جلد دوم

«صلّوا كما رأيتموني أصلّي»

"تم ویسے نماز ادا کرو جیسے تم نے مجھے نماز ادا کرتے ہوئے دیکھا ہے۔"

فِقهُ الصَّلاة

نمازِ نبوی مدلل

تالیف

فضیلۃ الشیخ مولانا محمد منیر قمر حفظہ اللہ





جلد دوم

«صَلُّوا كَمَا رَأَيْتُمُونِي أُصَلِّي»

"تم ویسے نماز ادا کرو جیسے تم نے مجھے نماز ادا کرتے ہوئے دیکھا ہے۔"

فِقهُ الصَّلاة

نمازِ نبوی مدلل

تالیف

فضیلۃ الشیخ مولانا محمد منیر قمر





((صَلُّوا كَمَا رَأَيْتُمُونِي أُصَلِّي))

”تم ویسے نماز ادا کرو، جیسے تم نے مجھے نماز ادا کرتے ہوئے دیکھا ہے“

فِقهُ الصَّلاة

نمازِ نبوی مدلل

(جلد دوم)



تالیف

فضیلۃ الشیخ مولانا محمد منیر قمر حفظہ اللہ

تدوین و تبییض

حافظ ارشاد الحق و ام محمد شکیلہ قمر حفظہما اللہ

ناشر

مکتبہ کتاب و سنت
ریحان چیمہ۔ ڈسکہ

ام القریٰ پبلی کیشنز
سیالکوٹ روڈ گوجرانوالہ

نام کتاب

فِقهُ الصَّلاۃ

(جلد دوم)

نمازِ نبوی مدلل

تالیف

فضیلۃ الشیخ مولانا محمد منیر قمر حفظہ اللہ

تدوین و تبییض

حافظ ارشاد الحق و ام محمد شکیلہ قمر حفظہما اللہ

طبع: ________ مئی 2016ء

کمپوزنگ: ________ ابوسفیان عزیزی

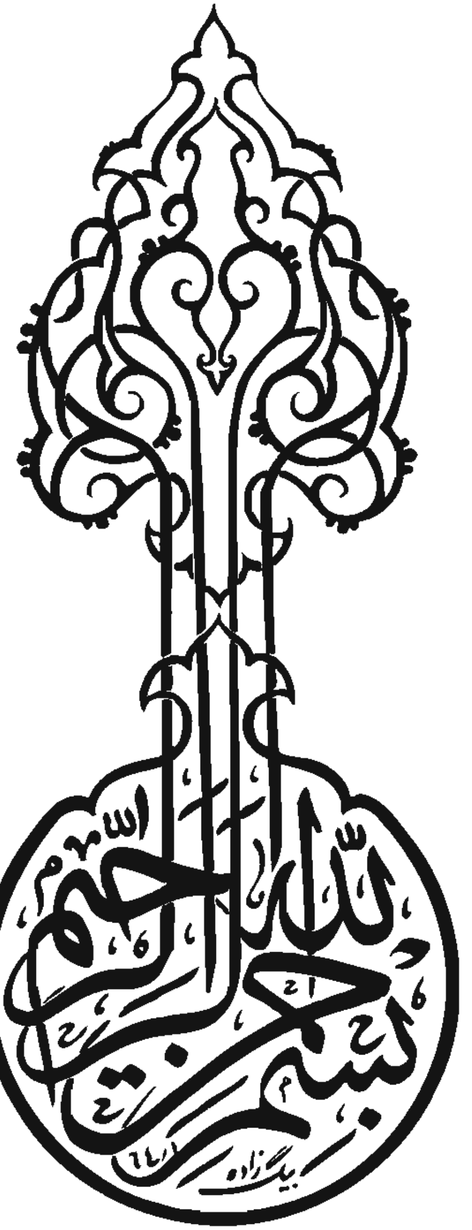
تعداد: ________ 800

ناشر

مکتبہ کتاب و سنت
ریحان چیمہ۔ ڈسکہ

ام القری پبلی کیشنز
سیالکوٹ روڈ گوجرانوالہ

055-3823990 / 0321-6466422



www.mohammedmunirqamar.com

فہرست مضامین

فضائلِ نماز اور تارکِ نماز کا حکم و شرعی حیثیت

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

گفتنی

اِنَّ الْحَمْدَ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَ نَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ، وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ أَنْفُسِنَا، وَ سَیِّئَاتِ أَعْمَالِنَا، مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ، وَمَنْ یُّضْلِلْ فَلَا ھَادِيَ لَہٗ، وَ أَشْھَدُ أَنْ لَّآاِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَأَشْھَدُ أَنَّ مُحَمَّداً عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ. أَمَّا بَعْدُ:

﴿یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰہَ حَقَّ تُقٰتِہٖ وَ لَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ﴾ [البقرۃ: ۱۰۲]

﴿یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّکُمُ الَّذِیْ خَلَقَکُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَۃٍ وَّ خَلَقَ مِنْھَا زَوْجَھَا وَ بَثَّ مِنْھُمَا رِجَالًا کَثِیْرًا وَّ نِسَآءً وَ اتَّقُوا اللّٰہَ الَّذِیْ تَسَآءَ لُوْنَ بِہٖ وَ الْاَرْحَامَ اِنَّ اللّٰہَ کَانَ عَلَیْکُمْ رَقِیْبًا﴾ [النساء: ۱]

﴿یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰہَ وَ قُوْلُوْا قَوْلًا سَدِیْدًا ۝ یُّصْلِحْ لَکُمْ اَعْمَالَکُمْ وَ یَغْفِرْلَکُمْ ذُنُوْبَکُمْ وَ مَنْ یُّطِعِ اللّٰہَ وَ رَسُوْلَہٗ فَقَدْ فَازَ فَوْزًا عَظِیْمًا﴾ [الأحزاب: ۷۰، ۷۱]

اما بعد! قارئین کرام! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

شہادتِ توحید و رسالت کے بعد ارکانِ اسلام میں سے اہم ترین رُکن نماز ہے، جو بندے کی اپنے رب کے ساتھ مناجات اور مومن کی معراج ہے۔ اس اہم رکن سے متعلق احکام و مسائل کی تفصیلات بیان کرنے کے لیے کافی طویل نفسی سے کام لیتے ہوئے ریڈیو ام القیوین (متحدہ عرب امارات) کی اُردو سروس سننے والے اپنے سامعین کے صبر کو بھی خوب آزمایا اور متعدد اوقات میں ۵ منٹ سے لے کر ۱۲ منٹ تک کے مختلف دورانیے پر مشتمل تقریباً پونے آٹھ سو نشستوں میں نماز کے موضوع کو کسی حد تک مکمل کیا، جو الحمد للہ آڈیو کیسٹوں میں بھی محفوظ ہے۔ بعد میں بعض احباب نے خواہش ظاہر کی کہ نماز سے متعلق ان تفصیلات کو سی ڈیز اور پھر ڈی وی ڈیز میں ٹرانسفر کر دیا جائے اور واقعی انھیں جدید ٹیکنالوجی میں محفوظ کراتے ہوئے اپنے ویب سائیٹ پر بھی پوسٹ کر دیا اور یہ مشورہ بھی ہوا کہ مزید محفوظ کرنے کے لیے کتابی شکل میں بھی ڈھال دینا چاہیے۔

چنانچہ پانی، غسل، وضو اور تیمّم و طہارت سے متعلق احکام و مسائل پر مشتمل، اسی طرح حیض و استحاضہ

اور نفاس کے ضروری احکام، اوقاتِ نماز اور فضیلتِ جماعت پر مشتمل جلد اول آپ کے سامنے پیش کی جا چکی ہے۔ جبکہ جلد دوم میں فضائلِ نماز، تارکِ نماز کا انجام، اذان و اقامت، ستر پوشی و لباس، عام احکامِ حجاب و پردہ اور مساجد کے احکام و مسائل کی تفصیلات آ گئی ہیں۔

جلد اول کی طرح ہی اس جلد دوم کی ترتیب و تبییض بھی ہمارے فاضل دوست جناب حافظ ارشاد الحق صاحب (فاضل مدینہ یونیورسٹی، مقیم الزید، شارجہ) کی مرہونِ منت ہے۔ فَجَزَاهُمُ اللّٰهُ فِي الدَّارَيْنِ خَيْراً.

اس کتاب (جلد دوم) کی طباعت میں ہمارے ارادے کے خلاف قدرے تاخیر ہوگئی ہے۔ ﴿وَلِكُلِّ أَجَلٍ كِتَابٌ﴾ جس کی ایک وجہ دراصل متحدہ عرب امارات سے نقل مکانی کر کے ہمارا سعودی عرب میں آ جانا بھی ہے، اس دَوران میں ہم کچھ عرصے تک نہ تو کوئی علمی کام کر سکے اور نہ معاونین احباب سے پہلا سا رابطہ رکھ سکے۔ بہر حال چونکہ اللہ کی طرف سے ہر کام کا وقت مقرر ہے، لہٰذا یہ تاخیر ہونا ہی تھی۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ سعودی عرب میں بھی ہمیں اپنی رحمتوں کے سائے میں رکھے، ہم پر اپنی برکات کا نزول جاری رکھے، ہم سے اپنے دین کی خدمت لیتا رہے اور اسے شرفِ قبولیت سے بھی نوازے۔ آمین

تمام قارئینِ کرام سے بھی درخواست ہے کہ اپنی نیک دعاؤں میں مولف و مرتب اور تمام معاونین کو بھی شامل فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ ہم سب کی اس خدمت کو قبول فرمائے، اس کتاب کو تمام قارئین و سامعین کے لیے مفید بنائے اور اس کی باقی جلدوں کی تکمیل و اشاعت کا سامان پیدا فرمائے۔ آمین یا الٰہ العالمین *

والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ
ابوعمران محمد منیر قمر سیالکوٹی
ترجمان سپریم کورٹ۔ الخبر
و داعیہ متعاون مراکز دعوت و ارشاد
الدمام، الظهران، الراكه، الخبر

سعودی عرب
۲/ ذوالقعدہ ۱۴۱۵ھ
۲/ اپریل ۱۹۹۵ء

* یہاں طبع اول کے مقدمہ ہی کو معمولی ترمیم و اضافہ کر کے شاملِ اشاعت کر دیا گیا ہے۔ [ابو عدنان، الخبر] (۲/ ربیع الاول ۱۴۳۶ھ = ۲۴/ دسمبر ۲۰۱۴ء)

1 فضائلِ نماز؛ قرآنِ کریم میں

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

1 ﴿اَلَّذِیۡنَ یُؤۡمِنُوۡنَ بِالۡغَیۡبِ وَ یُقِیۡمُوۡنَ الصَّلٰوۃَ وَ مِمَّا رَزَقۡنٰہُمۡ یُنۡفِقُوۡنَ﴾
[البقرۃ: ۳]

’’(متقی و ہدایت یافتہ اور فلاح پانے والے وہ لوگ ہیں) جو غیب پر ایمان لاتے ہیں اور نماز قائم کرتے ہیں اور اللہ کے دیے ہوئے رزق سے خرچ کرتے ہیں۔‘‘

2 ﴿ وَاسۡتَعِیۡنُوۡا بِالصَّبۡرِ وَالصَّلٰوۃِ وَ اِنَّہَا لَکَبِیۡرَۃٌ اِلَّا عَلَی الۡخٰشِعِیۡنَ﴾
[البقرۃ: ٤٥]

’’اور صبر و نماز کے ذریعے (اللہ سے) مدد حاصل کرو اور یہ (پابندیِ نماز) بڑا بھاری کام نظر آتا ہے، مگر (اللہ کے حضور) عاجزی کرنے والوں کے لیے (یہ بہت آسان ہوجاتی ہے)۔‘‘

3 ﴿یٰۤاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوا اسۡتَعِیۡنُوۡا بِالصَّبۡرِ وَ الصَّلٰوۃِ اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الصّٰبِرِیۡنَ﴾
[البقرۃ: ١٥٣]

’’اے ایمان والو! صبر اور نماز کے ذریعے (اللہ سے) مدد حاصل کرو، یقین کیجیے کہ اللہ صبر کرنے والے لوگوں کے ساتھ ہے۔‘‘

4 ﴿لٰکِنِ الرّٰسِخُوۡنَ فِی الۡعِلۡمِ مِنۡہُمۡ وَ الۡمُؤۡمِنُوۡنَ یُؤۡمِنُوۡنَ بِمَاۤ اُنۡزِلَ اِلَیۡکَ وَمَاۤ اُنۡزِلَ مِنۡ قَبۡلِکَ وَ الۡمُقِیۡمِیۡنَ الصَّلٰوۃَ وَ الۡمُؤۡتُوۡنَ الزَّکٰوۃَ وَ الۡمُؤۡمِنُوۡنَ بِاللّٰہِ وَ الۡیَوۡمِ الۡاٰخِرِ اُولٰٓئِکَ سَنُؤۡتِیۡہِمۡ اَجۡرًا عَظِیۡمًا﴾ [النساء: ١٦٢]

’’لیکن علم میں رسوخ والے اور اہلِ ایمان آپ پر نازل کی گئی شریعت پر ایمان لاتے ہیں اور آپ سے پہلی شرائع پر بھی ایمان رکھتے ہیں اور نماز ادا کرنے والے ہیں اور زکوۃ

دینے والے ہیں اور اللہ تعالیٰ اور روزِ آخرت پر ایمان رکھنے والے ہیں، یہی لوگ ہیں، جنھیں ہم اجرِ عظیم عطا کریں گے۔''

5 ﴿وَ قَالَ اللّٰهُ اِنِّیْ مَعَكُمْ لَىِٕنْ اَقَمْتُمُ الصَّلٰوةَ وَ اٰتَیْتُمُ الزَّكٰوةَ وَ اٰمَنْتُمْ بِرُسُلِیْ وَ عَزَّرْتُمُوْهُمْ وَ اَقْرَضْتُمُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا لَّاُكَفِّرَنَّ عَنْكُمْ سَیِّاٰتِكُمْ وَ لَاُدْخِلَنَّكُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ فَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ مِنْكُمْ فَقَدْ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِیْلِ﴾ [المائدة: ١٢]

''اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا: میں تمھارے ساتھ ہوں، اگر تم نے نماز قائم کی، زکات ادا کی، میرے رسولوں پر ایمان لائے، اور ان کی مدد کی اور اللہ (کے بندوں) کو قرض حسن دیا (اگر ایسا کیا) تو یقیناً میں تمھارے گناہ معاف کر دوں گا اور تمھیں ان جنتوں میں داخل کروں گا، جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی اور جس نے تم میں سے اس کے بعد بھی کفر کیا تو اس نے صراطِ مستقیم کو کھو دیا۔''

6 ﴿اِنَّمَا یَعْمُرُ مَسٰجِدَ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَ الْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَ اَقَامَ الصَّلٰوةَ وَ اٰتَى الزَّكٰوةَ وَ لَمْ یَخْشَ اِلَّا اللّٰهَ فَعَسٰۤى اُولٰٓىِٕكَ اَنْ یَّكُوْنُوْا مِنَ الْمُهْتَدِیْنَ﴾ [التوبة: ١٨]

''اللہ کی مسجدوں کے آباد کار تو صرف وہی لوگ ہو سکتے ہیں، جو اللہ اور قیامت پر ایمان رکھیں اور نماز قائم کریں اور زکات ادا کریں اور اللہ کے سوا کسی سے نہ ڈریں، پس قریب ہے کہ ہدایت یافتہ یہی لوگ ہوں۔''

7 ﴿وَ اَقِمِ الصَّلٰوةَ طَرَفَیِ النَّهَارِ وَ زُلَفًا مِّنَ الَّیْلِ اِنَّ الْحَسَنٰتِ یُذْهِبْنَ السَّیِّاٰتِ ذٰلِكَ ذِكْرٰى لِلذّٰكِرِیْنَ﴾ [هود: ١١٤]

''اور نماز قائم کرو، دن کے دونوں سروں (صبح و شام) پر اور کچھ رات گزرنے پر، درحقیقت نیکیاں برائیوں کو دُور کر دیتی ہیں، یہ ایک یاددہانی ہے، ان لوگوں کے لیے جو اللہ کو یاد رکھنے والے ہیں۔''

8 ﴿وَ الَّذِیْنَ صَبَرُوا ابْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهِمْ وَ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَ اَنْفَقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ سِرًّا وَّ عَلَانِیَةً وَّ یَدْرَءُوْنَ بِالْحَسَنَةِ السَّیِّئَةَ اُولٰٓىِٕكَ لَهُمْ عُقْبَى

الدَّارِ ۝ جَنّٰتُ عَدْنٍ يَّدْخُلُوْنَهَا وَ مَنْ صَلَحَ مِنْ اٰبَآئِهِمْ وَ اَزْوَاجِهِمْ وَ ذُرِّيّٰتِهِمْ وَ الْمَلٰٓئِكَةُ يَدْخُلُوْنَ عَلَيْهِمْ مِّنْ كُلِّ بَابٍ ۝ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ بِمَا صَبَرْتُمْ فَنِعْمَ عُقْبَى الدَّارِ ﴾ [الرعد: ٢٢ تا ٢٤]

''اور وہ لوگ جنھوں نے رضائے الٰہی کے لیے صبر کا دامن تھامے رکھا اور نماز قائم کی اور ہمارے دیے ہوئے رزق سے ظاہر و پوشیدہ خرچ کیا اور بُرائی کا جواب بھلائی سے دیا، وہی لوگ ہیں، جن کے لیے اچھی عاقبت ہے، وہ جناتِ عدن میں داخل ہوں گے اور ان کے ساتھ ہی اچھے عمل والے ان کے والدین اور بیویاں بچے بھی اور فرشتے ہر طرف سے ان کے پاس آئیں گے (اور کہیں گے) تم پر سلام ہے کہ تم نے اپنے صبر کا یہ پھل پایا ہے اور یہ اچھا دارِ عاقبت ہے۔''

9 ﴿قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ ۝ الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ خَاشِعُوْنَ﴾
[المؤمنون: ١، ٢]

''یقیناً فلاح پا گئے ایمان والے، جو اپنی نماز میں خشوع اختیار کرتے ہیں۔''

10 ﴿وَالَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَوَاتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ﴾ [المؤمنون: ٩]

''اور وہ لوگ (فلاح پا گئے) جو اپنی نمازوں کی حفاظت کرتے ہیں۔''

11 ﴿رِجَالٌ لَّا تُلْهِيهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَاِقَامِ الصَّلٰوةِ وَاِيْتَآءِ الزَّكٰوةِ﴾ [النور: ٣٧]

''(اللہ والے ہیں) وہ لوگ جنھیں تجارت اور خرید و فروخت اللہ کا ذکر کرنے، نماز قائم کرنے اور زکات ادا کرنے سے غافل نہیں کرتے (اللہ انھیں اپنا فضل و رزق بے شمار عطا کرتا ہے)۔''

12 ﴿وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ﴾
[النور: ٥٦]

''اور نماز قائم کرو اور زکات ادا کرو اور اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت کرو، تاکہ تم رحم کیے جاؤ۔''

13 ﴿ وَالَّذِیۡنَ یَبِیۡتُوۡنَ لِرَبِّہِمۡ سُجَّدًا وَّقِیَامًا ﴾ [الفرقان: ٦٤]

''اور (اللہ کے بندے) اپنی راتیں قیام وسجود میں گزارتے ہیں۔''

14 ﴿اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنۡہٰی عَنِ الۡفَحۡشَآءِ وَ الۡمُنۡکَرِ﴾ [العنکبوت: ٤٥]

''بے شک نماز فحاشی اور بُرے کاموں سے روکتی ہے۔''

15 ﴿الَّذِیۡنَ یُقِیۡمُوۡنَ الصَّلٰوۃَ وَ یُؤۡتُوۡنَ الزَّکٰوۃَ وَ ہُمۡ بِالۡاٰخِرَۃِ ہُمۡ یُوۡقِنُوۡنَ﴾ [لقمان: ٤]

''نیک اور فلاح پانے والے وہ ہیں جو نماز قائم کرتے، زکات ادا کرتے اور آخرت پر ایمان لاتے ہیں۔''

16 ﴿ تَتَجَافٰی جُنُوۡبُہُمۡ عَنِ الۡمَضَاجِعِ یَدۡعُوۡنَ رَبَّہُمۡ خَوۡفًا وَّ طَمَعًا وَّ مِمَّا رَزَقۡنٰہُمۡ یُنۡفِقُوۡنَ ﴿ فَلَا تَعۡلَمُ نَفۡسٌ مَّاۤ اُخۡفِیَ لَہُمۡ مِّنۡ قُرَّۃِ اَعۡیُنٍ جَزَآءًۢ بِمَا کَانُوۡا یَعۡمَلُوۡنَ﴾ [السجدۃ: ١٦، ١٧]

''ان کی پشتیں بستروں سے الگ رہتی ہیں، وہ اپنے رب کو خوفِ جہنم اور طمعِ جنت کے ساتھ پکارتے ہیں اور ہمارے عطا کردہ رزق سے خرچ کرتے ہیں۔ پھر جیسا کچھ ان کی آنکھوں کی ٹھنڈک کا سامان اُن کے لیے چھپا رکھا گیا ہے، اس کی کسی کو خبر نہیں، یہ ان کے اعمال کی جزا اور بدلہ ہے۔''

17 ﴿ اِنَّ الۡاِنۡسَانَ خُلِقَ ہَلُوۡعًا ﴿ اِذَا مَسَّہُ الشَّرُّ جَزُوۡعًا ﴿ وَّاِذَا مَسَّہُ الۡخَیۡرُ مَنُوۡعًا ﴿ اِلَّا الۡمُصَلِّیۡنَ ﴿ الَّذِیۡنَ ہُمۡ عَلٰی صَلَاتِہِمۡ دَآئِمُوۡنَ﴾ [المعارج: ١٩ تا ٢٣]

''انسان تھڑدلا (بے صبرا) پیدا کیا گیا ہے، جب اس پر مصیبت آتی ہے تو گھبرا اُٹھتا ہے۔ اور جب اسے خوشحالی نصیب ہوتی ہے تو بخل کرنے لگتا ہے، مگر وہ لوگ (ان عیوب سے مبرّا ہیں) جو نماز پڑھنے والے ہیں، جو اپنی نماز پر ہمیشہ پابندی کرتے ہیں۔''

18 ﴿ قَدۡ اَفۡلَحَ مَنۡ تَزَکّٰی ﴿ وَ ذَکَرَ اسۡمَ رَبِّہٖ فَصَلّٰی﴾ [الأعلیٰ: ١٤، ١٥]

''فلاح پا گیا وہ جس نے پاکیزگی اختیار کی۔ اور جس نے اپنے رب کا ذکر کیا اور پھر نماز پڑھی۔''

2 شرائع قدیمہ اور نماز؛ قرآنِ کریم میں

❶ دعاے حضرت خلیل علیہ السلام:

﴿ رَبِّ اجْعَلْنِیْ مُقِیْمَ الصَّلٰوۃِ وَ مِنْ ذُرِّیَّتِیْ﴾ [إبراهيم: ٤٠]

''اے میرے پروردگار! مجھے اور میری آل و اولاد کو نماز قائم کرنے والا بنا دے۔''

❷ اوصافِ حضرت اسماعیل علیہ السلام:

﴿ وَ کَانَ یَاْمُرُ اَهْلَهٗ بِالصَّلٰوۃِ وَالزَّکٰوۃِ وَ کَانَ عِنْدَ رَبِّهٖ مَرْضِیًّا ﴾ [مريم: ٥٥]

''وہ اپنے اہلِ خانہ کو نماز قائم کرنے اور زکات ادا کرنے کا حکم فرمایا کرتے تھے اور وہ اپنے رب کے نزدیک بڑے پسندیدہ تھے۔''

❸ میثاقِ بنی اسرائیل:

١ ﴿ وَ اَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَ اٰتُوا الزَّکٰوۃَ﴾ [البقرة: ٨٣]

''اور نماز قائم کرو اور زکات ادا کرو۔''

٢ ﴿وَ اَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَ اٰتُوا الزَّکٰوۃَ وَ ارْکَعُوْا مَعَ الرّٰکِعِیْنَ﴾ [البقرة: ٤٣]

''اور نماز قائم کرو اور زکات ادا کرو اور رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع (نماز ادا) کرو۔''

٣ ﴿وَاسْتَعِیْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوۃِ وَ اِنَّهَا لَکَبِیْرَۃٌ اِلَّا عَلَی الْخٰشِعِیْنَ﴾ [البقرة: ٤٥]

''اور صبر و نماز کے ذریعے (اللہ سے) مدد حاصل کرو اور یہ بڑا بھاری کام نظر آتا ہے، مگر عاجزی کرنے والوں کے لیے (بہت آسان ہے)۔''

❹ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حکمِ الٰہی:

﴿وَ اَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِذِکْرِیْ﴾ [طٰهٰ: ١٤] ''اور میری یاد کے لیے نماز قائم کرو۔''

❺ حضرت مریم بنت عمران کو حکمِ الٰہی:

﴿یٰمَرْیَمُ اقْنُتِیْ لِرَبِّكِ وَ اسْجُدِیْ وَ ارْکَعِیْ مَعَ الرّٰکِعِیْنَ﴾ [آل عمران: ٤٢]

''اے مریم! اپنے رب کے حضور عاجزی سے کھڑی ہو اور سجدہ کر اور رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کر۔''

❻ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو وصیتِ الٰہی:

﴿وَ اَوۡصٰنِیۡ بِالصَّلٰوۃِ وَ الزَّکٰوۃِ مَا دُمۡتُ حَیًّا﴾ [مریم:۳۱]

''اور (میرے رب نے) مجھے نماز و زکات کی وصیت فرمائی ہے کہ تاحینِ حیات ان کی پابندی کروں۔''

❼ حضرت زکریا علیہ السلام کی نماز:

﴿فَنَادَتۡهُ الۡمَلٰٓئِکَةُ وَ هُوَ قَآئِمٌ یُّصَلِّیۡ فِی الۡمِحۡرَابِ﴾ [آل عمران: ۳۹]

''فرشتوں نے انھیں (زکریا) کو اُس وقت پکارا جبکہ وہ محراب میں کھڑے نماز پڑھ رہے تھے۔''

❽ حضرت لقمان علیہ السلام کی وصیت:

﴿یٰبُنَیَّ اَقِمِ الصَّلٰوۃَ وَاۡمُرۡ بِالۡمَعۡرُوۡفِ وَانۡهَ عَنِ الۡمُنۡکَرِ وَاصۡبِرۡ عَلٰی مَاۤ اَصَابَکَ اِنَّ ذٰلِکَ مِنۡ عَزۡمِ الۡاُمُوۡرِ﴾ [لقمان: ۱۷]

''اے میرے بیٹے! نماز قائم کر اور نیکی کا حکم دے اور بُرائی سے روک اور (اس راہ میں) جو مشکلات آئیں، ان پر صبر کر، بے شک یہ بڑی عزیمت و ہمت کے کاموں میں سے ہے۔''

❾ شریعتِ اسلامیہ اور نبی علیہ السلام کو حکمِ الٰہی:

﴿وَاۡمُرۡ اَهۡلَکَ بِالصَّلٰوۃِ وَ اصۡطَبِرۡ عَلَیۡهَا﴾ [طٰهٰ: ۱۳۲]

''اور آپ اپنے اہلِ خانہ (اور امت) کو نماز کا حکم دیجیے اور خود بھی اس پر قائم رہیے۔''

3 ترکِ نماز کا انجام؛ قرآنِ کریم میں

① ﴿فَاِنۡ تَابُوۡا وَ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتَوُا الزَّکٰوۃَ فَاِخۡوَانُکُمۡ فِی الدِّیۡنِ﴾ [التوبۃ: ۱۱]

''پھر اگر یہ لوگ توبہ کرلیں اور نماز قائم کریں اور زکات ادا کریں تو یہ تمھارے دینی بھائی

ہیں (ورنہ اسلامی برادری سے ان کا کوئی تعلق نہیں)۔''

② ﴿فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَيْثُ وَ جَدْتُّمُوْهُمْ وَخُذُوْهُمْ وَ احْصُرُوْهُمْ وَ اقْعُدُوْا لَهُمْ كُلَّ مَرْصَدٍ فَاِنْ تَابُوْا وَ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَخَلُّوْا سَبِيْلَهُمْ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ﴾ [التوبة: ٥]

''مشرکوں کو جہاں بھی پاؤ، قتل کر دو اور انھیں پکڑ کر قید کر لو اور گھیر لو اور ان کی تاک میں ہر گھات کی جگہ بیٹھو، پھر اگر وہ توبہ کر لیں اور نماز کو درستی سے پڑھنے لگیں اور زکات دیا کریں تو ان کو ان کے حال پر چھوڑ دو، بے شک اللہ بڑا غفور و رحیم ہے۔''

③ ﴿فَخَلَفَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ اَضَاعُوا الصَّلٰوةَ وَ اتَّبَعُوا الشَّهَوٰتِ فَسَوْفَ يَلْقَوْنَ غَيًّا﴾ [مریم: ٥٩]

''پھر ایسے ناخلف لوگ ان کے جانشین بنے، جنھوں نے نماز کو ضائع کیا اور نفسانی خواہشات کی پیروی کی، قریب ہے کہ وہ غی (جہنم) سے دو چار ہوں گے۔''

④ ﴿مُنِيْبِيْنَ اِلَيْهِ وَاتَّقُوْهُ وَ اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَلَا تَكُوْنُوْا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ﴾ [الروم: ٣١]

''اس کی طرف رجوع کرتے ہوئے اور اس سے ڈرو اور درستی سے نماز ادا کرتے رہو اور یہ شرک کرنے والوں میں نہ ہو جاؤ۔''

⑤ ﴿كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ رَهِيْنَةٌ ۝ اِلَّآ اَصْحٰبَ الْيَمِيْنِ ۝ فِيْ جَنّٰتٍ يَتَسَآءَلُوْنَ ۝ عَنِ الْمُجْرِمِيْنَ ۝ مَا سَلَكَكُمْ فِيْ سَقَرَ ۝ قَالُوْا لَمْ نَكُ مِنَ الْمُصَلِّيْنَ ...﴾ [المدثر: ٣٨ تا ٤٣]

''ہر شخص اپنے کرتوتوں کی پاداش میں گرفتار رہے گا، سوائے دائیں ہاتھ (میں اعمال ناموں) والوں کے، وہ جنت میں مجرموں سے سوال کرتے ہوں گے کہ تمھیں دوزخ میں کیا چیز لے گئی، وہ کہیں گے کہ ہم نماز نہیں پڑھتے تھے...الخ۔''

⑥ ﴿فَلَا صَدَّقَ وَلَا صَلّٰى ۝ وَلٰكِنْ كَذَّبَ وَتَوَلّٰى﴾ [القیامة: ٣١، ٣٢]

''نہ اس نے تصدیق کی، نہ نماز پڑھی بلکہ تکذیب کی اور پیٹھ پھیری۔''

⑦ ﴿وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ ارْكَعُوْا لَا يَرْكَعُوْنَ ۝ وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ﴾
[المرسلات: ٤٨، ٤٩]

''اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ (نماز کے لیے) جھکو تو وہ نہیں جھکتے، اس دن جھٹلانے والوں کے لیے ویل خرابی ہوگی۔''

⑧ ﴿فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّيْنَ ۝ الَّذِيْنَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ﴾ [الماعون: ٤، ٥]

''ہلاکت اور بربادی ہے ان نمازیوں کے لیے، جو اپنی نماز سے غافل ہیں۔''

4 نماز کے لیے اذان و اقامت؛ قرآنِ کریم میں

① ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا نُوْدِيَ لِلصَّلٰوةِ مِنْ يَّوْمِ الْجُمُعَةِ فَاسْعَوْا اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ وَذَرُوا الْبَيْعَ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ﴾ [الجمعۃ: ٩]

''اے ایمان والو! جب جمعہ کے دن تمھیں نماز کے لیے نِدا (اذان) دی جائے تو اللہ کے ذکر (نماز) کی طرف جلدی کر کے پہنچو اور کاروبارِ تجارت کو چھوڑ دو، تمھارے لیے یہی بہتر ہے، اگر تم جانتے ہو۔''

② ﴿وَاِذَا نَادَيْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ اتَّخَذُوْهَا هُزُوًا وَّ لَعِبًا ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَعْقِلُوْنَ﴾ [المائدۃ: ٥٨]

''اور جب تم نماز کے لیے بلاتے (اذان کہتے) ہو تو یہ لوگ اس کا مذاق اُڑاتے اور اسے کھیل تماشا بناتے ہیں، یہ اس لیے کہ یہ بے عقل قوم کے لوگ ہیں۔''

5 نماز کے لیے ستر پوشی اور عام حجاب کے احکام؛ قرآنِ کریم میں

ارشادِ الٰہی ہے:

① ﴿يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ خُذُوْا زِيْنَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ﴾ [الأعراف: ٣١]

''اے آدم علیہ السلام کی اولاد! ہر نماز کے وقت اپنی زینت (لباس) اختیار کرو۔''

مرد و زن کے لیے ''مقامِ ستر'' کی حدود کیا ہیں؟ اس کی تفصیل سنتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں آ گئی

ہے، جو آگے اپنے مقام پر آ رہی ہے۔

④ ﴿ وَقُلْ لِّلْمُؤْمِنٰتِ يَغْضُضْنَ مِنْ اَبْصَارِهِنَّ وَيَحْفَظْنَ فُرُوْجَهُنَّ وَلَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ اِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَلْيَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلٰى جُيُوْبِهِنَّ وَلَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ اِلَّا لِبُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ اٰبَآئِهِنَّ اَوْ اٰبَآءِ بُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ اَبْنَآئِهِنَّ اَوْ اَبْنَآءِ بُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ اِخْوَانِهِنَّ اَوْ بَنِيْٓ اِخْوَانِهِنَّ اَوْ بَنِيْٓ اَخَوٰتِهِنَّ اَوْ نِسَآئِهِنَّ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُنَّ اَوِ التّٰبِعِيْنَ غَيْرِ اُولِي الْاِرْبَةِ مِنَ الرِّجَالِ اَوِ الطِّفْلِ الَّذِيْنَ لَمْ يَظْهَرُوْا عَلٰى عَوْرٰتِ النِّسَآءِ وَلَا يَضْرِبْنَ بِاَرْجُلِهِنَّ لِيُعْلَمَ مَا يُخْفِيْنَ مِنْ زِيْنَتِهِنَّ وَتُوْبُوْٓا اِلَى اللّٰهِ جَمِيْعًا اَيُّهَ الْمُؤْمِنُوْنَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴾ [النور: ۳۱]

''اور (اے نبی!) مومن عورتوں سے فرما دیجیے کہ وہ اپنی نظر بچا کر رکھیں اور اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کریں اور اپنا بناؤ سنگھار ظاہر نہ کریں، سوائے اس کے جو خود ظاہر ہوجائے اور اپنے سینوں پر اپنی اوڑھنیوں کے آنچل ڈالے رہیں اور وہ اپنا بناؤ سنگھار ظاہر نہ کریں، مگر ان لوگوں کے سامنے: شوہر، باپ، شوہروں کے باپ (سُسر)، ان کے اپنے بیٹے، ان کے شوہروں کے بیٹے (دوسری بیویوں سے)، ان کے بھائی، ان کے بھائیوں کے بیٹے (بھتیجے)، ان کی بہنوں کے بیٹے (بھانجے)، ان کے اپنے میل جول کی عورتیں اور ان کے لونڈی غلام اور وہ زیر دست مرد جو کسی اور قسم کی (نفسانی) غرض نہ رکھتے ہوں اور وہ بچے جو عورتوں کی پوشیدہ باتوں سے ابھی واقف نہ ہوئے ہوں اور وہ اپنے پاؤں زمین پر مارتی ہوئی نہ چلا کریں کہ اپنی جو زینت انھوں نے چھپا رکھی ہو، اس کا لوگوں کو علم ہوجائے۔ اور اے ایمان والو! تم سب کے سب اللہ کے سامنے توبہ کرو تاکہ تم فلاح پا جاؤ۔''

اس آیت کی ضروری تفسیر ''نماز کے لیے مرد و زن کے لباس'' کے ضمن میں آئے گی۔

③ ﴿وَالْقَوَاعِدُ مِنَ النِّسَآءِ الّٰتِيْ لَا يَرْجُوْنَ نِكَاحًا فَلَيْسَ عَلَيْهِنَّ جُنَاحٌ اَنْ يَّضَعْنَ ثِيَابَهُنَّ غَيْرَ مُتَبَرِّجٰتٍ بِزِيْنَةٍ وَّاَنْ يَّسْتَعْفِفْنَ خَيْرٌ لَّهُنَّ وَاللّٰهُ

سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ﴾ [النور: ٦٠]

''اور جو عورتیں جوانی سے گزر بیٹھی ہوں اور نکاح کی امیدوار نہ ہوں، وہ اگر اپنی چادریں اتار کر رکھ دیں تو ان پر کوئی گناہ نہیں، بشرطیکہ زینت کی نمایش کرنے والی نہ ہوں، تاہم وہ بھی حیاداری ہی برتیں تو ان کے حق میں اچھا ہے اور اللہ سب کچھ سنتا اور جانتا ہے۔''

④ ﴿يٰنِسَآءَ النَّبِيِّ لَسْتُنَّ كَاَحَدٍ مِّنَ النِّسَآءِ اِنِ اتَّقَيْتُنَّ فَلَا تَخْضَعْنَ بِالْقَوْلِ فَيَطْمَعَ الَّذِيْ فِيْ قَلْبِهٖ مَرَضٌ وَّ قُلْنَ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا ۝ وَ قَرْنَ فِيْ بُيُوْتِكُنَّ وَ لَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِيَّةِ الْاُوْلٰى﴾ [الأحزاب: ٣٢، ٣٣]

''اے نبی کی بیویو! تم دوسری عام عورتوں کی طرح نہیں ہو، اگر تم اللہ سے ڈرتی ہو تو (غیر مردوں سے) دبی زبان (باریک آواز) سے بات نہ کرو (ایسا کرو گی تو) جس کے دل میں کھوٹ ہے، اس کے دل میں لالچ پیدا ہوگا، لہٰذا کھڑی کھڑی صاف صاف بات کیا کرو اور اپنے گھروں میں جمی رہو اور زمانہ جاہلیت کی طرح بناؤ سنگھار نہ دکھاتی پھرو۔''

⑤ ﴿وَاِذَا سَاَلْتُمُوْهُنَّ مَتَاعًا فَسْئَلُوْهُنَّ مِنْ وَّرَآءِ حِجَابٍ ذٰلِكُمْ اَطْهَرُ لِقُلُوْبِكُمْ وَ قُلُوْبِهِنَّ وَ مَا كَانَ لَكُمْ اَنْ تُؤْذُوْا رَسُوْلَ اللّٰهِ وَ لَآ اَنْ تَنْكِحُوْٓا اَزْوَاجَهٗ مِنْۢ بَعْدِهٖٓ اَبَدًا اِنَّ ذٰلِكُمْ كَانَ عِنْدَ اللّٰهِ عَظِيْمًا﴾ [الأحزاب: ٥٣]

''اور جب تم ان (ازواجِ مطہرات) سے کوئی چیز مانگنے جاؤ تو پردے کے پیچھے سے مانگ لو، اس میں خوب ستھرائی ہے، تمھارے اور ان کے دلوں کے لیے۔''

اور فرمایا:

⑥ ﴿يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِكَ وَبَنٰتِكَ وَ نِسَآءِ الْمُؤْمِنِيْنَ يُدْنِيْنَ عَلَيْهِنَّ مِنْ جَلَابِيْبِهِنَّ ذٰلِكَ اَدْنٰٓى اَنْ يُّعْرَفْنَ فَلَا يُؤْذَيْنَ وَ كَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا﴾ [الأحزاب: ٥٩]

''اے نبی! اپنی بیویوں اور بیٹیوں سے اور عام مسلمانوں کی عورتوں سے کہہ دیں کہ وہ اپنی بڑی چادریں اوڑھ لیں اور اس سے امید ہے کہ وہ پہچان لی جائیں گی اور انھیں کوئی نہیں چھیڑے گا اور اللہ بڑا غفور و رحیم ہے۔''

6 تعمیرِ مسجد؛ قرآنِ کریم میں

① مشرکین کی بے بسی اور مومنین کا شعار:

﴿ مَا كَانَ لِلْمُشْرِكِيْنَ اَنْ يَّعْمُرُوْا مَسٰجِدَ اللّٰهِ شٰهِدِيْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ بِالْكُفْرِ اُولٰٓئِكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ وَ فِي النَّارِ هُمْ خٰلِدُوْنَ ۝ اِنَّمَا يَعْمُرُ مَسٰجِدَ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَ اَقَامَ الصَّلٰوةَ وَ اٰتَى الزَّكٰوةَ وَ لَمْ يَخْشَ اِلَّا اللّٰهَ فَعَسٰٓى اُولٰٓئِكَ اَنْ يَّكُوْنُوْا مِنَ الْمُهْتَدِيْنَ ﴾ [التوبة: ۱۷، ۱۸]

''مشرکین کا کام نہیں کہ آباد کریں اللہ کی مسجدیں اور تسلیم کر رہے ہوں اپنے اوپر کفر کو، ان کے تمام اعمال برباد ہوگئے اور وہ ہمیشہ نارِ جہنم میں رہیں گے۔ اللہ کی مسجدیں وہی آباد کرتا ہے، جو اللہ اور روزِ قیامت پر ایمان رکھتا ہو، نماز قائم کرتا ہو اور زکات ادا کرتا ہو اور اللہ کے سوا کسی سے نہ ڈرتا ہو، سو امید ہے کہ وہ لوگ ہدایت والوں میں سے ہوں گے۔''

② مساجد کا تقدّس:

۱ ﴿وَاَنَّ الْمَسٰجِدَ لِلّٰهِ فَلَا تَدْعُوْا مَعَ اللّٰهِ اَحَدًا﴾ [الجن: ۱۸]

''اور بلاشبہ یہ مساجد اللہ کے گھر ہیں، لہٰذا ان میں اللہ کے ساتھ کسی غیر اللہ کو ہرگز نہ پکارو۔''

۲ ﴿فِيْ بُيُوْتٍ اَذِنَ اللّٰهُ اَنْ تُرْفَعَ وَيُذْكَرَ فِيْهَا اسْمُهٗ يُسَبِّحُ لَهٗ فِيْهَا بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ﴾ [النور: ۳٦]

''(ہدایت پانے والے) ان گھروں میں پائے جاتے ہیں، جن کو بلند کرنے کا اور جن میں اس کے نام کی یاد کا اللہ نے اِذن دیا ہے، ان میں لوگ صبح و شام اس کی تسبیح کرتے ہیں۔''

۳ ﴿وَ اَقِيْمُوْا وُجُوْهَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ وَّ ادْعُوْهُ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ﴾ [الأعراف: ۲۹]

''اور ہر عبادت میں اپنا رُخ ٹھیک رکھو اور اسی کو پکارو، دین کو اس کے لیے خالص رکھ کر۔''

۴ ﴿يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ خُذُوْا زِيْنَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ﴾ [الأعراف: ۳۱]

''اے بنی آدم! ہر عبادت کے وقت اپنی زینت (لباس) سے آراستہ رہو۔''

③ دنیا کے بت کدے میں پہلا وہ گھر ''اللہ'' کا:

﴿ اِنَّ اَوَّلَ بَيْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِىْ بِبَكَّةَ مُبٰرَكًا وَّ هُدًى لِّلْعٰلَمِيْنَ ۝ فِيْهِ اٰيٰتٌۢ بَيِّنٰتٌ مَّقَامُ اِبْرٰهِيْمَ وَ مَنْ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا وَ لِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا وَ مَنْ كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ﴾

[آل عمران: ۹۶، ۹۷]

''بے شک سب سے پہلی عبادت گاہ جو انسانوں کے لیے تعمیر ہوئی، وہ ہے جو مکہ میں واقع ہے، اس کو خیر و برکت دی گئی تھی اور تمام جہان والوں کے لیے مرکز ہدایت بنایا گیا تھا، اس میں کھلی ہوئی نشانیاں ہیں، ابراہیم کا مقامِ عبادت ہے اور اس کا حال یہ ہے کہ جو اس میں داخل ہوگیا، امن میں آ گیا اور لوگوں پر اللہ کا یہ حق ہے کہ جو اس گھر تک پہنچنے کی استطاعت رکھتا ہو، وہ اس کا حج کرے اور جو کوئی اس حکم کی پیروی سے انکار کرے تو اسے معلوم ہونا چاہیے کہ اللہ تمام دنیا والوں سے بے نیاز ہے۔''

④ مساجد کی نظافت وصفائی:

۵ ﴿وَ عَهِدْنَآ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَ اِسْمٰعِيْلَ اَنْ طَهِّرَا بَيْتِيَ لِلطَّآئِفِيْنَ وَ الْعٰكِفِيْنَ وَ الرُّكَّعِ السُّجُوْدِ﴾ [البقرۃ: ۱۲۵]

''اور ہم نے ابراہیم اور اسماعیل کو تاکید کی تھی کہ میرے اس گھر کو طواف و اعتکاف اور رکوع و سجود کرنے والوں کے لیے پاک وصاف رکھنا۔''

۶ ﴿وَ اِذْ بَوَّاْنَا لِاِبْرٰهِيْمَ مَكَانَ الْبَيْتِ اَنْ لَّا تُشْرِكْ بِيْ شَيْئًا وَّ طَهِّرْ بَيْتِيَ لِلطَّآئِفِيْنَ وَ الْقَآئِمِيْنَ وَ الرُّكَّعِ السُّجُوْدِ﴾ [الحج: ۲۶]

''اور وہ وقت یاد کرو جب ہم نے ابراہیم کے لیے اس گھر (خانہ کعبہ) کی جگہ تجویز کی تھی (اس ہدایت کے ساتھ) کہ میرے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ کرو اور میرے گھر کو طواف کرنے والوں، قیام کرنے والوں اور رکوع کرنے والوں کے لیے پاک صاف رکھو۔''

اللہ نے شرک جیسی معنوی غلاظت سے مساجد کی نظافت و پاکیزگی اور عام گندگی سے صفائی ستھرائی ہر دو کا حکم فرمایا ہے۔

⑤ مسجدِ ضرار:

﴿وَ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مَسْجِدًا ضِرَارًا وَّ كُفْرًا وَّ تَفْرِيْقًۢا بَيْنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَ اِرْصَادًا لِّمَنْ حَارَبَ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ مِنْ قَبْلُ وَ لَيَحْلِفُنَّ اِنْ اَرَدْنَاۤ اِلَّا الْحُسْنٰى وَ اللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ﴾ [التوبة: ١٠٧]

''اور کچھ وہ لوگ ہیں جنھوں نے ایک مسجد بنائی، اس غرض کے لیے کہ (دعوتِ حق کو) نقصان پہنچائیں اور اس میں (بندگی کے بجائے) کفر کریں اور اہلِ ایمان میں پھوٹ ڈالیں اور (بہ ظاہر اس عبادت گاہ کو) اس شخص کے لیے کمین گاہ بنائیں، جو اس سے پہلے اللہ اور اس کے رسول کے خلاف برسرِ پیکار ہو چکا ہے، وہ ضرور قسمیں کھا کھا کر کہیں گے کہ ہمارا ارادہ تو بھلائی کے سوا کسی دوسری چیز کا نہ تھا، مگر اللہ گواہ ہے کہ وہ قطعی جھوٹے ہیں۔''

فضائلِ نماز

اور

تارکِ نماز کا حکم و شرعی حیثیت

1. نمازِ پنج گانہ کے فضائل۔
2. نمازِ جمعہ کے فضائل۔
3. تارکِ نماز کا حکم اور اس کا انجام۔

نمازِ پنج گانہ اور جمعہ کے فضائل

قرآنِ کریم کی روشنی میں

نمازِ پنج گانہ کی مطلق فضیلت کا ذکر شروع ہوا ہے تو بہتر معلوم ہوتا ہے کہ اس سلسلے میں پہلے قرآنِ کریم کے مختلف مقامات کا مطالعہ کریں۔ چنانچہ تیسویں پارے کی سورۃ الاعلیٰ میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

① ﴿قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى ۝ وَذَكَرَ اسْمَ رَبِّهٖ فَصَلّٰى﴾ [الأعلىٰ: ١٤، ١٥]

''فلاح پا گیا وہ شخص جس نے پاکیزگی اختیار کی اور جس نے اپنے رب کا نام یاد کیا (اس کا ذکر کیا) اور پھر نماز پڑھی۔''

یہاں اللہ تعالیٰ نے نماز کو نمازی کے لیے فلاح ونجات کا ذریعہ قرار دیا ہے۔ تقریباً یہی بات ایک دوسرے انداز سے اللہ تعالیٰ نے سورۃ المومنون کی پہلی دو آیتوں میں یوں بیان فرمائی ہے:

② ﴿ قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ ۝ الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ خَاشِعُوْنَ﴾

[المؤمنون: ١، ٢]

''یقیناً فلاح پا گئے ایمان لانے والے جو اپنی نماز میں خشوع اختیار کرتے ہیں۔''

آگے لغو باتوں سے پرہیز، زکات ادا کرنے، شرم گاہوں کی حفاظت، امانت داری، ایفاے عہد اور نمازوں کی پابندی جیسی صفات ذکر کرنے کے بعد فرمایا:

③ ﴿أُولٰٓئِكَ هُمُ الْوٰرِثُوْنَ ۝ الَّذِيْنَ يَرِثُوْنَ الْفِرْدَوْسَ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ﴾

[المؤمنون: ١٠، ١١]

''یہی لوگ جنت الفردوس کے وارث ہوں گے اور اس میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔''

کچھ ایسی بات اللہ تعالیٰ نے سورۃ المعارج میں اس طرح بیان فرمائی ہے:

④ ﴿اِنَّ الْاِنْسَانَ خُلِقَ هَلُوْعًا ۝ اِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ جَزُوْعًا ۝ وَاِذَا مَسَّهُ الْخَيْرُ مَنُوْعًا ۝ اِلَّا الْمُصَلِّيْنَ ۝ الَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ دَآئِمُوْنَ﴾
[المعارج: ١٩ تا ٢٣]

''انسان تھڑدلا (بے صبرا) پیدا کیا گیا ہے، جب اس پر مصیبت آتی ہے تو گھبرا اُٹھتا ہے اور جب اسے خوشحالی نصیب ہوتی ہے تو بخل کرنے لگتا ہے، مگر وہ لوگ (اس عیب سے مبرّا ہیں) جو نماز پڑھنے والے ہیں، جو اپنی نماز میں ہمیشہ پابندی کرتے ہیں۔''

سورت توبہ میں تو اللہ تعالیٰ نے نمازیوں اور مسجدوں کے آباد کاروں کے لیے بڑی عمدہ شہادت دی ہے، چنانچہ ارشادِ ربانی ہے:

⑤ ﴿اِنَّمَا يَعْمُرُ مَسٰجِدَ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَ اَقَامَ الصَّلٰوةَ وَ اٰتَى الزَّكٰوةَ وَ لَمْ يَخْشَ اِلَّا اللّٰهَ﴾ [التوبة: ١٨]

''اللہ کی مسجدوں کے آبادکار تو صرف وہی لوگ ہو سکتے ہیں جو اللہ اور قیامت پر ایمان رکھیں اور نماز قائم کریں اور زکات ادا کریں اور اللہ کے سوا کسی سے نہ ڈریں۔''

نمازیوں اور مساجد کے دوسرے آبادکاروں کے لیے اس شہادتِ ربانی کے علاوہ سورۃ السجدہ میں اللہ تعالیٰ نے راتوں کو اُٹھ اُٹھ کر نمازیں پڑھنے اور قیام کرنے والوں کی آنکھوں کو ٹھنڈک کی بشارت دی ہے، جیسا کہ ارشادِ الٰہی ہے:

⑥ ﴿تَتَجَافٰى جُنُوْبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ خَوْفًا وَّ طَمَعًا وَّ مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ۝ فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّآ اُخْفِيَ لَهُمْ مِّنْ قُرَّةِ اَعْيُنٍ جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ﴾ [السجدة: ١٦، ١٧]

''ان (مومنوں) کی پشتیں بستروں سے الگ رہتی ہیں (یعنی راتوں کو وہ قیام کرتے ہیں) وہ اپنے رب کو خوفِ (جہنم) اور طمع (جنت) کے ساتھ پکارتے ہیں اور ہمارے عطا کردہ رزق سے (اللہ کی راہ میں) خرچ کرتے ہیں، پھر جیسا کچھ ان کی آنکھوں کی ٹھنڈک کا سامان ان کے لیے چھپایا گیا، اس کی کسی کو خبر نہیں، یہ ان کے اعمال کی ایک جزا ہے۔''

نماز کی اہمیت وفضیلت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ قرآنِ کریم میں اتنا کسی

دوسری عبادت کا ذکر نہیں آیا، جتنا نماز کا ہے۔ نماز قائم کرنے کے بارے میں جا بہ جا حکم ہے۔ صراحۃ النص، اشارۃ النص اور دلالۃ النص ہرسہ اَشکال کو جمع کیا جائے تو قرآن میں سیکڑوں مرتبہ نماز کا ذکر آیا ہے، حتیٰ کہ بیاسی (۸۲) مقامات تو قرآنِ کریم میں وہ ہیں، جہاں نماز اور زکات کا ذکر یکجا آیا ہے۔

قرآنِ کریم کے آغاز ہی میں متقی لوگوں کے اوصافِ حمیدہ بیان کرتے ہوئے ایک وصف یہ بھی بتایا گیا ہے کہ وہ نماز قائم کرتے ہیں، چنانچہ سورۃ البقرہ میں ارشادِ الٰہی ہے:

۷ ﴿اَلَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ وَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَ مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ﴾

[البقرۃ: ۳]

''متقی وہ لوگ ہیں، جو غیب پر ایمان لاتے ہیں، نماز قائم کرتے ہیں اور اللہ کے دیے ہوئے رزق سے فی سبیل اللہ خرچ کرتے ہیں۔''

آگے کتب سماویہ اور روزِ آخرت پر ایمان لانے کی مزید صفات بیان کرنے کے بعد فرمایا:

﴿اُولٰٓئِكَ عَلٰى هُدًى مِّنْ رَّبِّهِمْ وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ﴾ [البقرۃ: ۵]

''یہی لوگ اپنے رب کی طرف سے ہدایت یافتہ اور فلاح ونجات پانے والے ہیں۔''

سورۃ النور میں اللہ والوں کے اوصاف بیان کرتے ہوئے ارشادِ الٰہی ہے:

۸ ﴿رِجَالٌ لَّا تُلْهِيهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَاِقَامِ الصَّلٰوةِ وَاِيْتَآءِ الزَّكٰوةِ يَخَافُوْنَ يَوْمًا تَتَقَلَّبُ فِيْهِ الْقُلُوْبُ وَالْاَبْصَارُ﴾ [النور: ۳۷]

''وہ لوگ (مرد) جنھیں تجارتی کاروبار اور خرید و فروخت، اللہ کا ذکر کرنے، نماز قائم کرنے اور زکات ادا کرنے سے غافل نہیں کرتے، وہ اس روزِ قیامت سے ڈرتے رہتے ہیں، جس دن چشم و دل تلپٹ ہو جائیں گے۔''

اگلی آیت میں فرمایا:

﴿لِيَجْزِيَهُمُ اللّٰهُ اَحْسَنَ مَا عَمِلُوْا وَيَزِيْدَهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ وَاللّٰهُ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ﴾ [النور: ۳۸]

''تاکہ اللہ انھیں ان کے عمل کی بہترین جزا دے اور ان پر مزید فضل و احسان کرے اور اللہ جسے چاہتا ہے بغیر حساب کے رزق دیتا ہے۔''

قرآنِ کریم میں اللہ تعالیٰ نے ایسے ہی کئی دیگر مقامات پر بھی نماز پڑھنے والوں کو جہنم سے نجات، دنیوی و اخروی کامیابی اور نعیم جنت کی خوشخبریاں دی ہیں، پھر ایک مقام پر نماز کو مصائب و مشکلات میں حصولِ مدد و قوت کا ذریعہ قرار دیا گیا ہے، چنانچہ سورۂ بقرہ میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

⑨ ﴿وَاسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ وَ اِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ اِلَّا عَلَى الْخٰشِعِيْنَ﴾

[البقرة: ٤٥]

''اور صبر و نماز کے ذریعے (اللہ تعالیٰ سے) قوت پکڑو اور یہ (پابندیِ نماز) بڑا بھاری کام نظر آتا ہے، مگر (اللہ کے حضور) عاجزی کرنے والوں کے لیے (یہ بہت آسان ہوجاتی ہے)۔''

تقریباً اسی مفہوم کی سورۂ بقرہ کی ایک دوسری آیت بھی ہے، جہاں ارشادِ ربانی ہے:

⑩ ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَ الصَّلٰوةِ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ﴾

[البقرة: ١٥٣]

''اے ایمان والو! صبر اور نماز کے ذریعے (اللہ سے) مدد حاصل کرو، یقین کیجیے کہ اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔''

دراصل جب مصیبت آتی ہے تو انسان عموماً راہِ صواب سے ہٹ جاتا ہے اور اس کوشش میں لگ جاتا ہے کہ اس سے کس طرح چھٹکارا حاصل ہو؟ اللہ تعالیٰ نے نماز کا راستہ بتایا ہے کہ اس طرح تمھارا رُخ اللہ کی طرف ہوجائے گا اور وہ تمام قدرتوں کا مالک اور مصائب کے دور کرنے پر قادر ہے۔

ویسے بھی مصیبت میں دوست یاد آتے ہیں، جن کے سامنے اپنا دُکھ بیان کر کے اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرے اور ہمدردی کے دو بول سُن کر سکون حاصل کرے، مومن کا محبوب ترین دوست اللہ تعالیٰ ہی ہے اور ہر آڑے وقت میں وہی اس کے کام آتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نبیِ اکرم ﷺ کسی بھی قسم کی مشکل پیش آتے ہی اللہ کے حضور کھڑے ہوجاتے اور نماز ادا کیا کرتے تھے، جیسا کہ سنن ابوداود اور مسند احمد میں حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

((كَانَ النَّبِيُّ ﷺ إِذَا حَزَبَهُ أَمْرٌ صَلّٰى)) [1]

''نبیِ اکرم ﷺ کو جب بھی کوئی اہم کام (مشکل کام) پیش آجاتا تو آپ ﷺ نماز ادا

[1] صحيح الجامع (٢/ ٤/ ٢١٥) وحسنه. صحيح سنن أبي داود (١/ ٢٤٥) الفتح الرباني (٢/ ٢٠٧)

فرمایا کرتے تھے۔‘‘

وہ لوگ جو فحاشی و بدکاری میں مبتلا ہوں اور انھیں ان سے خلاصی پانے کی کوئی راہ سجھائی نہ دے رہی ہو، ان کے لیے اور عام لوگوں کے لیے نماز کو برائیوں سے چھٹکارا پانے کا ذریعہ قرار دیا گیا ہے، چنانچہ سورۂ عنکبوت میں ارشادِ الٰہی ہے:

(۱۱) ﴿اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَ الْمُنْكَرِ﴾ [العنکبوت: ٤٥]

’’بے شک نماز فحاشی اور بُرے کاموں سے روکتی ہے۔‘‘

یہاں ایک سوال ذہن میں آتا ہے کہ بعض لوگ نمازیں بھی پڑھتے جاتے ہیں اور برائیوں میں بھی لت پت رہتے ہیں۔ کیا انھیں ان کی نماز برائیوں سے نہیں روکتی یا آخر وجہ کیا ہے؟

اس بات کا جواب ہم امام ابن کثیر رحمہ اللہ پر چھوڑتے ہیں، جسے اس کی تفصیل مطلوب ہو، وہ تفسیر ابن کثیر رحمہ اللہ مترجم اردو (۴/ ۱۷۵، ۱۷۶ طبع مکتبہ انسانیت لاہور) یا عربی میں سورۃ عنکبوت کی آیت (۴۰) کی تفسیر دیکھ لے۔

سورت ہود میں اللہ تعالیٰ نے نماز کو گناہوں کے لیے کفارہ قرار دیا ہے، جیسا کہ ارشادِ الٰہی ہے:

(۱۲) ﴿وَ اَقِمِ الصَّلٰوةَ طَرَفَيِ النَّهَارِ وَ زُلَفًا مِّنَ الَّيْلِ اِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ ذٰلِكَ ذِكْرٰى لِلذّٰكِرِيْنَ﴾ [ھود: ١١٤]

’’اور نماز قائم کرو دن کے دونوں سروں پر (صبح وشام) اور کچھ رات گزرنے پر، درحقیقت نیکیاں برائیوں کو دور کردیتی ہیں۔ یہ ایک یاد دہانی ہے، ان لوگوں کے لیے جو اللہ کو یاد رکھنے والے ہیں۔‘‘

صحیح بخاری و مسلم میں مذکور ہے کہ ایک صحابی سے ایک گناہ سرزد ہوا اور نماز سے اس کی تلافی ہوگئی۔[1]

[1] صحیح البخاری مع الفتح (۲/ ۷۸، ۸/ ۳۵۵) اس پس منظر کے ساتھ اس واقعے پر مشتمل آیت و حدیث کی کچھ تفصیل ہم آگے چل کر ذکر کریں گے۔ ان شاء اللہ

فضائلِ نمازِ پنج گانہ

حدیث شریف کے آئینہ میں؟

ہم پچھلی سطور میں نماز پنج گانہ کے فضائل کا ذکر قرآنِ کریم کے حوالے سے کر چکے ہیں اور کچھ آیات بھی پیش کی جا چکی ہیں۔ اسی سلسلے میں مزید عرض کہ نبیِ کریم ﷺ کے کثیر ارشاداتِ گرامی میں بھی نماز پنج گانہ، نماز جمعہ اور دیگر نفلی نمازوں کے فضائل وارد ہوئے ہیں۔ نمازِ پنج گانہ میں سے ہر نماز کے ساتھ مخصوص احادیث ہم ذکر کر چکے ہیں، لہٰذا اب ہم صرف ان احادیث میں سے کچھ ارشاداتِ گرامی کا انتخاب پیش کریں گے، جن کا تعلق مطلق نماز سے ہے۔

حدیث نمبر ①:

پہلی حدیث تو وہ ہے جس میں نماز کو اسلام کے پانچ ارکان میں سے ایمان کے بعد سب سے پہلا اور ایک اہم رکن قرار دیا گیا ہے، چنانچہ صحیح بخاری و مسلم، مسند احمد اور دیگر کتبِ حدیث میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ اور بعض دیگر صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین سے مروی ارشادِ نبوی ﷺ ہے:

«بُنِيَ الْإِسْلَامُ عَلٰى خَمْسٍ، شَهَادَةِ أَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَأَنَّ مُحَمَّداً رَّسُوْلُ اللّٰهِ، وَإِقَامِ الصَّلَاةِ، وَإِيْتَاءِ الزَّكَاةِ، وَحَجِّ الْبَيْتِ، وَصَوْمِ رَمَضَانَ»[1]

”اسلام کی عمارت پانچ ستونوں پر قائم ہے۔ اس بات کی گواہی و شہادت دینا کہ اللہ کے سوا کوئی معبودِ برحق نہیں اور حضرت محمد (ﷺ) اللہ کے رسول ہیں۔ نماز قائم کرنا۔ زکات ادا کرنا۔ بیت اللہ شریف کا حج کرنا اور رمضان المبارک کا روزہ رکھنا۔“

---

[1] صحیح الجامع (٢/ ٣/ ١٠) رقم الحدیث (٥٨٤٠) صحیح البخاري مع الفتح، رقم الحدیث (٨) مختصر صحیح مسلم للمنذري، رقم الحدیث (٦٢) سنن الترمذي، رقم الحدیث (٢١٠٤) سنن النسائي، رقم الحدیث (٤٦٢٨)

حدیث نمبر ②:

ایک دوسری حدیث میں نماز کو ان اسباب میں سے ایک سبب قرار دیا گیا ہے، جن کی وجہ سے کسی کا خون اور مال محفوظ ہو جاتا ہے، جیسا کہ صحیح بخاری و مسلم میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے، اسی طرح صحیحین، سنن اربعہ اور مستدرکِ حاکم میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے اور نسائی میں حضرت ابو بکرہ رضی اللہ عنہ سے ملتے جلتے الفاظ سے مروی ہے کہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

«أُمِرْتُ أَنْ أُقَاتِلَ النَّاسَ حَتّٰى يَشْهَدُ أَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَأَنَّ مُحَمَّداً رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَيُقِيْمُوا الصَّلَاةَ وَيُؤْتُوا الزَّكَاةَ، فَإِذَا فَعَلُوْا ذٰلِكَ عَصَمُوْا مِنِّيْ دِمَائَهُمْ وَأَمْوَالَهُمْ إِلَّا بِحَقِّ الْإِسْلَامِ، وَحِسَابُهُمْ عَلَى اللّٰهِ» [1]

''مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں اس وقت تک لوگوں سے قتال و جہاد کرتا رہوں، جب تک وہ اس بات کا اقرار نہ کرنے لگیں کہ اللہ کے سوا کوئی معبودِ برحق نہیں اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اللہ کے رسول ہیں، اگر اُنھوں نے اتنا کر لیا تو انھوں نے اپنے خون اور اموال مجھ سے محفوظ کر لیے، سوائے اسلامی حق (قصاص یا قتل کے بدلے قتل) کے اور ان کا حساب اللہ کے حوالے ہے۔''

حدیث نمبر ③:

اسی سلسلے کی تیسری حدیث میں بروقت ادا کی گئی نماز کو افضل ترین اور اللہ کے یہاں محبوب ترین اعمال میں سے قرار دیا گیا ہے، چنانچہ صحیح بخاری و مسلم، سنن نسائی، صحیح ابن حبان و ابن خزیمہ، مسند احمد اور سنن کبریٰ بیہقی میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، جس میں وہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا:

---

[1] صحيح مسلم مع النووي (١/ ٢١٠، ٢١٢) صحيح البخاري مع الفتح، رقم الحديث (٢٥) عن ابن عمر مختصر صحيح مسلم للمنذري، رقم الحديث (٥) عن ابن عمرو، رقم الحديث (٤) عن أبي هريرة "التجريد الصريح" (١/ ١٠٣) عن أبي هريرة، صحيح أبي داود، رقم الحديث (٢٢٩٩) صحيح سنن الترمذي، رقم الحديث (٢١٠٢) صحيح سنن النسائي، رقم الحديث (٣٧٠٥) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٧١) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٤٠٧)

«أَيُّ الْأَعُمَالِ أَحَبُّ إِلَى اللّٰهِ؟ ... اَلصَّلَاةُ عَلٰى وَقُتِهَا»[1]

''اللہ کے نزدیک محبوب ترین عمل کون سا ہے؟ (تو نبیِ اکرم ﷺ نے فرمایا:) نماز کو اس کے (اول) وقت پر ادا کرنا۔''

صحیح ابن خزیمہ اور مستدرک حاکم کے الفاظ یہ ہیں:

«اَلصَّلَاةُ فِيُ أَوَّلِ وَقُتِهَا» ''نماز کو اس کے اول وقت پر ادا کرنا۔''

سنن دارقطنی و بیہقی میں بھی یہی الفاظ ہیں، مگر ان الفاظ والی روایت پر امام دارقطنی نے کلام کیا ہے اور امام نووی رحمہ اللہ نے ''المجموع شرع المهذب'' میں ان الفاظ والی حدیث کو ضعیف قرار دیا ہے، لیکن حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے ان کا تعاقب کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس کے دوسرے طُرق بھی ہیں، جو کہ صحیح ابن خزیمہ اور مستدرک حاکم میں مروی ہیں۔[2] اس طرح اِن الفاظ والی روایت کو تقویت حاصل ہوگئی۔

اس سے آگے حدیث میں ہے کہ پھر میں نے پوچھا کہ اس کے بعد؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا:

«ثُمَّ بِرُّ الُوَالِدَيُنِ» ''پھر والدین کے ساتھ نیک سلوک کرنا۔''

میں نے کہا: اس کے بعد! تو آپ ﷺ نے فرمایا:

«اَلُجِهَادُ فِيُ سَبِيُلِ اللّٰهِ» ''اللہ کے راستے میں جہاد کرنا۔''

اس حدیث میں اللہ تعالیٰ کے نزدیک محبوب ترین عمل بروقت نماز کو ادا کرنا کو قرار دیا گیا ہے۔

حدیث نمبر ④:

ایک دوسری حدیث جو حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، اس میں ان امور سے بھی پہلے آپ ﷺ نے ایمان باللہ کو شمار کیا ہے۔ صاحبِ فتح الباری لکھتے ہیں کہ ان دونوں حدیثوں میں کوئی تضاد و تعارض نہیں ہے، کیونکہ امام ابن دقیق العید کے بقول حدیث ابن مسعود رضی اللہ عنہ میں بدنی اعمال مذکور ہیں، جبکہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں جو ایمان باللہ کا ذکر ہے تو وہ بدنی اعمال

---

[1] صحيح البخاري مع الفتح، رقم الحديث (٥٢٧) صحيح مسلم مع شرح النووي (١/ ٢/ ٧٣) صحيح سنن النسائي، رقم الحديث (٥٩٤، ٥٩٥)

[2] فتح الباري (٢/ ١٠)

سے نہیں، بلکہ قلبی اعمال سے تعلق رکھتا ہے۔[1]

حدیث نمبر ⑤:

پھر ایک اور حدیث بھی اسی مفہوم پر دلالت کرتی ہے جو شعب الایمان بیہقی میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، جس میں ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے:

«أَفْضَلُ الْعَمَلِ الصَّلَاةُ لِوَقْتِهَا»[2] ''افضل عمل وقت پر نماز کو ادا کرنا ہے۔''

حدیث نمبر ⑥:

ایک حدیث میں نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے نمازِ پنج گانہ کی پابندی کرنے والوں کی مغفرت اور بخشش کی بشارت سنائی ہے، جیسا کہ سنن ابو داود، نسائی، ابن ماجہ، موطا امام مالک اور صحیح ابن حبان و ابن سکن میں حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ میں نے نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا:

« خَمْسُ صَلَوَاتٍ اِفْتَرَضَهُنَّ اللّٰهُ عَزَّوَجَلَّ، مَنْ أَحْسَنَ وُضُوْءَهُنَّ وَصَلَّاهُنَّ لِوَقْتِهِنَّ وَأَتَمَّ رُكُوْعَهُنَّ وَسُجُوْدَهُنَّ وَخُشُوْعَهُنَّ كَانَ لَهٗ عَلَى اللّٰهِ عَهْدٌ أَنْ يَّغْفِرَ لَهٗ، وَمَنْ لَّمْ يَفْعَلْ فَلَيْسَ عَلَى اللّٰهِ عَهْدٌ إِنْ شَاءَ غَفَرَ لَهٗ وَإِنْ شَاءَ عَذَّبَهٗ »[3]

''اللہ تعالیٰ نے پانچ نمازیں فرض کی ہیں، جس نے اُن کے لیے اچھی طرح وضو کیا اور انھیں ان کے اوقات (اولیٰ) پر ادا کیا، ان کے رکوع و سجود پوری طرح ادا کیے اور ان میں خشوع و خضوع کا اہتمام کیا، اس کے لیے اللہ کا عہد ہے کہ وہ اُسے بخش دے گا اور جس نے ایسا نہ کیا، اس کے لیے اللہ تعالیٰ کا کوئی عہد نہیں، اگر وہ چاہے گا تو اسے بخش دے گا اور اگر چاہے گا تو اسے عذاب دے گا۔''

---

[1] صحيح البخاري مع الفتح (٢/ ٩) صحيح ابن خزيمة (١/ ١٦٩) مختصر الترغيب لابن حجر (ص: ٢٧ طبع مالی گاؤں انڈیا) صحيح ابن حبان (٢٨) الموارد، المشكاة، بتحقيق الألباني (١/ ١٨٠)

[2] فتح الباري (٢/ ٩)

[3] صحيح الجامع الصغير (٢/ ٣/ ١١١٤) رقم الحديث (٣٢٤٣) مشكوة المصابيح (١/ ١٨٠) وصححه الألباني وابن عبدالبر والنووي، "المنتقى" (١/ ١/ ٢٩٤) سنن أبي داود مع العون (٢/ ٩٣، ٩٤ طبع مدنی) الفتح الرباني (٢/ ٢٣٤، ٢٣٥) صحيح سنن النسائي، رقم الحديث (٤٤٥) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٤٠١) صحيح الترغيب، رقم الحديث (٣٦٦) موارد الظمآن، رقم الحديث (٢٥٢، ٢٥٣)

یہ حدیث اور اس سے پہلے بعض احادیث ہم نے اول وقت پر نماز ادا کرنے کے افضل ہونے کے دلائل کے ضمن میں ذکر کی تھیں۔

حدیث نمبر ⑦:

اس مفہوم کی ایک حدیث قدسی بھی ہے، جو مسند طیالسی، کتاب الصلوۃ محمد بن نصر مروزی اور معجم کبیر طبرانی میں صحیح سند سے مروی ہے، جس میں حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

«أَتَانِي جِبْرِيْلُ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ تَبَارَكَ وَتَعَالٰى فَقَالَ: يَا مُحَمَّدُ! إِنَّ اللّٰهَ عَزَّوَجَلَّ يَقُوْلُ: إِنِّيْ قَدْ فَرَضْتُ عَلٰى أُمَّتِكَ خَمْسَ صَلَوَاتٍ، فَمَنْ وَافٰى بِهِنَّ عَلٰى وُضُوْئِهِنَّ وَمَوَاقِيْتِهِنَّ وَرُكُوْعِهِنَّ وَسُجُوْدِهِنَّ، كَانَ لَهٗ عِنْدِيْ بِهِنَّ عَهْدٌ أَنْ أُدْخِلَهٗ بِهِنَّ الْجَنَّةَ وَمَنْ يَّلْقَانِيْ اِنْتَقَصَ مِنْ ذٰلِكَ شَيْئاً فَلَيْسَ لَهٗ عِنْدِيْ عَهْدٌ إِنْ شِئْتُ عَذَّبْتُهٗ وَإِنْ شِئْتُ رَحِمْتُهٗ»[1]

”میرے پاس جبرئیل علیہ السلام تشریف لائے اور کہنے لگے کہ اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم! اللہ عزوجل فرماتا ہے: میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی امت پر پانچ نمازیں فرض کی ہیں، جس نے ان کے وضو، اوقات رکوع اور سجود کا صحیح طور پر حق ادا کیا، اس کے لیے میرا عہد ہے کہ اس کے عوض میں اُسے جنت میں داخل کروں گا اور جو اس حال میں مجھ سے ملا کہ ان میں سے کسی چیز میں کمی کر کے آیا، تو اس کے لیے میرا کوئی عہد نہیں ہے، اگر میں نے چاہا تو اسے عذاب کروں گا اور اگر میں نے چاہا تو اس پر رحم کروں گا۔“

اس حدیث شریف کی رُو سے نمازِ پنج گانہ کی صحیح طور پر پابندی کرنے والے شخص سے اللہ تعالیٰ کا عہد و پیمان ہے کہ وہ اُسے جنت میں داخل کرے گا یہ حدیثِ قدسی ہے، جبکہ تقریباً اسی مفہوم کی ایک حدیثِ نبوی پہلے بھی گزری ہے۔

حدیث نمبر ⑧:

بعض احادیث میں نماز کے فضائل کچھ اس انداز سے مذکور ہیں کہ جب کوئی شخص نماز میں

[1] صحيح الجامع (١/ ١/ ٧٩) الصحيحه، رقم الحديث (٨٤٢)

مشغول ہوجاتا ہے، تو اللہ تعالیٰ کی نظرِ کرم اس انداز سے اس پر ہوجاتی ہے کہ جب تک وہ نماز میں مشغول رہتا ہے، اللہ اس کی طرف متوجہ رہتا ہے، چنانچہ سنن ابن ماجہ میں حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے مروی ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے:

«إِنَّ الرَّجُلَ إِذَا دَخَلَ فِيْ صَلَاتِهِ أَقْبَلَ اللّٰهُ عَلَيْهِ بِوَجْهِهِ، فَلَا يَنْصَرِفُ عَنْهُ حَتّٰى يَنْقَلِبَ أَوْ يُحْدِثَ حَدَثَ سُوْءٍ»[1]

''جب کوئی شخص نماز میں داخل ہوتا ہےتو اللہ تعالیٰ اپنے وجہِ کریم کے ساتھ اس کی طرف متوجہ ہوجاتا ہے اور اس وقت تک نظرِ کرم نہیں ہٹاتا، جب تک کہ وہ نماز سے فارغ نہ ہوجائے یا حادث (بے وضو) نہ ہوجائے۔''

حدیث نمبر ⑨:

ذکرِ الٰہی کے دوران میں آدمی کو اللہ تعالیٰ کی معیت حاصل ہوجاتی ہے، جو ایک بہت بلند مقام ہے۔ نماز بھی چونکہ ذکرِ الٰہی کا ایک اہم طریقہ ہے، لہٰذا دورانِ نماز بھی معیت الٰہی آدمی کے شاملِ حال ہوتی ہے، کیونکہ صحیح بخاری میں تعلیقاً اور سنن ابن ماجہ، صحیح ابن حبان اور مسند احمد میں موصولاً حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے ایک حدیث قدسی مروی ہے کہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

«إِنَّ اللّٰهَ تَعَالٰى يَقُوْلُ: أَنَا مَعَ عَبْدِيْ مَا ذَكَرَنِيْ وَتَحَرَّكَتْ بِيْ شَفَتَاهُ»[2]

''اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: میں اپنے بندے کے ساتھ ہوں، جب بھی وہ مجھے یاد کرے اور جب بھی میرے ذکر سے اس کے ہونٹ ہلیں۔''

حدیث نمبر ⑩:

یہ نمازیں گناہوں کو مٹاتی ہیں، کیونکہ معجم طبرانی، سنن بیہقی اور حلیۃ الاولیاء ابونعیم میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے:

---

[1] صحيح الجامع (١/ ٢/ ٦٢) رقم الحديث (١٦١٤) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٠٢٣) السلسلة الصحيحة (١٥٩٦)

[2] صحيح الجامع (١/ ٢/ ١٥١) رقم الحديث (١٩٠٦) مشكاة المصابيح، رقم الحديث (٢٢٨٥) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٣٧٩٢) موارد الظمآن، رقم الحديث (٢٣١٦)

«إِنَّ الْعَبْدَ إِذَا قَامَ يُصَلِّي أُتِيَ بِذُنُوبِهِ كُلِّهَا فَوُضِعَتْ عَلٰى رَأْسِهِ وَعَاتِقَيْهِ فَكُلَّمَا رَكَعَ أَوْ سَجَدَ تَسَاقَطَتْ عَنْهُ»[1]

''جب کوئی نماز کے لیے کھڑا ہوتا ہے تو اس کے تمام (صغیرہ) گناہ اس کے سر اور کندھوں پر رکھ دیے جاتے ہیں، جب بھی وہ رکوع یا سجدہ کرتا ہے، وہ گناہ اس سے گر جاتے ہیں۔''

حدیث نمبر ⑪:

اسی مفہوم کی دوسری دلیل وہ حدیث بھی ہے، جو صحیح مسلم، سنن ترمذی اور مسند احمد میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

«اَلصَّلَوَاتُ الْخَمْسُ وَالْجُمُعَةُ إِلَى الْجُمُعَةِ وَ رَمَضَانُ إِلٰى رَمَضَانَ مُكَفِّرَاتٌ مَا بَيْنَهُنَّ إِذَا اجْتُنِبَتِ الْكَبَائِرُ»[2]

''پانچ نمازیں اور جمعہ سے لے کر جمعہ تک اور رمضان سے لے کر رمضان تک اپنے مابین کے گناہوں کا کفارہ ہیں، جب تک کہ کسی کبیرہ گناہ کا ارتکاب نہ کیا گیا ہو (یعنی کبیرہ گناہ توبہ صادقہ کے بغیر معاف نہیں ہوتا)۔''

حدیث نمبر ⑫:

اسی بات کو ایک حدیث میں نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بڑی عمدہ مثال دے کر سمجھایا ہے، چنانچہ صحیح بخاری و مسلم میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، جو سنن ترمذی و نسائی اور مسند احمد میں بھی ہے کہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

«أَرَأَيْتُمْ لَوْ أَنَّ نَهْراً بِبَابِ أَحَدِكُمْ يَغْتَسِلُ فِيهِ كُلَّ يَوْمٍ خَمْسَ مَرَّاتٍ، هَلْ يَبْقٰى مِنْ دَرَنِهٖ شَيْئٌ؟»

''کیا خیال ہے کہ اگر کسی کے گھر کے دروازے پر نہر بہہ رہی ہو، وہ اس میں روزانہ پانچ

---

[1] صحيح الجامع (١/ ٢/ ٧٨) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (١٣٩٨)

[2] الفتح الرباني (٢/ ١٩٩) مشكاة المصابيح (١/ ١٧٩) صحيح الجامع (٢/ ٣/ ٣٦٦) مختصر صحيح مسلم للمنذري، رقم الحديث (٢٠٣) صحيح سنن الترمذي، رقم الحديث (١٧٧)

مرتبہ غسل کرتا ہوں، کیا اس کے جسم پر کوئی میل کچیل رہ جائے گی؟''

صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے جواب دیا: ''لَا يَبْقٰى مِنْ دَرَنِهٖ شَيْئٌ'' ''اس پر میل نامی کوئی چیز نہیں رہے گی۔'' تب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«فَكَذٰلِكَ مَثَلُ الصَّلَوَاتِ الْخَمْسِ، يَمْحُو اللّٰهُ بِهِنَّ الْخَطَايَا» [1]

''یہی مثال ان پانچ نمازوں کی ہے، ان سے اللہ تعالیٰ گناہوں کے میل کچیل کو محو کر دیتا ہے۔''

حدیث نمبر ⑬:

طبرانی کبیر اور مسند احمد میں حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ سے مروی ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے:

«إِنَّ كُلَّ صَلَاةٍ تَحُطُّ مَا بَيْنَ يَدَيْهَا مِنْ خَطِيْئَةٍ» [2]

''بے شک ہر نماز اپنے سے پہلے کیے گئے (صغیرہ) گناہوں کو مٹا دیتی ہے۔''

حدیث نمبر ⑭:

نمازوں کے گناہوں کا کفارہ ہونے کا ذکر صحیح مسلم، مسند احمد اور دیگر کتبِ حدیث میں حضرت عثمانِ غنی رضی اللہ عنہ سے مروی ایک ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں یوں بھی آیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«مَا مِنْ مُّسْلِمٍ يَتَطَهَّرُ فَيُتِمُّ الطَّهَارَةَ الَّتِي كَتَبَ اللّٰهُ عَلَيْهِ فَيُصَلِّيْ هٰذِهِ الصَّلَوَاتِ الْخَمْسَ إِلَّا كَانَتْ كَفَّارَةً لِّمَا بَيْنَهَا» [3]

''کوئی مسلمان جب اچھی طرح وضو کرے اور پھر پنج گانہ نمازیں ادا کرے تو یہ ان کے مابین کیے گئے گناہوں کا کفارہ بن جاتی ہیں۔''

---

[1] الفتح الرباني (٢/ ٢٠٢) مشكاة المصابيح (١/ ١٧٩) مختصر الترغيب (ص: ٢٧) وقال: أخرجه ابن ماجه من حديث عثمان، و مسلم أيضاً من حديث جابر بنحوه، صحيح البخاري مع الفتح، رقم الحديث (٥٢٨) صحيح مسلم مع شرح النووي (٣/ ٥/ ١٧٠) صحيح سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٣٠١) صحيح سنن النسائي، رقم الحديث (٤٤٨) صحيح الترغيب، رقم الحديث (٣٦٠)

[2] صحيح الجامع (١/ ٢/ ٢٢٦) الفتح الرباني (٢/ ٢٠٤) صحيح الترغيب، رقم الحديث (٣٦١)

[3] الترغيب والترهيب للمنذري (١/ ٢٠٠) والفتح الرباني (٢/ ٢٠٢) و مسلم مع النووي (٢/ ٣/ ١١٥)

حدیث نمبر ⑮:

صحیح بخاری و مسلم اور مسند احمد میں حضرت عثمانِ غنی رضی اللہ عنہ سے مروی ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے:

«لَا یَتَوَضَّأُ رَجُلٌ فَیُحْسِنُ وُضُوءَہٗ، ثُمَّ یُصَلِّي الصَّلَاۃَ إِلَّا غَفَرَ اللّٰہُ لَہٗ مَا بَیْنَھَا وَبَیْنَ الصَّلَاۃِ الَّتِي تَلِیْھَا»[1]

''جب کوئی شخص خوب اچھی طرح وضو کر کے نماز پڑھے تو اللہ تعالیٰ اس نماز اور اس سے ملنے والی دوسری نماز کے مابین والے تمام گناہ معاف کر دیتا ہے۔''[2]

حدیث نمبر ⑯:

گناہوں کا کفّارہ ہونے کے سلسلے میں ایک حدیث صحیح بخاری و مسلم میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما سے مروی ہے، جس میں وہ ایک واقعہ بیان کرتے ہیں:

''إِنَّ رَجَلًا أَصَابَ مِنِ امْرَأَۃٍ قُبْلَۃً'' ''ایک آدمی نے کسی غیر عورت کا بوسہ لے لیا۔''

یہ تو صحیح بخاری کے الفاظ ہیں، جب کہ صحیح مسلم اور سُنن میں ہے کہ ایک آدمی نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور (اپنی غلطی کا اعتراف کرتے ہوئے) اس نے کہا: اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم!

''إِنِّي وَجَدْتُ امْرَأَۃً فِي بُسْتَانٍ، فَعَلْتُ بِھَا کُلَّ شَيْئٍ غَیْرَ أَنِّي لَمْ أُجَامِعْھَا، قَبَّلْتُھَا وَلَزِمْتُھَا''

''مجھے باغ میں ایک عورت مل گئی۔ میں نے اس سے سب کچھ کیا سوائے اس کے کہ جماع نہیں کیا، بوس و کنار کیا (اب آپ صلی اللہ علیہ وسلم مجھے جو سزا چاہیں دے لیں)۔''

تب نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر سورت ہود کی یہ آیت نازل ہوئی، جس میں ارشادِ الٰہی ہے:

﴿وَ اَقِمِ الصَّلٰوۃَ طَرَفَیِ النَّھَارِ وَ زُلَفًا مِّنَ الَّیْلِ اِنَّ الْحَسَنٰتِ یُذْھِبْنَ

---

[1] صحیح الجامع (٣/ ٦/ ٢٢٦) الفتح الرباني (٢/ ٢٠١) صحیح الترغیب، رقم الحدیث (٣٦٠) صحیح البخاري مع الفتح، رقم الحدیث (١٢٠) صحیح مسلم مع شرح النووي (٢/ ٣/ ١١٢) شرح السنۃ للبغوي، رقم الحدیث (١٠٣)

[2] صحیح الجامع (٣/ ٦/ ٢١٥) الفتح الرباني (٢/ ٢٠١) صحیح الترغیب، رقم الحدیث (٣٦٠) صحیح البخاري مع الفتح، رقم الحدیث (١٦٠) صحیح مسلم مع شرح النووي (٢/ ٣/ ١١٢) شرح السنۃ للبغوي، رقم الحدیث (١٥٣) الاحسان، رقم الحدیث (١٠٤١)

السَّيِّاٰتِ ذٰلِكَ ذِكْرٰى لِلذّٰكِرِيْنَ﴾ [هود: ١١٤]

''اور دن کے دونوں کناروں (صبح وشام) اور کچھ رات گزرنے پر نماز قائم کرو، یقین کرو کہ نیکیاں برائیوں کوختم کر دیتی ہیں، یہ یاد دہانی ہے اللہ کو یاد رکھنے والوں کے لیے۔''

(اس آدمی نے سمجھا کہ نمازوں سے گناہوں کے کفارے کی یہ رعایت شاید صرف میرے لیے ہے، چنانچہ اس نے پوچھا:

''أَلِيْ هٰذَا؟'' (کیا یہ صرف میرے لیے ہی ہے؟)

تو نبیِ اکرم ﷺ نے فرمایا: (صرف تمھارے لیے ہی نہیں بلکہ)

«لِمَنْ عَمِلَ بِهَا مِنْ أُمَّتِيْ»[1]

''میری امت کے ہر اس شخص کے لیے ہے، جو اس پر عمل کرے گا۔''

اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ نمازوں سے صغیرہ گناہ معاف ہوجاتے ہیں، البتہ کبیرہ گناہوں کے لیے توبہ کے سوا کوئی چارہ نہیں، جیسا کہ جمہور اہلِ علم کا کہنا ہے۔[2]

حدیث نمبر ⑰:

فرضی نمازیں ادا کرنے والوں کو غافلوں میں شمار نہیں کیا جاتا، اگرچہ وہ راتوں کے نفلی قیام اور نفلی روزے وغیرہ بھی نہ رکھتے ہوں، کیوں کہ مستدرکِ حاکم میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ارشادِ نبوی ﷺ ہے:

«مَنْ حَافَظَ عَلٰى هٰؤُلَآءِ الصَّلَوَاتِ الْمَكْتُوْبَاتِ لَمْ يُكْتَبْ مِنَ الْغَافِلِيْنَ، وَمَنْ قَرَأَ فِيْ لَيْلَةٍ مِائَةَ آيَةٍ كُتِبَ مِنَ الْقَانِتِيْنَ»[3]

''جو شخص فرض نمازوں کی پابندی کرے تو وہ غافلین میں نہیں لکھا جاتا اور جو شخص رات کو (قرآنِ کریم) کی سو آیات پڑھ لے، اس کا شمار قانتین میں ہوجاتا ہے۔''

حدیث نمبر ⑱:

صحیح ابن خزیمہ و ابن حبان اور مسند بزار میں حضرت عمر بن مرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک

---

[1] صحيح البخاري مع الفتح (٢/ ٨، ٨/ ٣٥٥۔ ٣٥٧) مختصر صحيح مسلم للمنذري، رقم الحديث (٢١٤٣)

[2] فتح الباري (٨/ ٥٧)

[3] الصلاة للكليب (ص: ٢٠٢، من المجموعة) قال الحاكم: على شرط الشيخين وصححه الذهبي والألباني.

آدمی نبیِ اکرم ﷺ کے پاس آیا اور کہنے لگا: اے اللہ کے رسول اللہ ﷺ!

"أَرَأَيْتَ إِنْ شَهِدْتُّ أَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ، وَأَنَّكَ رَسُوْلُ اللّٰهِ، وَصَلَّيْتُ الصَّلَوَاتِ الْخَمْسَ، وَأَدَّيْتُ الزَّكَاةَ، وَصُمْتُ رَمَضَانَ، وَقُمْتُهُ فَمِمَّنْ أَنَا؟"

''اگر میں اس بات کی شہادت دوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبودِ برحق نہیں اور آپ ﷺ اللہ کے سچے رسول ہیں اور پانچوں نمازیں پڑھوں اور زکات ادا کروں اور رمضان المبارک کے دِنوں کو روزہ رکھوں اور راتوں کو قیام کروں تو میں کن لوگوں میں سے ہوگا۔''

تو آپ ﷺ نے فرمایا:

﴿مِنَ الصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ﴾[1] ''تمھارا شمار صدّیقین اور شہدا میں ہوگا۔''

حدیث نمبر ⑲:

ایک حدیث میں نبیِ اکرم ﷺ نے جن اعمال کو دخولِ جنت کا ذریعہ بتایا ہے، انھی میں سے ایک یہ نماز بھی ہے، چنانچہ صحیح بخاری و مسلم میں میزبانِ رسول اللہ ﷺ حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک آدمی نے نبیِ اکرم ﷺ سے پوچھا:

"أَخْبِرْنِيْ بِعَمَلٍ يُّدْخِلُنِيَ الْجَنَّةَ"

''مجھے ایسا عمل بتائیں، جس سے میں جنت میں داخل ہو جاؤں۔''

تو آپ ﷺ نے فرمایا:

﴿تَعْبُدُ اللّٰهَ لَا تُشْرِكُ بِهٖ شَيْئًا، وَتُقِيْمُ الصَّلَاةَ وَتُؤَدِّي الزَّكَاةَ، وَتَصِلُ الرَّحِمَ﴾[2]

''صرف اللہ کی عبادت کرو، اس کے ساتھ کسی کو شریک مت بناؤ اور نماز قائم کرو، اور زکات ادا کرو، اور صلہ رحمی کرو۔''

حدیث نمبر ⑳:

فضائلِ نماز کے سلسلے میں ایک حدیث سنن ابو داود، مسند احمد، الکامل لابن عدی اور تاریخ دمشق

[1] مختصر الترغیب (ص: ٢٦) و صحیح الترغیب للألباني، رقم الحدیث (٣٥٨) موارد الظمآن، رقم الحدیث (١٩)

[2] دیکھیں: مختصر الترغیب لابن حجر (ص: ٢٧) صحیح الترغیب، رقم الحدیث (٧٤٦) التجرید الصریح (١/ ١/ ١٠٣) صحیح مسلم مع شرح النووي (١/ ١/ ١٧٢، ١٧٣)

لابن عساکر میں حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

«صَلَاۃٌ فِيْ أَثَرِ صَلَاۃٍ، لَا لَغْوَ بَیْنَهُمَا، کِتَابٌ فِيْ عِلِّیِّیْنَ»[1]

''ایک نماز کے بعد دوسری نماز اس حال میں ادا کرنا کہ ان دونوں نمازوں کے مابین کوئی لغو فعل سرزد نہ ہوا ہو، یہ علیین میں لکھے جانے کا سبب ہے۔''

علّیّین اور سجّین:

اس حدیث کو اچھی طرح سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ تیسویں پارے کی سورت مطففین میں مذکور علّیّین اور سجّین نامی دونوں مقامات کے بارے میں علم ہو کہ وہ کیا ہیں؟ یہ معلومات خود اسی سورت میں مذکور ہیں، چنانچہ اس کی آیت (۷ تا ۹) میں ارشادِ الٰہی ہے:

﴿كَلَّآ اِنَّ كِتٰبَ الْفُجَّارِ لَفِيْ سِجِّيْنٍ ۝ وَمَآ اَدْرٰكَ مَا سِجِّيْنٌ ۝ كِتٰبٌ مَّرْقُوْمٌ﴾

ہرگز نہیں، یقیناً بدکاروں کا نامۂ اعمال سجین (قید خانے) کے دفتر میں ہے اور تمھیں کیا معلوم کہ وہ قید خانے یا سجین کا (دفتر) کیا ہے؟ ایک کتاب ہے لکھی ہوئی۔''

معلوم ہوا کہ سجّین وہ مقام ہے، جہاں بدکاروں کے اعمال ناموں کا دفتر ہے، جبکہ علّیّین اس کے برعکس وہ مقام ہے، جہاں اَبرار کے اعمال ناموں کا دفتر ہے، چنانچہ اسی سورت کی آیت (۱۸ تا ۲۱) میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ كَلَّآ اِنَّ كِتٰبَ الْاَبْرَارِ لَفِيْ عِلِّيِّيْنَ ۝ وَمَآ اَدْرٰكَ مَا عِلِّيُّوْنَ ۝ كِتٰبٌ مَّرْقُوْمٌ ۝ يَّشْهَدُهُ الْمُقَرَّبُوْنَ﴾

''یقیناً نیکوکاروں کا نامۂ اعمال علیین میں ہے۔ تمھیں کیا معلوم کہ علّیّین کیا ہے؟ وہ تو ایک کتاب ہے لکھی ہوئی، اس کے پاس مقرب (فرشتے) حاضر ہوتے ہیں۔''

اس سے اگلی آیات میں اَبرار یا نیکوکاروں کو ملنے والی جنت کی نعمتوں میں سے بعض کا ذکر آیا ہے، اس طرح نماز کے فضائل کا اندازہ بہ آسانی ہوجاتا ہے۔

حدیث نمبر ㉑:

جبکہ بعض احادیث میں نماز کو نور، برہان اور قیامت کے دن ذریعہ نجات قرار دیا گیا ہے،

[1] صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (٥٢٢، ١١٤٥) صحيح الجامع، رقم الحديث (٣٨٣٧)

جیسا کہ صحیح مسلم، سنن ترمذی اور مسندِ احمد میں حضرت ابو مالک اشعری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

«اَلطُّهُوْرُ شَطْرُ الْإِيْمَانِ، وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ تَمْلَأُ الْمِيْزَانَ وَسُبْحَانَ اللّٰهِ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ تَمْلَآنِ أَوْ تَمْلَأُ مَا بَيْنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ، وَالصَّلَاةُ نُوْرٌ، وَالصَّدَقَةُ بُرْهَانٌ، وَالصَّبْرُ ضِيَاءٌ، وَالْقُرْآنُ حُجَّةٌ لَكَ أَوْ عَلَيْكَ» [1]

’’طہارت و نظافت نصف ایمان (یا ایمان کا ایک حصہ) ہے۔ الحمدللہ کی تسبیح کرنا ترازو کو نیکیوں سے بھر دیتا ہے۔ سبحان اللہ اور الحمد للہ کی تسبیح کرنے سے زمین اور آسمان اس کی نیکیوں سے بھر جاتے ہیں۔ نماز (نمازی کے لیے) ذریعہ نور ہے، صدقہ و خیرات اور دلیل و برہانِ نجات ہے۔ صبر روشنی ہے (جس سے مصائب و مشکلات کے اندھیرے چھٹ جاتے ہیں) اور قرآن تمھارے حق میں یا تمھارے خلاف حجت ہے۔‘‘

یعنی اگر اس کی تلاوت کرو گے اور اس کے احکام پر عمل کرو گے تو وہ تمھارے حق میں حجت بن جائے گا، اور اگر اس کو پسِ پشت ڈال دو گے تو وہ تمھارے خلاف حجت بن جائے گا۔

اس حدیث میں نماز کو نور قرار دیا گیا ہے، جس کی تائید درجِ ذیل حدیث سے بھی ہوتی ہے:

حدیث نمبر (۲۲):

سنن دارمی، مسندِ احمد، طبرانی اوسط، شعب الایمان بیہقی، طبرانی کبیر اور صحیح ابن حبان میں مروی ہے، جس میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ ایک دن نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز کا ذکر شروع کیا تو اس کے بارے میں فرمایا:

«مَنْ حَافَظَ عَلَيْهَا، كَانَتْ لَهٗ نُوْرًا وَّبُرْهَانًا وَّنَجَاةً يَّوْمَ الْقِيَامَةِ» [2]

’’جس نے اس کی نگہداشت و محافظت کی تو یہ نماز اس کے لیے قیامت کے دن نورِ برہان اور ذریعہ نجات بن جائے گی۔‘‘

---

[1] مختصر صحيح مسلم للمنذري، رقم الحديث (١٢٠) صحيح الجامع (٢/ ٤/ ٢٠، ٢١)

[2] مشكاة المصابيح (١/ ١٨٣) صحيح ابن حبان (٢٥٤) الموارد، وقال المنذري: إسناده جيد، كما في تحقيق المشكوة (١/ ١٨٣) ووثق رجاله الهيثمي، كما في كتاب الصلاة لعبد الملك الكليب (ص: ٢٠٥) من المجموعة، وتحقيق الصلاة لابن قيم (ص: ٤٦) تحقيق صلاة الرسول ﷺ (ص: ١٦١)

حدیث نمبر ۲۳:

سنن نسائی و بیہقی، مسند احمد اور مستدرک حاکم میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے:

«حُبِّبَ إِلَيَّ مِنْ دُنْيَاكُمْ! النِّسَآءُ وَالطِّيْبُ، وَجُعِلَتْ قُرَّةُ عَيْنِي فِي الصَّلَاةِ»[1]

''تمھاری دنیا میں سے میرے نزدیک محبوب ترین دو چیزیں ہیں، عورتیں (بیویاں) اور خوشبو اور میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں ہے۔''

حدیث نمبر ۲۴:

نماز ہی وہ عمل ہے جس کی تاکید نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی حیات طیبہ کے آخری لمحات میں بھی کی تھی، جیسا کہ الادب المفرد سنن ابو داود و ابن ماجہ، مسندِ بزار اور مسندِ احمد میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

«كَانَ آخِرُ كَلَامِ النَّبِيِّ صلی اللہ علیہ وسلم: اَلصَّلَاةَ، اَلصَّلَاةَ، اِتَّقُوا اللّٰهَ فِيْمَا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ»[2]

''نماز کا خیال رکھو! نماز کا خیال رکھو اور غلاموں، کنیزوں کے معاملے میں اللہ سے ڈرتے رہو (یعنی ان پر زیادتی نہ کرو)۔''

حدیث نمبر ۲۵:

نماز کے بارے میں یہ تاکید کیوں نہ ہوتی، جبکہ ایک حدیث میں اسے دینِ اسلام کا ستون قرار دیا گیا ہے، جیسا کہ سنن ترمذی، مسندِ احمد، مسندِ طیالسی، مستدرکِ حاکم اور مصنف عبدالرزاق میں مروی ہے:

«رَأْسُ الْأَمْرِ الْإِسْلَامُ، وَعُمُوْدُهُ الصَّلَاةُ»[3]

''دین کی چوٹی اسلام ہے اور دین کا ستون نماز ہے۔''

---

[1] الفتح الرباني (٢/ ٢٠٦) و صحيح الجامع (٢/ ٣/ ٨٧) صحيح سنن النسائي، رقم الحديث (٣٦٨٠)

[2] الأدب المفرد (١٥٨، طبع أوقاف الأمارات) الفتح الرباني (٢/ ٢٠٨) صحيح الجامع (٢/ ٣/ ١٩٦) صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٢٩٥) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٢٦٩٨) یہی حدیث سنن ابن ماجہ اور مسند احمد میں ام المومنین حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے بھی مروی ہے اور صحیح ابن حبان، سنن ابن ماجہ اور مستدرک حاکم میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے بھی مروی ہے۔ صحيح سنن ابن ماجه (١/ ٢٧، ٢/ ١٠٩) الفتح الرباني (٢/ ٢٠٧، ٢٠٨) صحيح ابن حبان، رقم الحديث (١٢٢٠) الموارد، الإرواء (٧/ ٢٣٧)

[3] المستدرك للحاكم (٣/ ٥٧) سنن الترمذي، رقم الحديث (٢١١٠)

حدیث نمبر ۲۶:

نماز ہی کے ذریعے سے قربِ الٰہی بھی نصیب ہوتا ہے، حتی کہ صحیح بخاری، سنن کبریٰ بیہقی اور حلیۃ الاولیا ابو نعیم میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ایک حدیث قدسی ہے کہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«إِنَّ اللّٰهَ تَعَالٰی يَقُوْلُ: مَنْ عَادٰی لِيْ وَلِيًّا فَقَدْ آذَنْتُهٗ بِالْحَرْبِ، وَمَا تَقَرَّبَ إِلَيَّ عَبْدِيْ بِشَيْئٍ أَحَبُّ إِلَيَّ مِمَّا افْتَرَضْتُهٗ عَلَيْهِ، وَمَا يَزَالُ عَبْدِيْ يَتَقَرَّبُ إِلَيَّ بِالنَّوَافِلِ حَتّٰی أُحِبَّهٗ، فَإِذَا أَحْبَبْتُهٗ كُنْتُ سَمْعَهُ الَّذِيْ يَسْمَعُ بِهٖ، وَبَصَرَهُ الَّذِيْ يُبْصِرُ بِهٖ، وَيَدَهُ الَّذِيْ يَبْطُشُ بِهَا، وَرِجْلَهُ الَّذِيْ يَمْشِيْ بِهَا، وَإِنْ سَأَلَنِيْ لَأُعْطِيَنَّهٗ، وَإِنِ اسْتَعَاذَنِيْ لَأُعِيْذَنَّهٗ وَمَا تَرَدَّدْتُّ عَنْ شَيْئٍ أَنَا فَاعِلُهٗ تَرَدُّدِيْ عَنْ قَبْضِ نَفْسِ الْمُؤْمِنِ يَكْرَهُ الْمَوْتَ، وَأَنَ أَكْرَهُ مَسَاءَتَهٗ»[1]

''میرے اللہ کا ارشاد ہے: جس نے میرے کسی نیک بندے (ولی) کے ساتھ عداوت رکھی، میں اس کے ساتھ اعلانِ جنگ کرتا ہوں۔ میرا بندہ میرا قرب حاصل کرنے کے لیے جو اعمال بجا لاتا ہے، اس میں میرے نزدیک اس سے محبوب عمل کوئی نہیں، جو میں نے اس پر فرض کر دیا ہے۔ میرا بندہ نوافل کے ذریعے سے میرا قرب حاصل کرنے کی تگ و دو میں لگا رہتا ہے، یہاں تک کہ میں اس سے محبت کرنے لگتا ہوں اور جب میں اس کو اپنا محبوب بنا لیتا ہوں تو میں اس کی سماعت بن جاتا ہوں، جس سے وہ سنتا ہے، اس کی بصارت بن جاتا ہوں، جس سے وہ دیکھتا ہے اور اس کا ہاتھ بن جاتا ہوں، جس سے وہ پکڑتا ہے اور اس کا پاؤں بن جاتا ہوں، جس سے وہ چلتا ہے۔ اگر وہ مجھ سے کسی چیز کا سوال کرے تو میں اُسے وہ چیز ضرور دیتا ہوں اور اگر وہ مجھ سے پناہ مانگے تو میں اُسے ضرور پناہ دیتا ہوں۔ میں کبھی کسی کام میں جسے کرنا چاہوں، اتنا متردّد نہیں ہوا، جتنا

[1] بحواله تحقيق صلاة الرسول (ص: ٢٧٢) بحواله صحيح الجامع (١/ ٢/ ١١٧، ١١٨) صحيح البخاري مع الفتح، رقم الحديث (٦٥٠٢) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (١٦٤٠)

کہ اپنے مومن بندے کی جان قبض کرنے پر ہوتا ہوں، وہ موت کو ناپسند کرتا ہے اور مجھ سے اس کی یہ ناپسندیدگی اور تکلیف دیکھی نہیں جاتی۔‘‘

اندازہ فرمائیں کہ بندۂ مومن جو فرضی و نفلی نمازیں ادا کرتا ہے، اس کی سماعت و بصارت اور پکڑ و رفتار سب چیزیں اللہ تعالیٰ کی خاص نگرانی میں آجاتی ہیں اور اس کی برکات کے باعث مومن کے اعضاے جسمانی میں گویا قوتِ الٰہی کام کرنے لگتی ہے۔ اللہ! اللہ! یہ کتنا بڑا شرف ہے! کتنا بڑا مقام ہے! قُربِ الٰہی کی انتہا ہے۔ اَللّٰھُمَّ اجْعَلْنَا مِنْھُمْ.

نماز میں عدمِ پابندی کا انجام

پچھلی سطور میں ہم نے پابندیِ وقت کا موضوع شروع کیا تھا، جسے پہلے قرآنِ کریم کے حوالے سے بیان کیا تھا، جس کے ضمن میں نمازِ وسطیٰ کی تعیین و تفصیل آ گئی تھی، پھر احادیث کی روشنی میں پابندیِ وقت کا ذکر آیا تو اسی ضمن میں فضائلِ نماز بھی قرآن اور سنت کی رُو سے آ گئے تھے۔ اب آیئے دیکھیں کہ نماز میں عدمِ پابندی کی سزا اور عتاب کیا ہے؟ لیکن یہاں یہ بات ذہن میں رکھیں کہ عدمِ پابندی سے مراد یہ نہیں کہ وہ پڑھتا ہی نہیں، کیونکہ ایسا شخص تو تارکِ نماز ہے، جس کا ذکر بعد میں آئے گا اور اس کی سزا و عتاب بھی آگے ذکر کریں گے۔ ان شاء اللہ

عدمِ پابندی سے مراد عدمِ محافظت ہے کہ نمازوں کے اوقات کی پابندی نہ کرنا، بلکہ انھیں بے وقت حسبِ منشا ادا کرنا اور بے پروائی کا مظاہرہ کرنا۔

چونکہ اسلام کے ارکانِ خمسہ سے اقرارِ توحید و رسالت کے بعد بے شمار فضائل و برکات والا عمل اور اہم رکنِ دین نمازِ پنج گانہ ہے، لہٰذا نیند یا بھول وغیرہ کسی شرعی عذر کے بغیر اُسے وقت سے بے وقت کر کے پڑھنا کبیرہ گناہ ہے، جیسا کہ سورۃ المنافقون میں ارشادِ الٰہی ہے:

﴿ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُلْهِكُمْ اَمْوَالُكُمْ وَلَاۤ اَوْلَادُكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴾ [المنافقون: ٩]

''اے ایمان والو! تمھیں تمھارے مال و اولاد ذکرِ الٰہی سے غافل نہ کر دیں اور جو کوئی غفلت کرے گا تو ایسے لوگ ہی (قیامت کے دن) نقصان اُٹھانے والے ہیں۔''

یہاں ذکرِ الٰہی سے مراد عام ذکر نہیں، بلکہ نمازِ پنج گانہ مراد ہے، چنانچہ جلالین میں اس آیت کی تفسیر میں ذکرِ الٰہی سے مراد پانچ نمازیں لکھا ہے۔[1]

اسے رئیس المفسرین امام ابن جریر رحمہ اللہ نے بھی اس آیت کے تحت لکھا ہے کہ کہا گیا ہے:

[1] تفسير الجلالين (ص: ٧٤٤) دار المعرفة بيروت

''ذکر سے یہاں پانچ نمازیں مراد ہیں۔''[1]

علامہ ہیتمی رحمہ اللہ نے اپنی کتاب ''الزواجر عن اقتراف الکبائر'' میں لکھا ہے:

''علمائے تفسیر کی ایک جماعت نے کہا ہے کہ اس آیت میں ذکرِ الٰہی سے مراد پانچ نمازیں ہیں۔''

گویا جو آدمی کاروباری مصروفیات یا بچوں کے کھیل کود میں نمازوں کو بے وقت کر کے پڑھتا ہے، قیامت کے دن وہ خسارہ پانے والا ہوگا۔[2]

تیسویں پارے کی سورۃ الماعون میں تو اللہ تعالیٰ نے بڑی سخت وعید سنائی ہے، چنانچہ ارشادِ الٰہی ہے:

﴿ فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّيْنَ ۝ الَّذِيْنَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ﴾ [الماعون: ٤، ٥]

''ایسے نمازیوں کے لیے ہلاکت ہے، جو اپنی نمازوں سے بے خبر ہیں۔''

اس آیت میں نمازیوں کے لیے جس ''ویل'' (ہلاکت) کا ذکر آیا ہے، اس ''ویل'' کی تشریح کرتے ہوئے امام طبری رحمہ اللہ نے لکھا ہے:

''اَلْوَادِي الَّذِيْ يَسِيْلُ عَنْ صَدِيْدِ أَهْلِ جَهَنَّمَ''[3]

''جہنم کی ایک وادی کا نام ''ویل'' ہے، جو جہنمیوں کے پیپ سے بہتی ہے۔''

''الزواجر'' میں علامہ ہیتمی رحمہ اللہ نے اور انھی سے نقل کرتے ہوئے ''تطهير المجتمعات عن أرجاس الموبقات'' میں علامہ احمد بن حجر آل بوطامی آف قطر نے ''ویل'' کی تشریح یوں کی ہے کہ اس سے شدت عذاب مراد ہے یا پھر یہ بھی کہا گیا ہے:

''وَادٍ فِيْ جَهَنَّمَ لَوْ سُيِّرَ فِيْهِ جِبَالُ الدُّنْيَا لَذَابَتْ مِنْ شِدَّةِ حَرِّهٖ''[4]

''یہ جہنم کی ایک وادی ہے۔ اگر اس میں دنیا کے پہاڑ بھی ڈال دیے جائیں تو اس وادی کی شدتِ حرارت سے وہ پہاڑ بھی پگھل جائیں۔''

اس آیت میں نماز سے بے خبری کا کیا مطلب ہے؟ اس کی وضاحت ملاحظہ کریں۔

---

[1] مختصر تفسير الطبري على المصحف (ص: ٦٣٨) طبع دار الشروق.

[2] الزواجر (١/ ١٣٣)

[3] مختصر تفسير الطبري (ص: ٧٠٤)

[4] تطهير المجتمعات (ص: ٩٠) طبع مصر، الزواجر (١/ ١٣٣)

1 امام جلال الدین سیوطی رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر میں کہا ہے:
"یُؤَخِّرُوْنَهَا عَنْ وَقْتِهَا"[1] (وہ نماز کو اس کے وقت سے مؤخر کر دیتے ہیں)

2 امام ابن جریر طبری رحمہ اللہ نے نمازوں سے بے خبری برتنے والوں ساہون کو لاہون سے تعبیر کیا ہے۔[2] جو لوگ نماز سے کھیل تماشا کرتے ہیں۔ بات یہ بھی پہلے والی ہی ہے کہ اپنی مرضی سے جب چاہے پڑھ لی، پابندیِ وقت کے بجائے نماز کو کھیل بنا لیا۔

3 اور امام ابن کثیر رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے کہ اس بے خبری سے مراد ترکِ نماز نہیں، بلکہ نماز کو ان کے اوقات سے بلا عذر مؤخر کر کے ادا کرنا ہے، کیونکہ اس بات کی تعیین تو خود حدیث میں بھی آئی ہے، جیسا کہ (مسند بزار میں) حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً مروی ہے کہ انھوں نے نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا: ''اپنی نمازوں سے ''بے خبر'' لوگوں سے کون مراد ہیں؟'' تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

﴿هُمُ الَّذِيْنَ يُؤَخِّرُوْنَ الصَّلَاةَ عَنْ وَقْتِهَا﴾[3]

''ان سے وہ لوگ مراد ہیں جو اپنی نماز کو وقت سے مؤخر کر دیتے ہیں۔''

اس حدیث کو مسند بزار کی طرف منسوب کرتے ہوئے علامہ ہیثمی نے اس کی سند کو ضعیف لکھا ہے۔[4]

ایسے ہی "الترغیب و الترھیب" میں امام منذری نے اس حدیث کو ابراہیم کے بیٹے عکرمہ کی روایت سے مسند بزار کی طرف منسوب کیا اور لکھا ہے کہ حفاظِ حدیث نے اس کو موقوفاً ہی روایت کیا ہے۔ امام بزار کے سوا اسے کسی نے بھی مرفوعاً روایت نہیں کیا اور عکرمہ ضعیف ہے۔

گویا یہ تفسیر مرفوعاً ثابت نہ ہوئی، البتہ ایک دوسری موقوف حدیث میں یہی مفہوم ہے، جس کی سند کو بھی علامہ ابن قیم رحمہ اللہ اور علامہ ہیثمی رحمہ اللہ و منذری کی طرف سے حسن قرار دیا گیا ہے، وہ مسند ابی یعلیٰ اور درّ منثور سیوطی (۶/ ۴۰۰) کے مطابق تفسیر ابن جریر، ابن المنذر اور سنن بیہقی میں حضرت مصعب بن سعد رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، جس میں وہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے اپنے والدِ گرامی حضرت

---

[1] تفسير الجلالين (ص: ٨٢٣)

[2] سنن الطبري (ص: ٧٠٤)

[3] مختصر تفسير ابن كثير للرفاعي (٤/ ٤٣١)

[4] الزواجر (١/ ١٣٣) مجمع الزوائد (٧/ ١٤٣)

سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

''وہ لوگ جو اپنی نمازوں سے بے خبر ہیں (ان کے لیے ویل ہے) کون ہے جو سہو کا شکار نہیں ہوتا اور وہ کون ہے جو دورانِ نماز خیالات میں مبتلا نہیں ہوتا؟''

تو انھوں نے فرمایا:

''لَيْسَ ذَاكَ، إِنَّمَا هُوَ إِضَاعَةُ الْوَقْتِ''[1]

''ایسا تو نہیں، بلکہ اس سے مراد نمازوں کے اوقات کو ضائع کرنا ہے۔''

ان دونوں حدیثوں اور تفصیل سے معلوم ہوا کہ نماز کو اس کے وقت سے بے وقت کر کے ادا کرنا کبیرہ گناہ ہے اور ایسا کرنے والوں کو جہنم کی اس وادی میں گرایا جائے گا، جس کے عذاب کی شدت کا یہ عالم ہوگا کہ پہاڑوں کے پتھر بھی پگھل جائیں گے۔ أَعَاذَنَا اللّٰهُ مِنْهُ. آمِيْن

نماز کے لیے پابندیِ وقت کی پروا نہ کرنے والوں کو سخت عذاب ہوگا، جیسا کہ سورت مریم میں اللہ تعالیٰ نے پہلے انبیاے کرام علیہم السلام اور دوسرے سعادت مند لوگوں کا ذکر کیا اور پھر ارشاد فرمایا ہے:

﴿ فَخَلَفَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ اَضَاعُوا الصَّلٰوةَ وَ اتَّبَعُوا الشَّهَوٰتِ فَسَوْفَ يَلْقَوْنَ غَيًّا ۝ اِلَّا مَنْ تَابَ وَ اٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَاُولٰٓئِكَ يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ وَلَا يُظْلَمُوْنَ شَيْئًا ﴾ [مريم: ٥٩]

''پھر ایسے ناخلف لوگ ان کے جانشین بنے، جنھوں نے نماز کو ضائع کیا اور نفسانی خواہشات کی پیروی کی، پس قریب ہے کہ وہ غی یا گمراہی کے انجام سے دو چار ہوں گے، سوائے ان لوگوں کے جو تائب ہوگئے اور ایمان لائے اور اچھے عمل کیے، وہ لوگ جنت میں داخل ہوں گے اور ان کی ذرہ برابر حق تلفی نہ ہوگی۔''

یہاں نماز کو ضائع کرنے سے کلی طور پر نماز ترک کرنے کی رائے کو صرف امام ابن جریر طبری رحمہ اللہ نے اختیار کیا ہے، جبکہ صحابہ میں سے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

''لَيْسَ مَعْنٰى أَضَاعُوْهَا: تَرَكُوْهَا بِالْكُلِيَّةِ، وَلٰكِنْ أَخَّرُوْهَا عَنْ أَوْقَاتِهَا''[2]

---

[1] الصلاة لابن قيم (ص: ٣٩) المكتب الإسلامي مجموعة رسائل الصلاة (ص: ٢٠٥) الزواجر و الترغيب أيضاً

[2] الزواجر (١/ ١٣٣)

''نماز کو ضائع کرنے کا معنیٰ ان کا اسے بالکلیہ ترک کرنا نہیں بلکہ انھیں ان کے اوقات سے مؤخر کرنا مراد ہے۔''

حضرت عمر بن عبدالعزیز، امام اوزاعی اور مسروق رحمہم اللہ نے بھی ضائع کرنے کا مطلب انھیں بے وقت کر کے پڑھنا ہی بیان کیا ہے۔[1]

امام التابعین حضرت سعید بن مسیّب رحمہ اللہ نے نمازوں کو ضائع کرنے کا مطلب بیان کرتے ہوئے فرمایا ہے:

''هُوَ أَنْ لَّا يُصَلِّيَ الظُّهْرَ حَتّٰى تَأْتِيَ الْعَصْرُ، وَلَا يُصَلِّيَ الْعَصْرَ إِلَى الْمَغْرِبِ، وَلَا يُصَلِّيَ الْمَغْرِبَ إِلَى الْعِشَاءِ وَلَا يُصَلِّيَ الْعِشَاءَ إِلَى الْفَجْرِ وَلَا يُصَلِّيَ الْفَجْرَ إِلٰى طُلُوْعِ الشَّمْسِ''[2]

''نمازوں کو ضائع کرنا یہ ہے کہ کوئی شخص نمازِ ظہر کو اس وقت تک نہ پڑھے، جب تک نمازِ عصر کا وقت نہ ہو جائے اور مغرب ہو جانے تک عصر کی نماز نہ پڑھے اور عشا ہو جانے تک مغرب ادا نہ کرے اور فجر ہونے تک عشا کی نماز ادا نہ کرے اور سورج نکلنے تک فجر کی نماز نہ پڑھے۔''

ان اقوالِ صحابہ و تابعین سے معلوم ہوا کہ نماز کو ضائع کرنے سے مراد انھیں وقت سے بے وقت کر کے پڑھنا اور ان کو ادا کرنے میں عدمِ پابندی برتنا ہے۔ جو شخص اسی حالت پر قائم رہے اور توبہ نہ کرے، اُسے اللہ تعالیٰ نے غی میں ڈالنے کی وعید سنائی ہے۔

غیّ:

یہ ''غيّ'' کیا ہے؟ اس کی وضاحت ''الزواجر عن اقتراف الکبائر'' میں یوں ہے:

''هُوَ وَادٍ فِيْ جَهَنَّمَ، بَعِيْدٌ قَعْرُهٗ وَشَدِيْدٌ عِقَابُهٗ''[3]

''یہ جہنم کی ایک وادی ہے جو بہت گہری اور سخت عذاب والی ہے۔''

سعودی دار الافتاء سے شائع کردہ احکامِ نماز کے کتابچوں اور رسائل پر مشتمل مجموعے (ص: ۲۰۴)

---

[1] مختصر تفسیر ابن کثیر الرفاعي (۲/ ۶۱۸)

[2] الزواجر (۱/ ۱۳۳)

[3] الزواجر (۱/ ۱۳۳)

میں شیخ عبدالملک علی الکلیب نے اپنے رسالہ ''الصلاۃ'' کے حاشیے میں غالباً علامہ ابن قیم رحمہ اللہ سے نقل کرتے ہوئے ''غيّ'' کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے:

''أَيُ شَرّاً وَّخُسُرَاناً وَقِيُلَ: هُوَ وَادٍ فِيُ جَهَنَّمَ بَعِيُدُ الْقَعُرِ مِنُ قَيُحٍ وَّدَمٍ''[1]

یعنی غیّ کا معنیٰ شرّ اور نقصان ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ غیّ جہنم کی ایک وادی کا نام ہے، جو انتہائی گہری، خون اور پیپ سے بھری ہوئی ہے۔

علامہ ابن قیم رحمہ اللہ نے اپنی کتاب ''الصلاۃ'' میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے غیّ کا معنیٰ یہ نقل کیا ہے:

''وَهُوَ نَهُرٌ فِيُ جَهَنَّمَ، خَبِيُثُ الطَّعُمِ، بَعِيُدُ الْقَعُرِ''[2]

''غیّ جہنم کی ایک نہر کا نام ہے، جو بڑی ہی بدمزہ اور گہری ہے۔''

اسی سلسلے میں ایک حدیث وہ بھی ہے، جسے امام سیوطی رحمہ اللہ نے ''الدر المنثور'' (٤/ ٢٧٨) میں تفسیر ابن جریر طبری، ابن مردویہ اور البعث للبیہقی کی طرف منسوب کیا ہے، جس میں حضرت ابو امامہ باہلی رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً مروی ہے کہ جہنم کے کنارے سے اگر ایک پتھر کو اس میں گرایا جائے تو وہ ستر سال تک بھی غیّ اور آثام تک نہیں پہنچ پاتا اور جب پوچھا گیا کہ غیّ اور آثام کیا ہے تو جواب ملا:

''بِئُرَانِ فِيُ أَسُفَلِ جَهَنَّمَ، يَسِيُلُ فِيُهِمَا صَدِيُدُ أَهُلِ جَهَنَّمَ''[3]

''دوزخ کی اتھاہ گہرائی میں یہ دو کنویں ہیں، جن میں اہلِ جہنم کی پیپ چلتی ہے۔''

اس حدیث کو امام ابن کثیر رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر میں تفسیر ابن جریر رحمہ اللہ سے نقل کیا اور کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے اور اس کا مرفوعاً بیان ہونا منکر ہے۔[4]

علامہ ہیثمی رحمہ اللہ نے ''مجمع الزوائد'' (١٠/ ٣٨٩) میں کہا ہے کہ یہ حدیث طبرانی نے روایت کی ہے، اس کے کئی رواۃ ضعیف ہیں، جنھیں ابن حبان رحمہ اللہ نے ثقہ کہا ہے، البتہ کہا ہے کہ وہ خطا کر جاتے ہیں۔ امام منذری رحمہ اللہ نے ''الترغیب'' (٤/ ٢٧٢) میں کہا ہے کہ اس حدیث کو طبرانی و بیہقی نے مرفوعاً

---

[1] حوالہ بالا و الصلاۃ لابن القیم (ص: ٤١)

[2] کتاب الصلاۃ لابن القیم (ص: ٤٠)

[3] کتاب الصلاۃ لابن قیم (ص: ٤١)

[4] تفسیر ابن کثیر (٣/ ١٢٨)

بیان کیا ہے، جبکہ دوسرے محدّثین نے اسے ابوامامہ رضی اللہ عنہ پر موقوفاً بیان کیا ہے اور یہی زیادہ صحیح ہے۔[1]

ایک اور حدیث میں بھی پابندیِ وقت کا ثواب اور بے پروائی و عدمِ پابندی کا عتاب وارد ہوا ہے، چنانچہ صحیح ابن حبان، سنن دارمی، مسندِ احمد، معجم طبرانی کبیر و اوسط اور شعب الایمان بیہقی میں حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ ایک دن نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز کا ذکر شروع کیا اور فرمایا:

«مَنْ حَافَظَ عَلَيْهَا كَانَتْ لَهٗ نُوراً وَّ بُرْهَاناً وَّنَجَاةً يَّوْمَ الْقِيَامَةِ، وَمَنْ لَّمْ يُحَافِظْ عَلَيْهَا، لَمْ تَكُنْ لَّهٗ نُوْرٌ وَّلَا بُرْهَانٌ وَّلَا نَجَاةٌ، وَكَانَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ مَعَ قَارُوْنَ وَفِرْعَوْنَ وَهَامَانَ وَأُبَيِّ بْنِ خَلَفٍ»[2]

''جس نے اس پر پابندی کی، اس کے لیے قیامت کے دن یہ نورِ برہان، دلیلِ خیر اور ذریعۂ نجات بن جائے گی، اور جس نے اس پر پابندی نہ کی تو اس کے لیے یہ نور ہوگی، نہ برہان اور نہ ذریعۂ نجات ہی اور قیامت کے دن اس کا حشر قارون، فرعون، ہامان اور ابیّ بن خلف کے ساتھ ہوگا۔''

نماز کی پابندی نہ کرنے والے شخص کا حشر ان بدنامِ زمانہ لوگوں کے ساتھ کیوں ہوگا؟ اس کی یہ حکمت بھی بعض اہل علم نے بیان کی ہے، چنانچہ علامہ ہیتمی رحمہ اللہ نے ''الزواجر'' (۱/ ۱۳۳) میں کسی کا نام لیے بغیر بعض علما کے حوالہ سے، اور دَور حاضر کے معروف عالمِ دین سید سابق نے ''فقه السنة'' (۱/ ۱۹۳) میں علامہ ابن قیم رحمہ اللہ کی طرف منسوب کرتے ہوئے وہ حکمت ذکر کی ہے کہ ان چار (بدنامِ زمانہ) اشخاص کے ناموں کو خاص طور پر ذکر کرنے کی وجہ یہ ہے کہ یہ چاروں کفار کے سردار ہیں اوران کے ذکر کو مخصوص کرنے میں ایک بدیع نقطہ بھی ہے اور وہ یہ کہ نماز پر محافظت و پابندی نہ کرنے کا سبب یا تو کسی کا مال ہوسکتا ہے، یا پھر حکومت یا کسی کی کرسیٔ وزارت و ملازمت علیا یا پھر تجارت۔

اور اگر کسی کو اس کے مال کے غرور نے نماز پر پابندی سے روک لیا تو اس کا حشر و انجام (بڑے بڑے خزانوں کے مالک) قارون کے ساتھ ہوگا اور اگر کسی کو اس کی حکومت نے عدمِ پابندی پر برانگیختہ کیا تو اس کا انجام (اپنے وقت کے بہت بڑے حاکم) فرعون کے ساتھ ہوگا اور اگر کسی

[1] تحقيق الصلاة لابن القيم.

[2] موارد الظمآن (٢٥٤)

کو اس کی وزارت (و ملازمتِ علیا) نے نماز پر پابندی سے باز رکھا تو اس کا انجام (فرعون کے وزیر و افسرِ اعلیٰ) ہامان کے ساتھ ہوگا اور اگر کسی کو اس کی وسیع تجارت و بزنس یعنی کھلے کاروبار نے نماز کی پابندی نہ کرنے دی تو اس کا حشر (کفارِ مکہ کے بڑے تاجر) ابیّ بن خلف کے ساتھ ہوگا۔[1]

[1] کتاب الصلاۃ لابن قیم (ص: ٤٦، ٤٧)

ترکِ نماز کا انجام
قرآنِ کریم کی روشنی میں

یہ بات تو بالکل واضح ہے کہ یہ وعیدیں ان لوگوں کے لیے ہیں، جو نماز کے بالکلیہ تارک نہیں، بلکہ نماز کے بارے میں بے پروائی اور عدمِ پابندی کا ارتکاب کرتے اور اسے وقت سے بے وقت کر کے ادا کرتے ہیں۔

اب رہا معاملہ نماز کے بالکلیہ تارک کا تو وہ قرآن و سنت کی نصوصِ صحیحہ کی رُو سے بہت ہی خطرناک ہے اور اس کا انجام انتہائی خوفناک ہے، چونکہ نماز جیسی اہم عبادت کے سلسلے میں آج کل بہت سستی بلکہ مجرمانہ تغافل کا رویہ اپنایا جا رہا ہے بلکہ نوجوان نسل تو انتہائی غفلت کا شکار ہے۔ کسی بھی قسم کی مصروفیت نہ ہونے کے باوجود اَذان سن کر بھی وہ ہوٹلوں میں بیٹھے خور و نوش اور ٹی وی اور فلم بینی وغیرہ میں مگن رہتے ہیں یا پھر گھروں، حویلیوں اور ڈیروں میں تاش، کیرم یا دوسرے کھیل کھیلنے میں وقت ضائع کر دیتے ہیں، یا ایسے ہی دوسرے سہل انگاری وتن آسانی کے مظاہرے کرتے ہیں، یا پھر اپنے کاروبار میں مشغول رہتے ہیں، لیکن نماز کے لیے مسجد جاتے ہیں نہ مصلیٰ بچھاتے ہیں۔ ایسے تمام لوگوں کی خدمت میں چند قرآنی آیات اور احادیثِ نبویہ پیش کرتے ہیں، تاکہ انھیں اپنا اور اپنے جیسے دوسرے تارکینِ نماز کا انجام معلوم ہو سکے۔ تو آیئے اس سلسلے میں پہلے بعض قرآنی آیات کا مطالعہ کریں، چنانچہ سورۃ المدثر میں ارشادِ الٰہی ہے:

1 ﴿ كُلُّ نَفْسٍۭ بِمَا كَسَبَتْ رَهِيْنَةٌ ۝ اِلَّآ اَصْحٰبَ الْيَمِيْنِ ۝ فِيْ جَنّٰتٍ يَتَسَآءَلُوْنَ ۝ عَنِ الْمُجْرِمِيْنَ ۝ مَا سَلَكَكُمْ فِيْ سَقَرَ ۝ قَالُوْا لَمْ نَكُ مِنَ الْمُصَلِّيْنَ ۝ وَلَمْ نَكُ نُطْعِمُ الْمِسْكِيْنَ ۝ وَكُنَّا نَخُوْضُ مَعَ الْخَآئِضِيْنَ ۝ وَكُنَّا نُكَذِّبُ بِيَوْمِ الدِّيْنِ ۝ حَتّٰىٓ اَتٰىنَا الْيَقِيْنُ ﴾

[المدثر: ۳۸ تا ۴۷]

''ہر شخص اپنے (برے) کاموں کی پاداش میں گرفتار ہے، سوائے دائیں ہاتھ والوں کے (یعنی جو دائیں ہاتھ میں نامۂ اعمال دیے جائیں گے) وہ جنت میں ہوں گے اور سوال کرتے ہوں گے گناہگاروں سے: تمھیں دوزخ میں کیا چیز لے گئی؟ وہ کہیں گے کہ ہم نماز نہیں پڑھتے تھے اور ہم محتاج اور فقیر کو کھانا نہیں کھلاتے تھے اور بیہودہ بکنے والوں کے ساتھ ہم بھی شریک ہوجاتے تھے اور قیامت کے دن کو ہم جھوٹ سمجھتے تھے، یہاں تک کہ موت ہم پر آن پہنچی۔''

ان آیات میں مجرمین کے جہنم میں جانے کے اسباب کا ذکر ہوا ہے جن میں سب سے پہلا سبب ہی یہ مذکور ہے کہ ہم نماز نہیں پڑھا کرتے تھے۔ یہاں تو بے نماز کا انجام بتایا گیا ہے، جبکہ انتیسویں پارے کی سورۃ المرسلات میں فرمایا:

﴿كُلُوْا وَتَمَتَّعُوْا قَلِيْلًا اِنَّكُمْ مُّجْرِمُوْنَ ۝ وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ﴾

[المرسلات: ٤٦، ٤٧]

''تم دنیا میں کچھ کھا پی لو اور تھوڑا سا مزہ اٹھا لو، تم مجرم و گناہ گار ہو، اس دن جھٹلانے والوں کے لیے ویل وخرابی ہوگی۔''

آیت (۴۸ اور ۴۹) میں فرمایا:

2 ﴿وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ ارْكَعُوْا لَا يَرْكَعُوْنَ ۝ وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ﴾

[المرسلات: ٤٨، ٤٩]

''اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ (نماز کے لیے) جھکو تو نہیں جھکتے (یعنی نماز نہیں پڑھتے) اس دن جھٹلانے والوں کے لیے ویل وخرابی ہوگی۔''

یہاں نماز کے لیے بلائے جانے کے باوجود نماز نہ پڑھنے پر انھیں ویل وخرابی کی یہ وعید سنائی گئی ہے۔ علامہ ابن قیم رحمہ اللہ اپنے رسالہ ''الصلاۃ'' میں لکھتے ہیں کہ یہاں یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ وعید جھٹلانے پر ہے، بلکہ درحقیقت اللہ تعالیٰ نے ان کے ترکِ نماز کا ذکر فرمایا ہے، تو یہ وعید بھی تارکِ نماز پر ہی واقع ہوئی ہے۔[1]

سورۃ التوبہ میں مشرکین کی کارستانیوں کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا ہے:

[1] الصلاۃ و حکم تارکھا (ص: ٤٣، طبع المکتب الإسلامي)

3 ﴿فَاِنْ تَابُوْا وَ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَاِخْوَانُكُمْ فِي الدِّيْنِ﴾

[التوبۃ: ۱۱]

''پھر اگر یہ لوگ (شرک و کفر اور عہد شکنی سے) توبہ کر لیں اور نماز قائم کریں اور زکات ادا کریں تو یہ تمھارے دینی بھائی ہیں۔''

یہاں اللہ تعالیٰ نے مومنوں کے ساتھ ان کی اخوت اور بھائی چارگی کو نماز کے ساتھ معلق کر دیا ہے، گویا اگر وہ نماز نہ پڑھیں گے تو وہ مومنوں کے بھائی نہیں ہوں گے اور نہ مومن ہی ہوں گے، کیونکہ مومنوں کے بھائی تو صرف مومن ہی ہو سکتے ہیں، جیسا کہ سورۃ الحجرات میں ارشادِ الٰہی ہے:

﴿ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ﴾ [الحجرات: ۱۰] ''مومن آپس میں بھائی بھائی ہیں۔''

اس آیت اور سورۃ التوبہ والی آیت کے مجموعی مفہوم سے معلوم ہوا کہ جو شخص تارکِ نماز ہو، اس کا دین اسلام اور (اسلامی برادری سے کوئی تعلق نہیں)۔ والعیاذ باللہ

سورۃ الروم میں تو نماز نہ پڑھنے والوں کو مشرک کہا گیا ہے، چنانچہ ارشادِ الٰہی ہے:

4 ﴿مُنِيْبِيْنَ اِلَيْهِ وَاتَّقُوْهُ وَ اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَلَا تَكُوْنُوْا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ﴾

[الروم: ۳۱]

''اسی (ایک اللہ) کی طرف رجوع کرو اور اس سے ڈرتے رہو اور درستی سے نماز ادا کرتے رہو اور شرک کرنے والوں میں سے نہ ہو جاؤ۔''

یہاں عدمِ رجوع الی اللہ اور ترکِ تقویٰ اور ترکِ نماز کو مشرکین کا شیوہ قرار دیا گیا ہے۔

ترکِ نماز کا انجام
حدیث شریف کے آئینے میں

قرآنی آیات کی طرح نبیِ اکرم ﷺ کے کثرت سے ایسے ارشادات بھی مروی ہیں، جن میں نماز نہ پڑھنے والوں کو سخت وعید سنائی گئی ہے اوران کا انجام بتایا گیا ہے، مثلاً:

① صحیح مسلم، سنن ابو داود، ابن ماجہ، ترمذی اور مسندِ احمد میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبیِ اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

«بَيْنَ الرَّجُلِ وَبَيْنَ الْكُفْرِ، تَرْكُ الصَّلَاةِ»[1]

''بندۂ مومن اور کفر کے مابین ترکِ نماز (کا فرق) ہے۔''

صحیح مسلم کے الفاظ ہیں:

«بَيْنَ الرَّجُلِ وَبَيْنَ الشِّرْكِ وَالْكُفْرِ، تَرْكُ الصَّلَاةِ»[2]

''بندۂ مومن اور شرک و کفر کے مابین حد فاصل ترکِ نماز ہے۔''

② ایسے ہی سنن اربعہ، صحیح ابن حبان، مستدرکِ حاکم اور مسندِ احمد میں حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے نبیِ اکرم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا:

«اَلْعَهْدُ الَّذِي بَيْنَنَا وَبَيْنَهُمْ، اَلصَّلَاةَ، فَمَنْ تَرَكَهَا فَقَدْ كَفَرَ»[3]

---

[1] الصلاة وتحقيقه (ص: ٤٦) المنتقىٰ مع النيل (١/ ١/ ٢٩١) صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٩١٢) صحيح سنن الترمذي، رقم الحديث (٢١١٢) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٠٧٨) صحيح سنن النسائي، رقم الحديث (٤٥٠) صحيح الترغيب، رقم الحديث (٥٦٣)

[2] مختصر صحيح مسلم للمنذري، رقم الحديث (٢٠٤)

[3] صحيح الجامع (٢/ ٣/ ٦٤) المنتقىٰ مع النيل (١/ ١/ ٢٩٣) عن بريده، صحيح سنن الترمذي، رقم الحديث (٢١١٣) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٠٧٩) صحيح سنن النسائي، رقم الحديث (٤٤٩) ←

''ہمارے اور ان (کفار و مشرکین) کے مابین جو عہد ہے، وہ نماز ہے، جس نے اسے ترک کر دیا تو اس نے کفر کیا۔''

③ تیسری حدیث ہبۃ اللہ طبری لالکائی کی کتاب "شرح أصول اعتقاد أهل السنة والجماعة" (۱۵۲۱) میں نبیِ اکرم ﷺ کے آزاد کردہ غلام حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، جس میں وہ بیان کرتے ہیں کہ انھوں نے نبیِ اکرم ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا:

«بَیْنَ الْعَبْدِ وَبَیْنَ الْکُفْرِ وَالْإِیْمَانِ الصَّلَاۃِ، فَإِذَا تَرَکَھَا فَقَدْ أَشْرَكَ»[1]

''بندے اور اس کے کفر و ایمان میں (وجہِ تمیز) نماز ہے، جب کسی نے نماز چھوڑ دی تو اس نے شرک کیا۔''

④ چوتھی حدیث جسے امام منذری رحمہ اللہ نے "الترغیب" میں طبرانی اور محمد بن نصر مروزی کی "کتاب الصلاۃ" کی طرف منسوب کرتے ہوئے کہا ہے کہ ان کی دونوں سندوں میں کوئی خاص قابلِ مواخذہ بات نہیں ہے، اس میں حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبیِ اکرم ﷺ نے ہمیں وصیت کی اور فرمایا:

«لَا تُشْرِکُوْا بِاللّٰہِ شَیْئًا، وَّلَا تَتْرُکُوْا الصَّلَاۃَ عَمَداً، فَمَنْ تَرَکَھَا عَمَداً مُتَعَمِّدًا فَقَدْ خَرَجَ مِنَ الْمِلَّۃِ»[2]

''اللہ کے ساتھ کسی چیز کو شریک مت بناؤ اور نہ جان بوجھ کر نماز چھوڑو، کیوں کہ جس نے جان بوجھ کر نماز چھوڑ دی تو وہ ملت (اسلامیہ) سے خارج ہوگیا۔''

⑤ بعض روایات میں کہا گیا ہے کہ ایسے شخص سے اللہ کا ذمہ ختم ہوجاتا ہے، یعنی وہ اللہ کے ذمے سے نکل جاتا ہے، چنانچہ "مسند أحمد" (۵/ ۲۳۸) اور طبرانی کبیر میں حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً مروی ہے:

«مَنْ تَرَكَ صَلَاۃً مَّکْتُوْبَۃً مُّتَعَمِّدًا فَقَدْ بَرِئَتْ مِنْہُ ذِمَّۃُ اللّٰہِ»[3]

← صحیح ابن حبان، الموارد، رقم الحدیث (۲۵۵) صحیح الترغیب، رقم الحدیث (۵۶۳) مصابیح السنة، رقم الحدیث (۴۰۱)

[1] الصلاة أیضاً، صحیح الترغیب والترهیب، رقم الحدیث (۵۶۵)

[2] الصلاة (ص: ۴۷)

[3] الصلاة (ص: ۲۵، ۴۷) صحیح الترغیب، رقم الحدیث (۵۶۸، ۵۶۹)

''جس نے کوئی فرض نماز جان بوجھ کر ترک کر دی تو اس سے اللہ کا ذمہ بَری ہے۔''

"مجمع الزوائد" (۱/ ۲۹۵) میں علامہ ہیثمی رحمہ اللہ نے اسے طبرانی کبیر کی طرف منسوب کیا اور کہا ہے کہ اس کی سند میں بقیہ بن ولید مدلس ہے اور اس نے عنعنہ سے کام لیا ہے۔ البتہ "مسند أحمد" (٦/ ٤٢١) میں مکحول کے طریق سے ام ایمن رضی اللہ عنہا سے ایک حدیث مروی ہے، جس میں منقول ہے:

«لَا تَتْرُكِي الصَّلَاةَ مُتَعَمِّدًا، فَإِنَّهُ مَنْ تَرَكَ الصَّلَاةَ مُتَعَمِّدًا فَقَدْ بَرِئَتْ مِنْهُ ذِمَّةُ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ»

یہ پہلی حدیث کی شاہد ہے، لیکن علامہ ہیثمی رحمہ اللہ کے بقول اس کے راوی تو سب صحیح حدیث کے راوی ہیں، البتہ مکحول نے ام ایمن سے سنا نہیں۔ یعنی اس کی سند میں یوں انقطاع پیدا ہوجاتا ہے۔ امام منذری "الترغيب" میں کہتے ہیں کہ اسے طبرانی نے "معجم الأوسط" میں روایت کیا ہے اور متابعات کے لیے اس کی سند میں کوئی خاص قابل مواخذہ بات نہیں ہے۔

سنن ابن ماجہ میں بھی ایک روایت ہے جس میں حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ مجھے ابو القاسم صلی اللہ علیہ وسلم نے وصیت فرمائی:

«أَلَّا أَتْرُكَ الصَّلَاةَ مُتَعَمِّدًا فَمَنْ تَرَكَهَا مُتَعَمِّدًا فَقَدْ بَرِئَتْ مِنْهُ ذِمَّةُ اللّٰهِ»[1]

''کہ میں جان بوجھ کر نماز ترک نہ کروں، کیوں کہ جس نے جان بوجھ کر نماز ترک کر دی تو اس سے اللہ کا ذمہ بَری ہوگیا۔''

اس کی سند میں شہر بن حوشب ضعیف راوی ہے، البتہ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ والی حدیث اس کی شاہد ہے۔ بہر حال ان دونوں اور ام ایمن رضی اللہ عنہا والی حدیث کے مجموعی مفاد سے معلوم ہوتا ہے کہ تارکِ نماز سے اللہ کا ذمہ بری ہوجاتا ہے، جو اس کے ملت اسلامیہ سے خروج کی دلیل ہے، کیونکہ علامہ ابن قیم رحمہ اللہ کے بہ قول اگر وہ اسلام پر ہی ہوتا تو پھر اسے اسلام کا ذمہ بھی حاصل ہوتا، جبکہ سنن ابو داود، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ اور مسند احمد میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ میں نے نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا:

«إِنَّ أَوَّلَ مَا يُحَاسَبُ بِهِ الْعَبْدُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ مِنْ عَمَلِهِ الصَّلَاةُ فَإِنْ صَلُحَتْ

[1] الصلاة أيضاً و صحيح الترغيب، رقم الحديث (٥٦٥) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٤٠٣٤)

فَقَدْ أَفْلَحَ وَأَنْجَحَ، وَإِنْ فَسَدَتْ فَقَدْ خَابَ وَخَسِرَ ﴾[1]

''قیامت کے دن بندے کے سب سے پہلے جس عمل کا حساب ہوگا، وہ نماز ہے، اگر اس پہلو سے معاملہ صحیح نکلا تو وہ فلاح و کامیابی پا گیا اور اگر یہ معاملہ فاسد ہوگیا تو پھر وہ خائب و خاسر (ناکام) ہی ہوگا۔''

معجم طبرانی میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی اسی مفہوم کی حدیث میں ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے:

﴿ أَوَّلُ مَا يُحَاسَبُ بِهِ الْعَبْدُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ الصَّلَاةُ، فَإِنْ صَلُحَتْ صَلُحَ لَهُ سَائِرُ عَمَلِهِ، وَإِنْ فَسَدَتْ فَسَدَ سَائِرُ عَمَلِهِ ﴾[2]

''قیامت کے دن بندے کے سب سے پہلے جس عمل کا حساب ہوگا، وہ نماز ہے، اگر اس پہلو سے معاملہ صحیح نکلا تو بقیہ سارے اعمال ہی صحیح ہوگئے اور اگر یہ معاملہ فاسد ہوگیا تو بقیہ سارے اعمال بھی فاسد ہوگئے۔''

---

[1] دیکھیں: الصلاة للكليب (ص: ٢٠٥) من المجموعة، المنتقىٰ (١/ ١/ ٢٩٥) صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (٧٧٠) صحيح سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٣٧) صحيح سنن النسائي، رقم الحديث (٤٥١) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٤٢٥، ١٤٢٦) مسند أحمد (٢/ ٢٩٠) مصابيح السنة (١/ ٤٥٨)

[2] نيل الأوطار مع المنتقىٰ (١/ ١/ ٢٩٥) صحيح الترغيب للألباني، رقم الحديث (٣٧٣)

تارکِ نماز کا حکم

وعیدِ شدید پر مبنی ان آیات و احادیث اور بعض آ ثارِ صحابہ رضی اللہ عنہم کی بنا پر اس مسئلے کو بڑی اہمیت حاصل ہوگئی ہے، حتی کہ بعض صحابہ و تابعین رحمہم اللہ اور ائمہ و فقہاء نے یہ مسلک اختیار کیا ہے کہ بے نماز کافر و مشرک (اور دینِ اسلام سے خارج) ہے اور دوسروں نے کہا ہے کہ کافر (خارج از اسلام) تو نہیں، البتہ تارکِ نماز فاسق ہے۔

غرض کہ اس مسئلے میں علمائے سلف و خلف میں اختلاف چلا آ رہا ہے۔ موضوع کی اہمیت کے پیشِ نظر اس کی قدرے تفصیل سے گفتگو کرنا نہ صرف مناسب بلکہ ضروری لگتا ہے۔ چنانچہ جمہوریہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم تارکِ نماز کے کفر کا نظریہ رکھتے تھے۔ جن میں سے علامہ ابن حزم رحمہ اللہ نے ''محلّٰی'' (۲/۲٤۲، مسئلة: ۲۷۹) میں حضرت عمرِ فاروق، عبدالرحمٰن بن عوف، معاذ بن جبل اور ابو ہریرہ رضی اللہ عنہم کے اسمائے گرامی بطورِ خاص ذکر کیے ہیں اور ساتھ ہی یہ بھی کہا ہے:

''وَلَا نَعْلَمُ لِهٰؤُلَاۤءِ مِنَ الصَّحَابَةِ مُخَالِفًا''[1]

''ہمیں صحابۂ کرام میں سے ان صحابہ کا کوئی مخالف بھی معلوم نہیں ہے۔''

ان الفاظ سے اس موضوع پر صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے اجماع کا اشارہ ملتا ہے۔ علامہ ابن حزم رحمہ اللہ کے ذکر کردہ اسمائے گرامی پر امام منذری رحمہ اللہ نے ''الترغیب والترھیب'' میں حضرت عبداللہ بن مسعود، حضرت عبداللہ بن عباس، حضرت جابر بن عبداللہ اور حضرت ابو الدرداء رضی اللہ عنہم کے ناموں کا اضافہ کیا ہے کہ یہ بھی تارکِ نماز کے کفر کے قائلین ہیں، ایسے ہی تابعین و ائمۂ دین میں سے امام احمد، اسحاق، عبداللہ بن مبارک، ابراہیم نخعی، حکم بن عتیبہ، ابو ایوب سختیانی، ابو داود طیالسی، ابن ابی شیبہ اور زہیر بن حرب رحمہم اللہ بھی کفر کے قائلین میں سے ہیں۔[2]

---

[1] مختصر الترغیب للشیخ مبارك التمیمي (۱/ ۱۲۸) تحقیق حسنین محمد مخلوف طبع علی نفقة الشیخ راشد، حاکم دبئی و الصلاة و تحقیقه لابن القیم (ص: ۳۷)

[2] حواله سابقه.

علامہ ابن قیم رحمہ اللہ نے ''کتاب الصلاۃ'' میں علامہ ابن حزم رحمہ اللہ کے حوالے سے چند صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اور تابعین و تبع تابعین اور ائمہ دین رحمہم اللہ سے قائلینِ کفر وارتداد کے نام لیے ہیں، جن میں سے ان مذکورہ حضرات کے علاوہ سعید بن جبیر، عامر شعبی، اوزاعی اور مالکیہ میں سے عبدالملک بن حبیب رحمہم اللہ کے نام بھی ہیں اور یہ بھی لکھا ہے کہ امام شافعی رحمہ اللہ کے مذہب کے پیروکاروں میں سے بھی بعض اسی کے قائل ہیں، حتیٰ کہ امام طحاوی رحمہ اللہ نے تو خود امام شافعی رحمہ اللہ سے بھی تارکِ نماز کے کفر کا قول ہی بیان کیا ہے۔[1] امام شوکانی رحمہ اللہ نے ''نیل الأوطار'' میں حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کا اسمِ گرامی بھی اسی زمرے میں شمار کیا ہے، جن کے نزدیک تارکِ نماز کافر ہے۔

اس مسئلے میں دوسری رائے یہ ہے کہ تارکِ نماز کافر تو نہیں بلکہ وہ فاسق ہے، امام ابو حنیفہ، مالک اور شافعی رحمہم اللہ کا یہی مذہب ہے۔[2]

یہ اختلافِ رائے بھی اس تارکِ نماز کے بارے میں ہے، جو محض سستی اور بے پروائی کی بنا پر تارک ہو، لیکن دل سے نماز کی فرضیت کا قائل ہو، ہاں اگر کوئی تارکِ نماز اس کی فرضیت کا بھی منکر ہو تو وہ کافر اور ملتِ اسلامیہ سے خارج ہے۔ سید سابق نے ''فقه السنة'' میں اس پر تمام مسلمانوں کا اجماع ذکر کیا ہے۔[3]

---

[1] الصلاۃ (ص: ٣٣)

[2] نیل الأوطار (١/ ١/ ٢٩١)

[3] حوالہ جاتِ سابقہ. و الزواجر (١/ ١٣٨)

قائلینِ فسق کے دلائل

تارکِ نماز کو کافر نہیں بلکہ فاسق قرار دینے والوں کا کہنا ہے کہ اس کے مسلمان ہوجانے کے بعد اس کے لیے اسلام کا حکم ثابت ہو چکا ہے، لہٰذا اسے اب ہم اسلام سے کسی یقینی خبر کے بغیر نہیں نکال سکتے، یعنی کافر قرار نہیں دے سکتے، جبکہ بعض احادیث ایسی بھی ہیں، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر کوئی شخص نماز کی فرضیت کا قائل ہو، مگر سستی اور بے پروائی کی وجہ سے اس کا تارک ہو تو وہ کافر نہیں ہوگا۔ اس موقف پر انھوں نے مندرجہ ذیل احادیث سے استدلال کیا ہے:

پہلی حدیث:

صحیح بخاری و مسلم اور دیگر کتبِ حدیث میں حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

«مَنْ شَهِدَ أَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ، لَا شَرِيْكَ لَهٗ، وَأَنَّ مُحَمَّداً عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ، وَأَنَّ عِيْسٰى عَبْدُ اللّٰهِ وَرَسُوْلُهٗ وَكَلِمَتُهٗ، أَلْقَاهَا إِلٰى مَرْيَمَ، وَرُوْحٌ مِّنْهُ، وَالْجَنَّةُ حَقٌّ، وَالنَّارُ حَقٌّ، أَدْخَلَهُ اللّٰهُ الْجَنَّةَ عَلٰى مَا كَانَ مِنْهُ مِنَ الْعَمَلِ»[1]

”جس نے اس بات کی شہادت دی کہ اللہ کے سوا کوئی معبودِ برحق نہیں، وہ یکتا ہے اور اس کا کوئی شریک و سہیم نہیں۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس کے بندے اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ عیسیٰ علیہ السلام اللہ کے بندے اور اس کے رسول علیہ السلام ہیں اور اس کا کلمہ ہیں، جسے اس نے مریم علیہا السلام کی طرف القا کیا اور وہ اس کی روح ہیں۔ جنت حق ہے اور جہنم بھی حق ہے، تو اللہ اُسے جنت میں داخل کر دے گا، وہ چاہے کسی بھی عمل پر کیوں نہ ہو۔“

[1] المنتقیٰ مع النیل (١/ ١/ ٢٩٥) صحیح مسلم مع شرح النووي (١/ ١/ ٢٢٦، ٢٢٧) صحیح البخاری مع الفتح، رقم الحدیث (٣٤٣٥) صحیح الجامع، رقم الحدیث (٦٣٢٠)

دوسری حدیث:

اسی طرح دوسری حدیث بھی صحیح بخاری ومسلم اور دیگر کتبِ حدیث میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سواری پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے سوار تھے کہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذ رضی اللہ عنہ سے مخاطب ہوکر فرمایا:

''اے معاذ! اس پر انھوں نے فرمایا: اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! فرمائیے! میں حاضر اور ہمہ تن گوش ہوں! تب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

« مَا مِنْ عَبْدٍ يَّشْهَدُ أَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ، وَأَنَّ مُحَمَّداً رَّسُوْلُ اللّٰهِ إِلَّا حَرَّمَهُ اللّٰهُ عَلَى النَّارِ »

''جو بندہ اس بات کی شہادت دے کہ اللہ کے سوا کوئی معبودِ برحق نہیں اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس کے رسول ہیں، اللہ اُسے آگ پر حرام کر دیتا ہے۔''

حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کہنے لگے:

''أَفَلَا أُخْبِرُ بِهَا النَّاسَ فَيَسْتَبْشِرُوْا؟''

''کیا میں لوگوں کو یہ بات نہ بتا دوں، تاکہ وہ خوش ہوجائیں؟''

تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

« إِذًا يَّتَّكِلُوْا » ''تب تو وہ اسی پر توکّل کر کے بیٹھ جائیں گے (اور عمل کرنے سے رُک جائیں گے)۔''

چنانچہ پھر موت کے وقت حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے یہ بات بتائی اور وہ بھی کتمانِ علم کے گناہ سے ڈرتے ہوئے کہ اگر میں نے یہ بات لوگوں کو نہ بتائی تو کہیں اس ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کو چھپانے پر گناہ گار نہ بن جاؤں۔[1]

تیسری حدیث:

اسی موضوع کی ایک تیسری حدیث بھی ہے، جو صحیح البخاری، ''کتاب العلم، باب الحرص

[1] المنتقیٰ (۱/ ۱/ ۲۹۶) صحیح مسلم مع شرح النووي (۱/ ۱/ ۲۴۰) صحیح البخاري مع الفتح، رقم الحدیث (۱۲۸)

على الحديث“ اور ”كتاب الرقاق، باب صفة الجنة والنار“ میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

«أَسْعَدُ النَّاسِ بِشِفَاعَتِي، مَنْ قَالَ: لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ، خَالِصًا مِّنْ قَلْبِهِ»[1]

”میری شفاعت پانے والوں میں سب سے خوش نصیب وہ ہے، جس نے اخلاصِ دل سے لا الٰہ الا اللہ کہا، یعنی اس بات کی شہادت دی کہ اللہ کے سوا کوئی معبودِ برحق نہیں ہے۔“

چوتھی حدیث:

چوتھی حدیث سنن نسائی و ابن ماجہ، مسندِ احمد اور مستدرکِ حاکم میں حضرت ابو ذر غفاری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے رات کو قیام کیا، جس کے دوران میں صبح ہونے تک ایک ہی آیت کو بار بار دُہراتے رہے اور پھر فرمایا:

«دَعَوْتُ لِأُمَّتِي، وَأُجِبْتُ بِالَّذِي لَوِ اطَّلَعَ عَلَيْهِ كَثِيرٌ مِّنْهُمْ تَرَكُوا الصَّلَاةَ»

”میں نے اپنی امت کے لیے دعا مانگی ہے اور وہ قبول بھی ہوگئی ہے جس کا اکثر لوگوں کو علم ہوجائے تو ان میں اکثر نماز چھوڑ بیٹھیں۔“

حضرت ابو ذر رضی اللہ عنہ کہنے لگے:

”أَفَلَا أُبَشِّرُ النَّاسَ؟“ ”کیا میں لوگوں کو خوش خبری نہ دے دوں؟“

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

”ہاں (دے دو) اس پر وہ چل نکلے تو حضرت عمرِ فاروق رضی اللہ عنہ نے نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مخاطب ہوکر عرض کی (اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم):

«إِنَّكَ إِنْ تَبْعَثْ إِلَى النَّاسِ بِهٰذَا يَتَّكِلُوا عَنِ الْعِبَادَةِ»

”اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو یہ خوشخبری پہنچا دی تو لوگ عبادت گزاری سے ہاتھ کھینچ لیں گے۔“

(یہ بات سن کر) نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابو ذر رضی اللہ عنہ کو واپس بلانے کے لیے آواز دی تو وہ واپس لوٹ آئے۔ اس قیام اللیل میں جو آیت آپ صلی اللہ علیہ وسلم رات بھر دُہراتے رہے، وہ سورۃ المائدہ کی

---

[1] بحواله الصلاة لابن القيم، وتحقيقه (ص: ٣٤) المنتقىٰ (١/ ١/ ٢٩٦) صحيح البخاري مع الفتح، رقم الحديث (٩٩)

آیت (۱۱۸) ہے، جس میں ہے:

﴿اِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُكَ وَ اِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ فَاِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ﴾

[المائدۃ: ۱۱۸]

''اے اللہ اگر تو انھیں عذاب دے تو یہ تیرے بندے ہیں اور اگر تو انھیں بخش دے تو تو بڑا غالب حکمت والا ہے۔''[1]

پانچویں حدیث:

پانچویں حدیث صحیح مسلم ''کتاب الإیمان، باب الدلیل علی أن من مات علی التوحید دخل الجنة قطعاً'' میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، جس میں ارشادِ نبوی ﷺ ہے:

«مَنْ مَّاتَ، وَهُوَ يَعْلَمُ أَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ، دَخَلَ الْجَنَّةَ»[2]

''جو اس حال میں مر گیا کہ وہ جانتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبودِ برحق نہیں تو وہ جنت میں داخل ہوگیا۔''

چھٹی حدیث:

سنن ابو داود، مستدرکِ حاکم اور مسندِ احمد میں حضرت معاذ رضی اللہ عنہ سے مروی ارشادِ نبوی ﷺ کے الفاظ ہیں:

«مَنْ كَانَ آخِرُ كَلَامِهِ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ دَخَلَ الْجَنَّةَ»[3]

''مرتے وقت جس کی زبان سے آخری کلمات ''لا إلٰه إلا اللّٰه'' ادا ہوئے، وہ جنت میں داخل ہوگیا۔''

ساتویں حدیث:

ساتویں حدیث صحیح بخاری و مسلم میں حضرت عتبان بن مالک رضی اللہ عنہ کے واقعے پر مشتمل ہے،

---

[1] الصلاۃ (ص: ٣٤) صحیح سنن النسائي (١/ ٢١٨) و صحیح سنن ابن ماجه للألباني (١/ ٢٢٥) مشکاۃ المصابیح (١/ ٣٧٨) مسند أحمد (٥/ ١٤٩) المستدرك للحاکم (١/ ٢٤١) بحواله تحقیق مصابیح السنة (١/ ٤٢٧)

[2] الصلاۃ أیضاً (ص: ٣٦) صحیح مسلم مع شرح النووي (١/ ١/ ٢١٨)

[3] سنن أبي داود مع العون (٨/ ٣٨٥) مسند أحمد (٥/ ٢٤٧) مستدرك الحاکم (١/ ٣٥١)

جس میں یہ ارشادِ نبوی ﷺ ہے:

«إِنَّ اللّٰهَ قَدْ حَرَّمَ عَلَى النَّارِ مَنْ قَالَ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ يَبْتَغِي بِذٰلِكَ وَجْهَ اللّٰهِ»[1]

''اللہ تعالیٰ نے اس شخص کو آگ پر حرام کر دیا، جس نے خالص رضائے الٰہی کے لیے ''لا إلٰه إلا اللّٰه'' کہا۔''

آٹھویں حدیث:

سنن ترمذی و ابن ماجہ، مسندِ احمد، صحیح ابن حبان، سنن بیہقی اور مستدرکِ حاکم میں ایک ایسے شخص کا واقعہ بھی مذکور ہے، جس کے نامۂ اعمال کو کھولا جائے گا تو وہ برائیوں سے بھرے ننانوے رجسٹروں پر مشتمل ہوگا اور ہر رجسٹر تا حدِ نظر طویل و عریض ہوگا، پھر ایک چھوٹا سا کارڈ نکالا جائے گا، جس میں ''لا إلٰه إلا اللّٰه'' کی شہادت ہوگی تو کلمۂ توحید کے اقرار پر مشتمل وہ کارڈ تمام رجسٹروں پر بھاری نکلے گا۔[2]

صحیح مسلم میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ارشادِ نبوی ﷺ ہے کہ ہر نبی کی ایک مقبول دعا تھی اور ہر نبی نے وہ دعا کرنے میں جلدی کی، لیکن میں نے اسے چھپائے رکھا اور وہ میں قیامت کے دن شفاعت کی صورت میں کروں گا جو، ان شاء اللہ، میری امت کے ہر اس فرد کو پہنچے گی، جو اس حال میں فوت ہوا کہ شرک نہیں کرتا تھا۔[3]

طریقۂ استدلال:

ان اور ان جیسی ہی دیگر احادیث سے یوں استدلال کیا جاتا ہے کہ نبیِ اکرم ﷺ نے محض کلمۂ شہادت کو اخلاص دل سے پڑھنے پر اس کے جسم پر جہنم کی آگ حرام قرار دی ہے، اسے بالآخر جنت کی بشارت دی ہے اور جس نے اس کلمۂ شہادت کے سوا کوئی بھی عملِ خیر کبھی نہ کیا ہوگا، اسے بھی ایک نہ ایک دن بالآخر جہنم سے نکالے جانے کی خوشخبری سنائی ہے، لہٰذا یہ احادیث تارکِ نماز کی تکفیر اور اس کے دائمی جہنمی ہونے میں مانع ہیں، بلکہ اس کے برعکس جس طرح عام کبیرہ گناہوں کے مرتکب لوگوں کے لیے رحمت کی امید کی جا سکتی ہے، اسی طرح ترکِ نماز بھی چونکہ فسق اور گناہِ کبیرہ

[1] الصلاة (ص: ٣٦) صحيح البخاري مع الفتح (١/ ٥١٩) صحيح الجامع، رقم الحديث (١٧٩٣) صحيح مسلم مع شرح النووي (١/ ١/ ٢٤٢۔ ٢٤٥)

[2] سنن الترمذي مع التحفة (٧/ ٣٩٥)

[3] مختصر مسلم للمنذري تحقيق الألباني، رقم الحديث (٩٥)

ہے، لہٰذا تارکِ نماز کے لیے بھی رحمت کی اُمید جائے گی اور وہ لوگ یہ بھی کہتے ہیں:

''کفر تو نام ہے توحید کے انکار کا، نیز رسالت اور روزِ قیامت کے انکار کا، نبیِ اکرم ﷺ کے لائے ہوئے دینِ برحق کے انکار کا، جبکہ تارکِ نماز اللہ کی وحدانیت کا اقرار کرتا ہے، حضرت محمد ﷺ کے بارے میں اللہ کا رسول ہونے کی شہادت دیتا ہے اور اس بات پر بھی ایمان رکھتا ہے کہ اللہ تعالیٰ قبروں والوں کو (حساب کے لیے) اُٹھائے گا، ایسے آدمی کے کفر کا فیصلہ کیسے دیا جا سکتا ہے؟ خصوصاً جبکہ ایمان تو تصدیق کا نام ہے، جس کی ضد یا عکس تکذیب ہے، یعنی ان امور کو جھٹلانا ہے، نہ کہ تصدیق کی ضد ترکِ عمل ہے، سو ایک تصدیق کرنے والے یعنی ماننے والے پر، تکذیب کرنے والے یعنی جھٹلانے یا انکار کرنے والے کا حکم کیسے لاگو کیا جا سکتا ہے؟''[1]

سابقہ دلائل کا جائزہ:

سابق میں ہم نے بے نماز کو کافر نہیں بلکہ کبیرہ گناہ کا مرتکب اور فاسق قرار دینے والوں کے دلائل پر مبنی آٹھ احادیث ذکر کی ہیں، جن میں سے اقرارِ توحید و رسالت والے کلمے کی برکت سے لوگوں کو جہنم سے بالآخر نکالے جانے بلکہ جہنم پر حرام ہونے اور جنت میں داخل کیے جانے سے استدلال کیا گیا ہے۔

یہ احادیث تو بلاشبہہ صحیح ہیں اور قابلِ استدلال بھی، البتہ اس مسئلے میں یہ صریح نہیں ہیں اور نہ وہ زیرِ بحث مسئلے میں واضح دلیل و حجت ہیں، کیونکہ امام شوکانی رحمہ اللہ نے ''نیل الأوطار'' میں لکھا ہے:

''تمام سلف و خلف، ائمہ اسلام اور اشعریہ و معتزلہ تک کا اس بات پر اتفاق و اجماع ہے کہ وہ احادیث جن میں ''لا إلٰه إلا اللّٰه'' کہنے سے جنت میں داخل ہو جانے کا ذکر ہے وہ اس بات یا شرط کے ساتھ مقیّد ہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے عائد کردہ فرائض و واجبات کو ادا کرنے میں کوئی کوتاہی نہ کرتا ہو اور ایسے کبیرہ گناہوں کا ارتکاب نہ کیا گیا ہو، جن سے توبہ نہ کی گئی ہو۔ (یعنی اگر کوئی کبیرہ گناہ سرزد ہوا تو اس سے توبہ کی جا چکی ہو) اور اس بات پر بھی سب کا اتفاق ہے کہ محض کلمۂ شہادت کہہ لینا دخولِ جنت کا موجب نہیں

[1] از افادات ابن القیم في الصلاۃ (ص: ۳۶، ۳۷)

ہے، لہٰذا یہ احادیث مطلوبہ مسئلے میں حجت نہیں بن سکتیں۔‘‘

آگے چل کر لکھتے ہیں:

’’یہی وجہ ہے کہ سلف صالحین نے ان احادیث کی تاویل کی ہے، چنانچہ سلف کی ایک جماعت جن میں سے حضرت سعید بن میسّب رحمہ اللہ بھی ہیں، ان کا کہنا ہے کہ ان احادیث میں مذکور حکم کا اطلاق فرائض و واجبات اور اوامر و نواہی کے نازل ہونے سے پہلے پہلے تھا۔ یہی تاویل امام نووی رحمہ اللہ نے شرح مسلم میں بھی کی ہے، جبکہ اس تاویل کی تردید بھی امام نووی اور شوکانی رحمہما اللہ نے ذکر کی ہے کہ ان احادیث میں سے بعض کے راوی حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ ہیں اور ان کا اسلام لانا کافی تاخیر سے ہوا تھا، وہ بالاتفاق غزوۂ خیبر کے سال ۷ھ میں مسلمان ہوئے تھے، جبکہ اس وقت تک احکامِ شریعت مثلاً نماز، روزہ، زکات اور حج وغیرہ کے احکام کا نزول و استقرار ہو چکا تھا، حتیٰ کہ حج کی فرضیت بھی راجح تر قول کے مطابق ۵ ھ یا ۶ ھ میں نازل ہوئی تھی، ویسے تو ایک قول ۹ ھ کا بھی ہے، مگر راجح پہلا قول ہی ہے۔‘‘[1]

’’فتح الباري‘‘ میں حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ نے مختلف تشریحی اقوال میں سے ایک یہ ذکر کیا ہے:

’’وَقِيلَ: اَلْمُرَادُ أَنَّ مَنْ قَالَهَا مُخْلِصًا، لَا يَتْرُكُ الْفَرَائِضَ‘‘[2]

’’کلمۂ توحید کے نتیجے میں جنت میں جانے والوں سے مراد وہ لوگ ہیں، جنھوں نے اخلاصِ دل کے ساتھ یہ کلمہ پڑھا اور پھر فرائض میں سے کوئی فریضہ ترک بھی نہیں کیا۔‘‘

امام نووی رحمہ اللہ نے مسلم کی شرح میں قاضی عیاض رحمہ اللہ کے افادات کو مزید اور مفید اضافوں کے ساتھ بیان کیا ہے، ان افادات میں سے یہ بھی مذکور ہے کہ جن احادیث میں کلمہ گو کے جنت جانے کا ذکر ہے، ان کا معنیٰ دراصل یہ ہے کہ جس نے کلمہ پڑھا اور کلمہ پڑھنے کے حقوق و فرائض بھی ادا کیے (تو وہ آدمی جنتی ہے)۔ ان احادیث کی یہ تشریح حضرت حسن بصری رحمہ اللہ نے بھی بیان کی ہے، جبکہ امام بخاری رحمہ اللہ نے ان احادیث کی تشریح یہ کی ہے:

---

[1] نیل الأوطار (۱/ ۱/ ۲۷۹) صحیح مسلم مع شرح النووي (۱/ ۱/ ۲۲۰)

[2] فتح الباري (۱/ ۵۲۲)

”کلمہ گو کے جنت میں جانے سے مراد ایسا شخص ہے، جسے اپنی غلطی کا احساس ہو جائے اور وہ شرمندہ اور تائب ہوجائے، اسی پر اس کو موت آ جائے اور اسے عمل کرنے کا وقت ہی نہ ملے، تو ایسا آدمی محض کلمہ پڑھنے کے نتیجے ہی میں جنت چلا جائے گا۔“

ان تاویلات وتشریحات کی ضرورت بھی صرف اس وقت پیش آتی ہے، جب ان احادیث کو ان کے ظاہری معنوں پر محمول کیا جائے، لیکن اگر ان احادیث کو ان کے صحیح معنوں پر محمول کیا جائے تو پھر ان کی تاویل وتشریح کوئی مشکل نہیں رہ جاتی، جیسا کہ محقّقین نے بیان کیا ہے۔

تمام اہلِ سنت، جن میں سلف صالحین، اہلِ حدیث علما، فقہا اور اشعری متکلمین شامل ہیں، ان سب کا مذہب یہ ہے کہ گناہ گار لوگ اللہ کی مشیت ومرضی کے تابع ہیں، جس شخص کی بھی موت ایمان کی حالت میں واقع ہوئی اور وہ اخلاصِ دل سے توحید ورسالت کی گواہی دیتا تھا تو وہ جنت میں داخل ہوجائے گا۔ اگر وہ اپنے گناہوں سے تائب ہوگیا تھا یا گناہوں سے محفوظ تھا تو وہ رحمتِ الٰہی سے جنت میں چلا جائے گا اور وہ آگ پر بالجملہ حرام ہوگا۔ اگر تو ان احادیث کو ایسے آدمی پر محمول کریں تو معاملہ بالکل واضح ہے اور حضرت حسن بصری وامام بخاری رحمہما اللہ کی بیان کردہ تاویل کا یہی معنیٰ ہے۔

لیکن اگر وہ شخص نیکیوں اور برائیوں کے ملے جلے اعمال والا ہے کہ اس نے اللہ تعالیٰ کی طرف سے عائد کردہ بعض واجبات کو ترک کیا ہے یا پھر اللہ کی طرف سے حرام کیے گئے بعض امور کا ارتکاب کیا ہے تو وہ مشیّتِ الٰہی یعنی اللہ کی مرضی کے تابع ہے، اس کے بارے میں قطعیت سے یہ نہیں کہا جاسکتا ہے کہ وہ سیدھے جنت میں چلا جائے گا اور نہ یہ کہ وہ سیدھا جہنم میں داخل کر دیا جائے گا، بلکہ قطعیت اور یقین کے ساتھ جو بات کہی جا سکتی ہے وہ صرف یہ کہ یہ شخص بالآخر کبھی نہ کبھی تو اس کلمے کی برکت سے جنت میں ضرور ہی جائے گا، لیکن اس سے پہلے اس کا معاملہ مشیّت وارادۂ الٰہی کے تابع ہے۔ اگر اللہ نے چاہا تو وہ اسے اس کے گناہوں کی سزا دے دے گا (اور سزا بھگتنے کے بعد وہ جنت میں چلا جائے گا) اور اگر اللہ چاہے گا تو وہ اپنے فضل وکرم سے اس کے گناہ اسے معاف کر دے گا (اور اسے جنت میں داخل کر دے گا، یہ اس کی مرضی ہے)۔

انھی تاویلات وتشریحات کے سلسلے میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ جہنم کی آگ حرام ہونے اور جنت کا مستحق ہونے والی ہر دو طرح کی احادیث کو مستقل بالذّات مان لیا جائے تو یہ بھی ممکن ہے اور پھر ان

دونوں کی طرح احادیث کے مابین جمع وتطبیق یوں ہوگی کہ لا الٰہ الا اللہ پڑھ لینے سے جنت کا مستحق ہوجانے کا معنیٰ یہ ہے، جس پر اجماعِ امت بھی ہے کہ توحید ورسالت پر ایمان رکھنے والا ہر موحّد یقیناً جنت میں داخل ہوجائے گا، یا معافی پا کر سیدھا ہی جنت میں چلا جائے گا، یا پھر اپنے گناہوں کی سزا بھگتنے کے بعد اور اس پر جہنم کی آگ حرام ہونے سے مراد یہ ہے کہ اس پر نارِ جہنم کی ہمیشگی حرام ہے۔ (ان دونوں مسئلوں میں خوارج ومعتزلہ کے برخلاف) اور وہ حدیث جس میں مذکور ہے کہ جس کی زبان سے آخری کلمات "لا إلٰہ إلا اللّٰہ" ہوئے، وہ جنت میں داخل ہوجائے گا، وہ حدیث ممکن ہے کہ صرف اسی شخص کے ساتھ خاص ہو، جس کی زبان سے نکلنے والے آخری کلمات یہی اقرارِ توحید ورسالت ہوں، اگرچہ پہلے وہ اچھے بُرے ہر طرح کے ملے جلے اعمال والا ہو اور موت کے وقت اس اقرار کے صدور کی برکت سے اسے اللہ کی رحمت اپنے سائے میں ڈھانپ لے اور پوری طرح اس کی نجات ہو جائے اور وہ جہنم پر حرام ہوجائے۔

برخلاف اس شخص کے جو ملے جلے اعمالِ خیر وشر والا ہے اور پھر آخری وقت میں اس کی زبان سے یہ اقرارِ توحید و رسالت بھی ادا نہیں ہوا (تو ایسا شخص اس حدیث کا مصداق نہیں ہوسکتا) ان احادیث کے سلسلے میں بعض دیگر تشریحی امور کی تفصیل مطلوب ہو تو امام نووی رحمہ اللہ کی شرح صحیح مسلم (۱/ ۱/ ۲۱۸ تا ۲۲۱) ملاحظہ فرمائیں۔

ان احادیث کے مفہوم کی تعیین کے لیے یہ تاویلات وتشریحات اشد ضروری ہیں، کیونکہ قرآن و سنت میں ایسی کثرت سے نصوص (آیات و احادیث) بھی ہیں، جن میں کتنے ہی شرعی واجبات کا ذکر آیا اور بتایا گیا ہے کہ اگر انھیں ترک کیا گیا تو یہ نارِ جہنم میں ڈالے جانے کا موجب ہوگا، ایسے ہی کثرت سے ایسے محرمات کا ذکر وارد ہوا ہے، جن کے ساتھ ہی یہ بتایا گیا ہے کہ اگر ان کا ارتکاب کیا تو یہ موجبِ جہنم ہے، لہٰذا وعیدوں والی ان احادیث اور کلمۂ توحید و رسالت پڑھنے سے جنت لے جانے والی ان احادیث کے مابین مطابقت پیدا کرنے کے لیے یہ تاویلیں انتہائی ضروری ہیں، ورنہ پھر تو بشارت و وعید والی ان احادیث کے مابین ایک لاینحل اشکال بلکہ تضاد نظر آئے گا۔[1]

---

[1] نیل الأوطار (۱/ ۱/ ۲۹۷)

بعض دیگر دلائل:

تارکِ نماز کو فاسق قرار دینے والوں کے بعد دلائل کا جائزہ تو ہوگیا، جب کہ ان کے کچھ دلائل اور بھی ہیں، جن کی رو سے وہ کہتے ہیں کہ تارکِ نماز کافر نہیں بلکہ گناہِ کبیرہ کا مرتکب اور فاسق ہے۔

نویں حدیث:

ان دلائل میں سے ایک تو وہ حدیث ہے جو سننِ اربعہ میں سے سنن ابو داود، نسائی، ابن ماجہ اور صحیح ابن حبان و ابن سکن میں حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ میں نے نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا:

''اللہ نے پانچ نمازیں فرض کی ہیں، جس نے ان کے لیے اچھی طرح وضو کیا اور انھیں ان کے اوقات (اولیٰ) میں ادا کیا، ان کے رکوع و سجود پوری طرح ادا کیے اور ان میں خشوع و خضوع کا اہتمام کیا، اس کے لیے اللہ کا عہد ہے کہ وہ اُسے بخش دے گا، اور جس نے ایسا نہ کیا، اس کے لیے اللہ کا کوئی عہد نہیں ہے:

﴿ إِنْ شَاءَ غَفَرَلَهٗ وَإِنْ شَاءَ عَذَّبَهٗ ﴾[1]

''اگر وہ چاہے گا تو اُسے بخش دے گا، اور اگر وہ چاہے گا تو اسے عذاب دے گا۔''

حدیث شریف کے آخری الفاظ سے تارکِ نماز کے عدمِ کفر پر استدلال کیا جاتا ہے اور اس بات پر بھی کہ تارکِ نماز کے لیے دائمی جہنمی ہونا بھی ضروری نہیں، بلکہ اللہ چاہے گا تو وہ اسے معاف کر دے گا اور چاہے گا تو عذاب دے کر چھوڑ دے گا۔

جائزہ:

''المنتقی'' کی شرح ''نیل الأوطار'' میں اس حدیث کے تحت ایک گذشتہ بحث کی طرف اشارہ کرتے ہوئے امام شوکانی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

''وہاں ہم بیان کر چکے ہیں کہ کفر کی کئی قسمیں ہیں اور ان میں سے بعض ایسی بھی ہیں جو مغفرت و بخشش کے منافی بھی نہیں، مثلاً اہلِ قبلہ مسلمانوں کو بعض گناہوں کے ارتکاب پر

---

[1] مسند أحمد (٥/ ٣١٧) صحیح سنن أبي داود، رقم الحدیث (٤١٠) صحیح سنن النسائي، رقم الحدیث (٤٤٧) سنن ابن ماجه (١٤٠١) موارد الظمآن، رقم الحدیث (٢٥٢)

کفر کرنا کہا گیا ہے۔‘‘[1]

یہ اس بات کی دلیل ہے کہ ہر تارکِ نماز کا دائمی جہنمی ہونا کوئی ضروری نہیں، لیکن شارع علیہ السلام نے جن گناہوں کو کفر کا نام دیا ہے، وہ کفر ہی ہوں گے، اگر چہ یہ اصل کفر سے الگ کفر ہے، جس کی کچھ وضاحت بھی ہم کریں گے۔ ان شاء اللہ

’’المنتقیٰ‘‘ میں تو ابو البرکات المجد ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے اس حدیث کو تارکِ نماز کے عدمِ کفر کے دلائل کے ضمن میں نقل کیا ہے، جب کہ ان کے قابلِ صد افتخار پوتے احمد بن تیمیہ رحمہ اللہ نے اپنے فتاویٰ میں لکھا ہے:

’’جو شخص پکا بے نماز ہو اور ترکِ نماز پر اور اسی ترک اور اصرار پر ہی اس کی موت آ جائے تو وہ مسلمان نہیں ہوگا، البتہ اکثر لوگ جو پکے بے نماز تو نہیں ہوتے، بلکہ کبھی وہ نماز پڑھنے لگتے ہیں اور کبھی چھوڑ دیتے ہیں، وہ لوگ نماز پر محافظت ونگہداشت کرنے والے نہیں ہوتے ہیں، وہ وعید کے تحت ہوتے ہیں اور یہی وہ لوگ ہیں، جن کے بارے میں یہ سنن کی حدیثِ عبادہ رضی اللہ عنہ وارد ہوئی ہے۔‘‘[2]

اس سے واضح ہوگیا کہ اس حدیث کا دائمی تارک نماز سے کوئی تعلق نہیں اور نہ اس کے عدمِ کفر پر اس بات سے استدلال کرنا درست ہوسکتا ہے، کیونکہ یہ کبھی پڑھنے اور کبھی چھوڑ بیٹھنے والے شخص کے بارے میں ہے۔

دسویں دلیل:

تارکِ نماز کو کافر کے بجائے فاسق قرار دینے والوں کا استدلال ایک اس حدیث سے بھی ہے، جو سنن ابو داود، ابن ماجہ، بیہقی، مستدرکِ حاکم اور مسندِ احمد میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، جس میں وہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے:

« إِنَّ أَوَّلَ مَا يُحَاسَبُ بِهِ الْعَبْدُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ الصَّلَاةُ الْمَكْتُوبَةُ، فَإِنْ أَتَمَّهَا فَبِهَا، وَإِلَّا قِيلَ انْظُرُوا هَلْ لَهُ مِنْ تَطَوُّعٍ؟ فَإِنْ كَانَ لَهُ تَطَوُّعٌ، أُكْمِلَتِ

[1] نيل الأوطار (١/ ١/ ٢٩٥)

[2] مجموع فتاویٰ (٢٢/ ٤٩)

الْفَرِيْضَةُ مِنْ تَطَوُّعِهِ، ثُمَّ يُفْعَلُ بِسَائِرِ الْأَعْمَالِ الْمَفْرُوْضَةِ مِثْلَ ذٰلِكَ ﴾[1]

''قیامت کے دن بندے کے اعمال میں سب سے پہلے جس کا حساب لیا جائے گا، وہ فرض نماز ہے۔ اگر اس نے اُسے پورا کیا ہوگا تو بہتر ہے، ورنہ کہا جائے گا کہ دیکھو! کیا اس کی کوئی نفلی نمازیں ہیں؟ اگر اس کی کوئی نفلی نمازیں ہوئیں تو اس کی فرض نمازوں میں واقع کمی کو ان سے پورا کیا جائے گا اور پھر بقیہ تمام اعمال کا حساب بھی ایسے ہی کیا جائے گا۔''

معمولی لفظی فرق کے ساتھ اسی مفہوم کی ایک حدیث سنن ابو داود، ابن ماجہ، مستدرکِ حاکم اور مسند احمد میں حضرت تمیم الداری رضی اللہ عنہ سے بھی مروی ہے۔[2]

اس قسم کی احادیث سے یوں استدلال کیا جاتا ہے کہ جب فرض نمازوں کی کمی کو نوافل سے پورا کیا جائے گا تو یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اس کی پڑھی ہوئی نمازوں پر اُسے ثواب ملے گا اور وہ مقبول ہیں اور یہ بات کفر کے منافی ہے!

جائزہ:

یہ استدلال بھی اولاً تو اسی طرح کا ہے، جیسے سابق میں گزری ہوئی بعض احادیث سے کیا گیا تھا، جو پکے تارکِ نماز سے نہیں، بلکہ ایسے تارکِ نماز سے تعلق رکھتی ہیں، جو نماز تو پڑھتا ہو، لیکن کبھی چھوڑ بھی دیتا ہو۔ دوسرا یہ کہ اگر کفر دون کفر والی بات پیشِ نظر رہے اور یہ بات ذہن میں ہو کہ کفر کی بعض اقسام مغفرت، دخولِ جنت اور عدمِ خلود فی النار کے منافی نہیں ہیں، تو پھر ان تاویلات کو کھینچ تان کر لانے کی ضرورت ہی نہیں رہ جاتی۔

تاویل:

فاسق کہنے والے اہلِ علم ان احادیث کی، جن میں واضح طور پر تارکِ نماز کے لیے کفر کا لفظ آیا ہے، تاویل کرتے اور کہتے ہیں کہ ایسی احادیث میں کفر سے مراد کفرانِ نعمت ہے یا پھر علامہ مجد الدین ابن تیمیہ رحمہ اللہ کے بقول ﴿ فَقَدْ كَفَرَ ﴾ سے مراد یہ نہیں کہ وہ کافر ہوگیا یا اس نے کفر کیا،

---

[1] المنتقى مع النيل (١/ ١/ ٢٩٥) وصحيح الجامع (١/ ٢/ ٣٥٢) صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (٧٧٠) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٤٢٥) صحيح سنن النسائي، رقم الحديث (٤٥٣)

[2] صحيح الجامع (١/ ٢/ ٣٥٣) صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (٧٧١) سنن ابن ماجه (١٤٢٦)

بلکہ اس سے مراد ہے:

"قَدْ قَارَبَ الْكُفْرَ"[1] "وہ کفر کے قریب پہنچ گیا۔"

اس تاویل کی تائید کے لیے انھوں نے متعدد احادیث بھی نقل کی ہیں، جن میں کفر کا لفظ وارد ہوا ہے اور وہ ہیں بھی نماز کے علاوہ دیگر امور کے بارے میں، مثلاً: ایک حدیث صحیح بخاری و مسلم، سنن ترمذی و ابن ماجہ میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، جس میں وہ بیان کرتے ہیں کہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«سِبَابُ الْمُسْلِمِ فُسُوقٌ، وَقِتَالُهُ كُفْرٌ»[2]

"مسلمان کو گالی دینا فسق اور اس سے قتال و جنگ کرنا کفر ہے۔"

دوسری حدیث بھی صحیح بخاری و مسلم میں حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، جس میں وہ فرماتے ہیں کہ میں نے نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا:

«لَيْسَ مِنْ رَجُلٍ ادَّعٰى لِغَيْرِ أَبِيْهِ وَهُوَ يَعْلَمُهُ إِلَّا كَفَرَ»[3]

"جس شخص نے جانتے بوجھتے اپنے آپ کو اپنے باپ کے سوا کسی دوسرے کی طرف منسوب کیا تو اس نے کفر کیا۔"

ایسے ہی صحیح مسلم اور مسندِ احمد میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے:

«اثْنَتَانِ فِيْ النَّاسِ، هُمَا بِهِمْ كُفْرٌ، اَلطَّعْنُ فِيْ النَّسَبِ وَالنِّيَاحَةُ عَلَى الْمَيِّتِ»[4]

"دو باتیں لوگوں میں کفر ہیں، ایک کسی کے نسب میں طعن و تشنیع کرنا اور دوسری میت پر نوحہ خوانی (بین) کرنا۔"

چوتھی حدیث صحیح بخاری و مسلم، سنن نسائی و ابن ماجہ اور مسند احمد میں حضرت جریر رضی اللہ عنہ سے، صحیح بخاری، سنن ابو داود، نسائی، ابن ماجہ اور مسند احمد میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے، صحیح بخاری و

---

[1] المنتقیٰ (۱/ ۱/ ۲۹٦)

[2] المنتقیٰ (۱/ ۱/ ۲۹٦) الصلاة لابن القيم (ص: ۵۱) صحيح البخاري مع الفتح، رقم الحديث (۴۸) مختصر صحيح مسلم للمنذري، رقم الحديث (٦٦) صحيح سنن الترمذي، رقم الحديث (۲۱۲۳) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٦۹)

[3] صحيح البخاري مع الفتح، رقم الحديث (۳۵۰۸) مختصر صحيح مسلم للمنذري، رقم الحديث (۵۰)

[4] أيضاً و الصلاة لابن القيم (ص: ۵۲) مختصر صحيح مسلم للمنذري، رقم الحديث (۵۵)

سنن نسائی میں حضرت ابوبکرہ رضی اللہ عنہ سے، صحیح بخاری اور سنن ترمذی میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے، جس میں ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے:

«لَا تَرْجِعُوْا بَعْدِيْ كُفَّارًا يَّضْرِبُ بَعْضُكُمْ رِقَابَ بَعْضٍ»[1]

''میرے بعد تم کافر نہ ہو جانا کہ تم ایک دوسرے کی گردنیں مارنے لگو۔''

پانچویں حدیث صحیح مسلم میں حضرت جریر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، جس میں ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے:

«أَيُّمَا عَبْدٍ أَبَقَ مِنْ مَّوَالِيْهِ فَقَدْ كَفَرَ حَتّٰى يَرْجِعَ إِلَيْهِمْ»[2]

''جو غلام اپنے آقاؤں سے بھاگ جائے تو اس نے کفر کیا، یہاں تک کہ وہ ان کے پاس نہ لوٹ آئے۔''

چھٹی حدیث صحیحین اور موطأ میں مروی ہے، جس میں ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے:

«مَنْ قَالَ لِأَخِيْهِ: يَا كَافِرُ، فَقَدْ بَاءَ بِهَا»[3]

''جس نے اپنے کسی مسلمان بھائی کو کافر کہا تو وہ خود ایسا ہو گیا۔''

ساتویں حدیث میں ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے:

«أَصْبَحَ مِنْ عِبَادِيْ مُؤْمِنٌ بِيْ وَكَافِرٌ»[4]

''میرے بندوں میں سے بعض نے مومن ہونے کی حالت میں اور بعض نے کافر ہونے کی حالت میں صبح کی۔''

آگے فرمایا:

''جس نے یہ کہا کہ اللہ کے فضل و رحمت سے بارش ہوئی، وہ مجھ پر ایمان رکھنے والا اور

---

[1] صحيح الجامع (٣/ ٦/ ١٤٣) نيل الأوطار (١/ ١/ ٢٩٧) صحيح البخاري مع الفتح، رقم الحديث (٧٠٧٧، ٧٠٧٨، ٧٠٧٩، ٧٠٨٠) صحيح مسلم مع النووي (١/ ٢/ ٥٥، ٥٦) صحيح سنن النسائي، رقم الحديث (٣٨٤٥، ٣٨٤٦، ٣٨٤٧) صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٩٢٠) صحيح سنن الترمذي، رقم الحديث (١٧٨٤) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٣٩٤٢، ٣٩٤٣)

[2] صحيح الجامع (١/ ٢/ ٣٩٩) نيل الأوطار أيضاً، مختصر صحيح مسلم للمنذري، رقم الحديث (٥٧)

[3] صحيح البخاري مع الفتح، رقم الحديث (٦١٠٤) صحيح مسلم مع النووي (١/ ٢/ ٤٩)

[4] أيضاً، صحيح البخاري مع الفتح، رقم الحديث (٨٤٦) مختصر صحيح مسلم، رقم الحديث (٥٦) صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٣٠٦)

ستاروں سے کفر کرنے والا ہے اور جس نے یہ کہا کہ فلاں ستارے کی تاثیر سے بارش ہوئی ہے، وہ مجھ سے کفر کرنے والا اور ستاروں پر ایمان لانے والا ہے۔''[1]

ایسے ہی سنن ابن ماجہ، دارمی اور مسند احمد میں ارشادِ نبوی ﷺ ہے:

«تَبَرُّؤٌ مِنْ نَّسَبٍ وَإِنْ دَقَّ، كُفْرٌ بَعْدَ إِيْمَانٍ»[2]

''نسب سے (بیٹا ماننے سے) انکار کرنا، چاہے وہ کس قدر دقیق ہی کیوں نہ ہو، ایمان لے آنے کے بعد کفر ہے۔''

سنن ابو داود، ترمذی، ابن ماجہ، دارمی اور مسندِ احمد میں ارشادِ نبوی ﷺ ہے:

«مَنْ أَتیٰ امْرَأَةً فِيْ دُبُرِهَا، فَقَدْ كَفَرَ بِمَا أُنْزِلَ عَلٰى مُحَمَّدٍ ﷺ»[3]

''جس نے اپنی بیوی سے دُبر (جائے پاخانہ) میں جماع کیا تو اس نے شریعت محمدیہ سے کفر کیا۔''

سنن ابو داود، ترمذی، صحیح ابن حبان، مستدرکِ حاکم اور مسندِ احمد میں ارشادِ نبوی ﷺ ہے:

«مَنْ حَلَفَ بِغَيْرِ اللّٰهِ فَقَدْ كَفَرَ» ''جس نے غیر اللہ کی قسم کھائی تو اس نے کفر کیا۔''

ایسی ہی دیگر احادیث سے استدلال کرتے ہوئے ان احادیث کی تاویل کی جاتی ہے کہ جیسے ان میں کفر سے مراد کفرِ اکبر نہیں، ایسے ہی نماز کے تارکین سے متعلق احادیث میں بھی کفر سے مراد کفرانِ نعمت یا کفر کے قریب ہونا مراد ہے، لہٰذا تارکِ نماز کافر نہیں بلکہ فاسق ہے۔

اس کے علاوہ وہ لوگ جو تارکِ نماز کے عدمِ کفر کے قائل ہیں، وہ کہتے ہیں کہ نبیِ اکرم ﷺ نے زانی، چور، ڈاکو، شرابی اور خائن سے ایمان کی نفی کی ہے، جیسا کہ صحیح بخاری و مسلم، سنن نسائی و ابن ماجہ اور مسند احمد میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ارشادِ نبوی ﷺ ہے:

---

[1] صحيح سنن ابن ماجه (٢/ ١١٨) للألباني، الصلاة لابن القيم و تحقيقه (ص:٥١)

[2] صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٣٠٤) صحيح سنن ترمذي، رقم الحديث (١١٦) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٦٣٩) و سنن الدارمي (١/ ٢٥٩) كتاب الوضوء، باب من أتى امرأته في دبرها، مسند أحمد (٢/ ٤٠٨، ٤٧٦) في مسند أبي هريرة رضی اللہ عنہ.

[3] صححه الحاكم والذهبي و ابن حبان، صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (٢٧٨٧) صحيح سنن الترمذي، رقم الحديث (١٢٤١) صحيح ابن حبان، الموارد، رقم الحديث (١١٧٧) مسند أحمد (٢/ ٨٦، ٨٧) المستدرك للحاكم (١/ ١٨) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٢٠٤٢)

«لَا يَزْنِي الزَّانِيُ حِيْنَ يَزْنِيُ، وَهُوَ مُؤْمِنٌ، وَلَا يَشْرَبُ الْخَمْرَ حِيْنَ يَشْرَبُهَا، وَهُوَ مُؤْمِنٌ، وَلَا يَنْهَبُ نَهْبَةً ذَاتَ شَرَفٍ يَرْفَعُ النَّاسُ إِلَيْهِ فِيْهَا أَبْصَارَهُمْ حِيْنَ يَنْتَهِبُهَا وَهُوَ مُؤْمِنٌ»[1]

''جب کوئی زنا کرتا ہے تو وہ زنا کے وقت مومن نہیں رہتا اور کوئی شرابی شراب پیتے وقت مومن نہیں رہتا، اور کوئی چور جب چوری کرتا ہے تو مومن نہیں رہتا اور کوئی ڈاکو جب ڈاکا ڈالتا ہے اور لوگ اس کی طرف نگاہیں اٹھا کر دیکھتے ہیں تو وہ اس وقت مومن نہیں رہتا۔''

صحیح مسلم اور مسند احمد میں یہ الفاظ بھی ہیں:

«وَلَا يَغُلُّ أَحَدُكُمْ حِيْنَ يَغُلُّ، وَهُوَ مُؤْمِنٌ، فَإِيَّاكُمْ وَإِيَّاكُمْ»[2]

''تم میں سے جب کوئی شخص مالِ غنیمت میں خیانت کرتا ہے تو وہ اس وقت مومن نہیں رہتا، لہٰذا خبردار رہو بچ کر رہو۔''

صحیح بخاری، سنن نسائی اور مسندِ احمد میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ایک حدیث ہے، جس میں اسی حدیث کی طرح زانی، چور اور شرابی کا تذکرہ ہے، لیکن ڈاکو کا ذکر نہیں، بلکہ اس کے بجائے قاتل سے نفی ایمان پر دلالت کرنے والے الفاظ ہیں:

«وَلَا يَقْتُلُ وَهُوَ مُؤْمِنٌ»[3]

''کوئی بندہ جب جریمہ قتل کا ارتکاب کرتا ہے تو وہ اس وقت مومن نہیں رہتا۔''

ایسے ہی صحیح بخاری و مسلم اور سنن ثلاثہ یعنی سنن ابوداود و ترمذی اور نسائی میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے، جس میں زانی، چور اور شرابی سے ارتکاب جرم کے وقت ایمان کی نفی کی گئی ہے، اس حدیث کے آخر میں یہ الفاظ بھی ہیں:

«وَالتَّوْبَةُ مَعْرُوْضَةٌ بَعْدُ»[4] ''توبہ کا دروازہ ابھی کھلا ہے۔''

---

[1] سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٣٩٣٦) صحيح البخاری مع الفتح، رقم الحديث (٢٤٧٥) صحيح سنن النسائي، رقم الحديث (٤٥٢٦)

[2] صحيح الجامع (٣/ ٦/ ٢٣٤، ٢٣٥) مختصر صحيح مسلم للمنذري، رقم الحديث (٤٣)

[3] صحيح الجامع (٢/ ٣/ ٢٣٥) صحيح البخاري مع الفتح، رقم الحديث (٦٨٠٩) صحيح سنن النسائي، رقم الحديث (٤٥٢٥)

[4] صحيح الجامع (٢/ ٣/ ٢٣٤) صحيح البخاري مع الفتح، رقم الحديث (٦٨١٠) صحيح سنن النسائي، ←

یہی حدیث مصنف ابن ابی شیبہ میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور ابن ابی اوفیٰ رضی اللہ عنہ سے بھی مروی ہے۔

عدمِ کفر کے قائلین کا کہنا ہے کہ ان جرائم کا ارتکاب کرنے سے ایمان کا نام زائل ہوجانے کے باوجود ان لوگوں پر کفرِ انکار (کفرِ اکبر) واجب نہیں کیا گیا اور نہ ان کے ہمیشہ کے جہنمی ہونے کو ضروری قرار دیا گیا ہے، ایسے ہی تارکِ نماز کا کفر کفرِ اکبر (یا کفرِ انکار) نہیں اور نہ اس کا یہ جرم ہمیشہ کے لیے اس کے جہنمی ہونے کا موجب ہے، اس پر مستزاد یہ کہ امانت ادا نہ کرنے بلکہ اس میں خیانت کرنے والے شخص سے بھی ایمان کی نفی کی گئی ہے اور عہد شکنی، وعدہ خلافی کرنے والے سے دین ہی کی نفی کی دی گئی ہے، جیسا کہ مسندِ احمد، سنن بیہقی، شعب الایمان بیہقی اور ''الأحاديث المختارة للضياء'' میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے:

«لَا إِيمَانَ لِمَنْ لَّا أَمَانَةَ لَهُ، وَلَا دِينَ لِمَنْ لَّا عَهْدَ لَهُ»[1]

''اس شخص کا کوئی ایمان نہیں جو امانت دار نہیں اور اس شخص کا کوئی دین نہیں جو عہد اور وعدہ کا پاس نہیں رکھتا۔''

اس حدیث میں ان کے ایمان اور دین کی نفی کی گئی ہے، لیکن ترکِ امانتداری اور عہد شکنی کرنا ایسے کفر کا موجب تو نہیں، جو انھیں ملت اسلامیہ ہی سے نکال باہر کریں۔ خصوصاً بعض صحابہ و تابعین اور ائمہ کے ایسے اقوال بھی ملتے ہیں کہ انھوں نے کفر سے کفرِ اکبر مراد نہیں لیا، جو آدمی کو دین اسلام ہی سے خارج کر دے، بلکہ اس سے ادنیٰ درجے کا کفر مراد لیا ہے، چنانچہ سورۃ المائدہ کی آیت میں جو ارشادِ الٰہی ہے:

﴿ وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ ﴾ [المائدة: ٤٤]

''اور جو لوگ اللہ کے نازل کردہ آسمانی قانون کے مطابق فیصلہ نہیں کرتے وہ کافر ہیں۔''

اس آیت میں وارد کفر کے متعلق حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ اس سے مراد وہ کفرِ (اکبر) نہیں جو تم سمجھتے ہو، چنانچہ امام طاؤس رحمہ اللہ بیان کرتے ہیں کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے جب اس

← رقم الحديث (٤٥٦٧) صحيح مسلم مع النووي (١/ ٢/ ٤٥) صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٩٢٣) صحيح سنن الترمذي، رقم الحديث (٢١١٧)

[1] صحيح الجامع (٣/ ٦/ ١٢٣) مشكاة المصابيح (١/ ١٧) مسند أحمد (٣/ ١٥٤) سنن البيهقي (٦/ ٢٨٨) بحواله تحقيق مصابيح السنة (١/ ١٢٣)

آیت کی تفسیر پوچھی گئی تو انھوں نے فرمایا:

"هُوَ بِهٖ كُفْرٌ، وَلَيْسَ كَمَنْ كَفَرَ بِاللّٰهِ وَمَلَائِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ"

"اس کا یہ فعل تو کفر ہے، لیکن یہ کفر اس شخص کے کفر جیسا نہیں جو اللہ، اس کے فرشتے، کتابوں اور رسولوں کا انکار و کفر کرتا ہے۔"

ترجمان القرآن حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا یہ بھی کہنا ہے:

"كُفْرٌ لَا يَنْقُلُ عَنِ الْمِلَّةِ"

"وہ کفر ایسا نہیں، جو اُسے ملتِ اسلامیہ ہی سے خارج کر دے۔"

ان کی یہ تفسیر مستدرکِ حاکم (۲/۳۱۳) میں مروی ہے، جسے امام حاکم نے صحیح قرار دیا ہے اور علامہ ذہبی نے بھی ان کی تصحیح کی ہے، جبکہ سفیان رحمہ اللہ ابن جریج رحمہ اللہ کے حوالے سے امام عطا رحمہ اللہ کا قول بیان کرتے ہیں:

"كُفْرٌ دُوْنَ كُفْرٍ، وَظُلْمٌ دُوْنَ ظُلْمٍ، وَفِسْقٌ دُوْنَ فِسْقٍ"[1]

"کفرِ اکبر سے ادنیٰ درجے کا کفر، ظلمِ عظیم سے ادنیٰ درجے کا ظلم اور فسق سے ادنیٰ درجے کا فسق۔"

کفر کی یہ تاویل تو واضح ہوگئی۔ الحمد للہ۔ اس تاویل کے سلسلے میں بعض کبار علما اور اہلِ علم کے تحقیقی فرمودات ملاحظہ کریں:

جائزہ:

صاحبِ نیل الاوطار نے "المنتقیٰ لأبي البرکات" اور "الصلاۃ لابن القیم" میں واردشدہ ایسی احادیث کے ساتھ بعض دیگر احادیث کا اضافہ بھی کیا اور لکھا ہے:

"المنتقیٰ کے مصنف مجد ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے اس تاویل کی تائید میں جو یہ احادیث وارد کی ہیں تو ان میں مذکورہ کفر کے بارے میں بھی اس طرح نزاع پایا جاتا ہے، جس طرح کہ تارکِ نماز پر کفر کے اطلاق میں پایا جاتا ہے، اس تاویل کی تنگ وادی میں قدم رکھنے کا سبب دراصل وہ وہم ہے، جس کی رو سے کفر اور عدمِ مغفرت کو لازم وملزوم قرار دے لیا

[1] الصلاۃ (۵۲/ ۵۳)

گیا ہے۔ (یعنی جس پر کفر کا لفظ آ گیا، اس کی بخشش نہیں ہوگی، اس وہم کو ایک قاعدہ کلیہ بنا لیا گیا ہے، حالانکہ) یہ کوئی قاعدہ کلیہ نہیں ہے، اس قاعدے کلیے کی نفی کثیر احادیث میں وارد لفظِ کفر کی تاویلات کے جھنجٹ میں پڑنے سے بچا لیتی ہے۔''

آگے فرماتے ہیں:

''جسے نبیِ اکرم ﷺ نے کافر کا نام دیا ہے، ہم بھی اسے کافر کہتے ہیں اور اس سے زیادہ نہ کچھ کہتے ہیں اور نہ تاویل ہی کرتے ہیں، کیونکہ اس کی کوئی ضرورت ہی نہیں ہے۔''[1]

بعض اہلِ علم نے تارکِ نماز کے کفر پر دلالت کرنے والی احادیث میں وارد کلمہ ''کفر'' اور ان دوسری احادیث میں وارد کلمہ ''کفر'' میں فرق کیا ہے، ان کا کہنا ہے:

''الف لام معرفہ کے ساتھ کفر سے مراد حقیقی کفر ہے اور نکرہ کے صیغہ کفر سے مراد یہ ہے کہ یہ کام کفر کے کاموں میں سے ہیں یا ان میں سے کسی کے ارتکاب سے کفر کا صدور ہوا، مگر وہ کافر نہیں ہوا، جو دائرہ اسلام سے خارج ہو جائے۔ امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے اپنی کتاب ''اقتضاء الصراط المستقیم'' میں اس موضوع پر تفصیلی بحث کی ہے۔''[2]

---

[1] نیل الأوطار (١/ ١/ ٢٩٧، ٢٩٨)

[2] اقتضاء الصراط المستقیم (١/ ٢٠٧، ٢٠٨) تحقیق دکتور ناصر العقل.

تمام دلائل پر طائرانہ نظر
اور
اُن کی اقسام

تارکِ نماز کو کافر نہیں بلکہ فاسق قرار دینے والوں کے جتنے بھی دلائل ہیں، ان پر ایک طائرانہ نظر ڈالیں تو پتا چلتا ہے کہ دورِ حاضر کے معروف عالم شیخ محمد بن صالح العثیمین کے تجزیہ کی رُو سے یہ سب دلائل پانچ صورتوں میں منحصر ہیں۔

پہلی قسم:

وہ دلائل جو ضعیف، غیر صحیح اور غیر صریح احادیث پر مشتمل ہیں، جن سے استدلال صحیح نہیں ہے۔

دوسری قسم:

ایسے دلائل یا نصوص جن میں زیرِ بحث مسئلے کے لیے اصلاً کوئی دلیل ہی نہیں ہے، مثلاً بعض لوگوں نے سورۃ النساء کی اس آیت سے استدلال کیا ہے، جس میں ارشادِ الٰہی ہے:

﴿ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَ يَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ﴾ [النساء: ٤٨]

''بے شک اللہ تعالیٰ اسے معاف نہیں کرے گا کہ اس کے ساتھ شرک کیا جائے۔ اس سے کم تر جس گناہ کو چاہے گا معاف کر دے گا۔''

یہاں ﴿مَا دُوْنَ ذٰلِكَ﴾ کا مطلب یہ تو ہر گز نہیں کہ شرک کے سوا تمام گناہ ہی ایسے ہیں، کیونکہ جس نے اللہ و رسول کے ارشادات کی تکذیب کی وہ کافر ہے اور اس کا کفر بھی ایسا ہے، جو قابلِ معافی ہے، لیکن یہ گناہ ظاہر ہے کہ شرک کی قبیل سے بھی نہیں۔

تیسری قسم:

تیسری قسم ایسی عام نصوص پر مبنی ہے، جو تارکِ نماز کے کفر پر دلالت کرنے والی احادیث سے خاص کر دی گئی ہیں۔ مثلاً جن احادیث میں کلمۂ شہادت کی برکت سے آگ حرام ہونے کا ذکر ہے، وہ عام ہیں اور ترکِ نماز کے کفر والی احادیث نے تارکِ نماز کو ان سے خاص کر کے نکال دیا ہے۔

چوتھی قسم:

چوتھی قسم ایسے عام دلائل پر مشتمل ہے، جو ایسے امور سے مربوط ومقید کر دیے گئے ہیں، جن کی موجودگی میں ترکِ نماز ممکن ہی نہیں، مثلاً جن احادیث میں اخلاصِ دل کے ساتھ اور خالص رضائے الٰہی کے لیے اقرارِ توحید ورسالت کا ذکر آیا ہے، جس کے عوض میں نارِ جہنم سے نجات کا ذکر ہے۔ تو یہ اخلاصِ دل کے ساتھ اور خالص رضائے الٰہی کے حصول والی شرطیں ایسے امور ہیں، جن کی موجودگی میں ترکِ نماز ناممکن ہے۔ اس لیے کہ جس نے بھی صدق و اخلاص کا رویہ اپنایا، اسے اس نے ادائے نماز پر آمادہ کیا، کیوں کہ نماز اسلام کا رکن اور بندے اور خالق کے مابین ایک تعلق ہے۔

اور اگر بندہ اللہ کی رضا کے حصول میں صادق ہے تو اس تک پہنچنے کے جو طریقے ہیں ان پر چلنا ضروری ہے اور یہ نماز انہی میں سے ایک ہے۔ اس طرح جس نے اخلاص، صدقِ دل سے توحیدِ باری تعالیٰ اور رسالتِ مصطفی ﷺ کا اعتراف کر لیا تو اسے یہ شہادت صرف رضائے الٰہی کے حصول کی خاطر نماز ادا کرنے پر آمادہ کرے گی اور اس میں وہ نبیِ اکرم ﷺ کی اتباع کرے گا، کیونکہ شہادتِ حق اور کامل سپردگی لازم وملزوم چیزیں ہیں۔ یعنی جب شہادتِ حق ہوگی تو پھر کامل سپردگی اور اتباع بھی ضرور ہوگی۔

پانچویں قسم:

پانچویں قسم ایسی نصوص پر مبنی ہے، جو کچھ ایسے احوال اور ظروف سے وابستہ ہیں، جن کے دوران میں انسان ترکِ نماز میں معذور ہے، جس پر کوئی مؤاخذہ نہیں ہے۔ جیسے وہ لوگ جو اسلامی تعلیمات کے فرض ہونے سے پہلے فوت ہوگئے، یا وہ لوگ جنھوں نے کلمۂ شہادت پڑھ کر توحید و رسالت

کی شہادت دے دی اور اسلام میں داخل ہوگئے، لیکن کسی عمل کی نوبت آنے سے پہلے ہی فوت ہوگئے یا مار دیے گئے اور انھیں شرائع اسلام پر عمل کرنے کا موق ہی نہیں ملا، یا یہ کہ کوئی شخص دارالکفر میں مسلمان ہوا اور ابھی تک اسلامی تعلیمات سے لاعلم تھا اور اسی حالت میں اسے موت آجائے۔ ایسے لوگ ترکِ نماز میں یا عدمِ ادائے نماز میں معذور شمار ہوں گے، ان پر کوئی مواخذہ نہیں ہوگا۔

حاصل کلام قائلینِ فسق کے پاس یا تو سرے سے کوئی صحیح دلیل ہے ہی نہیں یا پھر وہ دلیل کسی ایسے وصف سے وابستہ ہے، جس کی موجودگی میں ترکِ نماز کا کوئی امکان ہی نہیں ہوسکتا یا وہ نصوص ودلائل ایسے حالات سے مقید ہیں، جن میں ترکِ نماز کا عذر موجود ہے یا پھر ایسے عام دلائل ونصوص ہیں جو تارکِ نماز کی تکفیر کے ساتھ خاص کر دیے گئے ہیں۔[1]

قائلینِ کفر کے دلائل؛ قرآنِ کریم سے:

پچھلے اوراق میں ہم نے تارکِ نماز کا حکم اور اسے کافر نہیں، بلکہ مرتکب کبیرہ اور فاسق قرار دینے والوں کے دلائل ذکر کیے ہیں۔ بعض اہلِ علم کے اقوال و افادات کی روشنی میں ان کا تجزیہ بھی پیش کیا ہے۔ اب باری ہے تارکِ نماز کے بارے میں قائلینِ کفر کے دلائل کی، جس کے قائلین میں سے صحابہ وتابعین، تبع تابعین اور ائمہ ہیں تو آیے اس سلسلے میں پہلے قرآنِ کریم کا مطالعہ کریں۔

چنانچہ علامہ ابن قیم نے اپنی "کتاب الصلاۃ" میں قائلینِ فسق کے دلائل نقل کرنے کے بعد قائلینِ کفر کے دلائل بھی ذکر کیے ہیں اور قرآنِ کریم کے دس مقامات میں سے تارکِ نماز کے کفر پر استدلال اور وجوہِ استدلال بیان کی ہیں۔ جن میں سے تین مقامات کو "تارکِ نماز کے انجام" کے ضمن میں بھی ہم ذکر کر چکے ہیں، لہٰذا ان کی تفصیل کو دہرانے کے بجائے ان سے وجہِ استدلال کا خلاصہ بیان کرتے ہیں۔

1. ان تینوں میں سے پہلا مقام سورۃ المدثر آیت (۳۸ تا ۴۸) ہیں۔ جہاں مذکور ہے کہ جنتی لوگ مجرموں سے جہنم میں جانے کا سبب پوچھیں گے، تو وہ ترکِ نماز وغیرہ جرائم کا ذکر کریں گے۔ ان آیات میں سے آیت (۴۱) میں اللہ نے انھیں مجرم کہا ہے، جبکہ قرآنِ کریم کہ متعدد مقامات پر اللہ تعالیٰ نے مجرموں کو مومن مسلمانوں کی ضد قرار دیا ہے۔ جیسا کہ سورۃ القمر میں ارشادِ الٰہی ہے:

---

[1] دیکھیں: ماہنامہ "محدث" بنارس (جلد: ۸، شمارہ: ۴۰، ذوالقعدہ ۱۴۱۰ھ، جون ۱۹۹۰)

﴿اِنَّ الْمُجْرِمِیْنَ فِیْ ضَلٰلٍ وَّسُعُرٍ ۝ یَوْمَ یُسْحَبُوْنَ فِی النَّارِ عَلٰی وُجُوْھِھِمْ ذُوْقُوْا مَسَّ سَقَرَ﴾ [القمر: ٤٧، ٤٨]

''بے شک مجرمین (گناہ گار دنیا میں) گمراہ ہیں (اور آخرت میں) دہکتی آگ میں پڑیں گے، جس دن وہ اوندھے (جہنم کی) آگ میں گھسیٹے جائیں گے (تو ان سے کہا جائے گا) دوزخ کی آگ (تمھارے بدن سے) لگنے کا مزہ چکھو۔''

سورۃ المطففین میں ہے:

﴿اِنَّ الَّذِیْنَ اَجْرَمُوْا کَانُوْا مِنَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا یَضْحَکُوْنَ﴾ [المطففین: ٢٩]

''بے شک مجرمین (گناہ گار لوگ دنیا میں) ایمان والوں سے ہنستے (مسخرہ پن کرتے) تھے۔''

ان دو مقامات پر اللہ نے مجرمین کو مومن مسلمان کی ضد بتایا ہے۔ لہٰذا جب تارکِ نماز کو اہلِ جہنم مجرمین سے شمار کیا ہے اور مجرمین مومنین کی ضد ہیں تو یہ تارکِ نماز کے کفر کی دلیل ہوئی۔

٢ دوسرا مقام انتیسویں پارے کی سورۃ المرسلات آیت (٤٦ تا ٤٨) ہے، وہاں بھی آیت (٤٦) میں مجرمین کا ذکر ہوا ہے اور آیت (٤٧) میں مجرمین کو ویل و ہلاکت کی وعید سنائی گئی، جس کا سبب ترکِ نماز ہے۔ اللہ نے پانچ نمازیں روزانہ فرض کی ہیں اور ان کے ترک پر سخت سزاؤں کی وعید سنائی ہے، تو اگر کوئی ایمان دار ہو اور اللہ کی طرف سے اس حکم کے نزول کی تصدیق بھی کرتا ہو تو پھر یہ ناممکن ہے کہ وہ شخص ترک نماز پر مصر رہے۔ اگر کوئی ترکِ نماز پر پھر بھی مصر ہے، تو سمجھ لیں کہ اس کا دل ایمان سے بالکل خالی ہے اور یہ فعل اس کے لیے کفر پر دلالت کرتا ہے۔

٣ تیسرا مقام سورۃ توبہ کی آیت (١١) ہے، جہاں اخوتِ اسلامی کو توبہ و نماز اور زکات ادا کرنے کے ساتھ معلق قرار دیا گیا ہے اور جو نماز ادا نہیں کرتا، وہ مومنوں کے ساتھ اخوت کا مستحق نہیں، لہٰذا یہ بھی ان کے لیے غیر مومن ہونے کی وجہ سے ان کے کفر کی دلیل ہوئی۔

٤ چوتھا مقام سورۃ الماعون کی آیت (٤، ٥) ہے کہ نماز میں عدمِ پابندی اور اسے وقت سے بے وقت کر کے پڑھنے سے متعلق موضوع کے ضمن میں بھی گزری ہیں، جن میں اللہ نے ان نمازیوں کے لیے ویل کی وعید سنائی ہے، جو نمازوں سے بے خبر ہیں۔ وہاں اس بے خبری کا معنیٰ نمازوں کو بے وقت ادا کرنا لیا گیا تھا، جس کی دلیل ایک مرفوع مگر ضعیف اور حسن موقوف روایت ذکر

کی تھی۔ جبکہ بعض اہلِ علم نے بے خبری سے مراد ترکِ نماز بیان کی ہے۔ مثلاً حیوہ بن شریح، ابوصخر کے حوالے سے بیان کرتے ہیں کہ انھوں نے محمد بن کعب القرظی سے ﴿اَلَّذِيْنَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ﴾ کا معنیٰ پوچھا تو انھوں نے جواب دیا: "هو تاركها"[1]

اس آیت میں نماز سے بے خبر سے تارکِ نماز مراد ہے۔

اگر اس تفسیر کو نہ بھی لیا جائے اور کہا جائے کہ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہما والی موقوف اور حسن درجے کی تفسیر میں اس سے مراد نماز میں عدم پابندی ہی ہے، تو پھر ان دونوں میں سے پہلی آیت میں جو ویل کی وعید ہے، وہ قرآنِ کریم کے اکثر مقامات پر کفار کے لیے وارد ہوئی ہے۔ ہاں صرف دو مقامات پر غیر کفار یعنی فاسقین کے لیے وارد ہوئی ہے۔ ان دونوں مقامات میں سے ایک تو سورت تطفیف یا مطففین کی پہلی ہی آیت ہے:

﴿وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِيْنَ﴾ [المطففين:١] "ویل ہے ناپ تول میں کمی کرنے والوں کے لیے۔"

دوسری جگہ سورۃ الھمزہ کی پہلی ہی آیت ہے:

﴿وَيْلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةٍ﴾ [الهمزة:١]

"ویل ہے ہر طعنہ دینے والے اور عیب ٹٹولنے والے اور غیبت کرنے والے کے لیے۔"

یہ دو مقام ایسے ہیں، جہاں یہ ویل کی وعید کفار کے لیے نہیں، جبکہ دیگر مقامات پر ویل کفار کے لیے ہی مذکور ہوئی ہے۔ مثلاً سورت فصلت، جسے حم السجدہ بھی کہتے ہیں، اس میں ارشادِ الٰہی ہے:

﴿وَوَيْلٌ لِّلْمُشْرِكِيْنَ ۝ الَّذِيْنَ لَا يُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ كٰفِرُوْنَ﴾ [حم السجدة: ٦، ٧]

"ویل ہے مشرکین کے لیے جو زکات ادا نہیں کرتے اور وہ آخرت کے منکر ہیں۔"

سورۃ الجاثیہ میں فرمایا:

﴿وَيْلٌ لِّكُلِّ اَفَّاكٍ اَثِيْمٍ﴾ [الجاثية: ٧] "ویل ہے ہر جھوٹے گناہ گار کے لیے۔"

آگے اس کا سبب بتاتے ہوئے فرمایا:

"یہ اللہ کی باتیں سنتا ہے جو اس کے پاس پڑھی جاتی ہیں، پھر وہ ضد کرتا ہے غرور کی بنا پر

---

[1] بحواله الصلاة (ص: ٤٠)

(اور ایسے ہو جاتا ہے) گویا اس نے سنا ہی نہیں، ایسے شخص کو دردناک عذاب کی خوشخبری سنا دیں اور وہ جب ہماری باتوں میں سے کسی بات کی خبر پاتا ہے تو اس کا مذاق اڑاتا ہے، ایسے لوگوں کے لیے ذلّت ناک عذاب ہے۔''

سورت ابراہیم میں ہے:

﴿ وَ وَيْلٌ لِّلْكٰفِرِيْنَ مِنْ عَذَابٍ شَدِيْدٍ ﴾ [إبراهيم: ٢]

''اور کافروں کے لیے ویل ہے سخت عذاب سے۔''

ان مقامات پر اللہ تعالیٰ نے ویل کی وعید کفار ہی کو سنائی ہے۔ اور تارکِ نماز کو بھی ویل ہی کی وعید سنائی گئی ہے، جو اس کے کفر کی دلیل ہے۔ اور عام فُسّاق کی طرح تارکِ نماز نہیں ہے، بلکہ تارکِ نماز کو یہ وعید کفار کے ساتھ الحاق کرتے ہوئے یا اسے ان میں سے شمار کرتے ہوئے سنائی گئی ہے، جیسا کہ اس بات کے بہ کثرت دلائل آ رہے ہیں۔

⑤ قرآنِ مجید کے مذکورہ چار مقامات کے علاوہ پانچواں مقام جس سے تارکِ نماز کے کفر پر استدلال کیا جاتا ہے، سورت مریم کی آیت (۵۹) ہے، یہ بھی نماز میں عدمِ پابندی کے ضمن میں ذکر کی جا چکی ہے، اس میں ارشادِ الٰہی ہے:

﴿فَخَلَفَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ اَضَاعُوا الصَّلٰوةَ وَ اتَّبَعُوا الشَّهَوٰتِ فَسَوْفَ يَلْقَوْنَ غَيًّا ﴾ [مريم: ٥٩]

''پھر ایسے ناخلف لوگ ان کے جانشین بنے، جنھوں نے نماز کو ضائع کر لیا اور نفسانی خواہشات کی پیروی کی، عنقریب وہ غیّ یا گمراہی سے دوچار ہوں گے۔''

اگلی آیت میں فرمایا:

﴿اِلَّا مَنْ تَابَ وَ اٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَاُولٰٓئِكَ يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ وَلَا يُظْلَمُوْنَ شَيْئًا ﴾ [مريم: ٦٠]

''سوائے ان لوگوں کے جنھوں نے توبہ کی اور ایمان لائے اور اچھے عمل کیے، وہ جنت میں داخل ہوں گے اور ان کی ذرّہ برابر حق تلفی نہ ہو گی۔''

آیت اول میں مذکور ''غیّ'' کی تفسیر ذکر کی جا چکی ہے کہ وہ ایک گہری وادی ہے، جس میں

اہلِ جہنم کی پیپ بہتی ہے۔

ان آیات سے یوں استدلال کیا جاتا ہے کہ اللہ نے یہ جگہ نماز کو ضائع کرنے اور خواہشات کی پیروی کرنے والوں کے لیے بنائی ہے۔ اگر تارکِ نماز گناہگار مسلمانوں کے ساتھ ہوتا تو جہنم کے کسی اوپر کے طبقے میں ہوتا نہ کہ اس گہری کھائی میں، جب کہ یہ گہری کھائیاں یا وادیاں اہل اسلام کا نہیں بلکہ کفار کا ٹھکانا ہیں۔ یہیں ایک دوسری دلیل بھی موجود ہے اور وہ یوں کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ عنقریب وہ غي کے انجام سے دوچار ہوں گے، سوائے ان لوگوں کے جنھوں نے توبہ کی، ایمان لائے اور اچھے عمل کیے۔

ان الفاظ سے بھی بے نماز کے کفر کا پتا چلتا ہے، کیونکہ وہ مومن مسلمان ہی رہتا تو اس کی توبہ کے ساتھ ایمان لانے کی شرط نہ ہوتی، جب کہ اللہ تعالیٰ نے یہاں توبہ کے ساتھ ایمان لانے کا بھی ذکر کیا، جو اس کے کفر یعنی اہلِ ایمان میں سے نہ ہونے کی دلیل ہے۔

٦ ایک چھٹے مقام سے بھی تارکِ نماز کے کفر پر استدلال کیا جاتا ہے اور وہ ہے سورۃ المنافقون کی آیت (٩) جو ترجمہ و مختصر تفسیر سمیت عدمِ پابندی پر وعید کے ضمن میں گزر چکی ہے، جس میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

''اے ایمان والو! تمھیں تمھارے مال و اولاد اللہ کے ذکر (نمازِ پنج گانہ) سے غافل نہ کر دیں اور جو کوئی غفلت کرے گا تو ایسے لوگ ہی (قیامت کے دن) نقصان اٹھانے والے ہیں۔''

اس آیت سے یوں استدلال کیا جاتا ہے کہ اس آدمی کے لیے مطلق نقصان کا فیصلہ کیا ہے، جسے اس کے مال و اولاد نماز سے روک دیں یا غافل کر دیں اور مطلق نقصان صرف کفار کے ساتھ خاص ہے جب کہ مسلمان اگرچہ اپنے گناہوں کی وجہ سے نقصان اٹھاتا تو ہے لیکن آخر کار وہ فائدہ و نفع ہی پانے والا ہوتا ہے۔ اس آیت میں تو اللہ نے تاکید کی چار مختلف شکلوں کو یکجا جمع کر کے تارکِ نماز کے خسارے کو انتہائی یقینی کر دیا ہے، جو اس کے کفر کی دلیل ہے۔ تاکید کی ان چار قسموں کی تفصیل ''الصلاۃ لابن القیم'' (ص ٤٢، ٤٣) میں دیکھی جا سکتی ہے۔

٧ اس سلسلے کا ساتواں مقام سورۃ القلم ہے، جہاں پہلے فرمایا:

﴿ أَفَنَجْعَلُ الْمُسْلِمِينَ كَالْمُجْرِمِينَ ﴾ [القلم: ٣٥]

''کیا ہم مسلمانوں (فرمانبرداروں) کو گناہ گاروں (مجرموں) کے برابر کر دیں گے؟''

آگے فرمایا:

''تمھیں کیا ہو گیا ہے، تم کیسے فیصلہ کرتے ہو، کیا تمھارے پاس کوئی کتاب ہے۔ جس سے تم پڑھ لیتے ہو، اس میں تمھیں وہ ملتا ہے، جو تمھیں پسند ہے۔ کیا تم نے ہم سے قسمیں لے رکھی ہیں ٹھیک پہنچنے والی قیامت کے دن کہ تمھیں وہ ملے گا، جس کا تم فیصلہ کرو گے، ان سے پوچھیے کہ ان میں سے کون اس کا ذمّہ لیتا ہے۔ کیا ان کے واسطے کوئی شریک ہیں، پھر تو چاہیے کہ اگر وہ سچے ہیں تو اپنے شریکوں کو لے آئیں۔ جس دن کہ کھولی جائے گی پنڈلی (قیامت کے دن) اور وہ بلائے جائیں گے سجدہ کرنے کے لیے مگر وہ نہ کر سکیں گے۔ ان کی آنکھیں جھکی جا رہی ہوں گی، ان پر ذلت چڑھتی آتی ہو گی۔''

پھر اس کی وجہ بتاتے ہوئے فرمایا:

﴿ وَقَدْ كَانُوْا يُدْعَوْنَ اِلَى السُّجُوْدِ وَهُمْ سٰلِمُوْنَ ﴾ [القلم: ٤٣]

''وہ سجدوں کی طرف بلائے جاتے تھے، جبکہ وہ صحیح سالم تھے۔ (مگر انھوں نے کبھی سجدہ نہیں کیا تھا)۔''

ان آیات سے تارکِ نماز کے کفر پر یوں استدلال کیا جاتا ہے کہ اللہ نے یہ خبر دی ہے کہ وہ مسلمانوں کو مجرموں جیسا نہیں کرے گا، کیونکہ یہ اس کی حکمت کے لائق ہی نہیں ہے، پھر اس نے مجرموں کے جو حالات بیان کیے ہیں، مسلمانوں کے حالات کے برعکس ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جس دن پنڈلی کھولی جائے گی اور اس دن (روزِ قیامت) انھیں اللہ کے سامنے سجدہ ریز ہونے کے لیے بلایا جائے گا، مگر وہ مسلمانوں کے ساتھ مل کر سجدہ نہیں کر سکیں گے اور اس کا سبب دراصل یہ ہوگا کہ انھوں نے دنیا میں نمازیوں کے ساتھ مل کر سجدہ کرنا ترک کیے رکھا تھا، اس سے معلوم ہوا کہ تارکینِ نماز کا حشر کفار و منافقین کے ساتھ ہوگا، جن کی کمریں مسلمانوں کے الٰہ کو سجدہ کرنے کے وقت نہیں جھکیں گی اور اگر یہ تارکین نماز مسلمان ہوتے تو پھر انھیں بھی دوسرے مسلمانوں کی طرح سجدہ کرنے کی توفیق نصیب ہو جاتی تھی۔

٨ اسی موضوع کا آٹھواں مقام سورۃ النور ہے، جس میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ﴾

[النور: ٦٥]

''اور نماز قائم کرو اور زکات دو اور رسول اللہ ﷺ کی اطاعت کرو، تاکہ تم رحم کیے جاؤ۔''

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے حصولِ رحمت کو ان امور کی بجا آوری کے ساتھ معلق کر دیا ہے اور اگر تارکِ نماز موجب کفر اور دخولِ جہنم کا سبب نہیں تو پھر ان کو نماز پڑھے بغیر بھی مرحوم ہونا چاہیے تھا، حالانکہ اللہ تعالیٰ نے انھیں ان افعال کی بجا آوری کے بعد رحمت کے امیدوار بنایا ہے۔

۹ اس سلسلے میں نواں مقام سورۃ القیامہ ہے، جس میں ارشادِ الٰہی ہے:

﴿ فَلَا صَدَّقَ وَلَا صَلّٰی ۝ وَلٰكِنْ كَذَّبَ وَتَوَلّٰی ﴾ [القیامۃ: ۳۱، ۳۲]

''نہ اس نے تصدیق کی، نہ نماز پڑھی بلکہ تکذیب کی اور پیٹھ پھیری۔''

جب اسلام تصدیقِ خبر اور اطاعتِ امر کا نام ہے تو اللہ نے اس کی دو ضدیں بھی بتائی ہیں اور وہ ہیں عدمِ تصدیق اور عدمِ نماز، اور تصدیق کے مقابلے میں تکذیب کو اور نماز کے مقابلے میں پیٹھ پھیرنے کو رکھا ہے۔ پس جس طرح جھٹلانے یا تکذیب کرنے والا کافر ہے، ایسے ہی تارکِ نماز بھی ہے اور جس طرح تکذیب سے اسلام زائل ہو جاتا ہے، ایسے ہی نماز سے پیٹھ پھیرنے سے بھی اسلام زائل ہو جاتا ہے۔

۱۰ دسواں مقام سورۃ السجدہ ہے، جس میں ارشادِ الٰہی ہے:

﴿ اِنَّمَا يُؤْمِنُ بِاٰيٰتِنَا الَّذِيْنَ اِذَا ذُكِّرُوْا بِهَا خَرُّوْا سُجَّدًا وَّ سَبَّحُوْا بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَ هُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ ﴾ [السجدۃ: ۱۵]

''ہماری باتوں کو وہی مانتے ہیں، جنھیں جب سمجھایا جائے تو وہ سجدہ ریز ہو جاتے ہیں اور اپنے رب کی تسبیح بیان کرتے ہیں اور تکبر نہیں کرتے۔''

یہاں اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں سے ایمان کی نفی کی ہے، جنھیں اللہ کی آیات سے سمجھایا جائے تو حمدِ باری تعالیٰ بیان کرتے ہوئے سجدہ ریز نہیں ہو۔ اللہ کی آیات کے ساتھ تذکیر و نصیحت میں سب سے عمدہ اور اعلیٰ تذکیر نماز کی آیتوں سے تذکیر ہے، جسے ان آیات کے ساتھ سمجھایا گیا، مگر وہ نہ سمجھا اور نہ اس نے نماز ہی پڑھی تو گویا وہ ان پر ایمان ہی نہیں لایا، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے مومنوں کی یہ خصوصیت بیان کی ہے کہ وہ اہلِ سجود ہیں اور جو شخص نماز نہیں پڑھتا وہ سوائے سورۂ بقرہ آیت (۴۳) اور دوسری آیات کے الفاظ: ﴿وَأَقِيْمُوْا الصَّلٰوةَ﴾ ''اور نماز قائم کرو۔'' ان پر ایمان ہی نہیں لایا۔ یوں اس آیت سے اس کے کفر پر استدلال کیا گیا ہے۔[1]

[1] دیکھیں: کتاب الصلاۃ لابن القیم (ص: ۳۷، ۴۵)

قائلینِ کفر کے دلائل؛ احادیث کی روشنی میں:

سابقہ سطور میں ہم نے تارکِ نماز کے بارے میں کفر کی رائے رکھنے والوں کے قرآنی دلائل ذکر کیے ہیں، جبکہ ان کا استدلال متعدد احادیث سے بھی ہے، جن میں سے بعض احادیث ترکِ نماز کے انجام کے ضمن میں بھی ذکر کی جا چکی ہیں۔

1. مثلاً صحیح مسلم، سنن ابو داود، ترمذی، ابن ماجہ اور مسندِ احمد میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے:

«بَيْنَ الرَّجُلِ وَبَيْنَ الْكُفْرِ تَرْكُ الصَّلَاةِ»[1]

''بندۂ مومن اور کفر کے مابین ترکِ نماز (کا فرق) ہے۔''

جبکہ صحیح مسلم کے الفاظ ہیں:

«بَيْنَ الرَّجُلِ وَبَيْنَ الشِّرْكِ وَالْكُفْرِ تَرْكُ الصَّلَاةِ»

''بندۂ مومن اور شرک و کفر کے مابین صرف نماز ہی کا فرق ہے۔''

2. دوسری حدیث سننِ اربعہ، صحیح ابن حبان، مستدرکِ حاکم اور مسندِ احمد میں حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، جس میں وہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا:

«اَلْعَهْدُ الَّذِيْ بَيْنَنَا وَبَيْنَهُمُ الصَّلَاةُ فَمَنْ تَرَكَهَا فَقَدْ كَفَرَ»[2]

''ہمارے اور ان کفار و مشرکین کے مابین جو عہد ہے وہ نماز ہے، جس نے اسے چھوڑ دیا، اس نے کفر کیا۔''

3. تیسری حدیث ہبۃ اللہ لالکائی کی کتاب ''شرح اصول اعتقاد'' میں ہے کہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے آزاد کردہ

---

[1] المنتقیٰ مع النيل (١/ ١/ ٢٩١) صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٩١٢) صحيح سنن الترمذي، رقم الحديث (٢١١٢) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٠٧٨) صحيح سنن النسائي، رقم الحديث (٤٥٠) صحيح الترغيب، رقم الحديث (٥٦٣)

[2] صحيح الجامع (٢/ ٣/ ٦٤) المنتقیٰ (١/ ١/ ٢٩٣) عن بريدة، صحيح سنن الترمذي، رقم الحديث (٢١١٣) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٠٧٩) صحيح سنن النسائي، رقم الحديث (٤٤٩) صحيح ابن حبان، الموارد (٢٥٥) صحيح الترغيب، رقم الحديث (٥٦٣) مصابيح السنة، رقم الحديث (٤٠١) یہ حدیث سنن ابی داود میں مجھے نہیں ملی۔

غلام حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ انھوں نے نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا:

«بَيْنَ الْعَبْدِ وَبَيْنَ الْكُفْرِ وَالْإِيمَانِ الصَّلَاةُ، فَإِذَا تَرَكَهَا فَقَدْ أَشْرَكَ»[1]

''بندے اور اس کے کفر و ایمان میں وجۂ تمییز نماز ہے، جب اس نے نماز چھوڑ دی تو اس نے شرک کیا۔''

④ چوتھی حدیث طبرانی اور مروزی کی کتاب ''الصلاۃ'' میں ہے، حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں وصیت کی اور فرمایا:

«لَا تُشْرِكُوا بِاللّٰهِ شَيْئًا، وَلَا تَتْرُكُوا الصَّلَاةَ عَمَداً، فَمَنْ تَرَكَهَا عَمَداً مُتَعَمِّدًا فَقَدْ خَرَجَ مِنَ الْمِلَّةِ»[2]

''اللہ کے ساتھ کسی چیز کو شریک مت بناؤ اور نہ جان بوجھ کر نماز چھوڑو، پس جس نے جان بوجھ کر نماز چھوڑ دی، وہ ملت (اسلامیہ) سے خارج ہوگیا۔''

⑤ بعض روایات انفرادی طور پر تو ضعیف اور متکلم فیہ ہیں، البتہ ایک دوسرے کی شاہد ہیں، ان میں ایک مسند احمد و طبرانی کبیر میں حضرت معاذ رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً مروی ہے:

«مَنْ تَرَكَ صَلَاةً مَكْتُوبَةً مُتَعَمِّدًا فَقَدْ بَرِئَتْ مِنْهُ ذِمَّةُ اللّٰهِ»[3]

''جس نے کوئی فرض نماز جان بوجھ کر ترک کر دی، اس سے اللہ کا ذمہ بَری ہے۔''

⑥ حضرت ام ایمن رضی اللہ عنہا مرفوعاً بیان فرماتی ہیں:

«لَا تَتْرُكِي الصَّلَاةَ مُتَعَمِّدًا فَإِنَّهُ مَنْ تَرَكَ الصَّلَاةَ مُتَعَمِّداً فَقَدْ بَرِئَتْ مِنْهُ ذِمَّةُ اللّٰهِ وَرَسُولِهِ»[4]

''جان بوجھ کر نماز نہ چھوڑو، پس جس نے جان بوجھ کر نماز چھوڑ دی، اس سے اللہ اور اس کے رسول کا ذمہ بَری ہوگیا۔''

⑦ سنن ابن ماجہ اور مسند احمد میں حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ مجھے ابو القاسم صلی اللہ علیہ وسلم نے

[1] صحيح الترغيب والترهيب، رقم الحديث (٥٦٥)

[2] الصلاة (ص: ٤٧)

[3] الصلاة (ص: ٢٥، ٤٧) صحيح الترغيب، رقم الحديث (٥٦٨، ٥٦٩)

[4] مسند أحمد (٦/ ٤٢١) صحيح الترغيب و الترهيب، رقم الحديث (٥٧٢)

وصیت فرمائی:

«أَلَّا أَتْرُكَ الصَّلَاةَ مُتَعَمِّدًا فَمَنْ تَرَكَهَا مُتَعَمِّدًا فَقَدْ بَرِئَتْ مِنْهُ ذِمَّةُ اللّٰهِ»[1]

''میں جان بوجھ کر نماز نہ چھوڑوں، کیوں کہ جس نے جان بوجھ کر نماز چھوڑ دی، اس سے اللہ کا ذمہ بَری ہوگیا (یعنی وہ اللہ کے ذمے سے نکل گیا)۔''

ان تینوں روایات کے مجموعی مفاد سے معلوم ہوا کہ تارکِ نماز سے اللہ کا ذمہ بَری ہو جاتا ہے، جو اس کے ملت اسلامیہ سے خروج کی دلیل ہے، کیونکہ بہ قول علامہ ابن قیم رحمہ اللہ اگر وہ اسلام پر ہی ہوتا تو پھر اُسے اسلام کا ذمہ حاصل ہونا تھا۔

۸ اسی موضوع کی آٹھویں حدیث صحیح ابن حبان، معجم طبرانی کبیر، معجم طبرانی اوسط اور مسندِ احمد میں مروی ہے، جو نماز پر عدمِ پابندی کے ضمن میں بھی گزر چکی ہے، جس میں حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک دن نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ذکر کرتے ہوئے فرمایا:

''جو شخص اس پر محافظت کرے گا، اس کے لیے یہ قیامت کے دن نور، دلیلِ خیر اور ذریعہ نجات بن جائے گی اور جس نے اس پر پابندی نہ کی تو یہ اس کے لیے نور ہوگی نہ دلیلِ خیر اور نہ ذریعہ نجات ہی:

«وَكَانَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ مَعَ قَارُوْنَ وَ فِرْعَوْنَ وَهَامَانَ وَأُبَيِّ بْنِ خَلَفٍ»[2]

''قیامت کے دن اس شخص کا حشر قارون، فرعون، ہامان اور ابی بن خلف کے ساتھ ہوگا۔''

اس حدیث کی تشریح ہم ذکر کر چکے ہیں کہ ان بدنامِ زمانہ لوگوں کے ساتھ اس کا حشر کیوں ہوگا؟ نماز پر عدمِ پابندی کے نتیجے میں عالمِ کفر کے ان چار ستونوں کے ساتھ حشر ہونے کو بنیاد بناتے ہوئے بھی تارکِ نماز کے کفر کی رائے اختیار کی گئی ہے۔

۹ نویں دلیل وہ ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے، جو سنن ترمذی و ابن ماجہ، الایمان لابن ابی شیبہ اور مسندِ احمد میں مروی ہے، جسے تعددِ طُرق کی بنا پر صحیح قرار دیا گیا ہے، اس میں حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

---

[1] صحيح الترغيب، رقم الحديث (٥٦٥) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٤٠٣٤)

[2] صحيح ابن حبان، رقم الحديث (٢٥٤)

«رَأْسُ الْأَمْرِ الْإِسْلَامُ، وَعُمُودُهُ الصَّلَاةُ»[1]

''امرِ دین کی چوٹی اسلام ہے اور اسلام کا ستون نماز ہے۔''

اس حدیث سے یوں استدلال کیا جاتا ہے کہ نماز کا مقام اسلام میں ایسے ہے، جیسے کسی خیمے کا ستون ہو اور جس طرح ستون گر جانے سے خیمہ ہی گر جاتا ہے، اسی طرح نماز چھوڑ دینے سے بھی اسلام چھوٹ جاتا ہے۔ امام احمد رحمہ اللہ نے تارکِ نماز کے کفر پر اسی حدیث سے ایسے ہی استدلال کیا ہے۔[2]

(۱۰) ایک دسویں حدیث صحیح بخاری شریف اور دیگر کتب میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، جس میں ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے:

«مَنْ صَلّٰى صَلَاتَنَا، وَاسْتَقْبَلَ قِبْلَتَنَا، وَأَكَلَ ذَبِيْحَتَنَا فَهُوَ الْمُسْلِمُ، لَهٗ مَا لَنَا، وَعَلَيْهِ مَا عَلَيْنَا»[2]

''جس نے ہماری طرح نماز پڑھی، ہمارے قبلے کی طرف رخ کیا اور ہمارا ذبیحہ گوشت کھایا وہ مسلمان ہے، اس کے وہی حقوق ہیں جو ہمارے ہیں اور اس پر وہی واجبات ہیں جو ہم پر ہیں۔''

اس حدیث سے یوں استدلال کیا جاتا ہے کہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے ان تینوں امور کی موجودگی میں مسلمان کہا ہے، اگر یہ نہیں تو وہ مسلمان نہیں، دوسرا استدلال یوں کہ اگر کوئی شخص مشرق کی طرف منہ کر کے نماز پڑھے تو وہ مسلمان نہیں ہوگا تو کہاں وہ شخص جو بالکل ہی نماز ترک کر دے، وہ کیسے مسلمان ہوسکتا ہے۔

(۱۱) گیارھویں حدیث، جو صحیح بخاری و مسلم، سنن ترمذی و نسائی، صحیح ابن حبان و ابن خزیمہ، طبرانی کبیر، بیہقی، ابو یعلی اور مسند احمد میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«بُنِيَ الْإِسْلَامُ عَلٰى خَمْسٍ: شَهَادَةِ أَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَأَنَّ مُحَمَّداً رَّسُوْلُ اللّٰهِ، وَإِقَامِ الصَّلَاةِ، وَإِيْتَاءِ الزَّكَاةِ، وَالْحَجِّ، وَصَوْمِ رَمَضَانَ»[3]

---

[1] صحیح سنن الترمذي، رقم الحدیث (۲۱۱۰) سنن ابن ماجه، رقم الحدیث (۳۹۷۳) مسند أحمد (۵/ ۲۳۱)

[2] الصلاة لابن القیم (ص: ۴۸) و کتاب الصلاة للإمام أحمد (ص: ۴۲)

[3] صحیح البخاري مع الفتح (۱/ ۴۹۶) کتاب الصلاة، باب فضل استقبال القبلة، صحیح سنن النسائي، رقم الحدیث (۴۶۲۴) صحیح الجامع، رقم الحدیث (۶۳۵۰)

[4] صحیح البخاري مع الفتح(۱/ ۴۹) بتحقیق کتابنا سوئے حرم، رقم الحدیث (۱)

”اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر ہے: اس بات کی گواہی دینا کہ اللہ کے سوا کوئی معبودِ برحق نہیں اور حضرت محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں اور نماز قائم کرنا اور زکات ادا کرنا اور حج کرنا اور رمضان کے روزے رکھنا۔“

اس حدیث سے کئی طرح سے استدلال کیا گیا ہے، پہلی صورت یہ کہ نبیِ اکرم ﷺ نے اسلام کو ایک قبہ یا گنبد قرار دیا ہے، جو پانچ ارکان پر کھڑا ہو، پس جب اس کا ایک رکن گر جائے تو وہ پورا ہی گر جاتا ہے اور یوں بھی استدلال کیا گیا ہے کہ نبیِ اکرم ﷺ نے ان پانچ ارکان کو اسلام قرار دیا ہے اور یہ پانچوں ہی اسلام کی حقیقت کے اجزا ہیں، یعنی اس کی حقیقت مسمی میں داخل ہیں، پس جب ان میں سے بعض چیزیں نہ رہیں تو مسمّٰی ہی نہ رہا۔ خصوصاً جبکہ وہ چیز اس کے ارکان میں سے ہو نہ کہ ایسے اجزا سے جو اس کے ارکان نہیں، جیسے گھر کی دیوار ہے کہ جب وہ گر جائے تو وہ گھر ہی گر جاتا ہے، برعکس اس کے کہ کوئی لکڑی یا اینٹ گر جائے تو گھر گرنے نہیں پاتا۔

گویا نماز گھر کی وہ دیوار ہے، جس پر شہتیر رکھا ہوتا ہے۔ جب وہ دیوار ہی نہ رہے گی تو وہ گھر یا کمرہ بھی نہیں رہے گا، اسی طرح جب کوئی نماز ہی کا تارک ہوگا تو اس کا اسلام منہدم ہوجائے گا۔

اسی طرح قائلینِ کفر کا استدلال ان احادیث سے بھی ہے جن میں مذکور ہے کہ اگر کوئی شخص اپنے گھر میں یا ڈیرے پر نماز پڑھ چکا ہو اور جماعت ہوتی دیکھے تو دوبارہ اس میں شامل ہوجائے، یہ نماز اس کے لیے نفلی ہوجائے گی، جیسا کہ اس مسئلے کی تفصیل بھی گزر چکی ہے کہ پہلی فرض اور دوسری پڑھی گئی نماز نفلی ہوگی۔ اس موقع پر ہم نے اس موضوع پر دلالت کرنے والی متعدد احادیث ذکر کی تھیں، جبکہ زیرِ بحث مسئلے پر دلالت کرنے والی حدیث سنن نسائی، موطا امام مالک، مستدرکِ حاکم اور مسندِ احمد میں حضرت مجحن بن ادرع اسلمی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، جس میں وہ بیان کرتے ہیں کہ میں نبیِ اکرم ﷺ کے ساتھ بیٹھا تھا کہ اذان ہوئی، نبیِ اکرم ﷺ اُٹھ گئے اور نماز پڑھ کر جب لوٹے تو دیکھا کہ میں اسی جگہ بیٹھا ہوں تو آپ ﷺ نے فرمایا:

«مَا مَنَعَكَ أَنْ تُصَلِّيَ، أَلَسْتَ بِرَجُلٍ مُّسْلِمٍ؟»

”تمھیں نماز سے کس چیز نے روکا ہے؟ کیا تم مسلمان نہیں ہو؟“

اس پر حضرت مجحن رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

''بَلٰی، وَلٰکِنِّيْ صَلَّیْتُ فِيْ أَھْلِيْ ››

''میں مسلمان ہوں، البتہ نماز میں نے اپنے اہل و عیال کے ساتھ پڑھ لی تھی۔''

تب آپ ﷺ نے فرمایا:

‹‹ إِذْ جِئْتَ فَصَلِّ مَعَ النَّاسِ، وَإِنْ کُنْتَ قَدْ صَلَّیْتَ ›› [1]

''جب تم آؤ تو لوگوں کے ساتھ مل کر نماز پڑھ لو، چاہے تم پہلے نماز پڑھ ہی کیوں نہ چکے ہو۔''

اس ارشادِ گرامی کے الفاظ: ''کیا تم مسلمان نہیں ہوا۔'' میں نبیِ اکرم ﷺ نے مسلم و کافر کے مابین تفریق کرنے والی چیز نماز کو قرار دیا ہے۔ اس حدیث کے بین السطور میں یہ چیز محسوس کی جا سکتی ہے کہ اگر تم مسلمان ہوتے تو نماز پڑھتے اور اگر نماز کے بغیر بھی کسی کا اسلام ثابت ہوتا تو نبیِ اکرم ﷺ اس شخص کو جس نے آپ ﷺ کے ساتھ نماز نہیں پڑھی تھی، اسے آپ ﷺ یہ نہ کہتے کہ کیا تم مسلمان نہیں ہو؟ یہ الفاظ تارکِ نماز کے کفر کی دلیل ہیں۔

اجماعِ صحابہ رضی اللہ عنہم:

قرآنی آیات اور احادیثِ نبویہ کے علاوہ تارکِ نماز کے کفر کی رائے رکھنے والوں کا استدلال بعض آثارِ صحابہ رضی اللہ عنہم سے بھی ہے، جن میں نہ صرف یہ کہ ان صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی رائے مذکور ہے، بلکہ اس بات پر صحابہ رضی اللہ عنہم کے اجماع و اتفاق کا پتا چلتا ہے، مثلاً سنن ترمذی و مستدرک حاکم میں حضرت عبداللہ بن شقیق عقیلی رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں:

''کَانَ أَصْحَابُ رَسُوْلِ اللّٰہِ ﷺ لَا یَرَوْنَ شَیْئًا مِّنَ الْأَعْمَالِ تَرْکُہٗ کُفْرٌ غَیْرَ الصَّلَاۃِ'' [2]

''حضرت عبداللہ بن شقیق عقیلی رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ نبیِ اکرم ﷺ کے صحابہ کسی بھی عمل کے ترک کرنے کو کفر نہیں سمجھتے تھے، سوائے ترکِ نماز کے۔''

یہ اثر اس بات کا پتا دیتا ہے کہ تارکِ نماز کے کفر پر تمام صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی رائے متفق ہوگئی

[1] سنن النسائي مع التعلیقات السلفیة (۱/ ۹۹) و الصلاۃ لابن القیم و تحقیقه (ص: ۴۹، ۵۰)

[2] المنتقیٰ (۱/ ۱/ ۲۹۳) مشکاۃ المصابیح (۱/ ۱۸۳) صحیح سنن الترمذي، رقم الحدیث (۲۱۱۴) صحیح الترغیب (٥٦٤) والحاکم (۱/ ۷) بحواله تحقیق صحیح الترغیب (۱/ ۲۲۷)

تھی اور ایسے ہی وہ واقعہ بھی ہے جو حضرت عمرِ فاروق رضی اللہ عنہ کے بارے میں کتبِ حدیث میں وارد ہوا ہے، چنانچہ موطا امام مالک میں صحیح سند کے ساتھ اور انھی کے طریق سے سنن کبریٰ بیہقی میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ جب امیر المومنین حضرت عمرِ فاروق رضی اللہ عنہ کو خنجر مار کر زخمی کیا گیا، تو کچھ دوسرے لوگوں کے ساتھ مل کر میں انھیں مسجد سے اٹھا کر ان کے گھر لے گیا۔ حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ نے حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کو حکم فرمایا کہ وہ لوگوں کو نماز پڑھائیں، پھر جب ہم حضرت عمرِ فاروق رضی اللہ عنہ کے گھر گئے تو وہ موت کی غشی میں تھے۔ کچھ دیر وہ اسی حالت میں رہے، پھر انھیں کچھ افاقہ ہوا تو انھوں نے پوچھا:

«هَلْ صَلَّى النَّاسُ؟» ''کیا لوگوں نے نماز پڑھی ہے؟''

انھیں بتایا گیا کہ ہاں تو انھوں نے فرمایا:

''لَا إِسْلَامَ لِمَنْ تَرَكَ الصَّلَاةَ'' ''اس کا کوئی اسلام نہیں، جو نماز نہیں پڑھتا۔''

دوسرے سیاق میں ہے کہ حضرت عمرِ فاروق رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

«لَا حَظَّ فِي الْإِسْلَامِ لِمَنْ تَرَكَ الصَّلَاةَ»

''اس کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں، جس نے نماز ترک کر دی۔''

یہ فرمانے کے بعد پھر پانی منگوا کر وضو کیا اور نماز ادا فرمائی۔[1]

مجمع الزوائد میں علامہ ہیثمی نے اس واقعے کو طبرانی اوسط کی طرف منسوب کیا ہے، جس میں حضرت مسور بن مخرمہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں حضرت عمرِ فاورق رضی اللہ عنہ کا پتا لینے ان کے گھر گیا تو دیکھا کہ وہ کپڑے میں لپٹے بے سُدھ پڑے تھے۔ میں نے حاضرین سے پوچھا کہ ان کا کیا حال ہے؟ تو انھوں نے کہا: جیسا آپ دیکھ رہے ہیں، (بے ہوش پڑے ہیں) میں نے کہا کہ انھیں نماز کے حوالے سے ہوش میں لاؤ، کیونکہ نماز سے بڑھ کر خوفزدہ کر کے جگانے والی دوسری کوئی چیز نہیں، تو پاس بیٹھے لوگوں نے کہا:

''اَلصَّلَاةُ يَا أَمِيرَ الْمُؤْمِنِينَ'' ''اے مومنوں کے امیر! نماز کا وقت ہے۔''

یہ سننا تھا کہ وہ فوراً پکار اُٹھے: ''هَا اللّٰهِ إِذًا'' ''تو چلیے پھر۔'' ساتھ ہی فرمایا:

---

[1] بحوالہ الصلاۃ لابن القیم وتحقیقہ (ص:۲۱۔ ۵۰)

”وَلَا حَقَّ فِي الْإِسْلَامِ لِمَنْ تَرَكَ الصَّلَاةَ“[1]

”اس کا اسلام میں کوئی حصہ نہیں جس نے نماز ترک کر دی۔“

حضرت مسور رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

«فَصَلَّى وَإِنَّ جُرْحَهُ يَثْعُبُ دَمًا»

”پھر انھوں نے نماز ادا کی، جبکہ ان کے زخم سے خون جاری تھا۔“

اس واقعے سے اجماعِ صحابہ پر یوں استدلال کیا جاتا ہے کہ حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ نے یہ کلمات کثیر صحابہ رضی اللہ عنہم کی موجودگی میں کہے اور ان میں سے کسی نے بھی ان پر نکیر نہیں کی تھی جو ان کلمات پر رضا مندی اور موافقت کی دلیل ہے۔

تارکِ نماز کے حکم کا موضوع شروع کرتے وقت آغاز میں ہم ذکر کر چکے ہیں کہ کتنے ہی صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کا یہی نظریہ تھا، حتیٰ کہ علامہ ابن حزم نے تو بعض صحابہ رضی اللہ عنہم کے اسمائے گرامی ذکر کرنے کے بعد لکھا ہے:

”لَا نَعْلَمُ لِهٰؤُلَآءِ مِنَ الصَّحَابَةِ مُخَالِفًا“

”ہمیں صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم میں سے ان کی مخالفت پر، کسی کا علم نہیں ہو سکا۔“

ان کے یہ الفاظ بھی اجماعِ صحابہ کی طرف ہی اشارہ کر رہے ہیں اور فقہ مقارن کی بہترین کتاب ”المغني“ میں امام ابن قدامہ رحمہ اللہ نے بعض صحابہ کرام کے اقوال بھی نقل کیے ہیں، مثلاً حضرت عمرِ فاروق اور عبداللہ بن شقیق رضی اللہ عنہما کے اقوال کے علاوہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا مقولہ نقل کرتے ہیں، جس میں وہ ارشاد فرماتے ہیں:

”مَنْ لَّمْ يُصَلِّ فَهُوَ كَافِرٌ“ ”جو نماز نہیں پڑھتا تو وہ کافر ہے۔“

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

”مَنْ لَّمْ يُصَلِّ فَلَا دِيْنَ لَهُ“[2] ”جس نے نماز نہ پڑھی تو اس کا کوئی دین نہیں۔“

آثارِ تابعین و تبع تابعین رحمہم اللہ:

تارکِ نماز کے کفر پر دلالت کرنے والے بعض آثارِ تابعین و تبع تابعین رحمہم اللہ بھی ہیں، جنھیں

---

[1] بحواله الصلاة للكليب (ص: ٢٠٥) من المجموعة.

[2] المغني (٣/ ٣٥٥، طبع جديد بتحقيق التركي)

محمد بن نصر مروزی رحمہ اللہ کے حوالے سے علامہ ابن قیم نے روایت کیا ہے، مثلاً امام ایوب رحمہ اللہ کا قول ہے:

”تَرْكُ الصَّلَاةِ كُفْرٌ لَا يُخْتَلَفُ فِيْهِ“

”ترکِ نماز کفر ہے، جس میں اختلاف نہیں ہونا چاہیے۔“

امام عبداللہ بن مبارک رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

”مَنْ أَخَّرَ صَلَاةً حَتّٰى يَفُوْتَ وَقْتُهَا مُتَعَمِّداً مِنْ غَيْرِ عُذْرٍ فَقَدْ كَفَرَ“

”جس نے بلا عذر جان بوجھ کر نماز کو اتنا مؤخر کر دیا کہ اس کا وقت ہی ختم ہوگیا تو اس نے کفر کیا۔“

ایک دوسرے قول میں وہ کہتے ہیں:

”مَنْ قَالَ: إِنِّيْ لَا أُصَلِّيْ الْمَكْتُوْبَةَ الْيَوْمَ فَهُوَ أَكْفَرُ مِنْ حِمَارٍ“

”جس نے یہ کہا کہ میں آج کی فرض نماز نہیں پڑھوں گا تو وہ گدھے سے بھی بدتر کافر ہے۔“

اسی طرح امام ابن ابی شیبہ اور اسحاق رحمہما اللہ کے اقوال بھی ہیں۔[1] ان کے علاوہ متعدد ائمہ وفقہا کے اسمائے گرامی بھی اس موضوع کے آغاز میں ذکر کیے جا چکے ہیں، جنھیں دہرانے کی ضرورت نہیں۔

محاکمہ:

اس طرح تارکِ نماز کے بارے میں دونوں طرح کی آرا کے دلائل تو کافی تفصیل سے آ گئے، اب ہر دو طرح کے دلائل کو سامنے رکھتے ہوئے کسی نتیجے پر پہنچنے کے لیے ان کے مابین فیصلہ باقی ہے، اس سلسلے میں ہم بعض محققین و مجتہدین اور فقہا و محدّثین کی طرف رجوع کرتے ہیں۔

امام ابن قدامہ:

سب سے پہلے فقہ حنبلی کے رکنِ رکین امام ابن قدامہ کی رائے دیکھیں! چنانچہ موصوف ”المغني“ میں کئی صفحات پر مشتمل بحث میں لکھتے ہیں کہ اگر کوئی نماز کی فرضیت کا قائل ہو، اس کا انکار نہ کرے، البتہ بے پروائی اور سستی کی وجہ سے نماز نہ پڑھے تو اسے تین دن تک نماز کی طرف بلایا جائے اور کہا جائے کہ تم نے نماز شروع نہ کی تو تمھیں قتل کر دیا جائے گا۔ اگر وہ پابند ہوجائے تو ٹھیک ہے، ورنہ اُسے قتل کرنا واجب ہے اور اگر وہ فرضیت کا ہی منکر ہو تو وہ مرتد ہے۔

---

[1] الصلاة (ص: ٦٣، ٦٤)

اگر اقرار کے وجوب کے باجود نماز نہ پڑھے تو وہ سزائے موت کا مستحق ہے، لیکن وہ کافر نہیں۔ کفر پر دلالت کرنے والی جو احادیث ہیں، وہ وعید میں شدت پر دلالت کرتی ہیں کفرِ حقیقی پر نہیں۔ یہی صحیح تر بات ہے۔ بے پروائی سے ترکِ نماز کرنے والے کے ساتھ عام کفار کا سا سلوک نہیں کیا جائے گا، بلکہ وہ کہتے ہیں کہ ہم نہیں جانتے کہ کسی بھی زمانے میں تارکِ نماز کے مر جانے پر اُسے غسل نہ دیا گیا ہو، اس کا جنازہ نہ پڑھا گیا ہو اسے مسلمانوں کے قبرستان میں دفن نہ کیا گیا ہو اس کے وارثوں کو اس کی میراث سے اور نہ اس کے بزرگوں کی وراثت سے منع کیا گیا اور نہ ترکِ نماز کی وجہ سے میاں بیوی میں تفریق کی گئی، جبکہ تارکین نماز (ہر زمانے میں) کثرت سے رہے ہیں۔ اگر ایسا تارکِ نماز اپنے حقیقی معنوں میں کافر ہوتا تو اس پر یہ تمام احکام ثابت ہوتے۔[1]

امام شوکانی:

مجتہدِ مطلق امام شوکانی رحمہ اللہ نیل الاوطار میں دونوں طرح کے دلائل کے مابین محاکمہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

حق یہی ہے کہ تارکِ نماز کافر ہے (اور توبہ نہ کرنے کی شکل میں) اسے قتل کیا جائے گا۔ وہ کافر اس بنا پر ہے کہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے کافر کہا ہے اور کسی آدمی اور اس پر اس نام (کفر) کے اطلاق کے جواز کے مابین حائل صرف نماز کو قرار دیا ہے، لہٰذا ترکِ نماز کا تقاضا ہے کہ ایسے آدمی پر اس نام (کفر) کا اطلاق جائز ہو۔

عدمِ کفر کی رائے رکھنے والوں نے قائلینِ کفر پر جو اعتراضات وارد کیے ہیں، ہم پر وہ کچھ بھی لازم نہیں کرتے، کیونکہ ہم کہتے ہیں کہ کفر کی بعض انواع و اقسام کا بخشش اور حقِ شفاعت میں غیر مانع ہونا ممکن ہے، جیسا کہ اہلِ قبلہ مسلمانوں کے بعض گناہوں کا نام نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کفر رکھا ہے اور جب ایسا ہے تو پھر ہمیں ان تاویلات کی ضرورت نہیں، جن میں لوگ مبتلا ہیں۔ آگے اس کے قتل کیے جانے کے دلائل ذکر کیے ہیں، جو ایک الگ موضوع ہے۔[2]

امام ابن قیم:

اسی سلسلے میں جب ہم علامہ ابن قیم رحمہ اللہ کے فیصلے پر مبنی خیالات کا مطالعہ کرتے ہیں تو معلوم

---

[1] یہ محض خلاصہ ہے۔ تفصیل کے لیے "المغني" (۳/ ۳۵۱ تا ۳۵۹، طبع جدید) ملاحظہ فرمائیں۔

[2] نیل الأوطار شوکانی (۱/ ۱/ ۲۹۲)

ہوتا ہے کہ موصوف نے بھی انتہائی وسعتِ نظر، گہری بصیرت اور محققانہ و غیر جانبدارانہ انداز سے (۱۴،۱۳) صفحات صرف محا کے پر تحریر کیے ہیں۔ علامہ موصوف کا کلام اتنا جامع و مانع ہے کہ اس میں اختصار بھی کوئی آسان کام نہیں، بہر حال ہماری کوشش ہے کہ ان کے خیالات کا خلاصہ آپ کے سامنے رکھا جا سکے۔ موصوف لکھتے ہیں:

''تارکِ نماز کے کفر یا عدمِ کفر کے مسئلے میں حق وصواب معلوم کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ایمان اور کفر کی حقیقت معلوم ہو، پھر ہی نفی یا اثبات کا فیصلہ ہوسکتا ہے، چناں چہ کفر اور ایمان دو باہم مقابل اشیا ہیں۔ ایمان ایک ایسی اصل ہے، جس کے کئی شعبے ہیں اور ہر شعبے کا نام ایمان ہے، اسی طرح نماز بھی جزوِ ایمان ہے، زکات، حج اور روزہ بھی، اسی طرح ان ظاہری اعمال کے علاوہ باطنی اعمال مثلاً حیا، توکّل علی اللہ، خشیت وخوفِ الٰہی اور انابت و رجوع الی اللہ بھی ایمان کے اجزا ہیں، حتی کہ راستے سے کسی تکلیف دہ چیز کو ہٹانا بھی ایمان کا ایک شعبہ ہے، ان شعبوں میں سے بعض ایسے بھی ہیں، جن کے زائل ہونے سے ایمان ہی زائل ہوجاتا ہے، جیسے شہادتِ توحید و رسالت ہے اور ان شعبوں میں سے بعض وہ ہیں جن کے زائل ہونے سے بھی ایمان زائل نہیں ہوتا، جیسے راستے سے تکلیف دہ چیز کے ہٹانے کو ترک کرنا۔ ایمان کے کچھ شعبے ایسے ہیں، جو شہادت سے ملحق ہیں اور اس کے قریب ہیں اور بعض ایسے ہیں جو راستے میں پڑی تکلیف دہ چیز ہٹانے سے ملحق ہیں اور اسی کے قریب تر ہیں۔

ایمان کی اس قسم کی طرح ہی کفر کی اصل اور کئی شعبے ہیں۔ جس طرح ایمان کے شعبے ایمان ہیں، اسی طرح کفر کے شعبے بھی کفر ہیں۔ حیا ایمان کا حصہ ہے اور بے حیائی کفر کا ایک شعبہ ہے۔ سچائی ایمان کے شعبوں میں سے ایک شعبہ ہے تو جھوٹ بھی کفر کا ایک شعبہ ہے۔ نماز پڑھنا، زکات دینا، حج کرنا اور روزے رکھنا ایمان کے شعبے ہیں اور ان کا ترک کرنا کفر کے شعبوں میں سے ہے۔ اللہ کے نازل کردہ آسمانی قانون کے مطابق فیصلہ کرنا ایمان کا شعبہ ہے اور اللہ کے قانون کو چھوڑ کر خود ساختہ قوانین سے فیصلہ کرنا کفر کا شعبہ ہے۔ غرض کہ تمام گناہ کے کام کفر کے شعبے ہیں اور تمام نیک کام ایمان کے

شعبے ہیں۔ پھر ایمان کے ان شعبوں یا اجزا کی بھی دو قسمیں ہیں: قولی اجزاے ایمان اور فعلی اجزاے ایمان، بعینہٖ کفر کے شعبوں یا اجزا کی بھی دو قسمیں ہیں: قولی اجزاے کفر اور فعلی اجزاے کفر۔

قولی اجزاے ایمان میں ایک شعبہ ایسا بھی ہے، جس کے زوال اور خاتمے سے ایمان ہی کا خاتمہ ہو جاتا ہے اور فعلی اجزاے ایمان میں سے بھی بعض ایسے ہیں جس کے خاتمے سے ایمان زائل ہوجاتا ہے۔ یہی معاملہ کفر کے قولی اور فعلی شعبوں کا بھی ہے، پس جس طرح اپنے اختیار سے کلمہ کفر کہنا کافر کر دیتا ہے، اسی طرح افعالِ کفر میں سے کسی کا ارتکاب بھی کافر کر دیتا ہے، مثلاً بت کو سجدہ کرنا یا قرآن کی توہین کا ارتکاب کرنا، یہ ایک اصل ہوئی، جبکہ یہاں ایک اصل اور بھی ہے اور وہ یہ کہ ایمان کی حقیقت قول اور عمل کے مجموعے کا نام ہے اور قول کی دو قسمیں ہیں:

''دل کا قول جو اعتقاد یا عقیدہ ہے اور زبان کا قول و اقرار یا اسلام کا کلمہ کہنا۔''

ایسے ہی عمل کی بھی دو قسمیں ہیں: دل کا عمل جو نیت و اخلاص ہے اور اعضاے جسم کا عمل۔

جب یہ چاروں ہی زائل ہوگئے تو ایمان ہی نہ رہا اور جب تصدیقِ قلب زائل ہوگئی تو دوسرے اجزاے ایمان بے کار ہوگئے، کیونکہ دل کی تصدیق دیگر امور کے اعتقاد اور ان کے نفع ہونے کے لیے شرط ہے اور جب دل کا عمل اور صدق کا اعتقاد زائل ہو جائیں تو اہلِ سنت کے نزدیک بالاتفاق ایمان زائل ہوگیا، کیونکہ جن کا عمل ساتھ نہ ہو تو محض تصدیق انھیں فائدہ نہیں دیتی، جبکہ دل کا عمل ہی دراصل محبت و اتباع ہے، اور اس کی مثال ایسے ہی ہے جیسے ابلیس، فرعون، اس کی قوم، یہود اور مشرکین؛ یہ سب اپنے نبی کے سچا ہونے کی تصدیق کرتے تھے، بلکہ پوشیدہ و علانیہ اس کا اقرار بھی کرتے تھے اور کہتے تھے کہ یہ جھوٹا تو نہیں، لیکن ہم نہ اس کی اتباع کریں گے اور نہ اس پر ایمان لائیں گے، انھیں ان کے محض تصدیق و اقرار کرنے نے کوئی فائدہ نہ پہنچایا اور جب دل کے کسی عمل کے زائل ہونے سے ایمان زائل ہوجاتا ہے تو پھر یہ کہاں بعید ہے کہ اعمالِ اعضا میں سے بڑے عمل کے زوال پر ایمان ضائع ہوجائے۔

یہاں ایک اصل اور بھی ہے اور وہ یہ کہ کفر کی دو قسمیں ہیں:
عملی کفر اور انکاری و عنادی یعنی اعتقادی کفر، کفرِ اعتقاد تو یہ ہے کہ یہ جانتے ہوئے کہ رسول ﷺ جو احکام و افعال اللہ سے لائے ہیں اور اللہ کے جو اسمائے حسنیٰ اور صفاتِ علیا ہیں، ان سب کا انکار کرے، ان پر ایمان نہ لائے۔ یہ کفر ہر اعتبار سے ایمان کی ضد ہے۔
کفر کی دوسری قسم عملی کفر ہے اور وہ دو طرح کا ہے۔ اس کے بعض اجزا کو ایمان کی ضد ہیں، جب کہ بعض ایسے نہیں ہیں۔ جیسے بت کو سجدہ کرنا، قرآنِ کریم کی توہین کرنا، نبی کو قتل کرنا اور گالی دینا؛ یہ سب عملی کفر ہیں، مگر ایمان کی ضد ہیں۔ اسی طرح خود ساختہ قانون سے فیصلہ کرنا (قانون الٰہی کو چھوڑ کر) اور نماز ترک کرنا عملی کفر کی اقسام ہیں اور یہ ہرگز ممکن نہیں کہ ایسے شخص سے کفر کے نام کی نفی کی جائے، جس پر اللہ نے اور اس کے رسول ﷺ نے کفر کا لفظ بولا ہے۔ پس خود ساختہ قانون سے فیصلہ کرنے والا اور تارک نماز نبیِ اکرم ﷺ سے ثابت شدہ واضح دلائل کی رو سے کافر ہے۔ اگرچہ اس کا کفر عملی کفر ہے نہ کہ اعتقادی۔ یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ ان دونوں کو اللہ اور اس کا رسول ﷺ کافر کہیں، پھر بھی ان پر کفر کا نام نہ بولا جائے۔ ایسے ہی زانی، شرابی، چور اور پڑوسیوں کو اذیت پہنچانے والے کا معاملہ بھی ہے کہ ان سے نبیِ اکرم ﷺ نے ایمان کی نفی کی ہے، تو یہ کفریہ افعال ہوئے، البتہ یہ عملی کفر ہے، جس سے اعتقادی کفر کی نفی ہوگئی۔ ایسے ہی عورت سے دُبر میں جماع کرنے، دوسرے مسلمان بھائی کو کافر کہنے اور کسی مسلمان سے قتال و جنگ کرنے اور سورۂ بقرہ کی آیت (۸۴، ۸۵) کے مطابق کتاب اللہ کے بعض حصوں کو ترک کرنے پر، ان کا کفر مگر یہ سب عملی کفر ہیں۔ ایسے ہی جن سے ایمان کی نفی کی گئی ہے، ان سے اگرچہ ایمان کا نام تو زائل ہوگیا، لیکن وہ عملی کفر میں مبتلا ہیں۔ یہ سب کلی طور پر دائرۂ اسلام اور ملتِ اسلامیہ سے خارج نہیں ہوں گے۔‘‘

اس تفصیل سے ایک اور اصل بھی معلوم ہوگئی جو اہلِ سنت کے اصول میں سے ایک عظیم اصل ہے، وہ یہ کہ ملے جلے عمل والے شخص میں ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ اس میں کفر اور ایمان، شرک اور توحید، تقوی اور فسق و فجور اور نفاق اور ایمان اکٹھے ہو جائیں۔ (یعنی کچھ کام ایک قسم کے اور کچھ اس کے

برعکس دوسری قسم کے) جیسا کہ سورت یوسف کی آیت (۱۰۶) میں اللہ نے ان کے لیے شرک کے باوجود ایمان ثابت کیا ہے اور سورۃ الحجرات کی آیت (۱۴) میں ان سے ایمان کی نفی کے باوجود ان کے لیے اسلام اور اللہ و رسول ﷺ کی اطاعت ثابت ہے۔ ایسے ہی صحیح بخاری و مسلم، سنن ترمذی اور نسائی میں ارشادِ نبوی ﷺ ہے:

« آيَةُ الْمُنَافِقِ ثَلَاثٌ » ''منافق کی تین نشانیاں ہیں۔''

پھر وہ نشانیاں بتائیں:

1 جب بات کرے تو جھوٹ بولے۔

2 وعدہ کرے تو خلاف ورزی کرے۔

3 اس کے پاس امانت رکھی جائے تو خیانت کرے۔

جبکہ صحیح بخاری مسلم، سنن ابو داود، ترمذی اور نسائی کی ایک دوسری حدیث میں چار علامتیں بتائیں:

4 جب جھگڑے تو گالیاں بکے۔

یہ چاروں ہی افعال نفاق کی علامتیں ہیں، لیکن یہ عملی نفاق ہے، جو اعتقادی نفاق سے کمتر درجے کا ہے، جبکہ اعتقادی نفاق تو وہ ہے جسے اللہ نے سورۃ النساء میں فرمایا ہے:

﴿ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ فِي الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ﴾ [النساء: ١٤٥]

''منافقین جہنم کے سب سے گہرے گڑھے میں ہوں گے۔''

عملی نفاق والے شخص میں ایمان و نفاق دونوں جمع بھی ہو سکتے ہیں، ایسے ہی ریاکاری کو مسندِ احمد میں شرکِ اصغر کہا گیا ہے۔[1]

اس کا معنیٰ یہ ہوا کہ شرک و توحید بھی ایک شخص میں یکجا ہو سکتے ہیں، ایسے ہی وہ شخص بھی جس نے خود ساختہ قانون سے فیصلہ کیا یا بیوی سے لواطت کی وغیرہ وغیرہ، ان امور میں کفر اور اسلام جمع ہو جاتے ہیں۔

یہاں یہ بات بھی پیشِ نظر رہے کہ اگر کسی سے کوئی کفریہ فعل صادر ہو جائے تو اس پر مطلق کافر کا لفظ صادق نہیں آتا۔ ایسے ہی کسی حرام کا ارتکاب کرنے والے کو مطلق فاسق نہیں کہا جائے گا، البتہ

[1] صحيح الجامع (١/ ٢/ ٤٥)

یہ نام تب صادق آئیں گے اگر کسی سے ان افعال کا صدور اکثر حالات میں ہوتا ہی رہے۔ اسی طرح زانی، شرابی، چور اور ڈاکو کو مومن کا نام نہیں دیا جا سکتا، اگر چہ وہ کچھ ایمان رکھتا ہے اور نہ اُسے کافر ہی کہا جا سکتا ہے، اگر چہ اس نے کفریہ افعال کا ارتکاب کیا ہے۔

اس ساری تفصیل سے مقصود یہ بتانا ہے کہ تارکِ نماز سے ایمان کا سلب کیا جانا دیگر کبائر کا ارتکاب کرنے والوں سے ایمان سلب کیے جانے سے بھی اولیٰ ہے اور تارکِ نماز سے اسلام کا سلب کیا جانا دوسرے لوگوں کو ہاتھ اور زبان سے تکلیف دینے والوں سے اسلام سلب کیے جانے سے اولیٰ ہے۔ تارکِ نماز کو مسلمان اور مومن کا نام نہیں دیا جا سکتا، اگر چہ اس کے پاس اسلام اور ایمان کا کچھ حصہ بھی ہے۔ اب بات رہ گئی کہ کیا اس کے پاس جو ایمان و اسلام کا حصہ ہے، وہ اسے جہنم میں ہمیشگی سے بچا سکتا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اگر متروک عمل دوسرے اعمال کے صحیح ہونے کے لیے شرط نہیں ہے تو وہ فائدہ دے گا اور اگر متروک عمل دیگر اعمال کی قبولیت کے لیے شرط ہے تو پھر وہ اُسے فائدہ نہیں دے گا۔ یہی وجہ ہے نبوت و رسالت کا انکار کرنے والوں کو محض اقرارِ توحید نے نفع نہ دیا اور جس نے جان بوجھ کر بلا وضو نماز پڑھی، اسے نماز نے فائدہ نہ پہنچایا۔ غرض کہ ایمان کے بعض شعبے دوسرے شعبوں کے ساتھ مشروط کا تعلق رکھتے ہیں اور بعض ایسے نہیں ہیں۔

اب رہا معاملہ نماز کا کہ کیا یہ ایمان کے صحیح ہونے کے لیے شرط ہے یا نہیں؟ اس سارے مسئلے کا راز بھی یہی ہے۔ جو دلائل ذکر کیے گئے ہیں، ان سے معلوم ہوتا ہے کہ بندے کے ترکِ نماز کی وجہ سے اس کا دوسرا کوئی عمل قبول نہیں ہوتا، کیونکہ یہ نماز اس کے دیوان کی چابی اور اس کے فائدے یا نفع کا راس المال ہے۔ جب رأس المال ہی نہ ہو تو فائدہ یا منافع کہاں سے آئے گا؟ جب وہ نماز کے معاملے میں خسارے میں رہا تو پھر ہر طرف سے خسارہ ہی خسارہ ہے، جو شخص پکا تارکِ نماز ہے۔ اس کے تمام اعمال اکارت جاتے ہیں۔ جو کبھی کبھی چھوڑتا ہے، تو اس کے اس دن کے اعمال ضائع ہو جاتے ہیں۔

الغرض کبھی کبھی ترکِ نماز کا ارتکاب کرنے والے کو کہا جا سکتا ہے کہ اس نے کفر کیا، وہ کافر نہیں ہوا۔ لیکن جو شخص نہ صرف یہ کہ ہمیشہ کا تارکِ نماز ہو، بلکہ اس کے ساتھ ہی اسے ترکِ نماز پر اصرار بھی ہو تو اس کے کفر میں کیا شک رہ جاتا ہے؟ علامہ ابن قیم رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

''ایک شخص نے نماز چھوڑی، اُسے نماز کی طرف دعوت دی گئی، حتیٰ کہ بالآخر اسے باندھ دیا گیا اور تلوار کھینچ لی گئی اور اُسے کہا گیا کہ نماز پڑھتے ہو تو بولو، ورنہ ابھی تمھارا قصہ تمام کر دیا جائے گا۔ وہ کہے کہ قتل کرنا ہے تو کر لے، میں نماز نہیں پڑھوں گا، ایسے شخص کے کفر میں شک کرنے والے پر بھی تعجب ہے۔''[1]

خلاصۂ کلام:

تارکِ نماز کے بارے میں جو تفصیلات اور پھر محاکمہ ذکر کیا ہے، اس کا خلاصہ یہ ہوا کہ دلائل کی رو سے ترکِ نماز کے کفر والا قول صحیح تر ہے، البتہ یہ کفر کفرِ بواح نہیں کہ ایسے شخص کے ساتھ تمام غیر مسلموں جیسا سلوک روا رکھا جائے، بلکہ یہ کفر اس سے کم درجے کا کفر ہے، جو بخشش و شفاعت میں مانع نہیں اور ایسا شخص ہمیشہ کا جہنمی بھی نہیں ہوگا، بلکہ اپنے گناہوں کی سزا بھگت کر یا اللہ سے معافی پا کر وہ جنت میں چلا جائے گا، لیکن یہاں یہ بات تارکینِ نماز کو کان کھول کر سُن لینی چاہیے کہ اگر علی وجہ التنزل یہ بھی مان لیا جائے کہ ترکِ نماز فسق ہے، تو یہ بھی کیا کم ہے کہ آخرت کو تو جو ہوگا سو ہوگا۔ اس گناہ کی تو دنیا میں بھی سخت سزا ہے۔

سزائے قتل یا قید:

اگر کوئی اسلامی حکومت نظامِ صلات کو پوری طرح نافذ کر دے تو اس شکل میں تارکِ نماز کی سزا کیا ہے؟ اس سلسلے میں حضرت سفیان ثوری، ابو عمر، امام اوزاعی، عبداللہ بن مبارک، حماد بن زید، وکیع بن جراح، امام مالک بن انس، امام محمد بن ادریس شافعی، امام احمد بن حنبل اور امام اسحاق اور ان کے اصحاب رحمہم اللہ کا فتویٰ یہ ہے کہ تارکِ نماز کو قتل کیا جائے گا۔ جبکہ اس بارے میں بعض دوسرے اہلِ علم کا کہنا ہے کہ اُسے قتل تو نہ کیا جائے، البتہ اُسے قید میں ڈال دیا جائے، اگر وہ توبہ کر لے تو اُسے نکال دیا جائے، یا پھر وہ قید میں جان ہی سے ہاتھ دھو بیٹھے، یعنی تادمِ توبہ یا تادمِ موت اُسے قید میں رکھا جائے۔ اس دوسرے مسلک کے قائلین امام ابن شہاب زہری، سعید بن مسیّب، عمر بن عبدالعزیز، داود بن علی ظاہری، ابو حنیفہ اور مزنی رحمہم اللہ ہیں۔

قائلینِ قید کے دلائل:

دوسرے مسلک یعنی تادمِ توبہ یا تادمِ مرگ قید کے قائلین نے جن احادیث سے استدلال کیا

---

[1] الصلاۃ (ص: ٦٢، ٦٣)

ہے، ان میں سے ایک تو صحیح بخاری و مسلم، سنن ابو داود، ترمذی اور نسائی اور مسند احمد میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

1 «اُمِرْتُ أَنْ أُقَاتِلَ النَّاسَ حَتّٰی یَقُوْلُوْا لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ، فَإِذَا قَالُوْهَا عَصَمُوْا مِنِّيْ دِمَآءَ هُمْ وَأَمْوَالَهُمْ إِلَّا بِحَقِّهَا»[1]

”مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں لوگوں سے اس وقت تک قتال کرتا رہوں، جب تک وہ لا الٰہ الا اللہ نہ کہہ دیں (یعنی اللہ تعالیٰ کے معبودِ برحق ہونے کا اقرار نہ کر لیں) اور جب وہ یہ اقرار کر لیں تو پھر ان کے خون اور مال مجھ سے محفوظ ہو گئے، سوائے اسلامی حق کے (یعنی قصاص وغیرہ کے)۔“

2 صحیح بخاری و مسلم کی ایک متفق علیہ حدیث میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«أُمِرْتُ أَنْ أُقَاتِلَ النَّاسَ حَتّٰی یَشْهَدُوْا أَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَأَنَّ مُحَمَّداً رَّسُوْلُ اللّٰهِ، وَیُقِیْمُوا الصَّلَاةَ، وَیُؤْتُوا الزَّکَاةَ، فَإِذَا فَعَلُوْا ذٰلِكَ، عَصَمُوْا مِنِّيْ دِمَائَهُمْ وَأَمْوَالَهُمْ إِلَّا بِحَقِّ الْإِسْلَامِ، وَحِسَابُهُمْ عَلَی اللّٰهِ عَزَّوَجَلَّ»[2]

”مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں لوگوں سے اس وقت تک قتال کرتا رہوں، جب تک وہ یہ نہ کہہ دیں کہ اللہ کے سوا کوئی معبودِ برحق نہیں اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں اور انھوں نے نماز قائم کی اور زکات دی اور جب انھوں نے ایسا کر لیا تو ان کے خون و اموال محفوظ ہو گئے، سوائے کسی اسلامی حق کے اور ان کا حساب اللہ کے ہاں ہے۔“

3 تیسری حدیث صحیح بخاری و مسلم، سنن ابو داود، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ اور مسندِ احمد میں حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«لَا یَحِلُّ دَمُ امْرِئٍ مُسْلِمٍ یَشْهَدُ أَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَأَنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ إِلَّا بِإِحْدٰی

---

[1] صحیح البخاري مع الفتح، رقم الحديث (١٣٩٩، ٦٩٢٤، ٧٢٨٤) مختصر صحيح مسلم للمنذري، رقم الحديث (٤) صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (٢٢٩٩) صحيح سنن الترمذي، رقم الحديث (٢١٠١، ٢١٠٢) و صحيح سنن النسائي، رقم الحديث (٣٧٠٥ تا ٣٧١٣) الصحيحة، رقم الحديث (٤٠٧)

[2] صحيح البخارى مع الفتح، رقم الحديث (٢٥) مختصر صحيح مسلم للمنذري، رقم الحديث (٥)

ثَلَاثٍ، اَلثَّيِّبُ الزَّانِيُ، وَالنَّفْسُ بِالنَّفْسِ، وَالْمُفَارِقُ لِدِيْنِهِ التَّارِكُ لِلْجَمَاعَةِ ﴾[1]

''کسی مسلمان کا جو اس بات کی گواہی دیتا ہو کہ اللہ کے سوا کوئی معبودِ برحق نہیں اور میں اللہ کا رسول ہوں، اس کا خون حلال نہیں ہے، سوائے تین صورتوں کے، کوئی شادی شدہ ہو کر زنا کرے، خون کے بدلے خون یا جان کے بدلے جان کا معاملہ ہو، یا پھر کوئی دینِ اسلام کو ترک کر کے مسلمانوں کی جماعت کو چھوڑ کر مرتد ہو جائے۔''

مانعینِ قتل کا ان احادیث سے استدلال اس طرح ہے کہ ان احادیث میں نبیِ اکرم ﷺ نے اقرارِ توحید و رسالت کے بعد کسی کے مال اور خون کو صرف ان حالات میں حلال قرار دیا ہے جو ان احادیث میں مذکور ہیں اور نماز چونکہ دین کے عملی ارکان میں سے ہے، جیسے روزے، زکات اور حج ہیں، لہٰذا اس کے ترک پر کسی کو قتل نہیں کیا جائے گا۔

قائلینِ قتل کے دلائل:

تارکِ نماز کے قتل کو واجب قرار دینے والوں کا استدلال ایک تو قرآنِ کریم سورۃ التوبہ سے ہے، جس میں ارشادِ الٰہی ہے:

1 ﴿فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ وَخُذُوْهُمْ وَاحْصُرُوْهُمْ وَاقْعُدُوْا لَهُمْ كُلَّ مَرْصَدٍ فَإِنْ تَابُوْا وَأَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَخَلُّوْا سَبِيْلَهُمْ﴾ [التوبة: ٥]

''پس مشرکوں کو جہاں پاؤ قتل کر دو اور ان کو قید کر لو اور گھیر لو اور ان کی تاک میں ہر گھات کی جگہ بیٹھو، پھر اگر وہ (شرک و کفر سے) توبہ کر لیں اور نماز کو درستی سے پڑھنے لگیں اور زکات دیا کریں تو ان کو ان کے حال پر چھوڑ دو (یعنی ان سے تعرض نہ کرو)۔''

قائلینِ قتل کا اس آیت سے اس طرح استدلال ہے کہ اللہ نے قتل کا حکم فرمایا ہے، ہاں اگر وہ توبہ کر کے نماز و زکات کے پابند ہو جائیں تو انھیں چھوڑ دیا جائے اور اگر وہ ایسا نہ کریں تو انھیں قتل کر

---

[1] صحيح البخاري مع الفتح، رقم الحديث (٦٨٧٨) مختصر صحيح مسلم للمنذري، رقم الحديث (١٠٢٣) صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٦٥٨) صحيح سنن الترمذي، رقم الحديث (١١٣١) صحيح سنن النسائي، رقم الحديث (٣٧٥٠) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٢٥٣٤)

دیا جائے، جبکہ مانعینِ قتل اس کا جواب یہ دیتے ہیں کہ جب کوئی شرک سے تائب ہوگیا تو اس سے سزائے قتل ساقط ہوگئی، وہ چاہے نماز نہ بھی پڑھتا ہو اور زکات نہ بھی دیتا ہو، لیکن ان کا یہ جواب قرآنِ کریم کے ظاہری مفہوم کے سراسر خلاف ہے۔

2 وجوبِ قتل کے قائلین کی دوسری دلیل وہی حدیث ہے جو صحیحین کے حوالے سے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت قائلینِ قید کے دلائل میں ابھی گزری ہے، جس میں وہ بیان کرتے ہیں کہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مجھے لوگوں سے قتال کا حکم دیا گیا ہے، یہاں تک کہ وہ یہ شہادت نہ دیں کہ اللہ کے سوا کوئی معبودِ برحق نہیں اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں اور نماز نہ پڑھنے لگیں اور اگر انھوں نے ایسا کر لیا تو پھر ان کے خون اور مال مجھ سے محفوظ ہوگئے، سوائے کسی اسلامی حق کے اور ان کا حساب اللہ کے پاس ہے۔[1]

قائلینِ قتل کا استدلال اس حدیث سے دو طرح سے ہے:

اولاً: نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ان سے قتال کا حکم دیا گیا، یہاں تک کہ وہ نماز قائم کرنے لگیں اور اس کا معنیٰ یہ ہوا کہ اگر وہ نماز قائم نہ کرنے لگیں تو ان سے قتال کیا جائے گا اور یہ تارکِ نماز کے قتل کی دلیل ہے۔

ثانیاً: خون محفوظ ہوگئے: «إِلَّا بِحَقِّ الْإِسْلَامِ» ''سوائے اسلامی حق کے۔'' یہاں اسلامی حق کو مستثنیٰ کیا ہے، جبکہ نماز تو اسلام کا بہت بڑا حق ہے۔ لہٰذا اس کے ترک کرنے پر اس کا خون محفوظ نہیں رہے گا، بلکہ اُسے قتل کیا جائے گا۔

3 تارکِ نماز کے سلسلے میں قائلینِ قتل کی تیسری دلیل صحیح بخاری و مسلم کی وہ حدیث ہے، جس میں حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے یمن سے نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں سونے کا ایک ٹکڑا بھیجا، جسے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے چار آدمیوں میں تقسیم فرمایا۔ ایک آدمی کہنے لگا: اے اللہ کے رسول! اللہ سے ڈریے! آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«وَيْلَكَ أَلَسْتُ أَحَقَّ أَهْلِ الْأَرْضِ أَنْ يَتَّقِيَ اللّٰهَ»

''تیرا بُرا ہوا، کیا میں تمام روئے زمین پر بسنے والے لوگوں کی نسبت اللہ سے زیادہ

---

[1] صحيح البخاري مع الفتح، رقم الحديث (٢٥) مختصر صحيح مسلم للمنذري، رقم الحديث (٥)

ڈرنے والا نہیں ہوں؟''

پھر جب وہ آدمی چلا گیا تو حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ (جو پاس بیٹھے تھے اور انھیں اس آدمی کا یہ کہنا بہت بُرا لگا تھا) کہنے لگے:

''اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! کیا میں اس شخص کی گردن نہ کاٹ دوں؟''

تو نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

﴿لَا لَعَلَّهٗ أَنْ یَّکُوْنَ یُصَلِّيْ﴾ ''نہیں، ہوسکتا ہے کہ یہ شخص نماز پڑھتا ہو۔''

اس شخص کی زبان سے نکلے ہوئے تلخ کلمات سے اندازہ کرتے ہوئے حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے کہا اور ایک روایت میں حضرت خالد رضی اللہ عنہ کے بجائے حضرت عمرِ فاروق رضی اللہ عنہ کا ذکر ہے اور اس میں کوئی تضاد یا تعارض نہیں، کیونکہ ان دونوں ہی نے اس شخص کی گردن مارنے کی اجازت طلب کی تھی، لیکن ہماری ذکر کردہ اس حدیث میں چونکہ حضرت خالد رضی اللہ عنہ ہی کا واقعہ مذکور ہے، لہٰذا یہاں وہی مراد ہیں کہ انھوں نے کہا: کتنے ایسے نمازی بھی ہیں کہ جو کچھ وہ اپنی زبان سے کہتے ہیں، وہ ان کے دل میں نہیں ہوتا۔ اس پر نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

﴿إِنِّيْ لَمْ أُوْمَرْ أَنْ أُنَقِّبَ قُلُوْبَ النَّاسِ، وَلَا أَشُقَّ بُطُوْنَهُمْ﴾[1]

''مجھے اس بات کا حکم نہیں دیا گیا کہ میں لوگوں کے دل چیر کر دیکھوں یا ان کے پیٹ چاک کروں۔''

یہ صحیح بخاری و مسلم کی حدیث کا کچھ اختصار ہے، البتہ اس میں محلِ شاہد یا مقامِ استدلال نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ الفاظ ہیں:

﴿لَا لَعَلَّهٗ أَنْ یَّکُوْنَ یُصَلِّيْ﴾ ''اس کی گردن مت کاٹو! ہوسکتا ہے کہ یہ نماز پڑھتا ہو۔''

ان الفاظ سے معلوم ہوا کہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے قتل میں مانع نمازی ہونے کو قرار دیا ہے، تو اس کا معنیٰ یہ ہوا کہ جو نماز کا تارک ہو، اُسے قتل کیا جائے گا، کیونکہ اس کے قتل کا مانع موجود ہی نہیں ہے۔

4 ایسے ہی ان کی چوتھی دلیل وہ حدیث ہے، جسے امام احمد و شافعی رحمہما اللہ نے اپنی اپنی مسند میں اور امام مالک رحمہ اللہ نے اپنے موطا میں روایت کیا ہے، جس میں حضرت عبیداللہ بن عدی بن خیار بیان کرتے ہیں کہ ایک انصاری صحابی رضی اللہ عنہ نے مجھے یہ حدیث بتائی ہے کہ ایک صحابی رضی اللہ عنہ آیا،

[1] صحیح البخاری مع الفتح، رقم الحدیث (٤٣٥١) صحیح مسلم مع شرح النووي (٤/ ٧/ ١٦٣)

اس نے پردے کے ساتھ نبیِ اکرم ﷺ کے کان میں کچھ کہا اور منافقین میں سے ایک آدمی کو قتل کرنے کی اجازت طلب کی، نبیِ اکرم ﷺ نے بلند آواز سے فرمایا:

«أَلَيْسَ يَشْهَدُ أَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ»

''کیا وہ اس بات کی گواہی نہیں دیتا کہ اللہ کے سوا کوئی معبودِ برحق نہیں؟''

تو اس انصاری صحابی رضی اللہ عنہ نے عرض کی کہ ہاں وہ یہ شہادت دیتا ہے، لیکن اس کی شہادت کیا حقیقت رکھتی ہے؟ پھر آپ ﷺ نے فرمایا:

«أَلَيْسَ يَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّداً رَسُوْلُ اللّٰهِ»

''کیا وہ یہ شہادت نہیں دیتا کہ حضرت محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں۔''

اس انصاری صحابی رضی اللہ عنہ نے عرض کی کہ ہاں وہ یہ شہادت تو دیتا ہے، لیکن اس کی شہادت کیا ہوئی؟ آپ ﷺ نے فرمایا:

«أَلَيْسَ يُصَلِّيْ الصَّلَاةَ» ''کیا وہ شخص نماز نہیں پڑھتا۔''

اس صحابی رضی اللہ عنہ نے عرض کی کہ وہ نماز تو پڑھتا ہے، لیکن اس کی نماز کہاں ہوگی؟ تب آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

«أُولٰئِكَ الَّذِيْ نَهَانِيَ اللّٰهُ عَنْ قَتْلِهِمْ»[1]

''یہی وہ لوگ ہیں جن کے قتل سے مجھے اللہ نے منع کیا ہے۔''

اسی حدیث سے معلوم ہوا کہ اللہ نے اپنے نبی کو ان لوگوں کے قتل سے منع نہیں کیا، جو تارکِ نماز ہوں، بلکہ کسی کے خون کے محفوظ ہونے کے لیے کلمۂ شہادت کے اقرار کے ساتھ اقامتِ نماز بھی ضروری شرط ہے۔

5 قائلینِ قتل کی پانچویں دلیل صحیح مسلم، سنن ابو داود، ترمذی اور مسند احمد میں اُم المومنین حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے مروی وہ حدیث ہے، جس میں نبیِ اکرم ﷺ کا ارشاد ہے:

«إِنَّهُ يُسْتَعْمَلُ عَلَيْكُمْ أُمَرَاءُ فَتَعْرِفُوْنَ وَتُنْكِرُوْنَ، فَمَنْ أَنْكَرَ فَقَدْ بَرِئَ، وَمَنْ كَرِهَ فَقَدْ سَلِمَ وَلٰكِنْ مَنْ رَضِيَ وَتَابَعَ»

[1] نیل الأوطار (١/ ١/ ٩٢٠) والصلاۃ (١٨، ١٩)

”تم پر ایسے حاکم مسلط کیے جائیں گے، جنھیں تم پہچانو گے اور ان کا انکار بھی کرو گے، پس جس نے انکار کیا وہ بَری ہوگیا اور جس نے محض اس سے کراہت اور نفرت بھی کی تو وہ گناہ سے سلامت رہا، ہاں جس نے ان کے ساتھ رضا مندی ظاہر کی اور ان کی اتباع بھی کی (تو وہ گناہ گار ہوگا)۔“

صحابہ رضی اللہ عنہم نے پوچھا: اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! ”أَلَا نُقَاتِلُهُمْ؟“ (کیا ہم ان سے جنگ نہ کریں؟) تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«لَا مَا صَلَّوْا»[1] ”نہیں، جب تک کہ وہ نماز پڑھیں۔“

اس حدیث میں نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے ظالم حکام سے قتال میں مانع نماز کو قرار دیا ہے، جس سے معلوم ہوا کہ اگر وہ ایسے نہ ہوتے تو ان سے قتال ضروری ہوتا، جو تارکِ نماز کے قتل کی دلیل ہے۔

6 چھٹی دلیل وہ حدیث ہے جو مسند احمد اور صحیح ابن خزیمہ میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، جس میں نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ مجھے لوگوں کے ساتھ قتال کا حکم دیا گیا ہے، یہاں تک کہ وہ اس بات کی شہادت دینے لگیں کہ اللہ کے سوا کوئی معبودِ برحق نہیں اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں اور نماز پڑھنے لگیں۔ (اگر وہ ایسا کرنے لگیں تو) پھر ان کے اموال مجھ پر حرام ہیں اور ان کا حساب اللہ کے پاس ہے۔[2]

اس حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بتایا کہ مجھے لوگوں سے قتال کا حکم ہے، یہاں تک کہ وہ نماز نہ پڑھنے لگیں اور جب تک وہ کلمہ شہادت کے اقرار اور نماز و زکات ادا کرنا شروع نہ کریں، ان جانیں اور اموال غیر محرم بلکہ مباح ہیں، تو گویا تارکِ نماز کا قتل کیا جانا ہی معلوم ہو رہا ہے۔

7 قائلینِ قتل کی ساتویں دلیل سنن نسائی و بیہقی میں حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث ہے، جس میں وہ بیان کرتے ہیں کہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد کچھ عرب لوگ مرتدّ ہوگئے (حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ان مرتدّین کے ساتھ قتال کا ارادہ کیا تو) حضرت عمرِ فاروق رضی اللہ عنہ نے ان سے کہا:

”كَيْفَ تُقَاتِلُ الْعَرَبَ؟“ (آپ ان عربوں کے ساتھ کیسے قتال کریں گے؟)

---

[1] مختصر صحيح مسلم للمنذري، رقم الحديث (١٢٢٩) صحيح سنن الترمذي، رقم الحديث (١٨٤٩) صحيح الجامع، رقم الحديث (٢٣٩٥)

[2] الصلاة (ص: ٢٠) الصحيحه في آخر شرح حديث رقم الحديث (٤٠٧)

تو حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

''مجھے ان لوگوں کے ساتھ قتال کا حکم دیا گیا ہے، یہاں تک کہ وہ اس بات کی شہادت نہ دینے لگیں کہ اللہ کے سوا کوئی معبودِ برحق نہیں اور میں اس کا رسول ہوں، اور نماز پڑھنے لگیں اور زکات دینے لگیں۔''[1]

یہ حدیث بھی قائلینِ قتل کی دلیل ہے۔

محاکمہ:

سابق میں ہم تارکِ نماز کے سلسلے میں دنیوی عقوبت کے طور پر سزائے قتل یا تاحینِ توبہ یا پھر تادمِ واپسیں سزائے عمر قید کی رائے رکھنے والے فریقین کے دلائل ذکر کر چکے ہیں، جن میں سے کبار محققین نے قائلینِ قتل کے دلائل کو زیادہ وزنی قرار دیا ہے، کیونکہ قائلینِ عمر قید نے جن احادیث سے دلیل اخذ کی ہے، ان میں سے ایک تو حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ والی حدیث ہے، جس میں خون اور اموال کے محفوظ ہونے کے لیے مطلق لا الٰہ الا اللہ کو شرط قرار دیا گیا ہے، جبکہ اسی موضوع کی وہ احادیث جو قائلینِ قتل کے دلائل ہیں، ان میں سے اس اطلاق کو اقرارِ توحید کے علاوہ اقرارِ رسالت، اقامتِ نماز اور ادائے زکات کے ساتھ مقید و مشروط کیا گیا ہے۔ گویا قائلینِ قید کی دلیل والی حدیث تو صحیح ہے، لیکن وہ مطلق ہے، جبکہ قائلینِ قتل کے استدلال والی احادیث صحیح ہونے کے ساتھ ساتھ اس پہلی مطلق حدیث کو مقید کرنے والی بھی ہیں، اس لیے یہ قائلینِ قید کی مؤید نہیں، بلکہ قائلینِ قتل کی دلیل بن گئی ہے، کیوں کہ مال وخون کا محفوظ ہونا بھی نماز کے ساتھ مقید ہے اور جو کسی اسلامی حق کا استثنا آیا ہے، وہ بھی قائلینِ قتل ہی کے حق میں ہے، کیونکہ جب کسی اسلامی حق سے بھی قتل کیا جائے گا تو نماز علی الاطلاق اسلام کا سب سے زیادہ تاکیدی حق ہے، لہٰذا اس کے ترک پر بھی تارکِ نماز کو قتل ہی کیا جانا چاہیے۔

قائلینِ قید نے جو حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ والی حدیث پیش کی ہے کہ توحید و رسالت کا اقرار کرنے والے کسی مسلمان کا خون کسی کے لیے حلال نہیں سوائے تین شکلوں کے:

① شادی شدہ ہو کر زنا کرے۔

② جان کے بدلے میں ہو، یعنی اس نے کسی کا قتل کیا ہو۔

[1] المنتقیٰ مع النیل (۱/ ۱/ ۲۸۸) و الصلاۃ (ص: ۱۲۰) صحیح سنن النسائي، رقم الحدیث (۲۸۹۸)

③ وہ دینِ اسلام کو ترک کر کے اور مسلمانوں کی جماعت سے نکل کر مرتد ہو جائے۔

اس حدیث کے بارے میں علامہ ابن قیم رحمہ اللہ ، جو قائلینِ قتل میں سے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ یہ سزاے قید والوں کی نہیں، بلکہ یہ حدیث تو ہماری دلیل ہے، کیونکہ اس میں نبیِ اکرم ﷺ نے جن تین شکلوں میں قتل کو جائز قرار دیا ہے، ان میں سے ایک ترکِ دین ہے اور نماز دین کا رکنِ اعظم ہے (لہٰذا ان کا نماز ترک کرنا ترکِ دین ہوا) خصوصاً جبکہ ہم یہ کہیں کہ تارکِ نماز کافر ہے تو کہا جا سکتا ہے کہ اس نے دین کے ستون کو بالکلیہ ہی ترک کر دیا اور اگر اسے کافر نہ کہیں تو بھی اتنا کہا جا سکتا ہے کہ اس نے دین کے ستون کو ڈھا دیا (تو ایسے شخص کی سزا بھی قتل ہوگی)۔[1]

پھر آگے انھوں نے امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کی کتاب سے ایک طویل اقتباس نقل کیا ہے، جس میں امام موصوف رحمہ اللہ نے متعدد احادیث و آثارِ صحابہ کے حوالے سے ثابت کیا ہے کہ نماز کے بغیر کسی کا اسلام سے کوئی ناتا نہیں رہتا۔ کیوں کہ نماز دین کا ستون ہے اور اگر ستون ہی گر جائے تو پھر لکڑی، کاٹھ اور مٹی گارے سے فائدہ نہیں اُٹھایا جاسکتا، ہاں اگر ستون قائم ہو تو پھر ان اشیا سے استفادہ کیا جا سکتا ہے۔ اور یہی معاملہ اسلام میں نماز کا ہے۔ نماز اسلام کے فرائض میں سے پہلی چیز ہے اور قیامت کے دن سب سے پہلے اسی کا حساب لیا جائے گا۔ اس مفہوم کی احادیث و آثار ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں، انھیں دُہرانے کی ضرورت نہیں۔ البتہ ایک بات جو امام مالک رحمہ اللہ نے اس جگہ فرمائی ہے، وہ یہ کہ ارشادِ نبوی ﷺ ہے:

’’دین میں سے پہلے چیز جو تم کھودو گے وہ امانت ہے اور آخری چیز جو تم سے رخصت ہو جائے گی وہ نماز ہے۔‘‘

یہ ارشاد شعب الایمان بیہقی میں قدرے مختلف الفاظ سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔[2]

صحیح الجامع الصغیر میں بھی یہ حدیث موجود ہے اور اسے حکیم کی طرف منسوب کیا گیا ہے، اس کے راوی حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ ہیں، وہاں اس حدیث کے الفاظ ہیں:

«أَوَّلُ مَا يُرْفَعُ مِنَ النَّاسِ الْأَمَانَةُ، وَآخِرُ مَا يَبْقَى مِنْ دِيْنِهِمُ الصَّلَاةُ، وَرُبَّ مُصَلٍّ لَا خَلَاقَ لَهُ عِنْدَ اللّٰهِ تَعَالَىٰ»[3]

---

[1] الصلاة (ص: ٢٠)

[2] تحقيق كتاب الصلاة للإمام أحمد (ص: ٤٣) من المجموعة

[3] صحيح الجامع (١/ ٢/ ٣٥٣)

''لوگوں سے سب سے پہلے جو چیز اٹھائی جائے گی، وہ امانت ہے اور ان کے دین میں سے جو چیز سب سے آخر تک رہے گی، وہ نماز ہے، کتنے ہی ایسے نمازی ہیں جنھیں اللہ کے یہاں اس کا کوئی اجر نہیں ملے گا۔''

اس حدیث اور دیگر احادیث سے امام احمد رحمہ اللہ نے یہ بات اخذ کی ہے کہ نماز اسلام کے فرائض میں سے پہلی چیز ہے اور یہی سب سے آخر میں مفقود ہوگی، گویا یہی اسلام کا اول ہے اور یہی آخر ہے۔ جب کسی چیز کا اول و آخر جاتا رہے تو وہ ساری ہی ختم ہوجاتی ہے۔[1]

بالفاظ دیگر جب کسی کی نماز جاتی رہی تو اس کا دین ہی جاتا رہا، وہ واجب القتل ہے، اس اعتبار سے بھی حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ والی حدیث قائلینِ قید کے بجائے، قائلینِ قتل ہی کی دلیل بنتی ہے۔[2]

اور تارکینِ نماز کے قتل سے بعض دیگر مسائل بھی تعلق رکھتے ہیں، مثلاً یہ کہ ایک نماز کو جان بوجھ کر ترک کرنے پر قتل کیا جائے یا دو نمازوں یا تین نمازوں کے ترک کرنے پر اسے قتل کیا جائے گا؟ نیز یہ کہ اسے سزائے موت دینے سے پہلے توبہ کا موقع دیا جائے، ہر نماز کے وقت اُسے نماز کی دعوت دی جائے اور اس کا قتل کفر اور ارتداد کی بنا پر ہوگا یا شرعی حد کا نفاذ اور اسے تلوار سے قتل کیا جائے یا کسی دوسرے طریقے سے؟

ان تمام سوالوں کے جوابات کے لیے کتاب الصلاۃ ابن قیم، مغنی ابن قدامہ، نیل الاوطار شوکانی اور دوسری شروحِ حدیث اور کتبِ فقہ دیکھی جا سکتی ہیں۔ علامہ احمد بن حجر آلِ بوطامی چیف جسٹس حکومتِ قطر نے اپنی کتاب '' تطهير المجتمعات من أرجاس الموبقات'' میں لکھا ہے:

''اہلِ علم کا اس بات پر اجماع ہے کہ جو آدمی تارکِ نماز اور وجوبِ نماز کا عقیدہ بھی نہ رکھتا ہو تو اسے کافر ہونے کی وجہ سے قتل کیا جائے اور اگر وجوبِ نماز کا عقیدہ رکھتا ہو، لیکن سستی و غفلت کی وجہ سے نماز نہ پڑھتا ہو تو اسے تین دن کے لیے توبہ کا موقع دیا جائے گا، اس عرصے میں اس پر نماز ادا کرنے کے لیے دباؤ ڈالا جائے گا۔ اگر اس نے توبہ کر لی اور نماز شروع کر لی، تو ٹھیک ہے، ورنہ اسے قتل کر دیا جائے گا۔ اس پر اجماع ہے۔''

---

[1] الصلاة (ص: ٤٣، ٤٣، من المجموعة للإمام أحمد) بتحقيق الشيخ محمد حامد الفقي، الصلاۃ اُردو ترجمة (ص: ٦٢، ٦٥، طبع دار الافتاء)

[2] دیکھیں: الصلاة للإمام أحمد (ص: ٤٢، ٤٣ عربي، ص: ٦٢، ٦٥ اُردو) و الصلاة لابن قيم (٢١، ٢٢)

آگے چل کر موصوف اور ایسے ہی شیخ محمد بن صالح العثیمین نے اپنے رسالے ''حکم تارک الصلاۃ'' (جس کا اردو ترجمہ ماہنامہ محدث بنارس میں اور نورِ اسلام اکیڈمی لاہور کی طرف سے کتابی شکل میں شائع ہوا ہے) اس میں لکھا ہے:

ترکِ نماز کی وجہ سے تارکِ نماز پر درج ذیل امور مرتب ہوتے ہیں:

① اس کا شمارہ کفار کے زمرے میں ہوگا۔

② نماز اور دیگر ارکانِ اسلام کی پابند مسلمان عورت سے اس کی شادی جائز نہیں۔

③ اس کے کافر یا کم از کم فاسق ہونے کی وجہ سے اس کی گواہی قابلِ قبول نہ ہوگی۔

④ اگر توبہ نہ کرے تو واجب القتل ہے۔

⑤ اس کے مرنے پر اسے غسل دیا جائے نہ اس کی نمازِ جنازہ پڑھی جائے گی اور نہ اسے مسلمانوں کے قبرستان میں دفن کیا جائے گا۔

⑥ اس کے مسلمان رشتے داروں کی وراثت سے حصہ نہیں دیا جائے گا اور نہ اس کے مرنے پر وہ اس کے وارث ہوں گے، بلکہ اس کا سارا مال بیت المال میں جمع کر دیا جائے گا۔[1]

ترکِ نماز پر وعید اور تارکِ نماز کا جو حکم بالتفصیل ذکر کیا گیا ہے، اس سے تارکینِ نماز کی آنکھیں کھل جانی چاہییں کہ اگر تارکِ نماز کی سزا کا تقاضا ہو تو دنیا میں بھی ذلت وخواری اور آخرت میں بھی عذاب اور دنیا میں ذلت ہر دو طرح سے ہے۔ اگر جمہور کے مسلک پر قتل کر دیا جائے تو نسل در نسل یہ بات چلے کہ ان کا فلاں بندہ ترکِ نماز کے جرم میں قتل کیا گیا تھا۔ اگر امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے مسلک کو اختیار کرتے ہوئے اسے تعزیراً سزا دی جائے اور پھر اُسے تائب ہو کر نماز شروع کرنے تک یا مرنے تک عمر قید میں ڈال دیا جائے تو یہ بہ ظاہر ہلکی سزا ہے، مگر پہلی سے زیادہ ذلت ناک اور رسوا کن!!

---

[1] مختصر از تطهير المجتمعات (ص: ۸۷، ۸۹) شیخ عثیمین رحمہ اللہ نے ان امور پر کچھ مزید امور کا اضافہ کیا ہے۔ (ماهنامه ''محدث''، جلد ۸، شماره بابت ذوالقعدة ۱۴۰۱ھ بمطابق ۱۹۹۰ء)

اذان واقامت کے مسائل

اب ہم، ان شاء اللہ، سرِ دست مختصر انداز سے اذان و اقامت کے مسائل ذکر کر رہے ہیں۔

عام طور پر دیکھا جاتا ہے کہ کبھی موذن موجود نہ ہو اور مسجد میں موجود لوگوں میں سے کسی کو کہا جائے کہ تم اذان دے دو تو وہ کئی بہانے بناتا ہے۔ کبھی کہتا ہے کہ مجھے شرم آتی ہے اور کبھی کوئی اور بہانا بناتا ہے۔ ممکن ہے کہ بعض کو اذان و اقامت کی ترتیب اور اس کے الفاظ بھی نہ آتے ہوں، جو مسلمان کے لیے بہر حال ایک عجیب بات ہے، کیونکہ اذان واقامت کے الفاظ بڑے مختصر اور آسان ہیں اور اس کا اجر وثواب بھی بہت زیادہ ہے۔ نبیِ اکرم ﷺ کے متعدد ارشادات میں اذان اور موذن کا جواب دینے کے بہت سے فضائل ذکر ہوئے ہیں:

1. چنانچہ صحیح بخاری شریف میں ارشادِ نبوی ﷺ ہے:

«لَا يَسْمَعُ مَدَى صَوْتِ الْمُؤَذِّنِ جِنٌّ وَلَا إِنْسٌ وَلَا شَيْئٌ إِلَّا شَهِدَ لَهٗ يَوْمَ الْقِيَامَةِ»[1]

''موذن کی آواز کو جن وانس اور جو چیز بھی سنتی ہے، وہ اس کے حق میں قیامت کے دن شہادت دے گی۔''

2. نسائی اور مسند احمد میں حضرت براء بن عازب اور سنن ابن ماجہ میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ارشادِ نبوی ﷺ ہے:

«اَلْمُؤَذِّنُ يُغْفَرُ لَهٗ مَدٰى صَوْتِهٖ، وَيَشْهَدُ لَهٗ كُلُّ رَطْبٍ وَّيَابِسٍ»[2]

''موذن کی مغفرت ہو جاتی ہے اور ہر خشک اور تر چیز اس کے حق میں گواہی دیتی ہے۔''

---

[1] مشكاة المصابيح (١/ ٢٠٧) صحيح البخاري مع الفتح، رقم الحديث (٢٠٩)

[2] صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٨٤) صحيح سنن النسائي، رقم الحديث (٦٢٦) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٧٢٣) صحيح ابن حبان، الموارد، رقم الحديث (٢٩٢)

سنن نسائی میں آخری الفاظ ہیں:

«وَلَهُ مِثْلُ أَجْرِ مَنْ صَلَّى»[1]

یعنی جتنے لوگ اذان کی آواز سن کر نماز کے لیے آتے ہیں، ان نمازیوں کے اجر کے برابر موذن کو بھی اجر دیا جاتا ہے۔

۳ صحیح مسلم میں ارشادِ نبوی ﷺ ہے:

«اَلْمُؤَذِّنُوْنَ أَطْوَلُ النَّاسِ أَعْنَاقاً يَّوْمَ الْقِيَامَةِ»[2]

''قیامت کے دن موذن تمام لوگوں سے لمبی گردنوں والے ہوں گے۔''

لمبی گردن ہونا حسن و وقار اور سیادت و قیادت کی علامت معروف ہے۔ صحیح مسلم میں ہے کہ نبیِ اکرم ﷺ طلوعِ فجر کی علامت سے پہلے کسی پر حملہ نہیں کیا کرتے تھے، بلکہ اذان ہونے کا انتظار کرتے اور اگر کسی جگہ سے اذان کی آواز آجاتی تو حملہ کرنے سے رک جاتے، ورنہ حملہ کر دیتے۔

۴ ایک مرتبہ آپ ﷺ نے موذن کو اللہ اکبر کہتے سنا تو فرمایا: یہ فطرت پر ہے اور جب اسے «أَشْهَدُ أَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ» کہتے سنا تو فرمایا:

«خَرَجْتَ مِنَ النَّارِ»[3] ''تو جہنم سے نکل گیا۔''

۵ سنن ابو داود و ترمذی، صحیح ابن خزیمہ و ابن حبان، مسندِ احمد، الأم للشافعی اور طبرانی کبیر میں ہے کہ نبیِ اکرم ﷺ نے ائمہ اور موذنین کے لیے یہ دعا فرمائی:

«اَللّٰهُمَّ ارْشُدِ الْأَئِمَةَ، وَاغْفِرْ لِلْمُؤَذِّنِيْنَ»[4]

''اے اللہ! پیش اماموں کو رشد و ہدایت نصیب فرما اور موذنوں کی مغفرت فرما۔''

۶ حد تو یہ ہے کہ صحیح بخاری اور دیگر کتب حدیث میں ارشادِ نبوی ﷺ ہے:

«لَوْ يَعْلَمُ النَّاسُ مَا فِي الْأَذَانِ وَالصَّفِّ الْأَوَّلِ، ثُمَّ لَمْ يَجِدُوْا إِلَّا أَنْ يَّسْتَهِمُوْا

---

[1] مشكاة المصابيح (١/ ٢١١) صحيح سنن النسائي، رقم الحديث (٦٢٧)

[2] صحيح مسلم مع شرح النووي، رقم الحديث (١٩٧) موارد الظمآن، رقم الحديث (٢٩٣)

[3] مشكاة المصابيح (٢٠٩/١) صحيح مسلم مع شرح النووي، رقم الحديث (١٩٥)

[4] إرواء الغليل (١/ ٢٣١) صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٨٦) صحيح سنن الترمذي، رقم الحديث (١٧٠)

عَلَيْهِ لَاسْتَهَمُوْا》[1]

''اگر لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ اذان کہنے اور صف اول میں کھڑے ہو کر نماز پڑھنے کی فضیلت وثواب کیا ہے، تو قرعہ اندازی کے سوا کوئی چارہ ہی نہ رہے اور وہ قرعہ اندازی کیا کریں۔''

اذان کا جواب دینے کی فضیلت:

اذان کا جواب دینے والے کو بھی بڑے اجر وثواب کی بشارتیں دی گئی ہیں۔ مثلاً سنن ابو داود اور صحیح ابن حبان میں مروی ہے کہ کسی شخص نے نبیِ اکرم ﷺ کی خدمت میں عرض کی کہ موذنین تو ہم پر فضیلت لے گئے تو آپ ﷺ نے فرمایا:

《قُلْ كَمَا يَقُوْلُوْنَ فَإِذَا انْتَهَيْتَ فَسَلْ تُعْطَهُ》[2]

''تم بھی انہی کی طرح کہتے جاؤ اور جب تم اذان کے الفاظ مکمل کر لو تو اللہ سے جو سوال کرو گے وہ تمھیں دیا جائے گا۔''

نسائی شریف میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے کھڑے ہو کر اذن کہنا شروع کیا، جب وہ خاموش ہوئے تو آپ ﷺ نے فرمایا:

《مَنْ قَالَ مِثْلَ هٰذَا يَقِيْنًا دَخَلَ الْجَنَّةَ》[3]

''جس نے قلبی یقین کے ساتھ اسی طرح کہا وہ جنت میں داخل ہو گیا۔''

صحیح بخاری و مسلم میں اذان کا جواب دینے اور بعد میں دعا کرنے کو بڑے اجر وثواب کی خوشخبری دی گئی ہے۔ مثلاً صحیح مسلم، سنن ابو داود، نسائی، ترمذی اور مسندِ احمد اور سنن بیہقی میں ارشادِ نبوی ﷺ ہے:

《إِذَا سَمِعْتُمُ الْمُؤَذِّنَ فَقُوْلُوْا مِثْلَ مَا يَقُوْلُ، ثُمَّ صَلُّوْا عَلَيَّ فَإِنَّهٗ مَنْ صَلّٰى عَلَيَّ وَاحِدَةً صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ بِهَا عَشْراً》

[1] صحيح البخاري مع الفتح، رقم الحديث (٦١٥) مختصر صحيح مسلم للمنذري، رقم الحديث (٦٢٨) صحيح سنن النسائي، رقم الحديث (٥٦٢) صحيح الجامع، رقم الحديث (٥٣٣٩)

[2] مشكاة المصابيح (١/ ٥٦٢) صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٩٢) موارد الظمآن، رقم الحديث (٦٩٥)

[3] مشكاة المصابيح (١/ ٢١٣) صحيح سنن النسائي، رقم الحديث (٢٥٠)

’’جب تم موذن کی آواز سنو تو تم بھی اسی طرح کہتے جاؤ، جو وہ کہتا ہے پھر مجھ پر دورد بھیجو، جس نے مجھ پر ایک مرتبہ درود بھیجا، اللہ اس پر دس رحمتیں نازل کرے گا۔‘‘

پھر آگے ارشاد فرمایا:

’’پھر میرے لیے وسیلے کی دعا کرو (وسیلہ جنت میں ایک مقام ہے، جو اللہ کے صرف ایک ہی بندے کو ملے گا اور میں امید رکھتا ہوں کہ وہ بندہ میں ہی ہوجاؤں) پس جس نے میرے لیے وسیلے کی دعا مانگی، اس کے لیے میری شفاعت حلال ہوگئی۔‘‘[1]

اذان کا جواب:

صحیح مسلم، سنن ابو داود اور بیہقی میں اذان کا جواب دینے کی فضیلت کے علاوہ یہ بھی مذکور ہے کہ اذان کا جواب کیسے دیا جائے، چنانچہ امیر المومنین حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے مروی ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے کہ جب موذن «اَللّٰهُ أَكْبَرُ» کہے، تو تم میں سے بھی کوئی «اَللّٰهُ أَكْبَرُ» کہے، جب وہ «أَشْهَدُ أَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ» کہے، تو وہ بھی «أَشْهَدُ أَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ» کہے، پھر جب وہ «أَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّداً رَّسُوْلُ اللّٰهِ» کہے، تو وہ بھی «أَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّداً رَّسُوْلُ اللّٰهِ» کہے، پھر وہ جب «حَيَّ عَلَى الصَّلَاةِ» کہے، تو وہ «لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللّٰهِ» کہے، پھر وہ جب «حَيَّ عَلَى الْفَلَاحِ» کہے تو وہ «لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللّٰهِ» کہے، پھر جب وہ «اَللّٰهُ أَكْبَرُ» کہے، تو وہ بھی «اَللّٰهُ أَكْبَرُ» کہے، پھر جب وہ «لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ» کہے تو وہ بھی «لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ» کہے:

«دَخَلَ الْجَنَّةَ»[2] ’’وہ جنت میں داخل ہوگیا۔‘‘

قابلِ توجہ بات صرف اتنی سی ہے کہ اذان کا جواب وہی کلمات دہرانا ہے، جو موذن کہتا ہے۔ سوائے اس کے کہ جب وہ «حَيَّ عَلَى الصَّلَاةِ» اور «حَيَّ عَلَى الْفَلَاحِ» دو دو مرتبہ کہے تو جواب دینے والا اس کے بجائے دو دو مرتبہ ہی «لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللّٰهِ» کہے گا۔ اب رہا

---

[1] مشكاة المصابيح (١/ ٢٠٨) إرواء الغليل (١/ ٢٥٩) مختصر صحيح مسلم للمنذري، رقم الحديث (١٩٨) صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٩١) صحيح سنن الترمذي، رقم الحديث (٦٨٢٠) صحيح سنن النسائي، رقم الحديث (٦٥٣) صحيح الجامع، رقم الحديث (٦١٣)

[2] مشكاة المصابيح (١/ ٢٠٨) إرواء الغليل (١/ ٢٥٨) مختصر صحيح مسلم للمنذري، رقم الحديث (١٩٩) صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٩٥)

معاملہ اذانِ فجر کے کلمات «اَلصَّلَاۃُ خَیْرٌ مِّنَ النَّوْمِ» کا کہ ان کے جواب میں کیا کہا جائے گا؟ کتبِ حدیث میں اس کی کوئی صراحت نہیں ملتی، جیسا کہ "التلخیص" میں حافظ ابن حجر نے، "سبل السلام" میں امیر صنعانی اور "تحفة الأحوذي" میں علامہ مبارکپوری رحمہ اللہ نے لکھا ہے۔[1]

البتہ صحیح مسلم، سنن ابو داود، ترمذی، نسائی، مسند احمد اور سنن بیہقی میں آپ ﷺ کے ارشادِ گرامی ہے:

«إِذَا سَمِعْتُمُ الْمُؤَذِّنَ فَقُوْلُوْا مِثْلَ مَا یَقُوْلُ»[2]

"جب تم موذن کو سنو تو وہی کہو جو وہ کہتا ہے۔"

اس سے پتا چلتا ہے کہ «اَلصَّلَاۃُ خَیْرٌ مِّنَ النَّوْمِ» کے جواب میں یہی کلمات دُہرائے جائیں، جیسے دیگر کلمات کا حکم ہے، سوائے حَیعلتَین کے، ان کے جواب میں «لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّۃَ إِلَّا بِاللّٰہِ» کہنا صحیح مسلم اور دیگر مذکورہ کتبِ حدیث میں نبیِ اکرم ﷺ کے حکم سے ثابت ہے۔ "الفقه علی المذاهب الأربعة" میں علامہ جزیری رحمہ اللہ نے اور حنفیہ و شافعیہ و حنابلہ کی کتبِ فقہ میں جو لکھا ہے کہ «اَلصَّلَاۃُ خَیْرٌ مِّنَ النَّوْمِ» کے جواب میں "صَدَقْتَ وَبَرَرْتَ"[3] "تو نے سچ کہا اور نیکی کا کام بتایا۔" کہنا مستحسن یا مستحب ہے تو ان کلمات کا استحباب واستحسان معلوم نہیں کیسے اخذ کیا گیا ہے، جب کہ نبیِ اکرم ﷺ، خلفائے راشدین اور صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کسی سے بھی یہ الفاظ ثابت نہیں ہیں۔

اذان کی دعا:

اذان سننے اور اس کا جواب دینے کے بعد نبیِ اکرم ﷺ نے ہمیں ایک دعا سکھلائی ہے، جس کا بہت زیادہ اجر وثواب بھی بتایا ہے۔ چنانچہ صحیح بخاری، سنن ابو داود، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ، مسندِ احمد اور سنن بیہقی میں ارشادِ نبوی ﷺ ہے:

"جو شخص اذان سننے کے بعد یہ دعا کرے، اس کے لیے قیامت کے دن میری شفاعت حلال ہوگئی۔"

---

[1] التلخيص الحبير (١/ ٧٩) سبل السلام (١/ ١٢٧) تحفة الأحوذي (١/ ٦١٦ مدني)

[2] مشكاة المصابيح (١/ ٢٠٨) و إرواء الغليل (١/ ٢٥٩) مختصر مسلم للمنذري، رقم الحديث (١٩٨) صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٩١) صحيح سنن الترمذي، رقم الحديث (٦٨٢٠) صحيح سنن النسائي، رقم الحديث (٦٥٣) صحيح الجامع، رقم الحديث (٦١٣)

[3] الفقه على المذاهب الأربعة (١/ ٣١٨)

دعا یہ ہے:

«اَللّٰهُمَّ رَبَّ هٰذِهِ الدَّعْوَةِ التَّامَّةِ وَالصَّلَاةِ الْقَائِمَةِ آتِ مُحَمَّدَنِ الْوَسِيْلَةَ وَالْفَضِيْلَةَ وَابْعَثْهُ مَقَامًا مَّحْمُوْدَنِ الَّذِيْ وَعَدْتَّهٗ»[1]

دعاے اذان کا صحیح ترین صیغہ اور الفاظ صرف یہی ہیں اور اس پر جو اضافے کیے گئے ہیں، وہ شاذ اور مدرج ہیں، لہٰذا صرف انھیں الفاظ پر اکتفا کرنا ہی اولیٰ ہے اور وہ اضافے یہ ہیں:

''پہلا یہ کہ ''شرح معاني الآثار'' کی روایت میں ''آتِ مُحَمَّدًا'' کے بجائے ''آتِ سَيِّدَنَا مُحَمَّدًا'' کے الفاظ ہیں، یہاں ''سَيِّدَنَا'' ثابت نہیں ہے، بلکہ مدرج ہے۔ ''عمل الیوم واللیلة لابن السني'' میں ''اَلْوَسِيْلَةَ وَالْفَضِيْلَةَ'' کے بعد ''وَالدَّرَجَةَ الرَّفِيْعَةَ...'' کے الفاظ بھی ہیں۔ یہ بھی مدرج ہیں اور نبیِ اکرم ﷺ سے ثابت نہیں، جیسا کہ ''التلخیص'' میں حافظ ابن حجر نے اور ''المقاصد الحسنة'' میں امام سخاوی رحمہ اللہ نے کہا ہے۔[2]

ملا علی قاری حنفی رحمہ اللہ نے ''مرقاۃ المفاتیح'' میں امام بخاری رحمہ اللہ سے نقل کیا ہے کہ میں نے ان الفاظ کا اضافہ کسی روایت میں نہیں دیکھا۔[3]

''المحرر'' میں رافعی نے اس دعا کے آخر میں ''يَا اَرْحَمَ الرّٰحِمِيْنَ'' کے الفاظ بھی ذکر کیے ہیں، مگر یہ بھی طُرقِ حدیث میں مذکور نہیں ہیں۔ سنن بیہقی میں اس دعا کے آخر میں «اِنَّكَ لَا تُخْلِفُ الْمِيْعَادَ» کے الفاظ بھی ہیں، جب کہ تمام کتبِ حدیث اور صحیح بخاری کے صحیح و متداول نسخ میں ان کا ذکر بھی نہیں، صرف تورپشتی کی روایت میں یہ الفاظ ہیں۔ ان کلمات کے شاید شاذ ہونے کی وجہ سے شارح بخاری حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے انھیں ذکر ہی نہیں کیا، لہٰذا محدثین نے اس اضافے کو بھی شاذ قرار دیا ہے۔[4]

---

[1] صحیح البخاري مع الفتح، رقم الحدیث (٦١٤) صحیح سنن أبي داود، رقم الحدیث (٤٩٦) صحیح سنن الترمذي، رقم الحدیث (١٧٤) صحیح سنن النسائي، رقم الحدیث (٦٥٦) سنن ابن ماجه، رقم الحدیث (٧٢٢)

[2] الإرواء (١/ ٦٢١) تحقیق مصابیح السنة (١/ ٢٧٢)

[3] دیکھیں: تحفة الأحوذي (١/ ٦٢٣)

[4] الإرواء (١/ ٢٦٠، ٢٦١)

اذان کی دعا کے سلسلے میں یہ بھی عام طور پر دیکھا جاتا ہے کہ لوگ صرف ایک ہی دعا کرتے ہیں، حالانکہ ایک چھوٹی سی دعا اور بھی ہے جس کا بہت ثواب بتایا گیا ہے۔ چنانچہ صحیح مسلم، سنن ابوداود، ترمذی، نسائی اور ابن ماجہ میں ارشادِ نبوی ﷺ ہے کہ جو اذان سن کر یہ دعا کرے، اس کے گناہ معاف ہوجاتے ہیں۔ اس دعا کے الفاظ یہ ہیں:

«أَشْهَدُ أَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ، وَ أَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ، رَضِيْتُ بِاللّٰهِ رَبًّا وَّ بِمُحَمَّدٍ رَّسُوْلًا وَّ بِالْإِسْلَامِ دِيْنًا» [1]

اذان کے وقت کو دعا کی قبولیت کا وقت بتایا گیا ہے، لہٰذا اس سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔ جیسا کہ سنن ابوداود اور دارمی میں ارشادِ نبوی ﷺ ہے:

«ثِنْتَانِ لَا تُرَدَّانِ أَوْ قَلَّمَا تُرَدَّانِ، الدُّعَاءُ عِنْدَ النِّدَاءِ وَعِنْدَ الْبَأْسِ حِيْنَ يَلْحَمُ بَعْضُهُمْ بَعْضاً» [2]

''دو اوقات میں دعا رد نہیں ہوتی یا کم رد ہوتی ہے کا اذان کے بعد کی دعا اور معرکہ حق وباطل کے دوران کی دعا جب کہ لوگ ایک دوسرے سے گتھم گتھا ہوتے ہیں۔''

سنن ابو دواد، ترمذی اور مسندِ احمد میں بھی ارشادِ نبوی ﷺ ہے:

«لَا يُرَدُّ الدُّعَاءُ بَيْنَ الْأَذَانِ وَالْإِقَامَةِ» [3]

''اذان اور اقامت کے درمیان کی گئی دعا رد نہیں ہوتی۔''

اذان کے کلمات:

اذان کے کلمات تو معروف ہیں۔ کتبِ حدیث میں سے صحیح مسلم اور سنن نسائی میں حضرت ابومحذورہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبیِ اکرم ﷺ نے بہ نفسِ نفیس مجھے اذان سکھائی اور فرمایا کہ کہو:

[1] سنن الترمذي مع التحفة (١/ ٢٦) مشكاة المصابيح (١/ ٢٠٩) مختصر صحيح مسلم للمنذري، رقم الحديث (٤٠٠) صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٩٣٦) صحيح سنن النسائي، رقم الحديث (٦٥٥) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٧٢١)

[2] مشكاة المصابيح (١/ ٢١٦) صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (٢١٥)

[3] مشكاة المصابيح (١/ ٢١٢) سنن الترمذي مع التحفة (١/ ٦٢٥) صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٨٩) مسند أحمد (٣/ ١١٩، ١٥٥) موارد الظمآن، رقم الحديث (٢٩٦)

«اَللّٰهُ اَكْبَرُ، اَللّٰهُ اَكْبَرُ. اَللّٰهُ اَكْبَرُ، اَللّٰهُ اَكْبَرُ. اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ، اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ. اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ، اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ»

پھر دوبارہ یہ کہا:

«أَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ، أَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ. أَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ، أَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ. حَيَّ عَلَى الصَّلَاةِ، حَيَّ عَلَى الصَّلَاةِ. حَيَّ عَلَى الْفَلَاحِ، حَيَّ عَلَى الْفَلَاحِ. اَللّٰهُ اَكْبَرُ، اَللّٰهُ اَكْبَرُ. لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ»[1]

یہاں یہ چیز پیشِ نظر رہے کہ شہادتین کو دہرایا ہے اور اسے ترجیع کہا جاتا ہے۔ یہ طریقہ صحیح و ثابت ہے۔ امام مالک وشافعی اور جمہور علما اسی حدیث کے پیشِ نظر اذان میں ترجیع کی مشروعیّت کے قائل ہیں اور امام ترمذی کے بقول اہلِ مکہ کا عمل اسی پر ہے۔ امام نووی رحمہ اللہ نے شرح مسلم میں اور علامہ مبارکپوری نے تحفۃ الاحوذی میں اہلِ مدینہ اور دیگر شہروں کا عمل بھی اسی کے مطابق ذکر کیا ہے۔ صحیح مسلم ونسائی کی مذکورہ حدیث اور اذان میں ترجیع کی تائید سنن ابو داود، ترمذی، ابن ماجہ اور دیگر کتبِ حدیث میں مذکور صحیح احادیث سے بھی ہوتی ہے۔ لہٰذا بلاوجہ ترجیع کے جواز ومشروعیّت کا انکار درست نہیں ہے۔ علامہ خلیل احمد سہارنپوری نے "بذل المجهود" میں اور علامہ انور شاہ کاشمیری نے "العرف الشذي" میں ترجیع والی احادیث کے صحیح ہونے کا اعتراف کیا ہے۔[2]

جب ترجیع کے ساتھ اذان کہی جائے تو اس میں پہلے شہادتین کو ذرا آہستہ آواز سے کہا جاتا ہے اور دوسری مرتبہ زور سے اور کھینچ کر کہا جاتا ہے، جیسا کہ سنن ابو داود میں متعدد طُرق سے حضرت ابو محذورہ رضی اللہ عنہ سے ثابت ہے۔[3]

اذان کا دوسرا طریقہ وہی ہے، جو عام طور پر معروف ہے، یعنی مذکورہ تمام کلمات بلا ترجیع دو دو بار کہے جائیں، سوائے آخر میں "اَللّٰهُ اَكْبَرُ، اَللّٰهُ اَكْبَرُ. لَا اِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ" ایک بار ہی کہنا ہے،

---

[1] مشكاة المصابيح (١/ ٢٠٢) المنتقىٰ مع النيل (١/ ٢/ ٤٣) مختصر صحيح مسلم للمنذري، رقم الحديث (١٩١) صحيح سنن النسائي، رقم الحديث (٦١٢) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٧٠٩)

[2] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: تحفة الأحوذي (١/ ٥٦٩ تا ٥٧٥)

[3] مشكاة المصابيح (١/ ٢٠٣) وصححه الألباني لكثرة طرقه، صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٨٢، ٤٧٥)

جیسا کہ سنن ابو داود، ترمذی، ابن ماجہ، دارمی اور دیگر کتبِ حدیث میں حضرت عبداللہ بن زید بن عبد ربہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں مذکور ہے۔[1]

یہ تو عام طور پر ظہر وعصر اور مغرب وعشا کی اذان ہوئی، جبکہ فجر کی اذان میں ''حَيَّ عَلَى الصَّلَاةِ'' اور ''حَيَّ عَلَى الْفَلَاحِ'' کے بعد دو مرتبہ ''اَلصَّلَاةُ خَيْرٌ مِّنَ النَّوْمِ'' کہا جاتا ہے۔ ان کلمات کو تثویب کہا گیا ہے۔ جن کا ثبوت سنن ابو داود اور صحیح ابن حبان میں حضرت ابو محذورہ رضی اللہ عنہ سے مروی ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں مذکور ہے، جس میں نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

«فَإِنْ كَانَ صَلَاةُ الصُّبْحِ قُلْتَ: اَلصَّلَاةُ خَيْرٌ مِّنَ النَّوْمِ، اَلصَّلَاةُ خَيْرٌ مِّنَ النَّوْمِ، اَللّٰهُ اَكْبَرُ، اَللّٰهُ اَكْبَرُ، لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ»[2]

''جب فجر کی اذان ہو تو (حَیعلتَین کے بعد) کہو: «اَلصَّلَاةُ خَيْرٌ مِّنَ النَّوْمِ، اَلصَّلَاةُ خَيْرٌ مِّنَ النَّوْمِ» پھر آخر میں «اَللّٰهُ اَكْبَرُ، اَللّٰهُ اَكْبَرُ، لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ»''

جبکہ صحیح ابن خزیمہ، سنن دارقطنی اور بیہقی میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے بھی یہ کلمات مروی ہیں۔ نیز سنن ترمذی میں حضرت بلال رضی اللہ عنہ سے مروی ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں بھی ان کلماتِ تثویب کا ذکر آیا ہے۔[3]

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ امام احمد رحمہ اللہ اور امام ابن مبارک رحمہ اللہ نے تثویب انہی کلمات کو کہا ہے اور اہلِ علم نے اسے ہی اختیار کیا ہے۔[4]

اس تفصیل سے یہ بات واضح ہوگئی کہ یہ کلمات خود نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے تعلیم فرمودہ ہیں اور یہ جو کہا جاتا ہے کہ یہ الفاظ حضرت عمرِ فاروق رضی اللہ عنہ کی طرف سے اضافہ کردہ ہیں، یہ بات صحیح نہیں ہے۔ موطا امام مالک میں ان کلمات کی نسبت حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی طرف جس روایت میں کی گئی ہے، محدّثین کرام کے نزدیک وہ روایت معضل یا مرسل ہونے کی بنا پر ضعیف ہے۔[5]

[1] المنتقیٰ (۱/ ۱/ ۳۵، ۳۶) سنن الترمذي مع التحفة (۱/ ۵۸۰، ۵۵٦) مشكاة المصابيح (۱/ ۲۰۵، ۲۰٦) صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٦٩) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (۷۰٦)

[2] مشكاة المصابيح (۱/ ۲۰۳) و صححه الألباني، صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٧٢) موارد الظمآن، رقم الحديث ۲۸۹)

[3] مشكاة المصابيح (۱/ ۲۰٤) سنن الترمذي، رقم الحديث (۱۹۸) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (۷۱۵)

[4] سنن الترمذي مع التحفة (۱/ ۵۹۲ تا ۵۹۵) نيل الأوطار (۱/ ۲/ ۳۸) صحيح سنن الترمذي، رقم الحديث (۱٦۵)

[5] مشكاة المصابيح (۱/ ۲۰٦) تحقيق الألباني.

اس تفصیل سے یہ بات بھی واضح ہوگئی کہ اذان کے کلمات یہی ہیں۔ ان کے آگے پیچھے یا درمیان میں دوسرے کوئی کلمات کسی صحیح حدیث سے نبیِ اکرم ﷺ سے ثابت نہیں ہیں۔ اگر ''حَيَّ عَلٰی خَیْرِ الْعَمَلِ'' یا دوسرے کوئی کلمات کبھی تھے بھی تو وہ منسوخ ہو چکے، کیونکہ صحیحین اور دیگر دواوینِ حدیث میں مذکورہ کلمات کے علاوہ دوسرے کسی قسم کے الفاظ کا کوئی ذکر نہیں ہے۔[1]

شیعہ حضرات یہ کلمات ''حَيَّ عَلٰی خَیْرِ الْعَمَلِ'' بڑے التزام سے کہتے ہیں۔ حالانکہ اول تو یہ کلمات کبھی اذان کا حصہ نہیں رہے اور اگر کبھی رہے بھی تو امام شوکانی کی تحقیق کے مطابق منسوخ ہو چکے ہیں۔ اس کی تفصیل ''نیل الأوطار'' کے مذکورہ مقام پر دیکھی جا سکتی ہے۔

اسی طرح یہ لوگ اذان میں ''أَشْھَدُ أَنَّ عَلِیًّا وَلِيُّ اللّٰہِ'' اور ''وَصِيُّ اللّٰہِ'' کے کلمات کا اضافہ بھی کرتے ہیں، یہ بھی ان کی اپنی ایجاد ہے۔ اورتو اور خود حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بھی یہ ثابت نہیں کہ اپنے عہدِ خلافت ہی میں انھوں نے کبھی یہ کلمات کہلوائے ہوں اور کتبِ شیعہ بھی ان کے غیر صحیح ہونے پر شاہد ہیں، مشہور شیعہ کتاب ''من لا یحضرہ الفقیہ'' میں لکھا ہے:

''یہ کلمات اذان کا حصہ نہیں ہیں اور جو شخص ان کلمات کو جزوِ اذان سمجھ کر اذان میں کہے اس پر اللہ کی لعنت ہو۔''[2]

فجر کی دو اذانیں اور پہلی میں تثویب:

اذان بڑے بڑے شعائرِ اسلامیہ میں سے ایک اہم شعار ہے۔ جسے امام شوکانی جیسے بعض اہلِ علم نے واجب، بعض نے سنتِ مؤکدہ اور بعض نے فرض کفایہ قرار دیا ہے۔ شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے دوسری رائے ہی کو صحیح تر قرار دیا ہے۔[3]

صبح کے وقت دو اذانیں ہیں، جن میں سے ایک تو نمازِ فجر کا وقت ہوجانے اور لوگوں کو نماز کے لیے بلانے والی ہے اور دوسری اس سے کچھ پہلے ہوتی ہے۔ ان دونوں اذانوں میں سے دوسری تو

---

[1] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: نیل الأوطار (۱/ ۲/ ۳۹)

[2] دیکھیں: ماہنامہ ''محدث'' لاہور (ص: ٦٤، جلد: ۱۹، شمارہ: ۷ باب رجب ۱۴۰۹ھ بمطابق ۱۹۸۹ء) تبصرہ بر کتاب مقامِ صحابہ (شیعہ مذہب کی روشنی میں) از مولانا فیض عالم صدیقی رحمہ اللہ۔

[3] مجموع الفتاویٰ (۱/ ٦٧، ٦٨، ٤/ ٢٠) تمام المنة (ص: ١٤٤) تفصیل کے لیے دیکھیں: السیل الجرار للشوکاني (۱/ ۱۹٦، ۱۹۷) الأوسط (۳/ ۲٤)

عام اور بلااختلاف معمول بہ ہے۔ البتہ پہلی اذان پر عمل کم ہو رہا ہے، حالانکہ وہ بھی صحیح احادیث سے ثابت شدہ سنت ہے اور نبیِ اکرم ﷺ نے صبح کی ان دونوں اذانوں کے لیے الگ الگ مؤذن مقرر فرمائے ہوئے تھے۔ جیسا کہ صحیح بخاری اور دیگر کتبِ حدیث میں حضرت نافع، حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے بیان کرتے ہیں۔ اس حدیث میں یہ بھی مذکور ہے کہ دونوں موذنوں کے اذان کہنے میں زیادہ وقفہ بھی نہیں ہوتا تھا۔

ایسے ہی صحیحین، سنن نسائی و بیہقی، مسندِ احمد، اور معانی الآ ثار طحاوی میں ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی حدیث میں بھی فجر کے دو الگ الگ موذنوں کا ذکر ہے، اسی طرح انیسہ، انس، سہل بن سعد اور سلمان فارسی رضی اللہ عنہم کی مرویات بھی فجر کی دو اذانوں کے لیے الگ الگ دو موذنوں کا پتا دیتی ہیں۔[1]

بعض احادیث سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ''اَلصَّلَاۃُ خَیْرٌ مِّنَ النَّوْمِ'' (نماز نیند سے بہتر ہے) کے الفاظ پر مشتمل ''تثویب'' کا تعلق پہلی اذان سے ہے، نہ کہ دوسری سے، جبکہ آج کل یہ مروّج دوسری میں ہی ہے اور ان کلمات کے دوسری اذان کی بجائے پہلی کے لیے ثابت ہونے کے دلائل میں سے کئی احادیث ہیں۔ مثلاً سنن ترمذی میں تعلیقاً اور سنن بیہقی، مصنف عبدالرزاق، الاوسط، ابن المنذر اور معانی الآ ثار طحاوی میں موصولاً مروی ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا:

«کَانَ فِيْ الْآذَانِ الْأَوَّلِ بَعْدَ الْفَلَاحِ: اَلصَّلَاۃُ خَیْرٌ مِّنَ النَّوْمِ»

''پہلی اذان میں « حَيَّ عَلَی الْفَلَاحِ » کے بعد دو مرتبہ « اَلصَّلَاۃُ خَیْرٌ مِّنَ النَّوْمِ» کہا جاتا تھا۔''

جب کہ ''الأوسط'' میں تو حضرت نافع کے الفاظ ہیں کہ خود حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما فجر کی پہلی اذان میں ''حَيَّ عَلَی الصَّلَاۃِ'' اور ''حَيَّ عَلَی الْفَلَاحِ'' کے بعد ''اَلصَّلَاۃُ خَیْرٌ مِّنَ النَّوْمِ، اَلصَّلَاۃُ خَیْرٌ مِّنَ النَّوْمِ'' کہا کرتے تھے۔[2]

اس تثویب کے اذانِ اول میں ہونے کے ایک دوسرے راوی حضرت ابو محذورہ رضی اللہ عنہ بھی ہیں۔ ان سے اگرچہ ایک روایت میں مطلق صبح کی نماز کی اذان میں ان الفاظ کا کہنا بھی مروی ہے، جیسا کہ ابو داود اور مسند احمد کے حوالے سے فقہ السنۃ میں حدیث نقل کی گئی تھی، جس میں وہ نبیِ اکرم ﷺ

[1] دیکھیں: إرواء الغلیل (۱/ ۲۳۵۔ ۲۳۹)

[2] دیکھیں: تمام المنۃ، وقال: إسنادہ حسن، کما قال الحافظ (ص: ۱۴۶، ۱۴۷) و الأوسط و تحقیقہ (۳/ ۲۲)

سے درخواست کرتے ہیں کہ اے اللہ کے رسول ﷺ! مجھے اذان کا طریقہ سکھلائیں تو آپ ﷺ نے اسے اذان سکھلائی، جس میں وہ بیان کرتے ہیں کہ نبیِ اکرم ﷺ نے فرمایا:

«فَإِنْ كَانَ صَلَاةُ الصُّبْحِ قُلْتَ: اَلصَّلَاةُ خَيْرٌ مِّنَ النَّوْمِ، اَلصَّلَاةُ خَيْرٌ مِّنَ النَّوْمِ»[1]

''اگر صبح کی نماز ہوتو اذان میں یہ کہو: «اَلصَّلَاةُ خَيْرٌ مِّنَ النَّوْمِ، اَلصَّلَاةُ خَيْرٌ مِّنَ النَّوْمِ»۔''

اب اس حدیث میں تو مطلق صبح کی نماز کہا گیا ہے، جبکہ خود حضرت ابو محذورہ رضی اللہ عنہ ہی سے ایک دوسری حدیث مروی ہے، جو سنن ابو داود، نسائی، دارقطنی، الاوسط، مصنف عبدالرزاق، معانی الآثار طحاوی اور دیگر کتب میں مروی ہے، جس میں نبیِ اکرم ﷺ کا ارشاد ہے:

«وَإِذَا أَذَّنْتَ بِالْأَوَّلِ مِنَ الصُّبْحِ فَقُلْ: اَلصَّلَاةُ خَيْرٌ مِّنَ النَّوْمِ، اَلصَّلَاةُ خَيْرٌ مِّنَ النَّوْمِ»[2]

''جب تم صبح کی پہلی اذان کہو تو یہ بھی کہو: «اَلصَّلَاةُ خَيْرٌ مِّنَ النَّوْمِ، اَلصَّلَاةُ خَيْرٌ مِّنَ النَّوْمِ»۔''

سنن نسائی کے الفاظ ہیں:

«اَلصَّلَاةُ خَيْرٌ مِّنَ النَّوْمِ، اَلصَّلَاةُ خَيْرٌ مِّنَ النَّوْمِ فِي الْآذَانِ الْأَوَّلِ مِنَ الصُّبْحِ»[3]

ان الفاظ کا معنیٰ بھی وہی ہے، جو سابقہ الفاظ کا ہے۔

حضرت ابو محذورہ رضی اللہ عنہ والی اس دوسری روایت اور ابن عمر رضی اللہ عنہما والی روایت سے معلوم ہوا کہ یہ تثویب دراصل دوسری اذان میں نہیں، بلکہ پہلی میں ہونی چاہیے اور جس روایت میں مطلق صبح کی اذان میں ہونا مذکور ہے، اس کے اطلاق کی ان احادیث سے تقیید ہوجاتی ہے، کیونکہ وہ اطلاق صبح کی دونوں اذانوں کو شامل ہے، جبکہ ان احادیث کی رو سے وہاں دوسری اذان مراد ہی نہیں ہے۔

بلوغ المرام کی شرح سبل السلام میں علامہ صنعانی رحمہ اللہ نے بھی یہی بات کہی ہے کہ (حضرت

---

[1] تمام المنة (ص: ١٤٧) الأوسط و تحقيقه (٣/ ٢١)

[2] دیکھیں: سبل السلام (١/ ١١٩) دار الفكر بيروت.

[3] دیکھیں: تمام المنة، حواله بالا.

ابو محذورہ رضی اللہ عنہ والی) اس (دوسری) روایت میں دیگر روایات میں واردشدہ اطلاق کی تقیید ہے۔ آگے ابن رسلان سے نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اُنھوں نے کہا:

''اس روایت کو امام ابن خزیمہ نے صحیح قرار دیا ہے اور ابن رسلان نے کہا کہ تثویب کی مشروعیت فجر کی اذان اول میں ہے، کیوں کہ وہی تو سوئے ہوئے لوگوں کو جگانے کے لیے ہے، جبکہ دوسری اذان تو فجر کا وقت ہونے کی اطلاع اور اس کی طرف دعوت کی خاطر ہوتی ہے۔''

سنن کبریٰ نسائی میں سفیان عن ابی جعفر عن ابی سلیمان کے طریق سے حضرت ابو محذورہ رضی اللہ عنہ کے الفاظ ہیں:

«كُنْتُ أُؤَذِّنُ لِرَسُولِ اللّٰهِ ﷺ فَكُنْتُ أَقُولُ فِي أَذَانِ الْفَجْرِ الْأَوَّلِ»[1]

''میں نبیِ اکرم ﷺ کا مؤذن تھا، پس میں فجر کی پہلی اذان میں یہ کہا کرتا تھا: «حَيَّ عَلَى الصَّلَاةِ، حَيَّ عَلَى الْفَلَاحِ، اَلصَّلَاةُ خَيْرٌ مِّنَ النَّوْمِ»۔''

اس روایت کی سند کو علامہ ابن حزم نے صحیح قرار دیا ہے۔

ایسے ہی سنن کبریٰ بیہقی میں بھی ہے، جس میں حضرت ابو محذورہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ وہ نبیِ اکرم ﷺ کے حکم سے صبح کی پہلی اذان میں تثویب کہا کرتے تھے (جیسا کہ حدیث گزری ہے)۔

آگے علامہ صنعانی فرماتے ہیں:

''ان احادیث کی بنا پر «اَلصَّلَاةُ خَيْرٌ مِّنَ النَّوْمِ» کے الفاظ نماز کے لیے بلانے اور اس کا وقت ہوجانے کی خبر دینے والی (دوسری) اذان کے لیے مشروع نہیں ہیں، بلکہ یہ الفاظ تو سوئے ہوئے کو جگانے کے لیے دی جانے والی اذان (اول) میں کہنے مشروع ہیں۔''[2]

تثویب کے اذانِ اول میں ہونے کی بات صرف ابن رسلان، امیر صنعانی اور علامہ البانی ہی نے نہیں کہی، بلکہ امام ابو حنیفہ اور ان کے دونوں ارشد تلامذہ امام ابو یوسف اور امام محمد رحمہم اللہ سے بھی یہی قول ملتا ہے۔ چنانچہ امام طحاوی رحمہ اللہ نے شرح المعانی میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما اور حضرت ابو محذورہ رضی اللہ عنہ سے مروی احادیث، جو تثویب کے اذانِ اول میں ہونے کے بارے میں صریح ہیں، ان کا ذکر کرنے

---

[1] صحيح سنن النسائي، رقم الحديث (٦٢٨)

[2] سبل السلام (١/ ١١٩)

کے بعد کہا ہے:

”وَهُوَ قَوْلُ أَبِي حَنِيفَةَ وَأَبِي يُوسُفَ وَمُحَمَّدٍ رَحِمَهُمُ اللّٰهُ تَعَالیٰ“

”امام ابو حنیفہ، ابو یوسف اور محمد رحمہم اللہ کا بھی یہی قول ہے۔“

البتہ بعض علما نے ان احادیث میں یہ تطبیق دی ہے کہ جن احادیث میں اذانِ اول کے الفاظ ہیں، ان سے مراد نمازِ فجر والی اذان ہی ہے اور اس پر ”اول“ کا اطلاق اقامت کے مقابلے میں کیا گیا ہے، کیوں کہ اقامت کو بھی حدیث میں اذان کہا گیا ہے۔ یعنی اذانِ اول جو نمازِ فجر کے لیے ہوتی ہے، اس میں یہ الفاظ کہے جائیں گے اور اذان ثانی (اقامت جو نمازِ باجماعت کے لیے ہوتی ہے) اس میں یہ الفاظ نہیں کہے جائیں گے۔

آدابِ اذان اور اوصافِ مؤذن:

اب رہی اذان کہنے کے آداب اور مؤذن کے اوصاف کی بات۔ اس سلسلے میں پہلی بات تو یہ ہے کہ موذن کے لیے وہ صفات یا اوصاف ضروری نہیں، جو پیش امام کے لیے لازمی ہیں، مثلاً افضلیت اور عمر وغیرہ، کیونکہ صحیح بخاری و مسلم میں ارشادِ نبوی ﷺ ہے:

«إِذَا حَضَرَتِ الصَّلَاةُ فَلْيُؤَذِّنْ أَحَدُكُمْ وَلْيَؤُمَّكُمْ أَكْبَرُكُمْ»[1]

”جب نماز کا وقت ہو جائے تو تم میں سے ایک اذان کہے اور سب سے بڑا امامت کرائے۔“

احادیثِ نبویہ ﷺ سے جن اوصاف کا پتا چلتا ہے اور اذان کہنے کے جو آداب سامنے آتے ہیں۔ ان کی قدرے تفصیل کچھ یوں ہے:

1. مؤذن باوضو ہو کر اذان دے، کیونکہ اذان کے کلمات بھی ذکر ہیں اور ذکر باوضو ہی اولیٰ ہے۔

البتہ اس سلسلے میں سنن ترمذی و بیہقی میں جو حدیث ہے:

«لَا يُؤَذِّنُ إِلَّا مُتَوَضِّئٌ»[2] ”باوضو انسان ہی اذان دے۔“

وہ تو محدّثینِ کرام کے نزدیک ضعیف ہے۔[3] یہی وجہ ہے کہ اہلِ علم میں دونوں طرح کی آرا

[1] صحیح البخاري مع الفتح، رقم الحدیث (٦٢٨) صحیح مسلم مع شرح النووي (٣/ ١٧٤)

[2] ضعیف الجامع، رقم الحدیث (٦٣٣٢)

[3] الإرواء (١/ ٢٤٠) تحفة الأحوذي (١/ ٥٩٩)

موجود ہیں۔ امام شافعی، امام اسحاق بن راہویہ، امام عطا اور بعض دیگر اہلِ علم کے نزدیک بلاوضو اذان دینا مکروہ ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے امام عطاء رحمہ اللہ کے قول "اَلْوُضُوْءُ حَقٌّ وَسُنَّةٌ"، کو تعلیقاً ذکر کیا ہے، جب کہ سفیان ثوری، ابن المبارک، احمد بن حنبل، مالک، ابراہیم نخعی رحمہم اللہ اور احناف کے نزدیک بلاوضواذان کہنے کی اجازت ہے۔ امام ابراہیم نخعی رحمہ اللہ کا قول بھی امام بخاری رحمہ اللہ نے تعلیقاً ذکر کیا ہے۔[1]

مذکورہ حدیث کے بعض شواہد بھی ہیں، ایک تو حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے تلخیص میں، سنن بیہقی و الافراد اور دارقطنی کے حوالے سے حضرت وائل بن حجر رضی اللہ عنہ سے ذکر کیا ہے۔ دوسرا شاہد امام زیلعی رحمہ اللہ نے "نصب الرایۃ" میں ابوالشیخ کے حوالے سے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے۔ ان شواہد کے پیشِ نظر علامہ مبارکپوری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ موذن کا باوضو ہونا ہی زیادہ اولیٰ ہے۔[2]

(٢) مؤذن کسی اونچی جگہ پر کھڑا ہو کر اذان دے، تا کہ آواز دور تک جائے۔ کیوں کہ سنن ابو داود میں ایک روایت ہے، حضرت عروہ بن زبیر رضی اللہ عنہ بنی نجار کی ایک عورت سے بیان کرتے ہیں، وہ کہتی ہے:

"میرا گھر مسجد کے ارد گرد والے تمام گھروں سے اونچا تھا اور حضرت بلال رضی اللہ عنہ اس پر کھڑے ہو کر اذان دیا کرتے تھے۔"

مگر آج جہاں جہاں لاؤڈ سپیکر موجود ہیں، وہاں اونچی جگہ پر کھڑے ہونے کی ضرورت ہی نہیں رہتی۔

(٣) آدمی چاہے تنہا ہی کیوں نہ ہو، بلند آواز سے اذان کہے، کیونکہ صحیح بخاری، سنن نسائی، ابن ماجہ اور مسندِ احمد میں حدیث ہے، جسے حضرت ابو سعید رضی اللہ عنہ سے عبداللہ بن عبدالرحمٰن بن ابو صعصعہ اپنے باپ کے حوالے سے بیان کرتے ہیں، جس میں یہ الفاظ بھی ہیں:

«فَإِذَا كُنْتَ فِيْ غَنَمِكَ أَوْ بَادِيَتِكَ فَارْفَعْ صَوْتَكَ بِالنِّدَاءِ»[3]

"جب تم اپنی بکریوں کے ساتھ جنگل میں ہو تو بلند آواز سے اذان کہو۔"

---

[1] صحيح البخاری مع الفتح (٢/ ١١٤) سنن الترمذي مع التحفة (١/ ٥٨٩۔ ٦٠١)

[2] تحفة الأحوذي (١/ ٦٠١)

[3] صحيح البخاری مع الفتح، رقم الحديث (٦٠٩) صحيح سنن النسائي، رقم الحديث (٦٢٥) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٧٢٣)

آگے اس کا ثواب بھی بتایا کہ جن وانس میں سے جو بھی تمھاری آواز سنے گا، قیامت کے دن تمھارے حق میں شہادت دے گا۔

اگر کبھی کسی کی متعدد یا ایک نماز قضا ہوجائے یا جمع بین الصلاتین کا ارادہ ہو تو جب نماز پڑھنا ہو، پہلے اذان کہے اور پھر اقامت کے ساتھ نماز ادا کرے۔ اگر دو یا زیادہ نمازیں ہوں تو صرف ایک ہی اذان کہے، لیکن ہر نماز کے لیے اقامت کہتا جائے، جیسا کہ غزوۂ خندق کے موقع پر نبیِ اکرم ﷺ نے چار نمازیں ادا فرمائیں۔ یہ حدیث سنن ترمذی، نسائی، مسندِ احمد، سنن بیہقی، صحیح ابن حبان، ابن خزیمہ اور مسند طیالسی میں مذکور ہے۔

۴ موذن قبلہ رو کھڑا ہو کر اذان کہے، کیونکہ نبیِ اکرم ﷺ کے دونوں موذن قبلہ رو کھڑے ہو کر اذان کہا کرتے تھے اور یہی طریقہ بالاتفاق مسنون ومندوب ہے۔ البتہ فقہاے مذاہب اربعہ نے لوگوں کو آواز سنانے کی خاطر گھوم جانے کی بھی اجازت دی ہے۔ بشرطیکہ وہ اذان کا آغاز قبلہ رُو ہو کر کرے۔[1]

کھڑے ہو کر اذان کہی جائے یہی مسنون ہے۔ امام ابن المنذر نے اس پر اجماع نقل کیا ہے اور اگر عذر ہو تو بیٹھ کر بھی اذان کہی جا سکتی ہے، جیسا کہ سنن بیہقی میں ایک صحابی ابو زید رضی اللہ عنہ کا عمل نقل ہوا ہے۔[2]

۵ دورانِ اذان جب ''حَيَّ عَلَى الصَّلَاةِ'' کہے تو سر، گردن اور سینے کو دائیں جانب اور جب ''حَيَّ عَلَى الْفَلَاحِ'' کہے تو بائیں جانب گھمائے، جیسا کہ سنن ترمذی اور مسند احمد میں حضرت جحیفہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

«رَأَيْتُ بِلَالًا، يُؤَذِّنُ وَيَدُورُ، وَيُتْبِعُ فَاهُ هَاهُنَا، وَاصْبَعَاهُ فِي أُذُنَيْهِ، وَرَسُولُ اللّٰهِ ﷺ فِي قُبَّةٍ لَهُ حَمْرَاءَ»[3]

''میں نے بلال رضی اللہ عنہ کو دیکھا کہ وہ اذان کہتے ہوئے اپنے منہ کو اِدھر اُدھر پھیر رہے تھے اور ان کی دونوں انگلیاں کانوں میں تھیں، جب کہ نبیِ اکرم ﷺ سرخ قبے میں تھے۔''

---

[1] الفقه على المذاهب الأربعة (١/ ٣١٧)

[2] إرواء الغليل (١/ ٢٤١)

[3] سنن الترمذي مع تحفة (١/ ١٨٩، ١٩٠) وصححه الألباني في تعليقه على مشكاة المصابيح (١/ ٢٠٦)

گھوم جانے کی کیفیت کے بارے میں امام شوکانی رحمہ اللہ نے "نیل الأوطار" (۱/ ۲/ ٤٧) میں بڑی تفصیل ذکر کی ہے۔

۶ اذان کے وقت اپنے دونوں کانوں میں انگلیوں کے پورے ڈالے رکھے، جیسا کہ اسی مذکورہ حدیث میں حضرت بلال رضی اللہ عنہ کا طریقہ ذکر ہوا ہے اور دونوں میں کون سی انگلیاں ڈالے؟ اس کی صراحت تو نہیں ملتی، البتہ معروف یہی ہے اور فقہا و ائمہ اور خصوصاً امام نووی رحمہ اللہ نے بھی یہی کہا ہے کہ وہ انگشتِ شہادت یعنی دونوں ہاتھوں کے انگوٹھے کے ساتھ والی انگلیاں ہوں۔[1]

سنن ابن ماجہ کی ایک روایت میں اس کی وجہ یہ بتائی گئی ہے کہ اس طرح موذن زیادہ بلند آواز نکال سکتا ہے، مگر وہ روایت ضعیف ہے۔ لیکن مذکورہ وجہ بلاشبہہ معقول ہے اور امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اہلِ علم نے اس چیز کو پسند کیا ہے۔[2]

۷ موذن ایسا شخص ہو جو اجرت نہ لے، بلکہ لوجہ اللہ یہ فریضہ سرانجام دے۔ کیوں کہ سنن ابو داود، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ اور مسند احمد میں حضرت عثمان بن ابو العاص رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کی کہ مجھے میری قوم کا امام مقرر فرما دیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"تم ان کے امام ہو اور (نماز کے دوران میں) کمزور نمازیوں کا خیال رکھو۔"

«وَاتَّخِذْ مُؤَذِّنًا لَا يَأْخُذُ عَلٰى أَذَانِهٖ أَجْراً»[3]

"تم کسی ایسے شخص کو موذن مقرر کرو، جو اذان کہنے پر اجرت نہ لے۔"

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اور اکثر اہلِ علم نے اذان پر اُجرت لینے کو ناپسند کیا ہے۔[4] "نیل الأوطار" میں امام شوکانی رحمہ اللہ نے نقل کیا ہے کہ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک

---

[1] فتح الباري (٢/ ١١٦)

[2] سنن الترمذي مع التحفة (١/ ٥٩١)

[3] مشكاة المصابيح و تحقيقه (١/ ٢١١) سنن الترمذي مع التحفة (١/ ٦١٨) المنتقىٰ مع النيل (١/ ٢/ ٥٨) مسند أحمد (٤/ ٢١٧) مستدرك الحاكم (١/ ١٩٩) بحواله تحقيق المصابيح (١/ ٢٧٥) صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٩٧) صحيح سنن الترمذي، رقم الحديث (١٧٢) صحيح سنن النسائي، رقم الحديث (٦٤٨) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٧١٤)

[4] سنن الترمذي مع التحفة (١/ ٦١٩)

اذان پر اجرت لینا حرام ہے، لیکن امام مالک رحمہ اللہ کے نزدیک اس میں کوئی حرج نہیں۔[1] امام شافعی رحمہ اللہ نے کتاب الام میں کہا ہے کہ مجھے محبوب یہ ہے کہ موذنین لوجہ اللہ اذان دیں۔[2]

٨ موذن مرد ہو یا سمجھ دار لڑکا، عورت کا اذان کہنا بعض اہلِ علم نے مکروہ قرار دیا ہے۔ امام احمد، شافعی اور اسحاق رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اگر صرف عورتوں میں کوئی عورت اذان کہہ لے تو کوئی حرج نہیں۔[3]

سنن بیہقی میں ابن عمر رضی اللہ عنہما سے موقوفاً مروی حدیث ہے:

''لَیْسَ عَلَی النِّسَاءِ أَذَانٌ وَلَا إِقَامَةٌ'' ''عورتوں پر نہ اذان ہے اور نہ ہی اقامت۔''

اس کی تائید حضرت اسماء رضی اللہ عنہا سے مروی مرفوعاً مگر ضعیف روایت سے بھی ہوتی ہے، جسے بیہقی و ابن عدی رحمہما اللہ نے بیان کیا ہے۔[4] حضرت انس، حسن بصری، ابن سیرین، نخعی، ثوری، مالک، ابوثور رحمہم اللہ اور احناف کا یہی مسلک ہے۔[5]

یہاں اس بات کی وضاحت بھی کر دیں کہ فقہ السنۃ میں سنن بیہقی سے ابن عمر رضی اللہ عنہما کا جو اثر بیان کیا گیا ہے، اس کی سند کو صحیح لکھا ہے۔ یہی بات ''نیل الأوطار'' میں امام شوکانی رحمہ اللہ نے لکھی تھی اور ان سے بھی پہلے ''تلخیص الحبیر'' (١/ ٢١١) میں حافظ ابن حجر رحمہ اللہ سے بھی ہوا، جبکہ دورِ حاضر کے معروف محدث علامہ البانی نے ''سلسلة الأحادیث الضعیفة'' (٢/ ٢٧٠) اور ''تمام المنة'' (ص: ١٥٣) میں اس قولِ تصحیح کو خطا فاحش قرار دیا ہے۔ اس تصحیح کا سبب اس اثر کی سند کے ایک راوی عبداللہ ہیں، جو نافع سے بیان کرتے ہیں اور العمری (عبداللہ بن عمر۔ العمری المکبّر) ہیں نہ کہ عبیداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما، تصحیح کرنے والوں کا یہی وہم اس اثر کی تصحیح کا باعث ہوا۔

پھر حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی یہ اثر متن کے اعتبار سے مصنف ابن ابی شیبہ (١/٢٢٣) میں مروی ایک اثر کے مخالف بھی ہے، جس کی سند بھی جید ہے۔ اس میں وہب بن کیسان کہتے ہیں کہ

---

[1] نیل الأوطار (١/ ٢/ ٥٩) تحفة الأحوذي (١/ ٦١٩)
[2] نیل الأوطار (١/ ٢/ ٥٩)
[3] فقه السنة (١/ ١٢٠)
[4] نیل الأوطار (١/ ٢/ ٣٢)
[5] فقه السنة (١/ ١٢٠)

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے پوچھا گیا کہ عورتوں پر بھی اذان ہے؟ تو وہ غضب ناک ہوئے اور فرمایا:

«أَنَا أَنْهٰى عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ» ''میں ذکرِ الٰہی سے روکوں؟''

یعنی میں اذان کہنے سے انھیں کیوں روکوں۔ امام احمد رحمہ اللہ نے اسی اثر سے احتجاج کیا ہے۔[1]

اس معاملے میں امام شافعی اور اسحاق رحمہما اللہ بھی امام احمد رحمہ اللہ کے ہمنوا ہیں کہ عورت کے اذان کہہ لینے میں کوئی حرج نہیں، جیسا کہ شروع میں ذکر ہوا ہے اور اس کی ایک دلیل ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے فعل سے بھی ہوتی ہے۔ چنانچہ مستدرک حاکم اور انھی کے طریق سے سنن کبریٰ بیہقی، مصنف عبدالرزاق و ابن ابی شیبہ میں مروی ہے:

''إِنَّهَا كَانَتْ تُؤَذِّنُ وَتُقِيمُ وَتُؤَمُّ النِّسَاءَ وَتَقِفُ وَسْطَهُنَّ''[2]

''حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اذان کہا کرتی تھیں اور اقامت کہتیں اور عورتوں کو جماعت کراتی تھیں اور ان کے وسط میں (صف کے اندر) کھڑے ہوتی تھیں۔''

عورتوں کی امامت کرانے کے الفاظ مصنف ابن ابی شیبہ (۲/ ۸۹) میں ابن ابی لیلیٰ کے طریق سے مروی اثر میں بھی موجود ہیں۔ لہٰذا اس اضافے کی متابعت ہوگئی اور یہ دونوں اثر ایک دوسرے کے لیے باعثِ تقویت ہیں۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے اس اثر کے کئی دیگر طُرق بھی ہیں۔ مثلاً ایک طریق رائطہ حنفیہ سے سنن بیہقی، دارقطنی اور مصنف عبدالرزاق میں مروی ہے۔ جس میں وہ بیان کرتی ہیں:

''إِنَّ عَائِشَةَ أَمَّتْ نِسْوَةً فِي الْمَكْتُوبَةِ فَأَمَّتْهُنَّ بَيْنَهُنَّ وَسَطًا''[3]

''حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے عورتوں کی فرض نماز میں امامت کرائی اور ان کے وسط میں (صف کے اندر) کھڑی ہوئیں۔''

اس کی سند کو امام نووی رحمہ اللہ نے ''المجموع'' (٤/ ١٩٩) میں صحیح کہا ہے اور ''نصب الرایۃ'' (۲/ ۳۱) میں علامہ زیلعی رحمہ اللہ نے ان کی تصحیح کو برقرار رکھا ہے۔ البتہ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے ''التلخیص الحبیر'' (۲/ ٤۲) سکوت اختیار فرمایا ہے۔ علامہ البانی نے ان کے سکوت ہی کو اقرب قرار دیا ہے اور لکھا ہے کہ مجھے اس رائطہ کے حالات نہیں ملے۔[4]

---

[1] تمام المنة (ص: ۱۵۳)

[2] تمام المنة (۱۵۳)

[3] تمام المنة (۱۵۳)

[4] تمام المنة (ص: ۱۵٤)

مصنف عبدالرزاق و ابن ابی شیبہ اور سنن بیہقی میں اس روایت کی ایک شاہد ہے، جس میں حجیرہ بنت حصین بیان کرتی ہیں:

"أَمَّتْنَا أُمُّ سَلَمَةَ فِيْ صَلَاةِ الْعَصْرِ، قَامَتْ بَيْنَنَا"[1]

"ہمیں اُم المومنین حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے نمازِ عصر کی جماعت کرائی اور ہمارے وسط میں کھڑی ہوئیں۔"

مصنف ابن ابی شیبہ میں قتادہ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کی آزاد کردہ کنیز اور حضرت حسن بصری رحمہ اللہ کی والدہ خیرہ کے حوالے سے بیان کرتے ہیں:

"إِنَّهَا رَأَتْ أُمَّ سَلَمَةَ زَوْجَ النَّبِيِّ ﷺ تَؤُمُّ النِّسَاءَ، وَتَقُوْمُ مَعَهُنَّ فِيْ صَفِّهِنَّ"[2]

"انھوں نے ام المومنین حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہ کو عورتوں کی جماعت کراتے دیکھا اور وہ عورتوں کی صف کے اندر کھڑی ہوئیں۔"

یہ تمام آثار قابلِ عمل ہیں، خصوصاً جبکہ ارشادِ نبوی ﷺ:

«إِنَّمَا النِّسَاءُ شَقَائِقُ الرِّجَالِ» "عورتیں مردوں کی ہم جنس ہیں۔"

بھی ان کا مؤید ہے۔ ان آثار سے یہ بات بھی واضح ہوگئی کہ عورت کے اذان کہنے کے سلسلے میں امام احمد، شافعی اور اسحاق رحمہم اللہ کا مسلک ہی راجح ہے، جبکہ امام شوکانی رحمہ اللہ نے تو وجوبِ اذان کے دلائل ذکر کر کے آخر میں یہ بھی لکھا ہے:

"بظاہر عورتیں بھی مَردوں کی طرح ہی ہیں، کیونکہ وہ مَردوں کی ہم جنس ہیں اور جو حکم مَردوں کے لیے ہے وہی عورتوں کے لیے بھی اور ایسی کوئی دلیل نہیں ہے، جو ایسی ہو کہ عورتوں پر اذان کے عدمِ وجوب کا ثبوت بن سکے اور جو دلیل وارد ہے، اس کی سند میں دو راوی متروک ہیں، جن سے حجت جائز نہیں۔ بہر حال اگر کوئی ایسی دلیل مل جائے، جس کی بنا پر عورتوں کو مَردوں کے حکم سے الگ کیا جا سکے، تب تو ایسا ہی ہے، ورنہ پھر وہ مَردوں کی طرح ہی اس حکم میں شامل ہیں۔"[3]

---

[1] تمام المنة (ص: ١٥٤)

[2] تمام المنة (ص: ١٥٤)

[3] السيل الجرار (١/ ٩٦، ١٩٧) تمام المنة (ص: ١٤٤)

اذان کا شرعی حکم:

اب رہا معاملہ اذان کے شرعی حکم کا تو امام عطا، احمد بن حنبل، مالک، مجاہد، اوزاعی اور داود رحمہم اللہ اذان کو واجب قرار دیتے ہیں اور ان کا استدلال متعدد احادیث سے ہے:

پہلی دلیل:

سنن ابو داود ونسائی، صحیح ابن حبان، مسندِ احمد اور مستدرکِ حاکم میں مروی ہے:

«مَا مِنْ ثَلَاثَةٍ فِيْ قَرْيَةٍ وَلَا بَدْوٍ، وَلَا تُقَامُ فِيْهِمُ الصَّلَاةُ إِلَّا اسْتَحْوَذَ عَلَيْهِمُ الشَّيْطَانُ، فَعَلَيْكَ بِالْجَمَاعَةِ، فَإِنَّمَا يَأْكُلُ الذِّئْبُ الْقَاصِيَةَ»[1]

''اگر کسی گاؤں یا صحرا میں تین آدمی ہوں اور وہ اذان و اقامت کہہ کر جماعت سے نماز ادا نہ کریں تو ان پر شیطان غالب آ جاتا ہے، پس تم پر جماعت لازم ہے اور تنہا بکری کو بھیڑیا کھا جاتا ہے۔''

مسند احمد کے الفاظ ہیں:

«مَا مِنْ ثَلَاثَةٍ لَا يُؤَذِّنُوْنَ، وَلَا تُقَامُ فِيْهِمُ الصَّلَاةُ»[2]

دوسری دلیل:

صحیحین میں ارشادِ نبوی ﷺ ہے:

«إِذَا حَضَرَتِ الصَّلَاةُ فَلْيُؤَذِّنْ لَكُمْ أَحَدُكُمْ وَلْيَؤُمَّكُمْ أَكْبَرُكُمْ»[3]

''جب نماز کا وقت ہوجائے تو ایک شخص اذان کہے اور تم میں سے بڑا تمھیں جماعت کرائے۔''

---

[1] مسند أحمد (٥/ ١٩٦) صحيح ابن خزيمة، رقم الحديث (١٤٨٦) المستدرك للحاكم (١/ ٢٤٦) بحواله تحقيق مصابيح السنة (١/ ٣٩٤) صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (٥١١) صحيح سنن النسائي، رقم الحديث (٨١٧) صحيح الجامع، رقم الحديث (٥٧٠١)

[2] المنتقیٰ مع النيل (١/ ٢/ ٣١)

[3] المنتقیٰ (١/ ٢/ ٣٢) صحيح البخارى مع الفتح، رقم الحديث (٦٢٨) صحيح مسلم مع شرح النووي (٣/ ٥/ ١٧٤)

تیسری دلیل:

صحیح بخاری و مسلم ہی کی حدیث ہے کہ نبیِ اکرم ﷺ نے حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو دوہری اذان اور اکہری اقامت کہنے کا حکم فرمایا اور حکم وجوب کے لیے ہوتا ہے۔

چوتھی دلیل:

سنن ابو داود، ترمذی، ابن ماجہ، دارمی اور مسندِ احمد میں حضرت عبداللہ بن زید سے مروی حدیث ہے:
«ثُمَّ أَمَرَ بِالتَّأْذِيْنِ» ''پھر آپ ﷺ نے اذان کہنے کا حکم فرمایا۔''

پانچویں دلیل:

پانچویں دلیل نبیِ اکرم ﷺ کا تادمِ واپسیں اذان پر دوام اختیار فرمانا بھی ہے۔[1]

امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ اسے سنت قرار دیتے ہیں اور ان کا استدلال اس حدیث سے ہے، جس میں مذکور ہے کہ حجۃ الوداع کے موقع پر مزدلفہ میں آپ ﷺ نے بلا اذان صرف اقامت سے نمازِ مغرب وعشا ادا فرمائیں۔ جبکہ صحیح بخاری میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے مزدلفہ میں بھی دو اذانوں اور دو اقامتوں سے نماز ادا فرمائی۔

امام مالک رحمہ اللہ کے نزدیک اذان سنتِ مؤکدہ اور واجب علی الکفایہ ہے اور بعض نے فرضِ کفایہ کہا ہے۔ امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک بھی امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کی طرح اذان سنت ہے، جبکہ اصحابِ شافعی میں سے بعض نے اسے سنت، بعض نے فرض کفایہ اور بعض نے جمعہ کے لیے فرضِ کفایہ اور باقی نمازوں کے لیے اسے سنت قرار دیا ہے۔[2]

بہر حال اذان ایک اہم ذکر اور شعائرِ اسلام میں سے ہے۔ کوئی شخص چاہے اکیلا ہی کیوں نہ ہو، احادیث میں اس کے اذان کہہ کر نماز پڑھنے اور نبیِ اکرم ﷺ کا اس کی تحسین کرنے کا پتا چلتا ہے۔ اگر صرف دو ہوں تب بھی ایک اذان کہے اور بڑا امامت کرائے۔ اگر تین ہوں اور اذان و اقامت اور جماعت کا اہتمام نہ کریں تو ان پر شیطان کے غالب آجانے کی نبیِ اکرم ﷺ نے خبر دی ہے۔ ان سب امور سے اذان کی اہمیت واضح ہوجاتی ہے، بلکہ وجوب کے قول کا پلہ بھاری ہو جاتا ہے۔

---

[1] نيل الأوطار (١/ ٢/ ٣٣، ٣٦) و فتح الباري (٢/ ٧٩)

[2] نيل الأوطار (١/ ٢/ ٣٢)

سپیکری درود وسلام وغیرہ:

اذان کے ضروری مسائل تو قدرے اختصار سے آپ کے سامنے آ گئے ہیں۔ اقامت کے مسائل سے پہلے ہم یہاں ایک اہم بات کی طرف آپ کی توجہ مبذول کروانا چاہتے ہیں اور وہ یہ کہ مسائلِ اذان کی تفصیل میں آپ نے کتنی زیادہ احادیث پڑھی ہیں، مگر کیا کسی ایک میں بھی یہ ذکر آیا ہے کہ اذان سے متصل پہلے صلوۃ و سلام بھی خوب راگ لگا کر پڑھا جائے؟ ہرگز نہیں۔ صلوۃ وسلام اور درود شریف کے فضائل و برکات اپنی جگہ، مگر عین اذان سے پہلے اسی طرح انھیں پڑھنا گویا یہ اذان کا ہی کوئی حصہ ہیں، یہ قطعاً ناجائز اور صریحاً بدعت ہے۔ یہ تقسیمِ پاک و ہند کے بعد ایجاد ہونے والی بدعت ہے اور عمر رسیدہ لوگ اس کے گواہ ہیں۔ خاص طور پر جب سے مساجد میں لاؤڈ سپیکر عام ہوئے ہیں، یہ سلسلے بھی زوروں پر آ گیا ہے۔ اس اعتبار سے اسے سپیکری درود وسلام بھی کہا جاتا ہے۔

حنبلی، شافعی اور مالکی حتیٰ کہ خود احناف کا دیوبندی مکتبِ فکر بھی اس کا قائل و فاعل نہیں، صرف بریلوی مکتبِ فکر کے لوگ اس ایجادِ نو کو اپنائے رکھنے پر مصر نظر آتے ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ ان میں سے بھی کتنے ہی علما اس کو بدعت قرار دے چکے ہیں۔ صرف کم پڑھے لکھے لوگوں کی بِھیڑ ہے، جو ماننے کے لیے تیار نہیں تو آیئے آپ کو صرف احناف کے بریلوی مکتبِ فکر کے بعض علما کی تصریحات بھی سنا دیں۔

مرکز سوادِ اعظم اہلِ سنت والجماعت آستانہ عالیہ چشتیہ صابریہ دار الحق ٹاؤن شپ سکیم لاہور کی طرف سے آٹھ صفحاتی پمفلٹ شائع ہوا تھا، جس کا عنوان ہے: ''اذان سے قبل صلوۃ (درود شریف)، تسمیہ (بلند آواز بسم اللہ پڑھنا) اور تعوذ (اعوذ باللہ) بلند آواز سے پڑھنا غیر مشروع، ناجائز اور بدعت ہے۔ یہ تو عنوان ہے۔ اسی پمفلٹ میں بریلوی مکتبِ فکر کے علما اور پیر حضرات کے فتاویٰ ہیں، جن میں آستانہ عالیہ علی پور کے پیر جماعت علی شاہ صاحب، مفتی محمد حسین نعیمی، مرکز اہلِ سنت والجماعت دارالعلوم حزب الاحناف لاہور اور اس مکتبِ فکر کے بانی احمد رضا خاں بریلوی کے فتاویٰ درج ہیں، جن کا خلاصہ مذکورہ عنوان ہی میں آ گیا ہے۔ لہٰذا تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں۔ مذکورہ پمفلٹ کی عبارت یہ ہے:

اذان سے قبل صلوۃ، تسمیہ، تعوذ بلند آواز سے پڑھنا غیر مشروع، ناجائز اور بدعت ہے

''ماہنامہ ''انوار الصوفیہ'' قصور، ترجمان آستانہ عالیہ علی پور شریف، مؤسس اعلیٰ حضرت امیرِ ملت مجدد العصر جناب قبلۂ عالم پیر جماعت علی شاہ صاحب، اعلیٰ حضرت مولانا احمد رضا خاں بریلوی رحمہ اللہ، امامِ اہل سنت مفتی اعظم پاکستان مفتی محمد حسین نعیمی، جامعہ نعیمیہ لاہور، مرکزِ اہل سنت والجماعت دارالعلوم حزب الاحناف داتا گنج بخش روڈ لاہور کے فتاویٰ۔''

سوال:

''آج کل ہم اہل سنت والجماعت کی تمام مساجد میں بآواز بلند اذان سے قبل صلوۃ وسلام پڑھتے ہیں اور بعض مؤذنین صلوۃ وسلام سے بھی پہلے اعوذ اور بسم اللہ اور آیت ﴿اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَ الْمُنْكَرِ﴾ یا کوئی اور آیت پڑھتے ہیں، پھر صلوۃ وسلام اور پھر اذان پڑھتے ہیں، کیا یہ جائز ہے؟

جواب:

''اذان سے قبل اعوذ باللہ پڑھنا مشروع نہیں ہے۔ اس کا حکم قرآن شریف کے ساتھ مخصوص ہے، یعنی جب قرآن شریف پڑھنا چاہو تو اعوذ باللہ پڑھ لو، اس کے سوا کسی چیز سے پہلے پڑھنے کا حکم نہیں۔ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ہر نیک کام کے اول پڑھنا باعثِ برکت ہے، لیکن اُونچی آواز سے اور مزید برآں لاؤڈ سپیکر میں پڑھنا فضول ہے۔ آہستہ سے پڑھنا کافی ہے۔ قرونِ اولیٰ میں بلکہ پاکستان کے معرضِ وجود میں آنے سے پہلے کہیں بھی اذان کو اونچی آواز سے بسم اللہ پڑھ کر شروع کرنا معہود نہیں ہے، ایسے ہی اونچی آواز سے بالالتزام صلوۃ وسلام اذان سے قبل پڑھنا اور اس کو عادت بنانا مشروع نہیں ہے۔ دراصل یہ زوائد وہابیوں، دیوبندیوں کی ضد سے یا نعت خوان قسم کے موذنین نے پیدا کیے ہیں، پہلے زمانوں میں سب قارئین جانتے ہیں کہ اذان اس زوائد سے خالی ہوتی تھی۔ اگر ہمارے علما عوام کی تائید میں کہ اب وہ اس راستے پر چل پڑے ہیں، غور وفکر

سے اس کو جائز ثابت کر بھی دیں تو صرف جائز ہی ہوگا، مستحب یا مندوب یا افضل نہیں ہوگا۔ باقی رہ گئی یہ بات کہ اس پر ثواب بھی ہوگا، یہ بات تب ہو کہ جب وہ مستحب ہو۔

''اعلیٰ حضرت مولانا احمد رضا خان بریلوی سے اس کی بابت پوچھا گیا تو انھوں نے لکھا کہ اذان کے بعد جب جماعت کا وقت قریب ہو، کسی شخص یا موذن کا بطورِ تثویب کے سلام وصلوۃ پڑھنا بہتر ہے، یعنی اذان کے بعد صلوۃ وسلام پڑھنے کی وجہ تو ہوسکتی ہے پہلے نہیں اور اس رسم کو جو اسلام میں معہود نہیں، جہلا بڑھاتے چلے جا رہے ہیں اور علما خاموش ہیں، پتا نہیں کیوں؟ یہ عظیم المیہ ہے۔''[1]

سوال:

''حضرت مولانا مفتی محمد حسین نعیمی صاحب السلام علیکم! گزارش ہے قرآن وسنت کی روشنی میں ارشاد فرمائیں کہ پنج وقت نماز کے لیے جو اذانیں دی جاتی ہیں، ان سے پہلے رسول اللہ ﷺ پر درود وصلوۃ بآواز بلند بھیجنا مسنون ومشروع ہے؟ جیسا کہ ہمارے ہاں معمول بنتا جا رہا ہے۔ نمازِ فجر سے پہلے ہمارے محلّے کی مسجد میں سے تین یا ساڑھے تین بجے ہی لاؤڈ سپیکر پر صوفیا کا کلام یا کوئی اور کلام سنانا شروع کر دیا جاتا ہے۔ کبھی کبھی درود وسلام کو بھی سنایا جاتا ہے۔ کیا محلّے والوں کو تین یا ساڑھے تین بجے ہی جگا دینا اِسلامی طریقہ ہے؟ صحیح فتویٰ دے کر عنداللہ ماجور ہوں۔ (السائل محمد حنفی باغبان پورہ جی ٹی نمبر ۲۴۵، لاہور)

الجواب هو الموافق للصواب:

درود شریف پڑھنا مسلمان کے لیے ذریعہ نجات اور وسیلہ شفاعت ہے۔ قرآنِ کریم میں واضح طور پر ایمان والوں کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ محبت اور عظمتِ رسول ﷺ کے لیے درود شریف پڑھا کریں۔ نماز کے اندر بھی درود شریف پڑھنے کا حکم ہے۔ اس لیے کوئی صحیح العقیدہ مسلمان درود شریف سے گریز نہیں کر سکتا اور اگر کوئی ایسا کرے تو یہ اس کی بدنصیبی ہوگی۔ اذان کے کلمات مقرر ہیں، اس میں کمی بیشی کرنا یا ان کے آگے پیچھے درود شریف یا قرآنِ کریم کی آیات بلا فصل ملانا بدعت اور عباداتِ الٰہی میں خلل ڈالنے کے مترادف

[1] دیکھیں: انوار الصوفیہ، علامہ غلام رسول گوہر ایڈیٹر۔ ماہ جنوی ۱۹۷۸ء شمارہ نمبر ۴)

ہے۔ اذان کے ساتھ اول درود شریف کو لازم قرار دینا اور اہلِ سنت کا شعار بنانا بھی بدعت اور عبادت معہودہ میں تحریف کرنے کی کوشش ہے۔ بہتر یہ ہے کہ درود شریف پڑھنے کی سعادت اگر حاصل کرنے کی کوشش ہے، تو اذان علاحدہ پڑھی جائے، کم ازکم پانچ منٹ پہلے پڑھ لی جائے۔ درمیان میں وقفہ دے کر اذان کہیں یا اس سے بھی بہتر یہ ہے کہ اذان کے بعد دعا پڑھ کر درود شریف پڑھیں۔ جب لوگ سوئے ہوئے ہوں یا کسی کام میں مشغول ہوں، نماز باجماعت سے پہلے قرآنِ کریم یا درود شریف یا کوئی وظیفہ یا صوفیاے کرام کا کلام بلند آواز سے پڑھنا سنت کے خلاف اور اہلِ اسلام کو پریشان کرنے، ان کو بلا وجہ تنگ کرنے کے گناہ کا ارتکاب ہے۔ بالخصوص فجر سے پہلے لاؤڈ سپیکر پر صوفیاے کرام کا کلام پڑھنا غیر مستحسن اور دوسروں کو تکلیف دینے کے مترادف ہے۔ فجر کے وقت سوائے دو سنت کے نوافل پڑھنے کا حکم بھی نہیں ہے۔ حضور ﷺ نمازیوں کی دشواری کے پیشِ نظر بعض اوقات نماز اور قراءت میں تخفیف کر دیا کرتے تھے۔ امام وخطیب کو ایسا رویہ اختیار نہیں کرنا چاہیے، جس سے اہلِ محلّہ تنگ ہوں، جبکہ اس کا عمل سنت بھی نہ ہو، مستحب بھی نہ ہو۔ واللہ اعلم بالصواب

(مفتی محمد حسین نعیمی، جامعہ نعیمیہ لاہور)

از دار العلوم حزب الاحناف:

''فجر ہونے سے پہلے لاؤڈ سپیکر پر بلند آواز سے درود شریف پڑھنا جائز نہیں، کیونکہ کاروباری آدمی سوئے ہوئے ہوتے ہیں، ان کے آرام میں خلل واقع ہوتا ہے۔ دُرِمختار میں ہے: ''في حاشية الحموي عن الإمام الشعراني'' الخ حموی میں ہے۔ امام شعرانی نے فرمایا: مسجدوں میں یا مسجدوں کے علاوہ جماعت کا ذکر کرنا مستحب ہے، اس میں سلف وخلف کا اجماع ہے اور اگر ان کا ذکرِ جہر سونے والے پر اور نماز پڑھنے والے پر یا قرآن پڑھنے والے پر شورش ہو تو جائز نہیں۔

اعلیٰ حضرت نے فتویٰ رضویہ جلد سوم میں بھی قریب قریب ایسا ہی فرمایا ہے، لیکن انھوں نے مریض کا ذکر بھی فرمایا ہے کہ بلند آواز سے ذکر کرنے میں اگر مریض کے آرام میں خلل آتا ہے تو ذکرِ جہر ممنوع ہے، لہٰذا جب فجر طلوع ہو جائے، تب لاؤڈ سپیکر پر درود شریف

بلند آواز سے پڑھ سکتے ہیں، لیکن فجر سے پہلے نہ پڑھیں۔ (مورخہ ۲۲/اکتوبر ۱۹۷۸ء)

''ہم اہلِ سنت والجماعت کو نئی بات رائج کرنا اس لیے بھی زیب نہیں دیتا کہ ہم امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے مقلد ہیں۔ فقہ حنفی میں اذان سے قبل صلوۃ وغیرہ ثابت نہیں ہے، تو اب یہ غیر مقلدانہ عمل کرنا دراصل ثابت کرتا ہے کہ امامِ اعظم اور صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم عشق کی اس منزل سے آشنا نہ تھے (نعوذ باللہ) جس سے آج کا جاہل عاشق سرشار ہے۔

بر ایں عقل و دانش بباید گریست!

شائع کردہ

مرکز سوادِ اعظم اہل سنت والجماعت آستانہ عالیہ چشتیہ صابریہ

دارالحق ٹاؤن شپ سکیم لاہور

اذان کے بعد مسجد سے بلا عذر نکلنا

اذان ہوجانے کے بعد مسجد سے نکلنے کی ممانعت ہے، البتہ کوئی خاص عذر ہو یا چند لمحات کے لیے نکلنے کے ساتھ جلد واپس لوٹ آنے کا پختہ عزم و ارادہ ہو تو دوسری بات ہے، کیوں کہ مسندِ احمد میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں حکم فرمایا:

«إِذَا كُنْتُمْ فِي الْمَسْجِدِ فَنُودِيَ فَلَا يَخْرُجْ أَحَدُكُمْ حَتّٰى يُصَلِّيَ»

''جب تم مسجد میں ہو اور اذان ہوجائے تو نماز پڑھنے سے پہلے کوئی مسجد سے نہ نکلے۔''

جبکہ صحیح مسلم اور سنن میں ہے کہ اذان ہونے کے بعد ایک شخص مسجد سے نکل گیا تو حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

''أَمَّا هٰذَا فَقَدْ عَصٰى أَبَا الْقَاسِمِ صلی اللہ علیہ وسلم''

''اس شخص نے نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نافرمانی کی ہے۔''

اذان و اقامت کے درمیان وقفہ:

اذان کے مسائل تو اختصار کے ساتھ ذکر کیے جا چکے ہیں اور اب باری ہے مسائلِ اقامت کی، لہٰذا پہلی بات تو یہ ہے کہ اذان اور اقامت کے درمیان کتنا وقفہ ہونا چاہیے۔

اس سلسلے میں بعض احادیث ملتی ہیں، مگر کئی اہلِ علم نے تو انھیں ضعیف قرار دیا ہے، جبکہ ان کے سببِ ضعف کو امام شوکانی رحمہ اللہ نے اپنی تحقیقِ انیق سے رفع کر کے ثابت کیا ہے کہ وہ ضعیف نہیں اور علامہ ابن حزم و ابن دقیق العید رحمہما اللہ کی اپنے حق میں تائید اور ان احادیث کی تصحیح بھی نقل کی ہے۔ چنانچہ صحیح ابن خزیمہ، سنن بیہقی، طحاوی اور مصنف ابن ابی شیبہ میں صراحت کے ساتھ اور سنن ابو داود و دارقطنی میں قدرے ابہام والی سند سے مروی ہے اور اس ابہام کو مذکورہ صراحت والی سند نے دور کر دیا ہے۔

ایک انصاری صحابی رضی اللہ عنہ کسی مؤذن کے اذان و اقامت کہنے کی کیفیت بتاتے ہوئے نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مخاطب ہیں:

«فَأَذَّنَ، ثُمَّ قَعَدَ قَعْدَةً، ثُمَّ قَامَ فَقَالَ مِثْلَهَا إِلَّا أَنْ يَّقُوْلَ: قَدْ قَامَتِ الصَّلَاةُ» [1]

''ایک آدمی نے اذان کہی، پھر بیٹھ گیا پھر اُٹھا اور اذان جیسے کلمات ہی کہے، البتہ اس میں «قَدْ قَامَتِ الصَّلَاةُ» بھی کہا۔ یعنی اقامت کہی۔''

اس حدیث میں بیٹھ گیا اور پھر اقامت کہی کے کلمات سے استدلال کیا جاتا ہے کہ اذان و اقامت میں کچھ وقفہ ہونا چاہیے اور یہ وقفہ مستحب ہے۔ اس وقفے کی مقدار کتنی ہو؟ اس کی کوئی حد مقرر نہیں۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی صحیح میں ایک باب مقرر کیا ہے:

''كَمْ بَيْنَ الْأَذَانِ وَالْإِقَامَةِ''

لیکن وہاں بھی کوئی خاص حد مقرر نہیں کی، بلکہ دو رکعتوں کے برابر وقت والی احادیث ذکر کی ہیں۔ [2]

امام ابن بطال کہتے ہیں کہ اس کی کوئی حد نہیں، سوائے اس کے کہ جب نمازی اکٹھے ہوجائیں تو جماعت کھڑی ہو یا اقامت کہی جائے اور اذان سے لے کر جماعت کے لیے ایک آدمی استنجا اور وضو وغیرہ کر کے تیار ہوسکے۔ [3]

صحیح مسلم، سنن ابو داود، ترمذی اور مسند احمد میں حضرت جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ مؤذنِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم اذان کہتا:

«ثُمَّ يُمْهِلُ فَلَا يُقِيْمُ حَتّٰى إِذَا رَأَى رَسُوْلَ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم قَدْ خَرَجَ، أَقَامَ الصَّلَاةَ حِيْنَ يَرَاهُ» [4]

''پھر وہ انتظار کرتا یا دیر کرتا اور اقامت نہ کہتا، یہاں تک کہ جب وہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو گھر سے نکلتے دیکھ لیتا تو پھر اقامت کہتا۔''

اس سے بھی معلوم ہوا کہ کچھ عرصہ بعد ہی اقامت ہونی چاہیے۔ یہ تو عام نمازوں کی نسبت ہے۔ جبکہ خاص نمازِ مغرب کی اذان اور اس کی اقامت میں بھی کچھ وقفہ ہونا چاہیے، جیسا کہ ان عرب

---

[1] المنتقیٰ مع النیل (۱/ ۲/ ۵۸)

[2] صحیح البخاری مع الفتح (۲/ ۱۰۶)

[3] فقه السنة (۱/ ۱۱۸)

[4] مختصر صحیح مسلم للمنذري، رقم الحدیث (۲۶۵) صحیح سنن أبي داود، رقم الحدیث (۵۰۳) صحیح سنن النسائي، رقم الحدیث (۱۶۶)

ممالک میں معمول ہے، مگر ہمارے یہاں جلدی کی جاتی ہے اور احناف و شافعیہ کے نزدیک صرف تین آیتوں کی تلاوت کے برابر وقفہ ہونا چاہیے۔[1] جب کہ احادیث و آثار اس سے زیادہ وقفے پر دال ہیں۔

مغرب کی اذان و اقامت کے مابین والے وقفے کا ثبوت ان احادیثِ رسول ﷺ اور آثارِ صحابہ رضی اللہ عنہم سے ملتا ہے، جن میں مغرب کی اذان و اقامت کے مابین دو رکعتیں پڑھنے کا ثبوت ہے اور وہ احادیث و آثار صحیح بھی ہیں، جن کی تفصیل اس موضوع کے ضمن میں آگے دی جائے گی۔ ان شاء اللہ

اقامت کون کہے؟

اب رہی یہ بات کہ اقامت کون کہے؟ اس سلسلے میں عرض ہے کہ ہمارے ممالک میں بعض لوگ اذان کہتے ہوئے شرماتے ہیں، مگر اقامت بلا اجازت ہی کہنا شروع کر دیتے ہیں، اگرچہ عرب ممالک میں ایسا نہیں ہوتا۔ جبکہ صحیح تر اور اولیٰ یہ ہے کہ اقامت وہی شخص کہے، جس نے اذان کہی ہو، اس بات کی تائید سنن ابو داود، ترمذی و ابن ماجہ میں مذکور ایک روایت سے بھی ہوتی ہے، لیکن وہ روایت ضعیف ہے، یہی وجہ ہے کہ اس سلسلے میں اہلِ علم کی آرا مختلف ہیں۔

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اکثر اہلِ علم کا اس پر عمل ہے:

''مَنْ أَذَّنَ فَهُوَ يُقِيمُ'' ''جو اذان کہے وہی اقامت بھی کہے۔''

امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''مجھے محبوب یہ ہے کہ جو اذان کہے وہی اقامت کہے۔''

امام سفیان ثوری رحمہ اللہ کی بھی یہی رائے ہے۔ امام مالک و ابو حنیفہ رحمہما اللہ کے نزدیک اس امر میں وسعت ہے کہ جو بھی اقامت کہہ لے، صحیح ہے۔ یہ تو بات ہے اوّلیت و افضلیت کی۔ رہا معاملہ جواز کا تو علامہ مبارکپوری رحمہ اللہ نے کتاب الاعتبار حازمی کے حوالے سے لکھا ہے:

''اذان ایک کہے اور اقامت کوئی دوسرا کہہ لے تو اس کے جائز ہونے پر اہلِ علم کا اتفاق ہے۔''[2]

---

[1] الفقه على المذاهب الأربعة (١/ ٣٢٥)

[2] تفصیل کے لیے دیکھیں: تحفة الأحوذي على سنن الترمذي (١/ ٥٩٧، ٥٩٨)

اقامت کے کلمات:

کتبِ حدیث میں اقامت کے کلمات دو طرح سے وارد ہوئے ہیں، اکہری اقامت اور دوہری اقامت۔ اکہری اقامت اس طرح ہے:

«اَللّٰہُ اَکْبَرُ، اَللّٰہُ اَکْبَرُ، اَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ، اَشْھَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰہِ، حَیَّ عَلَی الصَّلَاۃِ، حَیَّ عَلَی الْفَلَاحِ، قَدْ قَامَتِ الصَّلَاۃُ، قَدْ قَامَتِ الصَّلَاۃُ، اَللّٰہُ اَکْبَرُ، اَللّٰہُ اَکْبَرُ، لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ»

یعنی صرف "اَللّٰہُ اَکْبَرُ" اور "قَدْ قَامَتِ الصَّلَاۃُ" کو دو مرتبہ اور باقی تمام کلمات کو صرف ایک ایک مرتبہ کہا جائے۔

1 صحیح بخاری و مسلم، سنن ابی داود اور مسند احمد میں حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

«أُمِرَ بِلَالٌ أَنْ یَّشْفَعَ الْأَذَانَ وَیُوْتِرَ الْإِقَامَةَ»[1]

"حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو حکم دیا گیا کہ وہ اذان دہری اور اقامت اکہری کہیں۔"

جب کہ سنن ترمذی و نسائی اور ابن ماجہ میں بھی اکہری اقامت کا حکم دیا جانا مذکور ہے اور نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم انھیں حکم دینے والے تھے، کیونکہ انھوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی رحلت کے بعد اذان ہی نہیں کہی، سوائے اس کے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے لیے اور بعض روایات کی رو سے شام میں صرف ایک ہی مرتبہ اذان کہی تھی اور اس کے بعد پھر کبھی نہیں کہی۔ ان کا یہ واقعہ معروف ہے۔[2]

2 اکہری اقامت کی دوسری دلیل سنن ابو داود، ترمذی، ابن ماجہ، دارمی اور مسندِ احمد میں مذکور حضرت عبداللہ بن زید بن عبد ربہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث ہے، جس میں اقامت اکہری ہی ثابت ہے اور صرف اتنے کلمات ہی ہیں، جو ہم نے ذکر کیے ہیں۔[3]

---

[1] صحيح البخاري مع الفتح، رقم الحديث (٦٠٥، ٦٠٦) مختصر صحيح مسلم للمنذري، رقم الحديث (١٩٢) صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٨٠)

[2] نيل الأوطار (١/ ٢/ ٤٠، ٤١)

[3] سنن الترمذي مع التحفة (١/ ٥٨٠، ٥٨٦) مشكاة المصابيح (١/ ٢٠٥، ٢٠٦) الإرواء (٢٦٥، ٢٦٤) صحيح ابن خزيمة، رقم الحديث (٣٧٤) سنن الدارقطني، رقم الحديث (١٤) سنن الدارمي (١/ ٢٧٠) باب الأذان ←

3 اکہری اقامت کی تیسری دلیل سنن ابو داود ونسائی، مسند احمد و شافعی، صحیح ابن حبان و ابن خزیمہ، مستدرک حاکم اور سنن دارقطنی میں مذکور ہے، حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے، جس میں وہ فرماتے ہیں:

«كَانَ الْأَذَانُ عَلٰى عَهْدِ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ مَرَّتَيْنِ مَرَّتَيْنِ وَالْإِقَامَةُ مَرَّةً مَرَّةً غَيْرَ أَنَّهُ يَقُوْلُ: قَدْ قَامَتِ الصَّلَاةُ، قَدْ قَامَتِ الصَّلَاةُ»[1]

''نبیِ اکرم ﷺ کے عہدِ مبارک میں اذان کے کلمات دو دو مرتبہ اور اقامت کے کلمات ایک ایک مرتبہ کہے جاتے تھے، سوائے ''قَدْ قَامَتِ الصَّلَاةُ'' کے (یہ دو مرتبہ ہی کہے جاتے تھے)۔''

صحاح وسنن میں مذکور انھی صحیح احادیث کے پیشِ نظر امام شافعی، امام احمد اور جمہور علما رحمہم اللہ اکہری اقامت کے حق میں تھے اور بقول امام خطابی و بغوی رحمہما اللہ جمہور علماے حرمین شریفین، علماے حجاز وشام ویمن ومصر ومراکش اور تمام بلادِ اسلامیہ کے علما کا یہی مسلک ہے۔ امام ابن سید الناس کے بقول:

''حضرت عمرِ فاروق، ان کے صاحبزادے عبداللہ اور حضرت انس رضی اللہ عنہم، حضرت حسن بصری، زہری، اوزاعی، احمد، اسحاق، ابوثور، یحییٰ بن معین اور ابن المنذر رحمہم اللہ کا بھی یہی موقف ہے۔''

امام بیہقی کہتے ہیں:

''سعید بن مسیّب، عروہ بن زبیر، ابن سیرین اور عمر بن عبدالعزیز رحمہم اللہ کا بھی یہی مسلک تھا۔''

امام بخاری رحمہ اللہ بھی اکہری اقامت کے قائل تھے۔ انھوں نے اس کا باقاعدہ باب باندھا ہے۔[2]

امام بغوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''اکثر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور علماے اُمت کا یہی قول (اکہری اقامت) ہے۔''[3]

امام مالک رحمہ اللہ بھی اکہری اقامت کے قائل تھے۔ مگر وہ (اہلِ مدینہ کے عمل کی وجہ سے) ''قَدْ قَامَتِ الصَّلَاةُ'' کو بھی صرف ایک ہی مرتبہ کہتے تھے۔

← مثنى مثنى والإقامة مرة، صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٦٩)

[1] صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٨٣) صحيح سنن النسائي، رقم الحديث (٦١٠)

[2] صحيح البخاري مع الفتح (٢/ ٨٣)

[3] نيل الأوطار (١/ ٢/ ٤١) شرح السنة للبغوي (٢/ ٢٥٥ طبع المكتب الإسلامي)

دوہری اقامت:

امام ابو حنیفہ، ابن المبارک اور سفیان ثوری رحمہم اللہ دوہری اقامت کے قائل ہیں کہ جیسے اذان ہے، ویسے اقامت ہے اور اس کے کلمات میں ''قَدْ قَامَتِ الصَّلَاۃُ'' کا دو مرتبہ اضافہ ہوگا۔[1]

ان کا استدلال سنن ابو داود، ترمذی، نسائی و صحیح ابن حبان اور ابن خزیمہ میں حضرت ابو محذورہ رضی اللہ عنہ سے مروی ایک حدیث سے ہے، جس میں اذان و اقامت دونوں کے دوہری ہونے کا ذکر ہے۔ سنن بیہقی، مصنف ابن ابی شیبہ اور طحاوی میں حضرت عبداللہ بن زید بن عبد ربہ کی مروی حدیث کے الفاظ میں بھی دوہری اقامت کی دلیل موجود ہے اور اس کی سند کو ابن دقیق العید اور ابن حزم نے صحیح قرار دیا ہے۔[2]

لہٰذا معلوم ہوا کہ دونوں طریقے ہی ثابت ہیں۔ علامہ ابن عبدالبر رحمہ اللہ نے امام اسحاق، احمد، ابو داود اور محمد بن جریر رحمہم اللہ سے نقل کیا ہے کہ وہ دونوں طریقوں میں سے کسی ایک کو اختیار کرنے کی اجازت دیتے تھے۔[3]

لیکن قول اول یعنی اکہری اقامت کی احادیث اَصح اور یہی اکثر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم و تابعین، علمائے اُمت اور ائمۂ دین رحمہم اللہ کا اختیار ہے اور یہی اولیٰ اور عام مروج بھی ہے۔[4]

اقامت کا جواب:

جس طرح اذان کا جواب دیا جاتا ہے، اسی طرح ہی اقامت کے کلمات کا جواب دینا بھی مستحب ہے۔ جس کی تفصیل اذان کے جواب والی ہی ہے کہ ہر کلمے کے جواب میں وہی کلمہ دہرا دے اور حَیعلتَین اور ''قَدْ قَامَتِ الصَّلَاۃُ'' کا جواب ابو داود اور بیہقی کی ایک حدیث میں ''أَقَامَهَا اللّٰهُ وَأَدَامَهَا'' مذکور ہے۔[5]

کبار محدّثین و شارحینِ حدیث مثلاً امام نووی رحمہ اللہ نے ''شرح مسلم'' (٤/ ٨٨) اور

---

[1] الفقه على المذاهب الأربعة (١/ ٣٢٢)

[2] شرح السنة (٢/ ٢٥٦) و نيل الأوطار (١/ ٢/ ٤٢)

[3] دیکھیں: شرح السنة وتحقيقه (٢/ ٢٥٦)

[4] نيل الأوطار (١/ ٢/ ٤٢)

[5] سنن أبي داود مع العون (٢/ ٢٣٠ طبع بيروت) سنن البيهقي بحواله إرواء الغليل (١/ ٢٥٨)

"الأذكار" (ص: ٣٧) میں، علامہ ابن علان نے "شرح الأذكار" (على هامش: الكتاب، ص: ٣٩) میں، ابن قیم نے "الوابل الصيب" (ص: ١١٨، أنصار السنة لاهور) میں، علامہ عجلونی نے "كشف الخفاء" (بتحقيق القلاش: ١/ ١٨١) میں، امیر صنعانی نے "سبل السلام" (١/ ١٢٧) میں، ابن قدامہ نے "المغني" (١/ ٤٢٧) میں امام شوکانی نے "نيل الأوطار" (١/ ٢/ ٥٤) میں علامہ مبارکپوری نے "تحفة الاحوذي" (١/ ٦١٧ مدنی) میں، علامہ عطاء اللہ حنیف بھوجیانی شارح نسائی نے "پیارے رسول کی پیاری دعائیں" مع نمازِ مسنون (ص: ١٩، مکتبہ سلفیہ لاہور) میں، ڈاکٹر وہبہ الزحیلی نے "الفقه الإسلامي و أدلته" (١/ ٥٥٢) میں اور سید سابق نے "فقه السنة" (١/ ١١٦، دارالكتاب العربی) میں، "قَدْ قَامَتِ الصَّلَاةُ" کے جواب میں "أَقَامَهَا اللّٰهُ وَأَدَامَهَا" کہنے کو مستحب لکھا ہے۔ حالانکہ سنن ابو داود و بیہقی والی حدیث کو کثیر محدّثین اور اہلِ علم نے ایک مجہول راوی (رَجُلٌ مِنْ أَهْلِ الشَّامِ) اور ایک مختلف فیہ راوی (شہر بن حَوشب) کی وجہ سے ضعیف قرار دیا ہے اور ضعیف حدیث قابلِ حجت و عمل نہیں ہوتی، تو پھر اس استحباب کا کیا معنیٰ ہوا؟ اس روایت کو خود شارح ابی داود علامہ عظیم آبادی نے "عون المعبود" (٢/ ٢٣١) میں، امام شوکانی نے "نيل الأوطار" (١/ ٢/ ٥٤) میں، علامہ مبارکپوری نے "تحفة الأحوذي" (١/ ٦١٧) میں، علامہ احمد حسن محدّث دہلوی نے "تنقيح الرواة" (١/ ١١٩) میں، علامہ شقیری نے "السنن و المبتدعات" (١/ ٥١) میں اور علامہ خضری نے "كتاب الدعاء" (ص: ٧٨) میں ضعیف کہا ہے۔ دَورِ حاضر کے عظیم علما میں سے محدث عصر علامہ البانی نے بھی "تحقيق المشكاة المصابيح" (١/ ٢١٢) میں اسے ضعیف قرار دیا ہے۔

شہر بن حوشب کی اگرچہ یحییٰ بن معین اور احمد بن حنبل نے توثیق کی ہے، مگر اکثر محدثین اور ماہرینِ جرح و تعدیل کا اس کے ضعیف ہونے پر اتفاق ہے۔[1]

لہٰذا "قَدْ قَامَتِ الصَّلَاةُ" کے جواب میں "قَدْ قَامَتِ الصَّلَاةُ" کہنا ہی اولیٰ ہے اور «فَقُوْلُوْا مِثْلَ مَا يَقُوْلُ الْأَمَامُ» کے عموم کا تقاضا بھی یہی ہے، کیونکہ یہاں حَيْعَلَتَيْن کے جواب میں "حَوْقَلَتَيْنِ" جیسی کوئی صریح و صحیح دلیل موجود نہیں ہے۔

---

[1] السلسلة الصحيحة (١/ ٢٠٠، ٢/ ١٠١) الضعيفة (٢/ ٥٠) الإرواء (١/ ٢٥٨) للألباني

نماز باجماعت کے لیے کھڑے کب ہوں؟

اقامت کے وقت مقتدیوں کے کھڑے ہونے کے بارے میں کوئی وقت مقرر نہیں۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے "قَدْ قَامَتِ الصَّلَاةُ" کے وقت کھڑے ہونے کی روایت ہے، حضرت سعید بن مسیّب رحمہ اللہ مؤذن کے "اَللّٰهُ أَكْبَرُ" کہتے ہی کھڑے ہونے کے قائل تھے، امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ "حَيَّ عَلَى الْفَلَاحِ" کے الفاظ پر اور امام مالک رحمہ اللہ لوگوں کی طاقت پر چھوڑتے ہیں کہ جو جب اُٹھ سکے اُٹھ جائے، کیونکہ ان میں کوئی ضعیف ہوگا اور کوئی ثقیل اور کھڑے ہونے کا وقت بھی مقرر نہیں ہے۔

حنابلہ "قَدْ قَامَتِ الصَّلَاةُ" کے وقت اور شافعیہ اقامت ختم ہونے پر کھڑے ہونے کے قائل ہیں۔[1]

امام مالک رحمہ اللہ کا قول ہی اقرب الی السنہ معلوم ہوتا ہے۔

---

[1] فتح الباري (٢/ ١٢٠) الفقه على المذاهب الأربعة (١/ ٣٢٥)

نماز کے لیے ضروری لباس

پانی، غسل، طہارت و وضو، تیمّم اور اقامتِ نمازِ پنج گانہ کی تفصیلات ذکر کرنے کے بعد مسائلِ نماز کا آغاز، نماز کی اہمیت وفضیلت کے بیان سے کیا گیا تھا، جس کے ضمن ہی میں ترکِ نماز اور عدمِ پابندیِ نماز پر وعید اور پھر تارکِ نماز کا حکم بھی قدرے تفصیل سے آ گیا ہے۔

نماز ادا کرنے کے طریقے اور احکامِ ادا سے پہلے اب آیئے! نماز کے لیے ضروری لباس کے بارے میں اسلامی احکام و مسائل تلاش کریں، کیونکہ جس طرح بدن کی طہارت و پاکیزگی واجب بلکہ بعض کے نزدیک قبولیتِ نماز کی شرط ہے، اسی طرح لباس کا بھی پاک ہونا اگر شرط نہیں تو کم از کم واجب ضرور ہے۔[1]

نماز کے لیے طہارتِ لباس:

لباس کی طہارت و نظافت کی طرف تو خود اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب کریم قرآنِ مجید میں بطورِ خاص توجہ دلائی ہے، چنانچہ سورۃ المدثر کے آغاز میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ يَاَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ ۝ قُمْ فَاَنْذِرْ ۝ وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ ۝ وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ ﴾

[المدثر: ۱ تا ٤]

’’اے کپڑا اوڑھنے والے! اٹھیے اور (لوگوں کو عذابِ الٰہی سے) ڈرایئے اور اپنے رب کی بڑائی بیان کیجیے اور اپنے کپڑوں کو پاک صاف رکھیے۔‘‘

مفسّرین لکھتے ہیں کہ یہاں کپڑوں کی طہارت سے مراد حسی و اخلاقی یا ظاہری و باطنی ہر طرح کی طہارت ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ (اللہ کی بڑائی بیان کرنے اور) نماز پڑھنے کے لیے کپڑوں کا پاک صاف ہونا بھی ضروری ہے۔[2]

---

[1] نيل الأوطار (١/ ٢/ ١٢١) الروضة الندية (١/ ٨٠)

[2] أشرف الحواشي مولانا محمد عبده (ص: ٦٨٧) **نیز دیکھیں:** تفسير ابن كثير (٤/ ٤٤٠، ٤٤١، دار المعرفة بيروت)

نماز کے لیے کپڑوں کی طہارت و نظافت کے التزام کا پتا درج ذیل احادیث سے بھی لگتا ہے۔

1 سنن ابن ماجہ اور مسند احمد میں حضرت جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے ایک آدمی کو سنا کہ وہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھ رہا تھا:

«أُصَلِّيْ فِي الثَّوْبِ الَّذِيْ آتِيْ فِيْهِ أَهْلِيْ؟»

''کیا میں اس کپڑے میں نماز پڑھ سکتا ہوں، جسے پہن کر میں اپنی اہلیہ سے جماع کرتا ہوں؟''

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«نَعَمْ، إِلَّا أَنْ تَرٰى فِيْهِ شَيْئاً فَتَغْسِلُهٗ»[1]

''ہاں (پڑھ سکتے ہو) سوائے اس کے کہ اگر تم اس میں کچھ لگا دیکھو تو اسے دھو لو۔''

2 دوسری حدیث تبویبِ بخاری میں اشارتاً اور سنن ابی داود، نسائی، ابن ماجہ، صحیح ابن حبان و ابن خزیمہ اور مسندِ احمد میں حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، جس میں وہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے ام المومنین حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا:

«هَلْ كَانَ النَّبِيُّ ﷺ يُصَلِّيْ فِي الثَّوْبِ الَّذِيْ يُجَامِعُ فِيْهِ؟»

''کیا نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اس کپڑے میں نماز پڑھ لیا کرتے تھے، جس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم جماع کرتے تھے؟''

تو انھوں نے جواباً فرمایا:

«نَعَمْ، إِذَا لَمْ يَكُنْ فِيْهِ أَذًى»[2]

''ہاں (پڑھ لیتے تھے) بشرطیکہ اس میں کوئی ایسی چیز نہ لگی ہو (جسے دھونا یا کھرچنا ضروری ہوتا ہے)۔''

ان دونوں احادیث سے معلوم ہوا کہ وہ لباس جس کی موجودگی میں جماع کیا گیا ہو، وہ ناپاک نہیں ہوتا، بلکہ پاک ہی رہتا ہے، ہاں اگر اسے کچھ لگ جائے تو اسے اس جگہ سے دھو لیا جائے۔

---

[1] فقه السنة (١/ ١٢٤) المنتقىٰ مع النيل (١/ ٢/ ١١٩) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٥٤٢)

[2] بحواله جات بالا، صحيح البخاري مع الفتح (١/ ٤٦٥) صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٥٢) صحيح سنن النسائي، رقم الحديث (٢٨٣) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٥٤٠) صحيح ابن حبان، رقم الحديث (٢٣٧)

اسی سے یہ پتا چل جاتا ہے کہ جس بچھونے پر ایسا کیا جائے، وہ بچھونا بھی ناپاک نہیں ہوتا، بلکہ لباس کی طرح وہ بھی پاک ہی رہتا ہے، ہاں اگر کچھ نظر آئے تو اس جگہ کو دھو دینا کافی ہے۔

امام شوکانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ان احادیث سے اور دو باتیں معلوم ہوئیں، پہلی یہ کہ محض وہم وگمان پر نہیں بلکہ یقین پر عمل کرنا چاہیے، کیونکہ جس کپڑے میں جماع کیا جائے، اسے کچھ لگ جانے کا خدشہ ہوتا ہی ہے، لیکن نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے محض خدشے سے نہیں بلکہ یقین ہوجانے اور کچھ نظر آ جانے پر اسے دھونے کا حکم فرمایا ہے اور دوسری بات جیسا کہ امام ابن رسلان فرماتے ہیں:

''عورت کی شرم گاہ سے نکلنے والی رطوبت کے ناپاک نہ ہونے کا بھی پتا چلتا ہے، کیوں کہ ان احادیث میں سے دوسری حدیث میں یہ مذکور نہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم جماع کرنے کے بعد نماز پڑھنے سے پہلے اس کپڑے کو دھوتے تھے اور اگر دھوتے ہوتے تو منقول ہوتا، جبکہ یہ بات معلوم ہے کہ جماع کے بعد جب ذکر شرم گاہ سے نکلتا ہے تو اس پر اس کی رطوبت لگی ہوتی ہے۔''[1]

3 تیسری حدیث سنن ابو داود، صحیح ابن حبان و ابن خزیمہ، مسندِ احمد اور مستدرکِ حاکم میں حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، جس میں وہ بیان کرتے ہیں:

((إِنَّهُ صلی اللہ علیہ وسلم صَلَّى فَخَلَعَ نَعْلَيْهِ، فَخَلَعَ النَّاسُ نِعَالَهُمْ))

''نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز پڑھی اور (دورانِ نماز ہی) اپنے جوتے اتار دیے (آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی دیکھا دیکھی) لوگوں نے بھی جوتے اتار دیے۔''

جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نماز پڑھ کر پھرے تو پوچھا:

((لِمَ خَلَعْتُمْ؟)) ''تم نے جوتے کیوں اتارے تھے؟''

تو لوگوں نے کہا:

((رَأَيْنَاكَ خَلَعْتَ فَخَلَعْنَا))

''ہم نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جوتے اتار دیے ہیں، لہٰذا ہم نے بھی اتار دیے۔''

---

[1] نیل الأوطار (١/ ٢/ ١٢١)

تو آپ ﷺ نے فرمایا:

«إِنَّ جِبْرِيْلَ أَتَانِيْ فَأَخْبَرَنِيْ إِنَّ بِهِمَا خَبَثًا»

''مجھے تو جبرائیل علیہ السلام نے آ کر بتایا تھا کہ جوتوں کو کوئی نجاست لگی ہوئی ہے (لہٰذا میں نے اتار دیے تھے)۔''

آیندہ کے لیے آپ ﷺ نے مستقل ایک اصول وضع فرما دیا اور فرمایا:

«فَإِذَا جَاءَ أَحَدُكُمُ الْمَسْجِدَ فَلْيُقَلِّبْ نَعْلَيْهِ، وَلْيَنْظُرْ فِيْهِمَا، فَإِنْ رَأَى خَبَثًا فَلْيَمْسَحْهُ بِالْأَرْضِ، ثُمَّ لْيُصَلِّ فِيْهِمَا»[1]

''جب تم میں سے کوئی شخص مسجد میں آئے تو اسے چاہیے کہ اچھی طرح الٹ پلٹ کر کے اپنے جوتوں کی پڑتال کرے اور انھیں اچھی طرح دیکھ لے، اگر وہ ان میں کوئی نجاست لگی دیکھے تو اسے اچھی طرح زمین پر رگڑ لے اور پھر ان میں نماز پڑھ لے۔''

اس حدیث سے پتا چلا کہ جوتوں سمیت بھی نماز ہوجاتی ہے، بشرطیکہ انھیں کوئی نجاست وغیرہ نہ لگی ہو اور اگر کچھ لگا ہو تو اسے زمین پر رگڑنے ہی سے نجاست زائل ہوجائے گی اور نماز کے لائق ہوجائیں گے۔ البتہ اس معاملے میں ممکنہ حد تک احتیاط کی ضرورت ہے اور اگر کوئی مکمل احتیاط کو اختیار کر کے جوتوں میں نماز پڑھتا ہے تو دیکھنے والوں کو بلاوجہ شور نہیں برپا کر دینا چاہیے، کیونکہ یہ عمل خود نبیِ اکرم ﷺ اور صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم سے ثابت اور جائز ہے۔[2]

بہر حال یہ تمام احادیث نماز کے لیے لباس (اور جوتوں) کی طہارت و نظافت کے التزام کی دلیل ہیں۔

مَردوں کے لیے ریشم کا لباس:

لباس کی طہارت و پاکیزگی کے لیے ایک بنیادی بات تو یہ بھی ہے کہ اس لباس کا مواد کسی ایسی چیز پر مبنی نہ ہو، جس کا پہننا شریعتِ اسلامیہ میں حرام قرار دیا گیا ہو، مثلاً مَردوں کے لیے ریشم

[1] صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (٦٠٥) موارد الظمآن للهيثمي، رقم الحديث (٣٦٠)

[2] اس سلسلے میں سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے مروی ایک حدیث دیکھنے کے لیے ملاحظہ کریں: صحيح البخاري (١/ ٤٩٤) باب الصلاة في النعال.

کے لباس کا استعمال حرام کیا گیا ہے تو اگر کسی نے ریشم کا لباس پہن رکھا ہو تو اس میں اس کی نماز نہیں ہوگی، جبکہ نماز کے علاوہ دوسرے اوقات بھی مردوں کے لیے اس کا پہننا ناجائز اور گناہ ہے۔ لیکن عورتوں کے لیے نماز اور غیر نماز ہر موقع کے لیے یہ جائز ہے۔ جیسا کہ صحیح بخاری و مسلم، سنن ترمذی و نسائی اور مسند احمد میں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ میں نے نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا:

«لَا تَلْبَسُوا الْحَرِيْرَ، فَإِنَّهٗ مَنْ لَبِسَهٗ فِي الدُّنْيَا، لَمْ يَلْبَسْهُ فِي الْآخِرَةِ»[1]

''ریشم کا کپڑا مت پہنو! بے شک جس نے دنیا میں ریشم پہنا، وہ آخرت میں نہیں پہن سکے گا۔''

صحیحین ہی کی ایک دوسری حدیث میں جو سنن نسائی، ابن ماجہ اور مسند احمد میں بھی ہے، جس میں حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«مَنْ لَبِسَ الْحَرِيْرَ فِي الدُّنْيَا فَلَنْ يَّلْبَسَهُ فِي الآخِرَةِ»[2]

''جس نے دنیا میں ریشم کا لباس پہنا، وہ آخرت میں اسے نصیب نہیں ہوگا۔''

ان احادیث میں جو مذکور ہے کہ اسے آخرت میں ریشم نصیب نہیں ہوگا، اس کا معنیٰ صرف یہ نہیں کہ چلیے جی آخرت میں یہ نصیب نہ ہوگا تو نہ سہی، کوئی دوسرا کپڑا ہی سہی۔ بلکہ آخرت میں اس کے نصیب نہ ہونے کی شرح میں اس کے کئی مفہوم بیان کیے گئے ہیں، چنانچہ ان احادیث کی شرح کرتے ہوئے امام شوکانی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

''یہ دونوں حدیثیں ریشم کا لباس پہننے کے حرام ہونے پر دلالت کرتی ہیں، کیونکہ حدیث کے شروع میں ممانعت کے الفاظ کا وارد ہونا حقیقتاً اس کے حرام ہونے کا تقاضا کرتے، اس کی وجہ یہ ہے کہ جس نے اسے دنیا میں پہن لیا تو وہ آخرت میں اسے نہیں پہنے گا۔''

بظاہر یہ اس کے جنت میں داخل ہی نہ ہو سکنے کا کنایہ ہے، کیوں کہ (سورۃ الحج، آیت: ۲۳

---

[1] صحيح البخاري مع الفتح، رقم الحديث (٥٨٣٠) مختصر صحيح مسلم للمنذري، رقم الحديث (١٣٣٦) صحيح سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٢٥٨) صحيح سنن النسائي، رقم الحديث (٤٨٩٨)

[2] صحيح البخاري مع الفتح، رقم الحديث (٥٨٣٢) صحيح مسلم مع شرح النووي (٧/ ٤/ ٥١) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٣٥٨٨)

میں اور سورۃ الفاطر، آیت: ۳۳ میں) اللہ تعالیٰ کا اہلِ جنت کے بارے میں ارشاد ہے:

﴿وَلِبَاسُهُمْ فِيهَا حَرِيرٌ﴾ ''اور جنت میں ان کا لباس ریشم ہوگا۔''

پس جس نے دنیا میں ریشم پہنی وہ جنت میں داخل نہ ہوگا۔ امام نسائی و احمد رحمہ اللہ نے یہ معنیٰ حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے:

«وَمَنْ لَّمْ يَلْبَسْهُ فِي الْآخِرَةِ لَمْ يَدْخُلِ الْجَنَّةَ»[1]

''جسے آخرت میں یہ نصیب نہ ہوئی، وہ جنت میں داخل نہ ہوگا۔''

امام نسائی رحمہ اللہ نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے بھی یہی قول نقل کیا ہے کہ اللہ کی قسم وہ جنت میں داخل نہیں ہوگا اور پھر اسی آیت کو ذکر کیا۔ البتہ سنن نسائی اور مستدرکِ حاکم میں حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے موقوفاً اور مسند طیالسی میں مرفوعاً مروی ہے کہ اگر وہ جنت میں داخل ہوگیا تو لوگ وہاں ریشم پہنیں گے، مگر یہ نہیں پہن پائے گا۔''[2]

لیکن یہ مرفوعاً ضعیف ہے۔[3] اسی بات پر حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی صحیح بخاری و مسلم، سنن ابو داود، نسائی، ابن ماجہ اور مسندِ احمد کی وہ حدیث بھی دلالت کرتی ہے، جس میں ارشادِ نبوی ﷺ ہے:

«إِنَّمَا يَلْبَسُ الْحَرِيرَ فِي الدُّنْيَا مَنْ لَّا خَلَاقَ لَهُ فِي الْآخِرَةِ»[4]

''دنیا میں وہی ریشم پہنتا ہے، جسے آخرت میں یہ نصیب نہ ہونے والی ہو۔''

صحیح مسلم میں حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ سے مروی ارشادِ نبوی ﷺ ہے:

«لَا تَلْبَسُوا الْحَرِيرَ فَإِنَّهُ مَنْ لَّبِسَهُ فِي الدُّنْيَا لَمْ يَلْبَسْهُ فِي الْآخِرَةِ»[5]

ریشم مت پہنو! جس نے دنیا میں ریشم پہنی تو آخرت میں اسے نصیب نہ ہوگی۔''

انہی الفاظ پر مبنی ایک حدیث حضرت عمرِ فاروق رضی اللہ عنہ سے بھی گزری ہے، جو اس موضوع کی

---

[1] إرواء الغليل (١/ ٣٠٩) وصححه

[2] نيل الأوطار (١/ ٢/ ٨٢) فتح الباري (١٠/ ٢٨٨)

[3] كما في غاية المرام (ص: ٦٦)

[4] صحيح البخاري مع الفتح، رقم الحديث (٥٨٣٥) مختصر صحيح مسلم للمنذري، رقم الحديث (١٣٣٥) صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٤٠٨) صحيح سنن النسائي، رقم الحديث (٤٨٩٩) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٣٥٩١)

[5] صحيح الجامع (٣/ ٦/ ١٨٠) صحيح مسلم مع شرح النووي (٧/ ١٤/ ٤٤)

پہلی حدیث ہے، امام شوکانی رحمہ اللہ اس موضوع کی بعض احادیث نقل کرنے اور بعض کی طرف اشارہ کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

"وَإِذَا لَمْ تُفِدْ هٰذِهِ الْأَدِلَّةُ التَّحْرِيمَ، فَمَا فِي الدُّنْيَا مُحَرَّمٌ"

"جب یہ دلائل بھی ریشم کی حرمت کا فائدہ نہیں دیتے تو پھر دنیا میں کوئی چیز حرام ہے ہی نہیں۔"

پھر آگے اعتراضات کے جواب دیے ہیں۔[1]

عورتوں کے لیے ریشم اور سونے کی اجازت:

ان احادیث سے بظاہر تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ ریشم مرد و زن سب کے لیے ہی ممنوع ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ بعض دیگر احادیث میں اس کی وضاحت موجود ہے کہ عورتوں کے لیے ان کا استعمال جائز ہے، چنانچہ سنن ابو داود، ترمذی، نسائی، بیہقی، مسند احمد، مسند طیالسی، معجم طبرانی، مستدرکِ حاکم اور معانی الآثار طحاوی میں حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، جس میں ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے:

«أُحِلَّ الذَّهَبَ وَالْحَرِيرَ لِلْأُنَاثِ مِنْ أُمَّتِي وَحُرِّمَ عَلٰى ذُكُورِهَا»[2]

"سونا اور ریشم میری امت کی عورتوں کے لیے حلال کیے گئے ہیں اور یہ مردوں پر حرام کیے گئے ہیں۔"

ایسی ہی دیگر احادیث کی بنا پر اس بات پر اجماعِ امت نقل کیا گیا ہے کہ ریشم مَردوں کے لیے حرام اور عورتوں کے لیے حلال ہے۔[3]

سونے اور ریشم کو مردوں کے لیے حرام اور عورتوں کے لیے حلال قرار دینے والی ایک حدیث سنن ابو داود، نسائی، ابن ماجہ، صحیح ابن حبان، معانی الآثار طحاوی اور مستدرکِ حاکم میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، جس میں وہ بیان کرتے ہیں:

«أَخَذَ النَّبِيُّ صلی اللہ علیہ وسلم حَرِيرًا فِي يَمِينِهِ، وَأَخَذَ ذَهَبًا فَجَعَلَهٗ فِي شِمَالِهِ»

---

[1] نیل الأوطار (۱/ ۲/ ۸۲، ۸۳)

[2] المنتقیٰ (۱/ ۲/ ۸۳) صحیح الجامع (۱/ ۱۱۹) والإرواء (۱/ ۳۰۵) مصنف عبدالرزاق (۱۱/ ٦٨ و مسند أحمد (٤/ ۳۹۲) بحوالہ تحقیق المصابیح (۳/ ۱۹٦) صحیح سنن الترمذي، رقم الحدیث (۱٤۰٤) صحیح سنن النسائي، رقم الحدیث (٤۷٥٤) و صحیح الجامع، رقم الحدیث (۲۰۹)

[3] نیل الأوطار (۱/ ۲/ ۸۲)

''نبیِ اکرم ﷺ نے ریشم پکڑی اور دائیں ہاتھ میں رکھ لی اور سونا پکڑا اپنے بائیں دستِ مبارک میں رکھ لیا۔'' پھر آپ ﷺ نے فرمایا:

((إِنَّ هٰذَيْنِ حَرَامٌ عَلٰى ذُكُورِ أُمَّتِي))[1]

''یہ دونوں چیزیں میری امت کے مَردوں پر حرام ہیں۔''

سنن ابن ماجہ میں ساتھ ہی یہ الفاظ بھی مروی ہیں:

((حِلٌّ لِّأُنَاثِهِمْ))[2] ''یہ ان کی عورتوں کے لیے حلال ہے۔''

سنن کبریٰ بیہقی اور معانی الآثار طحاوی میں حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ سے ایک تیسری حدیث مروی ہے، جس میں نبیِ اکرم ﷺ نے سونے اور ریشم کو مَردوں کے لیے حرام اور عورتوں کے لیے حلال قرار دیا ہے۔[3]

اِن احادیث کے پیشِ نظر صرف اس بات کی طرف اشارہ ہی کرنا کافی لگتا ہے کہ ہمارے وہ دوست، بھائی اور بزرگ جو مرد ہو کر بھی سونے کی انگوٹھیاں، چین، ٹاپس اور لاکٹ وغیرہ پہنے پھرتے ہیں اور شادی کی انگوٹھی سمجھ کر سجائے پھرتے ہیں، انھیں معلوم ہونا چاہیے کہ یہ مردوں کے لیے حرام ہے، شادی کی نشانی ہو یا کسی دوسری تقریب کی۔

ریشم ملا کپڑا:

البتہ یہ تو معاملہ ہے، مطلق ریشم یا خالص ریشم کے کپڑے کا جبکہ اگر کوئی کپڑا ایسا ہو، جس میں تانا یا بانا دونوں میں سے کوئی ایک چیز ریشم کی ہو، یعنی کسی کپڑے کا نصف مواد ریشم کا اور نصفِ ثانی کسی دوسری چیز کاٹن وغیرہ کا ہو تو اس کا حکم مَردوں کے لیے خالص ریشم کے کپڑے والا ہی ہے، حتیٰ کہ اگر کسی کپڑے میں بنائی کے وقت ریشم کے تاروں کی پٹیاں بنائی گئی ہوں جو نصف سے اگرچہ کم ہوں، مگر وہ ریشم مجموعی طور پر کپڑے میں کافی مقدار میں ہو جائے تو وہ بھی ممنوع ہے، چنانچہ صحیح بخاری و مسلم

---

[1] صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٤٢٢) صحيح سنن النسائي، رقم الحديث (٤٧٥٠) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٣٥٩٥) صحيح ابن حبان، رقم الحديث (١٤٦٥)

[2] غاية المرام وصححه بمجموع طرقه (ص: ٦٤ـ ٦٦) نيل الأوطار (١/ ٢/ ٨٤) الإرواء (١/ ٣٠٧، ٣٠٨) سنن ابن ماجه، رقم الحديث ٣٥٩٥)

[3] إرواء الغليل (١/ ٣٠٨)

میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

«أُهْدِيَتْ إِلَى النَّبِيِّ ﷺ حُلَّةٌ سِيَرَاءُ فَبَعَثَ بِهَا إِلَيَّ فَلَبِسْتُهَا فَعَرَفْتُ الْغَضَبَ فِي وَجْهِهِ»

''نبی اکرم ﷺ کو ایک ریشم کی آمیزش و ملاوٹ کا حلّہ تحفہ دیا گیا، وہ حلّہ آپ ﷺ نے مجھے بھیج دیا تو میں نے وہ پہن لیا، میں نے آپ ﷺ کے چہرۂ اقدس سے غصے کے آثار محسوس کر لیے۔'' (پوچھنے پر) آپ ﷺ نے فرمایا:

«إِنِّي لَمْ أَبْعَثْ بِهَا إِلَيْكَ لِتَلْبَسَهَا، إِنَّمَا بَعَثْتُ بِهَا إِلَيْكَ لِتُشَقِّقَهَا خُمُراً بَيْنَ النِّسَاءِ»[1]

''میں نے یہ حلّہ اس لیے تو نہیں بھیجا تھا کہ اسے تم پہن لو، بلکہ میں نے تو یہ اس لیے بھیجا تھا کہ تم اسے پھاڑ کر گھر کی عورتوں کے دوپٹے بنا لو۔''

ایک اور روایت میں ہے:

''فَشَقَقْتُهُ بَيْنَ نِسَائِيْ'' ''تو میں نے اسے پھاڑ کر گھر کی خواتین میں تقسیم کر دیا۔''

ایک روایت میں ہے:

«بَيْنَ الْفَوَاطِمِ»[2] ''میں نے وہ حلّہ پھاڑ کر فاطماؤں میں تقسیم کر دیا۔''

وہ فاطمائیں کون تھیں؟

1. ان میں سے ایک تو خود نبیِ اکرم ﷺ کی لختِ جگر حضرت فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا تھیں، جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کی زوجۂ محترمہ تھیں۔
2. دوسری فاطمہ بنت اسد تھیں، جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کی والدہ تھیں۔
3. تیسری فاطمہ بنت حمزہ رضی اللہ عنہما تھیں۔
4. علامہ ابن عبدالبر اور عبدالغنی نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے گھر کی خواتین میں سے ایک چوتھی فاطمہ بھی

---

[1] المنتقیٰ (۱/ ۲/ ۸۴) مشكاة المصابيح (۲/ ۱۲۴۲) صحيح مسلم مع شرح النووي (۷/ ۱۴/ ۴۹، ۵۰) صحيح البخاري، رقم الحديث (۲۶۱۴)

[2] صحيح مسلم مع شرح النووي (۷/ ۱۴/ ۵۰)

ذکر کی ہیں، جو فاطمہ بن شیبہ بن ربیعہ تھیں۔ یہ قاضی عیاض اور علامہ رسلان کے افادات ہیں۔[1]

اس حدیث میں ریشم کے حلے کے لیے جو لفظ ''سیراء'' آیا ہے، اس کی تشریح و تفہیم میں اہلِ علم و لغت کے مختلف اقوال ہیں۔ مثلاً قاموس میں ہے:

1 یہ ایسی چادریں ہیں، جس میں ریشم، پیتل اور خالص سونے کے ریشے استعمال کیے گئے ہوں۔

2 امام خطابی، خلیل اصمعی اور ابو داود نے کہا ہے کہ یہ ایسی چادریں ہیں، جن میں ریشمی تانا ہو۔

3 ازہری نے کہا ہے کہ مختلف رنگوں والی چادر کو ''سیراء'' کہتے ہیں۔

4 مالک نے کہا ہے کہ ریشم ملا کپڑا ہے۔

5 جوہری کا کہنا ہے کہ وہ کپڑا جس میں پیتل کی تاریں یعنی ریشے استعمال ہوں۔

6 کسی نے خالص ریشم کو ''سیراء'' کہا ہے۔[2]

اس حدیث سے ریشم ملے کپڑے کو مَردوں کے لیے استعمال کی حرمت اور عورتوں کے لیے حلّت معلوم ہوگئی۔ ماہرینِ لغتِ عرب کی ان تصریحات کی رُو سے تو ''سیراء'' اس کپڑے ہی کو کہا جاتا ہے، جو خالص ریشم کا نہیں بلکہ ریشم کے امتزاج سے بنا ہو اور اگر اسے خالص ریشم کا مان لیا جائے تو پھر اس کی حرمت میں کوئی کلام ہی نہیں رہ جاتا۔

ریشم کی جائز مقدار:

ریشم کا کسی کپڑے میں کتنا استعمال جائز ہے؟ اس سلسلے میں بعض احادیث سے پتا چلتا ہے کہ اگر کسی کپڑے میں دو انگلیوں یا تین انگلیوں، حد چار انگلیوں کے برابر ریشم استعمال کیا گیا ہو تو وہ جائز ہے۔ چنانچہ صحیح بخاری و مسلم میں حضرت عمرِ فاروق رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

﴿ إِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ نَهىٰ عَنْ لُبُوْسِ الْحَرِيْرِ إِلَّا هٰكَذَا، وَرَفَعَ لَنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ إِصْبَعَيْهِ الْوُسْطىٰ وَالسَّبَابَةَ وَضَمَّهُمَا ﴾[3]

''نبی اکرم ﷺ نے ریشم کے لباس سے منع فرمایا، سوائے اتنے کے اور (مقدار کی

---

[1] نیل الأوطار (۱/ ۲/ ۸۵)

[2] نیل الأوطار (۱/ ۲/ ۸۵) و فتح الباري (۱۹/ ۲۹۷)

[3] صحیح البخاري مع الفتح (۱۰/ ۱۲۸٤) رقم الحدیث (۵۸۲۹) المنتقیٰ (۱/ ۲/ ۸۷) مشکاۃ المصابیح (۲/ ۱۲٤۲) صحیح مسلم مع شرح النووي (۷/ ۱٤/ ٤٦)

وضاحت کے لیے) نبیِ اکرم ﷺ نے اپنی درمیانی اور شہادت والی انگلیوں کو اُٹھایا اور ان دونوں کو باہم ملایا۔''

جبکہ صحیح مسلم، سنن اربعہ، مسندِ احمد اور مصنف ابن ابی شیبہ کی ایک روایت میں ہے:

((نَهٰى عَنْ لُبْسِ الْحَرِيْرِ إِلَّا مَوْضِعَ إِصْبَعَيْنِ أَوْ ثَلَاثَةً أَوْ أَرْبَعَةً))[1]

''نبیِ اکرم ﷺ نے ریشم پہننے سے منع فرمایا، سوائے دو انگلیوں یا تین انگلیوں یا چار انگلیوں کے مساوی مقدار کے۔''

سنن ابو داود اور مسند احمد میں یہ الفاظ بھی ہیں:

((وَأَشَارَ بِكَفِّهٖ))[2] ''اور آپ ﷺ نے اپنے دست مبارک کی ہتھیلی سے اشارہ فرمایا۔''

اس حدیث کی ان مختلف روایات کے مجموعی مفہوم نے جواز کی مقدار واضح کر دی کہ اگر کسی کپڑے پر ریشم کی کڑھائی وغیرہ اتنی ہو، جس کی مقدار چار انگلیوں کے برابر ہو جائے تو ایسے کپڑے کے استعمال میں مَردوں کے لیے بھی کوئی مضایقہ نہیں۔ البتہ اس سے زیادہ کی اجازت نہیں ہے۔[3]

بیمار اور خارش زدہ کے لیے جواز:

یہاں ایک اور بات بھی ذکر کر دیں کہ بعض اوقات مجبوری کی شکل میں ریشم کا کپڑا پہننے کی اجازت دی گئی ہے۔ مثلاً کوئی بیمار ہو خصوصاً خارش زدہ ہو تو اسے ریشم کا لباس پہننے کی اجازت ثابت ہے، جیسا کہ صحیح بخاری و مسلم، سنن اربعہ اور مسند احمد میں حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں:

((إِنَّ النَّبِيَّ ﷺ رَخَّصَ لِعَبْدِ الرَّحْمٰنِ بْنِ عَوْفٍ وَالزُّبَيْرِ فِيْ لُبْسِ الْحَرِيْرِ لِحَكَّةٍ كَانَتْ بِهِمَا))[4]

---

[1] صحيح مسلم مع شرح النووي (٧/ ١٤/ ٤٨) صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٤١) صحيح سنن الترمذي، رقم الحديث (١٤٠٥) صحيح سنن النسائي، رقم الحديث (٤٩٠٥۔ ٤٩٠٦) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٣٥٩٣)

[2] فتح الباري (١٠/ ٢٨٨)

[3] جائز مقدار کی تفصیل مطلوب ہو تو نيل الأوطار (١/ ٢/ ٨٩ تا ٩٢) اور فتح الباري شرح صحيح البخاري (١٠/ ٢٨٥ تا ٢٩١) اور دیگر شروحِ احادیث اور کتبِ فقہ کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔

[4] صحيح البخاري مع الفتح (١٠/ ٢٩٥) المنتقىٰ (١/ ٢/ ٨٨) مشكاة المصابيح (٢/ ١٢٤٢) غاية المرام (ص: ٦٩) ولم يذكر سنن ابن ماجه، صحيح البخاري مع الفتح، رقم الحديث (٥٨٣٩) صحيح مسلم مع ←

''نبیِ اکرم ﷺ نے حضرت عبدالرحمٰن بن عوف اور زبیر رضی اللہ عنہما کو خارش کا مرض ہونے کی وجہ سے ریشمی لباس پہننے کی اجازت مرحمت فرمائی۔''

جبکہ ترمذی شریف کے الفاظ اور بخاری شریف کی ایک روایت میں ہے کہ ایک غزوے کے موقع پر حضرت عبدالرحمٰن بن عوف اور زبیر رضی اللہ عنہما نے نبیِ اکرم ﷺ کے سامنے جوئیں پڑ جانے کی شکایت کی تو نبیِ اکرم ﷺ نے انھیں ریشم کی قمیص پہننے کی رخصت عطا فرمائی۔

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فتح الباری میں لکھتے ہیں:

''انھیں خارش کی تکلیف جوؤں کے اثر سے ہوگئی تھی اور امام طبری سے نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اس حدیث میں اس بات کی دلیل ہے کہ اگر کسی کو کوئی تکلیف ہو جو ریشم کا لباس پہننے سے کم ہو جائے تو وہ شخص ریشم کے استعمال کی ممانعت میں داخل نہیں ہوگا۔''[1]

امام شوکانی رحمہ اللہ ''نیل الأوطار'' میں لکھتے ہیں کہ جمہور اہلِ علم کے نزدیک خارش اور جوؤں کے لیے ریشم پہنی جا سکتی ہے اور امام مالک رحمہ اللہ نے اختلاف کیا ہے، جبکہ یہ صحیح حدیث ان کے خلاف حجت ہے۔ دوسری بیماریاں (جن میں ریشم مفید ہوسکتی ہو) وہ بھی انھی پر قیاس کی جا سکتی ہیں اور ان کے لیے بھی یہ جائز ہے۔[2]

ریشم کے بچھونے:

یہاں یہ بات بھی ذہن نشین رہے کہ جس طرح ریشم کا لباس منع ہے، اس کے بچھونے بنانا اور ان پر بیٹھنا بھی اسی طرح ممنوع و حرام ہے، جس طرح اس کا پہننا ہے، چنانچہ صحیح بخاری شریف میں حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

«نَهَانَا النَّبِيُّ ﷺ أَنْ نَّشْرَبَ فِيْ آنِيَةِ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ، وَأَنْ نَّأْكُلَ فِيْهَا، وَأَنْ

← شرح النووي (٧/ ١٤/ ٥٢، ٥٣) صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٤٢١) صحيح سنن الترمذي، رقم الحديث (١٤٠٦) صحيح سنن النسائي، رقم الحديث (٤٩٠٣، ٤٩٠٤) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٣٥٩٢)

[1] فتح الباري (١٠/ ٢٩٥)

[2] نيل الأوطار (١/ ٢/ ٨٩)

نَّجۡلِسَ عَلَیۡهِ ﴾[1]

’’نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں اس بات سے منع کیا کہ ہم سونے اور چاندی کے برتنوں میں کھائیں اور پئیں اور اس سے بھی کہ ہم اس پر بیٹھیں۔‘‘

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے بخاری کی اس حدیث کی شرح کرتے ہوئے فتح الباری میں لکھا ہے کہ اس حدیث کی رو سے جمہور اہلِ علم کے نزدیک ریشم کے بچھونے پر بیٹھنا بھی حرام ہے اور بعض فقہا نے کچھ قیاسی قسم کے دلائل سے ریشم کے بچھونے پر بیٹھنے کا جواز کشید کرنے کی کوشش کی ہے، لیکن صاحبِ نیل الاوطار نے ان کی اس دلیل کو نص کے مقابلے میں ہونے کی وجہ سے باطل قرار دیا ہے۔

ایسے ہی صحیح مسلم اور سنن نسائی میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

﴿نَهَانِيۡ رَسُوۡلُ اللّٰهِ ﷺ عَنِ الۡجُلُوۡسِ عَلَی الۡمَیَاثِرِ ﴾

’’مجھے نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ریشم و دیباج کے بچھونوں پر بیٹھنے سے منع فرمایا۔‘‘

آگے حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ’’المیاثر‘‘ کی تشریح بھی خود ان الفاظ سے کی ہے کہ ’’میاثر‘‘ ریشم ملے وہ بچھونے ہیں جو عورتیں اپنے شوہروں کے لیے سواری پر ڈالنے کے لیے بناتی تھیں، جو سرخ ارجوانی (سرخ رنگ) کی چادروں جیسے ہوتے تھے۔[2]

صحیح بخاری میں بھی حضرت علی رضی اللہ عنہ کی یہ تفسیر مذکور ہے، لیکن ایک باب کے ترجمے میں تعلیقاً آئی ہے، اس باب کے تحت امام بخاری رحمہ اللہ حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ کی حدیث لائے ہیں، جو صحیح مسلم میں بھی مروی ہے اور ترمذی میں بھی اور شرح السنہ میں بھی، جس میں وہ بیان کرتے ہیں:

﴿نَهَانَا النَّبِيُّ ﷺ عَنِ الۡمَیَاثِرِ الۡحُمۡرِ وَعَنِ الۡقِسِّيِّ ﴾[3]

’’نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں دیباج کے بچھونوں اور ریشم ملے لباس سے منع فرمایا۔‘‘

---

[1] صحيح البخاري مع الفتح (١٠/ ٢٩١) المنتقیٰ (١/ ٢/ ٨٥) مشكاة المصابيح (٢/ ١٢٤١)

[2] المنتقیٰ (١/ ٢/ ٨٦) صحيح سنن النسائي، رقم الحديث (٤٩٦٩)

[3] صحيح البخاري مع الفتح (١٠/ ٢٩٢) والنيل أيضاً و صحيح الجامع (٣/ ٦/ ٥٨) مشكاة المصابيح (٢/ ١٢٤٨) صحيح سنن النسائي، رقم الحديث (٤٧٧٠) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٣٦٥٤) صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٤١٧) عن علي رضي الله عنه، صحيح سنن الترمذي، رقم الحديث (١٤٤٢) عن البراء، و الصحيحة، رقم الحديث (٢٣٩٦) صحيح مسلم مع شرح النووي (٧/ ١٤/ ٣١) عن البراء.

بخاری شریف کے ایک ترجمۃ الباب میں تعلیقاً جسے حارث بن ابی اُسامہ نے موصولاً حضرت عبیدہ بن سلمانی سے روایت کیا ہے، جس میں وہ ریشم کے بچھونے کا حکم بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''هُوَ كَلُبْسِهِ'' [1] ''یہ بھی پہننے کی طرح ہی (حرام) ہے۔''

قارئینِ کرام! لباس سے متعلق مسائل کا سلسلہ تو کافی طویل ہے، جس میں لباس کے نام اور ان کی شکلیں اور پھر جائز و ناجائز اور پسندیدہ رنگوں کا تذکرہ بھی آ جاتا ہے، جو الگ ایک مستقل موضوع ہے، جبکہ سرِ دست ان سب امور کا بیان ہمارے پیشِ نظر نہیں، ہم تو صرف یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ نماز کے لیے کیا ریشم والا یا پھر ریشم ملا لباس جائز ہے؟

ریشم کے لباس میں نماز:

اس سلسلے میں مطلق احادیث تو کتنی ہی ذکر کر دی گئی ہیں کہ ریشم کا لباس مَردوں کے لیے حرام ہے۔ ایک حدیث میں خاص نماز کے متعلق بھی اس کا حکم مذکور ہے، جس کی رُو سے امام شافعی رحمہ اللہ اور بعض دیگر اہلِ علم کے نزدیک ریشم کے لباس میں نماز بھی حرام ہے، چنانچہ صحیح بخاری و مسلم، سنن نسائی اور مسندِ احمد میں حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں:

«أُهْدِيَ لِرَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ فَرُّوْجُ حَرِيْرٍ فَلَبِسَهٗ، ثُمَّ صَلّٰى فِيْهِ، ثُمَّ انْصَرَفَ فَنَزَعَهٗ نَزْعاً شَدِيْداً، كَالْكَارِهِ لَهٗ، ثُمَّ قَالَ: لَا يَنْبَغِيْ هٰذَا لِلْمُتَّقِيْنَ» [2]

''نبیِ اکرم ﷺ کو ریشمی قبا ہدیہ دی گئی، آپ ﷺ نے وہ ریشمی قبا پہنی اور نماز پڑھی، پھر آپ ﷺ نے بڑی سختی کے ساتھ اتار پھینکا، جیسے آپ ﷺ کو اس سے نفرت ہو۔ پھر آپ ﷺ نے فرمایا کہ یہ کپڑا متقی لوگوں کے لائق نہیں ہے۔''

اس حدیث میں جو سختی کے ساتھ اتارنے اور مسند احمد میں «ثُمَّ أَلْقَاهُ» کے الفاظ میں ''اسے پھینکنے'' کا ذکر آیا ہے اور نفرت کرنے کا بھی تذکرہ ہوا ہے، ان سب سے معلوم ہوتا ہے کہ ریشم کو اسی وقت حرام کیا گیا تھا، اس سے پہلے وہ حرام نہیں تھی، جیسا کہ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے فتح الباری (۱۰/ ۲۷۰) میں لکھا ہے۔

---

[1] صحيح البخاري مع الفتح (۱۰/ ۲۹۱) باب افتراش الحرير

[2] صحيح البخاري مع الفتح (۱۰/ ۲۶۹، ۱/ ۴۸۵) المنتقىٰ (۱/ ۲/ ۸۰) صحيح الجامع (۳/ ۶/ ۲۵۳) صحيح مسلم مع شرح النووي (۷/ ۱۴/ ۵۱، ۵۲) صحيح سنن النسائي، رقم الحديث (۷۴۲)

اور "منتقی الأخبار" میں علامہ مجد الدین ابن تیمیہ رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ یہ حدیث اس بات پر محمول کی جائے گی کہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس ریشمی قبا کو اس کے حرام ہونے کا حکم نازل ہونے سے پہلے پہنا تھا، ورنہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں یہ تو گمان کرنا بھی روا نہیں کہ حرمت کا حکم نازل ہونے کے باوجود آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ قبا پہنی ہو اور اس میں نماز بھی پڑھی ہو۔[1]

اکثر فقہا حرمت کے بجائے اس کی کراہت کے قائل ہیں، یعنی ریشمی کپڑے میں نماز پڑھنا حرام نہیں بلکہ مکروہ ہے اور ان کا استدلال اس سے ہے کہ حرمت کی علّت تو غرور و تکبر ہے، جبکہ نماز میں غرور و نخوت نہیں ہوتی۔ لیکن صاحبِ نیل الاوطار کہتے ہیں کہ ان کا غرور کو علت بنا کر حرمت کی نص کو غیرِ نماز کے لیے مخصوص کرنا ایک ایسا فعل ہے جو قابل التفات ہی نہیں ہے۔

بعض لوگ ریشم کے کپڑے میں نماز کو جائز قرار دیتے ہیں اور وہ اُسی حدیثِ عقبہ رضی اللہ عنہ سے استدلال کرتے ہیں، جس میں ریشمی قبا میں نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا نماز پڑھنا مذکور ہے، اس حدیث سے وہ یوں دلیل لیتے ہیں کہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب ریشمی قبا میں نماز ادا فرمائی تو یہ جواز کی دلیل ہے۔ ہاں اگر نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اس نماز کو قبا اتارنے کے بعد دہراتے، تو پھر ریشمی کپڑے میں نماز پڑھنے کی ممانعت ثابت ہوتی تھی، جب کہ ان کا یہ استدلال بھی قابل قبول نہیں، کیونکہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس نماز کو اس لیے نہیں دُہرایا تھا، کیوں کہ وہ نماز اس کی حرمت کا حکم نازل ہونے سے پہلے اس قبا میں پڑھی گئی تھی۔

حرمت کا حکم نازل ہو جانے کے بعد بھی نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ریشمی کپڑے کو پہننا اور نماز بھی اس میں پڑھنا، اس بات کا تو وہم و گمان بھی روا نہیں، بلکہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت ایسی بدگمانی کسی گستاخی سے کم ہرگز نہیں ہو گی اور پھر اس بات کی دلیل بھی موجود ہے کہ وہ نماز ریشم کی حرمت کا حکم نازل ہونے سے پہلے ریشمی قبا میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پڑھی تھی، کیونکہ صحیح مسلم، مسند احمد اور دیگر کتبِ حدیث میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے ملتے جلتے الفاظ سے مروی ہے:

«صَلَّى فِيْ قُبَا دِيْبَاجٍ ثُمَّ نَزَعَهُ، وَقَالَ: نَهَانِيْ جِبْرِيْلُ»[2]

"نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ریشمی قبا میں نماز پڑھی، پھر اُسے اتار دیا اور فرمایا کہ مجھے جبرائیل علیہ السلام نے اس سے منع کر دیا ہے۔"

---

[1] المنتقیٰ (۱/ ۲/ ۸۰)

[2] نیل الأوطار (۱/ ۲/ ۸۰)

یہ حدیث اس بات کی واضح دلیل ہے کہ آپ ﷺ نے وہ نماز ریشم کے کپڑے میں نماز کی ممانعت کا حکم نازل ہونے سے پہلے پڑھی تھی، لہٰذا آپ ﷺ نے اُسے دہرایا نہیں، یہی وجہ ہے کہ یہ حدیث قائلینِ جواز کی دلیل ہرگز نہیں بن سکتی۔

حرمت کے نزول سے پہلے ریشم کا استعمال جائز رہا ہے یا نہیں؟ تو اس سوال کا جواب بعض احادیث سے مل جاتا ہے، چنانچہ مسند احمد میں حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

«إِنْ أَكَيْدَرَ دُوْمَةَ أَهْدٰى إِلَى النَّبِيِّ ﷺ جُبَّةَ سُنْدُسٍ أَوْ دِيْبَاجٍ قَبْلَ أَنْ يُّنْهٰى عَنِ الْحَرِيْرِ، فَلَبِسَهَا فَتَعَجَّبَ النَّاسُ مِنْهَا»

''اکیدر دومۃ الجندل نے نبیِ اکرم ﷺ کو سندس یا دیباج (اقسامِ ریشم) کا جبہ بطورِ ہدیہ بھیجا، قبل اس کے کہ ریشم سے منع کیا گیا (یعنی ریشم کی ممانعت کا حکم نازل ہونے سے پہلے) آپ ﷺ نے وہ جبہ پہنا تو (اس کی نفاست اور عمدگی پر) لوگ تعجب کرنے لگے۔''

تب نبیِ اکرم ﷺ نے فرمایا:

«وَالَّذِيْ نَفْسِيْ بِيَدِهٖ لِمَنَادِيْلُ سَعْدِ بْنِ مَعَاذٍ فِي الْجَنَّةِ أَحْسَنُ مِنْهَا»[1]

''مجھے قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے، سعد کو جنت میں جو رومال دیے جائیں گے، وہ تو اس سے بھی زیادہ اچھے ہوں گے۔''

اس حدیث میں جہاں حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کے جنتی ہونے کی بشارت اور ان کی فضیلت وارد ہوئی ہے، وہیں یہ حدیث اس بات کی بھی دلیل ہے کہ پہلے ریشم کا استعمال حرام نہیں تھا، بلکہ یہ حکم بعد میں نازل ہوا تھا۔ یہ حدیث صحیح بخاری و مسلم میں بھی حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے اور اسی طرح یہ حدیث صحیح بخاری و مسلم، سنن ترمذی، نسائی اور مسندِ احمد میں حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے بھی مروی ہے۔[2]

لیکن بادیٔ الامر میں ریشم کے حرام نہ ہونے کی جو صراحت مسند احمد میں ہے، وہ کسی دوسری کتاب میں نہیں ہے، اسی بنا پر ہم نے بھی مسند احمد کی روایت کی ہی نص ذکر کی ہے، البتہ اگر حضرت سعد رضی اللہ عنہ کی فضیلت اور انھیں جنت کی بشارت کا موضوع ہوتا تو صحیحین کے الفاظ کو ترجیح دینا ضروری تھا۔

---

[1] نيل الأوطار (١/ ٢/ ٨٠، ٨١) صحيح سنن النسائي، رقم الحديث (٤٨٩٥)

[2] صحيح البخاري مع الفتح (٧/ ١٢٢) صحيح مسلم مع شرح النووي (٨/ ١٦، ٢٢، ٢٤) سنن الترمذي مع التحفة (١٠/ ٣٤٦) صحيح الجامع الصغير (٣/ ٦/ ٩٥) صحيح سنن النسائي، رقم الحديث (٤٨٩٥)

بہر حال اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ امام شافعی رحمہ اللہ اور ان کے موافقین کا مسلکِ تحریم کافی قوی ہے۔حتیٰ کہ "البحر" میں کہا گیا ہے کہ اگر ریشمی کپڑے کے سوا دوسرا کوئی کپڑا موجود ہی نہ ہو تو اس میں نماز صحیح ہے، تاکہ دونوں طرح کی احادیث میں موافقت ہوجائے اور اگر ریشم کا کپڑا ہوتے ہوئے کوئی شخص عریاں ہوکر نماز پڑھے گا تو اس کی نماز باطل ہوجائے گی۔

امام احمد رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اگر صرف ریشم کا کپڑا ہی پاس ہو، دوسرا کوئی نہ ہو تو عریاں ہی نماز پڑھ لے، بالکل اسی طرح جیسے کسی کے پاس کپڑا تو ہو مگر وہ نجس و پلید ہو۔لیکن یہ تو تب ہے جب کپڑوں کی طہارت کو صحتِ نماز کے لیے شرط مانا جائے، جبکہ دلائلِ قویہ کی رُو سے امام شوکانی رحمہ اللہ نے طہارتِ لباس کو شرط نہیں بلکہ واجب قرار دیا ہے کہ ترکِ واجب کے گناہ کے ساتھ ساتھ نماز صحیح ہوگی۔[1]

علامہ نواب صدیق حسن خان رحمہ اللہ "الروضة الندية شرح الدر البهية" میں لکھتے ہیں کہ جمہور اہلِ علم کا مذہب یہ ہے کہ نماز کے لیے بدن، کپڑوں اور جگہ کا پاک ہونا واجب ہے۔بعض نے شرط اور بعض نے سنت بھی کہا ہے۔لیکن حق یہ ہے کہ یہ واجب ہے، لہٰذا جس نے جان بوجھ کر نجاست والے پلید کپڑوں سے نماز پڑھ لی، اس نے ایک واجب فعل کو ترک کیا، لیکن اس کی نماز صحیح ہوگی۔[2]

اس سے ریشم کے کپڑے میں پڑھی گئی نماز کا حکم بھی معلوم ہوجاتا ہے کہ نماز تو ہوجائے گی، البتہ حرمتِ ریشم اور ترکِ واجب کا ارتکاب شمار ہوگا، یہی بات حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے جمہور کے مذہب کے طور پر بیان فرمائی ہے۔امام مالک رحمہ اللہ تو یہاں تک کہتے ہیں کہ اگر ریشم کے کپڑے میں کوئی نماز مجبوراً پڑھی گئی اور اس نماز کا وقت ہوتے ہوئے ہی دوسرا کپڑا مل گیا تو اس نماز کو دُہرانا چاہیے۔[3]

لیکن اس سلسلے میں جمہور کا مسلک ہی اقرب و اعدل ہے۔

نماز میں سترِ عورہ:

تیسری بات جو نماز کے لائق لباس کے لیے ضروری ہے، وہ یہ ہے کہ مرد و زن ہر دو کا لباس ساتر ہونا چاہیے کہ وہ اعضا جن کا نماز میں ڈھانپنا ضروری ہے، وہ اس لباس میں ڈھانپے گئے ہوں، کیونکہ سورت اعراف آیت میں ارشادِ الٰہی ہے:

---

[1] نيل الأوطار (١/ ٢/ ١١٩۔ ١٢٢) بحواله فقه السنة (١/ ١٢٤)

[2] الروضة الندية (١/ ٨٠)

[3] نيل الأوطار (١/ ٢/ ٨١)

﴿ يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ خُذُوْا زِيْنَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ﴾ [الأعراف:٣١]

''اے بنی آدم! ہر نماز کے وقت زینت اختیار کر لیا کرو۔''

یاد رہے کہ اس آیت میں جو دو لفظ ہیں: مسجد اور زینت۔ ان سے متبادر مفہوم تو یہی لگتا ہے کہ مسجد میں جاتے وقت زینت اختیار کر کے جانا چاہیے، لیکن یہاں مسجد سے مراد محض مسجد ہی نہیں بلکہ نماز پڑھنے اور طواف کرتے وقت زینت اختیار کرنا ہے۔ جیسا کہ تفسیر جلالین میں ﴿عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ﴾ کا معنیٰ ومفہوم متعین کرنے کے لیے لکھا ہے:

''عِنْدَ الصَّلَاةِ وَالطَّوَافِ''[1]

''(زینت اختیار کر لیا کرو) نماز پڑھتے اور طواف کرتے وقت۔''

نماز کے ساتھ طواف بھی اس لیے شامل ہے کہ امام ابن کثیر رحمہ اللہ اپنی تفسیر میں اس آیت کے تحت لکھتے ہیں کہ یہ آیت ان مشرکین کی تردید کے لیے نازل ہوئی ہے، جو عریاں ہو کر بیت اللہ کا طواف کیا کرتے تھے، جیسا کہ صحیح مسلم، سنن نسائی، تفسیر ابن جریر (واللفظ لہٗ) میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اس آیت کا سبب وشانِ نزول بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''كَانُوْا يَطُوْفُوْنَ بِالْبَيْتِ عُرَاةً، الرِّجَالُ وَالنِّسَاءُ، وَالرِّجَالُ بِالنَّهَارِ وَالنِّسَاءُ بِاللَّيْلِ''

''وہ مرد وزن بیت اللہ شریف کا طواف عریاں ہو کر کیا کرتے تھے، مرد دن کے وقت اور عورتیں رات کے وقت۔''

ان میں کوئی عورت تو یہاں تک بھی کہتی تھی ع

اَلْيَوْمَ يَبْدُوْ بَعْضُهٗ أَوْ كُلُّهٗ   وَمَا بَدَا مِنْهُ فَلَا أُحِلُّهٗ

''آج جسم کا کچھ حصہ ظاہر ہو یا سارا جسم اور جو بھی ظاہر ہو میں اُسے (دوسروں کے لیے اس کا دیکھنا) حلال نہیں کرتی ہوں۔''

تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿خُذُوْا زِيْنَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ﴾ [الأعراف:٣١][2]

---

[1] تفسير الجلالين (ص: ١٩٦، ١٩٧ دار المعرفة بيروت)

[2] صحيح مسلم مع شرح النووي (٩/ ١٨/ ١٦٢)

''ہر نماز کے وقت زینت اختیار کر لیا کرو۔''

آگے چل کر لکھتے ہیں کہ امام مجاہد، عطا، ابراہیم نخعی، سعید بن جبیر، قتادہ، سدی اور ضحاک نے بھی ایسے ہی کہا ہے اور امام مالک رحمہ اللہ نے امام زہری رحمہ اللہ اور کتنے ہی دوسرے ائمہ سلف سے اس آیت کی تفسیر میں کہا ہے کہ یہ ان مشرکین کے بارے میں نازل ہوئی ہے، جو ننگے ہو کر بیت اللہ شریف کا طواف کیا کرتے تھے۔[1]

علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ کے بقول اس آیت اور اس کے معنیٰ میں واردشدہ احادیث کے پیشِ نظر ہر نماز خصوصاً جمعہ و عید کے لیے تجمل اور اختیارِ زینت مستحب ہے اور تجمّل و زینت سے مراد کوئی میک اپ کرنا نہیں، بلکہ امام ابن جریر طبری نے ﴿خُذُوْا زِیْنَتَکُمْ﴾ کا معنیٰ کیا ہے:

''اِلْبَسُوْا الثِّیَابَ''[2] ''کپڑے پہنو۔''

تفسیر جلالین میں لکھا ہے:

''مَا یَسْتُرُ عَوْرَتَکُمْ''[3] ''جو تمھاری شرمگاہ کو ڈھانپ لے۔''

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے اپنے رسالے ''حجاب المرأۃ ولباسھا في الصلاۃ'' میں جو پہلی فصل قائم کی ہے، وہ ہے:

''فَصْلٌ فِي اللِّبَاسِ لِلصَّلَاۃِ'' ''نماز کے لیے لباس کا بیان۔''

پھر لکھا ہے کہ یہی ہے ہر نماز و مسجد کے لیے زینت اختیار کرنا، جسے فقہا کہتے ہیں:

''بَابُ سَتْرِ الْعَوْرَۃِ فِيْ الصَّلَاۃِ''[4] ''نماز میں سترِ عورۃ کا بیان۔''

ان تصریحات سے یہ بات واضح ہوگئی کہ زینت اختیار کرنے سے اصل مراد نماز کے لیے ساتر لباس پہننا ہے۔ یہاں یہ بات بھی پیشِ نظر رہے کہ فقہا کی زبان میں جو سترِ عورہ کی اصطلاح معروف ہے، بہ ظاہر اس کا معنیٰ تو یہ ہے کہ نماز میں شرم گاہ کو ڈھانپا جائے، لیکن عورت یا شرم گاہ سے مراد محض

---

[1] تفسیر ابن کثیر (٢/ ٢١٠) و تفسیر مجاھد از مولانا عبدالرحمن سواتی (ص: ٢٣٥ طبع قطر) و فتح الباري (١/ ٤٦٥) باب وجوب الصلاۃ في الثیاب، وقول اللّٰہ تعالیٰ: ﴿خُذُوْا زِیْنَتَکُمْ عِنْدَ کُلِّ مَسْجِدٍ﴾ و مختصر تفسیر الطبري (ص: ١٦٨)

[2] مختصر تفسیر الطبری حوالہ بالا.

[3] تفسیر الجلالین (ص: ١٩٦)

[4] حجاب المرأۃ (ص: ١٤)

اُردو زبان کے لفظ شرم گاہ کا مدلول نہیں بلکہ اس سے کچھ بڑھ کر ہے، کیونکہ اُردو میں تو اس لفظ کا مدلول بہت محدود یعنی جائے پیشاب و پاخانہ ہے، جبکہ فقہ میں اس میں کئی اعضائے جسم بھی شامل ہیں، البتہ تہذیب السنن میں علامہ ابن قیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''بعض اعضا کو عورۃ مغلّظہ اور بعض کو عورۃ خفیفہ کہا جاتا ہے، اور یہ صرف مَردوں کی نسبت ہے اور نماز میں ان سب کا ستر ضروری ہے۔''[1]

مَردوں کا مقامِ ستر:

ظاہر ہے کہ نماز کے لیے مرد و زن کے ''ستر'' میں کافی فرق ہے، آیئے! اس سلسلے میں پہلے دیکھیں کہ نماز کے لیے مَردوں کا مقامِ ستر کیا ہے؟

اس سلسلے میں بنیادی طور پر تو عورۃ مغلّظہ یعنی جائے پیشاب و جائے پاخانہ ہیں، جو اُردو زبان میں شرم گاہ کا مدلول ہیں اور ان کے مقامِ ستر ہونے میں کسی کو کوئی اختلاف نہیں، البتہ اس کے علاوہ جو رانیں ہیں، ان کے مقامِ ستر ہونے یا نہ ہونے میں اختلاف ہے، تو آیئے اس سلسلے میں جانبین کے دلائل کا مطالعہ کریں۔

رانوں کو مقامِ ستر کہنے والوں کے دلائل:

آیئے! پہلے اس فریق کے دلائل دیکھیں جن کے نزدیک یہ اعضائے جسم یعنی رانیں مقامِ ستر ہیں، چنانچہ ان کا استدلال ایک تو اس حدیث سے ہے، جو صحیح بخاری میں تعلیقاً، تاریخ امام بخاری، مستدرکِ حاکم اور مسندِ احمد میں موصولاً حضرت محمد بن جحش رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، جس میں وہ بیان کرتے ہیں:

《 مَرَّ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ عَلٰى مَعْمَرٍ وَ فَخِذَاهُ مَكْشُوْفَتَانِ 》

''نبیِ اکرم ﷺ معمر رضی اللہ عنہ کے پاس سے گزرے، جبکہ ان کی دونوں رانیں ننگی تھیں۔''

تب آپ ﷺ نے فرمایا:

《 غَطِّ فَخِذَيْكَ فَإِنَّ الْفَخِذَيْنِ عَوْرَةٌ 》[2]

---

[1] تهذيب السنن (٦/ ١٧) الإرواء (١/ ٣٠١)

[2] صحيح البخاري مع الفتح (١/ ٤٧٨) بلفظ: « الفخذ عورة » المنتقىٰ (١/ ٢/ ٦٣) صحيح الجامع، رقم الحديث (٤١٥٧) مسند أحمد (٥/ ٢٩٠) مستدرك الحاكم (٤/ ١٨٠) و سنن البيهقي (٢/ ٢٢٨) بحواله تحقيق مصابيح السنة (٢/ ٤٠٧)

’’اپنی رانیں ڈھانپ لو، بے شک رانیں مقامِ ستر ہیں۔‘‘

نیز ان کا استدلال ایک دوسری حدیث سے ہے، جو صحیح بخاری میں تعلیقاً، سنن ابو داود، ترمذی، دارقطنی، موطا امام مالک اور صحیح ابن حبان میں حضرت جرہد اسلمی رضی اللہ عنہ سے موصولاً مروی ہے، جس میں وہ بیان کرتے ہیں:

((مَرَّ رَسُوْلُ اللّٰہِ صلی اللہ علیہ وسلم وَعَلَيَّ بُرْدَۃٌ، وَقَدِ انْکَشَفَتْ فَخِذِيْ))

’’نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم میرے پاس سے گزرے جبکہ میں ایک چادر اوڑھے ہوئے تھا، جس سے میری ران ننگی ہوچکی تھی۔‘‘ تب نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((غَطِّ فَخِذَکَ فَإِنَّ الْفَخِذَ عَوْرَۃٌ))[1]

’’اپنی ران ڈھانپو، بے شک ران مقامِ ستر ہے۔‘‘

تیسری دلیل بخاری شریف کے ترجمۃ الباب میں تعلیقاً اور سنن ترمذی و صحیح ابن حبان اور موطا امام مالک میں موصولاً حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے:

((اَلْفَخِذُ عَوْرَۃٌ))[2] ’’ران مقامِ ستر ہے۔‘‘

مسند احمد میں ہے کہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا گزر ایک آدمی کے پاس سے ہوا، جس کی ران ننگی تھی، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے مخاطب ہو کر فرمایا:

((غَطِّ فَخِذَیْکَ فَإِنَّ فَخِذَ الرَّجُلِ مِنْ عَوْرَتِہٖ))[3]

’’اپنی رانوں کو ڈھانپ لو، کیونکہ آدمی کی رانیں اس کے مقامِ ستر میں سے ہیں۔‘‘

ان کے موقف کی تائید اس حدیث سے بھی ہوتی ہے، جو سنن ابی داود، دارقطنی، بیہقی، مسند احمد اور تاریخِ بغداد خطیب میں حضرت عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ کے طریق سے مروی ہے، جس میں نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

((... فَإِنَّ مَا أَسْفَلَ عَنْ سُرَّتِہٖ إِلٰی رُکْبَتِہٖ مِنْ عَوْرَتِہٖ))

---

[1] صحيح البخاري مع الفتح (١/ ٥٧٠) سنن الدارقطني (١/ ١/ ٢٢٤) مع التعليق المغني، صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٣٨٩) صحيح سنن الترمذي (٢٢٤٥) موارد الظمآن، رقم الحديث (٣٥٣)

[2] صحيح سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٢٤٥) صحيح الجامع، رقم الحديث (٤٢٨٠)

[3] صحيح البخاري (١/ ٤٧٨) المنتقىٰ (١/ ٢/ ٦٣) صحيح الجامع، رقم الحديث (٤١٥٨)

''بے شک ناف کے نیچے سے لے کر گھٹنوں تک کا درمیانی سارا حصہ ہی مقامِ ستر ہے۔''

جبکہ ان میں سے بعض روایات کے الفاظ ہیں:

«مَا بَیْنَ السُّرَّةِ وَالرُّكْبَةِ عَوْرَةٌ»[1]

''ناف اور گھٹنوں کے مابین کا درمیانی سارا حصہ مقامِ ستر ہے۔

ان احادیث کی استنادی حیثیت پر سَر سَری نظر:

ایسی ہی بعض احادیث اور بھی ہیں، جو اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ ران مقامِ ستر ہے، لیکن وہ احادیث انتہائی ضعیف ہیں، البتہ یہ احادیث جو ہم نے ذکر کی ہیں، ان میں سے بھی ہر حدیث پر کچھ نہ کچھ کلام کیا گیا ہے، جس کی تفصیل "فتح الباري" (ص: ٤٧٨، ٤٧٩)، "نیل الأوطار" (١/ ٢/ ٦٣)، "نصب الرایة" (١/ ٢٩٦، ٢٩٧) اور "إرواء الغلیل" (١/ ٢٦٦، ٢٦٧، ٢٩٥ تا ٣٠٣) میں دیکھی جا سکتی ہے۔

البتہ محدّثینِ کرام کا کہنا ہے کہ چونکہ اس موضوع پر دلالت کرنے والی احادیث متعدد صحابہ رضی اللہ عنہم سے مروی ہیں اور وہ سب ایک دوسرے کے ساتھ مل کر قوت اختیار کر جاتی ہیں، کیونکہ ان کی اسناد میں کوئی متہم راوی نہیں ہے، بلکہ ان اسناد کے ضُعف کے اسباب زیادہ سے زیادہ اضطراب، مجہول رواۃ اور معمولی و متحمل کمزوری کے گرد ہی گھومتے ہیں اور ایسی اسناد کے مجموعے پر مبنی حدیث محدّثینِ کرام کے نزدیک درجۂ قبول کو پہنچ جاتی ہے، یہی وجہ ہے کہ ان میں سے بعض کو امام حاکم نے صحیح قرار دیا ہے اور علامہ ذہبی رحمہ اللہ جیسے نقاد نے ان کی موافقت کی ہے اور بعض کو امام ترمذی رحمہ اللہ نے حسن درجہ قرار دیا ہے، حتیٰ کہ امام بخاری رحمہ اللہ نے بھی ان میں حضرت ابن عباس، جرہد اور محمد بن جحش رضی اللہ عنہم کی روایات کو اگرچہ موصولاً و مسنداً تو بیان نہیں کیا، البتہ انھیں اپنی صحیح کے باب "ما یذکر في الفخذ" کے ترجمے میں تعلیقاً ذکر کیا ہے اور حدیثِ جرہد رضی اللہ عنہ کو امام بخاری نے اس مسئلے میں احوط قرار دیا ہے کہ اس پر عمل کرنے میں یعنی ران کو مقامِ ستر ماننے میں ہی زیادہ احتیاط ہے، اگرچہ دوسرے مسلک کی تائید کرنے والی حدیثِ انس رضی اللہ عنہ کو سند کے اعتبار سے زیادہ قوی قرار دیا ہے۔[2]

---

[1] الإرواء (١/ ٢٦٦، ٣٠٣) نصب الرایة (١/ ٢٩٨) صحیح الجامع، رقم الحدیث (٥٥٨٣)

[2] صحیح البخاري (١/ ٤٧٨) الإرواء (١/ ٢٩٧، ٢٩٨)

الغرض ان احادیث کی بنا پر ہی امام نووی رحمہ اللہ نے لکھا ہے:

"ذَهَبَ أَكْثَرُ الْعُلَمَاءِ إِلَىٰ أَنَّ الْفَخِذَ عَوْرَةٌ"[1]

"اکثر علماے امت کا یہی مذہب ہے کہ ران مقامِ ستر ہے۔"

امام شوکانی رحمہ اللہ نے امام ابو حنیفہ و شافعی رحمہما اللہ کا بھی یہی مذہب بیان کیا ہے اور ساتھ ہی "نیل الأوطار" میں لکھا ہے:

"وَالْحَقُّ أَنَّ الْفَخِذَ مِنَ الْعَوْرَةِ"[2]

"اور حق بات یہی ہے کہ رانیں مقامِ ستر (شرمگاہ) ہی ہیں۔"

اس مسلک کی تائید بعض دیگر امور سے بھی ہوتی ہے، لیکن ان کا تذکرہ ہم بعد میں کریں گے۔

مقامِ ستر قرار نہ دینے والوں کے دلائل:

اب آیئے! دوسرے مسلک والوں کے دلائل دیکھیں، جن کے نزدیک رانیں مقامِ ستر نہیں ہیں۔

پہلی دلیل:

صحیح بخاری، مسند ابی عوانہ اور مسند احمد میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

« إِنَّ النَّبِيَّ ﷺ يَوْمَ خَيْبَرَ حَسَرَ الْإِزَارَ عَنْ فَخِذِهِ حَتّٰى إِنِّي لَأَنْظُرُ إِلَىٰ بَيَاضِ فَخِذِهِ »[3]

"غزوہ خیبر کے دن نبیِ اکرم ﷺ نے اپنی ران مبارک کو ننگا کیا، یہاں تک کہ میں نبیِ اکرم ﷺ کی ران مبارک کی سفیدی کو دیکھ رہا تھا۔"

صحیح بخاری شریف میں یہ الفاظ بھی ہیں:

« وَإِنَّ رُكْبَتِي لَتَمُسُّ فَخِذَ النَّبِيِّ ﷺ »

"میرا گھٹنا نبیِ اکرم ﷺ کی ران مبارک سے چھو رہا تھا۔"

یہی الفاظ حدیثِ انس رضی اللہ عنہ سے مروی صحیح مسلم کی حدیث میں بھی ہیں، بلکہ یہ ساری حدیث ہی

---

[1] فتح الباري (١/ ٤٨١)

[2] نيل الأوطار (١/ ٢/ ٦٢)

[3] صحيح البخاري (١/ ٤٧٩، ٤٨٠) المنتقىٰ (١/ ٢/ ٦٤) و نصب الراية (١/ ٢٩٧)

مسلم شریف اور سنن بیہقی میں بھی موجود ہے۔[1]

لیکن اس میں ''حَسَرَ'' کا لفظ نہیں، جو اس بات کی دلیل بنے کہ ران کو نبیِ اکرم ﷺ نے خود ننگا کیا تھا، بلکہ اس میں ہے کہ میرا گھٹنا نبیِ اکرم ﷺ کی ران مبارک سے چھو رہا تھا:

((وَانْحَسَرَ الْإِزَارُ عَنْ فَخِذِ النَّبِيِّ ﷺ))

''اور نبیِ اکرم ﷺ کی ران سے تہبند کی چادر ہٹ گئی۔''

امام نووی رحمہ اللہ نے شرح صحیح مسلم میں انھی الفاظ کو بنیاد بناتے ہوئے کہا ہے کہ یہ ران کے مقامِ ستر ہونے کی دلیل ہے، کیونکہ کپڑے کا آپ ﷺ کی ران مبارک سے ہٹ جانا سواری پر سوار ہونے اور بھیڑ ہونے کی وجہ سے تھا نہ کہ یہ آپ ﷺ نے خود کپڑا ہٹایا تھا اور حضرت انس رضی اللہ عنہ کی نظر پڑ جانا بھی اچانک ہی تھا۔ یہی معاملہ ان کے گھٹنے کے آپ ﷺ کی ران سے چھونے کا بھی تھا، کیونکہ انھوں نے یہ تو نہیں کہا کہ میں نے جان بوجھ کر ایسا کیا تھا۔[2]

جب کہ ران کو مقامِ ستر قرار نہ دینے والے اس حدیث سے یہ استدلال کرتے ہیں کہ بخاری شریف اور مسند احمد میں لفظ ''حَسَرَ'' وارد ہوا ہے، جو اس بات کا پتا دیتا ہے کہ ران سے کپڑا خود نبیِ اکرم ﷺ نے ہٹایا تھا اور حضرت انس رضی اللہ عنہ کے گھٹنے کا آپ ﷺ کی ران سے بغیر کسی چیز کے حائل ہو کر چھونا اس کے مقامِ ستر نہ ہونے کی دلیل ہے، ورنہ مقامِ ستر کا بغیر کسی حائل کے دوسرے سے چھونا جائز نہیں ہے۔

مقامِ ستر نہ ماننے والے صحیح مسلم والی حدیث کے الفاظ:

((وَانْحَسَرَ الْإِزَارُ عَنْ فَخِذِ النَّبِيِّ ﷺ))

''نبیِ اکرم ﷺ کی ران مبارک سے (کسی وجہ سے) کپڑا ہٹ گیا۔''

کا یہ جواب دیتے ہیں کہ مان لیں کہ کپڑا آپ ﷺ نے جان بوجھ کر نہیں ہٹایا تھا، بلکہ خود ہٹ گیا تھا تو اس کے باوجود یہ اس بات کی دلیل نہیں بنتی کہ ران مقامِ ستر ہے، کیونکہ اگر ران مقامِ ستر ہوتی تو پھر آپ ﷺ فوراً ہی کپڑے سے ڈھانپ لیتے، حالانکہ صحیح مسلم و ابوعوانہ کا سیاق اور خصوصاً

[1] صحيح مسلم مع شرح النووي (٥/ ٩/ ٢١٨ وما بعد) إرواء الغليل (١/ ٣٠١)

[2] صحيح مسلم مع شرح النووي (٥/ ٩/ ٢١٩)

اس کے الفاظ ہیں:

«فَأَجْرَىٰ نَبِيُّ اللّٰهِ ﷺ فِي زُقَاقِ خَيْبَرَ، وَإِنَّ رُكْبَتِي لَتَمُسُّ فَخِذَ نَبِيِّ اللّٰهِ ﷺ وَإِنِّي لَأَرَىٰ بَيَاضَ فَخِذِ النَّبِيِّ ﷺ»

یہ الفاظ اس بات کا پتا دیتے ہیں کہ نبیِ اکرم ﷺ کی ران سے تادیر کپڑا ہٹا ہی رہا اور آپ ﷺ نے اسے ڈھانپا نہیں۔ اگر کپڑا غیر ارادی طور پر ہٹا تھا تو اس حالت پر برقرار نہ رہتا، کیونکہ مقامِ ستر سے کپڑا اُٹھائے رکھنا جائز نہیں اور آپ ﷺ تو معصوم عن الخطا تھے، لہٰذا اس حالت کا تادیر برقرار رہنا اس بات کی دلیل ہے کہ ران مقامِ ستر نہیں ہے۔[1]

علامہ ابن حزم رحمہ اللہ المحلی میں لکھتے ہیں کہ پس ثابت ہوا کہ ران مقامِ ستر نہیں ہے اور اگر وہ مقامِ ستر ہوتی تو اللہ تعالیٰ آپ ﷺ کی ران کو ہرگز نہ کھولتا اور نہ حضرت انس رضی اللہ عنہ یا کسی دوسرے کو دکھاتا، کیونکہ آپ ﷺ کو تو اللہ تعالیٰ نے نبوت و رسالت ملنے سے پہلے لڑکپن میں بھی مقامِ ستر کھلنے سے معصوم و محفوظ رکھا تھا، جیسا کہ صحیح بخاری و مسلم میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبیِ اکرم ﷺ تعمیرِ کعبہ کے وقت لوگوں کے ساتھ پتھر اُٹھا اُٹھا کر لا رہے تھے اور آپ ﷺ چادر باندھے ہوئے تھے، آپ ﷺ کے چچا حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''اگر تم چادر کھول کر کندھے پر پتھر کے نیچے رکھ لو تو بہتر رہے گا۔'' پھر انھوں نے آپ ﷺ کی چادر کھول کر آپ ﷺ کے کندھے پر رکھ بھی دی۔''

«فَسَقَطَ مَغْشِيًّا عَلَيْهِ فَمَا رُئِيَ بَعْدَ ذٰلِكَ الْيَوْمِ عُرْيَانًا»[2]

''تب آپ ﷺ غشی کھا کر گر گئے، پھر اس دن کے بعد آپ ﷺ کبھی عریاں نہیں دیکھے گئے۔''

علامہ ابن حزم کا نبیِ اکرم ﷺ کے بچپن سے تعلق رکھنے والے اس واقعے سے ران کے مقامِ ستر نہ ہونے پر استدلال ان کے تمام تر احترام اور جلالتِ علم و فضل کے اعتراف کے باوجود اتنا جاندار نہیں ہے، کیونکہ ہم پہلے بھی اشارہ کر آئے ہیں کہ مردوں کے مقامِ ستر کی دو قسمیں ہیں: مغلّظہ اور خفیفہ۔ مغلّظہ سے مراد شرمگاہیں اور خفیفہ سے مراد رانیں ہیں۔ آپ ﷺ کے بچپن کے واقعہ میں آپ ﷺ کے چچا کا آپ ﷺ کی چادر اتار کر آپ ﷺ کے کندھے پر رکھنا صرف رانوں کے کھلنے

[1] فتح الباري (١/ ٤٨١)

[2] صحيح البخاري مع الفتح (١/ ٤٧٤) باب كراهية التعري في الصلاة وغيرها.

تک محدود نہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ تب آپ ﷺ غشی کھا کر گر گئے، جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ ﷺ کے مقامِ ستر کی حفاظت کے سلسلے میں ایک خصوصی انتظام کے طور پر ہوا، جبکہ یہاں معاملہ ایسا نہیں ہے، بلکہ محض رانوں سے کپڑا اُٹھ جانے یا اُٹھانے کی بات ہے۔

دوسری دلیل:

ران کو ستر نہ ماننے والوں کی دوسری دلیل وہ حدیث ہے، جو صحیح مسلم، سنن بیہقی، مشکل الآثار طحاوی میں ایک طریق سے اور مسند احمد میں ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے، جس میں وہ بیان کرتی ہیں:

«كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ مُضْطَجِعًا فِيْ بَيْتِيْ كَاشِفًا عَنْ فَخِذَيْهِ أَوْ سَاقَيْهِ»

”نبی اکرم ﷺ میرے گھر میں رانیں کھولے یا پنڈلیاں کھولے لیٹے تھے۔“

آگے وہ بیان کرتی ہیں:

”حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اندر آنے کی اجازت چاہی تو آپ ﷺ نے اجازت دے دی اور اسی حال میں لیٹے رہے اور باتیں کیں۔ پھر حضرت عمرِ فاروق رضی اللہ عنہ آئے تو انھیں بھی اندر آنے کی اجازت دے دی، اور اسی طرح لیٹے رہے اور باتیں کیں۔ پھر حضرت عثمانِ غنی رضی اللہ عنہ نے اجازت طلب کی تو نبیِ اکرم ﷺ اُٹھ کر بیٹھ گئے اور کپڑے سنوار لیے۔“

مختصر یہ کہ جب وہ سب چلے گئے اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے صدیق و فاروق رضی اللہ عنہما کی آمد پر نہ اُٹھنے اور نہ کپڑے سنوارنے کا اور جب کہ حضرت عثمانِ غنی رضی اللہ عنہ کی آمد پر اُٹھ کر بیٹھ جانے اور کپڑے سنوار لینے کا سبب دریافت کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا:

«أَلَا أَسْتَحْيِيْ مِنْ رَجُلٍ يَسْتَحْيِيْ مِنْهُ الْمَلَائِكَةُ؟»[1]

”کیا میں اس شخص سے حیا نہ کروں، جس سے اللہ کے فرشتے بھی حیا کرتے ہیں؟“

اس حدیث میں جہاں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی فضیلت حیا داری مذکور ہے، وہیں اس سے ران کے مقامِ ستر نہ ہونے کی دلیل بھی لی جاتی ہے۔ اس حدیث کی شرح بیان کرتے ہوئے امام نووی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

---

[1] شرح صحيح مسلم للنووي (٨/ ١٥/ ١٦٨)

''مالکیہ اور دوسرے فقہا اس حدیث سے ران کے ستر نہ ہونے پر استدلال کرتے ہیں، حالانکہ اس میں ان کے لیے دلیل کی گنجایش نہیں ہے، کیونکہ اس حدیث میں شک کے الفاظ ہیں کہ رانیں کھلی تھیں یا پنڈلیاں، لہٰذا اس سے رانوں کے کھلی ہونے کا جزم لازم نہیں ہے۔''

اس حدیث کی تائید ایک دوسری حدیث سے بھی ہوتی ہے، جو سنن بیہقی، معانی الآ ثار طحاوی اور مسند احمد میں ہے، جسے علامہ ہیثمی رحمہ اللہ نے طبرانی کبیر و اوسط کی طرف بھی منسوب کیا ہے اور کہا ہے کہ اس کی سند حسن ہے، اس میں ام المومنین حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا بھی بالکل ایسا ہی واقعہ بیان کرتی ہیں، جیسا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے۔ البتہ اس میں ہے:

«كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ عِنْدِيْ يَوْمًا، وَقَدْ وَضَعَ ثَوْبَهٗ بَيْنَ فَخِذَيْهِ»[1]

''ایک دن نبیِ اکرم ﷺ میرے یہاں بیٹھے تھے اور اپنے کپڑوں کو دونوں رانوں کے درمیان ڈالے ہوئے تھے۔''

بظاہر مفہوم اس حدیث کا بھی وہی ہے، جو پہلی حدیث کا ہے، لہٰذا اس سے بھی ران کو ستر نہ ماننے والوں کا استدلال ممکن ہے۔

اس کا ایک دوسرا شاہد مشکل الآ ثار طحاوی میں حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے بھی مروی ہے، جس میں وہ بیان کرتے ہیں کہ نبیِ اکرم ﷺ انصار کے باغوں میں سے ایک باغ میں داخل ہوئے، جس میں کنواں (تالاب) بھی تھا، آپ ﷺ اس کے کنارے پر بیٹھ گئے اور قدم مبارک اندر کی طرف لٹکا دیے۔

«وَبَعْضُ فَخِذِهٖ مَكْشُوْفٌ» ''جبکہ آپ ﷺ کی ران مبارک کا کچھ حصہ ننگا تھا۔''

آپ ﷺ نے مجھے فرمایا کہ میں دروازے پر بیٹھ جاؤں، میں ابھی بیٹھا ہی تھا کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ تشریف لے آئے، میں نے آپ ﷺ کو بتایا تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ انھیں اندر آنے کی اجازت دو اور ساتھ ہی جنت کی خوشخبری بھی سنا دو۔ حضرت صدیق رضی اللہ عنہ داخل ہوئے، بشارت سن کر اللہ کی تعریف کی اور نبیِ اکرم ﷺ کی طرح ہی پاؤں لٹکا کر کنویں کے کنارے پر بیٹھ گئے، پھر

[1] فتح الباري (١/ ٤٧٩) نيل الأوطار (١/ ٢/ ٦٤) الإرواء (١/ ٢٩٩)

حضرت عمرِ فاروق رضی اللہ عنہ آئے، پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ آئے (ان دونوں کو بھی اجازت و بشارت دی گئی اور یہ بھی اسی طرح بیٹھتے گئے) بالآخر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ آئے تو انھیں بھی اندر آنے کی اجازت اور جنت کی بشارت دی۔

«فَلَمَّا رَآهُ النَّبِيُّ ﷺ غَطّٰى فَخِذَهُ»

''جب انھیں نبیِ اکرم ﷺ نے دیکھا تو ران کو ڈھانپ لیا۔''

اس کا سبب پوچھنے پر وہی جواب دیا کہ میں بھی اس سے حیا کرتا ہوں، جس سے فرشتے بھی حیا کرتے ہیں۔[1]

آثارِ صحابہ رضی اللہ عنہم:

رانوں کا ستر نہ ماننے والوں کا استدلال بعض دیگر احادیث اور آثار سے بھی ہے، جن میں سے پہلے اثر میں ابو العالیہ بیان کرتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن صامت نے میری ران پر ہاتھ مارا اور کہا:

''میں نے حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ سے پوچھا تھا تو انھوں نے میری ران پر ایسے ہی ہاتھ مار کر کہا کہ جس طرح تم نے مجھ سے پوچھا ہے، ایسے ہی میں نے نبیِ اکرم ﷺ سے پوچھا تھا، تو آپ ﷺ نے میری ران پر اس طرح ہاتھ مارا تھا، جیسے میں نے تمھاری ران پر ہاتھ مارا ہے اور فرمایا تھا:

«صَلِّ الصَّلَاةَ لِوَقْتِهَا»[2] ''نماز کو اس کے وقت پر ادا کرو۔''

یہ حدیث تو طویل ہے، لیکن محل شاہد نبیِ اکرم ﷺ کا حضرت ابو ذر رضی اللہ عنہ کی ران پر، ان کا عبداللہ بن صامت کی ران پر اور ان کا ابو العالیہ کی ران پر ہاتھ مارنا ہے۔

علامہ ابن حزم رحمہ اللہ نے اسے نقل کرنے کے بعد لکھا ہے کہ اگر ران مقامِ ستر ہوتی تو نبیِ اکرم ﷺ حضرت ابو ذر رضی اللہ عنہ کی ران کو اپنے دستِ مبارک سے ہرگز نہ چھوتے اور نہ عبداللہ بن صامت اور ابو العالیہ ایسا کرتے اور کسی مسلمان کے لیے یہ حلال نہیں ہے کہ وہ کسی انسان کی شرمگاہ قبل و دُبر پر کپڑے کے اوپر سے ہاتھ مارے۔

---

[1] الإرواء (١/ ٣٠٠)

[2] فقه السنة (١/ ١١٦)

علامہ موصوف نے اس اثر اور حدیث کے مجموعے میں ران پر کپڑے کے اوپر سے ہاتھ لگانے کو شرمگاہ پر ہاتھ لگانے سے ملا دیا ہے۔ حالانکہ نظائر کے اختلاف کی وجہ سے رانوں کو سترِ خفیف قرار دیا گیا ہے، جو سترِ مغلّظ یعنی شرمگاہ سے مختلف حیثیت رکھتی ہیں، لیکن رانوں کو کپڑے کے اوپر سے چھونا شرمگاہ کو چھونے سے قطعاً کوئی مناسبت نہیں رکھتا اور نہ ہی یہ فعل ایک جیسے ہوسکتے ہیں، جنھیں علامہ ابن حزم نے ایک جیسے کرتے ہوئے استدلال کرنا چاہا ہے۔[1]

آگے موصوف نے اپنی سند کے ساتھ جبیر بن حویرث کا اثر بیان کیا ہے کہ انھوں نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی ران دیکھی جو ننگی تھی۔ تیسرے اثر میں بیان کیا ہے کہ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ حضرت قیس بن شماس رضی اللہ عنہ کے پاس آئے (تو دیکھا کہ) انھوں نے اپنی دونوں رانوں سے کپڑا ہٹا رکھا تھا۔[2]

یہ دوسرا مسلک امام مالک و احمد کا ایک ایک روایت میں اور اہلِ ظاہر کا بھی یہی ہے۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ کی طرف بھی یہ منسوب ہے، مگر ان کی طرف یہ نسبت صحیح نہیں۔

یہ کل دلائل ہیں جانبین کے جو ہم نے آپ کے سامنے رکھ دیے ہیں۔

جائزہ اور ترجیح:

ان ہر دو طرح کے دلائل کو پیشِ نظر رکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ صحیح احادیث دونوں طرف ہی موجود ہیں، ایسے ہی ہر دو طرح کے دلائل کے مابین جمع و تطبیق یا موافقت پیدا کرنے اور کسی ایک پہلو کو ترجیح کا مرحلہ آتا ہے اور اس مسئلے میں یہ ممکن بھی ہے، چنانچہ امام قرطبی رحمہ اللہ کے حوالے سے صاحبِ فتح الباری لکھتے ہیں:

’’حضرت انس رضی اللہ عنہ والی حدیث اور اسی طرح کے مفہوم کی دوسری احادیث (جن سے مقامِ ستر نہ ماننے والوں نے استدلال کیا ہے) وہ مخصوص اوقات میں مخصوص واقعات وقضیے ہیں اور ان میں اس بات کا احتمال موجود ہے کہ وہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ خاص ہوں یا اصل اباحت کی بقا کا پتا دیتے ہوں، جبکہ یہ احتمالات حضرت جرہد رضی اللہ عنہ والی حدیث اور اسی

---

[1] تمام المنة (ص: ١٦٠)

[2] فقه السنة (١/ ١١٦)

مفہوم کی دوسری احادیث میں نہیں پائے جاتے (جو قائلینِ ستر کے دلائل ہیں) کیونکہ وہ احادیث ایک کلی حکم بتا رہی ہیں اور عام شریعت کا اظہار کرتی ہیں، لہٰذا اس عام پر عمل کرنا ہی اولیٰ و افضل ہے۔''

امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی صحیح کے ایک ترجمۃ الباب میں جو کہا ہے کہ اگرچہ حضرت انس رضی اللہ عنہ والی حدیث سند کے اعتبار سے زیادہ قوی ہے، لیکن عمل کے اعتبار سے حدیثِ جرہد رضی اللہ عنہ ہی احوط ہے۔ ان کے اس قول سے غالباً ان کی مراد یہی ہے کہ ران کو مقامِ ستر ماننا ہی اولیٰ و بہتر ہے اور یہ قول امام نووی رحمہ اللہ اکثر علما کا یہی مسلک ہے۔[1]

امام شوکانی رحمہ اللہ نے ''نیل الأوطار'' میں ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا والی حدیث (اور حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا والی اس کی شاہد) کی شرح میں لکھا ہے کہ ران کو مقامِ ستر نہ ماننے والی احادیث کی دلالت، مقامِ ستر ماننے والی احادیث کا مقابلہ نہیں کرسکتیں اور پھر اس کی چار وجوہات بیان کی ہیں۔

١ ان احادیث میں نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے افعال مبارکہ کو نقل کیا گیا ہے (جبکہ وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا خاصہ بھی ہوسکتے ہیں)۔

٢ وہ احادیث ان صحیح اور عام اقوال کا مقابلہ نہیں کرسکتیں، جن میں ران کو ستر کہا گیا ہے۔

٣ صحیح مسلم (اور دوسری کتب) میں (سوائے طحاوی کے) ران اور پنڈلی کے لفظ میں شک اور تردّد واقع ہوا ہے۔

٤ ان واقعات میں زیادہ سے زیادہ جو دلالت ہے وہ یہ ہے کہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ خاص ہیں (ان کا حکم عام نہیں)، کیوں کہ ان میں ایسی کوئی بات نہیں جو اس بات کی دلیل ہو کہ ایسے واقعات میں ہمارے لیے بھی ویسے ہی عمل ضروری ہے۔ لہٰذا ہم پر یہی واجب ہے کہ ہم ان اقوال کو اختیار کریں، جو اس بات پر نص ہیں کہ ران مقامِ ستر ہے۔[2]

ان دونوں طرح کی احادیث میں علامہ ابن قیم رحمہ اللہ نے تہذیب السنن میں سب سے عمدہ تطبیق و موافقت ذکر کی ہے، چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کے اصحاب اور دیگر فقہا میں

---

[1] فتح الباري (١/ ٤٨٠، ٤٨١)

[2] نيل الأوطار (١/ ٢/ ٦٤)

سے کتنے ہی حضرات نے ان دونوں طرح کی احادیث میں جمع و موافقت پیدا کرنے کے لیے کہا ہے کہ مقامِ ستر (عورہ) دوطرح کے ہیں:

① ایک مخفّفہ۔ ② دوسرے مغلّظہ۔

مغلّظہ تو شرمگاہیں یا جائے پیشاب و پاخانہ ہیں، جبکہ مخفّفہ رانیں ہیں اور رانوں سے نگاہیں جھکانے کے حکم میں اور انھیں کبھی ننگا کر لینے کے جواز میں کوئی منافات وتعارض بھی نہیں، کیونکہ نگاہیں جھکانا اس لیے ہے کہ یہ بھی مقامِ ستر ہیں اور انھیں کبھی ننگا کر لینے کا جواز اس لیے ہے کہ یہ مقامِ ستر سہی، لیکن ستر خفیفہ ہیں۔ واللہ اعلم[1]

علامہ ابن قیم رحمہ اللہ کی اسی جمع وتطبیق کو امام بخاری رحمہ اللہ نے کچھ دوسرے الفاظ میں بیان کیا ہے، لیکن بظاہر ان کی مراد بھی یہی ہے، چنانچہ وہ اپنی صحیح میں "باب ما يذكر في الفخذ" کے ترجمہ میں ہی فرماتے ہیں:

"وَحَدِيثُ أَنَسٍ أَسْنَدُ وَحَدِيثُ جُرْهَدٍ أَحْوَطُ حَتّٰى يُخْرَجَ مِنْ إِخْتِلَافِهِمْ"[2]

''حضرت انس رضی اللہ عنہ والی (ران کو مقامِ ستر قرار دینے پر دلالت کرنے والی) حدیث سند کے اعتبار سے زیادہ صحیح ہے اور حضرت جرہد رضی اللہ عنہ والی (مقامِ ستر ہونے پر دلالت کرنے والی) حدیث عمل کے اعتبار سے زیادہ قرینِ احتیاط ہے، تاکہ علما کے اس اختلاف سے نکلا جا سکے۔''

دورِ حاضر کے معروف عالم ومحدّث علامہ ناصر الدین البانی حفظہ اللہ نے "تمام المنة في التعليق على فقه السنة" میں مسئلہ زیرِ بحث کے متعلق بڑی مفید اور اصولی قسم کی باتیں کی ہیں، جنھیں ذکر کرنے کی طرف فریقِ اول کے دلائل پر مبنی احادیث کی استنادی حیثیت پر سرسری نظر ڈالنے کے آخر میں ہم اشارہ بھی کر آئے ہیں، چنانچہ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ ران کو مقامِ ستر نہ ماننے والوں کے دلائل ایک تو فعلی احادیث پر مبنی ہیں اور دوسری طرف وہ مُبیحہ (رانوں کے ننگا کرنے کو جائز کرنے والی ہیں) اور ستر ماننے والوں کے دلائل والی احادیث ایک تو قولی ہیں اور دوسری وہ حاظرہ (رانوں کو ننگا کرنے کی ممانعت کرنے والی) ہیں۔ وہ اصولی قاعدے، جو ایسی صورت میں دوطرح کے دلائل میں ترجیح اور

[1] تهذيب السنن (٦/ ١٧)

[2] صحيح البخاري مع الفتح (١/ ٤٧٨)

ذاتی غرض یا رغبت و دلچسپی سے دور رہتے ہوئے دونوں طرح کے دلائل والے مسئلے میں سے کسی ایک پہلو کو اختیار کرنے میں مدد دینے والے ہو سکتے ہیں۔ وہ اصولی قاعدے دو ہیں:

پہلا قاعدہ:

ممانعت پر دلالت کرنے والے پہلو کو اختیار کرنا جائز کرنے والے پہلو پر مقدّم ہوتا ہے۔

دوسرا قاعدہ:

قولی احادیث فعلی احادیث پر مقدّم ہوتی ہیں، کیونکہ فعلی احادیث میں ان کے نبیِ اکرم ﷺ کے ساتھ خاص ہونے وغیرہ کے احتمالات پائے جاتے ہیں۔

ان دو قاعدوں کے ساتھ ہی یہ بھی واضح ہے کہ رانوں کو ستر قرار نہ دینے والوں کے دلائل پر مبنی واقعات میں سے بعض تو ایسے بھی ہیں کہ جن کے وقوع میں قصد وارادہ کا دخل ظاہر نہیں ہوتا، جیسا کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ والی حدیث اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ والا اثر ہے اور اس پر مستزاد یہ کہ یہ مخصوص واقعات ہیں، جو اس مسئلے کے عام ہونے کا پتا نہیں دیتے، جبکہ اس کے برعکس جو قولی احادیث ہیں (جن سے پتا چلتا ہے کہ رانیں مقامِ ستر ہیں) وہ ایک عام حکمِ شریعت کا درجہ رکھتی ہیں اور سلف سے لے کر خلف تک سب کا ان قولی احادیث پر ہی عمل رہا ہے، کیونکہ ہم نہیں جانتے کہ سلف صالحین یا متاخرین میں سے کوئی اپنی رانوں کو ننگا کیے چلتا پھرتا یا اٹھتا بیٹھتا ہو، سوائے موجودہ دور کے کفار میں سے بعض لوگوں کے یا ان کفار کی اندھی تقلید کرنے والے کچھ مسلمانوں کے، جو گھٹنوں سے بھی اونچے پائنچوں کے نیکر پہنے پھرتے ہیں۔

ان امور کی بنا پر اور قولی دلائل کے راجح ہونے کے پیشِ نظر اس رائے میں ذرہ تردّد نہیں کرنا چاہیے کہ رانیں مقامِ ستر ہیں، خصوصاً جبکہ اکثر علما نے یہی رائے اختیار کی ہے۔ امام شوکانی رحمہ اللہ نے ''نیل الأوطار'' اور ''السیل الجرار'' میں اسی مسلک کو جزماً صحیح و حق کہا ہے، ہاں یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ رانوں کا مقامِ ستر ہونا، شرمگاہ کے مقامِ ستر ہونے سے خفیف تر ہے۔ ''تھذیب السنن'' میں علامہ ابن قیم رحمہ اللہ کا میلان بھی اسی طرف ہے، اس طرح حدیثِ ابو ذر رضی اللہ عنہ میں جو بظاہر کپڑے کے اوپر سے ران کو چھونا واقع ہوا ہے، وہ شرم گاہ کو چھونے جیسا ہرگز نہیں ہے۔[1]

---

[1] تمام المنة (ص: ۱۵۹، ۱۶۰)

بچوں کی تربیت اور لباس:

یہاں ایک اور بات کی طرف بھی اشارہ کر دیں کہ جب یہ بات طے ہوگئی کہ رانیں بھی مقامِ ستر ہیں، اگرچہ ان کا حکم ذرا خفیف ہے، تو کوشش کرنی چاہیے کہ نماز تو نماز، عام حالت میں بھی بلاضرورت انھیں ننگا نہ رکھا جائے اور بڑوں کی طرح ہی وہ بچے جنھیں آپ نماز کی تعلیم کے لیے اپنے ساتھ مسجد میں لے جاتے ہیں، انھیں بھی گھٹنوں سے اُٹھے ہوئے نیکر پہنا کر مسجد میں نہ لے جائیں، بلکہ انھیں بھی وہ لباس پہنائیں جو ساتر ہو اور کم از کم گھٹنوں سے نیچے تک ہو، تاکہ ان کے دل میں مسجد اور نماز کا مقام و مرتبہ اور اہمیت جاگزیں ہو اور انھیں اس بات کا پتا چلے کہ مسجد میں جانے کے لیے اور مسجد یا گھر میں نماز پڑھنے کے لیے پاک وصاف ہونے کے ساتھ ہی باادب قسم کا لباس ہونا بھی ضروری ہے، یہ نہیں کہ جس لباس میں چاہے نماز پڑھ لی۔[1]

جب کہ عموماً ہوتا یہ ہے، جیسا کہ دیکھا گیا ہے کہ لوگ اپنے ساتھ بچوں کو مسجد میں نماز کے لیے خصوصاً جمعہ کی نماز کے لیے لے جاتے ہیں اور وہ ہاف نیکر پہنے ہوئے ہوتے ہیں اور پھر بکثرت مشاہدہ کیا گیا ہے کہ ان میں سے بعض بچے تو بہت ہی تھوڑی عمر کے ہوتے ہیں، جنھیں اتنی پہچان بھی نہیں ہوتی کہ یہ مسجد ہے، اس میں دورانِ نماز شور مچانا، کھیلنا کودنا منع ہے، حتیٰ کہ عمرِ تمیز کو نہ پہنچنے کی وجہ سے وہ تو یہ بھی نہیں جانتے ہوتے کہ مسجد میں پیشاب وغیرہ کرنا غیر درست ہے یا نہیں، ایسے بچوں کو پیمپرز وغیرہ باندھے بغیر اور گھٹنوں کو ڈھانپنے والا کپڑا پہنائے بغیر مسجد میں لے جانا مناسب نہیں، بلکہ بہتر یہ ہے کہ اس کے سنِ تمییز پہنچنے تک اسے گھر ہی میں نماز سکھلائی جائے، خصوصاً سات سال تک اور جب وہ سمجھدار ہوجائے تو اسے مسجد ساتھ لے جانا شروع کر دیں۔ وَاللّٰهُ الْهَادِيْ إِلٰى سَوَاءِ السَّبِيْلِ.

ناف اور گھٹنوں کا حکم:

بعض اہلِ علم تو رانوں کے ساتھ ساتھ ہی ناف اور گھٹنوں کو بھی مقامِ ستر شمار کرتے ہیں، بلکہ بعض کا کہنا ہے کہ گھٹنے مقامِ ستر ہیں، ناف نہیں اور بعض کا قول ہے کہ ناف بھی مقامِ ستر ہے۔ چنانچہ امام ابوحنیفہ، عطا اور ایک قول میں امام شافعی رحمہ اللہ کا کہنا ہے کہ گھٹنے بھی مقامِ ستر ہیں، جبکہ انھی تینوں

---

[1] تحقيق الألباني على حجاب المرأة المسلمة لابن تيمية (ص: ٢٧)

ائمہ میں سے پہلے دو کے نزدیک ناف تو مقامِ ستر نہیں، لیکن امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ناف مقامِ ستر ہے اوراس کے برعکس گھٹنے مقامِ ستر نہیں ہیں۔

ان اعضا کو مقامِ ستر قرار دینے والوں نے دلائل کے طور پر جو احادیث ذکر کی ہیں، ان میں سے کوئی ایک بھی صحیح نہیں ہے، بلکہ ان پر کلام کیا گیا ہے، جس کی تفصیل ذکر کرنے کے بجائے طالب کے لیے ہم "منتقی الأخبار" کے ساتھ "نیل الأوطار" (۱/ ۲/ ٦٥۔ ٦٧) کے مطالعہ کا مشورہ دیتے ہیں یا پھر انھوں نے قیاس سے کام لیا ہے اور وہ اس طرح کہ سنن ابو داود، دار قطنی، بیہقی، مسند احمد اور تاریخ بغداد کی حدیث میں جو آیا ہے:

«مَا بَيْنَ السُّرَّةِ وَالرُّكْبَةِ عَوْرَةٌ»[1] "ناف اور گھٹنوں کے مابین مقامِ ستر ہے۔"

اس حدیث کی سند کو بھی بعض کبار محدّثینِ کرام نے حسن قرار دیا ہے۔[2]

وہ کہتے ہیں کہ اس حدیث میں جن اعضا کو بطورِ حد کے بتایا گیا ہے، وہ انھی اعضا کے ساتھ شاملِ حکم ہیں، جن کی حد بندی کی گئی ہے، یعنی جب ناف اور گھٹنوں کے اندرونی حصے کو مقامِ ستر کہا ہے، تو ناف اور گھٹنے بھی اس میں شامل ہوئے، جیسا کہ وضو کے لیے دھونے والے اعضا کے بیان میں ہاتھوں کی کلائیوں کو کہنیوں تک دھونے کا حکم ہے، تو کہنیاں بھی دھوئی جاتی ہیں۔ ﴿وَاَيْدِيَكُمْ اِلَى الْمَرَافِقِ﴾ لیکن ان کا یہ قیاس صحیح نہیں ہے، کیونکہ وضو میں کہنیوں کو محض حد کے محدود میں شامل ہونے کی وجہ سے نہیں دھویا جاتا، بلکہ ان کے دھونے کی الگ مستقل دلیل موجود ہے، وہ اس بات کو اس لیے بھی بطورِ دلیل پیش نہیں کر سکتے کہ ان میں سے بعض ناف کو مقامِ ستر مانتے ہیں تو گھٹنوں کو نہیں اور بعض گھٹنوں کو مانتے ہیں تو ناف کا انکار کرتے ہیں، لہٰذا انکار پر جو جواب وہ دیتے ہیں، وہی ہمارا بھی ہوسکتا ہے۔[3]

غرض کہ حکم کو اصل پر ماننا ہی واجب ہے اور اصل براءت کو اختیار کرنا ہی ضروری ہے، جب تک کوئی ایسی دلیل ثابت نہ ہوجائے، جو براءت اصلیہ سے حکم کو منتقل کر دے اور اگر ایسا نہیں ہے تو پھر لغوی اعتبار سے جن اعضا کو مقامِ ستر کہا جاتا ہے، وہ مقامِ ستر ہوں گے یا پھر ان کے ساتھ رانوں

---

[1] الإرواء (۱/ ۲٦٦، ۳۰۳) نصب الراية (۱/ ۲۹۸) صحيح الجامع، رقم الحديث (٥٥٨۳)

[2] نصب الراية (۱/ ۲۹۸) تمام المنة (ص: ۱۹۰) الإرواء (۱/ ۲٦٦، ۳۰۲)

[3] نيل الأوطار (۱/ ۲/ ٦٥)

کو سترِ خفیف کے طور پر شامل کیا جائے گا، جس کے دلائل ذکر کیے جا چکے ہیں اور جسم کے باقی حصوں میں سے کسی کو بلا دلیل مقامِ ستر نہیں کہا جائے گا۔[1]

عدمِ ستر کے دلائل:

پھر ناف اور گھٹنوں کے مقامِ ستر نہ ہونے کے دلائل بھی موجود ہیں، جن میں سے ایک تو وہی حدیث ہے، جسے سنن ابو داود، بیہقی، دارقطنی، مسند احمد اور تاریخ بغداد کے حوالے سے ابھی ہم نے ذکر کیا ہے، جس میں مذکور ہے:

«مَا بَيْنَ السُّرَّةِ وَالرُّكْبَةِ عَوْرَةٌ» ''گھٹنوں اور ناف کے مابین مقامِ ستر ہے۔''

یہ حدیث دلیل ہے اس بات کی کہ ان کے مابین مقامِ ستر ہے، یہ اعضا اس میں شامل نہیں ہیں۔ اسی طرح بعض دیگر احادیث بھی ہیں، جن میں بطورِ خاص گھٹنوں کے مقامِ ستر نہ ہونے کا ذکر ہے، مثلاً سنن ابن ماجہ میں حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما بیان فرماتے ہیں:

«صَلَّيْنَا مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ اَلْمَغْرِبَ فَرَجَعَ مَنْ رَجَعَ وَعَقَبَ مَنْ عَقَبَ فَجَاءَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ مُسْرِعًا قَدْ قَفَرَهُ النَّفْسُ وَقَدْ حَسَرَ عَنْ رُكْبَتِهِ»

''ہم نے نبیِ اکرم ﷺ کے ساتھ مغرب کی نماز پڑھی، پھر جس نے چاہا وہ چلا گیا اور جس نے چاہا وہ مسجد ہی میں رہ گیا، تو نبیِ اکرم ﷺ جلدی جلدی تشریف لائے، آپ ﷺ تیز تیز سانس لے رہے تھے اور آپ ﷺ نے اپنے گھٹنے سے کپڑا اٹھا رکھا تھا۔''

پھر آپ ﷺ نے فرمایا:

«أَبْشِرُوْا! هٰذَا رَبُّكُمْ قَدْ فَتَحَ بَابًا مِنْ أَبْوَابِ السَّمَآءِ يُبَاهِيْ بِكُمْ يَقُوْلُ: أُنْظُرُوْا إِلَىٰ عِبَادِيْ، صَلُّوْا فَرِيْضَةً وَهُمْ يَنْتَظِرُوْنَ أُخْرٰى»[2]

''خوش ہو جاؤ! تمھارے رب نے آسمان کے دروازوں میں سے ایک دروازہ کھول دیا ہے اور وہ تمھیں دیکھ کر فخر سے کہہ رہا ہے: میرے ان بندوں کی طرف دیکھو! یہ فرض نماز تو ادا کر چکے ہیں، لیکن اگلی فرض نماز کے لیے بیٹھے ہیں۔''

---

[1] دیکھیں: المغني، تحقيق التركي (٢/ ٢٨٦)

[2] المنتقىٰ (١/ ٢/ ٦٦) صحيح الجامع (١/ ١/ ٦٧) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٨٠١)

اس حدیث میں نبیِ اکرم ﷺ کا مسجد میں اس حال میں داخل ہونا کہ آپ ﷺ اپنے گھٹنے مبارک سے کپڑا اٹھائے ہوئے تھے، یہ اس بات کی دلیل ہے کہ گھٹنا مقامِ ستر نہیں، ورنہ آپ ﷺ مسجد میں اس طرح داخل نہ ہوتے۔ اسی طرح صحیح بخاری اور مسند احمد میں حضرت ابو الدرداء رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں:

«كُنْتُ جَالِسًا عِنْدَ النَّبِيِّ ﷺ إِذْ أَقْبَلَ أَبُوْبَكْرٍ آخِذاً بِطَرَفِ ثَوْبِهٖ حَتّٰى أَبْدٰى عَنْ رُكْبَتِهٖ»

''میں نبیِ اکرم ﷺ کے پاس بیٹھا تھا کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اس حال میں تشریف لائے کہ وہ اپنے تہبند والے کپڑے کو ایک طرف اس طرح پکڑے ہوئے تھے کہ ان کے دونوں گھٹنے ننگے تھے۔''

(انھیں اس انداز سے آتے دیکھ کر) نبیِ اکرم ﷺ نے فرمایا:

«أَمَّا صَاحِبُكُمْ فَقَدْ غَامَرَ»[1] ''تمھارے یہ ساتھی کسی سے ناراض ہو کر آئے ہیں۔''

اس حدیث میں آگے بھی کچھ الفاظ ہیں، لیکن اس میں یہ مذکور نہیں کہ نبیِ اکرم ﷺ نے ان کے گھٹنوں کو ننگے کر کے آنے پر یا انھیں ننگا کرنے پر نکیر کی تھی اور ناجائز کام کو دیکھ کر نکیر نہ کرنا، بلکہ اسے برقرار رہنے دینا، یہ تو منصبِ رسالت کے مقام و مرتبے کے خلاف ہے اور نبیِ اکرم ﷺ کے نکیر نہ کرنے کی وجہ ہی سے اس حدیث سے استدلال کیا جاتا ہے کہ گھٹنے مقامِ ستر نہیں ہیں۔

اس موضوع کی اور بھی کئی احادیث ہیں، جن سے پتا چلتا ہے کہ ناف اور گھٹنے مقامِ ستر نہیں ہیں اور اگر قائلین و مانعین سبھی کے دلائل پر کسی نہ کسی طرح وارد ہونے والے اعتراضات کو مان لیا جائے، تب بھی براءتِ اصلیہ کی رو سے بھی گھٹنے اور ناف مقامِ ستر ثابت نہیں ہوتے، جیسا کہ ہم پہلے بھی ذکر کر آئے ہیں اور اس کا یہ مطلب بھی ہرگز نہیں کہ یہ مقامِ ستر نہیں تو ان کا ڈھانپنا بھی ضروری نہیں، بلکہ ان کے مقامِ ستر نہ ہونے کے باوجود ان کا ڈھانپنا ضروری ہے اور کچھ ایسا ہی بلکہ اس سے بھی زیادہ تاکیدی معاملہ کندھوں کا بھی ہے کہ وہ اگرچہ مقامِ ستر نہیں، لیکن انھیں نماز میں ڈھانپنا ضروری ہے۔

---

[1] المنتقىٰ (١/ ٢/ ٦٧) صحيح البخاري مع الفتح، رقم الحديث (٣٦٦١)

کندھوں کو ڈھانپنا:

نماز کے لیے کندھوں کو ڈھانپنا بھی حسبِ امکان ضروری ہے، ہاں اگر کندھوں کو ڈھانپنے کا امکان ہی نہ ہو، جیسا کہ کبھی کپڑا صرف اتنا ہی ہو کہ ستر ڈھانپ سکتا ہو، کندھے نہیں تو ایسے میں ننگے کندھوں سے نماز پڑھی جا سکتی ہے، بصورتِ دیگر انھیں ڈھانپ کر نماز پڑھنا ضروری ہے، چنانچہ صحیح بخاری و مسلم، سنن ابو داود و نسائی اور مسند احمد میں، اسی طرح صحیح ابی عوانہ، سنن دارمی و بیہقی، معانی الآثار طحاوی اور کتاب الام شافعی میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

﴿لَا يُصَلِّي الرَّجُلُ فِيْ ثَوْبٍ وَّاحِدٍ لَيْسَ عَلٰى عَاتِقِهٖ مِنْهُ شَيْئٌ﴾ [1]

''کوئی آدمی ایک کپڑے میں اس انداز سے نماز نہ پڑھے کہ اس کے کندھوں پر اس کپڑے کا کوئی حصہ بھی نہ ہو۔''

اسی حدیث کے الفاظ ﴿لَا يُصَلِّيَنَّ﴾ ''ہرگز اس طرح نماز نہ پڑھے۔'' یہاں تاکیدی حکم ہے اور ﴿عَلٰى عَاتِقِهٖ﴾ کی جگہ ﴿عَاتِقَيْهِ﴾ بھی ہے کہ دونوں کندھوں پر کپڑے کا کچھ حصہ ہونا چاہیے۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اگر کپڑا وسیع ہو تو کندھوں پر بھی ضرور آنا چاہیے اور اس طرح کندھے بھی ڈھک جائیں گے، اگرچہ وہ ستر میں شامل نہیں ہیں اور اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ مجبوری کے وقت صرف ایک ہی کپڑے میں بھی نماز صحیح ہے، جبکہ امام نووی رحمہ اللہ کے بقول اس بات پر اجماعِ امت ہے کہ مردوں کے لیے بھی یہی افضل ہے کہ دو کپڑوں میں نماز پڑھیں، اگرچہ جائز ایک میں بھی ہے۔ [2]

امام شوکانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث اس بات کی بھی دلیل ہے کہ کپڑے میں نماز پڑھنے کی اس وقت ممانعت ہے، جبکہ کندھوں پر کپڑے کا کوئی حصہ نہ ہو، جمہور اہلِ علم نے اس ممانعت و نہی کو بھی نہی تنزیہی پر محمول کیا ہے کہ بہتر یہ ہے کہ اس حالت میں یعنی کندھا ننگا ہونے پر نماز نہ پڑھے، البتہ نماز پڑھ ہی لے تو وہ صحیح ہوگی، جبکہ امام نووی رحمہ اللہ اور امام شوکانی رحمہما اللہ کے بقول امام احمد رحمہ اللہ سے اس سلسلے میں دو روایتیں ملتی ہیں۔ ایک یہ کہ جسے کندھوں کو ڈھانپنے کی قدرت ہو، پھر بھی وہ

---

[1] صحيح البخاري مع الفتح (١/ ٤٧١) صحيح مسلم (٢/ ٤/ ٢٣١) المنتقىٰ مع النيل (١/ ٢/ ٧٠) صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (٥٨٥) صحيح سنن النسائي، رقم الحديث (٧٤١)

[2] صحيح مسلم مع شرح النووي (٢/ ٤/ ٢٣١)

انھیں ڈھانپے بغیر نماز پڑھ لے تو اس کی نماز صحیح نہیں ہوگی، جبکہ دوسری روایت میں ہے کہ اس کی نماز تو ہو جائے گی، لیکن وہ گناہ گار ہوگا۔[1]

البتہ علامہ ابن حزم رحمہ اللہ نے "المحلّی" (٤/ ٧١) میں حدیث کے ظاہر پر عمل کرتے ہوئے کھلا اور وسیع کپڑا ہونے کے باوجود کندھے پر نہ ڈالنے والے کی نماز کو باطل لکھا ہے۔ (لیکن یہ محض تشدّد ہے)[2]

صرف ایک ہی بڑا کپڑا ہونے کی شکل میں اسے کس طرح پہنا جائے؟ اس کی وضاحت بھی صحیح بخاری، سنن ابو داود اور مسند احمد میں وارد ہوئی ہے، چنانچہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا:

«فَلْيُخَالِفْ بِطَرَفَيْهِ»[3]

سنن ابو داود میں ہے:

«فَلْيُخَالِفْ بِطَرَفَيْهِ عَلٰى عَاتِقَيْهِ»[4]

وہ شخص صرف ایک کپڑے میں نماز پڑھے، وہ اس کے دونوں کونوں کو اپنے کندھوں پر اس طرح کر لے کہ دایاں کونا بائیں کندھے پر اور بایاں کونا دائیں کندھے پر چلا جائے۔

اس موضوع کی بکثرت احادیث ہیں، جن میں سے تیس (٣٠) احادیث کی تخریج تو امام شوکانی رحمہ اللہ نے "منتقی الأخبار" کی شرح "نیل الأوطار" (١/ ٢/ ٧١) میں کر دی ہے۔

غرض کہ اس حدیث میں چادر یا کپڑے کے کونوں کو مخالف سمتوں پر ڈالنے کا حکم ہے، یہ بظاہر تو وجوب کے لیے ہونا چاہیے تھا، لیکن جمہور اہلِ علم نے اسے استحباب پر محمول کیا ہے کہ ایسا کرے تو زیادہ اچھا ہے، ورنہ جیسے بھی ممکن ہو کر لے، البتہ امام احمد رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ضرور ایسا ہی کر لے، ورنہ گناہ گار ہوگا، اگرچہ ایک روایت کی رُو سے اس کی نماز ہو جائے گی۔

---

[1] نیل الأوطار (١/ ٢٢، ٧٠) صحیح مسلم مع شرح النووي (٢/ ٤/ ٢٣٢) الفتح الرباني (٣/ ٩٥)

[2] تمام المنة (ص: ١٦٣)

[3] صحیح البخاري مع الفتح، رقم الحدیث (٣٦٠)

[4] المنتقیٰ مع النیل (١/ ٢/ ٧١) أیضاً صحیح سنن أبي داود، رقم الحدیث (٥٨٦)

بہ وقتِ مجبوری کندھے ننگے رکھنا:

کبھی ایسا وقت بھی تھا اور کہیں کسی وقت اب بھی ایسا ہوسکتا ہے کہ کسی کے پاس کپڑا ہو، مگر اتنا کھلا چوڑا نہ ہو، جس سے کندھے اور مقامِ ستر سب چھپائے جاسکیں، تو ایسے میں کیا طریقہ اختیار کیا جائے؟ اس کی بھی نبیِ اکرم ﷺ نے تعلیم فرمائی ہے، چنانچہ صحیح بخاری و مسلم اور مسند احمد میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ میں نبیِ اکرم ﷺ کے ساتھ ایک سفر میں تھا۔ ایک رات میں کسی کام سے آپ ﷺ کے پاس حاضر ہوا تو میں نے آپ ﷺ کو نماز پڑھتے ہوئے پایا۔ میرے پاس صرف ایک ہی کپڑا تھا، وہ میں نے لپیٹ لیا اور آپ ﷺ کے پہلو میں نماز پڑھ لی، جب آپ ﷺ فارغ ہوئے تو پوچھا:

﴿مَا السُّرىٰ يَا جَابِرُ﴾

''اے جابر! رات کے اس وقت تمھیں آنے کی کیا ضرورت پیش آ گئی؟''

میں نے اپنی ضرورت بیان کی، جب بات مکمل کر چکا تو آپ ﷺ نے فرمایا:

﴿مَا هٰذَا الْإِشْتِمَالُ الَّذِيْ رَأَيْتُ﴾ ''کپڑا پہننے کا یہ طریقہ کیا ہوا، جو کہ میں دیکھ رہا ہوں؟''

میں نے عرض کی کہ میرا کپڑا تنگ یا چھوٹا تھا (لہٰذا اس طرح لپیٹا تھا) تو آپ ﷺ نے فرمایا:

﴿فَإِنْ كَانَ وَاسِعاً فَالْتَحِفْ بِهٖ، وَإِنْ كَانَ ضَيِّقًا فَاتَّزِرْ بِهٖ﴾[1]

''اگر تمھارا کپڑا کھلا چوڑا ہو تو پھر اسے (کندھوں سمیت) سارے جسم پر لپیٹ لو اور جب کپڑا چھوٹا ہو تو اسے صرف تہبند کے طور پر ہی باندھ لو۔''

اس حدیث سے یہ بات بھی واضح ہوگئی کہ اگر کپڑا چھوٹا ہو تو پھر صرف مقامِ ستر کو ڈھانپ لے اور تہبند باندھ کر نماز پڑھ لے، کندھوں کو ڈھانپنے کی ضرورت نہیں، اس صورت میں ننگے کندھوں ہی سے نماز جائز ہے، ہاں اگر کپڑا وافر موجود ہو تو پھر ننگے کندھوں سے نماز نہیں پڑھنی چاہیے۔

اس مسئلے کی مزید تفصیل ''فتح الباري'' (١/ ٤٦٥ تا ٤٦٨)، ''شرح صحیح مسلم للنووي'' (٢/ ٤/ ٢٣٠ تا ٢٣٤)، ''نیل الأوطار'' (١/ ٢/ ٧٠ تا ٧٦) اور ''المغني'' (٢/ ٢٩٠ تا ٢٩٢) میں دیکھی جا سکتی ہے۔

---

[1] صحيح البخاري (١/ ٤٧٢)

ایک کپڑے میں نماز جائز اور دو میں افضل و مستحب ہے:

ان احادیث سے یہ بات بھی روزِ روشن کی طرح واضح ہوگئی کہ نماز صرف ایک کپڑے میں بھی جائز ہے، خصوصاً جبکہ وہ بڑا ہو اور اس میں کندھوں کو ڈھانپنے کی وسعت موجود ہو، اس سلسلے میں نبیِ اکرم ﷺ کے ان ارشادات کے علاوہ بعض ایسی احادیث بھی ہیں، جن سے پتا چلتا ہے کہ آپ ﷺ نے ایک کپڑے میں نماز پڑھی، چنانچہ ایک کپڑے میں نماز کے جواز پر دلالت کرنے والی بعض احادیث تو گزر چکی ہیں، جبکہ صحیحین و سنن اربعہ اور مسند احمد میں حضرت عمر بن ابوسلمہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

«رَأَيْتُ النَّبِيَّ ﷺ يُصَلِّي فِيْ ثَوْبٍ وَّاحِدٍ مُتَوَشِّحًا بِهٖ فِيْ بَيْتِ أُمِّ سَلَمَةَ، قَدْ أَلْقَىٰ طَرَفَيْهِ عَلٰى عَاتِقَيْهِ»[1]

”میں نے نبیِ اکرم ﷺ کو ام المومنین حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے گھر ایک ہی کپڑے میں نماز پڑھتے دیکھا، جسے آپ ﷺ اس طرح لپیٹے ہوئے تھے کہ اس سے آپ ﷺ کے دونوں کندھے ڈھکے ہوئے تھے۔“

جبکہ صحیح بخاری و سنن ترمذی میں ”مُتَوَشِحًا“ کے بجائے ”مُشْتَمِلًا“ ہے اور صحیح مسلم کی بعض روایات میں ”مُلْتَحِفاً بِهٖ“ کے الفاظ ہیں اور ان سب کا معنیٰ تقریباً ایک ہی ہے۔ ”مُتَوَشِّحًا“، ”مُشْتَمِلًا“ اور ”مُلْتَحِفاً بِهٖ“ کے معنیٰ و مفہوم میں جو معمولی سا فرق ہے، وہ بخاری شریف کے ”باب الصلاة في الثوب الواحد“ کے ترجمہ میں امام زہری رحمہ اللہ سے منقول ہے، ایسے ہی شرح مسلم نووی اور ”نیل الأوطار“، شرح ”منتقى الأخبار للشوكاني“ (۱/ ۲/ ۷۵) میں بھی تفصیل دیکھی جا سکتی ہے۔

صرف ایک ہی کپڑے میں نماز کے جواز پر دلالت کرنے والی دوسری حدیث صحیح مسلم اور سنن ابو داود میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، جس میں وہ بیان فرماتے ہیں:

«إِنَّ النَّبِيَّ ﷺ صَلّٰى فِيْ ثَوْبٍ وَّاحِدٍ مُتَوَشِحًا بِهٖ»[2]

”نبیِ اکرم ﷺ نے ایک کپڑے کو کندھوں سمیت لپیٹ کر اس میں نماز پڑھی۔“

ایک تیسری حدیث میں تو حضرت جابر رضی اللہ عنہ ایک کپڑے میں نماز کے جواز کو تعجب سے دیکھنے

[1] صحيح البخاري (۱/ ٤٦٨ تا ٤٦٩) صحيح مسلم (۲/ ٤/ ۲۳۲) المنتقىٰ (۱/ ۲/ ۷۵)

[2] صحيح مسلم (۲/ ٤/ ۲۳۲)

والوں کو بڑے سخت لہجے میں مسئلہ سمجھاتے ہیں، چنانچہ صحیح بخاری شریف میں ”کتاب الصلاۃ، باب الصلاۃ بغیر رداءٍ“ میں حضرت محمد بن منکدر بیان کرتے ہیں:

«دَخَلْتُ عَلٰى جَابِرِ بْنِ عَبْدِ اللّٰهِ وَهُوَ يُصَلِّيْ فِيْ ثَوْبٍ مُلْتَحِفًا بِهٖ وَرِدَاءُهٗ مَوْضُوْعٌ»

”میں حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ کے یہاں داخل ہوا تو دیکھا کہ وہ صرف ایک ہی کپڑے کو (کندھوں سمیت) لپیٹ کر اس میں نماز پڑھ رہے ہیں اور دوسری چادر پاس رکھی ہے۔“

جب وہ نماز سے فارغ ہوئے تو ہم نے پوچھا:

”يَا أَبَا عَبْدِ اللّٰهِ! تُصَلِّيْ وَرِدَاءُكَ مَوْضُوْعٌ؟“

”اے ابوعبداللہ! آپ نماز پڑھ رہے تھے (صرف ایک ہی چادر لپیٹ کر) جبکہ (دوسری) چادر بھی آپ کے پاس ہی رکھی تھی؟“

تو انھوں نے فرمایا:

”نَعَمْ، أَحْبَبْتُ أَنْ يَّرَانِيَ الْجُهَّالُ مِثْلُكُمْ“

”ہاں، میں چاہتا تھا کہ مجھے (اس طرح نماز پڑھتے) تم جیسے (اس مسئلے سے) لاعلم لوگ دیکھ لیں۔“ پھر ساتھ ہی فرمایا:

”رَأَيْتُ النَّبِيَّ ﷺ يُصَلِّيْ هٰكَذَا“[1]

”میں نے نبیِ اکرم ﷺ کو دیکھا کہ آپ ﷺ اسی طرح نماز پڑھ رہے تھے۔“

”باب عقدِ الإزارِ على القفا في الصلاة“ میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

”إِنَّمَا صَنَعْتُ ذٰلِكَ لِيَرَانِيْ أَحْمَقُ مِثْلُكَ“

”میں نے اس طرح نماز اس لیے پڑھی تھی، تاکہ (اس مسئلے سے) تم جیسا لاعلم مجھے دیکھ لے۔“

پھر فرمایا:

”وَأَيُّنَا كَانَ لَهٗ ثَوْبَانِ عَلٰى عَهْدِ النَّبِيِّ ﷺ؟“[2]

---

[1] صحيح البخاري (١/ ٤٧٨)

[2] صحيح البخاري مع الفتح (١/ ٤٦٧) مختصر صحيح البخاري (١/ ١٠٣)

''عہدِ نبوی ﷺ میں ہم سے دو کپڑے کس کے پاس ہوا کرتے تھے؟''

یعنی اس عہدِ مسعود میں اکثر لوگوں کے پاس صرف ایک ہی کپڑا ہوا کرتا تھا اور وہ اسی میں نماز پڑھ لیا کرتے تھے۔ اس واقعہ میں ایک کپڑے میں نماز کا جواز بیان ہوا ہے، اگرچہ دو کپڑوں میں نماز کی افضلیت اپنی جگہ درست ہے۔ ایک کپڑے میں نماز کے جواز میں بھی پہلے پہل کچھ اختلاف رہا ہے، جیسا کہ مصنف ابن ابی شیبہ میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی طرف سے منقول ہے کہ انھوں نے فرمایا:

''لَا تُصَلِّیَنَّ فِيْ ثَوْبٍ وَّاحِدٍ، وَإِنْ كَانَ وَسِعَ مَا بَيْنَ السَّمَآءِ وَالْأَرْضِ''

''ایک کپڑے میں نماز مت پڑھو، چاہے وہ زمین و آسمان کی درمیانی وسعت جتنا بڑا ہی کیوں نہ ہو۔''

یہ قول امام ابن بطال نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی طرف منسوب کیا اور کہا ہے کہ اس پر متابعت نہیں کی گئی اور پھر ایک کپڑے میں نماز کا جائز ہونا طے پا گیا۔[1]

ایسے ہی صحیح بخاری، سنن ابو داود اور دیگر کتبِ حدیث میں حضرت ام ہانی رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ نبیِ اکرم ﷺ جب غسل سے فارغ ہوئے تو آپ ﷺ نے صلاۃ الضحیٰ کی آٹھ رکعتیں پڑھیں۔

صحیح بخاری میں ہے:

«مُلْتَحِفًا فِيْ ثَوْبٍ وَّاحِدٍ»[2] ''صرف ایک ہی کپڑا لپیٹے ہوئے۔''

ایک کپڑے میں نماز کا جواز تو خود نبیِ اکرم ﷺ کے ارشاداتِ گرامی سے ثابت ہے، چنانچہ صحیح بخاری و مسلم، سنن ابو داود و نسائی، ابن ماجہ اور مسندِ احمد میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ کسی سائل نے نبیِ اکرم ﷺ سے سوال کیا کہ آیا ایک کپڑے میں نماز ہو جاتی ہے؟

تو آپ ﷺ نے فرمایا:

«أَوَ لِكُلِّكُمْ ثَوْبَانِ؟»[3] ''کیا تم میں سے ہر کسی کے پاس دو دو کپڑے ہیں۔''

گویا آپ ﷺ نے فرمایا کہ ہر کسی کے پاس دو کپڑے تو ہیں ہی نہیں، پھر ایک میں نماز جائز

---

[1] فتح الباري (١/ ٤٦٨)

[2] صحیح البخاري (١/ ٤٦٩) صحیح سنن أبي داود، رقم الحدیث (١١٤٧)

[3] صحیح البخاري (١/ ٤٧٠) صحیح مسلم (٢/ ٤/ ٢٣٠، ٢٣١) صحیح سنن أبي داود، رقم الحدیث (٥٨٤) صحیح سنن النسائي، رقم الحدیث (٧٣٥) سنن ابن ماجه، رقم الحدیث (١٠٤٧)

کیوں نہ ہوگی، جبکہ اس سے ستر ڈھک جائے؟

علامہ سرخسی حنفی کے حوالے سے حافظ ابن حجر رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ یہ سائل حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ تھے اور امام طحاوی رحمہ اللہ سے نقل کیا ہے کہ اگر ایک کپڑے میں نماز مکروہ ہوتی تو پھر اس کی نماز بھی مکروہ ہوتی، جس کے پاس ایک کپڑے کے سوا کوئی دوسرا کپڑا ہی نہ ہوتا۔ صاحبِ فتح الباری فرماتے ہیں کہ یہ سوال جواز اور عدمِ جواز کے بارے میں تھا، نہ کہ کراہت اور عدمِ کراہت کے بارے میں۔[1]

بخاری شریف کی ایک دوسری روایت میں یہ بھی ہے کہ حضرت عمرِ فاروق رضی اللہ عنہ سے کسی نے پوچھا (جو غالباً حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ تھے) کہ ایک کپڑے میں نماز جائز ہے یا نہیں؟ تو انھوں نے فرمایا:

"إِذَا وَسَّعَ اللّٰهُ فَأَوْسِعُوْا"[2]

"جب اللہ نے فراخی عطا فرمائی ہے تو تم بھی کھلے دل سے کام لو۔"

یعنی ایک کپڑے میں جواز کے باوجود دو کپڑوں میں نماز پڑھو۔ آگے حضرت عمرِ فاروق رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

"آدمی کو چاہیے کہ تہبند اور اوپر کی چادر میں، یا پھر تہبند اور کرتا یا قمیص میں، یا تہبند اور قبا (چغہ) میں، یا شلوار اور اوپر کی چادر میں، یا شلوار اور قبا میں، یا نیکر اور قبا میں، یا نیکر اور قمیص میں نماز پڑھے۔" حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ "میرا خیال ہے کہ شاید حضرت عمرِ فاروق رضی اللہ عنہ نے یہ بھی کہا کہ یا پھر وہ نیکر اور اوپر کی (بڑی کھلی چوڑی) چادر میں نماز پڑھے۔"[3]

حضرت عمرِ فاروق رضی اللہ عنہ کے اس ارشاد میں اس کا سببِ ورود تو مذکور نہیں، البتہ مصنف عبدالرزاق میں اس کا ذکر اس طرح آیا ہے کہ حضرت اُبیّ بن کعب اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہما کے مابین اختلاف ہوگیا۔ حضرت اُبیّ رضی اللہ عنہ نے کہا کہ ایک کپڑے میں نماز جائز ہے، مکروہ نہیں، جبکہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا کہ یہ تب تھا جبکہ کپڑوں کی قلت تھی۔ حضرت عمرِ فاروق رضی اللہ عنہ نے منبر پر چڑھ کر فرمایا:

"اَلْقَوْلُ مَا قَالَ أُبَيٌّ، وَلَمْ يَأْلُ ابْنُ مَسْعُوْدٍ"

---

[1] دیکھیں: الفتح (۱/ ۴۷۰) نیل الأوطار (۱/ ۲/ ۷۴)

[2] صحیح البخاري مع الفتح، رقم الحدیث (۳۶۵)

[3] صحیح البخاري (۱/ ۴۷۵)

''بات وہی ہے جو حضرت ابیّ رضی اللہ عنہ نے کہی ہے۔ اور ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے بھی غلط نہیں کہا۔''

اور آگے وہ قول ہے جو ہم ذکر کر چکے ہیں۔[1] جس میں انھوں نے دو کپڑوں میں نماز پڑھنے کا حکم فرمایا ہے۔ جن جن کپڑوں کا ذکر ہوا ہے، ان میں سے ہر جوڑے کے ذریعے سے کندھوں سمیت تمام اعضاے ستر کو ڈھانپا جا سکتا ہے، حتیٰ کہ نیکر جو بظاہر رانوں کو نہیں ڈھانپ سکتا، لیکن جب اس پر کندھوں سے لے کر پاؤں تک آنے والی بڑی چادر لپٹی ہوئی ہو یا ان عرب ممالک میں مروج قمیص پہنی ہو، جسے ثوب کہتے ہیں، جو پاؤں تک ہی ہوتا ہے، تو ایسے میں نیکر بھی کام دے جائے گا، کیونکہ اصل ساتر چادر یا ثوب ہوں گے۔

لباس کی یہ اقسام بھی محض بطورِ وضاحت و مثال ہیں، یہ نہیں کہ ان کے سوا کسی اور کپڑے میں نماز ہی نہیں ہوتی، بلکہ اصل بات یہ ہے کہ لباس ساتر ہونا چاہیے، وہ کسی بھی نام سے پکارا جاتا ہو۔

اس حدیث سے اس بات کی وضاحت بھی ہوگئی کہ تنگی کے زمانے میں ایک ہی کپڑے میں نماز جائز رہی ہے اور رہے گی، لیکن فراخی میں دو کپڑوں میں نماز پڑھنا ہی افضل ہے۔ خصوصاً جبکہ سنن ابی داود و بیہقی میں حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

«نَهٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ أَنْ يُّصَلِّيَ الرَّجُلُ فِيْ سَرَاوِيْلَ وَلَيْسَ عَلَيْهِ رِدَاءٌ»[2]

''نبیِ اکرم ﷺ نے اس سے منع کیا کہ کوئی شخص صرف شلوار پہن کر نماز پڑھے اور اس پر اوپر والی چادر نہ ہو۔''

اس حدیث سے تو یہ ثابت ہوتا اور پتا چلتا ہے کہ جسم کے وہ بالائی حصے (کندھے وغیرہ) جو مقامِ ستر نہیں ہیں، انھیں ڈھانپنا بھی واجب و ضروری ہے، لیکن جمہور اہلِ علم نے اس نہی کو نہی تنزیہی قرار دیا ہے، جیسا کہ کندھوں کو ڈھانپنے سے متعلق موضوع کے ضمن میں ہم ذکر کر آئے ہیں۔

الغرض مردوں کے لیے دو کپڑوں میں نماز ادا کرنا افضل ہے اور قاضی عیاض، علامہ ابن عبدالبر، امام قرطبی اور امام نووی رحمہم اللہ نے اس پر اجماعِ امت ذکر کیا ہے، البتہ امام ابن المنذر رحمہ اللہ نے ایک کپڑے میں نماز کے جواز کا ذکر ائمہ کرام سے نقل کیا ہے اور یہ بھی کہا ہے:

---

[1] فتح الباري (١/ ٤٧٥) فقه السنة (١/ ١٢٨)

[2] صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (٥٩٤)

”وَقَدِ اسْتَحَبَّ بَعْضُهُمُ الصَّلَاةَ فِيْ ثَوْبَيْنِ“

”بعض ائمہ نے دو کپڑوں میں نماز کو مستحب قرار دیا ہے۔“

ان کے اس قول سے پتا چلتا ہے کہ دو کپڑوں کی فضیلت ہونے پر اجماع کا دعویٰ صحیح نہیں ہے، بلکہ اس میں بھی کچھ اختلاف ہے۔[1]

لیکن اس سے انکار کیسے کیا جا سکتا ہے کہ دو کپڑوں کی قدرت ہونے کی حالت میں دو ہی میں نماز ادا کرنا بہتر و افضل ہے، کیونکہ دو میں ستر پوشی بھی زیادہ بہتر طریقے سے ہوسکتی ہے اور دو میں زینت بھی ہے، جس کا قرآنِ کریم میں اللہ تعالیٰ نے حکم فرمایا ہے:

﴿خُذُوْا زِيْنَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ﴾ [الأعراف:٣١]

”ہر نماز کے وقت اپنی زینت اختیار کرو۔“

نیز نبیِ اکرم ﷺ نے بھی نماز کے وقت زینت اختیار کرنے کی ترغیب دلائی ہے، چنانچہ معجم طبرانی اوسط، سنن بیہقی اور معانی الآثار طحاوی میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما روایت بیان کرتے ہیں کہ نبیِ اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

« إِذَا صَلّٰى أَحَدُكُمْ فَلْيَلْبَسْ ثَوْبَيْهِ »

”جب تم میں سے کوئی شخص نماز پڑھے تو اسے چاہیے کہ دو کپڑوں میں نماز پڑھے۔“

آگے آپ ﷺ نے اس طریقے کو زینت قرار دیتے ہوئے فرمایا:

« فَإِنَّ اللّٰهَ أَحَقُّ مَنْ يُّزَيَّنُ لَهٗ »[2]

”اللہ تعالیٰ اس بات کا زیادہ حقدار ہے کہ اس کے لیے زیب و زینت اختیار کی جائے۔“

یوں تو ان احادیث صحیحہ ہی میں کفایت و برکت ہے، البتہ یہیں نواسۂ رسول ﷺ حضرت حسن رضی اللہ عنہ کا عمل بھی دیکھتے جایئے، ان کے بارے میں مذکور ہے:

« إِنَّهٗ إِذَا قَامَ إِلَى الصَّلَاةِ لَبِسَ أَجْوَدَ ثِيَابِهٖ »

”وہ جب نماز پڑھنے لگتے تو اپنے خوبصورت ترین کپڑے پہنتے تھے۔“

جب ان سے اس کا سبب پوچھا گیا تو انھوں نے فرمایا تھا:

---

[1] دیکھیں: صحيح مسلم مع شرح النووي (٢/ ٤/ ٢٣١) فتح الباري (١/ ٤٧١) نيل الأوطار (١/ ٢/ ٧٥)

[2] فقه السنة (١/ ١٢٨) صحيح الجامع، رقم الحديث (٦٥٢) والصحيحة للألباني، رقم الحديث (١٣٦٩)

”إِنَّ اللّٰهَ جَمِيْلٌ يُحِبُّ الْجَمَالَ فَأَتَجَمَّلُ لِرَبِّيْ“

”بے شک میرا پروردگار صاحبِ جمال ہے اور وہ حسن و جمال کو پسند فرماتا ہے، لہٰذا میں اپنے پروردگار کے لیے جمال و زینت اختیار کرتا ہوں۔“

ساتھ ہی فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کا حکم بھی ہے:

﴿خُذُوْا زِيْنَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ﴾ [الأعراف:٣١]

”ہر نماز کے وقت اپنی زینت اختیار کرو۔“[1]

نماز میں پگڑی یا ٹوپی سے سر کو ڈھانپنا

چونکہ نماز کے لیے مردوں کی نسبت ضروری لباس کا ذکر چل رہا ہے اور مردوں کے مقامِ ستر کی تعیین بھی بالتفصیل کی جا چکی ہے، جن میں تمام تر فقہی اختلافات کو تسلیم کر لینے کے باوجود بھی صرف اتنا ہی ہے کہ نمازی گھٹنوں اور ناف کے درمیانی حصے کو کپڑے سے ڈھانپ لے اور کپڑے کی قلت و مجبوری نہ ہو تو کندھوں کو بھی ڈھانپ لے اور قلت و مجبوری میں کندھوں کو ڈھانپنا بھی شرط، واجب یا ضروری نہیں ہے۔ ستر پوشی اور نماز کے لیے لباس کے ضمن میں کسی صحیح و صریح اور خاص حدیثِ رسول ﷺ سے، ائمہ اربعہ رحمہم اللہ میں سے کسی امام سے اور فقہا و محدّثین رحمہم اللہ میں سے کسی فقیہ یا محدّث سے یہ ثابت نہیں کہ مَردوں کو نماز میں سر کا ڈھانپنا بھی شرط یا واجب یا ضروری قرار دیا گیا ہو۔

مگر ہمارے یہاں اس سلسلے میں بڑے تشدد سے کام لیا جاتا ہے۔ اگر کوئی ننگے سر نماز پڑھ لے تو اسے بڑی خشمگیں آنکھوں سے تاڑا جاتا ہے، جیسے اس سے کوئی بہت ہی گھناؤنا جرم سرزد ہوگیا ہو اور اس شخص کو بڑا بُرا سمجھا جاتا ہے، جیسے اس نے کسی گناہِ کبیرہ کا علانیہ ارتکاب کر لیا ہو۔ اور کئی ”مہربان“ از راہِ شفقت کوئی نہ کوئی بوسیدہ سی کھجور کے پتوں کی بنی ہوئی یا پھر کوئی سوتی مگر تیل اور میل سے اٹی ہوئی ٹوپی اٹھا کر اس کے سر پر رکھ دیتے ہیں۔ بعض حضرات شدتِ احساس میں اس حد تک چلے جاتے ہیں کہ پاس کوئی رومال یا ٹوپی نہ ہو تو مسجد سے کسی بھی چیز کے میسر نہ آنے پر قمیص کے بٹن کھول لیتے ہیں اور کالر اٹھا کر اسے گلے کے بجائے سر پر رکھ لیتے ہیں، تاکہ سر ننگا نہ رہے۔ حالانکہ

---

[1] فقه السنة (١/ ١٢٨)

یہ تمام اندازِ ''ستر پوشی'' شرعی اعتبار سے درست نہیں ہیں، کیونکہ سر کو ڈھانپنے کے ضروری ہونے کی کوئی خاص دلیل نہیں ہے۔ البتہ اگر مطلق زینت اختیار کرنے سے پگڑی یا ٹوپی کی فضیلت اخذ کی جائے تو وہ ایک دوسری بات ہے اور وہ بھی محض فضیلت کی حد تک ہے نہ کہ شرط یا وجوب کے لیے ہے۔

ان مطلق دلائل کا تذکرہ تو بعد میں کریں گے، پہلے ان احادیث کا جائزہ پیش کرنا ضروری ہے، جس میں پگڑی یا ٹوپی کی بہت ہی زیادہ فضیلت بتائی گئی ہے، جو سب من گھڑت اور ضعیف ہیں۔

پہلی حدیث:

نماز میں پگڑی یا ٹوپی سے سر کو ڈھانپنے کی فضیلت پر دلالت کرنے والی جن احادیث کو پیش کیا جاتا ہے، ان میں سب سے پہلی حدیث ابن النجار نے (محمد بن مہدی المروزی تک) اپنی سند سے روایت کی ہے، جس میں مہدی بن میمون بیان کرتے ہیں کہ میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے بیٹے حضرت سالم رحمہ اللہ کے پاس داخل ہوا تو دیکھا کہ وہ عمامہ (پگڑی) باندھ رہے ہیں، انھوں نے مجھ سے مخاطب ہو کر فرمایا: اے ابو ایوب!

''أَلَا أُحَدِّثُكَ بِحَدِيثٍ تُحِبُّهُ وَتَحْمِلُهُ وَتَرْوِيهِ؟''

''میں تمھیں ایک حدیث نہ سناؤں، جسے تم پسند کرو اور یاد رکھو اور آگے بیان کرو؟''

میں نے عرض کی: ضروری سنائیں، تو انھوں نے فرمایا:

''دَخَلْتُ عَلٰى عَبْدِ اللّٰهِ ابْنِ عُمَرَ وَهُوَ يَعْتَمُّ''

''میں (اپنے والدِ گرامی حضرت) عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے یہاں داخل ہوا، جب کہ وہ عمامہ باندھ رہے تھے۔'' انھوں نے مجھے فرمایا:

''يَا بُنَيَّ! أُحِبُّ الْعَمَامَةَ، يَا بُنَيَّ! اِعْتَمَّ تُجَلُّ وَتُكْرَمُ وَتُوَقَّرُ، وَلَا يَرَاكَ الشَّيْطَانُ إِلَّا وَلّٰى هَارِبًا، إِنِّي سَمِعْتُ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ يَقُوْلُ: صَلَاةٌ بِعَمَامَةٍ تَعْدِلُ بِخَمْسٍ وَّعِشْرِيْنَ صَلَاةً بِغَيْرِ عَمَامَةٍ، وَجُمُعَةٌ بِعَمَامَةٍ، تَعْدِلُ سَبْعِيْنَ جُمُعَةً بِغَيْرِ عَمَامَةٍ، إِنَّ الْمَلَائِكَةَ يَشْهَدُوْنَ الْجُمُعَةَ مُعْتَمِّيْنَ، وَلَا يَزَالُوْنَ، يُصَلُّوْنَ عَلٰى أَصْحَابِ الْعَمَائِمِ حَتّٰى تَغْرُبَ الشَّمْسُ'' [1]

''اے میرے بیٹے! عمامہ (پگڑی) کو محبوب رکھو۔ اے بیٹے! عمامہ باندھ کر رکھو، تمھاری

[1] الضعيفة، رقم الحديث (١٢٧) ضعيف الجامع، رقم الحديث (٣٥٢٢)

جلالت وقدر، عزت وشرف اور تعظیم وتوقیر ہوگی اور شیطان تمھیں دیکھتے ہی بھاگ جائے گا۔ میں نے نبیِ اکرم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ عمامہ (پگڑی) باندھ کر پڑھی گئی ایک نماز بغیر عمامے کے پڑھی گئی پچیس نمازوں کے برابر ہوتی ہے اور عمامہ باندھ کر پڑھی گئی ایک نمازِ جمعہ بغیر عمامہ کے پڑھی گئی جمعہ کی ستر نمازوں کے برابر ہے۔ بے شک فرشتے عمامہ باندھ کر جمعہ میں حاضر ہوتے ہیں اور غروبِ آفتاب تک دستار وعمامہ والوں کے لیے رحمت کی دعائیں کرتے رہتے ہیں۔‘‘

امام سیوطی رحمہ اللہ نے اس روایت کو تاریخ ابنِ عساکر اور مسند الفردوس دیلمی کی طرف منسوب کیا ہے۔

حدیث کی استنادی حیثیت:

اس حدیث کی استنادی حیثیت معلوم کی جائے تو پتا چلتا ہے کہ محدثین کرام نے اس کو من گھڑت قرار دیا ہے:

امام سیوطی رحمہ اللہ نے اسے ’’ذیل الأحادیث الموضوعة‘‘ (ص: ۱۱۰) میں نقل کیا اور اس کے موضوع یا من گھڑت ہونے کے حکم کو برقرار رکھا ہے۔ اسی طرح ’’تنزیه الشریعة‘‘ میں ابن عراق نے بھی ان کی متابعت کی ہے۔ اسے من گھڑت روایات میں شمار کرنے کے باوجود امام سیوطی رحمہ اللہ سے ذہول ہوا۔ انھوں نے ابن عساکر کے حوالے سے اسے جامع صغیر میں بھی نقل کر دیا۔ فتح القدیر شرح الجامع الصغیر میں علامہ مناوی رحمہ اللہ نے امام سیوطی کا تعاقب کرتے ہوئے لکھا ہے کہ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے اس حدیث کو موضوع یعنی من گھڑت کہا ہے اور پھر ’’المقاصد‘‘ (ص: ۱۲٤) میں علامہ سخاوی رحمہ اللہ نے بھی حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کا یہ فیصلہ نقل کیا ہے اور اسے پسند کیا ہے۔ خود امام سیوطی نے ’’ذیل الأحادیث الموضوعة‘‘ نامی اپنی کتاب میں ابن حجر رحمہ اللہ سے اس حدیث کی یہ حیثیت نقل کی ہے۔

ماضی قریب کے معروف حنفی محدّث ملاّ علی قاری نے من گھڑت احادیث پر مشتمل اپنی کتاب ’’الموضوعات‘‘ (ص: ٥١) میں فقہاے مالکیہ میں سے ابوالحسن علی بن محمد المصری الشاذلی سے اس حدیث کے بارے میں ان کا قول نقل کیا ہے، جس میں وہ فرماتے ہیں:

”هٰذَا حَدِيْثٌ بَاطِلٌ“ (یہ روایت باطل ہے)

”لسان المیزان“ (۳/ ۲٤٤) میں حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ نے کہا ہے:

”هٰذَا حَدِيْثٌ مَّوْضُوْعٌ“ ”یہ روایت جعلی اور من گھڑت ہے۔“

آگے حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے اس روایت کی سند کے راویوں عباس بن کثیر، ابو بشر بن سیار، محمد بن مہدی مروزی اور مہدی بن میمون کے غیر معروف و مجهول ہونے کا تذکرہ کیا اور وضاحت کی ہے کہ حضرت سالم سے روایت کرنے والے راوی مہدی بن میمون وہ بصری مہدی نہیں، جن کی مرویات صحیحین میں ہیں، یہ کوئی دوسرے ہیں۔ اس حدیث کو محدّثِ عصر علامہ محمد ناصر الدین البانی نے اپنی کتاب ”سلسلة الأحاديث الضعيفة الموضوعة“ میں نقل کر کے اس پر بالتفصیل کلام کیا ہے، جو اس کتاب (۱/ ۱۵۸ تا ۱۶۰) میں دیکھا جا سکتا ہے۔[1]

دوسری حدیث:

اسی موضوع کی ایک دوسری حدیث بھی ہے، جس سے پگڑی اور ٹوپی پہن کر پڑھی جانے والی نماز کی فضیلت بیان کی جاتی ہے، وہ حدیث جسے ”حلية الأولياء“ میں ابونعیم اور انھی کے طریق سے دیلمی نے الفردوس میں روایت کیا ہے، اس میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً مروی ہے:

«رَكْعَتَانِ بِعَمَامَةٍ خَيْرٌ مِنْ سَبْعِيْنَ رَكْعَةً بِلَا عَمَامَةٍ»[2]

”عمامہ باندھ کر پڑھی گئی دو رکعتیں بلا عمامہ پڑھی گئی ستر رکعتوں سے بہتر ہیں۔“

استنادی حیثیت:

اس روایت کو بھی محدّثین کرام نے من گھڑت کہا ہے، کیونکہ اس کی سند کے ایک راوی طارق بن عبدالرحمٰن ہیں، جسے شرح الجامع الصغیر میں علامہ مناوی رحمہ اللہ نے ضعیف ثابت کرتے ہوئے لکھا ہے کہ امام ذہبی رحمہ اللہ سے اپنی کتاب ”الضعفاء“ میں وارد کیا اور کہا ہے:

”لَا يَكَادُ يُعْرَفُ“ (یہ غیر معروف ہے)

پھر اس کے بارے میں امام نسائی رحمہ اللہ کا قول نقل کیا ہے، جس میں وہ فرماتے ہیں:

---

[1] دیکھیں: ضعيف الجامع (۲/ ۳/ ۲۷٦، ۲۷۷)

[2] الضعيفة، رقم الحديث (۱۳۸) ضعيف الجامع، رقم الحديث (۳۵۲۹)

”لَيۡسَ بِقَوِيٍّ“ (یہ قوی نہیں ہے)

امام سخاوی رحمہ اللہ نے اس روایت کے بارے میں ”المقاصد الحسنة“ میں کہا ہے:

”هٰذَا الۡحَدِيۡثُ لَا يَثۡبُتُ“[1] (یہ حدیث ثابت نہیں یعنی صحیح نہیں ہے)

تیسری حدیث:

”سلسلة الأحاديث الضعيفة والموضوعة“ میں اس کے مولف رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ میں نے حافظ ابن رجب حنبلی رحمہ اللہ کے خط سے لکھا ہوئے ان کی شرح ترمذی کے نامکمل مسودے (۲/۸۳) کے ایک حصے کو دیکھا ہے، جس میں انھوں نے لکھا ہے کہ ابوعبداللہ امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ سے ایک نصیبی شیخ محمد بن نعیم کے بارے میں پوچھا گیا اور بتایا گیا کہ اس شیخ نے ”عن سهل عن أبيه عن أبي هريرة رضی اللہ عنہ عن النبي صلی اللہ علیہ وسلم“ کی سند سے یہ حدیث بیان کی ہے:

«صَلَاةٌ بِعَمَامَةٍ أَفۡضَلُ مِنۡ سَبۡعِيۡنَ صَلَاةً بِغَيۡرِ عَمَامَةٍ»

”عمامہ والی ایک نماز بغیر عمامہ سے پڑھی گئی ستر نمازوں سے افضل ہے۔“

استنادی حیثیت:

تو یہ سن کر امام احمد رحمہ اللہ نے اس کے بارے میں فرمایا:

”هٰذَا كَذَّابٌ، هٰذَا بَاطِلٌ“[2]

”یہ (نصیبی شیخ محمد بن نعیم) کذاب یعنی انتہائی جھوٹا اور اس کی بیان کردہ یہ روایت باطل ہے۔“

چوتھی حدیث:

دستار و عمامہ یا پگڑی و ٹوپی کی فضیلت کے بارے میں ایک اور روایت بھی ہے، جس میں ایک دوسرا انداز مروی ہے اور عمامہ پہن کر نماز پڑھنے کو دس ہزار نیکیاں کرنے کے برابر قرار دیا گیا ہے، چنانچہ مسند الفردوس دیلمی کے حوالے سے ”ذيل الأحاديث الموضوعة“ (ص: ۱۱۱) میں امام سیوطی رحمہ اللہ نے یہ روایت وارد کی ہے، جو حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً مروی ہے، اس روایت میں ہے:

---

[1] السلسلة الضعيفة (۱/ ۱۶۰) ضعيف الجامع (۲/ ۳/ ۱۸۸)

[2] السلسلة الضعيفة (۱/ ۱۶۱)

«اَلصَّلَاةُ فِي الْعَمَامَةِ تَعْدِلُ بِعَشْرِ آلَافِ حَسَنَةٍ»[1]

”عمامہ باندھ کر نماز پڑھنا دس ہزار نیکیاں کرنے کے برابر ہے۔“

استنادی حیثیت:

امام سیوطی رحمہ اللہ نے اس روایت کو ”ذیل الأحادیث الموضوعة“ یعنی من گھڑت احادیث کے ضمیمے میں نقل کیا اور اس کی سند کے ایک راوی ابان کو ”متّھم“ لکھا ہے۔ امام ابن عراق نے ”تنزیة الشریعة“ (۲/ ۲۵۷) نامی کتاب میں ان کی متابعت کرتے ہوئے اس راوی کو متہم ہی قرار دیا ہے۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کی پیروی کرتے ہوئے ان کے شاگرد حافظ سخاوی رحمہ اللہ نے اپنی کتاب ”المقاصد الحسنة“ (ص: ۱۲٤) میں اس روایت کے بارے میں کہا ہے:

”إِنَّهُ مَوْضُوعٌ“ (یہ روایت من گھڑت ہے)

ملا علی قاری نے ”الموضوعات“ (ص: ٥١) میں مالکی فقیہ شیخ ضوفی نے اس کے بارے میں لکھا ہے:

”إِنَّهُ حَدِيثٌ بَاطِلٌ“[2] ”یہ روایت باطل ہے۔“

عمامے کی فضیلت کے بارے میں ممکن ہے کچھ اور احادیث بھی ہوں، لہٰذا اس سلسلے میں ایک قاعدہ کلیہ ذہن میں رکھیں جو علامہ ابن قیم رحمہ اللہ کی ایک مختصر مگر نفیس ترین کتاب ”المنار المنيف في الصحيح والضعيف“ کے آخر میں ”كليات في أحاديث غير صحيحة“ کے عنوان کے تحت درج کیا گیا ہے۔ ضعیف احادیث کو پہچاننے کے قواعد و ذرائع کے بیان پر مبنی اس کتاب میں علامہ موصوف نے انتہائی تبحر علمی کا مظاہرہ فرمایا ہے، جو قابلِ مطالعہ ہے۔ یہ چھوٹے سائز کے صرف پونے دوسو صفحات کی کتاب ہے۔ کتاب کے محقق استاذ محمود مہدی استنبولی نے علامہ ابن قیم رحمہ اللہ کے ذکر کردہ ضعیف و موضوع احادیث کی پہچان کے قواعد میں سے ایک یہ بھی لکھا ہے:

”لَا يَصِحُّ فِي الْعِمَامَةِ حَدِيثٌ، وَلٰكِنَّ الرَّسُولَ ﷺ كَانَ يَلْبَسُهَا“[3]

”عمامے کی فضیلت کے بارے میں وارد شدہ احادیث میں سے کوئی بھی صحیح نہیں ہے،

---

[1] السلسلة الضعيفة، رقم الحديث (١٢٩)

[2] السلسلة الضعيفة (١/ ١٦١)

[3] المنار المنيف (ص: ١٦٣)

البتہ نبیِ اکرم ﷺ عمامہ باندھا کرتے تھے۔‘‘

ان روایات کے موضوع و باطل ہونے میں اس لیے تردّد نہیں رہنا چاہیے کہ ان میں عمامہ والی نماز کا ثواب اتنا ہی بتایا گیا ہے، جتنا اکیلے نماز پڑھنے والی کی نسبت باجماعت نماز پڑھنے والے کا ثواب ہے، جبکہ عمامہ باندھنا اور جماعت میں شامل ہونے میں زمین آسمان کا فرق ہے، کیونکہ عمامہ باندھنا زیادہ سے زیادہ مستحب ہے، بلکہ راجح تر بات یہ ہے کہ یہ سنن عادت میں سے ہے، سنن عبادت میں سے نہیں، اگرچہ نبیِ اکرم ﷺ کی اتباع کی نیت سے عادتاً پہننے پر ثواب بھی ہے، مگر نماز باجماعت سے اس کا کیا مقابلہ ہے؟ وہ تو کم از کم سنت مؤکدہ کا درجہ رکھتی ہے، بلکہ بعض اہلِ علم نے تو جماعت کو نماز کا رکن وشرط بنا دیا ہے کہ اس کے بغیر نماز ہی نہیں ہوتی، اگرچہ صحیح و راجح تر مسلک یہ ہے کہ جماعت فرض و واجب ہے، جسے ترک کرنے سے نماز تو ہوجائے گی، لیکن وہ ترکِ جماعت پر سخت گناہگار بھی ہوگا، جس کی تفصیل ہم ذکر کر چکے ہیں۔

ایسے میں یہ کیسے ممکن ہے کہ شارع حکیم وعلیم محض عمامہ باندھ کر پڑھی گئی نماز کے اجر وثواب کو جماعت کے ساتھ پڑھی گئی نماز کے برابر بلکہ اس سے بھی زیادہ کر دے، جیسا کہ ان روایات میں وارد ہوا ہے۔ غالباً حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے اسی کے پیشِ نظر اس روایت کو من گھڑت قرار دیا ہے۔[1]

ان باطل روایات کے اثرات:

ان ضعیف و باطل، نا قابلِ حجت اور نا قابلِ اعتبار روایات ہی کا نتیجہ ہے کہ آج ہمارے بعض بھائیوں نے خصوصاً پاک و ہند میں ٹوپی یا عمامے کو وہ مقام دے دیا ہے کہ قمیص کا کالر تک اٹھا کر سر پر رکھ لیتے ہیں، کوئی ننگے سر نماز پڑھ رہا ہو تو اسے کھا جانے والی نظروں سے گھورا جاتا ہے، یا پھر کوئی نہ کوئی از راہِ کرم بوسیدہ ٹوپی اس کے سر پر رکھ دیتے ہیں، جسے قطعاً زینت کا باعث قرار نہیں دیا جاسکتا۔ بلکہ ہماری مسجد میں دستیاب ہونے والی ٹوپیاں زینت تو کجا اُلٹا بدصورتی، بد ذوقی اور سوءِ منظر کا سبب بنتی ہیں۔

اول تو ان روایات کی حیثیت معلوم ہونے سے پتا چل گیا کہ ٹوپی یا عمامہ اور پگڑی و دستار کی کوئی فضیلت ثابت نہیں اور اگر نبیِ اکرم ﷺ کے دستار و عمامہ باندھنے کے عمل سے اس کی فضیلت

[1] دیکھیں: السلسلة الضعيفة (١/ ١٦١)

مان بھی لی جائے تو پھر ضروری ہے کہ ایسی دستار و عمامہ یا ٹوپی و پگڑی نماز کے لیے استعمال کی جائے، جسے دورِ حاضر میں واقعی زینت و عزت اور رعب و وقار کی علامت سمجھا جاتا ہے اور صرف نماز کے لیے ہی نہیں، عام حالات میں اِدھر اُدھر نکلنے یا کسی کے ہاں مہمان جانے کے لیے استعمال کیا جاتا ہو۔

محض سر کو ڈھکنا اور وہ بھی ایسی ٹوپیوں سے جنھیں اگر آپ سے کہا جائے کہ سر پر پہن کر بازار کا چکر لگا لو یا کسی عزیز رشتے دار کے یہاں سے ہو آؤ تو اسے پہن کر جانے میں آپ شرم محسوس کریں، تو پھر کیا اللہ کی ذات اور اس کے گھر ہی (نعوذ باللہ) ایسے غیر اہم مقامات ہیں، جس کے یہاں آپ ایسی مانگے کی ٹوپیاں اور وہ بھی ٹوٹی پھوٹی اور میلی کچیلی ٹوپیاں پہن کر کھڑے ہو جاتے ہیں؟!

اِدھر نماز سے فارغ ہوئے اور ٹوپی اتاری اور صفوں کی آخری دیوار کے پاس پھینک دی، یا پھر اسے تہہ کر کے جیب میں محبوس کر دیا۔ یاد رکھیں کہ دستار و عمامہ مسلمان کی شان اور اس کا امتیاز ہے، جو نماز کی نسبت نماز سے باہر عام حالات میں زیادہ ضروری ہے، تاکہ مسلمان کی پہچان ہو سکے اور وہ دستار و عمامہ جو امتیاز کے طور پر عام حالات میں پہنا جائے، وہی نماز میں بھی پہنا جانا چاہیے۔

ان ٹوپیوں کو رواج دینے کے نتیجے ہی میں اللہ کے گھروں کو اس طرح بھی ''غیر اہم'' بنایا جاتا ہے کہ انھیں اپنی ''سخاوت'' کا مرکز بناتے ہوئے ٹوپیاں خرید کر اس میں رکھی جاتی ہیں، جو تھوڑے ہی عرصے میں تیل اور میل سے اَٹ جاتی ہیں اور جا بجا سے پھٹ جاتی ہیں، مگر مسجد سے ہٹائے جانے کا تصور بھی نہیں کیا جاتا، اسی طرح مسجد کو بلا وجہ ایک خیراتی ادارے کا سا رنگ دے دیا جاتا ہے، جو بہر حال اللہ کے گھروں کے شایانِ شان ہرگز نہیں ہے، بلکہ یہ ان کے مقام اور تقدس کو مجروح کرنے کا ذریعہ ہے۔

ننگے سر نماز کا جواز

فضیلت والی روایات کی استنادی حیثیت اور ان کے نتائج و اثرات کے بعد اب آیئے ننگے سر نماز کا حکم بھی معلوم کریں کہ آیا اس طرح نماز ہو جاتی ہے یا نہیں؟

اس سلسلے میں برِ صغیر میں مسلمانوں کے دو بڑے مکتبِ فکر ہیں، ایک احناف اور دوسرے اہلِ حدیث احناف کی شاخیں ہیں۔ ان میں ایک دیوبندی احناف ہیں اور دوسرے ہیں بریلوی احناف۔ اس طرح ہمارے سامنے تین بڑے مکتبِ فکر آتے ہیں۔ لہٰذا آیئے! ان تینوں کے نزدیک ننگے سر نماز کی

شرعی حیثیت دیکھیں، چنانچہ ان تینوں میں سے غالب اکثریت بریلوی حضرات کی ہے، لہٰذا پہلے بریلوی موقف دیکھیں۔

① بریلوی موقف:

بریلوی موقف کو معلوم کرنے کے لیے جب اس مکتبِ فکر کے بانی احمد رضا خاں کی تصریحات کا مطالعہ کرتے ہیں تو پتا چلتا ہے کہ وہ اپنی کتاب ''احکامِ شریعت'' (حصہ اول مسئلہ نمبر ۵۴) میں لکھتے ہیں:

''اگر بہ نیتِ عاجزی ننگے سر (نماز) پڑھتے ہیں تو کوئی حرج نہیں۔''[1]

اسی کتاب ''احکامِ شریعت'' (حصہ دو مسئلہ نمبر: ۳۹) کے جز ''ب'' میں وہ لکھتے ہیں:

''اگر نماز کے دوران ٹوپی سر سے گر جائے تو اٹھا لینی چاہیے، یہی افضل ہے، جبکہ بار بار نہ گرے اور تذلل و انکساری کی نیت سے سر برہنہ رہنا چاہے تو (گری ہوئی ٹوپی) نہ اٹھانی چاہیے۔''

بریلوی مکتبِ فکر کی دوسری کتاب ''عرفانِ شریعت'' (حصہ اول مسئلہ: ۷) میں لکھا ہے:

''اگر مقتدی عمامہ باندھے ہوں اور امام کے سر پر عمامہ نہ ہو تو نماز بلا تکلف درست ہوگی۔''

لیجیے! بریلوی موقف خود اس مکتبِ فکر کے بانی و سرخیل کے اپنے اقوال و فتاویٰ کی روشنی میں واضح ہوگیا کہ ان کے علما کے نزدیک ننگے سر نماز ہوجاتی ہے اور یہ الگ بات ہے کہ سب سے زیادہ اسی مکتبِ فکر کے لوگ ننگے سر نماز پڑھنے والوں پر گرجتے اور برستے ہیں۔

② دیوبندی موقف:

احناف میں بریلوی مکتبِ فکر کے بعد دوسرا مکتبِ فکر دیوبندی ہے اور ان کی متداول کتب میں بھی ننگے سر نماز کو جائز لکھا گیا ہے، مثلاً امام طحاوی رحمہ اللہ کی کتاب "شرح معاني الآثار" (۱/ ۲۳٤) میں مذکور ہے:

''مردوں کے لیے صرف ایک ہی کپڑے میں نماز جائز ہے۔''

نیز لکھا ہے کہ امام ابوحنیفہ، ابو یوسف اور محمد رحمہم اللہ کا بھی یہی قول ہے۔

---

[1] احناف کے دونوں مکاتبِ فکر (بریلوی و دیوبندی) کے یہاں جو ''بہ نیتِ عاجزی اور تذلّل و انکسار'' اس کو مستحسن و افضل اور بلا کراہت جائز کہا گیا ہے، اس نظریے کا بھی ہم آگے چل کر جائزہ لیں گے۔ ان شاء اللہ

ظاہر ہے کہ جب ایک کپڑے میں نماز کو جائز قرار دیا گیا ہے تو یقیناً اس میں سر کو ڈھانپنا شامل نہیں ہوسکتا، جو ننگے سر نماز کے جواز کی دلیل ہوسکتی ہے۔

فقہ السنہ میں سید سابق نے لکھا ہے:

''حنفیہ کے نزدیک ننگے سر نماز پڑھنے میں کوئی حرج نہیں اور اگر یہ ننگے سر نماز پڑھنا خشوع کے لیے ہوتو یہ ان کے نزدیک مستحب ہے۔''[1]

مغل بادشاہ اورنگ زیب عالمگیر کے زمانے میں پانچ سو علماے احناف کی مرتب کی ہوئی کتاب فتاویٰ عالمگیری میں فقہ حنفی کی کتاب ''الذخیرہ'' سے نقل کرتے ہوئے لکھا گیا ہے:

''يُكْرَهُ الصَّلَاةُ حَاسِرًا رَأْسَهُ إِذَا كَانَ يَجِدُ الْعِمَامَةَ وَقَدْ فَعَلَ ذٰلِكَ تَكَاسُلًا وَتَهَاوُنًا، وَلَا بَأْسَ بِهِ إِذَا فَعَلَهُ تَذَلُّلًا وَخُشُوعًا، بَلْ هُوَ حَسَنٌ، كَذَا فِي الذَّخِيرَةِ''

''ننگے سر نماز پڑھنا مکروہ ہے، جبکہ اس کے پاس عمامہ بھی موجود ہو اور اس نے سستی کرتے ہوئے اور عمامہ کو اہمیت نہ دیتے ہوئے ننگے سر نماز پڑھی ہو اور اگر وہ خشوع وخضوع کے لیے ننگے سر نماز پڑھے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں بلکہ یہ زیادہ بہتر ہے۔ کتاب الذخیرہ میں ایسے ہی لکھا ہے۔''

ایسے ہی فقہ حنفی کی معروف کتاب شرح وقایہ میں مکروہاتِ نماز کے ضمن میں لکھا ہے:

''وَصَلَاتُهُ حَاسِراً رَأْسَهُ لِلتَّكَاسُلِ أَوْ لِلتَّهَاوُنِ بِهَا، لَا لِلتَّذَلُّلِ''

''سستی کی وجہ سے یا عمامہ سے بے پروائی کی وجہ سے ننگے سر نماز پڑھنا تو مکروہ ہے، لیکن تذلل وانکساری کے لیے ایسا کیا جائے تو پھر مکروہ نہیں ہے۔''

شرح وقایہ کے حاشیے ''عمدة الرعاية'' میں مولانا عبدالحی حنفی رحمہ اللہ ''للتذلل'' کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''لَا لِلتَّذَلُّلِ أَيْ لِقَصْدِ التَّذَلُّلِ وَإِظْهَارِ الْخُشُوعِ، لَا لِلتَّذَلُّلِ، فَإِنَّ الْخُشُوعَ فِي الصَّلَاةِ أَمْرٌ مُّسْتَحْسَنٌ وَهُوَ وَإِنْ كَانَ مِنْ أَفْعَالِ الْقَلْبِ لٰكِنْ لَا بَأْسَ بِإِظْهَارِ آثَارِهِ فِي الظَّاهِرِ''

یعنی اگر ننگے سر نماز پڑھنا تذلل وانکساری کے لیے ہوتو مکروہ نہیں، ان الفاظ ''تذلل کے

[1] فقه السنة (١/ ١٢٨)

لیے نہیں'' سے مراد یہ ہے کہ جب تذلل اور خشوع کا اظہار کرنا مقصود ہو (تب مکروہ نہیں) کیونکہ نماز میں خشوع ایک اچھا فعل ہے۔ یہ خشوع اگرچہ دل کے افعال سے ہے، لیکن اس کے آثار و علامات کو ظاہر کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔

ایسے ہی دیوبندی مکتبِ فکر کے علما کی کتب میں سے ''احسن الفتاویٰ'' اور ''شرح التنویر'' میں بھی ننگے سر نماز کو جائز و درست قرار دیا گیا ہے، جنھیں ہمارے بھائی یا تو پڑھتے نہیں اور اگر پڑھتے ہیں تو بھول جاتے ہیں، یا پھر تجاہلِ عارفانہ سے کام لیتے ہیں۔ وجہ چاہے کچھ بھی ہو، ہمیں اس سے کوئی غرض نہیں، البتہ اپنی ذمے داری سے سبکدوش ہونے کے لیے ان کتابوں کے متعلقہ اقتباسات اور ایک دیوبندی عالم مولانا لدھیانوی کا فتویٰ بھی آپ کے گوش گزار کیے دیتے ہیں۔

ایک فتویٰ:

دیوبندی مکتبِ فکر ہی کے ایک عالم مولانا لدھیانوی کا ایک فتویٰ روزنامہ ''جنگ لاہور'' (بابت ۳۰/ اکتوبر ۱۹۸۶ء) میں شائع ہوا تھا، جس میں انھوں نے مساجد میں پائی جانے والی چٹائی وغیرہ کی ٹوپیوں کی قباحتوں کے تذکرے کے ساتھ ساتھ ننگے سر نماز کے جواز کا فتویٰ جاری کیا تھا، جس کا خلاصہ یہ ہے:

پہلی بات:

چٹائی کی ٹوپیاں پہننے والوں کی نماز نہیں ہوتی اور ایسی ٹوپیاں مسجد میں رکھنا جائز ہی نہیں ہے۔ آگے اس کی وجوہات بیان کی ہیں، جن میں سے مختصراً ایک جگہ یہ ہے کہ ان ٹوپیوں سے مسجد کا احترام مجروح ہوتا ہے۔

دوسری بات:

ٹوپیوں پر میل کی تہہ اور پسینے کی بدبو خلافِ زینت اور ناگوار ہوتی ہے۔

تیسری بات:

ٹوپیوں کو مسجد میں رکھنے کے عدمِ جواز کی ایک اور دلیل موصوف نے یہ بھی ذکر کی ہے کہ ان ٹوپیوں کے مسجد میں رکھنے کی وجہ سے لوگ مسجد کو عبادت گاہ کے بجائے خیراتی اور رفاہی ادارہ سمجھنے لگتے ہیں، جو مسجد کے مقاصد کے خلاف ہے اور اس سے مسجد کی توہین ہوتی ہے۔

چوتھی بات:

مفتی صاحب موصوف نے فتوے میں احسن الفتاویٰ کے حوالے سے "شرح التنویر"، کی وہ عبارت بھی نقل کی ہے جو "مکروھات الصلاۃ"، کے ضمن میں ہے، جس میں کہا گیا ہے:

"وَصَلَاتُہٗ حَاسِراً أَیْ کَاشِفاً رَأْسَہٗ لِلتَّکَاسُلِ، وَلَا بَأْسَ بِہٖ لِلتَّذَلُّلِ"

"سستی کی وجہ سے ننگے سر نماز پڑھنا مکروہ ہے اور انکساری کی نیت سے ہو تو پھر کوئی حرج نہیں۔"

اس اقتباس کو نقل کر کے اس کے آخری الفاظ "وَلَا بَأْسَ بِہٖ لِلتَّذَلُّلِ" سے نتیجہ اخذ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"اس عبارت سے معلوم ہوا کہ بلا تکاسل (یعنی سستی) برہنہ (ننگے) سر نماز پڑھنے میں بھی کوئی کراہت نہیں ہے۔"

یہ ایک دیوبندی عالم اور معروف مفتی کا فتویٰ ہے، جس میں انھوں نے عقلی ونقلی دلائل کے ساتھ ننگے سر نماز کے جواز اور مساجد میں ان ٹوپیوں کے رکھنے کے عدمِ جواز کی صراحت کی ہے۔[1]

اس فتوے پر ایک دوسرے دیوبندی عالم مولانا سرفراز خاں صفدر گکھڑوی کا تعاقب بھی روزنامہ "جنگ" لاہور (۲ نومبر ۱۹۸۶ء) کی اشاعت میں شائع ہوا، جس میں انھوں نے اپنے تمام پیش رو ائمہ و علما کے فتاویٰ و تصریحات کے برعکس عوام الناس کے مروجہ رویے کے پیش نظر اور شائد ان کی تائید حاصل کرنے کے لیے ٹوپی کو لازم قرار دے دیا، مگر کوئی واضح دلیل نہیں دے پائے اور کسی بلا دلیل دعوے کے باطل ہونے کا اصول معروف ہے۔

اہلحدیث موقف:

اب تیسرا مکتبِ فکر اہلحدیث حضرات کا ہے، جن کے نزدیک ننگے سر نماز تو ہوجاتی ہے، خصوصاً جب یہ ضرورتاً بھی ہو، لیکن محض سستی اور بے پروائی کی بنا پر ننگے سر نماز پڑھنے کو فیشن ہی بنا لینا اسے وہ بھی پسند نہیں کرتے، بلکہ تمام احناف کی طرح اس صورت کو وہ بھی غیر مستحسن یا مکروہ و ناپسندیدہ قرار دیتے ہیں۔ چنانچہ

[1] دیکھیں: مجلّہ "جامعہ ابراہیمیہ" سیالکوٹ (شمارہ نمبر ۱۴، دسمبر ۱۹۸۷ء) اداریہ از پروفیسر میاں محمد یوسف صاحب سجاد۔

''اہلحدیث'' سوہدرہ:

اس سلسلے میں ایک مختصر فتویٰ مجلّہ ''اہلحدیث'' سوہدرہ (جو گوجرانوالہ پاکستان کے ایک قریبی چھوٹے سے مگر معروف علمی گاؤں سوہدرہ سے شائع ہوتا تھا) کی جلد (۱۵) شمارہ (۲۲) میں شائع ہوا تھا، جس میں مفتیِ مجلّہ نے لکھا تھا:

''ننگے سر نماز ہوجاتی ہے، صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم سے جواز ملتا ہے، مگر بطورِ فیشن بے پروائی اور تعصّب کی بنا پر مستقل اور ہمیشہ کے لیے یہ عادت بنا لینا، جیسا کہ آج کل دھڑلے سے کیا جا رہا ہے، ہمارے نزدیک صحیح نہیں، کیوں کہ نبی علیہ السلام نے خود یہ عمل نہیں کیا۔''[1]

مولانا سید محمد داود غزنوی رحمہ اللہ:

اسی سلسلے میں اہل حدیث کے ممتاز عالمِ دین مولانا سید محمد داود غزنوی رحمہ اللہ سے جب پوچھا گیا کہ بدن پر کپڑے ہوتے ہوئے سر پر سے ٹوپی یا پگڑی اتار کر رکھ دینی اور کوئی عذر بھی نہ ہو اور ہمیشہ اسی طرح ہی نماز پڑھنا، اگرچہ فرض نماز با جماعت مسجد میں ہو، اس کے لیے شرعاً کیا حکم ہے؟ کیا اس طرح نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم یا صحابہ رضی اللہ عنہم سے ثبوت ملتا ہے؟ اور ننگے سر نماز پڑھنی افضل ہے یا سر ڈھانک کر؟ اور ساتھ ہی دلائل کا مطالبہ کیا گیا تو موصوف رحمہ اللہ نے ۲۹/ جمادی الاولیٰ ۱۳۷۹ھ کو جو فتویٰ صادر فرمایا، جسے انھوں نے اپنے والد بزرگوار کی طرف منسوب کیا ہے، وہ لاہور سے شائع ہونے والے ہفت روزہ ''الاعتصام'' (جلد ۱۱، شمارہ: ۱۸) میں نشر ہوا۔ وہ فتویٰ قدرے طویل ہے، اس لیے اس کا حتی الامکان مفید خلاصہ پیش کیے دیتے ہیں، موصوف لکھتے ہیں:

''سر اعضاے ستر میں سے نہیں، لیکن نماز میں سر ننگا رکھنے کے مسئلے کو اس لحاظ سے نہیں بلکہ آدابِ نماز کے لحاظ سے دیکھنا چاہیے۔'' پھر آگے کندھوں کو ڈھانکنے پر دلالت کرنی والی صحیح بخاری اور موطا امام مالک کی روایات اور موطا کی شرح زرقانی (وتمہید) ابن عبدالبر، صحیح بخاری کی شرح فتح الباری، ایسے ہی شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کی کتاب ''الاختیارات'' اور امام ابن قدامہ کی ''المغنی'' سے تصریحات و اقتباسات نقل کر کے ثابت کیا ہے کہ کندھے بھی اگرچہ اعضاے ستر میں سے نہیں ہیں، اس کے باوجود نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم

[1] دیکھیں: فتاویٰ علماے حدیث (۴/ ۲۸۱)

نے ایک کپڑا ہونے کی شکل میں ننگے کندھوں سے نماز پڑھنے سے منع فرمایا ہے، اسی طرح سر بھی اگرچہ اعضائے ستر میں سے نہ سہی، لیکن آدابِ نماز میں سے یہ بھی ایک ادب ہے کہ بلا وجہ ننگے سر نماز نہ پڑھی جائے اور اسے زینت کا تقاضا بھی قرار دیا ہے۔

آگے لکھا ہے:

''ابتدائے عہدِ اسلام کو چھوڑ کر جبکہ کپڑوں کی قلت تھی، اس کے بعد اس عاجز کی نظر سے کوئی ایسی روایت نہیں گزری، جس میں صراحتاً یہ مذکور ہو کہ نبیِ اکرم ﷺ نے یا صحابہ نے مسجد اور وہ بھی نماز باجماعت میں ننگے سر نماز پڑھی ہو، چہ جائیکہ معمول ہی بنا لیا جائے۔ اس لیے اس رسم کو جو پھیل رہی ہے، بند کرنا چاہیے، اگر فیشن کی وجہ سے ننگے سر نماز پڑھی جائے تو نماز مکروہ ہوگی، اگر تعبّد اور خضوع اور خشوع و عاجزی کے خیال سے (ننگے سر) پڑھی جائے تو یہ نصاریٰ کے ساتھ تشبُّہ ہوگا۔ اسلام میں ننگے سر رہنا سوائے احرام کے، تعبّد یا خشوع وخضوع کی علامت نہیں اور اگر کسل اور سستی کی وجہ سے ہے تو یہ منافقین کی ایک خصلت سے متشابہ ہوگا۔''

﴿وَ لَا يَأْتُوْنَ الصَّلٰوةَ اِلَّا وَ هُمْ كُسَالٰى﴾ [التوبة: ٥٤]

''نماز کو آتے ہیں تو سست اور کاہل ہو کر۔''

غرض ہر لحاظ سے یہ ناپسندیدہ عمل ہے۔[1]

گویا موصوف کے نزدیک اگرچہ سر اعضائے ستر میں سے نہیں کہ اس کا ڈھانپنا واجب ہو، البتہ آدابِ نماز کا تقاضا یہ ہے کہ اسے ڈھانپا جائے اور ننگے سر نماز کو عادت بنا لینا پسندیدہ نہیں۔

موصوف کا فتویٰ تو پورا ہی قابلِ مطالعہ تھا، مگر ہم نے خلاصے پر ہی کفایت کی ہے، شائقین اسے ''الاعتصام'' کے مذکورہ شمارے میں یا پھر فتاویٰ علمائے حدیث (۴/ ۲۹۰، ۲۹۱) میں دیکھ سکتے ہیں۔

شیخ الحدیث مولانا محمد اسماعیل سلفی رحمہ اللہ:

ننگے سر نماز کے سلسلے میں ہم نے اہلحدیث موقف کا تذکرہ شروع کیا ہے، جس کے ضمن میں ہم نے دو فتوے بھی ذکر کیے ہیں، جبکہ یہی استفتا ایک معروف اہل حدیث عالم شیخ الحدیث مولانا

[1] دیکھیں: فتاویٰ علمائے حدیث (۴/ ۲۹۰، ۲۹۱)

محمد اسماعیل سلفی آف گوجرانوالہ کی خدمت میں بھی پیش کیا گیا تھا، جس پر موصوف نے بڑا تفصیلی جواب یا فتویٰ صادر کیا تھا۔ جسے ہفت روزہ ''الاعتصام'' نے اپنی اسی اشاعت میں نشر کیا تھا، جس میں مولانا غزنوی والا قدرے مفصّل مگر اس سے نسبتاً مختصر فتویٰ نشر کیا تھا۔

مولانا محمد اسماعیل رحمہ اللہ کا یہ فتویٰ بھی کافی مفصّل و مدلّل ہے، جو ''فتاویٰ علماے حدیث'' کے چار صفحات پر مشتمل ہے۔ موصوف رحمہ اللہ نے پہلے لکھا ہے کہ اس سوال پر تین وجوہ سے غور کیا جا سکتا ہے:

1. مطلق جواز اور اباحت کے لحاظ سے۔
2. افضلیت یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے عام عمل کے لحاظ سے۔
3. حرمت اور عدمِ جواز کے لحاظ سے۔

پھر انھوں نے نماز میں سترِ مغلّظ (شرمگاہ) کو ڈھانپنے کے دلائل ذکر کیے ہیں اور ذکر کیا ہے کہ اعضاے ستر کو ویسے بھی ننگا رکھنا درست نہیں، نماز میں تو قطعاً حرام و ناجائز ہوگا۔

یہ تو ہوا سترِ مغلّظ کے سلسلے میں، جبکہ:

''سر چونکہ بالاتفاق اعضاے ستر میں سے نہیں، اس لیے اگر کسی وقت ننگے سر نماز پڑھی جائے تو نماز بالاتفاق صحیح ہوگی۔ اس کے لیے نہ بحث کی ضرورت ہے، نہ احادیث کی ٹٹول کی ضرورت، جس طرح کوئی پنڈلی، پیٹ، پشت وغیرہ اعضا ننگے ہوں تو نماز جائز ہے، ننگے سر بھی نماز درست ہے، لیکن اسے عادت نہیں بنانا چاہیے۔

''امام اگر نماز کے بعد پاؤں آسمان (یا قبلہ) کی طرف کرے یا مقتدی کوئی ایسی حرکت کریں، تو حدیث میں اس سے رکاوٹ ثابت نہیں ہوگی، لیکن عقلمند ایسا کرنے سے پرہیز کرے گا، ننگے سر کی عادت بھی تقریباً اسی نوعیت کی ہے، جواز کے باوجود ایسی عادات عقل وفہم کے خلاف ہیں۔ عقل مند اور متدیّن آدمی کو اس سے پرہیز کرنا چاہیے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور اہلِ علم کا طریق وہی ہے جو اب تک مساجد میں متوارث اور معمول بہا ہے۔ کوئی مرفوع صحیح حدیث میری نظر سے نہیں گزری، جس سے اس (ننگے سر نماز کی) عادت کا جواز ثابت ہوتا ہو، خصوصاً باجماعت فرائض میں بلکہ عادتِ مبارکہ یہی تھی کہ پورے لباس سے نماز ادا فرماتے تھے۔''

امام بخاری کے "بَابُ وُجُوبِ الصَّلَاةِ فِي الثِّيَابِ وَقَوْلُ اللّٰهِ تَعَالىٰ ﴿خُذُوْا زِيْنَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ﴾ [الأعراف:٣١] وَمَنْ صَلّٰى مُلْتَحِفًا فِي ثَوْبٍ وَّاحِدٍ" الخ نقل کرنے کے بعد لکھا ہے:

"امام بخاری رحمہ اللہ کا مطلب یہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ زینت کا مطلب یہ سمجھتے ہیں کہ اعضائے ستر ڈھانپنے کے علاوہ اچھے کپڑوں میں نماز ادا کی جائے۔ عام ذہن کے لوگوں کو اس قسم کی احادیث سے غلطی لگی ہے کہ ایک کپڑے میں نماز ادا کی جائے تو سر ننگا رہے گا، حالانکہ ایک کپڑے کو اگر پوری طرح لپیٹا جائے تو سر ڈھکا جا سکتا ہے۔ پھر صحیحین وسنن کی متعدد احادیث کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ کسی میں سر ننگا رکھنے کا ذکر نہیں، خصوصاً جس میں عادت اور کثرتِ عمل ثابت ہو۔

پھر احادیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ صورت یا تو صرف اظہارِ جواز کے لیے ہے یا کپڑوں کی کمیابی کی وجہ سے۔ ان حالات سے جواز یا اباحت تو ثابت ہوسکتی ہے، سنت یا استحباب ظاہر نہیں ہوتا۔"

اسی طرح حضرت عمرِ فاروق رضی اللہ عنہ والا وہ اثر جو ہم ذکر کر چکے ہیں، جس میں مختلف کپڑوں کا ذکر آیا ہے۔ پھر اسے نقل کر کے لکھتے ہیں:

"اس سے کپڑوں کی قلت اور عدمِ استطاعت صراحتاً سمجھ میں آتی ہے اور یہ بھی ظاہر ہے کہ اگر پورے کپڑے میسر ہوسکیں اور کوئی مانع نہ ہو تو تکلف سے مسکنت کا اظہار نہیں کرنا چاہیے۔"

آگے فتح الباری سے ایک سے زیادہ کپڑوں میں نماز مستحسن ہونے اور صاحبِ استطاعت کے لیے اس کے واجب و افضل ہونے اور صرف ایک کپڑے میں نماز کو تنگ حالی پر محمول کرنے کا پتا دینے والی تصریحات نقل کرنے کے بعد لکھا ہے:

"غرض کسی حدیث سے بھی بلا عذر ننگے سر نماز کو عادت اختیار کرنا ثابت نہیں، محض بے عملی یا بدعملی کی وجہ سے یہ رواج بڑھ رہا ہے، بلکہ جہلا تو اسے سنت سمجھنے لگے ہیں۔" العیاذ باللہ

نماز کے لیے ایک کے بجائے دو کپڑے پہننے اور ان سے زینت اختیار کرنے والی بعض

روایات و آثار کو نقل کرتے ہوئے انھیں موید تزیّن و تجمّل قرار دیا ہے۔عمدۃ القاری شرح صحیح بخاری میں حافظ عینی نے مختلف مذاہب کے تذکرہ میں جو تفصیل بیان کی ہے، اس کا خلاصہ موصوف نے یہ ذکر کیا ہے:

''نماز ایک کپڑے میں درست ہے، لیکن جب وسعت ہو اور کپڑے میسر ہوں تو پھر صرف ایک پر اقتصار و اکتفا مستحسن نہیں۔''

ایسے ہی مغنی ابن قدامہ سے بعض آثار و اقوال نقل کرنے کے بعد موصوف فرماتے ہیں:

''ان تمام گزارشات سے مقصد یہ ہے کہ سر ننگا رکھنے کی عادت اور بلاوجہ ایسا کرنا اچھا فعل نہیں، یہ فعل فیشن کے طور پر روز بروز بڑھ رہا ہے اور یہ بھی نامناسب ہے۔''

آگے چل کر اپنے اس جواب یا فتوے کے آخر میں مولانا محمد اسماعیل سلفی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

''ویسے یہ مسئلہ کتابوں سے زیادہ عقل و فراست سے متعلق ہے، اگر اس جنسِ لطیف سے طبیعت محروم نہ ہو تو ننگے سر نماز ویسے ہی مکروہ معلوم ہوتی ہے، ضرورت اور اضطرار کا باب اس سے الگ ہے۔''[1]

اس فتوے میں موصوف نے ایک اثر کی بات بھی کی ہے، جس سے ننگے سر نماز کے جواز پر استدلال کیا جا سکتا ہے، جسے ہم بعد میں ذکر کریں گے۔ ان شاء اللہ

یہ تو اس تفصیلی فتوے کا اختصار ہے، جسے پوری تفصیل مطلوب ہو، وہ ''الاعتصام'' کا مذکورہ شمارہ یا مولانا علی محمد سعیدی رحمہ اللہ کے مرتب کردہ ''فتاویٰ علماے حدیث'' (۴/ ۲۸۶ تا ۲۸۹) دیکھ لے۔

خلاصۂ کلام:

اہلِ حدیث علما کے تین فتوے ہم نے آپ کے سامنے رکھ دیے ہیں، جن میں سے بعض میں احناف کی طرح ہی بلا وجہ ننگے سر نماز پڑھنے کو مکروہ و ناپسندیدہ قرار دیا ہے اور فیشن کے طور پر ایسے کرنے والوں کو اور بھی بُرا سمجھا ہے، ہاں بوقتِ ضرورت ایسا کر لینے کے جواز و اباحت سے انھیں بھی انکار نہیں ہے، بلکہ صحیح بات پوچھیں تو مولانا سید محمد داود غزنوی اور شیخ الحدیث مولانا محمد اسماعیل سلفی رحمہما اللہ کے دونوں فتووں پر بعض ملاحظات و مؤاخذات ممکن ہیں، لیکن ہم اس سے قطع نظر کرتے ہوئے ان

[1] مختصر از فتاویٰ علماے حدیث (۴/ ۲۸۶۔ ۲۸۹)

کے مفصل فتوؤں کے اس نچوڑ سے پوری طرح اتفاق کرتے ہیں، جو دوسرے لفظوں میں مجلّہ اہلحدیث سوہدرہ کا مختصر فتویٰ بن جاتا ہے، جس میں کہا گیا ہے کہ ننگے سر نماز ہوجاتی ہے، لیکن بطورِ فیشن و بے پروائی اور تعصّب کی بنا پر اسے مستقل اور ابد الآباد تک کے لیے عادت بنا لینا صحیح نہیں ہے۔

ننگے سر نماز کے جواز و عدمِ جواز کے سلسلے میں بریلوی، دیوبندی اور پھر اہل حدیث علما کی تصریحات وفتاویٰ ذکر کیے جا چکے ہیں، جن کا تعلق برصغیر پاک و ہند سے ہے، اب مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں عالمِ عرب کے دو ممتاز علما کے خیالات بھی پیش کر دیے جائیں۔

فقہ السنۃ سید سابق:

نہ صرف عرب ممالک بلکہ عالمِ اسلام میں جانی پہچانی کتاب ''فقه السنة'' کے مولف سید سابق رحمہ اللہ نے اپنی اس شہرۂ آفاق کتاب میں ''كَشْفُ الرَّأْسِ فِي الصَّلَاةِ'' کے تحت ننگے سر نماز کا حکم بیان کیا ہے، جس کے ضمن میں لکھا ہے کہ ابن عساکر نے (تاریخ دمشق میں) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت بیان کی ہے:

«إِنَّ النَّبِيَّ ﷺ كَانَ رُبَمَا نَزَعَ قَلَنْسُوَتَهٗ فَجَعَلَهَا سُتْرَةً بَيْنَ يَدَيْهِ»

''بعض دفعہ نبیِ اکرم ﷺ اپنے سرِ اقدس سے ٹوپی اتار لیتے اور اسے اپنے سامنے بطورِ سترہ رکھ لیتے تھے۔''[1]

پھر احناف سے نقل کیا ہے کہ ان کے نزدیک آدمی کے ننگے سر نماز پڑھنے میں کوئی حرج نہیں اور اگر یہ فعل خشوع کے لیے ہو تو یہ ان کے نزدیک مستحب ہے اور نماز میں سر کو ڈھانپنے کی افضلیت پر دلالت کرنے والی کوئی دلیل وارد نہیں ہوئی۔[2]

گویا سید سابق کے نزدیک ننگے سر نماز پڑھنے میں کوئی حرج نہیں، جسے انھوں نے ابن عساکر کی روایت سے ثابت کیا ہے، بلکہ خشوع کی نیت سے ہو تو مستحب ہے، جیسا کہ انھوں نے احناف سے نقل کر کے اسے برقرار رکھا ہے اور سر کو ڈھانپ کر نماز پڑھنے کی افضلیت پر دلالت کرنے والی کوئی دلیل نہیں ہے۔

---

[1] اس حدیث کی استنادی حیثیت اور اس کے ضُعف کا بیان آگے آرہا ہے۔

[2] فقه السنة (۱/ ۱۲۸)

مواخذات و اعتراضات:

موصوف کے اس اقتباس میں تین باتیں کہی گئی ہیں اور ان تینوں پر ہی مؤاخذات و اعتراضات وارد ہوئے ہیں۔ مثلاً:

1. یہ جو کہا گیا ہے کہ اگر خشوع کی نیت سے ننگے سر نماز پڑھی جائے تو یہ مستحب ہے، جیسا کہ فقہ السنۃ کے علاوہ خود فقہ حنفی کی کتب سے بھی ہم ذکر کر آئے ہیں۔ اس استحباب کی کوئی دلیل نہیں ہے، بلکہ اس کے برعکس مولانا محمد داود غزنوی رحمہ اللہ کے فتوے میں ہم ذکر کر آئے ہیں کہ انھوں نے ۲۹/ جمادی الاولیٰ ۱۳۷۹ھ میں جو فتویٰ صادر فرمایا تھا، جسے انھوں نے اپنے زمانہ طالب علمی میں اپنے والدِ گرامی مولانا سید عبدالجبار غزنوی رحمہ اللہ سے سنا تھا، جو اس وقتِ تحریر سے بھی دس سال پہلے کی بات ہوگی، اس میں انھوں نے کہا تھا:

"اگر تعبّد اور عاجزی اور خشوع و خضوع کے خیال سے (ننگے سر نماز پڑھی جائے تو یہ نصاریٰ کے ساتھ تشبہ ہوگا، اسلام میں ننگے سر رہنا (سوائے احرام کے) تعبّد یا خشوع و خضوع کی علامت نہیں۔"[1]

شیخ الحدیث مولانا محمد اسماعیل صاحب رحمہ اللہ نے بخاری شریف سے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی مختلف کپڑوں کے ناموں والا حضرت عمرِ فاروق رضی اللہ عنہ کا ایک اثر نقل کر کے اس سے یہ بھی نتیجہ اخذ کیا ہے:

"اگر پورے کپڑے میسر ہوسکیں اور کوئی مانع نہ ہو تو تکلف سے مسکنت (وخشوع) کا اظہار نہیں کرنا چاہیے۔"[2]

اسی سلسلے میں فقہ السنۃ کی تحقیق و تعلیق کے طور پر لکھی گئی کتاب "تمام المنۃ" میں علامہ ناصر الدین البانی رحمہ اللہ نے لکھا ہے:

"خشوع کی نیت سے ننگے سر نماز کا استحباب دین میں ایک ایسے حکم کو جاری کرنا ہے، جس کی کوئی دلیل نہیں، سوائے رائے کے اور اگر یہ فعل حق ہوتا تو نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اسے ضرور اختیار فرماتے اور اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اختیار فرمایا ہوتا تو ضرور آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہوتا

---

[1] فتاویٰ علماے حدیث (۴/ ۲۹۱)

[3] فتاویٰ علماے حدیث (۴/ ۲۸۷، ۲۸۸)

اور جب اس سلسلے میں آپ ﷺ سے کچھ منقول نہیں تو یہ اس بات کی دلیل ہے کہ یہ نظریہ ایک خود ساختہ بدعت ہے، لہٰذا اس سے بچنا چاہیے۔''[1]

اب رہی یہ بات کہ ننگے سر نماز کو خشوع کی علامت قرار دینے کے لیے اور اس کا جواز واستحباب پیدا کرنے کے لیے اسے موسمِ حج میں حالتِ احرام میں حاجی کے ننگے سر رہنے پر قیاس کیا جائے، جیسا کہ کتبِ فقہ میں وارد ہوا ہے (اور انصار السنۃ مصر کے بعض اخوان نے بھی اس سے جواز پر استدلال کیا ہے) تو یہ قیاس درست نہیں، بلکہ صاحب ''تمام المنۃ'' نے اسے قیاسِ باطل قرار دیا ہے، کیونکہ دورانِ احرام ننگے سر رہنا حج کا شعار ہے اور یہ فعل مناسکِ حج میں سے ہے، جس میں دوسری کوئی عبادت اس کے برابر نہیں ہوسکتی، اور اگر یہ قیاس صحیح ہوتا تو پھر لازماً یہ بھی کہنا پڑتا کہ ننگے سر نماز پڑھنا مستحب نہیں بلکہ واجب ہے، کیونکہ حج میں (دورانِ احرام) سر ننگا رکھنا واجب ہے اور یہ ایک ایسا نقطہ ہے جس کی رو سے اس قیاس سے رجوع کیے بغیر کوئی چارۂ کار ہی نہیں رہتا۔ وَلَعَلَّهُمْ يَفْعَلُونَ.[2]

۲ فقہ السنۃ میں ایک دوسری بات یہ بھی کہی گئی ہے کہ نماز میں سر کو ڈھانپنے کی افضلیت پر دلالت کرنے والی کوئی دلیل وارد نہیں ہوئی۔

مولف کا کسی بھی دلیل کے وارد ہونے کی مطلقاً نفی کر دینا صحیح نہیں، البتہ اگر وہ کہتے کہ افضلیت پر دلالت کرنے والی کوئی خاص دلیل وارد نہیں ہوئی تو پھر ان کی یہ بات مسلّم ہے، اگرچہ کسی خاص دلیل کا نہ ہونا کسی عام دلیل کے وارد ہونے کی نفی بھی نہیں کرتا اور سر کو ڈھانپنے کی عام دلیل موجود ہے اور اس قاعدے پر بھی تمام (علمائے اصول) کا اتفاق ہے کہ جب کوئی معارض ومخالف دلیل نہ ہو تو عام دلیل بھی حجت ہوتی ہے اور وہ عام دلیل ہے کہ نماز کے لیے دورِ حاضر سے کچھ پہلے کا معروف اسلامی لباس پہن کر اس سے زینت اختیار کرنا، دورِ سلف صالحین میں ننگے سر رہنا، چلنا پھرنا اور اسی حالت میں ہی مساجد میں چلے جانا عرفِ عام میں اچھی ہیئت شمار نہیں کیا جاتا تھا اور یہ بات ان کے یہاں خلافِ زینت تھی۔[3]

نماز کے وقت زینت کو اختیار کرنے کا خود اللہ تعالیٰ نے حکم فرمایا ہے، جیسا کہ ارشادِ الٰہی ہے:

---

[1] تمام المنة (ص: ١٦٦)

[2] تمام المنة أيضاً (ص: ١٦٤، ١٦٥)

[3] تمام المنة (ص: ١٦٤، ١٦٦) بتصرف يسير

﴿يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ خُذُوْا زِيْنَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ﴾ [الأعراف: ٣١]

''اے آدم کی اولاد! ہر نماز کے وقت اپنی زینت اختیار کرو۔''

نماز کے وقت زینت اختیار کرنے کی ترغیب نبیِ اکرم ﷺ نے بھی دلائی ہے، جیسا کہ طبرانی اوسط، بیہقی اور معانی الآثار کے حوالے سے ہم پہلے بھی حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی حدیث ذکر کر چکے ہیں، جس میں ارشادِ نبوی ﷺ ہے:

« إِذَا صَلّٰى أَحَدُكُمْ فَلْيَلْبَسْ ثَوْبَيْهِ فَإِنَّ اللّٰهَ أَحَقُّ مَنْ تُزَيَّنُ لَهُ »[1]

''تم میں سے جب کوئی نماز پڑھے تو اپنے دونوں کپڑے پہنے، بے شک اللہ تعالیٰ اس بات کا زیادہ مستحق ہے کہ اس کے لیے زینت اختیار کی جائے۔''

اس آیت و حدیث اور سلف صالحین کے عرف عام میں ننگے سر نہ پھرنے سے عمامہ وٹوپی کی فضیلت یا کم از کم ننگے سر نماز کی نسبت اس کی افضلیت کا پتا چلتا ہے اور یہ عام دلیل ہے، جب کہ عمامے کی فضیلت والی خاص احادیث ہم ذکر کر چکے ہیں کہ وہ سب واقعی موضوع اور من گھڑت ہیں۔

③ ننگے سر نماز کے دلائل کی استنادی حیثیت:

فقہ السنۃ کے مولف سید سابق کے اقتباس پر وارد ہونے والے مؤاخذات و اعتراضات میں سے دو ذکر کیے گئے ہیں، جبکہ اس اقتباس میں ایک تیسری بات بھی مذکور ہے کہ موصوف نے ننگے سر نماز کے جواز کی دلیل کے طور پر (تاریخ دمشق) ابن عساکر کے حوالے سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی بیان کردہ روایت پیش کی ہے، جس میں وہ بتاتے ہیں:

« إِنَّ النَّبِيَّ ﷺ كَانَ رُبَمَا نَزَعَ قَلَنْسُوَتَهٗ فَجَعَلَهَا سُتْرَةً بَيْنَ يَدَيْهِ »[2]

''نبیِ اکرم ﷺ بعض دفعہ اپنی ٹوپی اتار کر اسے اپنے سامنے بطورِ سترہ رکھ لیتے تھے۔''

اس روایت سے دو وجوہ کی بنا پر ننگے سر نماز کے جواز پر استدلال نہیں کیا جا سکتا:

① اس لیے کہ یہ روایت ضعیف ہے اور صاحب ''تمام المنة'' کے بقول اس کے ضعیف ہونے پر دلالت کرنے کے لیے یہی امر کافی ہے کہ اسے روایت کرنے میں ابن عساکر متفرد ہے، پھر انھوں

[1] فقه السنة (١/ ١٢٨) صحيح الجامع (١/ ١/ ٢٣٨) السلسلة الصحيحة (٣/ ٣٥٦، ٣٥٧)

[2] فقه السنة (١/ ١٢٨)

نے "سلسلة الأحاديث الضعيفة" (۲۵۳۸) میں اس کا سببِ ضعف بھی بیان کیا ہے۔

۲ اس لیے بھی اس روایت سے ننگے سر نماز کے جواز پر استدلال صحیح نہیں، کیونکہ اگر اس روایت کو صحیح بھی مان لیا جائے، تب بھی یہ مطلق ننگے سر نماز کے جواز کی دلیل نہیں بن سکتی، بلکہ اس روایت کے ظاہری الفاظ بتا رہے ہیں کہ آپ ﷺ نے ایسا اس وقت کیا جب ایسی کوئی چیز میسر نہ آئی، جسے بطورِ سترہ آپ ﷺ اپنے سامنے رکھ لیتے۔ سترے کے بارے میں واردشدہ احادیث سے پتا چلتا ہے کہ وہ سر ڈھانپنے سے بھی اہم فعل ہے۔[1]

گویا علی وجہ التنزل اس روایت کو صحیح بھی مان لیا جائے تو اس میں مذکور نبیِ اکرم ﷺ کا فعل یعنی سر مبارک سے ٹوپی اتار کر اسے بطورِ سترہ اپنے سامنے رکھ کر نماز پڑھنا ایک ایسی ضرورت کے لیے تھا جو سر ڈھانپنے سے بھی زیادہ اہم ہے، لہٰذا اس سے مطلق جواز اخذ نہیں کیا جا سکتا۔

دوسری دلیل:

تقریباً اسی حدیث سے ملتا جلتا ایک اثر سنن ابی دواد میں مروی ہے، جس ننگے سر کے جواز پر استدلال کیا جاتا ہے، اس اثر میں عبداللہ بن محمد زہری بیان کرتے ہیں کہ سفیان بن عیینہ نے فرمایا:

"رَأَيْتُ شَرِيْكًا صَلّٰى بِنَا فِيْ جَنَازَةٍ اَلْعَصْرَ فَوَضَعَ قَلَنْسُوَتَهٗ بَيْنَ يَدَيْهِ يَعْنِيْ فِيْ فَرِيْضَةٍ"[2]

"میں نے شریک کو دیکھا کہ انھوں نے ایک جنازے کے موقع پر ہمیں عصر کی نماز پڑھائی تو اپنی ٹوپی فرض نماز پڑھاتے وقت اپنے سامنے رکھ لی۔"

لیکن یہ اثر بھی کئی وجوہ کی بنا پر ناقابلِ حجت و استدلال ہے، جیسا کہ شیخ الحدیث مولانا اسماعیل سلفی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

1 "اس لیے کہ یہ نہ تو مرفوع حدیث ہے کہ اس میں نبیِ اکرم ﷺ کا کوئی عمل بیان ہوا ہو اور نہ یہ کسی صحابی رضی اللہ عنہ کا اثر ہے، بلکہ یہ صحابہ رضی اللہ عنہم کے بعد والوں میں سے کسی کا اثر ہے۔

2 یہ بھی معلوم نہیں کہ یہ شریک کون بزرگ ہیں، یہ شریک بن عبداللہ بن ابی نمر تابعی ہیں یا کہ

---

[1] بحواله تمام المنة (ص: ١٦٤)

[2] صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (٦٤٠)

شریک بن عبداللہ نخعی تبع تابعی ہیں اور ان دونوں میں سے چاہے کوئی بھی کیوں نہ ہو، دونوں میں ہی کم و بیش ضعف پایا جاتا ہے، لہٰذا یہ اثر بھی ضعیف ہوا اور پھر یہ کہ ان کا اپنا عمل ہے جو کسی طرح بھی قابلِ حجت نہیں۔

3 اس لیے بھی اس اثر کو دلیل نہیں بنایا جا سکتا کہ امام ابو داود نے اس اثر کو اپنی سنن کے "بَابُ اَلْخَطُّ إِذَا لَمْ يَجِدْ عَصاً" کے تحت وارد کیا ہے کہ ''جب عصا نہ ہو تو سترے کے لیے لکیر کھینچنے کا بیان۔''

امام صاحب کے انداز سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہاں ضرورتاً سر ننگا رکھا گیا ہے، کیونکہ جب انھیں سترے کے لیے کوئی چیز نہ ملی تو انھوں نے سترے کا کام ٹوپی سے لے لیا، ضرورت اور عذر سے سر ننگا رکھا جائے تو اس میں بحث نہیں، بلکہ بحث تو اس میں ہے کہ فیشن اور عادت کے طور پر نماز میں سر ننگا رکھنا کہاں تک درست ہے۔[1]

تیسری دلیل:

ایسے ہی ایک تیسری حدیث بھی ہے، جس سے نہ صرف یہ کہ ننگے سر نماز کے جواز پر استدلال کیا جا سکتا ہے، کیونکہ اس میں تو ننگے سر مساجد میں آنے کے لیے امر کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے، چنانچہ الکامل لابن عدی میں دو طریق سے اور تاریخ دمشق ابن عساکر میں ایک طریق سے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً مروی ہے، یعنی اس کلام کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کیا گیا ہے، جس میں ہے:

"اِئْتُوا الْمَسَاجِدَ حَسْراً مُعَصَّبِيْنَ فَإِنَّ الْعَمَائِمَ تِيْجَانُ الْمُسْلِمِيْنَ"[2]

''مساجد میں ننگے سر آؤ اور پگڑیاں باندھ کر آؤ، بے شک پگڑیاں تو مسلمانوں کے تاج ہیں۔''

تاریخ ابن عساکر میں اس کے الفاظ میں معمولی سا فرق ہے، وہاں پر ہے:

"اِئْتُوا الْمَسَاجِدَ حَسْراً وَمُقَنِّعِيْنَ فَإِنَّ ذٰلِكَ مِنْ سِيْمَا الْمُسْلِمِيْنَ"

''مساجد میں ننگے سر آؤ یا ٹوپی پہن کر یہ (ٹوپی پہننا) مسلمانوں کی نشانی ہے۔''

---

[1] فتاویٰ علماے حدیث (۴/ ۲۸۸، ۲۸۹)

[2] تمام المنة (ص: ١٦٥) و ضعيف الجامع (١/ ١/ ٦٢) و الضعيفة (٣/ ٤٥٩)

اس روایت کے دونوں طرح کے الفاظ سے ظاہر ہو رہا ہے کہ بیک وقت دو دلیلیں لی جا سکتی ہیں، ایک ننگے سر مساجد میں جانے اور نماز پڑھنے کے جواز کی اور دوسری اس کے سراسر برعکس پگڑی یا عمامہ باندھنے کی فضیلت کی۔ لیکن افسوس یہ ہے کہ ان دونوں باتوں میں سے یہ روایت کسی ایک پر بھی استدلال کے لائق نہیں ہے، کیونکہ محدّثینِ کرام نے اسے سخت ضعیف بلکہ موضوع اور من گھڑت قرار دیا ہے، کیونکہ اس روایت کے دونوں طرق میں ایک راوی میسرہ بن عبد ربہ ہے، جو خود اس بات کا معترف ہے کہ وہ ''وضّاع'' ہے، یعنی روایتیں گھڑتا ہے۔ حافظ عراقی نے اسے متروک قرار دیا ہے۔[1]

اس حدیث کے ابن عساکر والے طریق میں، جو الکامل میں بھی ہے، ایک راوی مبشر بن عبید ہے، جس کے بارے میں امام ابن عدی نے کہا ہے:

''مُبَشِّرٌ هٰذَا بَيِّنُ الْأَمْرِ فِي الضُّعْفِ، وَعَامَّةُ مَّا يَرْوِيهِ غَيْرُ مَحْفُوظٍ''

''یہ مبشر ضعیف ہونے میں واضح ہے اور اس کی مرویات عموماً غیر محفوظ ہیں۔''

امام احمد بن حنبل اس کے بارے میں فرماتے ہیں:

''کان یضع الحدیث'' (وہ حدیثیں گھڑا کرتا تھا)

اور ''الضعفاء و المتروکین'' (۳/ ۳۰) میں امام ابن حبان نے کہا ہے:

''يَرْوِيْ عَنِ الثِّقَاتِ الْمَوْضُوْعَاتِ، لَا يَحِلُّ كِتَابَةُ حَدِيْثِهِ إِلَّا عَلٰى جِهَةِ التَّعَجُّبِ''[2]

''یہ ثقہ راویوں سے من گھڑت احادیث بیان کرتا ہے، تعجب کے سوا اس کی مرویات کو لکھنا بھی جائز نہیں۔''

یہ ہے اس حدیث کی حقیقت، اب بھلا ایسی حدیث سے استدلال کیسے روا ہوسکتا ہے؟

علامہ البانی:

عرب کے علما سے دوسرے مشہور و معروف عالم اور محدّثِ کبیر علامہ ناصر الدین الالبانی رحمہ اللہ نے اپنی کتاب ''تمام المنۃ'' میں ننگے سر نماز پڑھنے کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار فرمایا

[1] تمام المنة (ص: ١٦٥)

[3] بحواله الضعيفة (٣/ ٤٥٩، ٤٦٠)

ہے، چنانچہ موصوف اپنی اس کتاب (ص: ۱۶۴) میں لکھتے ہیں کہ اس زیر بحث مسئلے کے بارے میں میری رائے یہ ہے کہ ننگے سر نماز پڑھنا مکروہ ہے، کیونکہ یہ بات طے شدہ ہے کہ مسلمان کے لیے مستحب یہ ہے کہ وہ نماز میں سب سے اکمل و احسن ہیئت وصورت میں داخل ہو، کیونکہ معجم طبرانی اوسط، سنن بیہقی اور معانی الآ ثار طحاوی میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی حدیث میں نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشادِ گرامی ہے:

«فَإِنَّ اللّٰهَ أَحَقُّ مَنْ تُزَيَّنُ لَهُ»[1]

''بے شک اللہ تعالیٰ اس بات کا زیادہ مستحق ہے کہ اس کے لیے زینت اختیار کی جائے۔''

سلف صالحین کے عرف عام میں یہ اچھی صورت شمار نہیں کی گئی کہ ننگے سر رہنے اور ایسے ہی چلنے پھرنے اور اسی طرح عبادت گاہوں (مساجد) میں داخل ہونے کی عادت بنا لی جائے، بلکہ یہ تو ایک مغربی عادت ہے، جو بہ کثرت اسلامی ممالک میں اس وقت سے در آئی ہے، جب سے وہ ان ممالک میں (استعمار کی حیثیت سے) داخل ہوئے اور اپنے ساتھ کتنی ہی فاسد و بدترین عادات لائے اور مسلمانوں نے ان کی نقالی و پیروی شروع کر دی، اس عادت اور ایسی ہی دیگر عاداتِ بد کو اپنانے کی وجہ سے مسلمان اپنے اسلامی تشخص ہی کو کھو بیٹھے ہیں، جبکہ یہ ہنگامی صورتِ حال اس لائق نہیں کہ اسے اپنے گذشتہ اسلامی عرف و تشخص کی مخالفت کا ذریعہ بنایا جائے اور نہ یہ عادت اس لائق ہے کہ اسے ننگے سر نماز ادا کرنے کے جواز کی دلیل بنا لیا جائے۔[2]

اس کے علاوہ موصوف نے اس کتاب کے اسی مقام پر ننگے سر نماز کے جواز پر دلالت کرنے والی روایات میں سے ایک کو ضعیف اور دوسری کو سخت ضعیف بلکہ موضوع اور من گھڑت قرار دیا ہے۔

ایک عجوبہ:

موصوف نے اپنی دوسری کتاب ''سلسلة الأحاديث الضعيفة والموضوعة'' میں جہاں عمامہ کی فضیلت پر دلالت کرنے والی یکے بعد دیگرے تین من گھڑت روایات نقل کی ہیں، وہاں ان کے بعد ان کے برے اثرات بھی ذکر کیے ہیں اور ایک بات یہ بھی لکھی ہے کہ دستار و عمامہ یا

---

[1] فقه السنة (١/ ١٢٨) صحيح الجامع (١/ ١/ ٢٣٨) السلسلة الصحيحة (٣/ ٣٥٦، ٣٥٧)

[2] تمام المنة (ص: ١٦٤، ١٦٦)

ٹوپی و پگڑی پر اتنی شدت کے ساتھ عمل کرنے والے لوگوں کی ایک بات انتہائی قابلِ تعجب ہے کہ وہ ڈاڑھی مونڈنے یا منڈوانے کا گناہ تو مسلسل کرتے چلے جاتے ہیں اور جب نماز کے لیے کھڑے ہوتے ہیں تو انھیں اپنے اس ارتکابِ گناہ کا کوئی شعور تک نہیں ہوتا اور نہ وہ اس سے اپنی نماز میں کوئی کمی محسوس کرتے ہیں، لیکن ٹوپی یا پگڑی کے معاملے سستی ہرگز نہیں کرتے، اس طرح ان لوگوں نے شریعت کے احکام کو الٹ کر رکھ دیا ہے کہ جو چیز اللہ کی طرف سے حرام تھی، اسے مباح کر لیا اور جو مباح تھی، اسے واجب یا قریبِ واجب کر لیا ہے۔[1]

ان الفاظ سے موصوف کے رجحان کا پتا چلتا ہے کہ ان کے نزدیک بھی عمامہ و دستار واجب نہیں، بلکہ ننگے سر بھی مباح و جائز ہے، لیکن یہ ناپسندیدہ فعل ہے اور افضل و اولیٰ یہی ہے کہ ننگے سر نماز نہ پڑھی جائے۔

افشاے اسلام کا حکم وفضیلت اور موانع:

اسی پر بس نہیں بلکہ موصوف نے اسی مقام پر اس بات کو بڑے زور دار طریقے سے بیان کیا ہے کہ عمامہ وٹوپی کی ضرورت جتنی نماز کے لیے ہے، نماز سے باہر اس کی اس سے بھی زیادہ ضرورت ہے، کیونکہ یہ مسلمانوں کا شعار ہے، جو انھیں غیر مسلموں سے امتیازی حیثیت دیتا ہے، خصوصاً دورِ حاضر میں جبکہ مومن و کافر سب کے لباس (اور وضع قطع) ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہیں، یہاں تک کہ اب تو یہ بھی مشکل ہوگیا ہے کہ مسلمان جانے پہچانے یا انجانے ہر طرح کے مسلمانوں میں دعا و سلام کو عام کر سکے۔

گویا نہ تو مسلمان کے چہرے پر اسلامی شعار یعنی ڈاڑھی ہوتی ہے اور نہ سر پر ٹوپی یا عمامہ اور لباس بھی ایک جیسے ہوگئے ہیں، اس ساری صورتِ حال میں تو سلام کے عام کرنے کے عمل میں بھی رکاوٹ آ رہی ہے، جسے کوئی جانتا ہے، اسے تو سلام کہہ لیتا ہے، لیکن جسے کوئی نہیں جانتا، اسے سلام کہنے میں یہ امر مانع ہوتا ہے کہ یہ مسلمان بھی ہے یا نہیں، کیونکہ کسی کے ماتھے پر یہ لکھا ہوا نہیں ہوتا کہ وہ کون ہے اور کسی قسم کا اسلامی شعار بھی اس پر واضح نہیں ہوتا۔ اب اگر وہ غیر مسلم ہے اور اسے سلام کہہ دیں تو اس ارشادِ رسالت مآب ﷺ کی خلاف ورزی ہوگی، جو صحیح مسلم، سنن ابو داود و ترمذی

[1] السلسلة الضعيفة (١/ ١٦٢)

میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، جس میں ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے:

«لَا تَبْدَأُوا الْيَهُودَ وَلَا النَّصَارىٰ بِالسَّلَامِ»[1]

''(غیر مسلم) یہود و نصاریٰ کو سلام کہنے میں پہل مت کرو۔''

اگر اسے عدمِ پہچان کی وجہ سے سلام نہیں کہتا، حالانکہ وہ مسلمان ہے تو رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے دوسرے ارشاد کی نافرمانی ہوتی ہے، جو صحیح بخاری و مسلم، سنن ابو داود، الادب المفرد، صحیح ابن حبان اور ابوعوانہ میں حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، جس میں پوچھا گیا: بہترین اسلام کونسا ہے؟ تو نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«تُطْعِمُ الطَّعَامَ وَتَقْرَأُ السَّلَامَ عَلٰى مَنْ عَرَفْتَ وَمَنْ لَّمْ تَعْرِفْهُ»[2]

''کھانا کھلاؤ اور سلام کہو، چاہے تم کسی کو جانتے ہو یا نہیں پہچانتے ہو۔''

یہ صورتِ حال مسلمانوں کی اپنی پیدا کردہ ہے، جس میں عمامہ و ٹوپی کا عام حالات میں استعمال نہ کرنا بھی اہم رول ادا کر رہا ہے اور ڈاڑھی منڈوانا اور مغربی طرز کے لباس کا عام استعمال اس پر مستزاد ہے۔ یہ سب عوامل مل کر افشاے سلام کے عملِ خیر میں رکاوٹ بن رہے ہیں، جبکہ افشاے سلام یعنی ہرکس و ناکس کو سلام کہنے کا نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم فرمایا ہے، جیسا کہ الادب المفرد امام بخاری، صحیح مسلم، سنن ابو داود و ترمذی میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

«لَا تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ حَتّٰى تُؤْمِنُوا وَلَا تُؤْمِنُوا حَتّٰى تَحَابُّوا، أَوَلَا أَدُلُّكُمْ عَلٰى شَيْءٍ إِذَا فَعَلْتُمُوْهُ تَحَابَبْتُمْ؟ أَفْشُوا السَّلَامَ بَيْنَكُمْ»[3]

---

[1] مختصر صحيح مسلم للمنذري، رقم الحديث (١٤٣٢) صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٣٣٧) صحيح سنن الترمذي، رقم الحديث (٢١٧١)

[2] صحيح البخاري مع الفتح (١١/ ٢١) الأدب المفرد (٤٤٧) مختصر صحيح مسلم للمنذري (٦٣) صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٣٢٦) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٣٢٥٣) موارد الظمآن، رقم الحديث (١٣٦٠)

[3] مختصر صحيح مسلم للمنذري، رقم الحديث (٤٢) صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٣٢٥) صحيح سنن الترمذي، رقم الحديث (٢١٦٢) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٦٨ و ٣٦٩٢) الأدب المفرد للبخاري، رقم الحديث (٩٨٠)

”تم اس وقت تک جنت میں نہیں جا سکتے، جب تک کہ ایمان نہ لے آؤ اور اس وقت تک مومن نہیں ہو سکتے، جب تک ایک دوسرے سے محبت نہ کرو۔ کیا میں تمھیں ایک ایسا عمل نہ بتاؤں جسے اپنانے سے تم باہم ایک دوسرے سے محبت کرنے لگو؟ آپس میں سلام کو عام کرو۔“

صحیح بخاری و مسلم کی ایک متفق علیہ حدیث میں ابو عمارہ حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں:

«أَمَرَنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ بِسَبْعٍ بِعِيَادَةِ الْمَرِيْضِ، وَاِتِّبَاعِ الْجَنَائِزِ وَتَشْمِيْتِ الْعَاطِسِ وَنَصْرِ الضَّعِيْفِ وَعَوْنِ الْمَظْلُوْمِ وَإِفْشَاءِ السَّلَامِ وَإِبْرَارِ الْمُقْسِمِ»[1]

”نبیِ اکرم ﷺ نے ہمیں سات کاموں کا حکم فرمایا:

1. بیمار کی عیادت و تیمار داری کا۔
2. جنازے کے پیچھے چلنے (جنازہ پڑھنے) کا۔
3. چھینک مارنے (پر الحمد للہ کہنے) والے کا (”یَرْحَمُكَ اللّٰه“ کہہ کر) جواب دینے کا۔
4. ضعیف و کمزور کی مدد کرنے کا۔
5. مظلوم کے ساتھ تعاون کرنے کا۔
6. سلام کو عام کرنے کا۔
7. قسم کھانے والے کی قسم کو پورا کرنا۔

یعنی کسی سے کام کروانے کے لیے کسی نے کوئی قسم کھا لی تو وہ کام کر دینا، تاکہ اس کی قسم پوری ہو جائے۔[2]

ایسے ہی الادب المفرد امام بخاری، سنن ترمذی و ابن ماجہ، دارمی، مستدرک حاکم اور مسند احمد میں ابو یوسف حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا:

«يَآ أَيُّهَا النَّاسُ! أَفْشُوا السَّلَامَ وَأَطْعِمُوا الطَّعَامَ، وَصِلُوا الْأَرْحَامَ، وَصَلُّوْا وَالنَّاسُ نِيَامٌ»

---

[1] صحيح البخاري مع الفتح (١١/ ١٨) مختصر صحيح مسلم للمنذري، رقم الحديث (١٣٧١)

[2] فتح الباري (١/ ٥٤٢) شرح حديث (٦٦٥٤)

''اے لوگو! سلام کو عام کرو اور (محتاجوں کو) کھانا کھلاؤ اور صلہ رحمی کرو اور راتوں کو جب لوگ سوئے ہوں، نمازیں پڑھو (شبِ زندہ داری کرو)۔''

جب تم یہ کام کرو گے تو:

«تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ بِسَلَامٍ»[1] ''سلامتی کے ساتھ جنت میں داخل ہو جاؤ گے۔''

اور اسی طرح ''الأدب المفرد'' امام بخاری، سنن ترمذی، مستدرک حاکم اور صحیح ابن حبان میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«أُعْبُدُوا الرَّحْمٰنَ، وَأَطْعِمُوا الطَّعَامَ، وَأَفْشُوا السَّلَامَ»

''اللہ کی عبادت کرو، اور (محتاجوں کو) کھانا کھلاؤ اور سلام عام کرو۔'' اگر تم ایسا کرو گے تو:

«تَدْخُلُوا الْجِنَانَ»[2] ''تم جنت میں داخل ہو جاؤ گے۔''

سلام کہنے کی فضیلت و برکت کا اندازہ اس حدیث سے بھی ہو جاتا ہے، جس میں سنن ابو داود وترمذی اور نسائی کی روایت کے مطابق حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں:

« جَاءَ رَجُلٌ إِلَى النَّبِيِّ ﷺ فَقَالَ: السَّلَامُ عَلَيْكُمْ وَ رَدَّ عَلَيْهِ ثُمَّ جَلَسَ، فَقَالَ النَّبِيُّ ﷺ عَشْرٌ»

''ایک آدمی نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور اس نے کہا: ''السلام علیکم'' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے سلام کا جواب دیا، پھر وہ شخص بیٹھ گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: دس نیکیاں۔''

پھر دوسرا آدمی آیا اور اس نے کہا: ''السلام علیکم ورحمۃ اللہ'' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا جواب دیا، پھر جب وہ بیٹھ گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بیس نیکیاں۔ پھر ایک اور آدمی آیا تو اس نے کہا: ''السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ'' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے سلام کا جواب دیا اور جب بیٹھ گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تیس نیکیاں۔''[3]

---

[1] رياض الصالحين بمراجعة الأرناؤوط (ص: ٣٦٦) فتح الباري (١١/ ١٩) صحيح سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٠١٩) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٣٣٤، ٣٢٥١)

[2] الأدب المفرد (ص: ٤٣٣) صحيح سنن الترمذي، رقم الحديث (١٥١١) صحيح ابن حبان، رقم الحديث (١٣١٠)

[3] صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٣٢٧) صحيح سنن الترمذي، رقم الحديث (٢١٦٣)

الادب المفرد امام بخاری رحمہ اللہ اور صحیح ابن حبان میں یہی حدیث حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے بھی مروی ہے، جیسے جیسے کوئی سلام کے الفاظ میں اضافہ کرتا جاتا، ثواب اور نیکیوں کی تعداد بھی بڑھتی جاتی ہے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ والی حدیث میں ''نیکیوں'' کا لفظ اور تعداد دونوں وارد ہوئے ہیں اور یہ تین کلمات تو صحیحین میں ثابت ہیں،[1] جبکہ بعض اضافی کلمات کی تفصیل فتح الباری (۱۱/ ۳، ۷، ۳۶، ۳۸) میں موجود ہے۔

اندازہ فرمائیں کہ سلام کہنے کی کس قدر فضیلت و ثواب ہے؟ جس سے ہمیں کسی حد تک کبھی محض اس لیے محروم ہونا پڑتا ہے کہ مسلمان کے اسلامی شعائر کو ترک کرنے کی وجہ سے ہم اسے پہچان نہیں پاتے، وہ شعائر جن میں سے ایک عمامہ یا ٹوپی ہے۔

جہاں مسلم اور کافر ملے جلے بیٹھے ہوں:

البتہ یہاں ایک مسئلہ بیان کر دینا مناسب لگتا ہے کہ اگر کہیں آپ دیکھتے ہیں کہ مسلم و کافر ملے جلے بیٹھے ہیں یا کام لگے ہوئے ہیں تو آپ کو مسلمانوں کی نیت سے ضرور سلام کہہ لینا چاہیے، کیونکہ اس کا ثبوت صحیح احادیث میں موجود ہے، چنانچہ صحیح بخاری و مسلم اور سنن ترمذی میں حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما سے مروی ہے:

« إِنَّ النَّبِيَّ ﷺ مَرَّ عَلٰى مَجْلِسٍ فِيهِ اَخْتِلَاطٌ مِّنَ الْمُسْلِمِينَ وَالْمُشْرِكِينَ عَبَدَةِ الْأَوْثَانِ وَالْيَهُودِ فَسَلَّمَ عَلَيْهِمُ النَّبِيُّ ﷺ »[2]

''نبی اکرم ﷺ ایک ایسی مجلس کے پاس سے گزرے، جس میں مسلمان اور مشرکین یعنی بتوں کے پجاری اور یہودی سب ملے جلے بیٹھے تھے تو نبی اکرم ﷺ نے ان کو سلام کہا۔''

عمومی لفظ کے ساتھ سلام کہنا مگر نیت صرف مسلمانوں کی کرنا، اس کی صراحت تو امام نووی رحمہ اللہ نے کی ہے کیوں کہ غیر مسلم کو سلام کرنے میں ابتدا کرنا جائز نہیں، جیسا کہ حدیث ذکر کی جا چکی ہے۔ امام ابن العربی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اگر اہلِ سنت و اہلِ بدعت، عدل پسند اور ظالم یا محبّ اور مبغض

---

[1] صحيح البخاري (١١/ ٣٦) صحيح مسلم، باب فضل عائشة، الأدب المفرد (ص: ٤٣٥، ٤٣٦) فتح الباري (١١/ ٦)

[2] صحيح البخاري مع الفتح (٢٦٥٤) مختصر صحيح مسلم للمنذري (١١٢٣) صحيح سنن الترمذي، رقم الحديث (٢١٧٣)

بیٹھے ہوں تو بھی اول الذکر لوگوں کی نیت کر کے عمومی الفاظ کے ساتھ سلام کہنا چاہیے۔[1]

سلام کی فضیلت اور متعلقہ اس سے متعلق امور تو ہم نے محض موانع کا ذکر کرنے کی مناسبت سے ذکر کر دیے ہیں، ورنہ سلام سے متعلق احکام و مسائل تو بہت زیادہ ہیں، لیکن سرِ دست وہ ہمارے موضوع کا حصہ نہیں ہیں، لہٰذا یہاں ہم ان سے صرفِ نظر کر رہے ہیں، کبھی اللہ تعالیٰ نے موقع بخشا اور توفیق سے نوازا تو ان مسائل کی تفصیل بھی ذکر کر دیں گے۔[2] ان شاء اللہ تعالیٰ

ٹوپی اور عمامہ یا کوئی ایک:

یہاں ایک اور بات بھی آپ کے گوش گزار کر دیں کہ بعض لوگ عام حالات میں تو کیا خاص دورانِ نماز بھی عمامہ یا ٹوپی نہیں رکھتے، بلکہ ایسے لوگوں کی کثرت ہو رہی ہے، جبکہ ادھر کچھ لوگ ہیں تو وہ بال کی کھال اتارنے کے چکر میں رہتے ہیں اور یہ پوچھتے ہیں کہ نیچے ٹوپی اور اس کے اوپر عمامہ یا پگڑی دونوں بیک وقت ضروری ہیں یا دونوں یعنی عمامہ و ٹوپی میں سے کوئی ایک چیز بھی کافی ہے اور کیا نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم یا صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے کبھی بغیر عمامہ کے ٹوپی پہنی ہے یا نہیں؟ عام لوگ تو عموماً صرف ٹوپی پر اکتفا کرتے ہیں، لیکن ان کا کہنا ہوتا ہے کہ ٹوپی کے اوپر لازماً عمامہ باندھو، کیونکہ صرف ٹوپی پہننا مکروہ ہے، ان کا استدلال رکانہ بن یزید الہاشمی والی سنن ابو داود و ترمذی اور بیہقی کی اس مرفوع حدیث سے ہوتا ہے، جس میں بیان ہے:

«إِنَّ فَرْقَ مَا بَيْنَنَا وَبَيْنَ الْمُشْرِكِينَ الْعَمَائِمُ وَالْقَلَانِسُ»[3]

''ہمارے اور مشرکین کے مابین فرق یہ ہے کہ ہم ٹوپی پر عمامہ باندھتے ہیں۔''

جبکہ حقیقت یہ ہے کہ نماز میں اور نماز سے باہر ہمیشہ یا کبھی صرف ٹوپی کا استعمال بلاشبہہ جائز و مباح ہے، اس پر پگڑی باندھنا نہ فرض، نہ واجب ہے اور نہ سنت موکدہ ہی۔

امام ترمذی رحمہ اللہ نے اس حدیث کو حسن غریب اور اس کی سند کو ''لیس بالقائم'' قرار دیا ہے اور شیخ البانی نے ان کی تصدیق کی ہے، نیز ماہنامہ ''محدّث'' دہلی (جلد: ١٠، شمارہ: ٣) میں صادر شدہ

[1] فتح الباري (١١/ ٣٩)

[2] دیکھیں: فتح الباري (١١/ ١) زاد المعاد محقق (٢/ ٣٩٩۔ ٤٢٨)

[3] نيل الأوطار (١/ ٢/ ١٠٨) مشكاة المصابيح (٢/ ١٢٤٤) سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٠٧٨) ضعيف الجامع، رقم الحديث (٣٩٦٣) ضعيف سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٠٠)

ایک فتوے کی رُو سے یہ روایت ضعیف ہے اور اگر اسے صحیح بھی تسلیم کر لیا جائے تو ابن الملک وغیرہ شرّاحِ حدیث کے بیان کردہ معنیٰ کے مطابق اس حدیث سے بھی (عمامہ کے بغیر) صرف ٹوپی پہننے کی کراہت ثابت نہیں ہوتی، بلکہ اس کے برعکس علامہ ابن قیم رحمہ اللہ کی تحقیق کے مطابق نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بغیر عمامہ کے صرف ٹوپی بھی استعمال فرمایا کرتے تھے، چنانچہ علامہ موصوف رحمہ اللہ اپنی بلند پایہ کتاب "زاد المعاد في هدي خير العباد" میں فرماتے ہیں:

"نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک عمامہ تھا، جسے "سحاب" کا نام دیا گیا تھا اور وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو پہنا دیا تھا۔"

آگے موصوف لکھتے ہیں:

"وَكَانَ يَلْبَسُهَا وَيَلْبَسُ تَحْتَهَا الْقَلَنْسُوَةَ، وَكَانَ يَلْبَسُ الْقَلَنْسُوَةَ بِغَيْرِ الْعَمَامَةِ، وَكَانَ يَلْبَسُ الْعَمَامَةَ بِغَيْرِ قَلَنْسُوَةٍ"[1]

"آپ صلی اللہ علیہ وسلم وہ عمامہ (سحاب) باندھتے تھے اور اس کے نیچے ٹوپی بھی پہنتے تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم عمامہ کے بغیر صرف ٹوپی بھی پہنتے تھے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم ٹوپی پہنے بغیر بھی عمامہ باندھتے تھے۔"

علامہ ابن قیم رحمہ اللہ کی تحقیق کی تائید بعض آثار سے بھی ہوتی ہے، مثلاً صحیح بخاری شریف میں امام ابو اسحاق رحمہ اللہ کا ایک اثر ہے، جو امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے استاذ ہیں اور انھوں نے اڑتیس صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم سے حدیث روایت کی ہے، بخاری شریف میں ان کے بارے میں مذکور ہے:

﴿وَضَعَ أَبُو إِسْحَاقَ قَلَنْسُوَةً فِي الصَّلَاةِ وَرَفَعَهَا﴾[2]

"ابو اسحاق نے اپنی ٹوپی کو حالتِ نماز میں نیچے رکھا اور پھر اسے اُٹھایا (گویا وہ نماز بھی صرف ٹوپی سے ادا فرماتے تھے)۔"

صرف ٹوپی کے استعمال کے جواز پر بعض نے کچھ مرفوع احادیث سے بھی استدلال کیا ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ ضعیف السند ہونے کی وجہ سے قابلِ حجت نہیں، مثلاً سنن ترمذی اور مسندِ احمد میں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے مروی ایک مرفوع حدیث ہے، جس میں منقول ہے:

﴿اَلشُّهَدَاءُ أَرْبَعَةٌ: رَجُلٌ مُؤْمِنٌ جَيِّدُ الْإِيمَانِ، لَقِيَ الْعَدُوَّ فَصَدَّقَ اللّٰهُ حَتّٰى

[1] زاد المعاد، محقق (۱/ ۱۳۵) النيل (۱/ ۲/ ۱۰۸)

[2] فتاویٰ علماے حدیث (۴/ ۲۹۵) فتویٰ "محدّث" دہلی

قُتِلَ، فَذٰلِكَ الَّذِيْ يَرْفَعُ النَّاسُ إِلَيْهِ أَعْيُنَهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ هٰكَذَا»

''شہید چار ہیں: ایک وہ مومن آدمی جو بڑے عمدہ ایمان والا ہے، وہ (میدانِ کارزار میں) دشمن سے برسرِ پیکار ہو اور اللہ (کی وحدانیت وحکم) کی تصدیق کی، یہاں تک کہ جان دے دی، یہی وہ شہید ہے جسے قیامت کے دن اتنا عظیم و رفیع مرتبہ و مقام ملے گا کہ لوگ اس کی طرف نگاہیں اٹھا کر دیکھیں گے۔''

سنن ترمذی میں یہ الفاظ بھی ہیں:

«وَرَفَعَ رَأْسَهٗ حَتّٰى سَقَطَتْ قَلَنْسُوَتُهٗ»

''اور (بلندی بتانے کے لیے) انھوں نے اپنے سر کو اِتنا اُٹھایا کہ سر سے ٹوپی گر گئی۔''

حضرت عمرِ فاروق رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کرنے والے حضرت فضالہ بن عبید سے بیان کرنے والے راوی ابو یزید خولانی بیان کرتے ہیں:

''فَمَا أَدْرِيْ اَ قَلَنْسُوَةُ عُمَرَ أَرَادَ أَمْ قَلَنْسُوَةُ النَّبِيِّ ﷺ''[1]

''میں نہیں جانتا کہ حضرت فضالہ کی مراد حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی ٹوپی کا گرنا تھا یا نبیِ اکرم ﷺ کی ٹوپی۔''

آگے دوسرے تین آدمیوں کا تذکرہ بھی ہے۔ امام ترمذی رحمہ اللہ نے اس حدیث کو حسن غریب قرار دیا ہے۔ جبکہ شیخ ناصر الدین البانی نے امام سیوطی کی الجامع الصغیر کی جو صحیح وضعیف دو قسموں میں تقسیم کی ہے، تو اس حدیث کو ضعیف قرار دیتے ہوئے انھوں نے اسے ضعیف الجامع (۲/ ۳/ ۲۵۹) میں ذکر کیا ہے، ایسے ہی ایک دوسری حدیث الرویانی اور ابن عساکر نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کی ہے، جس میں وہ بیان کرتے ہیں:

«كَانَ (ﷺ) يَلْبَسُ الْقَلَانِسَ تَحْتَ الْعَمَائِمِ وَبِغَيْرِ الْعَمَائِمِ وَالْعَمَائِمَ بِغَيْرِ الْقَلَانِسِ وَكَانَ يَلْبَسُ الْقَلَانِسَ الْيَمَانِيَّةَ»[2]

''نبیِ اکرم ﷺ عمامہ کے نیچے ٹوپی پہنتے تھے اور بغیر عمامہ کے صرف ٹوپی بھی اور ٹوپی کے بغیر بھی عمامہ باندھتے تھے اور آپ ﷺ یمنی ٹوپیاں بھی پہنا کرتے تھے۔''

---

[1] ضعيف سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٧٩)

[2] ضعيف الجامع، رقم الحديث (٤٦٢٢)

اس حدیث کو امام سیوطی الجامع الصغیر میں بھی لائے ہیں اور اسے صحیح وضعیف میں الگ الگ کرنے والے محدّث مذکور نے اسے سخت ضعیف قرار دیتے ہوئے اسے ضعیف الجامع میں درج کیا ہے۔

غرض کہ علامہ ابن قیم رحمہ اللہ والی تحقیق کی رو سے صرف عمامہ و پگڑی باندھیں یا صرف ٹوپی پہنیں یا دونوں کو بیک وقت اوپر نیچے استعمال کریں، ہر طرح جائز ہے، ممانعت نہیں۔ نماز کے لیے مردوں کے لباس کا موضوع ختم کرتے ہوئے یہ بھی کہتے جائیں کہ صحیح بخاری و مسلم کی ذکر کردہ حدیث کی رو سے جمہور اہل علم کے نزدیک نماز میں کندھوں کو ننگے رکھنے کی ممانعت نہی تنزیہی ہے، تحریمی نہیں یعنی کندھوں کا ڈھانپا ہوا ہونا بہتر ہے، فرض و واجب نہیں۔ مغنی ابن قدامہ میں مذکور ہے کہ امام ابوحنیفہ، مالک اور شافعی رحمہم اللہ کا یہی مسلک ہے، لیکن امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کے نزدیک کندھوں کا ڈھانپنا بھی ضروری ہے، البتہ اگر کپڑا چھوٹا ہو تو شرمگاہ یعنی مقاماتِ ستر کی ستر پوشی کرے اور ننگے کندھوں سے نماز پڑھ لے۔[1]

اب رہا معاملہ نماز میں مَردوں کے سر کو ڈھانپنے کا، تو اس سلسلے میں عرض ہے کہ اول تو دستار یا ٹوپی و پگڑی عام حالات میں بھی استعمال کریں، کیوں کہ یہ شعارِ مسلم ہے اور جب عام حالات میں اسے ترک کر رکھا ہے تو کم از کم نماز کے وقت تو اچھی سی ٹوپی پہن لیا کریں، کیونکہ یہ انسان کے لیے زینت ہے، مگر ہمارے ممالک کی مساجد میں یا پھر ہمارے ہی لوگوں کی لائی ہوئی اور ان مساجد میں رکھی گئی ٹوپیاں ہرگز زینت نہیں ہوتیں، ان کی نسبت تو ننگے سر نماز پڑھ لینا ہی بہتر ہے، کیوں کہ ننگے سر بھی نماز ہو جاتی ہے، سر کو ڈھانپنا محض زینت و آدابِ نماز کا ایک تقاضا ہے، کوئی فرض و واجب یا سنتِ مؤکدہ بھی نہیں ہے، لہٰذا اگر کوئی ننگے سر نماز پڑھ رہا ہو تو اس کے گلے پڑنا، اس کے سر پر ٹوپی رکھنا یا اسے خشمگیں نگاہوں سے گھورنا ہرگز درست نہیں ہے، اللہ تعالیٰ بات کو سمجھنے کی توفیق سے نوازے۔

نماز کے لیے عورت کا لباس

آیئے! اب دیکھیں کہ نماز کے لیے عورت کا کون سا لباس ضروری ہے؟ اس کے لیے کن اعضائے جسم کا ڈھانپنا ضروری ہے اور کن کو ننگا رکھ سکتی ہے؟ لباس کے کیا کیا اوصاف ضروری ہیں اور

[1] المغنی (١/ ١٦٥) بحوالہ فقہ السنۃ محمد عاصم (١/ ١٢٨) نیز دیکھیں: فتح الباري (١/ ٦/ ٥٦٣) منار السبیل (١/ ٧٤) المکتب الإسلامي.

وہ کون کون سے اعضا ہیں، جنھیں نماز میں ننگا رکھ سکتی ہے، لیکن اجانب یعنی غیر محرم مردوں کے سامنے نہیں؟ وہ کون کون سے اعضا ہیں، جنھیں اپنے شوہر اور محرم رشتے داروں کے سامنے تو ننگا کر سکتی ہے، مگر نماز میں نہیں، چاہے وہ اکیلی ہی نماز کیوں نہ پڑھ رہی ہو؟ تو اس سلسلے میں عرض ہے کہ نماز میں عورت کا سارا جسم ہی سوائے چہرے اور دونوں ہاتھوں کے مقامِ ستر ہے۔

عورت کا سارا جسم ہی مقامِ ستر ہے:

حقیقت یہ ہے کہ اُردو زبان میں جو لفظ ''عورت'' ہے، وہ اصلاً عربی لفظ ہے، جو شرمگاہ یا مقامِ ستر کے لیے ہے، جو اس بات کی دلیل ہے کہ عورت کا معنیٰ ہی مقامِ ستر اور پردہ ہے۔ لہٰذا اسے سر تا پاؤں پردے میں رہنا چاہیے، خصوصاً نماز میں، اس لغوی مفہوم کے علاوہ ایک صحیح حدیثِ رسول اللہ ﷺ میں بھی یہ صراحت موجود ہے، چنانچہ ''همام عن قتادة عن مورق عن أبي الأحوص عن عبدالله عن النبي ﷺ'' کے طریق سے مروی ارشادِ نبوی ﷺ ہے:

«اَلْمَرْأَةُ عَوْرَةٌ»[1] ''عورت (ساری کی ساری ہی) مقامِ ستر ہے۔''

یہی حدیث قتادہ سے ہمام کے بجائے سوید ابو حاتم کے طریق سے معجم طبرانی کبیر اور الکامل لابن عدی میں بھی ہے اور ابن عدی نے سوید پر کلام کیا ہے، لیکن سوید کی متابعت نہ یہ کہ صرف سنن ترمذی میں ہمام نے کی ہے، بلکہ صحیح ابن خزیمہ (۶۸۵، ۱۶۸۷) میں سعید بن بشیر نے بھی کی ہے ان طرق و متابعات کی وجہ ہی سے محدثین کرام نے اس حدیث کو صحیح قرار دیا ہے۔[2]

سر اور بال:

نماز میں عورت کا سارا جسم ہی سوائے چہرے اور ہاتھوں کے مقامِ ستر ہے، حتیٰ کہ عورت کا سر اور بال بھی کپڑے میں ڈھکے ہوئے ہونے چاہییں، کیوں کہ سنن ابو داود، ترمذی، ابن ماجہ، بیہقی، مصنف ابن ابی شیبہ، مستدرک حاکم، مسند احمد اور صحیح ابن حبان و خزیمہ میں ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ نبیِ اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

---

[1] إرواء الغليل (١/ ٣٠٣) و صححه، صحيح سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٩٦) و موارد الظمآن، رقم الحديث (٣٢٩)

[2] دیکھیں: إرواء الغليل (١/ ٣٠٣)

«لَا يَقْبَلُ اللّٰهُ صَلَاةَ حَائِضٍ إِلَّا بِخِمَارٍ»[1]

''اللہ تعالیٰ کسی بالغ (جوان) عورت کی نماز اوڑھنی (چادر) کے بغیر قبول نہیں کرتا۔''

امام دارقطنی نے اس حدیث کا موقوف ہونا زیادہ صحیح قرار دیا ہے اور امام حاکم نے اس کے مرسل ہونے کی علت کا تذکرہ کیا ہے، جیسا کہ نیل الاوطار (۱/۲/ ۶۷) میں ہے، جبکہ صاحب ارواء الغلیل نے ان اعتراضات کے شافی و کافی جواب ذکر کیے ہیں اور اس حدیث کو صحیح قرار دیا ہے۔ اس کی تفصیل ''إرواء الغليل'' (۱/ ۲۱۵ تا ۲۱۷) میں دیکھی جا سکتی ہے۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ عورت کے لیے نماز میں سر کا ڈھانپنا واجب و ضروری ہے، چاہے وہ اکیلی الگ تھلگ ہی نماز کیوں نہ پڑھ رہی ہو، کیونکہ اس کی نماز کی قبولیت کا انحصار سر پر اوڑھنی یا دوپٹے کے ہونے پر ہے۔ سر کے متعلق یہ تاکید تو صرف عورتوں کے لیے ہے نہ کہ مردوں کے لیے، جب کہ ہمارے ممالک کی مساجد میں پائی جانے والی ٹوپیوں کا وجود اور لوگوں کا تعامل اس کی چغلی کھا رہا ہے کہ شاید وہ یہی حکم مردوں کے لیے بھی سمجھتے ہیں کہ وہ بھی نماز کے وقت ہرگز ہرگز ننگے سر نہ ہوں، حالانکہ ایسا تو قطعاً نہیں ہے۔ اب رہا عورتوں کا معاملہ تو وہ نماز کے وقت اپنا سر اور بال بھی کپڑے میں ڈھانپ کر رکھیں۔

1 اوڑھنی اور پاؤں تک قمیص یا میکسی:

لباس کے سلسلہ میں متعدد آثار سے پتا چلتا ہے کہ عورت کا اکمل و مکمل اور افضل لباس تو کم از کم تین کپڑوں پر مشتمل ہوتا ہے اور وہ تین کپڑے ہیں:

1. پاؤں تک آنے والی قمیص یا میکسی۔
2. سر کی اوڑھنی یا دوپٹا۔
3. ایک اوپر کی بڑی چادر اور ایک صورت میں میکسی کے نیچے کی ازار یا پاجامہ۔

اگر صرف دو کپڑے ہوں تو بھی ان میں عورت کی نماز درست ہے۔ جمہور اہلِ علم نے کپڑوں

[1] المنتقیٰ (۱/ ۲/ ٦٧) الإرواء (۱/ ۲۱٤) التلخيص الحبير (۱/ ۲۷۹) صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (٥٩٦) صحيح سنن الترمذي، رقم الحديث (۳۱۱) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٦٥٥) مسند أحمد (٦/ ١٥٠، ۲۱۸، ۲٥٩) في مسند عائشة رضي الله عنها، المستدرك للحاكم (۱/ ۲٥۱) صحيح ابن خزيمة، رقم الحديث (۷۷٥) صحيح الجامع، رقم الحديث (۷۷٤۷)

کی اس مقدار کو واجب قرار دیا ہے اور ان دو میں سے ایک پاؤں تک آنے والی قمیص یا میکسی اور دوسری سر کی اوڑھنی یا دوپٹا ہے۔ قمیص کے ساتھ ہم ''پاؤں تک آنے والی'' کی شرط اس لیے لگا رہے ہیں کہ عہدِ قدیم تو کیا آج تک بھی عرب عورتوں کے لباس میں قمیص (درع) کے نام سے جو کپڑا معروف ہے، وہ پاؤں تک ہی ہوتا ہے، جیسے مردوں کی قمیص بھی ہے اور ثوب کہلواتی ہے اور پاؤں تک ہوتی ہے۔ اسی قمیص (درع) کو آج کل عربوں میں کئی ناموں سے پکارا جاتا ہے، جس کا نعم البدل لفظ ہمارے یہاں وہ میکسی ہے، جو ہاتھوں اور پاؤں تک سارے جسم پر پوری ہو۔

وہ میکسی ہرگز نہیں جو صرف کندھوں تک ہی ہوتی ہے یا پاؤں تک نہیں پہنچ پاتی، یا بالفاظِ دیگر یوں کہہ لیں کہ عربی اکیلی قمیص یا درع کا متبادل لباس ہمارے یہاں شلوار اور قمیص یا انھی کا کام دینے والے کسی بھی دوسرے نام کے کپڑے ہیں۔

بہ وقتِ ضرورت و مجبوری صرف ایک ہی کپڑے میں بھی نماز ہوجائے گی، بشرطیکہ وہ کپڑا اتنا بڑا ہو کہ سرتاپاؤں ڈھانپنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ اس بنیادی وضاحت کے بعد آیئے! دیکھیں کہ نماز میں عورت کے لیے ضروری لباس کے سلسلے میں آثار سے کیا پتا چلتا ہے؟ چنانچہ مصنف عبدالرزاق اور مصنف ابن ابی شیبہ میں ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے سوال کیا گیا:

''فِيْ كَمْ تُصَلِّيْ الْمَرْأَةُ مِنَ الثِّيَابِ؟'' (عورت کتنے کپڑوں میں نماز پڑھے؟)

تو انھوں نے فرمایا: جاؤ جا کر علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے پوچھو اور وہ جو جواب دیں، وہ آ کر مجھے بتاؤ۔ سائل حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس گیا تو انھوں نے بتایا:

''فِي الْخِمَارِ وَالدِّرْعِ السَّابِغِ'' (سر کی اوڑھنی اور پاؤں تک کی قمیص میں)

سائل لوٹ کر ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس آ گیا اور انھیں اس جواب کے بارے میں بتایا تو انھوں نے فرمایا: ''صَدَقَ'' [1] (علی رضی اللہ عنہ نے سچ فرمایا ہے۔)

اس اثر کی سند کے تمام راوی ثقہ ہیں، البتہ ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور مکحول رحمہ اللہ کے مابین ایک راوی ہے جو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے سوال کرتا ہے اور جس سے مکحول رحمہ اللہ روایت کرتے ہیں، اس راوی کا نام اس سند میں مذکور نہیں، لیکن نفسِ مسئلہ کے صحیح ہونے کا پتا اس اثر کی تائید کرنے

---

[1] فقه السنة (١/ ١٢٧) و تمام المنة (ص: ١٦١)

والے دوسرے آثار سے بھی چل جاتا ہے کہ مسئلہ یہی ہے، کیوں کہ مصنف عبدالرزاق ہی میں صحیح سند کے ساتھ حضرت ام الحسن بیان کرتی ہیں:

''رَأَيْتُ أُمَّ سَلَمَةَ زَوْجَ النَّبِيِّ ﷺ تُصَلِّيْ فِيْ دِرْعٍ وَّخِمَارٍ''[1]

''میں نے نبیِ اکرم ﷺ کی زوجہ محترمہ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کو دیکھا کہ ایک لمبی قمیص اور سر کی اوڑھنی میں نماز پڑھتی تھیں۔''

ایسے ہی صحیح سند کے ساتھ موطا امام مالک، مصنف ابن ابی شیبہ اور سنن بیہقی میں ام المومنین حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا کے ہاتھوں پرورش پانے والے یتیم حضرت عبداللہ خولانی بیان کرتے ہیں:

''إِنَّ مَيْمُوْنَةَ كَانَتْ تُصَلِّيْ فِي الدِّرْعِ وَالْخِمَارِ، لَيْسَ عَلَيْهَا إِزَارٌ''[2]

''حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا ازار (تہبند کی چادر) کے بغیر صرف بڑی قمیص اور دوپٹے میں نماز پڑھا کرتی تھیں۔''

یہ تینوں آثار نبیِ اکرم ﷺ کی ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن کے عمل پر مشتمل ہیں، جبکہ اسی مفہوم کے دیگر متعدد آثار بھی ہیں، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ان دو کپڑوں میں عورتوں کا نماز ادا کرنا معروف تھا اور کم از کم یہ تو دونوں ہونے ہی چاہییں۔

(2) صرف ایک بڑا کپڑا:

امام بخاری رحمہ اللہ کا رجحان اس طرف لگتا ہے کہ اگر ایک ہی بڑا کپڑا ہو، جو سر اور پاؤں سمیت سارے بدن کو ڈھانپ سکتا ہو تو اس میں بھی عورت کی نماز ہوجائے گی، چنانچہ صحیح بخاری، کتاب الصلاۃ ''بَابٌ فِيْ كَمْ تُصَلِّي الْمَرْأَةُ فِي الثِّيَابِ'' میں انھوں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے آزاد کردہ غلام حضرت عکرمہ رحمہ اللہ کا اثر تعلیقاً بیان کیا ہے، جس میں وہ فرماتے ہیں:

''لَوْ وَارَتْ جَسَدَهَا فِيْ ثَوْبٍ لَّأَجْزَأَتْهُ''[3]

''اگر وہ اپنے جسم کو ایک ہی کپڑے میں پوری طرح ڈھانپ لے تو وہ کپڑا ہی کفایت کر جائے گا۔''

---

[1] تمام المنة (ص: ١٦١)

[2] تمام المنة (ص: ١٦٢)

[3] صحيح البخاري (١/ ٤٨٢)

امام بخاری رحمہ اللہ نے حضرت عکرمہ رحمہ اللہ کا جو یہ اثر تعلیقاً بیان کیا ہے، اسے امام عبدالرزاق نے اپنی مصنف میں موصولاً روایت کیا ہے، اور ان کے الفاظ اس طرح ہیں:

"لَوْ أَخَذَتِ الْمَرْأَةُ ثَوْبًا فَتَقَنَّعَتْ بِهٖ حَتّٰى لَا يُرٰى مِنْ شَعْرِهَا شَيْئٌ أَجْزَأَ عَنْهَا"[1]

"اگر عورت ایک ہی بڑے کپڑے کو اپنے جسم پر اس طرح لپیٹ لے کہ اس کے بال تک بھی نظر نہ آئیں تو وہ کپڑا اُسے کفایت کر جائے گا۔"

ایسے ہی اس باب میں امام بخاری رحمہ اللہ نے اس مرفوع حدیث سے بھی عورت کی ایک بڑے کپڑے میں نماز کے جواز پر استدلال کیا ہے، جو صحیح بخاری کے علاوہ صحیح مسلم، سنن اربعہ، سنن دارمی و بیہقی، مسند احمد و طیالسی، صحیح ابی عوانہ، موطا امام مالک، مصنف ابن ابی شیبہ اور معانی الآثار طحاوی میں بھی ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے، جس میں وہ فرماتی ہیں:

«لَقَدْ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ يُصَلِّيْ الْفَجْرِ فَيَشْهَدُ مَعَهٗ نِسَآءٌ مِّنَ الْمُؤْمِنَاتِ مُتَلَفِّعَاتٍ فِيْ مُرُوْطِهِنَّ ثُمَّ يَرْجِعْنَ إِلٰى بُيُوْتِهِنَّ مَا يَعْرِفُهُنَّ أَحَدٌ»[2]

"نبیِ اکرم ﷺ فجر کی نماز پڑھتے، مسلمان عورتیں بھی آپ ﷺ کے ساتھ جماعت میں شریک ہوا کرتی تھیں اور وہ اپنی بڑی بڑی چادروں میں لپٹی ہوئی ہوتی تھیں، پھر وہ گھروں کو لوٹتیں تو انھیں کوئی پہچان نہیں سکتا تھا۔"

اس حدیث کو امام بخاری رحمہ اللہ نے نمازِ فجر کا وقت متعین کرنے کے لیے بھی وارد کیا ہے، لیکن اس سے پہلے ایک ہی بڑے کپڑے میں نماز کے جواز پر استدلال کیا ہے۔ ان کے استدلال پر اعتراض کیا جاتا ہے کہ وہ بڑی بڑی چادریں دوسرے کپڑوں کے اوپر ہوتی تھیں نہ کہ صرف وہی ہوتی تھیں، اس اعتراض کو شارح بخاری حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے یوں رفع کیا ہے کہ اصل تو ان بڑی چادروں کے علاوہ کسی دوسرے کپڑے کا عدم ہی ہے اور کوئی صراحت بھی نہیں ملتی کہ دوسرے کوئی کپڑے بھی ہوتے تھے، پھر امام بخاری رحمہ اللہ کا اختیار عموماً ان آثار سے اخذ کیا گیا ہوتا ہے، جنھیں عادتاً وہ ترجمۃ الباب میں

---

[1] فتح الباري (١/ ٤٨٢)

[2] صحيح البخاري مع الفتح (٢/ ٥٤ و ١/ ٤٨٢) الإرواء (١/ ٢٧٨) صحيح مسلم مع شرح النووي (٣/ ٥/ ١٤٣، ١٤٤) صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٠٨) صحيح سنن الترمذي، رقم الحديث (١٣١) صحيح سنن النسائي، رقم الحديث (٥٣١، ٥٣٢) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٦٦٩)

وارد کر دیتے ہیں، جیسا کہ یہاں انھوں نے حضرت عکرمہ رحمہ اللہ کا اثر وارد کیا ہے، جس میں صرف ایک کپڑے میں عورت کی نماز کا جواز ذکر ہوا ہے، جس میں وہ سر تا پاؤں چھپ سکے۔

ظاہر ہے کہ یہ محض ضرورت و مجبوری کی وجہ سے ہوگا، ورنہ جمہور اہلِ علم کے نزدیک واجب یہ ہے کہ عورت کم از کم دو کپڑوں میں نماز پڑھے، جن میں قمیص پاؤں تک ہو۔ یہی بات امام ابن المنذر رحمہ اللہ نے بھی ایک دوسرے انداز سے بیان فرمائی ہے، چنانچہ انھوں نے جمہور اہل علم کا مسلک نقل کرتے ہوئے لکھا ہے:

”إِنَّ الْوَاجِبَ عَلَى الْمَرْأَةِ أَنْ تُصَلِّيَ فِي دِرْعٍ وَّخِمَارٍ“

”عورت پر واجب یہ ہے کہ وہ پاؤں تک آنے والی قمیص اور دوپٹے میں نماز پڑھے۔“

آگے اس کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”اس سے مراد یہ ہے کہ وہ اپنے بدن اور سر کو ڈھانپ کر نماز پڑھے۔“

آگے وہ یہ بھی لکھتے ہیں:

”اگر کپڑا بڑا ہو جس سے (بدن کے علاوہ) وہ اپنا سر بھی ڈھانپ سکتی ہو تو پھر وہ بھی جائز ہے۔“[1]

اس طرح عورت کے لباس کی یہ دو صورتیں ہوگئیں، ایک واجب اور دوسری بوقتِ ضرورت۔

3 افضل و مستحب لباس کی مقدار تین کپڑے:

لباس کی افضل و مستحب مقدار یہ ہے کہ عورت ایک نہ دو بلکہ تین کپڑوں میں نماز ادا کرے، کیونکہ یہ صورت زیادہ ساتر ہے، چنانچہ سنن کبریٰ بیہقی اور مصنف ابن ابی شیبہ میں امیر المومنین حضرت عمرِ فاروق رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

”تُصَلِّي الْمَرْأَةُ فِي ثَلَاثَةِ أَثْوَابٍ؛ دِرْعٍ وَّخِمَارٍ وَّإِزَارٍ“[2]

”عورت کو چاہیے کہ تین کپڑوں میں نماز ادا کرے، پاؤں تک لمبی قمیص اور دوپٹا اور قمیص کے نیچے ازار بند یا تہبند۔“

---

[1] فتح الباري (١/ ٤٨٢)

[2] تمام المنة (ص: ١٦٢) وصححه.

یعنی اگر ایسی لمبی قمیص یا میکسی پہنی ہو تو اس کے نیچے بوقتِ نماز تہبند کے طور پر استعمال کی جانے والی چادر بھی ہونی چاہیے، جس کا قائم مقام آج کل میکسی کے نیچے والا پاجامہ یا شلوار بھی ہوسکتی ہے۔

ایک دوسرے طریق سے مصنف ابن ابی شیبہ میں صحیح سند کے ساتھ حضرت عبداللہ بن عمر و رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ انھوں نے فرمایا:

''إِذَا صَلَّتِ الْمَرْأَةُ فَلْتُصَلِّ فِيْ ثِيَابِهَا كُلِّهَا: اَلدِّرْعِ وَالْخِمَارِ وَالْمَلْحَفَةِ''[1]

''عورت جب نماز پڑھے تو اسے چاہیے کہ اپنے تمام کپڑوں میں نماز پڑھے، یعنی پاؤں تک لمبی قمیص، دوپٹا اور اوپر کی بڑی چادر۔''

امام ابن المنذر رحمہ اللہ نے امام عطا اور ابن سیرین رحمہما اللہ کے آثار بھی ذکر کیے ہیں، جن میں سے امام عطا رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''تُصَلِّيْ فِيْ دِرْعٍ وَّخِمَارٍ وَّإِزَارٍ''[2]

''عورت لمبی قمیص، دوپٹے اور ازار (پاجامہ) میں نماز پڑھے۔''

امام ابن سیرین رحمہ اللہ نے تو امام عطا کے ذکر کردہ تین کپڑوں کے ساتھ ملحفہ کا بھی اضافہ کیا ہے کہ بڑی قمیص کے نیچے ازار یا پاجامہ بھی ہو اور دوپٹے کے اوپر بڑی چادر بھی ہو۔[3] اس طرح یہ چار کپڑے ہوجاتے ہیں۔ ان تین یا چار کپڑوں پر دلالت کرنے والے آثار کو نقل کرنے کے بعد امام ابن المنذر رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''فَإِنِّيْ أَظُنُّهُ مَحْمُوْلًا عَلَى الْإِسْتِحْبَابِ''[4]

''میرا خیال ہے کہ یہ (دو سے زیادہ کپڑوں کا پہننا) استحباب پر محمول کیا گیا ہے۔''

ان سے پہلے ذکر کیے گئے تین کپڑوں کا پتا دینے والے آثار کے بارے میں صاحبِ ارواء الغلیل لکھتے ہیں:

---

[1] تمام المنة (ص: ١٦٢) وصححه.

[2] فتح الباري (١/ ٢/ ٤٨٢)

[3] فتح الباري (١/ ٥٧٥)

[4] فتح الباري (١/ ٥٧٥)

’’یہ دو کپڑوں کا پتا دینے والے آثار (امہات المومنین رضی اللہ عنہن) کے آثار منافی بھی نہیں، بلکہ تین کپڑوں پر مشتمل لباس اس کی اکمل وافضل صورت پر محمول ہوگا۔‘‘[1]

عورتوں کا پتلون پہننا:

عورتوں کا پتلون پہننا نماز کے لیے ہو یا عام حالات میں، کسی بھی صورت میں ایسا لباس پہننا عورت کے لیے جائز نہیں، جو اتنا تنگ و چست ہو کہ وہ عورت کے جسم کے اعضا اور خصوصاً مفاتنِ جسم کی حد بندی کر کے اور انھیں الگ الگ کر کے ان کے حدودِ اربعہ کی چغلی کھائے۔ اسی اصول کے پیش نظر اہلِ علم نے عورت کے لیے پتلون کا استعمال جائز قرار نہیں دیا، خصوصاً جبکہ اس میں مَردوں سے مشابہت پائی جاتی ہے، چناں چہ اس سلسلے میں خصوصی طور پر سعودی دارالافتاء سے صادر شدہ ایک فتوے کا اردو ترجمہ پیشِ خدمت ہے:

’’کسی عورت کے لیے جائز نہیں کہ وہ کوئی ایسا تنگ و چست لباس پہنے، جو اعضائے جسم کی حدود بندی کرنے والا ہو، کیونکہ یہ فتنے کا باعث ہے اور پتلون اکثر ایسی ہوتی ہے جو اپنے اندر اعضا کو بظاہر چھپا تو لیتی ہے لیکن ان کی حد بندی کر دیتی ہے۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ عورت کا پتلون پہننا مَردوں سے ان کی مشابہت اختیار کرنے کے زمرے میں آئے، جبکہ مردوں سے مشابہت کرنے والی عورتوں پر نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے لعنت فرمائی ہے۔‘‘[2]

اسی سے ملتا جلتا فتویٰ ایک دوسرے معروف سعودی عالم شیخ ابن جبرین نے بھی دیا ہے۔[3]

نماز میں چہرے اور ہاتھوں کا حکم:

اب رہا مسئلہ نماز کے دوران میں عورت کے چہرے اور ہاتھوں کا تو ان دونوں اعضا کو ننگا رکھا جا سکتا ہے، خصوصاً جبکہ عورت اکیلی ہو یا شوہر ومحارم یا کسی دوسری عورتوں کی موجودگی میں نماز پڑھے، اس پر استدلال سورۃ النور کی آیت کے بعض الفاظ سے کیا جاتا ہے، جس میں ارشادِ الٰہی ہے:

﴿وَقُلْ لِّلْمُؤْمِنٰتِ يَغْضُضْنَ مِنْ اَبْصَارِهِنَّ وَيَحْفَظْنَ فُرُوْجَهُنَّ وَلَا يُبْدِيْنَ

---

[1] تمام المنة (ص: ١٦٢)

[2] فتاویٰ إسلامية (٣/ ١٨٩، ١٩٩)

[3] فتاویٰ إسلامية (٣/ ١٩٢)

زِيْنَتَهُنَّ اِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَلْيَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلٰى جُيُوبِهِنَّ وَلَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ اِلَّا لِبُعُولَتِهِنَّ اَوْ اٰبَآئِهِنَّ اَوْ اٰبَآءِ بُعُولَتِهِنَّ اَوْ اَبْنَآئِهِنَّ اَوْ اَبْنَآءِ بُعُولَتِهِنَّ اَوْ اِخْوَانِهِنَّ اَوْ بَنِيْٓ اِخْوَانِهِنَّ اَوْ بَنِيْٓ اَخَوٰتِهِنَّ اَوْ نِسَآئِهِنَّ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُنَّ اَوِ التّٰبِعِيْنَ غَيْرِ اُولِي الْاِرْبَةِ مِنَ الرِّجَالِ اَوِ الطِّفْلِ الَّذِيْنَ لَمْ يَظْهَرُوْا عَلٰى عَوْرٰتِ النِّسَآءِ وَلَا يَضْرِبْنَ بِاَرْجُلِهِنَّ لِيُعْلَمَ مَا يُخْفِيْنَ مِنْ زِيْنَتِهِنَّ وَتُوْبُوْٓا اِلَى اللّٰهِ جَمِيْعًا اَيُّهَ الْمُؤْمِنُوْنَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ﴾ [النور:۳۱]

’’اور (اے میرے نبی!) مومن عورتوں سے فرما دیجیے کہ وہ اپنی نظریں بچا کر رکھیں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں اور اپنا بناؤ سنگھار نہ دکھائیں، سوائے اس کے جو خود ظاہر ہوجائے اور اپنے سینوں پر اوڑھنیوں کے آنچل ڈالے رکھیں اور وہ اپنا بناؤ سنگھار نہ ظاہر کریں، مگر ان لوگوں کے سامنے: شوہر، باپ، شوہروں کے باپ (سسر) ان کے بیٹے، ان کے شوہروں کے بیٹے (جو کسی دوسری بیوی سے ہوں) ان کے بھائی، ان کے بھائیوں کے بیٹے (بھتیجے) اور ان کی بہنوں کے بیٹے (بھانجے) ان کے میل جول کی عورتیں اور ان کے لونڈی و غلام اور وہ زیردست مرد جو کسی اور قسم کی (نفسانی) غرض نہ رکھتے ہوں اور وہ بچے جو عورتوں کی پوشیدہ باتوں سے ابھی واقف نہ ہوں اور اپنے پاؤں زمین پر مارتی ہوئی نہ چلا کریں کہ اپنی جو زینت انھوں نے چھپا رکھی ہو اس کا لوگوں کو علم ہوجائے اور ایمان والو! تم سب کے سب اللہ سے توبہ کرو، تاکہ تم فلاح پا جاؤ۔‘‘

زینت کا عدمِ اظہار یا پردہ:

اس آیتِ کریمہ میں ان تمام رشتے داروں اور بعض دوسرے لوگوں کا ذکر آ گیا ہے، جن کے سامنے عورت کا اپنی زینت اور بناؤ سنگھار ظاہر کرنا ممنوع نہیں ہے، ان رشتے داروں میں باپ کے مفہوم میں دادا، پردادا، اور نانا، پرنانا بھی شامل ہیں، لہٰذا عورت اپنے ددھیال اور ننھیال اور اپنے شوہر کے ددھیال و ننھیال کے بھی انھی سب بزرگوں کے سامنے اسی طرح آ سکتی ہے، جس طرح اپنے والد یا سسر کے سامنے آ سکتی ہے۔

یہاں آپ کو ایک عجیب بات بتائیں کے بعض علاقوں (پنجاب وغیرہ) میں ان رشتے داروں میں سے جن سے پردے کا اور بناؤ سنگھار نہ دکھانے کا حکم دیا گیا ہے، ان سے تو کوئی پردہ نہیں کیا جاتا، بلکہ پورے بناؤ سنگھار کے ساتھ ان میں گھل مل کر رہا جاتا ہے، لیکن سسر جنھیں اللہ تعالیٰ نے حقیقی باپ والا درجہ دیا ہے، ان سے گھونگھٹ نکالا اور پردہ کیا جاتا ہے، جو ہمارے مسلمانوں کی دینی تعلیمات سے دوری کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ ولا حول ولا قوة إلا بالله.

ایسے ہی اس آیت میں بیٹوں کا ذکر ہے، تو ان میں پوتے، پرپوتے اور نواسے پرنواسے بھی سب شامل ہیں، اس معاملے میں سگے اور سوتیلے کا بھی کوئی فرق نہیں ہے، اپنے سوتیلے بچوں کی اولاد کے سامنے بھی عورت اسی طرح آزادی کے ساتھ اظہارِ زینت کر سکتی ہے، جس طرح خود اپنی اولاد اور اولاد کی اولاد کے سامنے کر سکتی ہے۔

ایسے ہی اس آیت میں بھائیوں کا ذکر آیا ہے اور بھائیوں میں سگے (یا حقیقی جو ماں اور باپ دونوں کی طرف سے بھائی ہوں) اور سوتیلے (جو صرف باپ کی طرف سے بھائی ہوں، مگر ان کی ماں الگ ہو) اور ماں جائے (جو صرف ماں کی طرف سے بھائی ہوں مگر باپ الگ ہو یہ) سب بھائیوں کے مفہوم میں شامل ہیں۔

نیز اس آیت میں بھائیوں بہنوں کے بیٹوں کا ذکر آیا ہے، ان بھائی بہنوں سے مراد مذکورہ سابقہ تینوں قسم کے بھائی بہن ہیں اور ان کے بیٹوں، پوتوں اور نواسوں، سب پر ان کی اولاد کا اطلاق ہوتا ہے، ان سب کے سامنے بھی اظہارِ زینت جائز ہے۔

ان قریبی رشتے داروں کے بعد اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کا ذکر بھی کر دیا ہے، جو ایسے رشتے دار تو نہیں، لیکن کسی نہ کسی وجہ سے ان کے سامنے زیب و زینت اور بناؤ سنگھار کا اظہار جائز ہے اور ان میں سب سے پہلے ''اپنے میل جول کی عورتیں'' ذکر کی گئی ہیں۔ اپنے ''میل جول'' کی شرط سے یہ بات خود بخود ظاہر ہو جاتی ہے کہ آوارہ و بد اطوار عورتوں کے سامنے بھی شریف مسلمان عورت کو اپنی زینت کا اظہار نہیں کرنا چاہیے، جبکہ ﴿أَوْ نِسَآئِهِنَّ﴾ کی ضمیر اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ میل جول کی عورتیں بھی مسلمان مراد ہیں نہ کہ کافر و مشرک ہوں، چنانچہ شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے اپنے رسالہ ''حجاب المرأة و لباسها في الصلاة'' (ص: ١٤، ٢١ بتحقيق شيخ ألباني) میں

جہاں آیتِ نور کی تفسیر ذکر کی ہے، وہاں (ص: ۱۵) اس بات کی صراحت بھی کی ہے کہ زینت کو بھی اللہ تعالیٰ نے دو قسموں میں تقسیم کیا ہے: ① زینتِ ظاہرہ ② زینتِ باطنہ۔

زینتِ ظاہرہ کو عورت اپنے شوہر اور محرم رشتے داروں کے سامنے ظاہر کر سکتی ہے، جبکہ زینتِ باطنہ (جیسے سر، بال، گردن وغیرہ ہیں) ان کے سوا کسی کے سامنے ظاہر نہیں کر سکتی۔

آگے چل کر (ص: ۲۱) ﴿أَوْ نِسَآئِهِنَّ﴾ کی تفسیر بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اس ضمیر کو لانے میں مشرک عورتوں سے احتراز مقصود ہے۔''

یہودی عورتیں ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور دوسری امہات المومنین اور صحابیات رضی اللہ عنہن کے پاس آیا کرتی تھیں اور مردوں کے برعکس وہ بھی ان کا صرف چہرا اور ہاتھ دیکھ سکتی تھیں، جبکہ ذمی (مسلم معاشرے میں رہنے والی غیر مسلم) عورتوں کی نسبت یہ زینت ظاہرہ ہے اور ان کے نزدیک مردوں کی نسبت یہ اعضاء بھی زینت باطنہ ہیں، جو ان کے سامنے ظاہر کرنے جائز نہیں ہیں۔ ذمی عورتوں کے سامنے صرف منہ اور ہاتھوں سے زیادہ جسم کا کوئی حصہ ظاہر نہیں کیا جائے گا۔ زینتِ ظاہرہ و باطنہ کی حدود بھی اس کے اظہار کے جواز کے حساب سے ہوں گی، یہی وجہ ہے کہ محرم رشتے داروں کے سامنے زینتِ ظاہرہ کے اظہار کو جائز کیا گیا ہے، جبکہ شوہر کے لیے اس کی حدود خاص ہیں، جو دوسرے اقارب کے لیے نہیں ہیں۔

غرض کہ شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کی اس صراحت سے کہ ان عورتوں سے مراد صرف مسلمان شریف عورتیں ہیں، اس سے اُن لوگوں کی بات کا ضُعف واضح ہوگیا، جو کہتے ہیں کہ ان سے مراد صالح و نیک اطوار عورتیں ہیں، جو چاہے مسلم ہوں یا کافر، ان کا قول صحیح نہیں ہے۔[1]

﴿ اَوِ التّٰبِعِيْنَ غَيْرِ اُولِي الْاِرْبَةِ مِنَ الرِّجَالِ﴾ [النور: ۳۱]

''اور وہ زیرِ دست لوگ جو کسی اور قسم کی غرض نہ رکھتے ہوں۔''

اس آیت میں زیرِ دست لوگوں کا ذکر آیا ہے، جو عمر کے اس پہر میں ہوں جس میں نفسانی خواہشات دم توڑ چکی ہوتی ہیں، تاکہ ان کے اس حد تک ضعیف العمر ہونے کی وجہ سے ان کے بارے میں یہ شبہہ کرنے کی گنجایش ہی نہ رہے کہ وہ اس گھر کی خواتین کے معاملے میں کوئی ناپاک خواہش

[1] حجاب المرأة المسلمة ولباسها في الصلاة (ص: ۲۱) مع التعليق، طبع چهارم.

کرنے کی ہمت کرسکیں گے۔

﴿وَلْيَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلٰى جُيُوبِهِنَّ﴾ [النور: ۳۱]

''انھیں چاہیے کہ اپنے سینوں پر اپنی اوڑھنیوں کے آنچل ڈالے رکھیں۔''

یہ اس بات کی دلیل ہے کہ عورت کو اپنی گردن بھی غیر محرم لوگوں سے چھپا کر رکھنی چاہیے اور اس کے گلے کا ہار وغیرہ زینتِ باطنہ شمار ہوگا نہ کہ ظاہرہ۔[1]

اس آیت میں ﴿اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُنَّ﴾ یعنی ملکِ یمین بھی ان لوگوں میں سے شمار کیے گئے ہیں، جن کے سامنے زینت ظاہرہ کا اظہار جائز ہے، لیکن ملک یمین سے مراد کون لوگ ہیں؟ حضرت سعید بن مسیّب رحمہ اللہ کی تفسیر کے مطابق تو ان سے مراد صرف کنیزیں (لونڈیاں) ہیں یا پھر اہلِ کتاب کنیزیں اور اسی قول کو امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ وغیرہ نے راجح کہا ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی تفسیر کی رو سے ان سے مراد غلام مرد ہیں، امام شافعی رحمہ اللہ وغیرہ کا یہی مسلک ہے اور امام احمد رحمہ اللہ کا ایک قول یہ بھی ہے اور اس کا تقاضا ہے کہ غلام کا اپنی آقا عورت کو دیکھنا جائز ہو اور اس مفہوم کی بعض احادیث بھی ہیں اور یہ جواز ضرورت کی وجہ سے ہے، کیونکہ وہ اسے بلانے کی بکثرت ضرورت مند رہتی ہے حتیٰ کہ شاہد، عامل اور پیغامِ نکاح دینے والوں سے بھی زیادہ اور جب ان کی نظر پڑنا جائز ہے تو غلام ان سے بھی اولیٰ ہے۔

غلام وغیرہ سے عدمِ حجاب اور سفر میں ان کا حکم:

اس میں یہ بھی نہیں کہ اب لازماً وہ اس کا محرم بن گیا ہے اور اس کے ساتھ وہ سفر کرسکتا ہے ہرگز نہیں، بلکہ غلام اور بے غرض وعمر رسیدہ مرد کا معاملہ صرف اتنا ہے کہ ان کے لیے نظر تو جائز ہے، لیکن وہ محرم نہیں ہوں گے کہ عورت ان کے ساتھ سفر پر نکل سکے۔ پس یہ ضروری نہیں کہ جس کے لیے نظر جائز ہو، اس کے ساتھ عورت کا سفر بھی جائز ہو یا خلوت وتنہائی جائز ہو، بلکہ غلام ضرورت کی بنا پر اپنی آقا عورت کو دیکھ تو سکتا ہے، لیکن اس کے ساتھ سفر یا تنہائی میں نہیں بیٹھ سکتا، کیونکہ وہ صحیحین میں مذکور اس ارشاد میں داخل نہیں ہے، جس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

---

[1] حوالہ سابقہ نیز دیکھیے: تفسیر القرطبي (۱۲/ ۱٥٤، ۱٥۷) تفہیم القرآن (۳/ ۳۸۷، ۳۹۳) حواشی مولانا مودودی برترجمہ قرآن۔

«لَا تُسَافِرُ الْمَرْأَةُ إِلَّا مَعَ زَوْجٍ أَوْ ذِي مَحْرَمٍ»[1]

''کوئی عورت اپنے شوہر یا محرم کے سوا کسی کے ساتھ سفر نہ کرے۔''

غلام اس ارشاد میں اس لیے داخل نہیں، کیوں کہ اگر وہ آزاد ہوجائے تو اپنی آقا سے نکاح کر سکتا ہے، جیسا کہ اس عورت کا بہنوئی بھی اس کی بہن کو طلاق دینے کے بعد اس سے نکاح کر سکتا ہے، کیوں کہ وہ محرم شمار نہیں ہوتا اور ایسے ہی غلام بھی محرم نہیں ہوتا اور بہنوئی کی حرمت بھی عارضی ہوتی ہے، جو طلاق کے ساتھ ہی ختم ہوجاتی ہے اور ایسے ہی بے غرض بوڑھا، چاہے عمر رسیدہ ہی سہی، لیکن محرم نہیں ہوسکتا۔

سفر میں رفاقت کا جواز صرف اس محرم کے لیے ہے جو دائمی محرم ہو۔ (جیسے باپ، بھائی، بیٹا وغیرہ ہیں) یہی وجہ ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کا ارشاد ہے:

''سَفَرُ الْمَرْأَةِ مَعَ عَبْدِهَا ضَيْعَةٌ''[2]

''عورت کا اپنے غلام کے ساتھ سفر کرنا (اپنے شرف کو) ضائع کرنا ہے۔''

یہی الفاظ ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی حیثیت سے مسند بزار اور طبرانی اوسط میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مرفوعاً بھی مروی ہیں، لیکن وہ مرفوع حدیث صحیح نہیں ہے۔[3]

پس معلوم ہوا کہ سورۃ النور کی آیت میں محرم رشتے داروں اور بعض دوسرے لوگوں کے سامنے اظہارِ زینت کی اجازت دی گئی ہے، جبکہ سفر والی حدیث میں محرم رشتے داروں کے سوا کسی دوسرے کے ساتھ نکلنے کی اجازت نہیں۔[4]

اس آیت میں چچاؤں اور ماموؤں کا ذکر نہیں آیا، حالانکہ وہ بھی محرم ہیں، ایسے ہی دودھ شریک (رضاعی) محارم کا تذکرہ بھی نہیں ہوا، جب کہ تمام فقہا کا اس بات پر اتفاق ہے کہ ان سب کا حکم بھی اُن محارم کا ہے، جن کا مذکورہ آیت میں ذکر آ گیا ہے۔

[1] الإرواء (٤/ ١٧٣) مسند الشافعي، رقم الحديث (٧٥٦) مسند أحمد (١/ ٢٢٢) صحيح الجامع، رقم الحديث (٧٣٠١) یہ حدیث مختلف الفاظ کے ساتھ حضرت ابن عمر، ابن عباس، ابوہریرہ اور ابوسعید خدری رضی اللہ عنہم سے مروی ہے۔ ملاحظہ ہو: تخریج سوئے حرم (ص: ۴۴ تا ۴۶)

[2] حجاب المرأة المسلمة لابن تيمية (ص: ٦٠)

[3] الحجاب (ص: ٢٠) و ضعيف الجامع (٢/ ٣/ ٢١٩)

[4] الحجاب لابن تيمية أيضاً

ماموؤں اور چچاؤں کا تذکرہ اس آیت میں نہ آنے کا بھید یہ ہے کہ یہ تو آبا واجداد کے برابر ہی ہوتے ہیں، لہٰذا ان کا ذکر کرنے کی ضرورت ہی نہیں تھی، ویسے بھی چچا پر باپ کا اطلاق ہوتا ہے، جیسا کہ قرآنِ کریم سورۃ البقرہ کی اس آیت میں حضرت یعقوب علیہ السلام کے بیٹوں کا قول اللہ تعالیٰ نے نقل فرمایا ہے کہ انھوں نے کہا:

﴿ نَعْبُدُ اِلٰهَكَ وَ اِلٰهَ اٰبَآئِكَ اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَ اِسْحٰقَ اِلٰهًا وَّاحِدًا﴾ [البقرۃ: ۱۳۳]

''ہم آپ کے اور آپ کے باپ دادوں ابراہیم، اسماعیل اور اسحاق کے معبودِ واحد کو پوجیں گے۔''

اس آیت میں حضرت اسماعیل علیہ السلام کو یعقوب علیہ السلام کے آبا و اجداد میں ذکر کیا ہے، حالانکہ وہ ان کے چچا تھے، گویا چچا پر باپ کا اطلاق بھی ہوتا ہے، اس لیے بھی چچا کا الگ سے ذکر نہیں کیا گیا۔

رضاعی محارم کا ذکر بھی اس آیت میں نہیں آیا، بلکہ صرف سنتِ مطہرہ ہی میں اس کے ذکر پر اکتفا کیا گیا ہے، کیونکہ صحیحین، سنن ابی داود، نسائی، ابن ماجہ اور مسند احمد میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے اور صحیح مسلم، سنن نسائی، ابن ماجہ و مسندِ احمد میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے:

((يَحْرُمُ مِنَ الرَّضَاعَةِ مَا يَحْرُمُ مِنَ النَّسَبِ))[1]

''رضاعت سے بھی وہی حرمت حاصل ہوتی ہے، جو نسب سے حاصل ہوتی ہے۔''

یہ اس آیتِ نور کی مختصر تفسیر ہے، جس میں یہ ذکر آ گیا ہے کہ اظہارِ زینت کس کس کے سامنے ناجائز اور زینت ظاہرہ و غیر ظاہرہ میں سے کون سی کس کے سامنے جائز اور ہر دو کی حدود کیا ہیں؟

آمدم برسرِ مطلب:

اسی آیتِ نور میں ارشادِ ہے:

﴿وَلاَ يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ اِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَلْيَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلٰى جُيُوبِهِنَّ﴾ [النور: ۳۱]

---

[1] صحيح الجامع (٣/ ٦/ ٣٢٧) صحيح مسلم مع شرح النووي (٥/ ١٠/ ٢٣) صحيح سنن النسائي، رقم الحديث (٣٠٩٩) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٩٣٨) حديث عائشة صحيح البخارى مع الفتح، رقم الحديث (٥٠٩٩) صحيح مسلم مع شرح النووي (٥/ ١٠/ ١٨، ٢١) صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (١٨١٠) صحيح سنن النسائي، رقم الحديث (٣٠٩٤، ٣٠٩٥، ٣٠٩٦)

''عورتیں اپنی زینت ظاہر نہ کریں سوائے اس کے جو (خود بخود) ظاہر ہو جائے اور انھیں چاہیے کہ وہ اپنے گریبانوں (سینوں) پر اپنی اوڑھنیوں کے آنچل ڈالے رہیں۔''

یہاں جو ﴿اِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا﴾ کے الفاظ ہیں کہ ''سوائے اس کے جو (خود بخود) ظاہر ہو جائے۔'' اسے زینتِ ظاہرہ قرار دیا گیا ہے، جو نماز میں عورت ظاہر کر سکتی ہے اور وہ ہے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے قول کے مطابق چہرے اور ہاتھوں کی زینت، جس کا اظہار نماز میں جائز ہے۔ گویا دورانِ نماز عورت اپنے چہرے اور ہاتھوں کو ننگا رکھ سکتی ہے، بلکہ شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

''بالاجماع چہرے، ہاتھوں اور پاؤں کا ڈھانپنا واجب نہیں ہے، بلکہ چہرے کا ننگا کرنا بالاجماع جائز ہے، اگرچہ یہ زینت باطنہ میں سے ہے، ایسے ہی جمہور علمائے امت کے نزدیک جن میں امام ابو حنیفہ، امام شافعی رحمہ اللہ اور ایک روایت کے مطابق امام احمد رحمہ اللہ بھی شامل ہیں، نماز میں ہاتھوں کا ظاہر کرنا بھی جائز ہے۔''[1]

یہ تو ہے چہرے اور ہاتھوں کا حکم، جو مختصر انداز سے صرف نماز کے اندر اندر کے لیے بیان ہوا ہے، رہا معاملہ عام حالات میں نماز سے باہر گلی بازار چلتے وقت پردے کے سلسلے میں ان کا حکم بھی موقع کی مناسبت سے ہم اس موضوع کو بھی قدرے تفصیل کے ساتھ بیان کیے دیتے ہیں، لیکن پہلے نماز ہی کے اندر اندر عورت کے پاؤں کا حکم کہ آیا وہ انھیں ڈھانپ کر رکھے یا کھلا رکھ سکتی ہے؟

نماز میں پاؤں کا حکم:

اس سلسلے میں ایک رائے تو یہ ہے کہ نماز میں عورت اپنے پاؤں کو بھی اور خصوصاً ان کے اوپر کے حصوں کو ڈھانپ کر رکھے، اس پر اس روایت سے استدلال کیا جاتا ہے، جو ام المومنین حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے سنن ابو داود، بیہقی، مستدرک حاکم، موطأ امام مالک اور طبقات ابن سعد میں مرفوعاً اور موقوفاً دونوں طرح سے مروی ہے۔ موقوف روایت میں ہے کہ محمد بن زید کی والدہ نے ام المومنین حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا:

''مَا ذَا تُصَلِّيْ فِيْهِ الْمَرْأَةُ مِنَ الثِّيَابِ؟''، ''عورت کتنے کپڑوں میں نماز پڑھے؟''

تو انھوں نے فرمایا:

[1] الحجاب لابن تيمية (ص: ٢٤، ٢٥)

''تُصَلِّيْ فِي الْخِمَارِ وَالدِّرْعِ السَّابِغِ الَّذِيْ يُغِيْبُ ظُهُوْرَ قَدَمَيْهَا''[1]

''سر کی اوڑھنی یا دوپٹے اور اتنی لمبی قمیص میں نماز پڑھے، جو اس کے پاؤں کے اوپر والے حصوں کو ڈھانپ لے۔''

یہ موقوف روایت موطا امام مالک، سنن ابو داود، بیہقی اور طبقات ابن سعد میں مروی ہے۔ دوسری مرفوع روایت میں ہے، جو سنن ابو داود، مستدرک حاکم اور بیہقی میں ہے مروی ہے کہ ام المومنین حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا تھا:

''أَتُصَلِّي الْمَرْأَةُ فِيْ دِرْعٍ وَّخِمَارٍ لَيْسَ إِزَارٌ؟''

''کیا عورت (تہبند کے طور پر استعمال ہونے والی) چادر کے بغیر صرف دوپٹے اور لمبی قمیص میں نماز پڑھ لے؟''

تو اس روایت میں مرفوعاً یہ بات نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کی گئی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«إِذَا كَانَ الدِّرْعُ سَابِغًا يُغَطِّيْ ظُهُوْرَ قَدَمَيْهَا»[2]

''ہاں پڑھ لے، جبکہ اس کی قمیص اتنی لمبی ہو کہ وہ اس کے پاؤں کے اوپر والے حصوں کو ڈھانپ لے۔''

اس موقوف اور مرفوع روایت سے نماز میں قدموں کو ڈھانپنے خصوصاً ان کے بالائی حصوں کو ڈھانپنے پر استدلال صحیح ہوتا، اگر یہ روایات صحیح ہوتیں، لیکن ایسا نہیں ہے، بلکہ یہ دونوں روایات ہی صحیح نہیں ہیں، نہ تو موقوفاً اور نہ ہی مرفوعاً، کیونکہ اس مرفوع روایت کو بیان کرنے کے بعد خود امام ابو داود نے لکھا ہے:

''اس روایت کو مالک بن انس، بکر بن مضر، حفص بن غیاث، اسماعیل بن جعفر، ابن ابی ذئب اور ابن اسحاق نے محمد بن زید عن امہ عن ام سلمۃ کے طریق سے ذکر کیا ہے اور ان میں سے کسی ایک نے بھی نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر نہیں کیا، بلکہ اسے حضرت ام سلمہ تک ہی موقوفاً بیان کیا ہے۔''[3]

---

[1] سنن أبي داود مع العون (٢/ ٣٤٣) الإرواء (١/ ٣٠٣، ٣٠٤)

[2] حوالہ جاتِ سابقہ، و تلخيص الحبير (١/ ٢٧٩، ٢٨٠) سنن أبي داود، رقم الحديث (٦٤٠)

[3] سنن أبي داود مع العون (٢/ ٣٤٤)

اس سے معلوم ہوا کہ عبدالرحمٰن بن عبداللہ بن دینار کا اس روایت کو مرفوعاً بیان کرنا صحیح نہیں ہے، جب کہ امام منذری رحمہ اللہ نے مختصر السنن میں اس راوی عبدالرحمٰن کے بارے میں کہا ہے:

"وَفِيْهِ مَقَالٌ"[1] "اس راوی پر کلام کیا گیا ہے۔"

جو یوں ہے کہ یہ راوی اگرچہ رجالِ صحیح بخاری میں سے ہیں، مگر ان کا حافظہ کمزور تھا اور تفرد و مخالفت کے وقت ایسا راوی قابلِ حجت نہیں ہوتا، لہٰذا یہ روایت مرفوعاً صحیح نہیں ہے۔[2]

اب رہا معاملہ موقوف روایت کا تو وہ بھی صحیح نہیں ہے، کیونکہ اس کا دارومدار بھی ام محمد بن زید پر ہے اور وہ مجہول راویہ ہیں۔ امام شوکانی رحمہ اللہ نے "نیل الأوطار" (۱/ ۲/ ٦٩) میں اس روایت کے مرفوع ہونے کو راجح قرار دیا ہے، جو کہ صاحبِ "تمام المنة" کے بقول اس راویہ کی جہالت، ان کے ذہن میں مستحضر نہ ہونے کا نتیجہ ہے۔ البتہ خود انھوں نے اپنی دوسری کتاب "السیل الجرار" (۱/ ١٦١) میں "لَا تَقُوْمُ بِهٖ حُجَّةٌ" کہہ کر خود ہی اپنی بات کا استدراک کر لیا ہے۔[3]

امام خطابی رحمہ اللہ نے معالم السنن شرح سنن ابو داود میں لکھا ہے کہ عورت کے لیے دورانِ نماز کن کن اعضائے جسم کو ڈھانپنا واجب ہے؟ اس سلسلے میں اختلاف ہے۔ امام شافعی اور امام اوزاعی رحمہما اللہ کے نزدیک چہرے اور ہاتھوں کے سوا سارے جسم کو ڈھانپے اور اسی کی روایت حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور امام عطاء رحمہ اللہ سے بھی ملتی ہے۔

امام احمد رحمہ اللہ کا کہنا ہے کہ دورانِ نماز اس کے جسم کا ناخن برابر حصہ بھی ننگا نہیں ہونا چاہیے۔ امام مالک رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اگر عورت نے اس حال میں نماز پڑھ لی کہ اس کے بال یا پاؤں کے اوپر والے حصے ننگے ہوگئے تو اگر وقت باقی ہو تو وہ اس نماز کو دہرائے۔ احناف کا مسلک نقل کرتے وقت لکھتے ہیں:

"ان کے نزدیک اگر بالوں، ران اور پیٹ کا ایک تہائی یا چوتھائی حصہ کھلا ہو تو اس کی نماز ناقص ہے اور اگر اس سے کم کھلا ہو تو پھر نہیں۔ کم از کم کی حد بندی میں ان کے یہاں

---

[1] بحواله عون المعبود (۲/ ۳۳٤)

[2] تمام المنة (ص: ١٦١) الإرواء (۱/ ۳۰٤) و انظر تحقيق الحجاب لابن تيمية (ص: ۲٥)

[3] دیکھیں: تمام المنة (ص: ١٦١) الإرواء (۱/ ۳۰۳، ۳۰٤) امام نووی رحمہ اللہ کا "المجموع" (۳/ ۱۷۲) میں سنن ابو داود کی سند کو جید کہنا ان کا ذہول ہے۔

اختلاف پایا جاتا ہے، جب کہ حد بندی کے سلسلے میں ان کے جتنے بھی اقوال ہیں، ان کی کوئی ایسی اصل نہیں جو اعتماد کے قابل ہو۔‘‘

پھر آگے اپنی طرف سے لکھتے ہیں:

’’اس روایت میں اس بات کی دلیل موجود ہے کہ اُسی کا قول صحیح ہے، جس کے نزدیک جسم کا کوئی بھی حصہ ظاہر ہونے پر نماز جائز نہیں۔ کیا آپ دیکھتے نہیں کہ نبیِ اکرم ﷺ نے فرمایا ہے کہ اس وقت عورت کی نماز ہوگی، جب اس نے وہ قمیص پہنی ہوگی، جو اس کے پاؤں کے اوپر کے حصوں کو بھی ڈھانپ لے۔ آپ ﷺ نے عورت کی نماز کے جائز ہونے کی شرط اس بات کو قرار دیا ہے کہ اس کے اعضائے جسم میں سے کچھ بھی ظاہر نہ ہو۔‘‘

ہم ذکر کر چکے ہیں کہ یہ روایت (ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے) مختلف کتبِ حدیث میں موقوفاً اور مرفوعاً دو طرح سے مروی ہے اور ان دونوں میں سے کوئی ایک بھی صحیح نہیں، لہٰذا اس سے استدلال کرنا بھی صحیح نہیں، چناں چہ امام خطابی رحمہ اللہ کے اس کلام کو تسامح ہی کہا جائے گا، جو کسی بھی محدّث یا عالم کے لیے عیب نہیں، بلکہ غیر نبی و غیر معصوم ہونے کی وجہ سے بشریت کا ایک تقاضا ہے۔

بعض صحیح احادیث:

البتہ قدموں کے پردے سے تعلق رکھنے والی ایک صحیح حدیث بھی ہے، جو مختلف طُرق سے سننِ اربعہ، بیہقی، دارمی، صحیح ابن حبان، موطا امام مالک اور مسند احمد و ابی یعلی میں ام المومنین حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے، جس میں وہ عورت کی چادر کے زیریں پلو کے بارے میں سوال کرتی ہیں تو ان کے جواب میں نبیِ اکرم ﷺ فرماتے ہیں:

«يُرْخِيْنَ شِبْراً» ’’وہ ایک بالشت لٹکائیں۔‘‘

انھوں نے عرض کی کہ ’’إِذَنْ يَنْكَشِفُ أَقْدَامُهُنَّ؟‘‘ (تب پھر ان کے قدم ننگے ہوں گے) تو آپ ﷺ نے فرمایا:

«فَيُرْخِيْنَهُ ذِرَاعاً لَا يَزِدْنَ عَلَيْهِ» [1]

---

[1] صحيح سنن أبي داود (٢/ ٧٧٦) صحيح سنن الترمذي (٢/ ١٤٧) صحيح سنن النسائي (٣/ ١٠٨٠) صحيح سنن ابن ماجه (٢/ ٢٧٩) السلسلة الصحيحة (٤/ ٤٧٨، ٤٨٠) المنتقىٰ (١/ ٢/ ٦٩) النيل (١/ ٢/ ١١٤) غاية المرام (ص: ٧٢، ٧٣) الموطأ مع التنوير (١/ ٣/ ١٠٥)

”تو پھر وہ ایک ذراع پلو لٹکا لیں، اس سے زیادہ نہ کریں۔“

ایک ذراع ہاشمی تقریباً چوالیس سینٹی میٹر کی ہوتی ہے، جیسا کہ شیخ زہیر الشاویش نے صحیح سنن ابی داود للألبانی کے حاشیے میں لکھا ہے۔ امام شوکانی رحمہ اللہ نے ”نیل الأوطار“ میں لکھا ہے کہ علامہ ابن رسلان کے بقول ایک بالشت یا ذراع (ہاتھ) پلو سے مراد بظاہر یہ ہے کہ اتنا پلو مردوں کی قمیص سے لمبا ہو، نہ یہ کہ اتنا زمین پر لگ رہا ہو۔[1]

علامہ ابن رسلان کی وضاحت کے مطابق ظاہر ہے کہ اگر مردوں کی قمیص کو گھٹنوں سے کچھ نیچے تک شمار کیا جائے تو ستر کے لیے کافی ہے اور اس پر ایک ہاتھ اور لمبا پلو یا کپڑا ہو تو اس عورت کے پاؤں تک ڈھک جائیں گے اور ایک بالشت میں جو پاؤں کے ننگا رہ جانے کا خدشہ ہوسکتا ہے، وہ بھی ختم ہوجائے گا۔

سنن ترمذی ونسائی میں یہ حدیث حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی حدیث کے ضمن میں آئی ہے، جبکہ ام المومنین ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے مروی حدیث کے مفہوم کی حدیث خود حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے سنن ابو داود و ابن ماجہ اور مسندِ احمد میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے بھی مروی ہے۔[2]

خلاصۂ کلام:

متعدد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے مروی اس حدیث کو محدّثینِ کرام نے صحیح قرار دیا ہے، لیکن کیا اس سے مسئلہ زیرِ بحث پر استدلال صحیح ہے یا نہیں؟

اس سلسلے میں یہ بات پیشِ نظر رہے کہ ان احادیث میں عام پردے کی بات ہے کہ عورت انھیں بھی ڈھانپ کر رکھے، جبکہ نماز کا اس میں کوئی ذکر نہیں ہے اور جس طرح نماز کے لیے بعض ائمہ وفقہا نے چہرے اور ہاتھوں کو مستثنیٰ کیا ہے، ایسے ہی پاؤں کے سلسلے میں امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کا مسلک یہ ہے کہ نماز میں عورت کا انھیں ڈھانپنا ضروری نہیں ہے، چنانچہ اس سلسلے میں شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

”اسی (چہرے اور ہاتھوں کو نماز میں ننگا کرنے کی) طرح پاؤں کو ننگا کرنا بھی امام ابو

---

[1] حاشية صحيح سنن أبي داود (٢/ ٧٧٦) نيل الأوطار (١/ ٢/ ٧٠)

[2] حوالہ جاتِ سابقہ۔

حنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک جائز ہے اور یہی مسلک قوی تر ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے پاؤں کو زینت ظاہرہ قرار دیا ہے، چنانچہ ابن ابی حاتم نے ان سے روایت بیان کی ہے کہ (سورت نور کی آیت کے الفاظ) ﴿وَلَا يُبْدِينَ زِينَتَهُنَّ إِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا﴾ [النور: ۳۱] میں ﴿مَا ظَهَرَ مِنْهَا﴾ سے مراد وہ انگوٹھیاں ہیں، جو چاندی کی ہوتی ہیں اور پاؤں کی انگلیوں میں پہنی جاتی ہیں۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ پہلے عورتیں اپنے چہرے اور ہاتھوں کی طرح ہی پاؤں بھی ظاہر کرلیا کرتے تھیں۔ وہ اپنی چادروں کے پلو گرا کر رکھتی تھیں، لیکن جب وہ چلتی تھیں تو کبھی پاؤں کھل جاتا تھا۔ وہ موزے اور بوٹ (جوتے) پہن کر تو نہیں چلا کرتی تھی اور پاؤں کو نماز میں ڈھانپنے کا عمل انسان کے لیے حرجِ عظیم کا باعث ہے۔''

پھر ام المومنین حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کی موقوف روایت ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

''(اگرچہ عورت نماز کے وقت اپنے پاؤں کے اوپر والے حصے کو ڈھانپ کر ہی کیوں نہ کھڑی ہو لیکن) جب وہ سجدہ کرے گی تو پھر پاؤں کے اندرونی حصوں (تلوؤں) کے ظاہر ہوجانے کا امکان ہوتا ہے۔''[1]

گویا نماز میں عورت کے لیے جائز ہے کہ وہ جب اپنے گھر میں ہو تو چہرہ، دونوں ہاتھ اور پاؤں ننگے رکھ سکتی ہے۔ نماز میں ستر پوشی کا عام حالت کی ستر پوشی سے کوئی ربط وتعلق نہیں، بلکہ بعض اعضا کو عورت نماز میں ظاہر کرسکتی ہے، عام حالات میں نہیں اور بعض اعضا کو شوہر اور دوسرے محرم رشتے داروں کے سامنے ظاہر کرسکتی ہے، مگر نماز میں نہیں۔ چاہے وہ کسی بند جگہ میں اکیلی ہی کیوں نہ ہو، مثلاً عورت نماز میں دوپٹا لیے بغیر نماز پڑھے تو اس کی نماز ہی نہیں ہوتی، جبکہ اپنے گھر میں شوہر اور محرم رشتے داروں کے سامنے وہ سر ننگا رکھ سکتی ہے۔ گویا یہ نماز میں زینت اختیار کرنا، حقوق اللہ میں سے ایک حق ہے اور یہ زینت لوگوں سے پردہ کرنے کے لیے نہیں ہے، بلکہ اللہ کے دربار میں حاضری کا ایک لازمی اور واجب ادب ہے۔

ایسے ہی مردوں کے لیے جائز ہے کہ وہ اپنے کندھوں کو ننگا رکھیں، لیکن جب نماز کا وقت ہو تو

[1] الحجاب لابن تيمية (ص: ٢٥)

ان کا ڈھانپنا ضروری ہے، بلکہ کپڑے میں وسعت کے ہوتے ہوئے ننگے کندھوں سے نماز بعض کے نزدیک تو ہوتی ہی نہیں۔ اگرچہ جمہور نے اس نہی کو نہی تنزیہی قرار دیا ہے کہ نماز میں کندھوں کو ننگے رکھنا ٹھیک نہیں، اس سے پرہیز ہی بہتر ہے، البتہ نماز ہو جائے گی۔

نماز کے علاوہ کندھوں کو ننگا کرنے میں حرج نہیں۔ نماز میں انھیں ڈھانپنا حقوق و آدابِ نماز کی وجہ سے ہے، جب کہ اس کے برعکس معاملہ عورت کے چہرے، ہاتھوں اور پاؤں کا ہے کہ صحیح تر قول کے مطابق وہ ان اعضا کو غیر محرم کے سامنے ننگا نہیں رکھ سکتی، لیکن نماز میں ان کا ڈھانپنا بالاتفاق واجب نہیں ہے، بلکہ نماز میں چہرہ ننگا رکھنے کے جواز پر تو اجماع ہے۔ جمہور کے نزدیک ہاتھوں کا ننگا رکھنا بھی جائز ہے۔ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک پاؤں بھی ننگے رکھ سکتی ہے۔ اس سلسلے میں امام صاحب کے مسلک کو شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے سب سے قوی قرار دیا ہے۔[1]

اگر کبھی عورت کو کسی ایسی جگہ نماز پڑھنی پڑے، جہاں اجنبی مرد بھی موجود ہوں تو وہاں اسے ان اعضا کو بھی ڈھانپنا ہوگا، کیونکہ غیر محرم لوگوں کی موجودگی میں عورت کا سارا جسم ہی مقامِ ستر ہے، جیسا کہ ایک صحیح حدیث میں ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے:

«اَلْمَرْأَةُ عَوْرَةٌ» ''عورت کا سارا جسم ہی مقامِ ستر ہے۔''

حتیٰ کہ اس کے سر کے بال بھی مقامِ ستر ہیں، جیسا کہ ایک صحیح حدیث ذکر کی جا چکی ہے، جس میں ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے:

«لَا يَقْبَلُ اللّٰهُ صَلَاةَ حَائِضٍ إِلَّا بِخِمَارٍ»[2]

''اللہ تعالیٰ کسی بالغ عورت کی نماز دوپٹے کے بغیر (سر ڈھانپے بغیر) قبول نہیں کرتا۔''

ابھی پچھلے اوراق میں ان بعض احادیث کا تذکرہ بھی کیا جا چکا ہے، جن میں سے ایک حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے اور اس میں پیروں کو بھی مقامِ ستر شمار کیا گیا ہے، لہٰذا غیر محرم لوگوں کی موجودگی میں کوئی عورت نماز پڑھے تو پاؤں کو بھی ڈھانپ کر پڑھے اور یہی معاملہ گلی بازار چلتے وقت بھی ہے، البتہ اکیلے میں نماز کے وقت پاؤں کھلے رکھ سکتی ہے۔

---

[1] مختصر الحجاب لابن تيمية (ص: ٢٢، ٢٥، ٢٩، ٣٣)

[2] الإرواء (١/ ٢١٤) و تلخيص الحبير (١/ ٢٧٩) صحيح الجامع، رقم الحديث (٧٧٤٧) مسند أحمد (٦/ ١٥٠، ٢١٨) في مسند عائشه، صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (٥٩٦) صحيح سنن الترمذي، رقم ←

نماز سے باہر پاؤں کا حکم:

ام المومنین حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا، اسی طرح ابن عمر و ابو ہریرہ رضی اللہ عنہما سے مروی سابقہ احادیث اس بات کا پتا دیتی ہیں کہ نماز سے باہر عام حالت میں اور غیر محرم لوگوں کے سامنے عورت کے پاؤں بھی مقامِ ستر ہیں، اسی طرح اس بات کا پتا قرآنِ کریم کی آیت سے بھی چلتا ہے، جیسا کہ سورۃ النور میں ارشادِ الٰہی ہے:

﴿وَلَا يَضْرِبْنَ بِأَرْجُلِهِنَّ لِيُعْلَمَ مَا يُخْفِينَ مِنْ زِيْنَتِهِنَّ﴾ [النور: ٣١]

''اور وہ اپنے پاؤں زمین پر مارتی ہوئی نہ چلا کریں کہ اپنی جو زینت انھوں نے چھپا رکھی ہو، اس کا لوگوں کو علم ہو جائے۔''

اس ارشادِ الٰہی کے ان الفاظ سے معلوم ہوا کہ عورت کے لیے پاؤں کو ڈھانپ کر رکھنا بھی ضروری ہے، اگر ایسا نہ ہوتا تو پھر زمین پر پاؤں مارے بغیر چلتے وقت عورت اپنے پاؤں کی زینت پازیب وغیرہ ظاہر کر سکتی تھی، لیکن ایسا نہیں، بلکہ شرعاً پاؤں بھی مقامِ ستر ہیں اور عہدِ رسالت میں ایسا تو سوچا بھی نہیں جا سکتا کہ عورتیں حکمِ شریعت سے سرتابی کرتی ہوں، لہٰذا اپنے پاؤں کی زینت کے اظہار کا یہی ایک طریقہ تھا کہ پاؤں کو زور سے زمین پر مار کر پازیب کا پتا دیا جائے تو اسلام نے اس انداز سے چلنے کی بھی ممانعت کر دی۔

علامہ ابن حزم رحمہ اللہ نے ''المحلّٰی'' (٢/ ٢١٦) میں اس آیت کے انھی الفاظ سے استدلال کرتے ہوئے لکھا ہے:

''هٰذَا نَصٌّ عَلٰى أَنَّ الرِّجْلَيْنِ وَالسَّاقَيْنِ مِمَّا يُخْفٰى، وَلَا يَحِلُّ إِبْدَاؤُهٗ'' [1]

''یہ آیت اس بات پر نص ہے کہ (عورت کے) دونوں پاؤں اور پنڈلیاں ایسے اعضا میں سے ہیں، جن کا ڈھانپنا ضروری ہے اور ظاہر کرنا جائز نہیں ہے۔''

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے بھی اپنے رسالے ''حجاب المرأة'' (ص: ٢٤) میں لکھا ہے کہ صحیح تر قول کے مطابق عورت چہرے، ہاتھوں اور پاؤں کو اجنبی مردوں کے سامنے ننگا نہیں کر سکتی۔

← الحديث (٣١١) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٦٥٥) المستدرك للحاكم (١/ ٢٥١) وقال: صحيح على شرط مسلم.

[1] المحلّٰى (٣/ ٢١٦، ٢١٧) حجاب الألباني (ص: ٣٦)

عورت کے لیے لباس کا کپڑا:

یہ تو ہوا نماز میں عورت کے لباس سے تعلق رکھنے والی بعض تفصیلات، جبکہ یہاں یہ بات بھی پیشِ نظر رہے کہ احادیث میں عورت کے لباس کی ان تفصیلات کے علاوہ اس بات کی صراحت بھی آئی ہے کہ اس کے لباس کا کپڑا کیسا ہونا چاہیے۔ یہ نہیں کہ جس کپڑے میں چاہے نماز پڑھنے لگے یا گلی بازار میں نکل جائے، بلکہ بعض احادیث سے پتا چلتا ہے کہ لباس کا کپڑا ایسا نہیں ہونا چاہیے کہ پتلا ہونے کی وجہ سے وہ جسم کے رنگ کی چغلی کھائے یا تنگ و چست ہونے کی وجہ سے اعضائے جسم کی حد بندی کرنے کی گستاخی کا مرتکب ہو رہا ہو، کیونکہ ایسا لباس اس دربارِ عالی کی حاضری کے شایانِ شان نہیں، چنانچہ معجم طبرانی صغیر میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

«سَيَكُوْنُ فِيْ آخِرِ أُمَّتِيْ نِسَاءٌ كَاسِيَاتٌ عَارِيَاتٌ عَلٰى رُؤُوْسِهِنَّ كَأَسْنِمَةِ الْبُخْتِ، اِلْعَنُوْهُنَّ فَإِنَّهُنَّ مَلْعُوْنَاتٌ»[1]

''میری امت کے آخری دور میں ایسی عورتیں ہوں گی جو لباس پہننے کے باوجود عریاں (ننگی) ہوں گی، ان کے سروں پر بختی اونٹوں کی کوہانوں جیسے (جوڑے) ہوں گے، ان پر لعنت بھیجو وہ ہیں ہی ملعون عورتیں۔''

صحیح مسلم، موطا امام مالک اور مسند احمد میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں ان الفاظ پر مستزاد یہ بھی ہے:

«لَا يَدْخُلْنَ الْجَنَّةَ، وَلَا يَجِدْنَ رِيْحَهَا، وَإِنَّ رِيْحَهَا لَتُوْجَدُ مِنْ مَّسِيْرَةِ كَذَا وَكَذَا»[2]

''وہ جنت میں داخل نہیں ہوں گی اور نہ اس کی خوشبو تک پائیں گی، جب کہ جنت کی خوشبو اتنے عرصے (پچاس سال) کے فاصلے پر بھی پائی جائے گی۔''

لباس ہونے کے باوجود کوئی عورت عریاں یا ننگی کیسے ہوسکتی ہے؟ اس کی وضاحت علامہ ابن عبدالبر سے نقل کرتے ہوئے امام سیوطی رحمہ اللہ نے تنویر الحوالک شرح موطا امام مالک میں کی ہے، چنانچہ وہ

---

[1] حجاب الألباني (ص: ٥٦)

[2] بحواله سابقه، الموطأ مع التنوير (١/ ٢/ ١٠٣) والمنتقىٰ (١/ ٢/ ١١٧) صحيح مسلم مع شرح النووي (٧/ ١٤/ ١٠٩، ١١٠)

فرماتے ہیں:

’’نبیِ اکرم ﷺ کی مراد وہ عورتیں ہیں، جو اتنے باریک کپڑے کا لباس پہنتی ہیں، جو ساتر ہونے کے بجائے تمام اعضا کے اوصاف بتا رہا ہوتا ہے، ایسی عورتیں نام کی تو لباس میں ملبوس ہوتی ہیں، لیکن فی الحقیقہ وہ عریاں ہوتی ہیں۔‘‘[1]

علامہ ہیتمی نے بھی ’’الزواجر‘‘ میں ان الفاظ کی ایسی ہی تشریح کی ہے اور جسم کو بیان کرنے والے کپڑے پہننے کو کبیرہ گناہوں میں سے کبیرہ گناہ نمبر (۱۰۸) پر ذکر کیا ہے۔ ایسا کپڑا پہننے کی ممانعت کا پتا بعض آثار سے بھی چلتا ہے، مثلاً طبقات ابن سعد میں ہشام بن عروہ بیان کرتے ہیں کہ منذر بن زبیر عراق سے لوٹ کر آئے تو انھوں نے حضرت اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہما کی طرف باریک مروزی و کوہستانی کپڑے کا لباس بھیجا، جبکہ ان دونوں موصوفہ نابینا ہوچکی تھیں، لہٰذا انھوں نے اپنے ہاتھ سے اس کپڑے کو چھوا اور فرمایا:

’’أُفٍّ! رُدُّوْا عَلَیْهِ کِسْوَتَهٗ‘‘ ’’اُف! یہ کپڑا انھیں واپس لوٹا دو۔‘‘

حضرت منذر کو یہ ناگوار گزرا اور عرض کی:

’’امی جان! اس میں سے بدن کا رنگ نظر نہیں آتا تو انھوں نے فرمایا:

’’إِنَّھَا إِنْ لَّمْ تَشِفُّ فَإِنَّھَا تَصِفُ‘‘[2]

’’یہ اگرچہ رنگ نہیں بتاتا، لیکن اعضائے جسم کے اوصاف و حدود تو بتاتا ہے۔‘‘

ان احادیث و آثار کی تائید اس اثر سے بھی ہوتی ہے، جو موطا امام مالک، سنن کبریٰ بیہقی اور طبقات ابن سعد میں حضرت ام علقمہ رحمہا اللہ سے مروی ہے، جس میں وہ بیان کرتی ہیں کہ میں نے امیر المومنین حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی پوتی حضرت حفصہ بنت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہما کو دیکھا کہ وہ ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس گئیں:

’’وَعَلَیْھَا خِمَارٌ رَقِیْقٌ یَشِفُّ عَنْ جَبِیْنِھَا‘‘

’’جبکہ وہ ایسا باریک دوپٹا لیے ہوئے تھیں، جس کے اندر سے ان کی پیشانی نظر آ رہی تھی۔‘‘

---

[1] التنویر (۱/ ۳/ ۱۰۳)

[2] الحجاب للألباني (ص: ۵۷)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے وہ دوپٹا ان سے لے کر پھاڑ دیا اور فرمایا:

"أَمَا تَعْلَمِيْنَ مَا أَنْزَلَ اللّٰهُ فِيْ سُوْرَةِ النُّوْرِ؟"

"تمھیں معلوم نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے سورۃ النور میں کیا حکم نازل فرمایا ہے؟"

پھر ایک موٹا دوپٹا منگوا کر انھیں پہننے کے لیے دیا۔[1]

یہی اثر سعید بن منصور اور ابن مردویہ نے بھی روایت کیا ہے، لیکن ان کے یہاں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس جانے والی عورت کا نام نہیں ہے، جبکہ ان سب کے یہاں اس اثر یا روایت کا سارا دارومدار ام علقمہ پر ہے، جن کا اصل نام مرجانہ ہے اور ان پر کلام کیا گیا ہے کہ وہ غیر معروف ہیں، لہٰذا یہ اثر قابلِ حجت تو نہیں، البتہ اس سے تائید و استشہاد صحیح ہے، جیسا کہ رئیس المحدثین امام بخاری رحمہ اللہ نے بھی اُم علقمہ سے تعلیقاً روایت بیان کی ہے، جبکہ ان کے سوا اس سند کے تمام راوی بخاری و مسلم کی شرط پر پورے اترنے والے ہیں۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا یہ فرمانا کہ تمھیں معلوم نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے سورۃ النور میں کیا حکم نازل فرمایا ہے؟ اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ جس نے باریک لباس سے ستر پوشی کی، اس نے کوئی ستر پوشی نہیں کی اور نہ اس نے ﴿وَلْيَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلٰى جُيُوْبِهِنَّ﴾ کے الفاظ پر مشتمل ارشادِ الٰہی پر ہی عمل کیا۔

سنن کبریٰ بیہقی میں عبداللہ بن ابوسلمہ بیان کرتے ہیں کہ امیر المومنین حضرت عمرِ فاروق رضی اللہ عنہ نے لوگوں کو مصر کا بنا ہوا باریک سفید کپڑا دیا اور پھر یہ بھی فرما دیا:

"لَا تُدَرِّعُهَا نِسَاؤُكُمْ" "تمھاری عورتیں اس کپڑے سے قمیص نہ بنائیں۔"

تو ایک آدمی نے عرض کی:

"میں نے وہ کپڑا اپنی بیوی کو پہنایا اور اس کے گھر میں اِدھر اُدھر آنے جانے سے اندازہ کیا کہ اس میں سے جسم کا رنگ نظر نہیں آتا۔"

اس پر حضرت عمرِ فاروق رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

"إِنْ لَّمْ يَشِفَّ فَإِنَّهٗ يَصِفُ"[2]

---

[1] الحجاب للألباني (ص: ٥٧)

[2] الحجاب للألباني (ص: ٥٨)

''اس سے اگرچہ رنگ نظر نہیں آتا، لیکن وہ اعضائے جسم کی حد بندی تو کرتا ہے۔''

امام بیہقی نے اس اثر کی سند کو مرسل کہا ہے، یعنی عبداللہ بن ابوسلمہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے مابین انقطاع ہے، جبکہ آگے ساتھ ہی امام بیہقی نے لکھا ہے کہ اسی اثر کو مسلم البطین نے ابو صالح کے حوالے سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے بیان کیا ہے، ان کے اس قول سے مرسل سند کو تقویت حاصل ہو جاتی ہے۔

ان آثار سے معلوم ہوا کہ صحابہ رضی اللہ عنہم کے یہاں طے تھا کہ ایسے پتلے کپڑے کا استعمال جائز نہیں، جو جسم کا رنگ ظاہر کرے یا اعضا کی حد بندی کرے، یہی وجہ ہے کہ سنن کبریٰ بیہقی میں تعلیقاً مروی ہے کہ دوپٹے کے بارے میں بتاتے ہوئے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا:

''إِنَّمَا الْخِمَارُ مَا وَارَى الْبَشَرَةَ وَالشَّعْرَ''[1]

''دوپٹا وہ ہے جو بدن اور بالوں کو چھپا لے۔''

یہی وجہ ہے کہ اہلِ علم نے کہا ہے کہ ایسے کپڑے سے ستر پوشی کرنا واجب ہے جو بدن کے رنگ کو ظاہر نہ کرے اور اگر کوئی ایسا باریک کپڑا ہو جس کے نیچے سے رنگ ظاہر ہو تو اس کپڑے کا پہننا جائز نہیں، کیونکہ اس سے ستر پوشی کی غرض پوری نہیں ہوتی۔[2]

کپڑا اتنا تنگ و چست نہیں ہونا چاہیے، جو موٹا ہونے کی وجہ سے اگرچہ بدن کے رنگ کا پتا نہ دیتا ہو، لیکن تنگ اور چست اور چپکا ہوا ہونے کی وجہ سے وہ اعضائے جسم کے حدودِ اربعہ کی چغلی کھائے، کیونکہ کپڑے سے اصل غرض تو رفعِ فتنہ ہوتا ہے اور وہ ڈھیلے ڈھالے اور کھلے کپڑے کے سوا نہیں ہو پاتا، لہٰذا یہی واجب ہے، چنانچہ سنن کبریٰ بیہقی، معجم طبرانی، مصنف ابن ابی شیبہ، طبقات ابن سعد، مسند بزار، مسند احمد اور الاحادیث المختارۃ للضیاء المقدسی میں حسن سند کے ساتھ حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ دحیہ کلبی نے نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو جو مصری موٹا کپڑا تحفے میں دیا تھا، وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے عطا فرما دیا تو میں نے وہ اپنی بیوی کو پہنا دیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے پوچھا:

«مَالَكَ لَمْ تَلْبَسِ الْقِبْطِيَةَ؟»

''کیا بات ہے کہ تم نے وہ مصری کپڑا نہیں پہنا؟''

---

[1] سنن البيهقي (٢/ ٢٣٥)

[2] المهذب (٣/ ١٧٠) الحجاب للألباني (ص: ٥٩)

میں نے عرض کی کہ وہ میں نے اپنی اہلیہ کو پہنا دیا ہے تو آپ ﷺ نے فرمایا:

«مُرْهَا فَلْتَعْجَلْ تَحْتَهَا غُلَالَةً فَإِنِّي أَخَافُ أَنْ تَصِفَ حِجْمَ عِظَامِهَا» [1]

''اسے حکم دو کہ وہ اس کپڑے کے نیچے دوسرا کپڑا (شمیز) بھی پہن لے، مجھے خدشہ ہے کہ اکیلے وہ کپڑا تمھاری اہلیہ کی ہڈیوں کا حجم ظاہر کرے گا۔''

اس حدیث کا شاہد بھی سنن ابو داود، بیہقی اور مستدرک حاکم میں دحیہ بنت خلیفہ کلبی سے مروی ہے، لیکن اس کا ایک راوی ابن لہیعہ نا قابلِ حجت ہے، البتہ اس کی متابعت ابو العباس یحییٰ مصری نے کی ہے اور اس پر کلام کیا گیا ہے، لیکن امام مسلم نے ان سے حجت لی ہے اور امام بخاری رحمہ اللہ نے استشہاد کیا ہے۔[2]

اس حدیث کی شرح بیان کرتے ہوئے امام شوکانی رحمہ اللہ ''نیل الأوطار'' میں لکھتے ہیں:

''عورت پر واجب ہے کہ وہ کسی ایسے کپڑے سے ستر پوشی کرے، جو جسم کے اوصاف ظاہر نہ کرے۔ کپڑے کے ساتر ہونے کی یہ شرط ہے اور بظاہر وہ مصری کپڑا ایسا ہوگا، جو موٹا ہونے کے باوجود ایسا نرم و ملائم اور چکنا سا ہو کہ اگر اس کے نیچے سے بدن کا رنگ نہ بھی ظاہر ہو، لیکن وہ اعضاے جسم کے اوصاف واضح کرتا ہو، جیسے کہ آج کل کثرت کے ساتھ ریشمی کپڑوں کا معاملہ ہے اور اگر کوئی عورت اپنے شوہر کی موجودگی میں ایسا کوئی چست لباس پہنتی ہے تو پھر اس کے لیے واجب ہے کہ نماز پڑھتے یا باہر نکلتے وقت اوپر موٹی چادر وغیرہ اوڑھ لے، جس کے نیچے اس لباس کی چستی دب جائے اور جسم کے اوصاف ظاہر نہ ہونے پائیں۔''

چنانچہ امام شافعی رحمہ اللہ نے کتاب الام میں لکھا ہے:

''اگر کوئی عورت کسی ایسے کپڑے میں ملبوس ہو، جو اعضاے جسم کی وصف گوئی کر رہا ہو تو میرے نزدیک محبوب تر بات یہ ہے کہ وہ ایسے کپڑے میں تب تک نماز ہرگز نہ پڑھے جب تک اس کے اوپر کوئی چادر نہ اُوڑھ لے۔''[3]

غرض کہ ستر پوشی کا یہ انداز صرف نماز ہی میں نہیں بلکہ گلی بازار نکلتے وقت بھی ایسے ہی ہے۔

---

[1] المنتقیٰ (١/ ٢/ ١١٦) و الحجاب (ص: ٥٩، ٦٠) وحسنه الألباني.

[2] نيل الأوطار (١/ ٢/ ١١٦، ١١٧)

[3] الأم (١/ ٧٨) الحجاب (ص: ٦٢)

عام پردے کے احکام و مسائل:

پچھلے اوراق میں ہم نے نماز کے لیے مردوں اور عورتوں کے ضروری لباس کی تفصیل ذکر کی ہے، جس کے ضمن میں عورت کے لیے عام پردے کے بعض احکام و مسائل بھی آ گئے ہیں، البتہ ایک موضوع ایسا ہے جو اگرچہ ہمارے اس موضوع سے کوئی تعلق نہیں رکھتا، لیکن جب اخفاے زینت اور ستر پوشی وغیرہ کی بات چلی ہے اور ان تمام لوگوں کا ذکر بھی سورۃ النور کی آیت (۳۱) کے حوالے سے آ گیا ہے، جن کے سامنے عورت اظہارِ زیب و زینت کر سکتی ہے۔ سرتاپا ہمہ تن ستر ہونے کے باوجود نماز میں منہ، ہاتھ اور پاؤں ننگے رکھ سکتی ہے اور اپنے گھر میں سر، گردن، ہاتھ، پاؤں اور چہرہ وغیرہ ننگا رکھ سکتی ہے، جہاں صرف محارم ہی ہوں۔

جب یہ سب امور آ گئے ہیں تو یہیں گلی بازار میں جاتے وقت لباس و ستر پوشی کا ذکر بھی ہو جائے تو بہتر ہے۔ چنانچہ اس سلسلے میں یہ بات تو طے ہے کہ عورت ہمہ تن ستر ہے، حتیٰ کہ اس کا چہرہ اور ہاتھ بھی اس میں داخل ہیں، جبکہ بعض اہلِ علم کا کہنا ہے کہ چہرہ اور دونوں ہاتھ ستر سے مستثنیٰ ہیں، ان کا پردہ واجب نہیں، بلکہ محض مستحب و مشروع ہے، لیکن موجودہ پرفتن دَور میں ان کے یہاں بھی اس کی اہمیت محض استحباب و مشروعیت سے بڑھ گئی ہے اور پھر یہ کہ اس نظریے کے حاملین بھی تھوڑے سے لوگ ہیں، جبکہ چہرہ اور ہاتھوں کو بھی مقامِ ستر قرار دینے والے بکثرت ہیں اور ان کے دلائل بھی زیادہ قوی ہیں، جن میں قرآنی آیات، احادیث نبویہ ﷺ، آثارِ صحابہ رضی اللہ عنہم اور اقوالِ ائمہ رحمہم اللہ سبھی شامل ہیں۔ تو آیئے! پہلے ہاتھوں اور چہرے کے وجوباً ڈھانپنے کے قائلین کے دلائل کا مطالعہ کریں اور ان میں سے سب سے پہلے قرآنی آیات کا مطالعہ کرتے ہیں۔

قرآنی آیات:

قرآنِ کریم کے متعدد مقامات پر اس بات کے واضح اشارات موجود ہیں کہ عورت کا چہرہ اور دونوں ہاتھ بھی مقامِ ستر ہیں، ننگے منہ اس کا گلی بازار میں نکلنا جائز نہیں ہے۔

پہلی آیت:

اس سلسلے میں سب سے پہلے اس آیت کی طرف آتے ہیں، جسے جانبین دونوں ہی اپنی اپنی

دلیل کے طور پر پیش کرتے ہیں اور وہ ہے سورۃ النور کی آیت (۳۱) جو ترجمہ سمیت ذکر کی جا چکی ہے، قائلینِ ستر کا استدلال اس کے ان الفاظ سے ہے:

﴿وَلَا يُبْدِينَ زِينَتَهُنَّ اِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَلْيَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلٰى جُيُوبِهِنَّ﴾ [النور: ۳۱]

''اور وہ عورتیں اپنی زینت ظاہر نہ کریں، سوائے اس کے جو خود بخود ظاہر ہو جائے اور انھیں چاہیے کہ وہ اپنے سینوں پر آنچل (دوپٹے) کا پلو ڈالے رہیں۔''

اس آیت کے الفاظ میں ﴿مَا ظَهَرَ مِنْهَا﴾ کی تفسیر بیان کرتے ہوئے امام ابن جریر طبری نے اپنی دو صحیح سندوں کے ساتھ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی تفسیر یہ بیان کی ہے کہ ﴿اِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا﴾ سے مراد (عورت کے) کپڑے ہیں، اس کے جسم کا کوئی حصہ نہیں۔[1]

ایسے ہی مصنف ابن ابی شیبہ اور مستدرک حاکم میں بھی حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کا اثر مروی ہے، جسے امام حاکم نے مسلم کی شرط پر صحیح قرار دیا ہے اور علامہ ذہبی رحمہ اللہ نے ان کی موافقت کی ہے، اس میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے پہلے ﴿وَلَا يُبْدِينَ زِينَتَهُنَّ﴾ کی تفسیر یہ بیان کی ہے کہ وہ پازیب، ہار اور کانوں کی بالیاں کچھ بھی ظاہر نہ کریں۔ اور آگے ﴿اِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا﴾ کی تفسیر کپڑوں سے کی ہے۔''[2]

امام ابن کثیر رحمہ اللہ نے بھی حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا یہی اثر اپنی تفسیر میں نقل کیا ہے اور لکھا ہے کہ عورتیں اپنی زینت کو غیر مردوں کے سامنے ظاہر نہ کریں، سوائے اس کے جس کا چھپا کر رکھنا ممکن ہی نہیں، حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ جیسے چادر اور کپڑے ہیں۔ آگے چل کر لکھتے ہیں:

''﴿مَا ظَهَرَ مِنْهَا﴾ کی یہ تفسیر حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی طرح ہی حضرت حسن بصری، امام ابن سیرین، ابو الجوزاء اور ابراہیم نخعی رحمہم اللہ نے بھی بیان کی ہے۔''[3]

صحیح بخاری میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ انھوں نے فرمایا:

''يَرْحَمُ اللّٰهُ نِسَاءَ الْمُهَاجِرَاتِ الْأُوَلِ لَمَّا أَنْزَلَ اللّٰهُ: وَلْيَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ

---

[1] تفسیر الطبري (۱۸/ ۱۱۹)

[2] الحجاب والسفور (ص: ۸۸) رسالة اللباب في فرضية النقاب، طبع بیروت و قاهره.

[3] تفسیر ابن کثیر (۳/ ۲۸۳)

عَلٰی جُیُوْبِهِنَّ. شَقَقْنَ مُرُوْطَهُنَّ فَاخْتَمَرْنَ بِهَا"[1]

''اللہ تعالیٰ پہلی مہاجر صحابیات رضی اللہ عنہن پر رحم کرے کہ جب یہ حکم نازل ہوا کہ عورتوں کو چاہیے کہ وہ اپنے سینوں پر اوڑھنیوں کے پلو ڈالے رہیں، تو انھوں نے اپنی قمیصوں کے نیچے استعمال کی جانے والی چادروں کو پھاڑا اور ان کی اوڑھنیاں بنا لیں۔''

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے "فَاخْتَمَرْنَ بِهَا" کی شرح کی ہے:

"غَطَّيْنَ وُجُوْهَهُنَّ" (انھوں نے اپنے چہروں کو چھپا لیا)

اور کتاب الاشربۃ میں خمر (شراب) کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے:

"وَمِنْهُ خِمَارُ الْمَرْأَةِ لِأَنَّهٗ يَسْتُرُ وَجْهَهَا"[2]

''اسی سے اوڑھنی یا دوپٹا بھی ہے کہ وہ بھی عورت کے چہرے کو ڈھانپ لیتا ہے۔''

فتح الباری ہی میں حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے فرّا سے نقل کیا ہے کہ زمانۂ جاہلیت میں عورتیں اپنے پیچھے کی طرف دوپٹے کا سارا کپڑا لٹکا دیتی تھیں اور آگے سے منہ سینہ کھلا رہتا تھا تو اللہ نے ان کے پردے کا حکم دیا۔[3]

ماہرِ علمِ اصول اور مفسرِ قرآن امام بیضاوی نے "أنوار التنزيل و أسرار التأويل" المعروف تفسیر بیضاوی میں اس آیت کے تحت ﴿إِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا﴾ کی تعیین کرتے ہوئے مختلف امور کا تذکرہ اور اختلافِ اقوال کی طرف اشارہ کرنے کے بعد نماز میں چہرے اور ہاتھوں کے ظاہر کرنے کے جواز کا تذکرہ کیا ہے اور آخر میں لکھا ہے:

"فَإِنَّ كُلَّ بَدَنِ الْمَرْأَةِ الْحُرَّةِ عَوْرَةٌ، لَا يَحِلُّ لِغَيْرِ الزَّوْجِ وَالْمَحْرَمِ النَّظَرُ إِلٰی شَيْئٍ مِّنْهَا إِلَّا لِضَرُوْرَةٍ كَالْمُعَالَجَةِ وَتَحَمُّلِ الشَّهَادَةِ"[4]

''آزاد عورت کا سارا جسم ہی مقامِ ستر ہے، شوہر اور محرم کے سوا کسی غیر محرم مرد کو عورت کے جسم کا کوئی بھی حصہ دیکھنے کی ہرگز اجازت نہیں سوائے علاج کے اور شہادت وغیرہ کی

---

[1] صحيح البخاري مع الفتح (٨/ ٤٨٩)

[2] فتح الباري (١٠/ ٤٨)

[3] فتح الباري (١/ ٤٩٠)

[4] اللباب في فرضية النقاب (ص: ٩٠، ٩١) صفوة التفاسير (١٠/ ١٦، ١٧) تفسير البيضاوي (٢/ ٥٨)

ضرورت و مجبوری کے۔"

ایسے ہی دورِ حاضر کے معروف مفسر علامہ شنقیطی نے اپنی تفسیر "أضواء البیان" (٦/ ١٩٢، ١٩٧) میں ﴿اِلَّا مَا ظَھَرَ مِنْھَا﴾ کے سلسلے میں تفصیلی بحث کی ہے اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اور ان کے موافقین کے قول کے بارے میں، جس میں کہا گیا ہے کہ ﴿اِلَّا مَا ظَھَرَ مِنْھَا﴾ سے مراد کپڑے ہیں، اپنا فیصلہ دیتے ہوئے لکھا ہے:

"وَھٰذَا الْقَوْلُ ھُوَ أَظْھَرُ الْأَقْوَالِ عِنْدَنَا وَأَحْوَطُھَا وَأَبْعَدُھَا مِنَ الرِّیْبَۃِ وَأَسْبَابِ الْفِتْنَۃِ"[1]

"یہ تمام اقوال سے زیادہ صحیح، سب سے زیادہ قرینِ احتیاط اور شک و شبہہ نیز اسبابِ فتنہ سے بعید تر قول ہے۔"

پھر آگے (ص: ١٩٨ تا ٢٠٢) اس قول کے راجح و صحیح تر ہونے کے اسباب ذکر کیے ہیں۔

اس کا معنیٰ یہ ہوا کہ موصوف کے نزدیک ہاتھوں اور چہرے کا بھی پردہ ہے، اس قول کو ترجیح دینے کے لیے انھوں نے جو اسباب ذکر کیے ہیں، ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے عورتوں کو زینت ظاہر کرنے سے منع فرمایا ہے اور صرف اس کی اجازت دی گئی ہے جو خود بخود ظاہر ہوجائے۔

اب زینت کے معنیٰ کو لغوی اعتبار سے دیکھا جائے گا، یا کسی دوسرے زاویے سے۔ بہر حال جو بات فوراً ذہن میں آتی ہے وہ یہ ہے کہ زینت ان آرایشی امور و اشیا کا نام ہے، جو کسی بھی چیز کے حسن کو دوبالا کرنے کے لیے ہوتی ہیں۔ قرآنِ کریم میں متعدد مقامات پر لفظِ زینت آیا ہے اور انھی معنوں میں آیا ہے۔

اس طرح زینت کا جو متبادر الی الذہن معنیٰ ہے اس میں کپڑے وغیرہ تو آسکتے ہیں، لیکن جسم کے اعضا، ہاتھ اور چہرہ وغیرہ نہیں اور معروف و متبادر معنیٰ سے عدول کر کے کوئی معنیٰ اس وقت تک نہیں لیا جا سکتا، جب تک اس کا کوئی قرینۂ صارفہ نہ ہو اور یہاں کوئی ایسا قرینہ نہیں کہ زینت سے مراد کپڑے وغیرہ کو چھوڑ کر اعضائے جسم مراد لیے جائیں، لہٰذا ﴿اِلَّا مَا ظَھَرَ مِنْھَا﴾ کی صحیح تر تفسیر کپڑے ہی ہے، جیسا کہ صحابیِ رسول حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا قول ہے۔[2]

---

[1] أضواء البیان (٦/ ١٩٧)

[2] أضواء البیان (٦/ ١٩٨، ٢٠٢)

یہاں یہ بات بھی پیشِ نظر رکھیں کہ اگر کوئی کہے کہ چہرے اور ہاتھوں والا قول بھی ایک صحابی کا ہے اور صحابی بھی وہ جو ترجمان القرآن کے نام سے معروف ہیں تو ایسے شخص کو کہا جا سکتا ہے کہ بلاشبہہ وہ صحابی اور ترجمان القرآن ہیں۔ اللہ کے نبی ﷺ نے ان کے لیے دعا بھی فرمائی تھی کہ اے اللہ! انھیں علم القرآن عطا فرما، جیسا کہ صحیحین، مسند احمد اور دیگر کتبِ حدیث میں ہے:

«اَللّٰهُمَّ عَلِّمْهُ الْكِتَابَ» [1]

''اے اللہ! انھیں (عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کو) علمِ قرآن عطا فرما۔''

«اَللّٰهُمَّ فَقِّهْهُ فِي الدِّيْنِ» [2] ''اے اللہ! انھیں دین کی سمجھ (علمِ دین) عطا فرما۔''

لیکن اس سب کچھ کے باوجود بھی وہ معصوم عن الخطاء تو نہیں تھے اور پھر کسی صحابی کی وہ تفسیر حرفِ آخر ہوتی ہے جس کا مخالف دوسرا کوئی صحابی نہ ہو، جبکہ اس مسئلے میں ایسا نہیں ہے۔ لہٰذا حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے قول کو چھوڑ کر حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی تفسیر کو لینے میں کوئی قباحت نہیں، بلکہ اسی کا لینا قرینِ احتیاط ہے۔

دور حاضر کے ایک دوسرے مفسر مولانا سید مودودی رحمہ اللہ اپنی تفسیر تفہیم القرآن (۳/ ۳۸۵، ۳۸۶) میں اس مسئلے کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اس کے پہلے حصے میں ارشاد ہوا ہے:

﴿ وَلَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ ﴾ [النور: ۳۱] ''وہ اپنی آرایش و زیبایش کو ظاہر نہ کریں۔''

دوسرے حصے میں ﴿ اِلَّا ﴾ بول کر اس حکمِ نہی سے جس چیز کو مستثنیٰ کیا گیا ہے، وہ ہے:

﴿ مَا ظَهَرَ مِنْهَا ﴾ [النور: ۳۱]

''جو کچھ اس آرایش و زیبایش میں سے ظاہر ہو یا ظاہر ہو جائے۔''

اس سے صاف مطلب یہ معلوم ہوتا ہے کہ عورتوں کو خود اس کا اظہار اور اس کی نمایش نہیں کرنی چاہیے، البتہ جو آپ سے آپ ظاہر ہو جائے (جیسے وہ چادر جو اوپر سے اوڑھی جاتی ہے، کیونکہ بہر حال اس کا چھپانا تو ممکن نہیں ہے اور عورت کے جسم پر ہونے کی وجہ سے بہر حال وہ بھی اپنے اندر ایک کشش رکھتی ہے) اس پر اللہ کی طرف سے کوئی مؤاخذہ نہیں ہے۔ یہی مطلب اس آیت کا حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ، حسن بصری، ابن سیرین اور ابراہیم نخعی رحمہم اللہ نے بیان کیا ہے۔ اس کے

---

[1] صحيح البخاري (١/ ١٦٩) صحيح سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٠٠٤) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٦٦)

[2] صحيح البخاري (١/ ٢٤٤) مختصر صحيح مسلم للمنذري، رقم الحديث (١٦٩٠)

برعکس بعض مفسرین نے ﴿مَا ظَهَرَ مِنْهَا﴾ کا مطلب لیا ہے:

''مَا يُظْهِرُهُ الْإِنْسَانُ عَلَى الْعَادَةِ الْجَارِيَةِ'' ''جسے انسان عادتاً ظاہر کرتا ہے۔''

پھر وہ اس میں منہ اور ہاتھوں کو ان کی تمام آرایشوں سمیت شامل کر دیتے ہیں، یعنی ان کے نزدیک یہ جائز ہے کہ عورت اپنے منہ کو سُرمے اور سرخی پاؤڈر سے اور ہاتھوں کو انگوٹھی، چھلے، چوڑیوں اور کنگنوں وغیرہ سے آراستہ رکھ کر لوگوں کے سامنے کھولے پھرے۔ یہ مطلب حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ اور ان کے شاگردوں سے مروی ہے اور فقہائے حنفیہ کے نزدیک ایک اچھے خاصے گروہ نے اسے قبول کیا ہے۔

لیکن ہم یہ سمجھنے سے بالکل قاصر ہیں کہ ﴿مَا ظَهَرَ مِنْهَا﴾ کے معنیٰ ''مَا يُظْهِرُ'' عربی زبان کے کسی قاعدے سے ہو سکتے ہیں۔ ''ظاہر ہونے'' اور ''ظاہر کرنے'' میں کھلا فرق ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن صریح طور پر ''ظاہر کرنے'' سے روک کر ''ظاہر ہونے'' کے معاملے میں رخصت دے رہا ہے۔ اس رخصت کو ظاہر کرنے کی حد تک وسیع کرنا قرآن کے بھی خلاف ہے اور ان روایات کے بھی خلاف جن سے ثابت ہوتا ہے کہ عہدِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں حکمِ حجاب (پردہ) آ جانے کے بعد عورتیں کھلے منہ نہیں پھرتی تھیں اور حکمِ حجاب میں منہ کا پردہ شامل تھا اور (اِحرام کے سوا جس میں منہ پر نقاب باندھنے کی ممانعت اور کپڑا لٹکا کر پردہ کر لینے کی گنجایش دی گئی ہے) دوسری تمام حالتوں میں نقاب کو عورتوں کے لباس کا ایک جزو بنا دیا گیا تھا۔

پھر اس سے بھی زیادہ قابلِ تعجب بات یہ ہے کہ اس رخصت کے حق میں دلیل کے طور پر یہ بات پیش کی جاتی ہے کہ منہ اور ہاتھ عورتوں کے ستر میں داخل نہیں، حالانکہ ستر اور حجاب میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ ستر تو وہ چیز ہے جسے محرم مردوں کے سامنے بھی کھولنا جائز نہیں۔

ستر اور پردے کے سلسلے میں اجنبی اور محرم میں فرق:

مولانا سید مودودی رحمہ اللہ نے تفہیم القرآن (۳/ ۳۸۶) میں لکھا ہے:

''ستر تو وہ چیز ہے جسے محرم مردوں کے سامنے کھولنا بھی جائز نہیں۔''

یہاں تو موصوف نے مطلق لکھ دیا ہے، جبکہ اپنی دوسری کتاب ''پردہ'' (ص: ۴۸) میں ''عورتوں کے لیے ستر کے حدود'' کے عنوان کے تحت لکھتے ہیں:

''ان کو حکم دیا گیا کہ اپنے چہرے اور ہاتھوں کے سوا تمام جسم کو تمام لوگوں سے چھپائیں، اس میں باپ، بھائی اور تمام رشتے دار مرد شامل ہیں اور شوہر کے سوا کوئی مرد اس سے مستثنیٰ نہیں ہے۔'' پھر انھوں نے اس کے دلائل ذکر کیے ہیں۔

یہاں موصوف نے صرف ہاتھوں اور منہ کو مستثنیٰ کیا ہے، حالانکہ محرم رشتے داروں کے معاملے میں یہ استثنا ناقص ہے اور حقیقت یہ ہے کہ بعض دیگر اعضا بھی اس استثنا میں شامل ہیں اور صرف دو اعضا کے استثنا پر موصوف نے جو دلائل ذکر کیے ہیں، وہ بظاہر چار روایات ہیں، حالانکہ فی الحقیقہ وہ دو حدیثیں ہیں، جن پر تفصیلی کلام کے لیے "حجاب المرأة المسلمة للألباني" (ص: ۱۸۔ ۲۳) دیکھیے اور ''مقالہ البانی در ردِ مودودی رحمہ اللہ'' مترجم اردو، مطبوع در کتاب ''آزادیِ عورت'' از رانا صابر نظامی صاحب (ص: ۲۱۶۔۲۲۲ طبع ادارہ تفہیم الاسلام لاہور) میں ملاحظہ فرمائیں۔

مولانا موصوف نے جو یہ کہا ہے کہ ستر تو وہ چیز ہے جسے محرم مردوں کے لیے کھولنا بھی جائز نہیں، پھر انھیں کہا ہے کہ چہرے اور ہاتھوں کے سوا تمام جسم کو تمام لوگوں سے چھپائیں، اس حکم میں باپ، بھائی اور سب رشتے دار شامل ہیں۔

یہ نظریہ صحیح نہیں ہے، بلکہ اس نظریے کی دو شقیں قرآن وسنت کے خلاف ہیں، مثلاً یہ کہ عورت منہ اور ہاتھوں کے سوا اپنے تمام جسم کو باپ اور بیٹے تک سے بھی چھپائے، جبکہ اس کے برعکس محرم رشتے داروں کے لیے پردے کی حدود الگ ہیں، اسی طرح ان سے جو تمام جسم کو بجز چہرہ اور ہاتھوں کے چھپانے کا کہا گیا ہے تو اس سلسلے میں بھی بعض دیگر اعضا کا محارم کے سامنے کھولنا ثابت ہے، مثال کے طور پر سورۃ الاحزاب آیت (۵۳) میں اللہ تعالیٰ نے اجنبی مردوں سے پردے کا حکم فرمایا ہے، لیکن بظاہر اس آیت میں اجنبی وغیرہ سب شامل ہیں، لیکن اگلی آیت (۵۵) ہی میں اللہ تعالیٰ نے یہ صراحت کر دی ہے کہ یہاں محرم مراد نہیں ہیں، بلکہ محارم اس حکم سے مستثنیٰ ہیں، چنانچہ ارشادِ الٰہی ہے:

﴿لَا جُنَاحَ عَلَيْهِنَّ فِيٓ اٰبَآئِهِنَّ وَ لَآ اَبْنَآئِهِنَّ وَ لَآ اِخْوَانِهِنَّ وَ لَآ اَبْنَآءِ اِخْوَانِهِنَّ وَ لَآ اَبْنَآءِ اَخَوٰتِهِنَّ وَ لَا نِسَآئِهِنَّ وَ لَا مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُنَّ﴾

[الأحزاب: ۵۵]

''ان پر اپنے باپوں، بیٹوں، بھائیوں، بھتیجوں، بھانجوں اور میل جول کی عورتوں اور اپنے

کنیز غلاموں کے سامنے (پردہ نہ کرنے میں) کوئی گناہ نہیں ہے۔''

ایسے ہی سورۃ النور (آیت: ۳۱) میں بھی ان کا استثنا بیان ہوا ہے، لہٰذا اَجانب اور محارم کا فرق واضح ہوگیا۔ ایسے ہی محارم کے سامنے ہاتھوں اور منہ کے سوا جن بعض اعضا کو کھولنے کی اجازت ہے، اس سلسلے میں متعدد احادیث مروی ہیں:

1 سنن ابی داود اور سنن کبریٰ بیہقی میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی لختِ جگر حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے پاس ہبہ کردہ غلام کے ہمراہ تشریف لائے، اس وقت حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے سر پر ایک اوڑھنی تھی کہ جب وہ اپنا سر ڈھانپتیں تو وہ پاؤں تک نہیں پہنچتی تھی اور جب پاؤں چھپاتیں تو سر تک نہ پہنچتی۔ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب اپنی لختِ جگر کو ذہنی الجھن میں دیکھا تو ارشاد فرمایا:

« إِنَّهُ لَيْسَ عَلَيْكِ بَأْسٌ إِنَّمَا هُوَ أَبُوكِ وَغُلَامُكِ »[1]

''تمھیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، کیوں کہ یہاں صرف تیرا باپ اور تیرا غلام ہی تو ہیں۔''

اس حدیث کی سند پر امام منذری رحمہ اللہ نے ''تلخیص السنن'' میں کچھ کلام کیا ہے، جب کہ شیخ البانی نے اس کی سند کو جید قرار دیا ہے۔[2]

اس حدیث میں اس بات کی دلیل موجود ہے کہ باپ (اور دیگر محارم) عورت کا سر اور بال دیکھ سکتے ہیں اور یہی حکم غلام کے لیے ہے۔ ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا، حضرت سعید بن مسیّب رحمہ اللہ، ایک قول میں امام شافعی رحمہ اللہ، ان کے اصحاب اور دیگر اکثر سلف صالحین رحمہم اللہ کا یہی مسلک ہے۔[3]

نیز یہ حدیث اس بات پر بھی صریح الدلالہ ہے کہ عورت کا سر اور پاؤں اس کے باپ اور غلام کے لیے ستر نہیں ہیں۔ یہ حدیث مولانا مودودی رحمہ اللہ کے نظریے کے بالکل خلاف پڑتی ہے۔

2 صحیح بخاری و مسلم اور دیگر کتبِ حدیث میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے چکی پیسنے کی وجہ سے ہاتھوں پر گٹے پڑ جانے کی شکایت اپنے والد صاحب سے کی تو نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم

---

[1] سنن أبي داود مع العون (١١/ ١٦٤) سنن البيهقي (٧/ ٩٥)

[2] مقالہ مترجم اردو (ص: ۲۲۷) از کتاب ''آزادیِ عورت'' رانا صابر نظامی، صحیح سنن سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٤٦٠) إرواء الغليل، رقم الحديث (١٧٩٩)

[3] عون المعبود (١١/ ١٦٥)

اس وقت ہمارے یہاں تشریف لائے، جبکہ ہم اپنے بستروں میں جا چکے تھے۔ ہم اُٹھنے لگے تو نبیِ اکرم ﷺ نے فرمایا:

''اپنی جگہ پر بیٹھے رہو، پھر آپ ﷺ ہم دونوں کے درمیان بیٹھ گئے تو میں نے آپ ﷺ کے قدموں کی ٹھنڈک اپنے سینے پر محسوس کی۔''[1]

فتح الباری میں حافظ ابن حجر کے بیان کے مطابق صحیح ابن حبان میں اس روایت کے الفاظ یوں ہیں:

''نبیِ اکرم ﷺ ہمارے پاس تشریف لائے، ہم دونوں پر ایک چادر تھی کہ جب ہم اسے طول کے بل پہنتے تو ہمارے پہلو ظاہر ہوجاتے اور جب عرض کے بل پہنتے تو ہمارے سر اور پاؤں ننگے ہوجاتے۔''[2]

اس حدیث سے بھی معلوم ہوا کہ والد کے سامنے سر اور پاؤں ننگے کیے جا سکتے ہیں۔

3 صحیح بخاری و مسلم اور دیگر کتبِ حدیث میں ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ میرے پاس رضاعی چچا آئے، انھوں نے میرے پاس آنے کی اجازت طلب کی تو میں نے انکار کر دیا کہ جب تک میں نبیِ اکرم ﷺ سے دریافت نہ کرلوں، اندر آنے کی اجازت نہیں دے سکتی، اتنے میں آپ ﷺ بھی تشریف لے آئے تو میں نے اس سلسلے میں آپ ﷺ سے استفسار کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا:

''بلاشبہہ وہ تمھارے چچا ہیں، اندر آنے کی اجازت دے دو۔''[3]

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فتح الباری میں لکھتے ہیں:

''اس بارے میں اصل یہ ہے کہ رضاعی اور نسبی رشتے دار کا عورتوں کے پاس جانا یکساں مباح ہے اور اسی طرح دیگر احکام میں ہے۔''[4]

---

[1] صحيح البخاري مع الفتح، رقم الحديث (٥٢٣٩) صحيح مسلم مع شرح النووي (٥/ ١٠/ ٢٠، ٢١)

[2] فتح الباري (١١/ ١٢٤ طبع دار الريان القاهره)

[3] صحيح البخاري مع الفتح (٩/ ٣٣٨)

[4] صحيح البخاري مع الفتح، رقم الحديث (٦٣١٨) صحيح مسلم مع شرح النووي (٧/ ١٣/ ٤٥) صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٢٣٢) صحيح سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٧١٣)

4 صحیح مسلم، مسند احمد اور طبقات ابن سعد میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ اپنی والدہ کے مشرف بہ اسلام ہونے کا واقعہ بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''میں جب اپنے گھر کے دروازے پر آیا تو اسے بند پایا اور میں نے پانی کے گرنے کی آواز سنی، ادھر والدہ محترمہ نے میرے پاؤں کی آہٹ سن لی تو فرمایا: ابو ہریرہ! جہاں ہو، وہیں رک جاؤ (تاکہ ستر پوشی کر لیں) پھر دروازہ کھولا، اس وقت وہ گھریلو استعمال کی قمیص پہن چکی تھیں، البتہ جلدی میں اپنا دوپٹا سر پر نہ اوڑھ سکی تھیں، اسی حالت میں اقرار کیا:

''أَشْهَدُ أَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ، وَأَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهُ وَرَسُوْلُهُ''[1]

''میں اس بات کی شہادت دیتی ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبودِ برحق نہیں اور اس بات کی شہادت دیتی ہوں کہ (حضرت) محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے سچے رسول ہیں۔''

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ والدہ کا اپنے بیٹے کے سامنے ننگے سر آ جانا صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے یہاں معروف تھا، یہی وجہ ہے کہ سر پر اوڑھنی لیے بغیر اپنے بیٹے کو اپنے پاس آنے کی اجازت دے دی، البتہ قمیص پہننے سے پہلے آنے کی اجازت نہیں دی۔

اس روایت کو طبقات ابن سعد (۵/ ۱۱۵) میں حضرت محمد بن حنفیہ رضی اللہ عنہ کے واسطے سے بھی روایت کیا ہے کہ وہ اپنی والدہ کی مینڈھیاں اپنے ہاتھوں سے کرتے اور ان کے سر میں کنگھی بھی خود کیا کرتے تھے اور اس کی سند بھی صحیح ہے۔[2]

خلاصہ کلام:

مولانا مودودی کا یہ نظریہ کہ عورتوں کو ہاتھوں اور چہرے کے سوا سارا جسم تمام مردوں بشمول ان کے باپوں اور بھائیوں کے سب سے چھپانا چاہیے، یہ ان احادیث و آثار کے خلاف ہے جو مردوں کو ان کی محرمات پر نظر کے جواز کا ثبوت فراہم کرتی ہیں، کیونکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے سر اور پاؤں وغیرہ زینت کی جگہوں پر نظر ڈالنے کی گنجایش دی ہے اور یہ اسلام کی فیاضی کے عین مطابق ہے۔

﴿وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ﴾ [الحج: ۷۸]

---

1 مختصر صحيح مسلم للمنذري، رقم الحديث (۱۷۰۸)

2 طبقات (۵/ ۱۱۵)

’’اللہ نے دین کے بارے میں تم پر کوئی تنگی روا نہیں رکھی۔‘‘

ہاں اس دور میں مسلمانوں نے عورتوں کے ستر کے خلاف اتنی آزادی دے رکھی ہے کہ عورتیں اپنے محرم مردوں کے سامنے (ہی نہیں بلکہ سرِ بازار بھی) اپنی پنڈلیاں، کندھے اور سینے کھولے پھرتی ہیں، یہ ایسا معاملہ ہے جس کی شریعت میں کوئی گنجایش ہے نہ اسے ذوقِ سلیم ہی پسند کرتا ہے۔

الغرض ان احادیث سے معلوم ہوا کہ ستر کے معاملے میں عام اجنبی مردوں اور محرم رشتے داروں میں بھی فرق ہے اور عورت محارم کے سامنے سر، منہ، گردن اور پاؤں کھول سکتی ہے۔[1]

لیکن اجنبی کے سامنے اس کا سارا جسم بہ شمول ان اعضا کے ستر ہے، جیسا کہ تفصیل ذکر کی جا رہی ہے۔

حجاب:

جہاں تک بات ہے حجاب کی تو وہ ستر سے زائد ایک چیز ہے، جسے عورتوں اور غیر محرم مردوں کے درمیان حائل کیا گیا ہے اور یہاں بحث ستر کی نہیں بلکہ احکامِ حجاب و پردے کی ہے۔[2]

پھر ﴿اِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا﴾ کے بعد والے الفاظ ﴿وَلْيَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلٰى جُيُوْبِهِنَّ﴾ بھی چہرے کے پردے والے قول ہی کی تائید کرتے ہیں، کیونکہ ان میں اللہ نے فرمایا ہے:

’’اور ان عورتوں کو چاہیے کہ اپنے سینوں پر اوڑھنیوں کے آنچل ڈالے رہیں۔‘‘

تفسیر کشّاف اور ابن کثیر میں مذکور ہے کہ زمانۂ جاہلیت میں عورتیں سروں پر ایک طرح کے کساوے سے باندھے رکھتی تھیں، جن کی گرہ جوڑے کی طرح پیچھے چوٹی پر لگائی جاتی تھی، سامنے گریبان کا ایک حصہ کھلا رہتا تھا، جس سے گلے اور سینے کا بالائی حصہ صاف نمایاں ہوتا تھا، چھاتیوں پر قمیص کے سوا اور کوئی چیز نہیں ہوتی تھی اور پیچھے دو دو، تین تین چوٹیاں لہراتی رہتی تھیں۔[3]

اس آیت کے نزول کے بعد مسلمان عورتوں میں دوپٹا رائج کیا گیا، جس کا مقصد یہ نہیں کہ آج کل کی ’’صاحبزادیوں‘‘ کی طرح بس دوپٹے کو بل دے کر گلے کا ہار بنا لیا جائے، بلکہ یہ تھا کہ

---

[1] دیکھیں: أضواء البيان للشنقيطي (٦/ ١٨٨)

[2] تفهيم القرآن، مولانا مودودی (٣/ ٣٨٥، ٣٨٦)

[3] تفسير الكشاف (٣/ ٦٢) تفسير ابن كثير (٣/ ٢٨٣، ٢٨٤)

اسے اوڑھ کر سر، کمر، سینہ سب اچھی طرح ڈھانک لیے جائیں اور منہ بھی پردے میں آ جائے، جیسا کہ تفسیر ابن ابی حاتم کی روایت سے پتا چلتا ہے، چنانچہ امام ابن ابی حاتم نے صفیہ بنت شیبہ کے حوالے سے ایک روایت بیان کی ہے، جس میں وہ بیان کرتی ہیں کہ ہم ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس بیٹھی تھیں کہ قریشی عورتوں کے فضائل کی بات چل نکلی تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا:

''إِنَّ لِنِسَآءِ قُرَيْشٍ لَفَضْلًا، وَإِنِّيْ وَاللّٰهِ مَا رَأَيْتُ أَفْضَلَ مِنْ نِّسَآءِ الْأَنْصَارِ أَشَدَّ تَصْدِيْقًا لِّكِتَابِ اللّٰهِ إِيْمَانًا بِالتَّنْزِيْلِ، لَقَدْ، أُنْزِلَتْ سُوْرَةُ النُّوْرِ: ﴿وَلْيَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلٰى جُيُوْبِهِنَّ﴾ فَانْقَلَبَ رِجَالُهُنَّ إِلَيْهِنَّ يَتْلُوْنَ عَلَيْهِنَّ مَا أَنْزَلَ اللّٰهُ إِلَيْهِمْ فِيْهَا، وَيَتْلُو الرَّجُلُ عَلَى امْرَأَتِهٖ وَابْنَتِهٖ وَأُخْتِهٖ وَعَلٰى كُلِّ ذِيْ قَرَابَتِهٖ فَمَا مِنْهُنَّ امْرَأَةٌ إِلَّا قَامَتْ إِلٰى مِرْطِهَا (فَاعْتَجَرَتْ بِهٖ تَصْدِيْقاً وَّإِيْمَاناً بِمَا أَنْزَلَ اللّٰهُ مِنْ كِتَابِهٖ) فَأَصْبَحْنَ يُصَلِّيْنَ الصُّبْحَ وَرَآءَ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ مُعْتَجِرَاتٍ كَأَنَّ عَلٰى رُؤُوْسِهِنَّ الْغِرْبَانَ''[1]

''قریشی عورتوں کے بڑے فضائل ہیں، لیکن اللہ کی قسم! میں نے انصاری عورتوں سے افضل کوئی عورتیں نہیں دیکھیں۔ وہ کتاب اللہ کی تصدیق اور وحی پر ایمان لانے میں بڑی شدید ہیں۔ جب سورۃ النور میں اللہ تعالیٰ نے یہ حکم نازل فرمایا کہ ''عورتیں اپنی اوڑھنیوں کے آنچل اپنے سینوں پر ڈالے رہیں'' تو ان کے مرد لوٹ کر ان کی طرف گئے اور انھوں نے انھیں وہ آیات سنائیں، جن میں پردے کا حکم نازل ہوا تھا۔ ہر مرد نے اپنی بیوی، بیٹی، بہن اور دوسری قرابت دار عورتوں کو وہ آیات سنائیں، ان عورتوں سے ہر کوئی اٹھی اور اپنی چادر (برائے تہبند جو پاؤں تک لمبی قمیص کے نیچے پہنے ہوئے تھیں) کو پھاڑا اور اس سے سر اور منہ کا پردہ کیا، تاکہ کتاب اللہ کی نازل شدہ اس آیت کی تصدیق اور ایمان کا اظہار ہوجائے۔ وہ عورتیں نبیِ اکرم ﷺ کے پیچھے نماز میں اس طرح ہوگئیں، جیسے (سیاہ اوڑھنیوں کی وجہ سے) گویا ان کے سروں پر کوّے بیٹھے ہیں۔''

اس اثر میں جو الفاظ ''فَاعْتَجَرَتْ'' اور ''مُعْتَجِرَاتٍ'' آئے ہیں، ان کا مصدر ''الاعتجار''

[1] فتح الباري (٨/ ٤٩٠) وانظر: تفهيم القرآن (٣/ ٣٨٦) وفرضية النقاب (ص: ٥٩) للهنداوي

ہے، جو اُوڑھنی کو سر پر لپیٹنے اور منہ ڈھانپنے کا مفہوم رکھتا ہے، چنانچہ امام ابن الاثیر نے ”غریب الحدیث“ میں لکھا ہے کہ عبیداللہ بن عدی بن خیار کی حدیث میں ہے کہ وہ آئے جبکہ وہ اپنے عمامہ سے اعتجار کیے ہوئے تھے تو وحشی کو ان کی دونوں آنکھوں اور پاؤں کے سوا کچھ نظر نہ آیا اور پگڑی اور عمامے سے اعتجار یہ ہوتا ہے کہ اسے سر پر لپیٹا جائے اور اس کے ایک کونے کو چہرے پر ڈال لیا جائے اور اس کپڑے کا کوئی حصہ ٹھوڑی کے نیچے سے نہ نکالا جائے۔[1]

نیز فتح الباری کے حوالے سے پہلے بھی فرّاء کا قول ذکر کیا جا چکا ہے کہ عہدِ جاہلیت میں عورتیں اپنے سر کے کپڑے پیچھے کی جانب لٹکا دیا کرتی تھیں، جس کے نتیجے میں ان کے چہرے وغیرہ کھلے رہ جاتے تھے تو انھیں پردے کا حکم دیا گیا۔[2]

ان دونوں تشریحی اقوال سے معلوم ہوا کہ چہرے کا پردہ ہے اور نہ صرف یہ کہ محض استحباباً ہے، بلکہ وجوباً ہے، جیسا کہ فراء کے الفاظ ”فَأُمِرْنَ بِالْإِسْتِتَارِ“ سے پتا چلتا ہے۔

شیخ محمد بن صالح العثیمین اپنے رسالے ”المرأة المسلمة أحكام فقهية حول الحجاب“ (ص: ١١) میں لکھتے ہیں:

”عورت کو جب اپنے سینے پر اوڑھنی کا پلو ڈالے رکھنے کا حکم ہے تو چہرے کا پردہ بھی اس پر واجب ہے، کیونکہ چہرے کا پردہ گریبان کے پردے کا لازم ہے یا قیاس کا تقاضا ہے، کیونکہ جب گلے اور سینے کا پردہ واجب ہے تو چہرے کا پردہ بالاولیٰ واجب ہے، کیونکہ چہرہ ہی تو مقامِ حسن و جمال اور باعثِ فتنہ ہے اور جو لوگ جمالِ صورت کا مطالبہ کرتے ہیں، وہ صرف چہرے کے جمال ہی کی بات ہوتی ہے اور جب کوئی کہے کہ فلاں عورت بہت حسین و جمیل ہے تو اس کی بات سے اس کے چہرے کے جمال کے سوا اور کوئی معنیٰ نہیں سمجھا جاتا، کیونکہ طلب و خبر ہر دو اعتبار سے چہرہ ہی مقامِ حسن و جمال ہے اور جب ایسا ہے تو پھر یہ کیسے سمجھا جا سکتا ہے کہ مبنی بر حکمت شریعتِ اسلامیہ عورت کے گلے اور سینے کے پردے کا تو حکم دے اور چہرہ ننگا رکھنے کی اجازت دے دے؟“[3]

---

[1] فرضية النقاب أيضاً.

[2] فتح الباري (١/ ٤٩٠)

[3] المرأة المسلمة (ص: ١١، طبع دار الإفتاء)

پہلی آیت، دوسرا جز:

پھر اسی سورۃ النور کی آیت (۳۱) ہی کے دوسرے الفاظ میں ارشادِ الٰہی ہے:

﴿وَلَا يَضْرِبْنَ بِأَرْجُلِهِنَّ لِيُعْلَمَ مَا يُخْفِينَ مِنْ زِينَتِهِنَّ﴾ [النور: ۳۱]

''اور عورتیں اپنے پاؤں زمین پر مارتے ہوئے نہ چلیں تاکہ وہ زینت جو وہ چھپائے ہوئے ہیں اس کا لوگوں کو علم ہو سکے۔''

ان الفاظ کی تفسیر بیان کرتے ہوئے علامہ عبدالقادر حبیب اللہ سندھی نے اپنے رسالے ''اللباب'' میں لکھا ہے:

''ان الفاظ میں اللہ تعالیٰ نے عورتوں کو زمین پر پاؤں مار کر چلنے سے بڑی شدت کے ساتھ روکا ہے، تاکہ ان کے پاؤں کے زیورات پازیب وغیرہ کی آواز نہ سنی جا سکے۔ یہ حکم ان کے شرف کے تحفّظ، شرّ کا دروازہ بند کرنے اور فحاشی کے وقوع کو روکنے کے لیے دیا گیا ہے، جو عفت وعصمت کے تحفظ کی ایک انتہا ہے۔ جب اس آیتِ کریمہ کی رُو سے عورت کی پازیب کی جھنکار بھی ممنوع ہے تو پھر کسی مسلمان کے لیے یہ کیسے روا ہو سکتا ہے کہ ضعیف ومنکر اور غیر صحیح اسانید پر مشتمل روایات کا سہارا لیتے ہوئے یہ کہے کہ عورت کا چہرہ اور ہاتھ مقامِ ستر اور زینت نہیں ہیں، لہٰذا انھیں وہ غیر محرم لوگوں کے سامنے ننگا کر سکتی ہے؟''[1]

نیز شیخ عثیمین لکھتے ہیں:

''مرد کے مبتلائے فتنہ ہونے کے خوف کی بنا پر پازیب کی جھنکار کو ممنوع کیا گیا ہے تو چہرے کو ننگا رکھنے کی اجازت کیسے ہو سکتی ہے؟ ان ہر دو میں سے از روئے فتنہ سامانی کون سی چیز بڑی ہے؟ ایک طرف پائل یا پازیب کی جھنکار ہے مگر عورت پردے میں ہے، نہیں معلوم بوڑھی ہے، جوان ہے، حسین وجمیل ہے یا قبیح المنظر اور دوسری طرف ایک عورت ننگے منہ ہے، چہرہ فطرتی حسن و جمال کے ساتھ ساتھ مصنوعی زیب و زینت کی بدولت فتنہ بردوش ہے، خواہشِ نفس عطا کی گئی ہے، ہر انسان بہ آسانی اندازہ کر سکتا ہے کہ ان ہر دو میں سے کون سا انداز زیادہ فتنہ انگیز اور بلا خیز ہے۔''[2]

---

[1] اللباب في فرضية النقاب (ص: ١٠٦)

[2] المرأة المسلمة (ص: ١٢)

ظاہر ہے کہ پازیب کی آواز میں کم فتنہ انگیزی ہے اور جب اس کم فتنہ انگیز فعل کی ممانعت کر دی گئی ہے تو پھر اس ہمہ فتنہ فعل کی اجازت کیسے ہوسکتی ہے؟ ہرگز نہیں، بلکہ ہر اعتبار سے چہرے کے پردے والے مسلک ہی کی تائید ہوتی ہے۔

دوسری آیت:

اسی مفہوم پر دلالت کرنے والی ایک دوسری آیت بھی سورۃ النور میں ہے، جس میں ارشادِ الٰہی ہے:

﴿ وَالْقَوَاعِدُ مِنَ النِّسَآءِ الّٰتِیْ لَا یَرْجُوْنَ نِکَاحًا فَلَیْسَ عَلَیْهِنَّ جُنَاحٌ اَنْ یَّضَعْنَ ثِیَابَهُنَّ غَیْرَ مُتَبَرِّجٰتٍۭ بِزِیْنَةٍ وَّاَنْ یَّسْتَعْفِفْنَ خَیْرٌ لَّهُنَّ وَاللّٰهُ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ ﴾ [النور: ٦٠]

''اور جو عورتیں جوانی سے گزر چکی ہوں اور نکاح کی امیدوار نہ ہوں، وہ اگر اپنی چادریں اتار کر رکھ دیں تو ان پر کوئی گناہ نہیں، بشرطیکہ زینت کی نمائش کرنے والی نہ ہوں، تاہم وہ بھی حیا داری ہی برتیں تو ان کے حق میں اچھا ہے اور اللہ سب کچھ سنتا اور جانتا ہے۔''

حضرت سعید بن جبیر، مقاتل، ضحاک اور قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس آیت میں ''قواعد'' سے مراد وہ عورتیں ہیں جن کو بڑھاپے کی وجہ سے حیض آنا بند ہو چکا ہو اور وہ اولاد پیدا کرنے کی عمر سے گزر چکی ہوں۔ اس آیت میں بوڑھی عمر رسیدہ خواتین کو جو کپڑے اتار کر رکھ دینے کی اجازت دی گئی ہے تو ظاہر ہے کہ اس سے عریاں ہو کر بیٹھنا ہرگز مراد نہیں، بلکہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے یہاں کپڑوں سے مراد (زیب و زینت کو چھپانے والی) اوپر کی بڑی چادر (جلباب) مراد لی ہے۔

تفسیر ابن کثیر کے مطابق حضرت ابن عباس اور ابن عمر رضی اللہ عنہم اور امام مجاہد، سعید بن جبیر، ابو الشعثاء، ابراہیم نخعی، حسن بصری، قتادہ، زہری اور اوزاعی رحمہم اللہ سبھی نے کپڑوں سے مراد جلباب یا ردا یعنی اوپر کی بڑی چادر ہی مراد لی ہے۔[1]

جلباب وہ بڑی چادر ہوتی ہے، جس میں سرتاپا چہرہ سمیت عورت نے اپنے جسم کو ڈھانپا ہوا ہو، اس آیت سے یوں استدلال کیا جاتا ہے کہ اس آیت کا مفہوم یہ ہے کہ بوڑھی عورت کو شارع حکیم نے اس بات کی اجازت دی ہے کہ وہ جلباب یا چادر اتار دے، جس میں اس کا چہرہ بھی چھپا ہوا

[1] تفسیر ابن کثیر (٣/ ٣٠٤)

ہوتا تھا، لیکن وہ اس شرط کے ساتھ کہ وہ زینت کی نمایش کرنے والی نہ ہو۔

یہ حکم بوڑھی عورتوں کے لیے ہے، جبکہ نوجوان عورت صاحبِ حسن و جمال ہے اور جس میں جاذبیت و دلکشی کا عنصر پایا جاتا ہے، اس کے لیے جائز نہیں کہ وہ چادر اتار دے، بلکہ اس پر واجب ہے کہ اپنے پروردگار کے اس حکم کا التزام کرے، جس میں اسے چادر اوڑھنے اور چہرہ تک چھپانے کا حکم دیا گیا ہے اور اس کا اسے وجوباً حکم ہے نہ کہ استحباباً و اختیاراً۔ امر کا صیغہ جو ادنائے جلباب میں ہے تو امر وجوب کے لیے ہوتا ہے، جب تک کہ کوئی قرینۂ صارفہ نہ ہو اور یہاں کوئی ایسا قرینہ موجود نہیں ہے، بلکہ ﴿غَيْرَ مُتَبَرِّجٰتٍۭ بِزِيْنَةٍ﴾ کے الفاظ نوجوان عورت کے لیے چہرے کے پردے کے واجب ہونے کی ایک دوسری دلیل ہے، جبکہ بوڑھی عورتوں کے لیے بھی یہ کوئی ضروری نہیں کہ وہ چادریں اتار پھینکیں، بلکہ انھیں بھی اس بات کی ترغیب دلائی گئی ہے کہ اجازت کے باوجود اگر وہ حیا داری کریں اور چادر اوڑھے رہیں تو یہی ان کے لیے بہتر ہے، جیسا کہ ﴿وَاَنْ يَّسْتَعْفِفْنَ خَيْرٌ لَّهُنَّ﴾ کے الفاظ کی تفسیر حضرت سعید بن جبیر رحمہ اللہ نے یہ کی ہے:

''أَيْ وَتَرْكُ وَضْعِهِنَّ لِثِيَابِهِنَّ، وَإِنْ كَانَ جَائِزًا، خَيْرٌ وَّ أَفْضَلُ لَهُنَّ''[1]

''بوڑھی عورتوں کے لیے اگرچہ چادر اتار دینا جائز ہے، لیکن ان کے لیے بہتر و افضل یہی ہے کہ وہ چادریں نہ اتاریں۔''

امام ابوحیان نے اپنی تفسیر ''البحر المحیط'' میں ﴿وَاَنْ يَّسْتَعْفِفْنَ﴾ کی تفسیر یہ کی ہے کہ وہ چادریں اتارنے سے پرہیز و حیا داری کریں اور نوجوان عورتوں ہی کی طرح ستر میں رہیں تو ان کے لیے یہی افضل ہے۔ جبکہ ایک دوسرے مفسر امام بغوی رحمہ اللہ نے یوں تفسیر کی ہے:

''وَأَنْ يَّسْتَعْفِفْنَ فَلَا يُلْقِيْنَ الْحِجَابَ وَالرِّدَآءَ''[2]

''اگر وہ چادر نہ ہی اتاریں اور باپردہ ہی رہیں تو ان کے لیے بہتر ہے۔''

حقیقت یہ ہے کہ سلف صالحینِ امت کی خواتین نے بڑھاپے میں چادر اتار دینے کی اجازت

---

[1] تفسير ابن كثير (٣/ ٣٠٤)

[2] اللباب (ص: ١٠٤) نقله عن الصارم المشهور للتويجرى (ص: ٦٢) المرأة المسلمة للعثيمين (١٣، ١٤) وفضل الخطاب في المرأة والحجاب، لأبي بكر الجزائري (ص: ٤٢، ٤٣، طبع جده) السفور والحجاب لابن باز (ص: ٥، ٦) طبع دار الإفتاء.

کے باوجود حیا داری و پردہ داری کی ترغیب والے فعل ہی کو اپنایا اور ہمیشہ اپنے چہرے کا بھی پردہ کیا، چنانچہ سعید بن منصور، ابن المنذر اور امام بیہقی نے سنن کبریٰ میں عاصم احول سے روایت بیان کی ہے، جس میں وہ بیان کرتے ہیں کہ ہم (ایک عمر رسیدہ فاضل خاتون) حضرت حفصہ بنت سیرین رحمہا اللہ کے پاس جایا کرتے تھے، انھوں نے ایک بڑی چادر (جلباب) ایسی بنا رکھی تھی جس سے وہ نقاب ڈالے رکھتی تھیں، ہم ان سے کہتے کہ اللہ تعالیٰ آپ پر رحم فرمائے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَالْقَوَاعِدُ مِنَ النِّسَآءِ الّٰتِیْ لَا یَرْجُوْنَ نِکَاحًا فَلَیْسَ عَلَیْهِنَّ جُنَاحٌ اَنْ یَّضَعْنَ ثِیَابَهُنَّ غَیْرَ مُتَبَرِّجٰتٍۭ بِزِیْنَةٍ﴾ [النور: ٦٠]

''اور وہ عمر رسیدہ بوڑھی عورتیں جو نکاح کا کوئی ارادہ (داعیہ) نہیں رکھتیں، ان پر کوئی گناہ نہیں کہ وہ اپنی چادریں اتار لیں، اس شرط کے ساتھ کہ وہ زینت کی نمایش کرنے والی نہ ہوں۔'' جبکہ کپڑوں سے مراد جلباب ہے تو وہ کہا کرتی تھیں:

''أَيُّ شَيْئٍ بَعْدُ؟'' (ان الفاظ کے بعد ارشادِ الٰہی کے کیا الفاظ ہیں؟)

ہم کہتے کہ آگے ہیں:

﴿وَاَنْ یَّسْتَعْفِفْنَ خَیْرٌ لَّهُنَّ﴾ [النور: ٦٠]

''اگر وہ حیا داری اختیار کریں تو ان کے لیے یہی بہتر ہے۔''

تو وہ فرماتیں:

''هُوَ إِثْبَاتُ الْحِجَابِ'' (یہی الفاظ پردے کو ثابت کرتے ہیں)

امام بغوی رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر میں امام ربیعۃ الرائے کا یہاں تک قول نقل کیا ہے کہ اس آیت میں ''قواعد'' سے مراد انتہائی عمر رسیدہ عورتیں ہیں، جن میں کوئی جاذبیت باقی نہ رہی ہو (اور ان کے صنفی جذبات سرد پڑ چکے ہوں) لیکن اگر اس آگ میں ابھی کوئی چنگاری باقی ہے تو ایسی عمر رسیدہ عورت اس آیت میں داخل نہیں ہوگی۔[1]

اس سے قطع نظر اگر حقیقتاً بھی ایک عورت ایسی ہے جو واقعی اس حد سے بھی گزر چکی ہے تو اس کے سامنے بھی افضل عمل کے لیے حضرت حفصہ بنت سیرین ایک بہترین نمونہ ہیں۔

---

[1] اللباب (ص: ١٠٥) والحجاب للألباني (ص: ٥٢) وقال: هذا إسناد صحيح.

تیسری اور چوتھی آیت سے استدلال:

ایسے ہی چہرے کے پردے کو واجب قرار دینے والوں کا استدلال سورۃ الاحزاب کی ان چار آیات سے بھی ہے، جن میں سے ایک کو ''آیتِ حجاب'' کا نام دیا گیا ہے، چنانچہ ارشادِ الٰہی ہے:

﴿ یٰنِسَآءَ النَّبِیِّ لَسْتُنَّ كَاَحَدٍ مِّنَ النِّسَآءِ اِنِ اتَّقَیْتُنَّ فَلَا تَخْضَعْنَ بِالْقَوْلِ فَیَطْمَعَ الَّذِیْ فِیْ قَلْبِهٖ مَرَضٌ وَّ قُلْنَ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا ۝ وَ قَرْنَ فِیْ بُیُوْتِكُنَّ وَ لَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِیَّةِ الْاُوْلٰی وَ اَقِمْنَ الصَّلٰوةَ وَ اٰتِیْنَ الزَّكٰوةَ وَ اَطِعْنَ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ ﴾ [الأحزاب: ۳۲، ۳۳]

''اے پیغمبر کی بیویو! تم دوسری عورتوں کی طرح نہیں ہو، اگر تم اللہ سے ڈرتی رہو تو (غیر مردوں سے) دبی زبان (باریک آواز) سے بات نہ کرو (اگر ایسا کرو گی تو) جس کے دل میں کھوٹ ہے، اس کے دل میں لالچ پیدا ہوگا، لہٰذا کھری کھری صاف بات کیا کرو اور اپنے گھروں میں جمی رہو اور زمانۂ جاہلیت کی طرح بناؤ سنگھار نہ دکھاتی پھرو اور نماز قائم کرو، زکات ادا کرو اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو۔''

مسجدِ نبوی کے واعظ اور مدینہ یونیورسٹی میں دراساتِ علیا کے پروفیسر شیخ ابوبکر جابر الجزائری نے اپنے رسالے ''فصل الخطاب في المرأة والحجاب'' میں ان آیات سے پانچ دلالات کا استخراج کیا اور لکھا ہے کہ ان میں سے ہر ایک مسلمان مومن عورت کے لیے پردے کو فرض قرار دینے کی دلیل ہے۔ پھر ان آیات کو صرف امہات المومنین کے ساتھ خاص کرنے والوں کے قول کو مضحکہ خیز قرار دیا اور دیگر قرآنی دلائل کے ساتھ واضح کیا ہے کہ نبیِ اکرم ﷺ کی ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن پر حجاب و پردہ فرض ہے تو دوسری عام مسلمان عورتوں پر بالاولیٰ فرض ہے۔ تفصیل مطلوب ہو تو موصوف کے رسالے کے صفحات (۲۵ تا ۳۸) دیکھے جا سکتے ہیں۔

پانچویں آیت سے استدلال:

سورۃ الاحزاب کی آیت (۵۳) سے بھی وجوبِ حجاب پر استدلال کیا گیا ہے، چنانچہ اس آیت میں ارشادِ الٰہی ہے:

﴿ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَدْخُلُوْا بُیُوْتَ النَّبِیِّ اِلَّاۤ اَنْ یُّؤْذَنَ لَكُمْ اِلٰی طَعَامٍ

غَيْرَ نٰظِرِيْنَ اِنٰهُ وَ لٰكِنْ اِذَا دُعِيْتُمْ فَادْخُلُوْا فَاِذَا طَعِمْتُمْ فَانْتَشِرُوْا وَ لَا مُسْتَاْنِسِيْنَ لِحَدِيْثٍ اِنَّ ذٰلِكُمْ كَانَ يُؤْذِي النَّبِيَّ فَيَسْتَحْيٖ مِنْكُمْ وَ اللّٰهُ لَا يَسْتَحْيٖ مِنَ الْحَقِّ وَاِذَا سَاَلْتُمُوْهُنَّ مَتَاعًا فَسْئَلُوْهُنَّ مِنْ وَّرَآءِ حِجَابٍ ذٰلِكُمْ اَطْهَرُ لِقُلُوْبِكُمْ وَ قُلُوْبِهِنَّ﴾ [الأحزاب: ٥٣]

''اے ایمان والو! نبی کے گھروں میں مت جاؤ، سوائے اس کے کہ تمھیں کھانے کے لیے اجازت دی جائے اور کھانا (تیار ہونے سے پہلے) اس کے پکنے کا انتظار (وہاں بیٹھ کر) مت کرو، لیکن جب تم کو بلایا جائے تو پھر جاؤ اور جب تم کھانا کھا چکو تو پھر وہاں سے نکل جاؤ اور وہیں جی لگا کر باتیں کرنے کے لیے نہ بیٹھے رہو، تمھاری اس بات سے نبی کو اذیت پہنچتی تھی، مگر وہ تم سے شرم کرتے ہیں، مگر اللہ حق بات کہنے میں شرم نہیں کرتا اور جب نبی کی ازواجِ مطہرات سے کوئی کام کی چیز مانگنے جاؤ تو پردے کے پیچھے سے مانگ لو، اس میں تمھارے اور ان کے دلوں کے لیے خوب ستھرائی ہے۔''

سورۃ الاحزاب کی یہی وہ آیت ہے، جسے ''آیتِ حجاب'' کہا جاتا ہے، کیوں کہ پردے کے بارے میں نازل ہونے والی یہ پہلی آیت ہے اور اس کے نزول کے بعد نبیِ اکرم ﷺ نے اپنی ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن کو اور صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے اپنی بیویوں کو پردے کا حکم فرما دیا تھا۔ اس آیت کے الفاظ ﴿وَاِذَا سَاَلْتُمُوْهُنَّ مَتَاعًا فَسْئَلُوْهُنَّ مِنْ وَّرَآءِ حِجَابٍ﴾ پردے کے فرض ہونے کی قطعی دلیل ہیں۔

اگر کوئی اس آیت کے حکم کو ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن کے ساتھ خاص قرار دے تو اس پر تعجب ہے، کیونکہ اگر ایسا ہی ہوتا تو پھر صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اس آیت کے نزول کے بعد اپنی بیویوں کو پردے کا حکم نہ دیتے اور پھر نبیِ اکرم ﷺ کے اس ارشاد کا کوئی معنیٰ ہی نہ ہوتا، جس میں آپ ﷺ نے پیغامِ نکاح دینے والے کو اپنی منگیتر کو ایک نظر دیکھنے کی اجازت فرمائی ہے، جیسا کہ سنن ترمذی، نسائی، ابن ماجہ و دارمی اور مسند احمد میں حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ میں نے نبیِ اکرم ﷺ کے سامنے ذکر کیا کہ میں نے فلاں عورت کو پیغامِ نکاح دیا ہے تو آپ ﷺ نے پوچھا:

((هَلْ نَظَرْتَ إِلَيْهَا؟)) ''کیا تم نے اسے ایک نظر دیکھا ہے؟''

انھوں نے عرض کی: نہیں، تو آپ ﷺ نے فرمایا:

«فَانْظُرْ إِلَيْهَا، فَإِنَّهُ، أَحْرٰى أَنْ يُّؤْدَمَ بَيْنَكُمَا»[1]

''اسے ایک نظر دیکھ لو یہ تم دونوں کے مابین ازدواجی تعلقات کے مستقل قائم رہنے کے لیے زیادہ موزوں ہے۔''

اگر اس آیتِ حجاب کے نزول کے بعد صحابیات رضی اللہ عنہن چہرے کا پردہ نہیں کیا کرتی تھیں تو پھر اس ارشاد کا کیا معنیٰ ہوا؟

اس سے بڑھ کر یہ کہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواجِ مطہرات کو اللہ تعالیٰ نے اسی سورۃ الاحزاب کی آیت (٦) میں مومنوں کی مائیں قرار دیا ہے، جو اس کے الفاظ ﴿وَاَزْوَاجُهٗ اُمَّهَاتُهُمْ...﴾ میں مذکور ہے، لہٰذا نکاح تو سگی ماؤں کی طرح مومنوں پر ہمیشہ کے لیے حرام ہے اور اگر یہ حکم صرف انھی کے ساتھ خاص مانا جائے تو پھر ان کے حجاب کو اپنانے کا کیا معنیٰ ہوگا؟ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ یہ حکم قیامت تک کے لیے ہے اور تمام مسلمان عورتوں کے لیے عام ہے اور قیاس کا تقاضا بھی یہی ہے کہ عام مسلمان عورتوں کے لیے بھی یہی حکم ہو۔[2]

چھٹی آیت سے استدلال:

سورۃ الاحزاب میں آیت (٥٩) نے صراحت کر دی ہے کہ یہ حکمِ حجاب صرف نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواجِ مطہرات کے لیے نہیں بلکہ عام مسلمان عورتوں کے لیے بھی ہے، چنانچہ ارشادِ الٰہی ہے:

﴿ يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِكَ وَبَنٰتِكَ وَ نِسَآءِ الْمُؤْمِنِيْنَ يُدْنِيْنَ عَلَيْهِنَّ مِنْ جَلَابِيْبِهِنَّ ذٰلِكَ اَدْنٰۤى اَنْ يُّعْرَفْنَ فَلَا يُؤْذَيْنَ وَ كَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴾

[الأحزاب: ٥٩]

''اے نبی! اپنی بیویوں اور بیٹیوں اور عام مسلمانوں کی عورتوں سے کہہ دیں کہ وہ اپنی بڑی بڑی چادریں اوڑھ لیں، امید ہے کہ وہ پہچان لی جائیں گی اور انھیں کوئی نہ چھیڑے گا اور اللہ بڑا غفور و رحیم ہے۔''

[1] مشكاة المصابيح (٢/ ٩٣٣) وقال الألباني: إسناده صحيح، وقد أعل بالإنقطاع، مسند أحمد (٤/ ٢٤٦) صحيح سنن الترمذي، رقم الحديث (٨٦٨) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٨٦٥) صحيح سنن النسائي، رقم الحديث (٣٠٣٤) موارد الظمآن، رقم الحديث (١٢٣٦) والصحيحة، رقم الحديث (٩٦)

[2] فصل الخطاب (ص: ٣٤، ٣٥ بتصرف)

اس آیت کے الفاظ ﴿يُدْنِيْنَ عَلَيْهِنَّ مِنْ جَلَابِيْبِهِنَّ﴾ کی تفسیر کبار تابعین میں سے حضرت عبیدہ سلمانی رحمہ اللہ نے کی ہے، جسے امام ابن جریر طبری رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر میں، ایسے ہی فریابی، عبد بن عبید، ابن المنذر اور ابن ابی حاتم (۲۲/ ۳۳) نے بھی روایت کیا ہے، چنانچہ امام محمد بن سیرین رحمہ اللہ جو خود معروف عالم اور تابعی ہیں، وہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے ان سے ارشادِ الٰہی کے ان الفاظ کی تفسیر پوچھی تو انھوں نے فرمایا:

''فَغَطّٰى وَجْهَهٗ، وَرَأْسَهٗ، وَأَبْرَزَ عَيْنَهُ الْيُسْرٰى'' [1]

''اپنے چہرے اور سر کو ڈھانپ لیا اور صرف اپنی بائیں آنکھ کو کھلا رہنے دیا۔''

نیز ترجمان القرآن حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی ان الفاظ کی تفسیر طبری کے حوالے سے امام ابن کثیر رحمہ اللہ نے نقل کی ہے، جس میں علی بن ابی طلحہ بیان کرتے ہیں کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے:

''أَمَرَ اللّٰهُ نِسَاءَ الْمُؤْمِنِيْنَ إِذَا خَرَجْنَ مِنْ بُيُوْتِهِنَّ فِيْ حَاجَةٍ أَنْ يُّغَطِّيْنَ وُجُوْهَهُنَّ مِنْ فَوْقِ رُؤُوْسِهِنَّ بِالْجَلَابِيْبِ، وَيُبْدِيْنَ عَيْنًا وَّاحِدًا'' [2]

''اللہ تعالیٰ نے مومنوں کی عورتوں کو یہ حکم فرمایا ہے کہ جب وہ کسی کام کے لیے اپنے گھروں سے نکلیں تو انھیں چاہیے کہ اپنے سروں کے اوپر سے گرائے گئے چادر کے پلّو سے اپنے چہروں کو ڈھانپ لیں اور صرف ایک آنکھ کھلی رہنے دیں۔''

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے ''أَمَرَ اللّٰهُ'' فرما کر چہرے کے پردے کے وجوب کو انتہائی واضح کر دیا ہے، تاکہ کسی تاویل کی گنجایش ہی باقی نہ رہے، پھر جلباب کا لغوی معنیٰ ہی وہ چادر ہے جو سارے جسم کو ڈھانپ لے، جیسا کہ علامہ ابن حزم رحمہ اللہ نے ''المحلّٰی'' (۳/ ۲۱۷) میں لکھا ہے:

''وَالْجِلْبَابُ فِيْ لُغَةِ الْعَرَبِ الَّتِيْ خَاطِبَنَا بِهَا رَسُوْلُ اللّٰهِ هُوَ مَا غَطّٰى جَمِيْعَ الْجِسْمِ لَا بَعْضَهٗ''

''وہ لغتِ عرب جس میں ہمیں نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے خطاب کیا ہے، اس لغتِ عرب میں جلباب وہ کپڑا ہے جو سارے جسم کو ڈھانپ لے نہ کہ اس کے بعض اعضا کو۔''

---

[1] اللباب (ص: ۹۳)

[2] تفسیر ابن کثیر (۳/ ۵۱۸) تفسیر ابن جریر طبری (۲۲/ ۳۳) وضعفه الألباني في الحجاب (ص:٤١)

امام قرطبی رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر میں مذکورہ دونوں تفسیریں اور جلباب کا لغوی معنیٰ بھی ذکر کیا اور لکھا ہے:

''وَالصَّحِيحُ أَنَّهُ الثَّوْبُ الَّذِي يَسْتُرُ جَمِيعَ الْبَدَنِ'' [1]

''صحیح یہی ہے کہ جلباب اس کپڑے کو کہا جاتا ہے، جو سارے بدن ہی کو ڈھانپ لے۔''

امام نسفی رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر میں ﴿يُدْنِينَ عَلَيْهِنَّ مِنْ جَلَابِيبِهِنَّ﴾ کے تحت لکھا ہے:

''جلباب وہ کپڑا ہے جو سارے جسم کو مستور کر لے اور ان الفاظ کا معنیٰ یہ ہے کہ عورتیں اپنی چادروں کو اوڑھ لیں، جن سے اپنے چہروں اور جوانب کو ڈھانپ لیں۔'' [2]

اسی طرح امام بیضاوی رحمہ اللہ (ص: ۴۰۹) نے بھی ﴿يُدْنِينَ عَلَيْهِنَّ مِنْ جَلَابِيبِهِنَّ﴾ کے تحت لکھا ہے:

''عورتیں جب کسی ضرورت سے اپنے گھر سے باہر نکلیں تو اپنی چادروں میں اپنے چہرے اور بدن ڈھانپ کر نکلیں۔'' [3]

شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ مجموع الفتاویٰ اور اپنی کتاب ''حجاب المرأة ولبأسها في الصلاة'' میں لکھتے ہیں:

''آیتِ حجاب کے نزول سے پہلے عورتیں جلباب کے بغیر گھروں سے باہر نکلا کرتی تھیں اور مرد ان کے چہرے اور ہاتھ دیکھتے تھے، اس وقت عورت کے لیے یہ جائز تھا کہ وہ چہرے اور ہاتھوں کو ننگا رکھ لے اور اس وقت ان اعضا پر مرد کی نظر پڑنا بھی جائز تھا، کیونکہ ان اعضا کا اظہار جائز تھا، پھر جب اللہ تعالیٰ نے یہ آیتِ حجاب نازل فرمائی تو عورتوں نے مردوں سے مکمل حجاب اختیار کر لیا۔'' [4]

نیز آگے چل کر وہ لکھتے ہیں:

''جلباب سے مراد وہ بڑا کپڑا ہے، جسے حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ اور بعض دیگر اہلِ علم

---

[1] تفسير القرطبي (٧/ ١٤/ ١٥٦)

[2] تفسير النسفي (٣/ ٢٣٩، ٢٤٠) بحواله اللباب (ص: ٦٥)

[3] بحواله بالا.

[4] حجاب المرأة (ص: ١٥، ١٦)

''رداء'' کہتے ہیں اور عام لوگ اسے ''ازار'' کا نام دیتے ہیں، ان ہر دو سے مراد وہ بڑی چادر ہے جو سر اور سارے بدن کو ڈھانپ لے، جیسا کہ حضرت عبیدہ سلمانی رحمہ اللہ نے بیان کیا ہے کہ عورت اس کپڑے کو سر کے اوپر سے اس طرح گرا لے کہ اس کی آنکھوں کے سوا کوئی چیز ظاہر نہ ہو اور اسی کی قبیل سے وہ نقاب بھی ہے، جو عورتیں ڈالا کرتی تھیں۔

جب عورتیں اس بات پر مامور تھیں کہ وہ بڑی چادر اوڑھیں، تاکہ پہچانی نہ جائیں تو اس سے مراد چہرے کا پردہ تھا اور اس وقت سے عورت کے لیے یہ جائز نہ رہا کہ وہ چہرے اور ہاتھوں کی زینت کو اجنبی یعنی غیر محرم مردوں کے سامنے ظاہر کریں، اس طرح سوائے کپڑوں کے کسی چیز پر غیر محرم کی نظر کا پڑنا جائز نہ رہا۔''[1]

دورِ حاضر کے ایک مفسر محمد علی صابونی اپنی تفسیر ''صفوۃ التفاسیر'' میں ﴿يُدْنِينَ عَلَيْهِنَّ مِنْ جَلَابِيبِهِنَّ﴾ کے تحت حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی تفسیر کہ ''اللہ نے مومن عورتوں کو حکم فرمایا ہے کہ وہ جب باہر نکلیں تو اپنے چہروں کو ڈھانپ لیں اور صرف ایک آنکھ کھلی رہنے دیں۔'' نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

''عورت کے چہرے کے وجوب پر دلالت کرنے والی صحیح وصریح روایات کے علاوہ یہ تفسیرِ عبیدہ ایک نصِ صریح ہے، جو چہرے کے پردے کے واجب ہونے پر دلالت کرتی ہے۔''[2]

بعض دیگر مفسرین کے اقوال بھی عورت کے چہرے کے وجوبِ حجاب کا پتا دیتے ہیں، مثلاً علامہ ابن الجوزی رحمہ اللہ نے ''زاد المسیر في علم التفسیر'' (٦/ ٤٢٢) میں لکھا ہے:

''﴿يُدْنِينَ عَلَيْهِنَّ مِنْ جَلَابِيبِهِنَّ﴾ کا معنیٰ یہ ہے کہ عورتیں اپنے سر اور چہرے ڈھانپ کر رکھیں، تاکہ معلوم ہو کہ وہ آزاد و شریف عورتیں ہیں اور ابن قتیبہ رحمہ اللہ سے جلابیب کا معنیٰ چادریں نقل کیا ہے۔''

امام ابوحیان نے اپنی تفسیر ''البحر المحیط'' (٧/ ٢٥٠) میں لکھا ہے:

''﴿يُدْنِينَ عَلَيْهِنَّ مِنْ جَلَابِيبِهِنَّ﴾ کا حکم عورتوں کے سارے جسم کو شامل ہے، یا پھر

---

[1] حجاب المرأة (ص: ١٧، ١٨) بتصرف يسير، مجموع الفتاویٰ (٢٢/ ١١٠، ١١٧، ١١٨)

[2] صفوة التفاسير (١٢/ ٧٢ دار القرآن، بيروت)

﴿عَلَيْهِنَّ﴾ کا معنیٰ ہے: ''عَلٰی وُجُوْهِهِنَّ'' کہ اپنے چہروں پر بڑی چادروں کے پلّو ڈال لیں، کیوں کہ عہدِ جاہلیت میں چہرہ ہی ننگا ہوتا تھا۔''

ابو السعود رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے:

''اس آیت کا معنیٰ یہ ہے کہ عورتیں بڑی چادروں سے اپنے بدن اور چہرے ڈھانپ لیں، جب وہ گھر سے نکلیں۔''[1]

امام ابوبکر الرازی المعروف بالجصاص نے اپنی کتاب ''احکام القرآن'' (۳/۳۷۲) میں لکھا ہے:

''اس آیت میں اس بات کی دلیل موجود ہے کہ جوان عورت غیر محرم مردوں سے اپنے چہرے کا بھی ضرور پردہ کرے۔''[2]

تفسیر جلالین میں بھی اس آیت کے ان الفاظ کا معنیٰ یہ لکھا ہے:

''عورتیں گھروں سے نکلتے وقت اپنی چادریں اپنے چہروں پر بھی ڈال لیں اور صرف آنکھ کھلی رہنے دیں۔''[3]

یہ چھے (٦) آیات ہیں، جن سے عورت کے چہرے کے پردے کے واجب ہونے پر استدلال کیا گیا ہے۔

آزاد عورت اور کنیز کے پردے کا مسئلہ:

قرآن کی چھے (٦) آیات سے عورتوں کے لیے چہرے کے پردے کے وجوب پر استدلالات ذکر کیے گئے ہیں اور چھٹی آیت سورۃ الاحزاب کی تھی، جس میں بعض الفاظ ایسے ہیں، جن سے آزاد و کنیز کے مابین چہرے کے پردے کے سلسلہ میں فرق اور عدمِ فرق کی بحث کی گئی ہے، اس آیت میں ارشادِ الٰہی ہے:

﴿ يَآأَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّأَزْوَاجِكَ وَبَنٰتِكَ وَ نِسَآءِ الْمُؤْمِنِيْنَ يُدْنِيْنَ عَلَيْهِنَّ مِنْ جَلَابِيْبِهِنَّ﴾ [الأحزاب: ٥٩]

---

[1] تفسير أبي السعود على هامش الرازي (/ ٨٠١) بحواله روائع البيان للصابوني (٢/ ٣٨٣)

[2] أحكام القرآن جصاص بحواله سابقه.

[3] تفسير الجلالين على المصحف (ص: ٥٦٠ دار المعرفة بيروت)

''اے نبی! اپنی بیویوں، بیٹیوں اور عام مسلمانوں کی عورتوں سے کہہ دیں کہ اپنی چادریں اُوڑھ لیں۔''

آگے فرمایا:

﴿ذٰلِكَ اَدْنٰٓى اَنْ يُّعْرَفْنَ فَلَا يُؤْذَيْنَ﴾ [الأحزاب: ٥٩]

''اس سے امید ہے کہ وہ پہچان لی جائیں گی اور انھیں کوئی نہ چھیڑے گا۔''

امام شوکانی رحمہ اللہ نے فتح القدیر میں اس آیت کا پسِ منظر یا شانِ نزول یہ لکھا ہے:

''مسلمان عورتیں ضرورت سے کہیں باہر نکلتیں تو منافقین انھیں چھیڑنے کی جراَت کرتے اور جب ان سے پوچھا جاتا تو کہتے کہ ہم سمجھتے تھے کہ یہ لونڈیاں ہیں، اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔''[1]

یعنی چادروں سے چہرے ڈھکے ہونے سے راستے والے پہچان لیں گے کہ یہ شریف زادیاں ہیں۔ (کنیزیں نہیں) اور یہ جان کر کوئی انھیں چھیڑنے کی جراَت نہیں کرے گا۔

اس پس منظر میں اس آیت کے آخری الفاظ کا تقاضا یہ لگتا ہے کہ کنیزیں اپنے چہرے ننگے رکھیں، لیکن یہ ایک غلط فہمی ہے، جسے بعض فقہا نے اور بھی بھیانک بنا دیا ہے، جن کا کہنا ہے کہ آزاد شریف زادی تو ساری ہی ستر ہے اور کنیز کے صرف وہ اعضا ستر ہیں، جو غالباً ننگے نہیں ہوتے، جیسے پیٹ، کمر اور پنڈلیاں وغیرہ، جب کہ اسلامی معاشرے کو طاہر و پاکیزہ رکھنے کے لیے اسلام نے جو اقدامات کیے ہیں، یہ مفہوم ان سے کوئی نسبت نہیں رکھتا اور باوجود اس کے کہ جمہور مفسرین نے اس آیت کا یہی مفہوم بیان کیا ہے، جیسا کہ امام شوکانی رحمہ اللہ کی تفسیر فتح القدیر کے حوالے سے بھی ذکر گزرا ہے، لیکن بایں ہمہ بعض کبار اہلِ تحقیق نے اس سے اتفاق نہیں کیا۔

بعض مفسرین نے بھی اس کا دوسرا مفہوم بیان کیا ہے، جو اسلامی معاشرے کی طہارت و پاکیزگی کے سلسلے میں اسلامی تعلیمات سے خوب میل کھاتا ہے، چنانچہ جمہور کے قرآنی الفاظ ﴿اَنْ يُّعْرَفْنَ﴾

[1] یہ پس منظر یا شانِ نزول طبقات ابن سعد (٨/ ١٢٧) میں مروی ہے، لیکن یہ روایت ضعیف ہے۔ شیخ البانی نے اسے نقل کرنے کے بعد لکھا ہے: ''فلا يصح بل هو ضعيف جدا لأمور فذكرها'' (الحجاب له، ص: ٤٣) یہ صحیح نہیں بلکہ کئی امور کی بنا پر یہ روایت ضعیف ہے اور آگے تین امور ذکر کیے ہیں۔

کے مفہوم کہ وہ پہچانی جائیں کہ وہ آزاد ہیں کنیزیں نہیں، اس سے ہٹ کر امام ابو حیان نے اپنی تفسیر "البحر المحیط" (۷/ ۲۵۰) میں ﴿اَدْنٰی اَنْ یُّعْرَفْنَ﴾ کا مفہوم یہ بیان کیا ہے:

''پردے کا حکم تمام عورتوں کو ہے، وہ آزاد ہوں یا کنیزیں اور ﴿اَدْنٰی اَنْ یُّعْرَفْنَ﴾ سے مراد یہ ہے کہ وہ پہچانی جائیں کہ وہ باعفت وعصمت پردہ دار نیک اطوار خواتین ہیں، تب شرپسند اور فساد انگیز افراد ان کے درپے ہی نہیں ہوں گے۔''

چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

''ظاہر بات یہ ہے کہ ارشادِ الٰہی میں ﴿نِسَآءِ الْمُؤْمِنِیْنَ﴾ کے الفاظ آزاد و کنیز سب عورتوں کو شامل ہیں اور کنیزیں تو زیادہ باعثِ فتنہ ہوتی ہیں، بہ نسبت آزاد عورتوں کے، کیونکہ وہ کام کاج کے سلسلے میں زیادہ اندر باہر آتی جاتی ہیں، لہٰذا انھیں ارشادِ الٰہی میں وارد اس عموم سے خارج اور خاص کرنے کے لیے واضح دلیل کی ضرورت ہے۔ ارشادِ الٰہی کے الفاظ ﴿اَدْنٰی اَنْ یُّعْرَفْنَ﴾ سے مراد یہ ہے کہ وہ عفت وعصمت کے تحفظ کے لیے پردہ دار عورتوں کی حیثیت سے پہچانی جائیں، تاکہ کوئی انھیں ستانے یا چھیڑنے کے درپے نہ ہو اور نہ وہ کسی کی ناپسندیدہ حرکت سے دوچار ہوں، کیونکہ عورت جب پوری طرح پردہ دار اور اپنے آپ کو سمیٹے سنبھالے ہوئے ہو تو اسے چھیڑنے کی کسی کو جرأت نہیں ہوتی، بخلاف بے پردہ عورتوں کے، انھیں بلاشبہہ تاڑا اور چھیڑا جانا قرینِ قیاس ہے۔''[1]

اس آیت کے الفاظ کی تفسیر جو جمہور نے کی ہے وہ اپنی جگہ، لیکن حقیقت یہ ہے کہ ابو حیان کی تفسیر ہی اسلامی نظامِ عفت وعصمت کے عین مطابق ہے اور اسی سے اسلامی تعلیمات کے مقاصد صحیح معنوں میں پورے ہوتے ہیں۔ شیخ محمد علی صابونی نے اسی تفسیر پر صاد کی ہے۔[2]

"اللباب في فرضية النقاب (ص: ۱۰۰، ۱۰۲) میں فرید بن امین الہنداوی نے بھی اس تفسیر کو زبردست خراجِ تحسین پیش کیا ہے اور کیوں نہ ہوتا؟ اس بحث میں تو بڑے بڑے ائمہ و محققین اور اساطین علم وفضل نے یہی موقف اختیار کیا ہے، جو امام ابو حیان کا ہے۔

---

[1] روائع البيان للصابوني (۲/ ۳۷۹، ۳۸۰)

[2] روائع البيان للصابوني (۲/ ۳۸۰)

علامہ ابن حزم رحمہ اللہ:

اہلِ ظاہر کے امام، محقق کبیر اور فاضل جلیل حضرت علامہ ابن حزم رحمہ اللہ نے تو کنیزوں کے لیے (چہرے کے) پردے کو واجب قرار دیا ہے، وہ اپنی معروف کتاب ''المحلّٰی'' (۳/ ۲۱۸، ۲۱۹) میں لکھتے ہیں:

''أَمَّا الْفَرْقُ بَیْنَ الْحُرَّۃِ وَالْأَمَۃِ فَدِیْنُ اللّٰہِ وَاحِدٌ وَالْخِلْقَۃُ وَالطَّبِیْعَۃُ وَاحِدَۃٌ، کُلُّ ذٰلِکَ فِي الْحَرَائِرِ وَالْإِمَاءِ سَوَاءٌ حَتّٰی یَأْتِيَ نَصٌّ فِي الْفَرْقِ بَیْنَھُمَا فِي شَيْئٍ فَیُوْقَفُ عِنْدَہٗ''

''رہی بات آزاد عورت اور کنیز کے پردے میں فرق کی تو اللہ کا دین (دونوں کے لیے) ایک ہے، آزاد کنیز کی خلقت و فطرت بھی ایک ہی ہوتی ہے، آزاد و کنیز سب عورتوں میں یہ امور و اوصاف برابر ہیں، لہٰذا پردے کے سلسلے میں ان کے مابین فرق نہیں کیا جا سکتا، یہاں تک کہ ان دونوں کے مابین فرق کرنے والی کوئی نص ہو تو پھر اس پر عمل کیا جائے۔''

گویا علامہ ابن حزم رحمہ اللہ نے آزاد شریف زادیوں اور کنیزوں کے لیے پردے کا حکم ایک ہی قرار دیا ہے۔

امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ:

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے جمہور اور علامہ ابن حزم رحمہ اللہ و ابو حیان رحمہ اللہ کی آراء کے مابین متوسط مسلک اپنایا ہے، جسے ایک تیسرا مسلک یا ان کے مابین ایک درمیانی راہ بھی کہا جا سکتا ہے، چنانچہ وہ اپنی کتاب ''حجاب المرأۃ المسلمۃ ولبأسھا في الصلاۃ'' میں ایک جگہ تو لکھتے ہیں:

''حجاب و پردہ آزاد عورتوں کے لیے خاص ہے، کنیزوں کے لیے نہیں۔''

ایک جگہ لکھا ہے:

''عہدِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفاے راشدین رضی اللہ عنہم کے دور میں یہی طریقہ تھا کہ آزاد عورتیں پردہ کریں اور کنیزیں پردہ نہ کریں، حتیٰ کہ حضرت عمرِ فاروق سر منہ ڈھانپنے والی کنیز کو مار کر کہا

کرتے تھے کہ تم آزاد عورتوں کی مشابہت کرتی ہو اور کنیز کا سر، ہاتھ اور منہ ننگا کروا دیتے تھے۔"[1]

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے حضرت فاروق رضی اللہ عنہ کے اس اثر کو مطلقاً تو قبول نہیں کیا، بعض اسلامی قواعدِ عامہ کی روشنی میں مسئلہ پر بحث و مناقشہ کیا ہے، "جس کے تذکرہ سے پہلے یہ واضح کر دیں کہ حضرت عمرِ فاروق رضی اللہ عنہ کا یہ اثر سنن کبریٰ بیہقی اور مصنف ابن ابی شیبہ میں مروی ہے اور امام بیہقی نے اسے روایت کرنے کے بعد لکھا ہے کہ اس سلسلے میں حضرت عمرِ فاروق رضی اللہ عنہ سے مروی آثار کی اسناد صحیح ہے، جبکہ علامہ ابن حزم رحمہ اللہ نے اس اثر کا جواب بھی "المحلّٰی" (۳/ ۲۲۱) میں ذکر کیا اور لکھا ہے:

"وَلٰكِنْ لَا حُجَّةَ فِيْ أَحَدٍ دُوْنَ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ"

"لیکن نبیِ اکرم ﷺ کے سوا دوسرا کوئی حجت نہیں ہے۔"

علامہ ابن حزم رحمہ اللہ کے اس قول کا شاہد و مؤید وہ حدیث بھی ہے جو سنن ابن ماجہ اور مصنف ابن ابی شیبہ میں ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے، اس میں وہ بیان کرتی ہیں:

"نبیِ اکرم ﷺ میرے پاس آئے تو ان کے پاس جو آزاد کردہ کنیز بیٹھی تھی، وہ چھپ گئی، آپ ﷺ نے دریافت کیا فرمایا کہ کیا یہ بالغ ہے؟ تو بتایا گیا کہ ہاں۔"

اس حدیث میں آگے ہے:

«فَشَقَّ لَهَا مِنْ عِمَامَتِه فَقَالَ: اِخْتَمِرِيْ بِهٰذَا»[2]

"آپ ﷺ نے اپنے عمامے مبارک سے کچھ کپڑا پھاڑ کر اس کنیز کو دیا اور فرمایا: یہ لے کر اسے اوڑھنی بنا لو۔"

اس روایت کی سند اگرچہ ضعیف ہے، لیکن یہ ابن حزم رحمہ اللہ کے قول کی شاہد و مؤید ہے اور جیسا کہ ہم نے ذکر کیا ہے کہ امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے حضرت عمرِ فاروق رضی اللہ عنہ کے اس اثر کو مطلقاً نہیں اپنایا، بلکہ بعض قواعدِ عامہ کی روشنی میں اصل مسئلے پر بحث و مناقشہ کیا ہے، جیسے کہ قاعدہ ہے:

"دَرْءُ الْمَفَاسِد قَبْلَ جَلْبِ الْمَصَالِحِ"

"فوائد و مصالح کے حصول سے قبل مفاسد کو دور کرنا ضروری ہوتا ہے۔"

---

[1] حجاب ابن تيمية (ص: ۳۷) بتحقيق الألباني.

[2] حجاب الألباني (ص: ٤٥ حاشية) وقال بسندٍ ضعيف، ضعيف سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٤٠)

اس قاعدے کو سامنے رکھتے ہوئے امام موصوف نے مسئلے کو اس کے اطلاق پر نہیں چھوڑا، جس کی رو سے ایک خوبصورت اور جوان کنیز کا بھی پردے کے بغیر رہنا لازم ہو اور وہ خوبرو کنیز اپنے بال بھی ننگے رکھے، بلکہ وہ بوڑھی عورتیں جو نکاح کی عمر سے گزر چکی ہوں، انھیں پردے کے معاملے میں قرآن پاک میں دی گئی گنجایش کا تذکرہ اور اس کا سبب یعنی زوالِ مفاسد کا ذکر کرنے، پھر بے نفس و بے خواہش لوگوں کے سامنے عورت کے اظہارِ زینت اور اس کے سبب یعنی مفاسد وفتن کا باعث بننے والی شہوت کے فقدان کے ذکر پر مشتمل ایک انتہائی مفید تمہید کے بعد شیخ الاسلام لکھتے ہیں:

''ایسے ہی کنیز کا معاملہ بھی ہے کہ اگر اس کے حسن و جمال اور جوانی سے فتنہ پیدا ہونے کا خطرہ ہو تو ایسی کنیز پر بھی ضروری ہے کہ وہ بھی (آزاد عورت کی طرح) اپنی چادر کا پلو لٹکائے اور پردہ کرے، اس کا اپنی نگاہ کو بچانا اور دوسروں کا اس سے اپنی نگاہ کو بچانا واجب ہے۔ کتاب و سنت میں بالعموم ہر قسم کی کنیزوں پر نگاہ ڈالنا مباح نہیں ہے اور نہ ان کا علی الاطلاق حجاب و پردے کو ترک کرنا اور اپنی زینت کا اظہار کرنا جائز ہے، بلکہ (بات صرف اتنی ہے کہ) قرآن نے کنیزوں کو وہ حکم نہیں دیا جو آزاد عورتوں کو دیا ہے اور سنت نے بالفعل ان میں اور آزاد عورتوں میں فرق کر دیا ہے، لیکن ان کے مابین عمومیت کے لفظ سے فرق نہیں کیا (کہ جو ہر کنیز کو ہی شامل ہو) بلکہ مسلمانوں میں مروج یہ تھا کہ کنیزیں نہیں بلکہ آزاد عورتیں ان سے حجاب و پردہ کیا کرتی تھیں۔ قرآن نے آزاد عورتوں میں سے بھی بوڑھی خواتین کو پردے کے احکام سے مستثنیٰ کر دیا ہے اور بعض مردوں کو مستثنیٰ کر دیا ہے کہ بے نفس و بے خواہش قسم کے مردوں کے سامنے عورت اپنی زینت ظاہر کر سکتی ہے اور یہ استثنا اس لیے ہے کہ ان دونوں قسم کے لوگوں میں شہوت معدوم ہے۔

''جب ان لوگوں کو مستثنیٰ کیا گیا ہے تو وہ کنیزیں جن کے ترکِ حجاب اور اظہارِ زیب و زینت سے فتنہ انگیزی کا خطرہ موجود ہے، وہ کنیزوں کی نسبت ترکِ حجاب کے عام حکم سے بالاولیٰ مستثنیٰ ہیں اور جیسا کہ شوہروں کے (دوسری بیویوں سے) لڑکوں اور ایسے ہی دوسرے لوگوں کے سامنے بھی مخفی زینت کو ظاہر کرنا جائز نہیں، جبکہ وہ شہوت کو برانگیختہ کرنے والے لوگ ہوں۔

’’حجاب و پردے کے سلسلے میں خطابِ الٰہی عام ہے، لیکن جو چیز عمومیت و عادت سے خارج ہوجائے، وہ اپنے نظائر سے نکل جاتی ہے، پس جب کنیز کے بے پردہ پھرنے اور اس پر نظر پڑنے سے فتنہ وفساد یعنی اخلاقی بگاڑ پیدا ہونے کا خطرہ ہو تو انھیں اس سے منع کرنا واجب ہے۔‘‘

تھوڑا آگے چل کر شیخ الاسلام لکھتے ہیں:

’’اگر خوبصورت کنیز اور لڑکوں پر نظر ڈالنے سے بگاڑ پیدا ہونے کا خطرہ ہو تو ان سے نظر بچانا ضروری ہے، جیسا کہ اہلِ علم نے ذکر کیا ہے۔‘‘[1]

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ کنیزوں کے پردے کے مسئلے میں امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کا مسلک جمہور اہلِ علم کے عدمِ وجوب اور علامہ ابن حزم رحمہ اللہ کے وجوب کے درمیان والی راہ ہے اور اس طرح جمہور کے مسلک کی تائید کرنے والے آثار جو شیخ الاسلام نے ذکر کیے ہیں، ان میں اور ’’درء المفاسد قبل جلب المصالح‘‘ والے قاعدے کے مابین تطبیق و موافقت بھی پیدا کر دی ہے۔ محقق و معلق کتاب ’’حجاب المرأة المسلمة ولبأسها في الصلاة‘‘ نے مقدمہ میں اسی درمیانے مسلک کو جمہور کے مسلک کی نسبت اقرب إلی الصواب قرار دیا ہے۔[2]

علامہ ابن قیم رحمہ اللہ:

اس سلسلے میں ان کے شاگردِ رشید اور محققِ شہیر علامہ ابن قیم رحمہ اللہ کی رائے اپنے جلیل القدر استاذِ گرامی سے ملتی جلتی ہے، چنانچہ شیخ حمود بن عبداللہ التویجری نے اپنی کتاب ’’الصارم المشهور على أهل التبرج والسفور‘‘ میں علامہ ابن قیم رحمہ اللہ کا ایک اقتباس ’’إعلام الموقعين‘‘ سے نقل کیا ہے، جس میں وہ فرماتے ہیں:

’’ایک بدصورت آزاد بڑھیا کی طرف نظر کا حرام کیا جانا اور ایک انتہائی حسن و جمال کی مالک کنیز کی طرف نظر کا مباح ہونا (یہ صحیح نہیں بلکہ) یہ نبیِ اکرم ﷺ کی طرف (اگر منسوب بھی کر دی گئی ہو تو) سراسر جھوٹ پر مبنی نسبت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے کہاں ایک کو

---

[1] حجاب ابن تيمية (ص: ٣٨، ٣٩) و مقدمة الألباني (ص: ٧)

[2] مقدمة حجاب ابن تيمية للألباني (ص: ٧)

حرام اور دوسری کو مباح قرار دیا ہے؟ اللہ تعالیٰ نے تو ارشاد فرمایا ہے:

﴿ قُلْ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوا مِنْ اَبْصَارِهِمْ ﴾ [النور: ۳۰]

''اے پیغمبر! لوگوں سے کہہ دیں کہ اپنی نگاہیں نیچی رکھیں۔''

''اللہ تعالیٰ ایسے ہی اس کے رسول ﷺ نے حسین و خوبرو کنیزوں کی طرف نظریں دوڑانے کے لیے آنکھوں کو کھلا تو نہیں چھوڑا اور جب کسی کنیز پر نظر پڑنے سے اخلاقی بگاڑ و فتنہ کا خطرہ ہو تو اس پر نظر ڈالنا بھی بلاشبہہ حرام ہے۔ یہ شبہہ یا اشکال دراصل اس طرح پیدا ہوا ہے کہ شارع نے آزاد عورتوں کے لیے تو حکم صادر فرمایا ہے کہ وہ اجنبی (غیر محرم) مردوں سے حجاب و پردے کے ذریعے اپنے چہرے چھپائیں، جبکہ کنیزوں پر یہ واجب نہیں کیا، لیکن یہ صرف ان کنیزوں کی نسبت ہے جو بیچاری کام کاج میں جُتی رہنے والی ہوتی ہیں، البتہ وہ کنیزیں جنھیں ہم خوابی کے لیے منتخب کیا جا چکا ہو اور انھیں عادتاً حفاظت و پردے میں رکھا جاتا ہے، ایسی کنیزوں کے لیے اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے کہاں یہ مباح کیا ہے کہ وہ گلی کوچوں میں اور لوگوں کے اکٹھے ہونے کی جگہوں پر ننگے منہ پھرتی رہیں اور مردوں کو کہاں اجازت دی گئی ہے کہ وہ انھیں دیکھ دیکھ کر لطف اندوز ہوتے رہیں؟ یہ سراسر شریعتِ مطہرہ کی طرف منسوب کی گئی ایک غلط بات ہے۔''

آگے موصوف نے ستر کی دو قسمیں بھی بیان کی ہیں: ''عَوْرَةٌ فِي النَّظْرِ'' اور ''عَوْرَةٌ فِي الصَّلَاةِ'' پھر بتایا ہے:

''آزاد عورت (گھر میں) ننگے منہ اور ننگے ہاتھوں نماز تو پڑھ سکتی ہے، لیکن وہ اسی طرح بازاروں اور لوگوں کے جمع ہونے کی جگہوں پر نہیں جا سکتی۔''[1]

یہ علامہ ابن قیم رحمہ اللہ کے اقتباس کا ترجمہ ہے اور آزاد عورتوں اور کنیزوں کے پردے کے سلسلے میں ہم صرف اسی پر اکفا کرتے ہیں، کیونکہ اس میں بات واضح ہوگئی ہے اور ویسے بھی آج الحمد للہ غلامی کا مسئلہ ہی ختم ہو چکا ہے، جس سے کنیزوں کے پردے کا یہ مسئلہ درپیش آنا ہی نادر ہوگیا ہے۔ ذٰلِكَ مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ تَعَالٰی.

---

[1] بحواله اللباب (ص: ۱۰۲) وإعلام الموقعين (۱/ ۲/ ٦١ دارالفكر بيروت)

حدیث شریف کی روشنی میں

سابق صفحات میں ہم نے قرآنِ کریم کی چھے (٦) آیات کی روشنی میں ثابت کیا ہے کہ گلی بازار نکلتے وقت اور غیر محرم مردوں کی موجودگی میں عورت کے لیے واجب ہے کہ وہ اپنے چہرے سمیت پردے سے رہے اور یہی چہرے کا پردہ ایک دو نہیں متعدد احادیث سے بھی ثابت ہے۔ حسبِ سابق ہماری یہ کوشش ہوگی کہ ہم صحیح اور حسن احادیث کے سوا کسی سے استدلال ذکر نہ کریں، کیونکہ ضعیف حدیث جب قابلِ حجت و استدلال ہی نہیں تو پھر اسے ذکر کرنے سے حاصل ہی کیا؟

پہلی حدیث:

پہلی حدیث صحیح بخاری و مسلم اور دیگر کتبِ حدیث میں ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے، جس میں وہ بیان کرتی ہیں:

«رَأَيْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ يَسْتُرُنِيْ بِرِدَآئِهِ وَأَنَا أَنْظُرُ إِلَى الْحَبَشَةِ يَلْعَبُوْنَ فِي الْمَسْجِدِ»[1]

''میں نے نبیِ اکرم ﷺ کو دیکھا کہ آپ ﷺ مجھے اپنی چادر سے پردے میں کر رہے تھے، جبکہ میں مسجد میں (حربی کھیل گتکا) کھیلنے والے حبشیوں کو کھیلتے دیکھ رہی تھی۔''

اگر چہرے کا پردہ ہی نہیں تو پھر نبیِ اکرم ﷺ کے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو چادر میں چھپانے کا مقصد ہی کیا تھا؟ باقی جسم تو یقیناً پہلے ہی کپڑوں میں ملبوس ہوگا، صرف چہرے کی بات تھی، اسے نبیِ اکرم ﷺ نے اپنی چادر سے پردہ مہیا فرما دیا۔

دوسری حدیث:

دوسری حدیث سنن اربعہ اور مسند احمد میں صحیح سند کے ساتھ ام المومنین حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے، جس میں وہ بیان کرتی ہیں کہ میں نبیِ اکرم ﷺ کے پاس تھی اور ام المومنین حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا بھی آپ ﷺ کے پاس تھیں، اتنے میں ایک نابینا صحابی حضرت ابن ام مکتوم رضی اللہ عنہ

[1] صحيح البخاري مع الفتح (٢/ ٤٧٤) رقم الحديث (٤٥٤) والمنتقىٰ مع النيل (٣/ ٦/ ١١٧) صحيح مسلم مع شرح النووي (٣/ ٦/ ١٨٤، ١٨٥)

آ گئے اور یہ اس وقت کا واقعہ ہے، جبکہ پردے کا حکم نازل ہو چکا تھا۔ نبیِ اکرم ﷺ نے فرمایا:

«إِحْتَجِبَا مِنْهُ» ''تم دونوں اس صحابی سے پردہ کرو۔''

ہم نے عرض کی: اے اللہ کے رسول ﷺ!

''أَلَيْسَ أَعْمٰى، لَا يُبْصِرُنَا وَلَا يَعْرِفُنَا؟''

''کیا یہ نابینا نہیں، ہمیں نہ وہ دیکھ سکتے ہیں نہ پہچان سکتے ہیں؟''

اس پر نبیِ اکرم ﷺ نے فرمایا:

«أَفَعُمْيَاوَانِ أَنْتُمَا؟ أَلَسْتُمَا تُبْصِرَانِهِ؟»[1]

''کیا تم دونوں بھی نابینا ہو؟ کیا تم انھیں نہیں دیکھ رہی ہو؟''

امام ترمذی رحمہ اللہ نے اس حدیث پر یوں تبویب کی ہے:

''بَابُ مَا جَآءَ فِيْ اِحْتِجَابِ النِّسَآءِ مِنَ الرِّجَالِ''

''عورتوں کا مردوں سے پردہ کرنے کے سلسلے میں باب''

گویا امام ترمذی رحمہ اللہ نے اس حدیث سے یہی سمجھا ہے کہ خطاب اگرچہ ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن کو تھا، لیکن اس کا حکم ان کے ساتھ خاص نہیں ہے بلکہ امتِ اسلامیہ کی تمام عورتوں کو شامل ہے۔

اس حدیث کی شرح کچھ تفصیل طلب ہے، جو "فتح الباري" (۹/ ۳۳۷)، "تحفة الأحوذي" (۸/ ٦٢، ٦٣)، "عون المعبود شرح سنن أبي داود" (۱۱/ ۱٦۹، ۱۷۱) اور دیگر شروحِ حدیث میں دیکھی جا سکتی ہے۔

تیسری حدیث:

اسی موضوع کی ایک تیسری حدیث صحیح مسلم، سنن ابو داود و نسائی، مسند احمد و شافعی اور موطا امام مالک میں حضرت فاطمہ بنت قیس رضی اللہ عنہا سے مروی ہے، وہ بیان کرتی ہیں کہ ان کے شوہر ابو عمرو بن حفص رضی اللہ عنہ نے انھیں تیسری طلاق بھی دے دی، جبکہ وہ گھر سے غائب تھے، وہ نبیِ اکرم ﷺ کی خدمت میں

[1] سنن الترمذي مع التحفة (۸/ ٦۱، ٦٢) سنن أبي داود مع العون (۱۱/ ۱٦۹) وقال الحافظ في الفتح (۹/ ۳۳۷) إسناد قوی، المنتقیٰ مع النیل (۳/ ٦/ ۱۱٦) مسند أحمد (٦/ ۲۹٦)

حاضر ہوئی اور سارا ماجرا سنایا، آپ ﷺ نے انھیں حکم فرمایا:

’’وہ حضرت ام شریک رضی اللہ عنہا کے گھر میں عدت کے دن گزاریں۔‘‘

پھر فرمایا:

’’وہ ایسی (مالدار و فیاض) عورت ہیں کہ میرے صحابی رضی اللہ عنہم بکثرت ان کے یہاں جاتے رہتے ہیں، لہٰذا تم ابن ام مکتوم رضی اللہ عنہ کے پاس عدت گزار لو، وہ تو نابینا آدمی ہیں، تم اس کے پاس اپنی چادر اتار سکو گی۔‘‘

صحیح مسلم کی ایک روایت میں ارشادِ نبوی ﷺ ہے:

«فَإِنَّكِ إِذَا وَضَعْتِ خِمَارَكِ لَمْ يَرَكِ»[1]

’’اگر تم ان کی موجودگی میں اپنی اوڑھنی اتار بھی لو گی تو وہ تم کو نہیں دیکھ پائیں گے۔‘‘

مسند احمد کی روایت میں بھی ایسے ہی الفاظ ہیں، جبکہ سنن نسائی میں حضرت ام شریک رضی اللہ عنہا کے مالدار و فیاض اور مہمان نواز ہونے کے تذکرے کے علاوہ یہ بھی مذکور ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

«فَإِنِّي أَكْرَهُ أَنْ يَّسْقُطَ عَنْكِ خِمَارُكِ أَوْ يَنْكَشِفَ الثَّوْبُ عَنْ سَاقَيْكِ فَيَرَى الْقَوْمُ مِنْكِ بَعْضَ مَا تَكْرَهِينَ»[2]

’’مجھے یہ اچھا نہیں لگتا کہ تم سے کبھی اوڑھنی گر جائے یا آپ کی پنڈلی سے کپڑا اُٹھ جائے اور تمھارے جسم کا کوئی حصہ لوگ دیکھ لیں، جس کا دیکھنا تم پسند نہیں کرتی ہو۔‘‘

اس حدیث میں دلیل ہے کہ عورت کے لیے جائز نہیں کہ وہ غیر محرم نابینا مرد کی موجودگی میں اوڑھنی اتار لے اور یہ اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ عورت اپنے چہرے اور دوسرے اعضا کو ڈھانپ کر رکھے، جیسا کہ ارشادِ نبوی ﷺ کے الفاظ سے پتا چل رہا ہے اور اس حدیث میں لفظ «خِمَارِ» کے بعد جو «لَمْ يَرَكِ» آیا ہے، وہ اس بات کی طرف اشارہ کر رہا ہے کہ نہ دیکھنے سے چہرہ نہ دیکھنا مراد ہے، کیونکہ ’’خمار‘‘ کی لغوی تشریح جو فتح الباری کے حوالے سے پہلے ذکر کی جا چکی ہے، اس سے مراد وہ کپڑا ہے جو چہرے کو ڈھانپ لے، لہٰذا یہ حدیث بھی قائلینِ وجوب کی دلیل ہے۔

---

[1] صحیح مسلم مع شرح النووي (٥/ ١٠/ ١٠٠)

[2] سنن أبي داود مختصراً (١١/ ١٧٠) صحیح سنن النسائي، رقم الحدیث (٣٠٣٦)

چوتھی حدیث:

ایسے ہی صحیح بخاری، سنن ابی داود، ترمذی ونسائی اور مسند احمد میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

«لَا تَنْتَقِبُ الْمَرْأَةُ الْمُحْرِمَةُ وَلَا تَلْبَسُ الْقُفَّازَيْنِ»[1]

''احرام کی حالت میں عورت عربی نقاب نہ پہنے اور نہ ہاتھوں پر دستانے چڑھائے۔''

عورت کے احرام کے سلسلے میں اہم وضاحت:

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ احرام کی حالت میں عورت کو عربی نقاب نہ پہننا چاہیے۔ نقاب نہ پہننے سے مراد یہ ہے کہ نقاب کو اس طرح منہ پر نہ باندھے، جیسے مرد لوگ پگڑی کا ڈھاٹا بناتے ہیں، ورنہ اس سے یہ مراد ہرگز نہیں کہ وہ پردہ ہی نہ کرے، بلکہ احرام کی حالت میں بھی سر سے کپڑا گرا کر پردہ کر لینے کا پتا ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن کے عمل سے بھی چلتا ہے، جبکہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بھی ان کے ہمراہ تھے۔ جیسا کہ اس موضوع کی بعض احادیث بھی آگے چل کر ہم ذکر کرنے والے ہیں، لہٰذا ان الفاظ سے اس غلط فہمی میں ہرگز مبتلا نہیں ہونا چاہیے کہ احرام کی حالت میں پردہ نہیں ہے، بلکہ بات صرف اتنی ہے کہ نقاب کے کپڑے کو منہ پر باندھنا نہیں چاہیے، اسے محض سر سے گرا لینا ہی کافی اور جائز بلکہ ضروری ہے۔

اس نقاب والی حدیث کو نقل کر کے امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے اپنی کتاب ''حجاب المرأة المسلمة ولبأسها في الصلاة'' میں لکھا ہے:

''یہ اس بات کے دلائل میں سے ہے کہ جو عورتیں احرام کی حالت میں نہ ہوں، وہ نقاب اور دستانے پہنیں (یہ دونوں چیزیں ان کے یہاں معروف تھیں) اور یہ اس بات کی متقاضی ہیں کہ وہ اپنے چہرے اور ہاتھوں کا پردہ کرتی ہوں گی۔''[2]

علامہ ابن قیم رحمہ اللہ نے ''تهذيب السنن'' میں نقاب والی اس حدیث کے سلسلے میں لکھا ہے کہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا حدیثِ ابن عمر رضی اللہ عنہما میں عورت کو نقاب اور دستانے پہننے سے روکنا اس بات کی

---

[1] سنن أبي داود مع العون (٥/ ١٧١) صحيح البخاري مع الفتح، رقم الحديث (١٨٣٧) صحيح سنن الترمذي، رقم الحديث (٦٦٦) صحيح سنن النسائي، رقم الحديث (٢٥٠٣) صحيح الجامع، رقم الحديث (٧٤٤٥)

[2] حجاب ابن تيمية (ص: ٣٦) بتحقيق الألباني.

دلیل ہے کہ عورت کا چہرہ (احرام میں) مرد کے جسم کی طرح ہے۔ لہٰذا (جس طرح مرد کے لیے جسم کے اعضا کے مطابق سِلا ہوا لباس پہننا منع ہے ایسے ہی) عورت کے لیے چہرے کے سائز کے مطابق سِلا ہوا نقاب و برقع پہننا منع ہے، البتہ چادر وغیرہ سے چہرے کو ڈھانپنا منع نہیں ہے اور یہی صحیح تر قول ہے۔

نبیِ اکرم ﷺ نے اس کے چہرے اور ہاتھوں کو برابر قرار دیا ہے اور دستانے اور نقاب دونوں سے منع فرمایا ہے، جبکہ یہ بات معروف ہے کہ ہاتھوں کا پردہ حرام نہیں ہے، بلکہ وہ محرم مرد کے جسم کی طرح ہیں، جن کو ان کے برابر سلے ہوئے کپڑے (دستانوں) سے ڈھانپنا منع ہے۔ ایسے ہی چہرہ ہے کہ اس کا چہرے کے مطابق سِلے نقاب وغیرہ سے ڈھانپنا منع ہے اور نبیِ اکرم ﷺ کی طرف سے (منہ کے برابر سلے) نقاب کے ممنوع ہونے کے سوا احرام کی حالت میں چہرہ ننگا رکھنے کے وجوب پر دلالت کرنے والا کوئی ایک حرف بھی صادر نہیں ہوا ہے اور نقاب کی ممانعت دستانوں کی ممانعت جیسی ہے اور چہرے کی نسبت نقاب ایسے ہی ہے، جیسے ہاتھوں کی نسبت دستانے ہیں۔ یہ بحمد اللہ واضح بات ہے۔

حضرت اسماء رضی اللہ عنہا سے مستدرک حاکم (۱/۴۵۴) میں ثابت ہے کہ وہ احرام کی حالت میں اپنا چہرہ ڈھانپ کر رکھا کرتی تھیں اور ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں:

> ''قافلے ہمارے پاس سے گزرتے، جبکہ ہم نبیِ اکرم ﷺ کے ہمراہ احرام کی حالت میں ہوتیں، جب وہ لوگ ہمارے پاس سے گزرنے لگتے تو ہم اپنے چہروں پر چادر ڈال لیتیں اور جب وہ آگے نکل جاتے تو پھر ہم چہرے ننگے کر لیتیں۔''[1]

اسی اقتباس کے آخر میں یہ الفاظ بھی ہیں کہ احرام کی حالت میں غیر مردوں کی موجودگی میں جو چہرے کا پردہ کرنا ہے تو اس میں یہ شرط لگانا کہ وہ کپڑا بہرصورت چہرے سے الگ رہنا چاہیے، جیسا کہ قاضی ابو یعلی اور بعض دیگر فقہا نے ذکر کیا ہے، اس کی کوئی اصل نہیں اور نہ کوئی دلیل ہے، بلکہ وہ نظریہ ضعیف ہے۔

صاحب المغنی (امام ابن قدامہ) نے کہا ہے کہ یہ شرط میں نے نہ تو امام احمد کے کسی ارشاد میں پائی ہے اور نہ اس کے بارے میں کوئی حدیث ہے، بلکہ بظاہر اس کا برعکس ہی صحیح ہے، کیونکہ سر کے اوپر سے چہرے پر لٹکائے گئے کپڑے میں یہ ہرگز ممکن نہیں کہ وہ چہرے پر نہیں لگے گا اور اگر یہ

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (١٨٣٣) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٢٩٣٥) مسند أحمد (٦/ ٣٠)

شرط ہوتا تو حدیث میں بیان ہوتا۔

آگے چل کر امام ابن قیم رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ اگر کوئی یہ کہے کہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اُس حدیث کا تم کیا کرو گے، جس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

﴿إِحْرَامُ الرَّجُلِ فِي رَأْسِهِ، وَإِحْرَامُ الْمَرْأَةِ فِي وَجْهِهِ﴾

''مرد کا احرام سر میں ہے اور عورت کا احرام چہرے میں ہے۔''

اس حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے عورت کے چہرے کو مرد کے سر کے قائم مقام قرار دیا ہے اور یہ حدیث عورت کے چہرے کو حالتِ احرام میں ننگا رکھنے کے وجوب کی دلیل ہے۔

(اُس معترض کو ہم یہ کہیں گے کہ) اس حدیث کے بارے میں کہا گیا ہے کہ اس کی کوئی اصل ہی نہیں، قابلِ اعتماد کتبِ حدیث کے مؤلفین میں سے اس کی روایت کسی نے بھی نہیں کی اور نہ اس کی سند کا کوئی پتا ہے اور نہ یہ قابلِ حجت ہے۔ ایسی لا اصل حدیث کے مقابلے میں اس صحیح کو کیسے چھوڑا جا سکتا ہے جو اس بات کی دلیل ہے کہ عورت کا چہرہ (بحالتِ احرام) مرد کے بدن کی طرح ہے اور اس حالت میں اس کے لیے ایسے کپڑے سے منہ ڈھانپنا منع ہے، جو چہرے کے سائز کے مطابق تیار کیا گیا، جیسے عربی نقاب یا عربی برقع وغیرہ ہیں، چہرے کو مطلق ڈھانپنا منع نہیں، جیسا کہ ہاتھوں کا بھی حکم ہے۔[1] واللہ اعلم

نقاب و برقع کے ساتھ عربی لفظ کا ہم اس لیے ذکر کر رہے ہیں کہ ہمارے یہاں اردو میں ان دونوں الفاظ کے مدلول میں اور عربی الفاظ کے مدلول میں کافی فرق ہے، لہٰذا نقاب سے وہ نقاب مراد نہ لیا جائے، جو ہمارے یہاں خواتین کے برقع کا ایک جز ہوتا ہے اور نہ اس عربی برقع سے ہمارے یہاں کا مروج برقع مراد ہے۔ سرِ دست ہم ان الفاظ کی لغوی تشریح میں نہیں جانا چاہتے، کیونکہ اس کا اصل موقع ''مسائلِ حج'' ہے۔[2]

نقاب والی اس حدیث کے سلسلے میں علامہ ابن قیم رحمہ اللہ نے اپنی ایک دوسری کتاب ''إعلام الموقعين'' میں لکھا ہے:

---

[1] تهذيب السنن على العون (٥/ ٢٨٢، ٢٨٣)

[2] اس کے لیے ہماری کتاب ''سوئے حرم'' (ص: ۱۲۰، ۱۲۱) دیکھیں۔

”نبیِ اکرم ﷺ نے فرمایا کہ احرام کی حالت میں عورت نہ تو نقاب ڈالے اور نہ دستانے پہنے۔“

اس طرح نبیِ اکرم ﷺ نے اس کے چہرے اور ہاتھوں کو ان کے سائز کے مطابق تیار کیے گئے کپڑے کے استعمال کی ممانعت میں برابر قرار دے دیا، لیکن اسے چہرے کے ڈھانپنے (پردہ کرنے) سے قطعاً نہیں روکا، اور نہ اسے ننگا رکھنے کا حکم فرمایا ہے۔ نبیِ اکرم ﷺ کی ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن اس امت کی تمام عورتوں کی نسبت زیادہ اس مسئلے کو جاننے والی ہیں، وہ ان کے پاس مردوں کے قافلے گزرنے کے وقت اپنے چہروں پر کپڑا ڈال لیا کرتی تھیں اور جب وہ گزر جاتے تو چہرے ننگے کر لیتی تھیں۔

علامہ ابن قیم رحمہ اللہ نے اپنی دوسری کتاب ”بدائع الفوائد“ میں احرام کی حالت میں عورت کے اپنا چہرہ ننگا رکھنے سے متعلق ایک سوال اور اس پر ابن عقیل کا جواب ذکر کیا ہے اور پھر اس جواب پر تعاقب کرتے ہوئے لکھا ہے:

> اس سوال اور اس پر ایسے ہی جواب کا سبب دراصل یہ ہے کہ احرام کی حالت میں عورت کے بارے میں نبیِ اکرم ﷺ کی تعلیمات سے متعلق بعض امور ان لوگوں پر مخفی ہیں، جبکہ نبیِ اکرم ﷺ نے احرام کی حالت میں یا کسی دوسرے موقع کے لیے عورت کو اس بات کی اجازت نہیں دی کہ وہ چہرہ ننگا رکھے، بلکہ جو نص اس سلسلے میں وارد ہوئی ہے، وہ صرف اس بات کے ساتھ خاص ہے کہ عورت حالتِ احرام میں نقاب نہ ڈالے، اور ایسے ہی اس نص میں دستانے نہ پہننے کا حکم آیا ہے۔“ [1]

اندازہ فرمائیں کہ کتاب و سنت کی تعلیمات میں گہرا درک رکھنے والے، اجماعِ امت کے مواقع کو بخوبی جاننے والے اور علماے اصول کی تفریعات کے متبحر عالم علامہ ابن قیم رحمہ اللہ کے الفاظ ”لَمْ يُشْرَعْ لَهَا كَشْفُ الْوَجْهِ فِي الإِحْرَامِ وَلَا غَيْرِهٖ“ کتنے واضح ہیں کہ عورت کے لیے احرام کی حالت میں بھی چہرے کو ننگا رکھنا جائز نہیں کیا گیا، چہ جائیکہ کسی دوسرے موقع پر ہو؟

پانچویں حدیث:

احکامِ پردہ میں چہرے کے بھی شامل ہونے پر جس پانچویں حدیث سے استدلال کیا گیا ہے، وہ سنن ابو داود، ابن ماجہ، صحیح ابن خزیمہ، سنن دارقطنی اور مسند احمد میں ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا

[1] اللباب (ص: ۱۱۲)

سے مروی ہے، جس میں وہ بیان کرتی ہیں:

«كَانَ الرُّكْبَانُ يَمُرُّوْنَ بِنَا وَ نَحْنُ مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ مُحْرِمَاتٌ فَإِذَا حَاذَوْنَا سَدَلَتْ إِحْدَانَا جِلْبَابَهَا مِنْ رَأْسِهَا عَلٰى وَجْهِهَا فَإِذَا جَاوَزُوْنَا كَشَفْنَاهُ»[1]

''مردوں کے قافلے ہمارے پاس سے گزرتے تھے، جبکہ ہم نبیِ اکرم ﷺ کی معیت میں احرام باندھے ہوئے تھیں، جب وہ ہمارے برابر آتے تو ہم اپنے سروں پر سے اوڑھنیاں اپنے چہروں پر گرا لیتیں اور جب وہ گزر جاتے تو ہم پھر چہروں کو کھول لیتیں۔''

اس حدیث پر امام ابو داود کی تبویب ہے: ''بَابٌ فِي الْمُحْرِمَةِ تُغَطِّي وَجْهَهَا'' اور امام ابن ماجہ کی تبویب ہے: ''بَابُ الْمُحْرِمَةِ تَسْدُلُ الثَّوْبَ عَلٰى وَجْهِهَا''[2]

ان دونوں کبار ائمہ رحمہما اللہ کی تبویب سے معلوم ہو رہا ہے کہ یہ حکم صرف نبیِ اکرم ﷺ کی ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن کے ساتھ خاص نہیں، بلکہ تمام مسلمان عورتوں کے لیے عام ہے۔

چھٹی حدیث:

وجوبِ حجاب کے حکم میں چہرہ بھی شامل ہونے پر دلالت کرنے والی حدیثِ ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے ہم معنیٰ ایک دوسری حدیث ام المومنین حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے سنن دارقطنی میں مروی ہے، جس میں وہ بیان کرتی ہیں:

«كُنَّا نَكُوْنُ مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ وَنَحْنُ مُحْرِمَاتٌ فَيَمُرُّ بِنَا الرَّاكِبُ فَتَسْدُلُ الْمَرْأَةُ الثَّوْبَ مِنْ فَوْقِ رَأْسِهَا عَلٰى وَجْهِهَا»[3]

''ہم نبیِ اکرم ﷺ کی معیت میں احرام میں ہوتیں اور ہمارے پاس سے کوئی سوار مرد گزرتا تو ہم عورتیں اپنے سروں سے اپنے چہروں پر کپڑا گرا لیتیں۔''

---

[1] بدائع الفوائد (٢/ ٣/ ١٤٢، طبع دارالكتاب العربي بيروت)

[2] سنن أبي داود مع العون (٥/ ٢٨٦) وتكلم عليه في العون، ولم يورده الألباني في صحيح أبي داود ولا في صحيح ابن ماجه، وقال الألباني في تحقيق مشكاة المصابيح (٢/ ٨٢٣) سنده جيد، وفي الحجاب: وسنده حسن في الشواهد (ص: ٥٠) وضعفه ابن حجر في الفتح (٣/ ٤٠٦) واللباب (ص: ١١٥) سنن الدارقطني (١/ ٢/ ٢٩٤) ضعيف سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٦٣٧) و مسند أحمد (٦/ ٣٠) تفصیل کے لیے ہماری کتاب ''سوئے حرم'' (ص: ٩٧) تخریج نمبر (٧٠) دیکھیں۔

[3] سنن الدارقطني (١/ ٢/ ٢٩٥)

ان دونوں احادیث کی تائید ان تین آثار سے بھی ہوتی ہے جو حضرت ابن عباس، عائشہ اور اسماء رضی اللہ عنہم سے مروی ہیں، جن میں سے بعض آگے چل کر اور بعض کو ہم اس موضوع سے متعلق آثارِ صحابہ کے ضمن میں ذکر کریں گے۔ ان شاء اللہ

ساتویں حدیث:

اس موضوع پر اس حدیث سے بھی استدلال کیا جاتا ہے، جو صحیح بخاری و مسلم، مسند احمد اور کتبِ سنن اربعہ، بیہقی اور دارمی میں حضرت ام عطیہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے، وہ بیان کرتی ہیں کہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں حکم فرمایا:

''ہم نوجوان لڑکیوں، حائضہ عورتوں اور پردہ دار خواتین سب کو نمازِ عید الفطر و عید الاضحیٰ کے لیے عید گاہ کی طرف لے چلیں، حائضہ عورتیں نماز سے الگ رہیں، البتہ خیر اور مسلمانوں کی اجتماعی دعا میں شریک ہو جائیں۔''

آگے ام عطیہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میں نے نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کی:

''يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ إِحْدَانَا لَا يَكُوْنُ لَهَا جِلْبَابٌ؟''

''ہم میں سے جس کے پاس بڑی چادر نہ ہو (وہ کیا کرے؟)''

تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«لِتُلْبِسْهَا أُخْتُهَا مِنْ جِلْبَابِهَا»[1]

''اس کی کوئی بہن اسے اپنی چادر اوڑھا دے۔''

سورۃ الاحزاب کی آیت (۵۹) کی تفسیر کے ضمن میں جلباب (بڑی چادر) کی تفسیر ذکر کی جا چکی ہے کہ اس سے مراد وہ بڑی چادر یا کپڑا ہے، جس میں جسم کے ساتھ ساتھ سر اور چہرہ بھی ڈھک جائے۔ جلباب کی اس تفسیر یا شرح اور حضرت ام عطیہ رضی اللہ عنہا کے اس سوال سے یہ اندازہ ہوجاتا ہے کہ صحابیات رضی اللہ عنہن ننگے سر منہ باہر نہیں نکلا کرتی تھیں اور اگر ننگے منہ نکلنا معروف ہوتا تو پھر اس سوال کا کوئی معنیٰ ہی نہ رہتا۔

---

[1] الفتح الرباني (٦/ ١٢٥، ١٢٦) صحيح البخاري مع الفتح، رقم الحديث (٣٥١) مختصر صحيح مسلم للمنذري (٤٣١) صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (١٠٠٦) صحيح سنن الترمذي، رقم الحديث (٤٤٥) صحيح سنن النسائي، رقم الحديث (١٤٦٧، ١٤٦٨) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٣٠٧)

آٹھویں حدیث:

وجوبِ حجاب کے حکم میں چہرے کو شامل ماننے والوں کی آٹھویں دلیل وہ حدیث ہے جو سنن ترمذی، صحیح ابن خزیمہ و ابن حبان، مسند بزار، معجم طبرانی کبیر اور الکامل لابن عدی میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، جس میں ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے:

﴿اَلْمَرْأَةُ عَوْرَةٌ﴾[1] ''عورت کا سارا بدن ہی مقامِ ستر ہے۔''

اس حدیث کے الفاظ شاہد ہیں کہ عورت کا سارا بدن ہی ستر ہے، تو کیا چہرہ بدن سے بھلا الگ ہوتا ہے؟

نویں حدیث:

ایسے ہی سنن ابن ماجہ، صحیح ابن حبان، مسند احمد، سنن بیہقی، مسند طیالسی، طحاوی، سنن سعید بن منصور اور مستدرک حاکم میں حضرت محمد بن مسلمہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے ایک عورت کے لیے پیغامِ نکاح دیا اور چوری چھپے اسے دیکھنے کی کوشش کرنے لگا، حتیٰ کہ ان کے کھجوروں کے باغ میں مَیں نے اسے دیکھ لیا، ان سے کہا گیا کہ تم نے یہ کام کیا، حالانکہ تم نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی ہو؟ تو انھوں نے وضاحت کر دی کہ میں نے نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے:

''جب اللہ کسی کے دل میں یہ ڈال دے کہ فلاں عورت کے لیے پیغامِ نکاح دے تو اس میں کوئی حرج نہیں کہ وہ اسے ایک نظر دیکھ لے۔''[2]

دسویں حدیث:

سنن ابو داود، مسند احمد و شافعی، معانی الآثار طحاوی، مسند بزار، مصنف عبدالرزاق اور مستدرک حاکم میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

---

[1] صحيح الجامع (٣/ ٦/ ١٤) الإرواء (١/ ٣٠٣) و مشكاة المصابيح (٢/ ٩٣٣) و صححه، صحيح سنن الترمذي، رقم الحديث (٩٣٦) صحيح ابن خزيمة باب اختيار صلاة المرأة في بيتها، رقم الحديث (١٦٨٥) موارد الظمآن، رقم الحديث (٣٢٩)

[2] السلسلة الصحيحة (١/ ١٥٣) و فتح الباري (٩/ ١٨١) و المنتقىٰ مع النيل (٣/ ٦/ ١١٠) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٨٦٤) موارد الظمآن، رقم الحديث (١٢٣٥)

''جب تم میں سے کوئی شخص کسی عورت کے لیے پیغامِ نکاح دے تو جہاں تک ممکن ہو کوشش کر کے اسے ایک نظر دیکھ لے۔''

حضرت جابر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے ایک لڑکی کے لیے پیغام دیا:

''فَكُنْتُ أَتَخَبَّأُ لَهَا'' ''میں اسے چھپ چھپ کر دیکھنے کی کوشش میں رہا۔''

حتیٰ کہ میں نے اسے دیکھ لیا اور پھر میں نے اس سے شادی کر لی۔''[1]

گیارھویں حدیث:

ایسی ہی ایک اور حدیث سنن ابو داود کے سوا سنن اربعہ، صحیح ابن حبان، سنن دارمی، دارقطنی، بیہقی، طحاوی، مسند ابی یعلی، سنن سعید، مستدرک حاکم، منتقی ابن جارود، تاریخ دمشق ابن عساکر اور المختارۃ للضیاء میں حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، جس میں وہ اپنا ایک واقعہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے ایک عورت سے شادی کا ارادہ کیا اور نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کے بارے میں بات کی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ''جاؤ جا کر اسے ایک نظر دیکھ لو، یہ تمھاری شادی کے دیر پا ہونے کا باعث ہوگا۔'' میں گیا اور اس کے والدین کو نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد سنایا مگر انھیں شاید یہ بات اچھی نہ لگی (کہ میں لڑکی کو دیکھوں) البتہ لڑکی نے بات سن لی اور پردے کی اوٹ سے کہنے لگی کہ اگر واقعی تمھیں نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات کی اجازت دی ہے تو تم مجھے دیکھ لو، ورنہ یہ بات کوئی معمولی بات نہیں، میں نے اسے دیکھا اور اس سے شادی کر لی، میں نے ستّر یا ستّر سے کچھ زیادہ عورتوں سے شادی کی مگر وہ عورت میرے دل میں سب سے زیادہ معزز ہوگئی۔''[1]

ان تینوں احادیث پر غور کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں چہرے کا پردہ معروف تھا، یہی وجہ ہے کہ پہلے دو صحابیوں کو چھپ کر دیکھنا پڑا اور ایک پر نکیر کی گئی، جس کا ازالہ انھوں نے ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سنا کر کیا، اور تیسرے واقعے میں والدین کا انکار یا بُرا منانا اور تعمیلِ ارشاد کے پیشِ نظر لڑکی کا رخِ زیبا سے پردہ ہٹانا؛ یہ سب امور اس بات کی دلالت کے لیے کافی ہیں کہ اس عہدِ زریں

---

[1] السلسلة الصحيحة (١/ ١٥٥) المنتقىٰ مع النيل (٣/ ٦/ ١١٠) صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (١٨٣٢، ١٨٣٤)

[2] السلسلة الصحيحة (١/ ١٥٠، ١٥٢) و فتح الباري أيضاً، سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٨٦٦) سنن الدارمي (٢/ ١٣٤) صحيح سنن الترمذي، رقم الحديث (٨٦٨) صحيح سنن النسائي، رقم الحديث (٣٠٣٤) موارد الظمآن، رقم الحديث (١٢٣٦)

کے لوگ پردے کے کتنے پابند تھے اور حضرت مغیرہ رضی اللہ عنہ والی حدیث کا مفہوم مخالف یہ بنتا ہے کہ جو پیغامِ نکاح نہ دینے والا ہو، اس کے لیے جائز نہیں کہ وہ عورت کو دیکھے اور یہ اسی وقت ممکن ہے، جب چہرے کا پردہ ہو، اگر وہ ننگے منہ ہو تو پھر اس حدیث کا کوئی معنیٰ ہی نہیں بنتا اور پیغامِ نکاح دینے والوں کے لیے اس لڑکی یا عورت کو دیکھنے کے سلسلے میں نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اجازت اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ دوسرے عام آدمی کے لیے اُسے دیکھنا حرام ہے۔ اگر امام طبری وغیرہ اہل علم کے بقول چہرہ مقامِ ستر نہیں تو پھر ان احادیث کا، اور اجازت کا کوئی مفہوم نہیں بنتا۔

بارھویں حدیث:

چہرے کے پردے کے وجوب پر دلالت کرنے والی احادیث میں سے ایک معجم طبرانی، طبقات ابن سعد اور مستدرک حاکم میں مروی ہے، جس میں قیس بن زید بیان کرتے ہیں کہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ام المومنین حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کو ایک طلاق دے دی تو ان کے دو خالو حضرت عثمان بن مظعون اور حضرت قدامہ بن مظعون رضی اللہ عنہما ان کے پاس آئے اور طلاق کے بارے میں ان سے دریافت کیا تو حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا نے انھیں بتایا:

"وَاللّٰهِ مَا طَلَّقَنِي عَنْ شَبَعٍ فَجَاءَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ فَدَخَلَ فَتَجَلَّبْتُ"

"اللہ کی قسم! ایسا تو نہیں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے جی بھر جانے کی وجہ سے طلاق دی ہو (بلکہ کوئی اور وجہ ہے) آپ صلی اللہ علیہ وسلم جب لوٹ کر میرے پاس آئے تو میں نے بڑی چادر اوڑھ کر پردہ کرلیا۔"

تب نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میرے پاس جبرائیل علیہ السلام آئے ہیں اور انھوں نے کہا ہے:

«رَاجِعْ حَفْصَةَ فَإِنَّهَا صَوَّامَةٌ قَوَّامَةٌ، وَإِنَّهَا زَوْجَتُكَ فِي الْجَنَّةِ»[1]

"حفصہ رضی اللہ عنہا کی طرف رجوع کر لیں (یعنی انھیں دوبارہ اپنے نکاح میں لوٹا لیں) وہ تو بڑی نفلی روزے رکھنے اور راتوں کا قیام کرنے والی خاتون ہیں اور وہ جنت میں بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیوی ہوں گی۔"

علامہ ہیثمی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس حدیث کے تمام راوی صحیح کے راوی ہیں، البتہ شیخ تویجری

---

[1] بلوغ الأماني (٢٢/ ١٣١) اللباب (ص: ١٣٤) والحجاب للألباني (ص: ٤٠) وقواه بالشاهد عن أنس رضي الله عنه.

نے کہا ہے کہ صحیح یہ ہے کہ یہ حدیث مرسل ہے، جبکہ اس کی شاہد مستدرک حاکم میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔

ایسے ہی یہ حدیث معجم طبرانی اوسط میں بھی مروی ہے اور اس کی سند میں بعض راوی ایسے ہیں، جن کے بارے میں ہیثمی رحمہ اللہ نے عدمِ معرفت کا اقرار کیا ہے۔ لیکن یاد رہے کہ یہ دوسری حدیث معرضِ استدلال نہیں بلکہ محض شاہد ہے۔

بہر حال حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کا طلاق کے بعد نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ان کے پاس آنے پر چادر اوڑھ کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے پردہ کر لینا اس بات کا ثبوت ہے کہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہدِ مسعود میں پردہ رائج تھا اور انھوں نے جلباب میں اپنا چہرہ چھپا کر انتہائی واضح انداز سے بتا دیا کہ چہرے کا پردہ واجب ہے۔ اگر چہرے کا پردہ ہی نہ ہوتا تو پھر حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کے اس فعل کا کوئی معنیٰ ہی نہ تھا، تب وہ اپنی حالت پر قائم رہتیں، خصوصاً جبکہ اندر آنے والا کوئی عام انسان نہیں تھا، بلکہ وہ تو محبوبِ الٰہی حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تھے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر تو ویسے بھی یہ حالت تو کیا عام حالات میں بھی غیر محرم مومن عورت کو دیکھنا حرام نہیں تھا، جیسا کہ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے فتح الباری میں اپنی تحقیق کا نچوڑ ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

”وَالَّذِيْ تَحَرَّرَ عِنْدَنَا أَنَّهُ ﷺ كَانَ لَا يَحْرُمُ عَلَيْهِ النَّظَرُ إِلَى الْمُؤْمِنَاتِ الْأَجْنَبِيَّاتِ بِخِلَافِ غَيْرِهِ“[1]

”ہمارے نزدیک یہ بات طے ہے کہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر عام لوگوں (مردوں) کے برعکس، غیر محرم مومن عورتوں پر نظر ڈالنا حرام نہیں تھا۔“

اس کے باوجود حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کا یہ عمل وجوبِ حجابِ چہرہ کی واضح دلیل ہے اور جلباب اوڑھ کر ان کے پردہ کر لینے کے ساتھ چہرہ چھپا لینے کا تذکرہ جلباب کے لغوی معنیٰ کی بنیاد پر ہی کیا جا رہا ہے، جیسا کہ تفصیل ذکر کی جا چکی ہے۔

تیرھویں حدیث:

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہدِ مبارک میں عورتوں کے چہرے کو ڈھانپنے اور حجاب کے صحابیات رضی اللہ عنہن میں عام ہونے کا پتا اس حدیث سے بھی چلتا ہے، جو طبقات ابن سعد میں حبیب بن ابی ثابت کے طریق سے

---

[1] فتح الباري (۹/ ۲۱۰، طبع دارالافتاء) بحواله اللباب (ص: ۱۲۵)

مروی ہے، جس میں حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں:

"لَمَّا انْقَضَتْ عِدَّتِي مِنْ أَبِي سَلَمَةَ أَتَانِي رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ فَكَلَّمَنِي بَيْنِي وَبَيْنَهُ حِجَابٌ فَخَطَبَ إِلَيَّ نَفْسِي... الخ"[1]

"جب میرے شوہر ابو سلمہ (رضی اللہ عنہ) سے میری عدت پوری ہوگئی تو آپ ﷺ میرے یہاں تشریف لائے اور آپ ﷺ نے مجھ سے بات کی، جبکہ میرے اور آپ ﷺ کے مابین حجاب (پردہ) تھا، آپ ﷺ نے مجھے پیغامِ نکاح دیا۔"

اس حدیث کی دلالت بھی واضح ہے۔

چودھویں حدیث:

اس عہدِ زریں میں پردے کے عام مروج ہونے کا پتا وہ حدیث بھی دیتی ہے جو سنن ابو داود، نسائی، صحیح ابن حبان، مستدرک حاکم اور مسند احمد میں حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، جس میں وہ بیان کرتے ہیں کہ ہم نبیِ اکرم ﷺ کی معیت میں ایک شخص کو دفن کر کے آئے اور واپسی پر جب آپ ﷺ کے دروازے کے پاس پہنچے تو (کیا دیکھتے ہیں):

"إِذْ هُوَ بِإِمْرَأَةٍ لَا نَظُنُّهُ عَرَفَهَا"

"ایک عورت جسے ہمارے خیال میں آپ ﷺ نے پہچانا نہیں، آپ ﷺ کے پاس کھڑی تھی۔"

لیکن پھر (جب کچھ پہچان ہوئی تو) آپ ﷺ نے فرمایا:

"اے فاطمہ! کہاں سے آئی ہو؟ تو حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: میں میت کے سوگواروں کے پاس سے آئی ہوں، وہاں میں نے میت کے حق میں دعاے مغفرت اور اس کے پسماندگان سے تعزیت کی ہے۔ آپ ﷺ نے پوچھا:

«فَلَعَلَّكِ بَلَغْتِ مَعَهُمُ الْكُدَى» "شاید تم ان کے ساتھ کُدیٰ قبرستان بھی گئی ہو۔"

تو انھوں نے عرض کی:

"مَعَاذَ اللّٰهِ، أَنْ أَبْلُغَ مَعَهُمُ الْكُدَي، وَقَدْ سَمِعْتُكَ تَذْكُرُ فِيهَا مَا تَذْكُرُ"[2]

---

[1] اللباب (ص: ١٢٤) والحجاب (ص: ٤٠)

[2] سنن أبي داود، رقم الحديث (٣١٢٣) ضعيف أبي داود، رقم الحديث (٦٨٤)

''میں اللہ سے پناہ مانگتی ہوں کہ میں ان کے ساتھ قبرستان جاتی، جبکہ میں وہ وعیدیں سن چکی ہوں، جو قبرستان جانے والی عورتوں کے لیے آپ ﷺ نے ارشاد فرمائی ہے۔''

تب آپ ﷺ نے فرمایا:

﴿لَوْ بَلَغْتِ مَعَهُمُ الْكُدٰى مَا رَأَيْتِ الْجَنَّةَ حَتّٰى يَرَاهَا جَدُّ أَبِيْكَ﴾[1]

''اگر تم ان کے ساتھ قبرستان تک جا نکلتی تو اس وقت تک جنت کو نہ دیکھ پاتی، جب تک تمھارے باپ کا دادا جنت نہ دیکھ لیتا۔''

اس حدیث میں مذکور واقعے سے معلوم ہوا کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا پردے میں چہرہ بھی چھپائے ہوئے تھیں، تبھی تو صحابی کا بیان ہے کہ ہمارے خیال میں نبیِ اکرم ﷺ نے انھیں پہلے پہچانا نہیں تھا، اگر ان کا چہرہ ننگا ہوتا تو پھر اس کا کوئی مطلب ہی نہیں بنتا کہ آپ ﷺ نے انھیں اولاً پہچانا نہیں تھا اور پھر ان کے اس حجاب پر نبیِ اکرم ﷺ نے کوئی نکیر بھی نہیں کی، جو ان کے لیے اس کی مشروعیت کی دلیل ہے۔ اگر چہرے کا پردہ اہل بیت اطہار کی خواتین کے ساتھ ہی خاص ہوتا اور دوسری عورتیں ایسا پردہ نہ کرتی ہوتیں تو پھر حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو آپ ﷺ فوراً پہچان لیتے، کیونکہ چہرے کا حجاب ان کے ساتھ خاص ہوتا۔ دوسری خواتین ننگے منہ ہوتیں۔ اس سب کے برعکس پتا یہ چلتا ہے کہ حضرت فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا سمیت تمام عورتیں چہرے کا بھی پردہ کیا کرتی تھیں۔

پندرھویں حدیث:

سابق میں ہم چودہ احادیث آپ کے گوش گزار کر چکے ہیں، جن سے عورتوں کے لیے چہرے کے پردے کے وجوب پر استدلال کیا گیا ہے، جبکہ اسی سلسلے کی بعض دیگر احادیث بھی ہیں، لیکن ہم ان میں سے صرف ایک اور حدیث آپ کے سامنے رکھنا چاہتے ہیں اور وہ پندرھویں حدیث صحیح بخاری ومسلم، مسند احمد، سنن بیہقی اور طبقات ابن سعد (واللفظ لہ: ۸/ ۸۶، ۸۷) میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، جس میں غزوۂ خیبر کا قصہ اور حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا کے قیدی ہونے اور نبیِ اکرم ﷺ کے انھیں اپنے لیے اختیار کرنے کا واقعہ مذکور ہے، اس میں وہ بیان کرتے ہیں کہ نبیِ اکرم ﷺ خیبر سے نکلے، لیکن آپ ﷺ نے حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ خلوت نہیں فرمائی تھی اور جب نبیِ اکرم ﷺ کے پاس

---

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (٣١٢٣) ضعيف سنن النسائي، رقم الحديث (١١٣)

سواری کا اونٹ کیا گیا تو آپ ﷺ نے اپنی ٹانگ آگے اس انداز سے بڑھائی کہ حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا آپ ﷺ کی ران پر اپنا پاؤں رکھ کر اونٹ پر بیٹھ جائیں، لیکن انھوں نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا، البتہ اپنا گھٹنا آپ ﷺ کی ران پر رکھ کر اونٹ پر بیٹھیں۔

آگے فرماتے ہیں:

«سَتَرَهَا رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ وَحَمَلَهَا وَرَآءَهٗ وَجَعَلَ رِدَآءَهٗ عَلٰى ظَهْرِهَا وَوَجْهِهَا»

''آپ ﷺ نے انھیں ستر میں کر لیا اور اپنے پیچھے بیٹھا لیا اور آپ ﷺ نے اپنی چادر ان کی کمر اور چہرے پر ڈال لی۔''

آگے مذکور ہے:

''آپ ﷺ نے انھیں اپنی ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن میں سے بنا لیا۔''

یہ آپ ﷺ کا اسوۂ حسنہ ہے کہ آپ ﷺ نے چہرے سمیت حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا کو پردے میں کر لیا۔[1]

یہ سب احادیث ایسی ہیں، جن سے استدلال کرتے ہوئے جمہور اہلِ علم نے چہرے کے پردے کو واجب قرار دیا ہے اور اس حکم کو امتِ اسلامیہ کی تمام عورتوں کے لیے عام شمار کیا ہے۔

رہا معاملہ امہات المومنین رضی اللہ عنہن کے چہرے کے حجاب کے واقعات کا تو وہ خود مانعین میں سے بعض افاضل نے بھی نقل کیے ہیں اور تسلیم کیا ہے کہ وہ چہرے کا پردہ کیا کرتی تھیں اور عام مسلمان عورتوں کے لیے بھی اس کی مشروعیت کو مانا ہے، البتہ وجوب کا انکار کیا ہے۔[2]

آثارِ صحابہ رضی اللہ عنہم

جس طرح ہماری ذکر کردہ پندرہ احادیث سے چہرے کے پردے کے وجوب پر استدلال کیا گیا ہے، ایسے ہی صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم سے مروی کتنے ہی ایسے آثار بھی ہیں جو انہی احادیث کے موافق ہیں۔

پہلا اثر:

ایک اثر صحیح بخاری و مسلم، سنن بیہقی، مسند احمد، طبقات ابن سعد اور تفسیر ابن جریر طبری میں

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٢١١، ٤٢١٣) صحيح مسلم مع شرح النووي (٥/ ١٠/ ٢٢٤ تا ٢٢٦)

[2] حجاب الألباني (ص: ٤٧۔ ٥٣) بعنوان مشروعية ستر الوجه.

ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے، جس میں وہ بیان کرتی ہیں کہ ام المومنین حضرت سودہ رضی اللہ عنہا حکمِ حجاب کے نازل ہوجانے کے بعد کسی کام کے لیے گھر سے نکلیں، جبکہ وہ موٹے جسم والی تھیں اور جو انھیں جانتا ہو، وہ اس پر مخفی نہیں رہتی تھیں تو انھیں حضرت عمرِ فاروق رضی اللہ عنہ نے دیکھا اور کہا:

''اے سودہ رضی اللہ عنہا! اللہ کی قسم، آپ ہم پر مخفی نہیں رہتیں، لہٰذا اس کی فکر کرو کہ تم گھر سے کیسے نکلو؟ وہ فرماتی ہیں کہ وہ اس وقت گھر کو لوٹ گئیں، جبکہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم میرے گھر میں تشریف فرما تھے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ میں گوشت کی نیک پچی ہڈی تھی، انھوں نے عرض کی کہ اے اللہ کے رسول! میں کسی غرض سے نکلی تھی اور مجھے عمر نے یہ کہا۔ وہ بیان کرتی ہیں کہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر نزولِ وحی کی کیفیت طاری ہوگئی اور جب یہ کیفیت رفع ہوگئی تو وہ نیم پچی ہوئی ہڈی ابھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دستِ مبارک ہی میں تھی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

﴿ إِنَّهُ أُذِنَ لَكُنَّ أَنْ تَخْرُجْنَ لِحَاجَتِكُنَّ ﴾[1]

''تم عورتوں کو اجازت دی گئی ہے کہ تم ضرورت کی بنا پر گھروں سے نکل سکتی ہو۔''

اس حدیث پر تبصرہ کرتے ہوئے خود مانعین میں سے شیخ البانی نے ''حجاب المرأة المسلمة'' میں لکھا ہے کہ اس میں یہ دلیل ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت سودہ رضی اللہ عنہا کو ان کی جسامت سے پہچانا تھا، جو اس بات کی دلیل ہے کہ وہ چہرے کو ڈھانپے ہوئے تھیں۔ ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے ذکر کیا ہے کہ وہ بڑے ڈیل ڈول اور جسامت سے پہچانی جاتی تھیں۔

یہ واقعہ تو آثار کے بجائے احادیث میں شمار کیا جانا چاہیے، خصوصاً جبکہ اس کے آخر میں ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ بھی منقول ہیں۔

دوسرا اثر:

اثر صحیح بخاری و مسلم، مسند احمد اور تفسیر ابن جریر طبری میں ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے، جس میں وہ واقعہ افک بیان کرتی ہیں اور اسی کے ضمن میں ان کا ارشاد ہے کہ میں اپنی جگہ پر بیٹھی تھی کہ غلبۂ نیند سے میری آنکھ لگ گئی اور میں سوگئی۔ حضرت صفوان بن معطل سلمی ذکوانی فوج کے پیچھے (گری پڑی اشیا اٹھانے کے لیے) رہ گئے تھے۔ صبح کے وقت وہ وہاں پہنچے جہاں میں تھی،

[1] صحيح البخاري مع الفتح، رقم الحديث (٥٢٣٧) مختصر صحيح مسلم للمنذري، رقم الحديث (١٤٣٥)

انھوں نے ایک سوئے ہوئے انسان کو پایا تو میرے پاس آئے:

''فَعَرَفَنِيْ حِيْنَ رَآنِي وَكَانَ يَرَانِيْ قَبْلَ الْحِجَابِ فَاسْتَيْقَظْتُ بِاسْتِرْجَاعِهِ حِيْنَ عَرَفَنِيْ فَخَمَّرْتُ وَجْهِيْ بِجِلْبَابِيْ'' [1]

''انھوں نے مجھے دیکھتے ہی پہچان لیا، کیونکہ وہ نزولِ حجاب سے پہلے مجھے دیکھتے تھے، جب انھوں نے مجھے پہچان کر ''إِنَّا لِلّٰهِ وَ إِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُوْن'' پڑھا تو میں ان کی آواز سن کر جاگ اُٹھی، تب میں نے اپنے کپڑے سے اپنے چہرے کو پردے میں کرلیا۔''

یہ واقعہ بھی چہرے کے مقامِ ستر ہونے کی دلیل ہے۔

تیسرا اثر:

سنن کبریٰ بیہقی میں حسن سند کے ساتھ عیینہ بن عبدالرحمٰن اپنے والد ماجد کے حوالے سے بیان کرتے ہیں کہ ایک عورت حضرت سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ کے پاس آئی، اس نے اپنے شوہر کی شکایت کی کہ وہ اس تک نہیں پہنچتا (جماع نہیں کرتا) انھوں نے اس کے شوہر سے پوچھا تو اس نے اس الزام کی تردید کر دی، تب حضرت سمرہ رضی اللہ عنہ نے اس معاملے کے بارے میں حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی طرف لکھا کہ اس شخص کو بیت المال کے خرچ سے کسی ایسی عورت سے بیاہ دیں جو حسن و جمال کے ساتھ ساتھ نیک و دیندار بھی ہو تو انھوں نے ایسا ہی کیا، اس واقعہ میں یہ الفاظ بھی وارد ہوئے ہیں:

''وَجَاءَتِ الْمَرْأَةُ مُتَقَنِّعَةً'' [2] ''وہ عورت چہرے کا پردہ کیے ہوئے آئی۔''

یہ واقعہ بھی اس بات کی دلیل ہے کہ صحابیات رضی اللہ عنہن میں چہرے کا پردہ معروف تھا۔

چوتھا اثر:

تفسیر ابن ابی حاتم کے حوالے سے امام ابن کثیر رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر میں نقل کیا ہے، جس میں سورت احزاب کی آیت ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَدْخُلُوْا بُيُوْتَ النَّبِيِّ اِلَّآ اَنْ يُّؤْذَنَ لَكُمْ اِلٰى طَعَامٍ غَيْرَ نٰظِرِيْنَ اِنٰىهُ ...﴾ کے نزول کا پس منظر بیان کیا گیا ہے، اس میں وارد ہوا ہے کہ کچھ صحابہ رضی اللہ عنہم نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر بیٹھے بات چیت میں مصروف ہو گئے:

---

[1] صحيح البخاري مع الفتح (٨/ ٤٥٢) مختصر صحيح مسلم للمنذري، رقم الحديث (٢١٥٣)

[2] سنن البيهقي (٧/ ٢٢٨) وسنده حسن كما في الحجاب للألباني (ص: ٥٢)

”وَزَوْجُ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ (وَهِيَ زَيْنَبُ بِنْتُ جَحْشٍ رضي الله عنها) اَلَّتِيْ دَخَلَ بِهَا مَعَهُمْ مُوَلِّيَةً وَجْهَهَا إِلَى الْحَائِطِ“[1]

”آپ ﷺ کی زوجۂ محترمہ (جو حضرت زینب بن جحش رضی اللہ عنہا) تھیں، جن کے پاس آپ ﷺ ان صحابہ رضی اللہ عنہم کے ہمراہ گئے تھے، وہ دیوار کی طرف منہ کیے بیٹھی رہیں۔“

اس واقعے میں ام المومنین حضرت زینب رضی اللہ عنہا کا دیوار کی طرف منہ کیے بیٹھے رہنا چہرے کے پردے کا پتا دیتا ہے، اگرچہ وہ ان صحابہ رضی اللہ عنہم کی محرم اور ماں بن گئی تھیں، اس کے باوجود ان کا یہ مشقت بھرا عمل چہرے کے وجوبِ حجاب کا پتا دیتا ہے۔

پانچواں اثر:

مستدرک حاکم میں حضرت اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہا سے مروی ہے، جس میں وہ حالتِ احرام میں چہرے کے پردے کے سلسلے میں فرماتی ہیں:

”كُنَّا نُغَطِّيْ وُجُوْهَنَا مِنَ الرِّجَالِ“[2] ”ہم مردوں سے اپنے چہرے چھپاتی تھیں“

چھٹا اثر:

اسی مفہوم کا ایک چھٹا اثر حضرت اسماء رضی اللہ عنہا کی بڑی بہن اور ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے سنن سعید بن منصور میں مروی ہے، جس میں وہ بیان کرتی ہیں:

”تَسْدُلُ الْمَرْأَةُ جِلْبَابَهَا مِنْ فَوْقِ رَأْسِهَا عَلٰى وَجْهِهَا“[3]

”عورت اپنی چادر کو سر سے سرکا کر اپنے چہرے پر گرا لے۔“

ایک دوسری سند سے حضرت معاذہ عدویہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ میں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا:

”مَا تَلْبَسُ الْمُحْرِمَةُ؟“ ”احرام کی حالت میں عورت کیا پہنے؟“

---

[1] تفسير ابن كثير (٣/ ٥٠٤) آخری لفظ صحيح مسلم مع شرح النووي (٥/ ٩/ ٢٣٢) میں حدیثِ انس میں بھی دیکھے جا سکتے ہیں۔

[2] بحواله اللباب (ص: ١٣٣) و حجاب الألباني (ص: ٥٠)

[3] اللباب (ص: ١٣٢) فتح الباري (٣/ ٤٠٦)

تو انھوں نے جواب دیا:

''لَا تَنْتَقِبُ، وَلَا تَتَلَثَّمُ وَتَسْدُلُ الثَّوْبَ عَلٰی وَجْهِهَا''

''وہ نقاب باندھے نہ ڈھاٹا اوراپنے چہرے پر (پردے کے لیے) کپڑا لٹکائے۔''

احرام کی حالت میں چہرے کو ڈھانپنے کی ممانعت کرنے والوں کی تردید کرتے ہوئے علامہ ابن قیم رحمہ اللہ نے ''بدائع الفوائد'' میں جو کچھ کہا، وہ ہم آپ کے گوش گزار کر چکے ہیں، لہٰذا اُسے دہرانے کی ضرورت نہیں۔[1]

البتہ وہاں انھوں نے مزید یہ بھی لکھا ہے:

''بعض فقہا نے جو کہا ہے کہ پردے کا کپڑا احرام کی حالت میں عورت کے چہرے پر نہ لگنے پائے، ان کی یہ بات صحیح نہیں ہے، کیونکہ صحابیات یا امہات المومنین رضی اللہ عنہن میں سے کسی سے یہ ثابت نہیں کہ وہ چہرے پر کپڑے کے نیچے کوئی لکڑی وغیرہ رکھتی ہوں اور یہ ناممکن ہے کہ ایسا کرنا احرام کا شعار ہو اور معروف نہ ہو اور اسے ہر خاص و عام جانتا نہ ہو۔''[2]

گویا اگر پردے کا کپڑا حالتِ احرام میں چہرے پر لگتا رہے، تب بھی اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔

ساتواں اثر:

مسائل ابی داود میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ایک ساتواں اثر بھی ہے، جس میں وہ فرماتے ہیں:

''تُدْنِي الْجِلْبَابُ إِلٰی وَجْهِهَا، وَلَا تَضْرِبُ بِهٖ''

''عورت (حالتِ احرام میں) اپنی چادر کا پلو اپنے چہرے کی طرف لٹکا لے، لیکن چہرے پر باندھے نہیں۔''

سند کے ایک راوی رَوح کہتے ہیں کہ میں نے پوچھا کہ کس چیز سے نہ باندھے؟ تو انھوں نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے بتایا کہ جیسے عورت جلباب (بڑی چادر) اوڑھتی ہے اور پھر رخسار پر لگنے والے کپڑے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بتایا کہ عورت اس کپڑے کو موڑ کر اپنے چہرے پر

---

[1] نیل الأوطار (٢/ ٣/ ١٤٢)

[2] اللباب (ص: ١٤٣)

باندھ لیتی ہے، جیسا کہ وہ اس کے چہرے پر لٹکا ہوا ہے۔[1]

گویا احرام کی حالت میں چہرے پر کپڑا اس طرح باندھنا یا لپیٹنا منع ہے، **مطلق** سر سے لٹکا کر چہرے کا پردہ کرنا منع نہیں، بلکہ ثابت ہے، جیسا کہ سابق میں کئی احادیث و آثار گزرے ہیں، لہٰذا جب احرام کی حالت میں بھی چہرے کو کھلا چھوڑنے کی اجازت نہیں ہے تو عام حالات میں اس کا جواز کیونکر ہوسکتا ہے؟

بنت حضرت شعیب علیہ السلام اور تفسیرِ عمر فاروق رضی اللہ عنہ:

آثارِ صحابہ رضی اللہ عنہم کے آخر میں ایک اور بات بھی ذکر کرتے جائیں کہ یہ چہرے کا پردہ صرف امت اسلامیہ کی خواتین پر ہی نہیں بلکہ باعصمت و عفت خواتین کا عہدِ قدیم سے یہی دستور چلا آرہا ہے کہ وہ غیر مردوں کی موجودگی میں بے مہابا و بے حجاب نہیں نکلا کرتی تھیں، بلکہ عام پردے کے ساتھ ساتھ چہرے کے پردے کا بھی اہتمام کیا کرتی تھیں، جیسا کہ حضرت شعیب علیہ السلام کی اس بیٹی کے بارے میں ذکر ملتا ہے، جو ان کی بکریوں کو پانی پلانے کے نتیجے میں اپنے والدِ گرامی کے مشورے سے کنویں کے قریب ایک درخت کے سائے میں بیٹھے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ساتھ لے جانے آئی تھی، اس کے آنے کی کیفیت قرآنِ کریم نے سورۂ قصص کی میں یوں بیان فرمائی ہے:

﴿ فَجَآءَتْهُ اِحْدٰهُمَا تَمْشِيْ عَلَى اسْتِحْيَآءٍ﴾ [القصص: ٢٥]

''ان دونوں (لڑکیوں) میں سے ایک باحیا طریقے سے چلتی ہوئی آئی۔''

اس باحیا طریقے کی تفسیر مستدرک حاکم اور تفسیر ابن ابی حاتم میں حضرتِ فاروق رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

''جَآءَتْ تَمْشِيْ عَلَى اسْتِحْيَآءٍ قَائِلَةً بِثَوْبِهَا عَلٰى وَجْهِهَا لَيْسَتْ بِسَلْفَعٍ مِنَ النِّسَآءِ وَلَّاجَةٌ خَرَّاجَةٌ''[2]

''وہ باحیا طریقے سے چلتی ہوئی یوں آئی کہ اس نے اپنے چہرے کا اپنے کپڑے سے پردہ کیا ہوا تھا، وہ مردوں میں بے باکانہ چلنے والی اور بکثرت اندر باہر آنے جانے والی

---

[1] اللباب (ص: ١٣٣) وقال: التويجري: إسناده صحيح على شرط الشيخين.

[2] اللباب (ص: ١٣١)

عورتوں کی قبیل سے نہیں تھی۔‘‘

یہ ابن ابی حاتم کے الفاظ ہیں، جبکہ امام بغوی نے اپنی تفسیر میں یہ الفاظ نقل کیے ہیں:

”لَیسَتْ بِسَلْفَعٍ مِّنَ النِّسَاءِ خَرَّاجَةٌ وَلَّاجَةٌ، وَلٰکِنْ مُسْتَتِرَةٌ وَضَعَتْ کُمَّ دِرْعِهَا عَلٰی وَجْهِهَا اسْتِحْیَآءً“[1]

’’وہ غیر مردوں میں بے باکانہ چلنے والی اور بکثرت اندر باہر آنے جانے والی عورتوں کی قبیل سے نہیں تھی، بلکہ وہ باپردہ ہو کر آئی، اس نے حیا داری کی بنا پر اپنے چہرے پر اپنی درع (قمیص) کی آستین ڈالی ہوئی تھی۔‘‘

یہ عہدِ قدیم میں ایک پیغمبر زادی کے پردے کی ایک جھلک ہے، جو آج کی خواتین کے لیے بہترین نمونہ ہے۔

آثارِ تابعین رحمہم اللہ

پردے سے متعلق مسائل کے ضمن میں ہم قرآن وسنت اور آثارِ صحابہ رضی اللہ عنہم کی روشنی میں ذکر کر چکے ہیں کہ عورتوں کو گلی بازار جاتے وقت اور غیر مردوں کی موجودگی میں چہرے کا بھی پردہ کرنا چاہیے، جیسا کہ سلف صالحینِ امت کی عورتوں کے آثار، نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور بعض انبیاے سابقین کی بنات و زوجات کے واقعات سے پتا چلتا ہے۔ آثارِ صحابہ رضی اللہ عنہم کے ضمن ہی میں بعض دیگر واقعات بھی ہیں، جن سے ہم صرفِ نظر کر رہے ہیں، کیوں کہ جو آثار ہم نے ذکر کر دیے ہیں، انھیں میں برکت ہے اور شاید یہاں یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ اگر اس مسئلے کو اسی حد تک ہی رہنے دیا جائے تو بھی اس میں کفایت ہے، لیکن مناسب معلوم ہوتا ہے کہ موضوع سے متعلق آثار و اقوالِ تابعین رحمہم اللہ اور علماے مذہبِ اربعہ اور اہلِ حدیث علما کے چیدہ چیدہ اقوال بھی آپ لوگوں کے گوش گزار کر دیے جائیں، تاکہ مسئلہ مزید کھل کر سامنے آجائے، چنانچہ اس سلسلے میں آیئے پہلے تابعین کرام رحمہم اللہ کے آثار کا مطالعہ کریں۔ وہ پاکباز لوگ جنھیں صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم جیسے قدسی نفوس انسانوں سے صحبت و زیارت کا شرف حاصل ہوا ہے۔

(1) حفصہ بنت سیرین رحمہا اللہ کا اثر:

آیاتِ حجاب میں سے دوسری آیت کی تفسیر و توضیح میں بھی ذکر گزرا ہے کہ امام سعید بن منصور،

[1] اللباب (ص: ۱۳۱)

ابن المنذر اور بیہقی نے عاصم احول سے روایت بیان کی ہے کہ ہم (ایک فاضل عمر رسیدہ خاتون) حضرت حفصہ بنت سیرین رحمہا اللہ کے پاس جایا کرتے تھے، انھوں نے ایک جلباب (بڑی چادر) ایسی بنا رکھی تھی، جس سے وہ نقاب ڈالے رکھتی تھیں، ہم ان سے کہتے تھے کہ اللہ آپ پر رحم فرمائے! اللہ تعالیٰ کا رشاد ہے:

﴿وَالْقَوَاعِدُ مِنَ النِّسَآءِ الّٰتِیْ لاَ یَرْجُوْنَ نِکَاحًا فَلَیْسَ عَلَیْهِنَّ جُنَاحٌ اَنْ یَّضَعْنَ ثِیَابَهُنَّ غَیْرَ مُتَبَرِّجٰتٍ بِزِیْنَةٍ﴾ [النور: ٦٠]

''اور وہ عمر رسیدہ بوڑھی عورتیں جو نکاح کا کوئی ارادہ (داعیہ) نہیں رکھتیں، ان پر کوئی گناہ نہیں کہ وہ اپنی چادریں اتار لیں، اس شرط کے ساتھ کہ وہ زینت کی نمایش کرنے والی نہ ہوں۔''

جبکہ اس آیت میں کپڑوں سے مراد جلباب ہے تو وہ کہا کرتی تھیں:

''أَيُّ شَيْئٍ بَعْدُ؟'' (ان الفاظ کے بعد ارشادِ الٰہی کے کیا الفاظ ہیں؟)

ہم کہتے کہ آگے ہے:

﴿وَاَنْ یَّسْتَعْفِفْنَ خَیْرٌ لَّهُنَّ﴾ [النور: ٦٠]

''اگر وہ حیاداری اختیار کریں تو ان کے لیے یہی بہتر ہے۔''

تو وہ فرماتیں:

''هُوَ إِثْبَاتُ الْحِجَابِ''[1] (یہی الفاظ پردہ کرنے کو ثابت کرتے ہیں)

(2) عبیدہ سلمانی رحمہ اللہ کا اثر:

ایسے ہی آیاتِ حجاب میں سے چھٹی آیت کی تفسیر و توضیح کے ضمن میں ذکر کیا گیا تھا، جس میں امام ابن جریر طبری (۲۲/۳۳) عبد بن حمید، ابن المنذر اور ابن ابی حاتم کی روایت کے مطابق امام محمد بن سیرین بیان کرتے ہیں کہ میں نے ان سے اس ارشادِ الٰہی ﴿یُدْنِیْنَ عَلَیْهِنَّ مِنْ جَلَابِیْبِهِنَّ...﴾ کی تفسیر پوچھی تو انھوں نے وضاحت کا عملی طریقہ یہ اختیار کیا:

''فَغَطّٰی وَجْهَهٗ، وَرَأْسَهٗ وَأَبْرَزَ عَیْنَهُ الْیُسْرٰی''[2]

''انھوں نے اپنے چہرے اور سر کو ڈھانپ لیا اور صرف بائیں آنکھ ننگی رہنے دی۔''

---

(1) اللباب (ص: ١٠٥، ١٣٦) والحجاب للألباني (ص: ٥٢) وقال: هذا إسناد صحيح.

(2) تفسير ابن كثير (٣/ ٥١٨)

3 متعدد تابعین:

جلباب کی تفسیر دوسری آیتِ حجاب کے ضمن میں بھی گزر چکی ہے کہ تابعین اور کبار اہلِ علم حضرت قتادہ، حسن بصری، سعید بن جبیر، (ابو الشعثاء، زہری، اوزاعی) اور ابراہیم نخعی رحمہم اللہ نے جلباب کا معنیٰ ''غِطَاءُ الْوَجْهِ''[1] یعنی چہرے کو ڈھانپنے والا ہی کیا ہے۔

مذاہبِ اربعہ

چاروں فقہی مکاتبِ فکر کے علما اور علمائے اہلِ حدیث اس بارے میں رائے رکھتے ہیں؟ آیئے سب سے پہلے مذہبِ حنبلی کا مطالعہ کریں۔

حنابلہ:

شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے اپنی کتاب ''حجاب المرأة ولبأسها في الصلاة'' میں امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کے بارے میں نقل کیا ہے کہ انھوں نے فرمایا:

''كُلُّ شَيْئٍ مِّنْهَا -أَيِ الْمَرْأَةِ- عَوْرَةٌ حَتّٰى ظُفُرِهَا''[2]

''عورت کے جسم کی ہر چیز حتیٰ کہ ناخن بھی مقامِ ستر ہیں۔''

حنبلی مذہب کی کتاب ''الاقناع'' میں علامہ شرف الدین المقدسی نے لکھا ہے:

''وَالْحُرَّةُ الْبَالِغَةُ كُلُّهَا عَوْرَةٌ فِي الصَّلَاةِ حَتّٰى ظُفُرِهَا وَشَعْرِهَا إِلَّا وَجْهَهَا قَالَ جَمْعٌ وَكَفَّيْهَا وَهُمَا وَالْوَجْهُ عَوْرَةٌ خَارِجَهَا بِاعْتِبَارِ النَّظْرِ كَبَقِيَّةِ بَدَنِهَا''[3]

''نماز میں آزاد نوجوان عورت کا سارا بدن ہی مقامِ ستر ہے، یہاں تک کہ ناخن اور بال بھی سوائے چہرے کے اور ایک جماعت نے کہا ہے کہ دونوں ہتھیلیاں بھی مستثنیٰ ہیں، جبکہ یہ اور چہرہ نماز سے باہر بھی مقامِ ستر ہیں، جیسے جسم کے دیگر اعضا ہیں۔''

کشاف القناع میں علامہ منصور البہوتی نے اس بات کو سنن ترمذی کی حدیث: «اَلْمَرْأَةُ عَوْرَةٌ»

---

[1] تفسیر ابن کثیر (۳/ ۳۰٤)

[2] حجاب ابن تیمیة (ص: ١٥)

[3] الإقناع مع كشاف القناع (١/ ٣٠٩)

''عورت کا سارا جسم ہی مقامِ ستر ہے۔'' سے ثابت کیا ہے اور المغنی ابن قدامہ کے حوالے سے لکھا ہے کہ نماز میں عورت کا اپنے چہرے کو ننگا رکھنا جائز ہے۔

مالکیہ:

اس سلسلے میں فقہاے مالکیہ کا بھی یہی مسلک ہے، چنانچہ شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے خود امام مالک رحمہ اللہ سے یہی قول نقل کیا ہے، انھوں نے جب امام احمد بن حنبل کا یہ قول نقل کیا:

''كُلُّ شَيْئٍ مِّنْهَا عَوْرَةٌ حَتّٰى ظُفُرِهَا''

''عورت کے تمام اعضاے جسم حتیٰ کہ ناخن بھی مقامِ ستر ہیں۔''

تو آگے لکھا ہے:

''وَهُوَ قَوْلُ مَالِكٍ'' ''امام مالک رحمہ اللہ کا بھی یہی قول ہے۔''

اس سے معلوم ہوا کہ حنابلہ کی طرح ہی مالکیہ کا بھی مذہب یہی ہے کہ عورت کا سارا جسم ہی مقامِ ستر ہے، جس میں چہرہ بھی شامل ہے۔

شافعیہ:

شافعیہ کے نزدیک بھی عورت کا سارا جسم ہی مقامِ ستر ہے، چنانچہ امام بیضاوی رحمہ اللہ اپنی تفسیر میں ﴿اِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا﴾ کے تحت لکھتے ہیں:

''فَإِنَّ كُلَّ بَدَنِ الْحُرَّةِ عَوْرَةٌ لَا يَحِلُّ لَغِيْرِ الزَّوْجِ وَالْمَحْرَمِ النَّظْرُ إِلٰى شَيْئٍ مِّنْهَا إِلَّا لِضُرُوْرَةٍ كَالْمُعَالَجَةِ وَتَحَمُّلِ الشَّهَادَةِ''[1]

''آزاد عورت کا سارا جسم ہی مقامِ ستر ہے، شوہر اور محرم رشتہ داروں کے سوا کسی کے لیے اس کے جسم کا کوئی بھی حصہ دیکھنا جائز نہیں ہے، سوائے علاج معالجہ اور شہادت جیسی ضرورت کے۔''

امام نووی رحمہ اللہ نے المنہاج میں فتنہ و بگاڑ سے امن ہونے کے باوجود بھی عورت کے لیے ننگے چہرے رہنے کی حرمت پر صاد کیا ہے۔ اصطخری وطبری کا بھی یہی قول ہے اور شیخ ابو اسحاق شیرازی و رویانی اور دیگر فقہا نے بھی حرمت کے حکم ہی کو قطعی قرار دیا ہے۔ امام بلقینی نے کہا ہے:

[1] حجاب ابن تيمية (ص: ١٥)

"وَالْفَتْوىٰ وَالْمَذْهَبُ عَلٰى مَا جَآءَ فِي الْمِنْهَاجِ مِنَ الْحُرْمَةِ مُطْلَقاً وَهُوَ الرَّاجِحُ"[1]

"فتویٰ اسی پر ہے اور مذہب بھی یہی ہے جو المنہاج میں آیا ہے کہ چہرے کو ننگا کرنے کی حرمت مطلق ہی ہے اور یہی راجح بھی ہے۔"

علامہ تقی الدین سبکی نے کہا ہے:

"إِنَّ الْأَقْرَبَ فِيْ صَنِيْعِ الْأَصْحَابِ أَنَّ وَجْهَهَا وَكَفَّيْهَا عَوْرَةٌ فِي النَّظَرِ لَا فِي الصَّلَاةِ"[2]

"اصحاب کے اندر یہی بات زیادہ قریبِ حقیقت معلوم ہوتی ہے کہ عورت کا چہرہ اور ہاتھ نظر میں مقامِ ستر ہیں نہ کہ نماز میں۔"

شافعیہ ہی میں سے امام تقی الدین حصنی اپنی کتاب "كفاية الأخيار في حل غاية الاختصار" میں لکھتے ہیں:

"یہ مکروہ ہے کہ کوئی شخص کسی ایسے کپڑے میں نماز پڑھے جو صور و تمثیل (فوٹو) والا ہو اور یہ (بھی مکروہ ہے) کہ کوئی عورت نقاب اوڑھ کر نماز پڑھے، سوائے اس کے کہ وہ مسجد میں ہو، جہاں ایسے غیر محرم بھی ہوں، جن سے دیکھنے میں احتراز نہ ہوسکے اور اگر عورت کی طرف دیکھنے کے نتیجے میں کسی بگاڑ کے پیدا ہونے کا اندیشہ ہو تو پھر عورت پر نقاب کا اٹھانا (مکروہ نہیں بلکہ) حرام ہے اور یہ بکثرت مقاماتِ زیارت جیسے بیت المقدس میں بھی ہے۔"[3]

امام سیوطی رحمہ اللہ نے سورۃ الاحزاب آیت (۵۹) میں ارشادِ الٰہی کے الفاظ: ﴿يُدْنِيْنَ عَلَيْهِنَّ مِنْ جَلَابِيْبِهِنَّ...﴾ کے بارے میں لکھا ہے:

"یہ تمام عورتوں کے لیے آیتِ حجاب ہے اور اس میں ان کے سر اور چہرے کو ڈھانپنے کا وجوب وارد ہوا ہے۔"[4]

---

[1] بحواله اللباب (ص: ١٤٢)

[2] فقه النظر للشيخ محمد أديب كلكل (ص: ٣٥) كما في اللباب (ص: ١٤٣)

[3] كفاية الأخيار (١/ ١٨١) طبع مصر

[4] عون المعبود شرح سنن أبي داود (١١/ ١٥٨)

حنفیہ:

ان تینوں فقہی مکاتبِ فکر کی طرح احناف کے یہاں بھی چہرے کے پردے کو غالب احوال میں واجب قرار دیا گیا ہے، جیسا کہ فقہ حنفی کی ایک معتبر کتاب "مجمع الأنہر" میں لکھا ہے۔

منتقی میں ہے کہ نوجوان عورت کو چہرہ ننگا رکھنے سے روکا جائے گا، تا کہ (اس کی بے حجابی و عریانی سے) بگاڑ پیدا نہ ہو۔ آگے لکھتے ہیں:

"وَفِيْ زَمَانِنَا الْمَنْعُ وَاجِبٌ بَلْ فَرْضٌ لِغَلَبَةِ الْفَسَادِ"

"ہمارے موجودہ زمانے میں ممانعت واجب بلکہ فرض ہے، کیونکہ آج کل معاشرہ فساد و بگاڑ میں بکثرت مبتلا ہے۔"

آگے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے نقل کیا ہے کہ عورت کا سارا جسم ہی مقامِ ستر ہے، سوائے آنکھ کے، تا کہ (راستہ وغیرہ دیکھنے کی ضرورت پوری ہو سکے)۔

صاحبِ مجمع نے حج کے موقع پر عورتوں کے حالات و احکام کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

"بحالتِ احرام شرح الطحاوی کی رو سے تو اولیٰ یہ ہے کہ عورت چہرہ ننگا رکھے، لیکن النہایہ میں ہے کہ سر سے چہرے پر کپڑا لٹکا کر پردہ کرنا ہی زیادہ واجب ہے، البتہ یہ مسئلہ اس بات کی دلیل ہے کہ عورت بلا ضرورت غیر مردوں کے سامنے اپنا چہرہ ننگا نہ کرے۔"

مجمع کے حاشیہ "درر المنتقی" میں ہے کہ بحالتِ احرام اگر کسی کپڑے وغیرہ کو سر سے لٹکا کر پردہ کر لے، جبکہ وہ کپڑا چہرہ سے الگ رہے تو یہ جائز بلکہ مندوب، بلکہ ایک قول کے مطابق یہی واجب ہے۔[1]

یہاں ہم یاد دلا دیں کہ یہ بات گزر چکی ہے کہ حالتِ احرام میں کسی لکڑی وغیرہ سے کوئی ایسی چیز بنا کر چہرے پر رکھنا، تا کہ پردے کا کپڑا چہرے کو نہ چھوئے اس کی کوئی دلیل نہیں، جیسا کہ علامہ ابن قیم رحمہ اللہ کی تحقیق ہم ان کی کتاب "بدائع الفوائد" (۲/ ۳/ ۱۴۳) کے حوالے سے ذکر کر چکے ہیں۔

فقہ حنفی کی ایک اور کتاب "الهدية العلائية" میں لکھا ہے:

---

[1] اللباب (ص: ۱۴۰، ۱۴۱)

''وَتَمْنَعُ الشَّآبَّةُ مِنْ كَشْفِ وَجْهِهَا خَوْفَ الْفِتْنَةِ''[1]

''نوجوان عورت یا لڑکی کو معاشرے میں پیدا ہونے والے بگاڑ کے خدشے کی بنا پر چہرہ ننگا رکھنے سے روکا جائے گا۔''

یہاں فتنہ و بگاڑ کے خدشے کی بات کی گئی ہے، جبکہ اس کا معیار کتاب الفتن میں احمد عزالدین بیانونی کے بقول عوام الناس نہیں بلکہ اس فتنے کو ایک خاص تناظر میں معلوم کیا جائے گا، ورنہ عوام الناس کی نسبت جن میں عورت ننگے منہ عموماً چلتی ہے، ان میں بگاڑ پیدا ہونے سے تو امن کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔[2]

لہٰذا اس علت (امن الفتنہ) کی رو سے بھی عوام الناس میں عورت کا ننگے منہ بے مہابا نکلنا قطعاً ممنوع بنتا ہے اور بگاڑ سے امن کا محض کھوکھلا دعویٰ کر کے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ جب فتنہ و بگاڑ کا خوف نہ ہو تو چہرے کا پردہ ضروری نہیں اور عورت کے لیے جائز ہے کہ وہ ننگے منہ چلتی پھرتی رہے، جب وہ عوام الناس ہیں تو فتنہ و بگاڑ کا پیدا نہ ہونا محال ہے اور جب لامحالہ یہ خدشہ موجود ہے تو پھر جوازِ کشف کیسے کشید کیا جا سکتا ہے؟

جب اللہ تعالیٰ نے نبیِ اکرم ﷺ کی ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن پر پردے کو فرض و واجب قرار دیا، جن کا معاشرہ ان قدسی نفوس افراد سے مرکب تھا، جنھیں نبیِ اکرم ﷺ کی صحبت و زیارت کا شرف حاصل تھا اور جو علم و عمل، تقویٰ و ورع، خوف و خشیتِ الٰہی اور انابت الی اللہ کے انتہائی بلند مقام پر فائز تھے، جب ایسے افرادِ معاشرہ کی موجودگی میں بھی نبیِ اکرم ﷺ کی ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن پردے پر مامور تھیں تو آج کی خواتین اس پر مامور کیوں نہ ہوں گی؟

جبکہ معاشرے کی حالت ہی سخت دگر گوں ہو چکی ہے، بگاڑ واقع ہو چکا ہے، افرادِ معاشرہ ان اوصاف سے تہی دست ہو چکے ہیں یا کم از کم ان اوصاف میں سخت ضعف و کمزوری آچکی ہے، ایسے میں آج کی خواتین پر چہرے کا پردہ یقیناً واجب ہی بنتا ہے اور افرادِ معاشرہ کو مجموعی طور پر دیکھ لیا جائے تو امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ اور ان کے اصحاب کا مذہب کھل کر سامنے آجاتا ہے کہ وہ بھی ایسے میں چہرے کے پردہ کے وجوب ہی کے قائل ہیں۔[3]

---

[1] اللباب (ص: ۱۳۹)

[2] اللباب (ص: ۸۱، ۱۴۰)

[3] اللباب (ص: ۸۱، ۱۴۰)

اہلِ حدیث اور بعض دیگر علما کے متفرق اقوال

پچھلے اوراق سے چہرے کے پردے پر گفتگو ہو رہی ہے اور قرآن و سنت کے علاوہ آثارِ صحابہ رضی اللہ عنہم و تابعین رحمہم اللہ اور مذاہبِ اربعہ کے ائمہ و فقہا رحمہم اللہ کے اقوال بھی ذکر کیے ہیں، اب اسی سلسلے میں ہم بعض معروف علما کے متفرق اقوال و آرا بھی آپ کے سامنے رکھنا چاہتے ہیں۔

(1) امیر صنعانی رحمہ اللہ:

علامہ یمانی امیر صنعانی رحمہ اللہ ''بلوغ المرام'' کی بہترین شرح ''سبل السلام'' میں لکھتے ہیں:

''بلوغ المرام کے مولف حافظ ابن حجر رحمہ اللہ اپنی اس تالیفِ لطیف میں ایسی کوئی حدیث نہیں لائے، جس سے یہ پتا چلتا ہو کہ احرام کی حالت میں عورت پر کون سا لباس یا کپڑا حرام ہے، جبکہ درحقیقت احادیث میں وارد ہوا ہے کہ عورت پر احرام کی حالت میں انتقاب یعنی چہرے پر نقاب باندھنا بھی اسی طرح منع ہے، جس طرح مرد پر قمیص اور موزے پہننا منع ہے۔ عربی نقاب کے باندھنے کے حرام ہونے کی طرح ہی عربی برقع بھی ممنوع ہے اور اس سے مراد وہ کپڑا ہے جو چہرے کے برابر سلایا گیا ہو، کیونکہ نصِ حدیث اسی کی ممانعت کے بارے میں وارد ہوئی ہے، مگر ایسی قمیص کے علاوہ تمام چادروں سے مرد کا اپنے جسم کو ڈھانپنا بالاتفاق جائز ہے، بالکل اسی طرح احرام کی حالت میں عورت اس نقاب یا برقع کے علاوہ کسی دوسرے کپڑے یا چادر وغیرہ سے چہرے کو ڈھانپ کر رکھے اور جس کسی نے یہ کہا ہے کہ عورت کا چہرہ بحالتِ احرام مرد کے سر کی طرح ہے، لہٰذا وہ اسے نہ ڈھانپے، اس قائل کے پاس اپنی اس بات کو ثابت کرنے کے لیے کوئی دلیل نہیں ہے۔''[1]

ایسے ہی موصوف رحمہ اللہ نے ''باب شروط الصلاۃ'' میں ایک حدیث کی شرح بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:

''نماز کے دوران میں عورت اپنا چہرہ ننگا رکھ سکتی ہے، کیونکہ دورانِ نماز چہرے کو ڈھانپ

[1] سبل السلام (۱/ ۲/ ۱۹۱)

کر رکھنے کی کوئی دلیل نہیں ہے۔ نماز کے دوران چہرہ ننگا رکھنے کے جواز سے مراد بھی ایسی حالت ہے کہ جب کوئی غیر محرم مرد اسے دیکھ نہ سکتا ہو اور یہ اس کا نماز کے لیے ستر ہے، جبکہ اجنبی و غیر محرم مردوں کی نسبت سے اس کا ستر یہ ہے کہ عورت کا سارا جسم ہی مقامِ ستر ہے۔''[1]

(2) امام شوکانی رحمہ اللہ:

ایک دوسرے محدّث و مجتہد عالم امام شوکانی رحمہ اللہ نے ''نیل الأوطار'' میں ابن رسلان کے حوالے سے لکھا ہے:

''اس بات پر تمام مسلمانوں کا اتفاق ہے کہ عورت کا ننگے منہ نکلنا منع ہے، خصوصاً جبکہ افرادِ معاشرہ میں فاسقوں کی کثرت ہو۔''[2]

(3) حافظ ابن حجر رحمہ اللہ:

بخاری شریف میں وارد حبشیوں کے گتکا کھیلنے اور حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے انھیں دیکھنے اور نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے انھیں اپنی چادر سے پردہ میں کرنے والی حدیث کی شرح میں حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے لکھا ہے:

''اس پر مسلسل عمل چلا آرہا ہے، خواتین کے لیے جائز ہے کہ وہ مساجد، بازار اور سفر میں نقاب اوڑھ کر نکل سکتی ہیں اور نقاب اس لیے کہ مرد انھیں دیکھ نہ سکیں، البتہ مردوں کو نقاب اوڑھنے کا قطعاً حکم نہیں ملا، تاکہ وہ عورتوں کو نہ دیکھ سکیں، اس طرح یہ ان دونوں صنفوں کے حکم میں مغایرت وفرق کی دلیل ہے۔''[3]

(4) امام غزالی رحمہ اللہ:

پھر حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے مرد وعورت کے مابین اسی فرق کے سلسلے میں امام غزالی رحمہ اللہ سے بحث نقل کی ہے، جس میں ان کے یہ الفاظ بھی ہیں:

---

(1) سبل السلام (۱/ ۱/ ۱۳۲)

(2) نیل الأوطار (۳/ ٦/ ۱۱٤)

(3) فتح الباري (۹/ ۳۳۷) نیل الأوطار (۳/ ٦/ ۱۱۷، ۱۱۸)

"لَمْ تَزَلِ ... النِّسَآءُ يَخْرُجْنَ مُتَنَقِّبَاتٍ"[1]

''عورتیں ہمیشہ سے نقاب اوڑھے ہی گھروں سے نکلتی آ رہی ہیں۔''

یوں حافظ ابن حجر اور امام غزالی رحمہما اللہ کے نزدیک امت اسلامیہ کی خواتین کا یہ تعامل بالتواتر چلا آ رہا ہے کہ وہ ننگے منہ نہیں بلکہ نقاب اوڑھے ہی باہر نکلتی ہیں۔

5 علامہ واحدی رحمہ اللہ:

معروف مفسر علامہ واحدی نے ارشادِ الٰہی ﴿يُدْنِيْنَ عَلَيْهِنَّ مِنْ جَلَابِيْبِهِنَّ...﴾ کی تفسیر میں مفسرین کی طرف منسوب کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ان الفاظ کا معنیٰ ہے:

"يُغَطِّيْنَ وُجُوْهَهُنَّ وَرُؤُسَهُنَّ إِلَّا عَيْناً وَّاحِدَةً"[2]

''عورتیں اپنے سر اور چہرے ڈھانپ کر رکھیں سوائے ایک آنکھ کے۔''

6، 7 امام ابوحیان اور لیث رحمہما اللہ:

امام ابوحیان نے اپنی تفسیر ''البحر المحیط'' میں ''تبرّج'' کا معنیٰ امامِ لغت لیث سے یہ نقل کیا ہے:

"تَبَرَّجَتِ الْمَرْأَةُ، أَبْدَتْ مَحَاسِنَهَا مِنْ وَّجْهِهَا وَجَسَدِهَا"[3]

''عورت نے اپنے چہرے اور جسم کے محاسن ظاہر کر دیے۔''

گویا امامِ لغت لیث اور ابوحیان کے نزدیک چہرے کو ننگا کرنا تبرّج اور بے پردگی ہے۔

8 علامہ ہیتمی رحمہ اللہ:

علامہ ابن حجر مکی ہیتمی رحمہ اللہ اپنی کتاب ''الزواجر'' میں لکھتے ہیں:

''صحیح تر بات یہ ہے کہ غیر محرمہ عورت پر نظر ڈالنا حرام ہے، چاہے وہ بلاشہوت ہی کیوں نہ ہو اور چاہے بگاڑ کا خطرہ بھی نہ ہو، کیونکہ فساد اور بگاڑ کے مادے کی جڑ کاٹنے کے لیے یہی ضروری ہے۔ اگر یہ نظر جائز ہو چاہے بحالتِ امن ہی کیوں نہ ہو، تو یہ فحاشی کی طرف

---

[1] بحواله بالا

[2] اللباب (ص: ١٤٨)

[3] اللباب (ص: ١٤٨)

لے جانے والی اور فساد و بگاڑ کا بیج بونے والی چیز ہے اور شریعتِ اسلامیہ کے محاسن کو یہی زیب تھا کہ احوال کی تفصیل سے اعراض کا حکم دے، فساد و بگاڑ اور ہر اس چیز کا دروازہ بند کر دے جو بگاڑ کا موجب ہوسکتا ہو۔ ہمارے ائمہ نے تو عورت کے کٹے ہوئے یا ہاتھ کے ساتھ ہی لگے ہوئے ناخن کو دیکھنا بھی حرام قرار دیا ہے اور یہ اس بنا پر کہ صحیح تر قول کی رو سے عورت کے چہرے اور ہاتھوں کو دیکھنا حرام ہے، کیونکہ یہ بھی عورت کے مقاماتِ ستر میں سے ہیں، چاہے صحیح تر قول کے مطابق وہ عورت کنیز ہی کیوں نہ ہو، اگرچہ یہی دونوں اعضا نماز کے دوران مقامِ ستر نہیں (بلکہ انھیں ننگا رکھا جا سکتا ہے)۔''[1]

9 علامہ جصّاص رحمہ اللہ:

چہرے کے پردے کے وجوب کے سلسلے میں علمائے احناف میں سے علامہ جصاص نے اپنی کتاب ''احکام القرآن'' میں ﴿ يَآَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّأَزْوَاجِكَ وَبَنٰتِكَ وَ نِسَآءِ الْمُؤْمِنِيْنَ ... ﴾ کے الفاظ کے تحت لکھا ہے:

''فِيْ هٰذِهِ الْآيَةِ دَلَالَةٌ عَلٰى أَنَّ الْمَرْأَةَ الشَّآبَّةَ مَأْمُوْرَةٌ بِسَتْرِ وَجْهِهَا عَنِ الْأَجْنَبِيِّيْنَ وَإِظْهَارِ السَّتْرِ وَالْعَفَافِ عِنْدَ الْخُرُوْجِ لِئَلَّا يَطْمَعَ أَهْلَ الرَّيْبِ فِيْهِنَّ''

''اس آیت میں اس بات کی دلیل موجود ہے کہ نوجوان عورت کو اس کا حکم دیا گیا ہے کہ وہ اپنے چہرے کو اجنبی مردوں سے پردے میں رکھے اور اس پر واجب ہے کہ وہ گھر سے نکلتے وقت ستر و حجاب اور عفت و پاکدامنی کا مظہر ہو، تاکہ غلط کار لوگوں کو ان کی طرف للچاتی ہوئی نظروں سے دیکھنے کی ہمت نہ ہو۔''

علامہ جصاص کے الفاظ بڑے واضح ہیں، لہٰذا ان پر کسی تبصرے کی ضرورت نہیں۔

10 حسن البنا شہید رحمہ اللہ:

اخوان المسلمین کے بانی حسن البنا شہید رحمہ اللہ نے اپنی کتاب ''المرأة المسلمة'' میں لکھا ہے:

''إِنَّ الْإِسْلَامَ يُحَرِّمُ عَلَى الْمَرْأَةِ أَنْ تَكْشِفَ عَنْ بَدَنِهَا''

---

[1] الزواجر (۲/ ۵، طبع دار المعرفة، بيروت)

''اسلام عورت پر اس بات کو حرام قرار دیتا ہے کہ وہ (گلی بازار میں) اپنے جسم کے کسی بھی حصے کو ننگا کرے۔''

آگے انھوں نے عورت کے غیر مردوں کے ساتھ خلوت گزیں ہونے اور ان سے خلط ملط ہونے کو بھی حرام لکھا ہے۔[1]

حسن البنا کے الفاظ بھی چہرے کے وجوبِ حجاب ہی کا پتا دیتے ہیں۔

(11) اجماعِ امت: ابن المنذر رحمہ اللہ:

امام ابن المنذر رحمہ اللہ نے اپنی کتاب ''الإجماع'' میں لکھا ہے:

''تمام علماے امت کا اس بات پر اجماع ہے کہ احرام کی حالت میں عورت سلا ہوا لباس اور موزے پہن سکتی ہے اور یہ کہ وہ اپنے سر اور بالوں کو ڈھانپ کر رکھے، البتہ چہرہ کھلا رہنے دے، لیکن غیر مردوں کی نظروں سے بچنے کے لیے وہ سر کے اوپر سے کوئی ہلکا سا کپڑا گرا کر چہرے کا پردہ کر لے۔''[2]

امام ابن المنذر رحمہ اللہ کا یہ دعواے اجماع حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے بھی فتح الباری میں نقل کیا ہے۔[3]

امام ابن المنذر کے بقول تو حالتِ احرام میں بھی چہرے کے پردے پر اجماع ہے، پھر عام حالات میں اس کو ننگا رکھنا کیسے روا ہوسکتا ہے؟

(12) شیخ عبداللہ بن زید آل محمود:

قطر کے معروف عالم، وہاں کے شرعی کورٹ اور امورِ اسلامیہ کے ڈائریکٹر جنرل شیخ عبداللہ بن زید آلِ محمود نے اپنے کتابچے ''الاخلاق الحمیدہ'' میں لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی کتابِ عظیم قرآنِ کریم میں ہر برے کام پر سرزنش اور زجر وتوبیخ کی گئی ہے، چنانچہ پردے کے سلسلے میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِكَ وَبَنٰتِكَ وَ نِسَآءِ الْمُؤْمِنِيْنَ يُدْنِيْنَ عَلَيْهِنَّ مِنْ جَلَابِيْبِهِنَّ ﴾ [الأحزاب: ٥٩]

---

(1) المرأة المسلمة بحواله اللباب (ص: ١٥٦)

(2) الإجماع (ص: ٥٧، طبع دار طيبه، رياض) بتحقيق أبي حماد صغير أحمد

(3) فتح الباري (٣/ ٤٠٦)

''اے نبی! اپنی بیویوں اور بیٹیوں اور عام مسلمانوں کی عورتوں سے کہہ دیں کہ وہ اپنی بڑی چادریں اوڑھ لیں۔''

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے مومن عورتوں کو حکم دیا ہے کہ وہ اپنی چادریں اوڑھے رہیں اور جلباب چادر یا عباء کے مشابہ ہوتا ہے، اس سے وہ اپنے سارے جسم کو ڈھانپ سکتی ہے، سوائے آنکھوں کے لیے رکھے گئے سوراخوں کے جہاں سے وہ راستہ دیکھ سکے۔ اور شریف زادیوں کے شایانِ شان یہی ہے، تاکہ وہ پردہ دار خواتین کی حیثیت سے پہچانی جائیں اور لوگوں کی نظروں میں ان کا احترام جاگزیں ہو ''وَهٰذَا نَصٌّ قَاطِعٌ فِيُ وُجُوبِ سَتْرِ الْمَرْأَةِ الْحُرَّةِ جَمِيعَ جِسْمِهَا حَتّٰى وَجْهَهَا'' [1] ''اور ارشادِ الٰہی کے یہ الفاظ اس معاملہ میں نص قاطع ہیں کہ عورت پر اپنا سارا جسم حتیٰ کہ چہرہ بھی پردہ میں رکھنا واجب ہے۔''

13 شیخ عبداللہ ناصح علوان:

دو ضخیم جلدوں پر مشتمل کتاب ''تربية الأطفال'' کے مولف شیخ عبداللہ ناصح علوان نے اپنے ایک کتابچے ''إلى كل أب غيورٍ يؤمن بالله'' میں پردے کے موضوع پر بحث کے دوران میں لکھا ہے کہ کیا عورت شرعاً چہرے کا پردہ کرنے پر مامور ہے؟ پھر اس سوال کا جواب دیتے ہوئے انھوں نے آیاتِ حجاب اور مفسّرین کے اقوال نقل کیے ہیں، جو ہم سابق میں ذکر کر چکے ہیں، پھر احادیثِ رسول ﷺ نقل کی ہیں۔

آگے لکھا ہے:

''جمہور ائمہ کرام جن میں سے امام شافعی، احمد اور مالک رحمہم اللہ بھی ہیں، ان سب کا کہنا ہے کہ عورت کا چہرہ مقامِ ستر ہے اور اس کا پردہ واجب ہے اور اسے (غیر مردوں کے سامنے) ننگا رکھنا حرام ہے۔ اس سلسلے میں ان کی دلیل صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اور سلف صالحین کے وہ تفسیری اقوال ہیں، جو صحیح اسانید سے ثابت ہیں اور جن میں کہا گیا ہے کہ قرآنی الفاظ ﴿يُدْنِينَ عَلَيْهِنَّ مِنْ جَلَابِيبِهِنَّ﴾ چہرے کو بھی شامل ہیں، نیز ان کا استدلال ان آثار سے بھی ہے جن میں وارد ہوا ہے کہ صحابیات رضی اللہ عنہن جب کسی کام سے باہر نکلتیں تو

[1] الأخلاق الحميدة بحواله اللباب (ص: ١٥١)

نقاب ڈالے چہروں کا پردہ کیے ہوئے ہوتی تھیں۔فقہائے احناف جو چہرے کے پردے کے وجوب کے قائل نہیں ہیں، وہ بھی چہرے کو غیر مشروط کھلا چھوڑنے کے قائل تو نہیں ہیں، بلکہ ان کے نزدیک بھی یہ شرط ہے کہ جب فتنہ و بگاڑ کا خدشہ نہ ہو، تب وہ چہرے کو کھلا رکھ سکتی ہے اور اگر کسی بگاڑ کے پیدا ہونے کا اندیشہ ہو تو پھر فساد و بگاڑ کا دروازہ بند کرنے کے لیے چہرے کا ننگا رکھنا احناف کے نزدیک بھی حرام ہے۔''[1]

جیسا کہ ہم پہلے بھی ذکر کر آئے ہیں کہ اگر احناف کی عائد کردہ اس شرط کو پیشِ نظر رکھ کر اور افرادِ معاشرہ میں فسق و فجور کے دَور دَورہ کو دیکھتے ہوئے معمولی سا بھی غور کیا جائے تو پتا چل جاتا ہے کہ ایسی صورت میں احناف کے نزدیک بھی چہرے کا پردہ واجب ہی بنتا ہے۔ یہی بات شیخ عبداللہ ناصح نے بھی اپنی بحث کے آخر میں لکھی ہے۔

(14) ڈاکٹر صالح الفوزان:

دورِ حاضر کے ایک معروف عالم اور جامعہ قطر کے مصری دیدہ ور علامہ ڈاکٹر یوسف القرضاوی نے ''اسلام میں حلال وحرام'' کے موضوع پر ایک بہت اہم اور نہایت وقیع کتاب لکھی ہے، جو عربی کے بعد اردو میں بھی شائع ہو چکی ہے۔

افادیت کے اعتبار سے یہ کتاب اپنا ثانی نہیں رکھتی، لیکن جیسا کہ معروف ہے ع

گرتے ہیں شہسوار ہی میدانِ جنگ میں

ایسے ہی میدانِ علم و قلم کے اس شہسوار سے بھی بعض لرزشیں سرزد ہوگئی ہیں، جن پر دوسرے اہلِ علم نے ان کا مؤاخذہ بھی کیا ہے، تاکہ غلط فہمی نہ ہونے پائے، اس سلسلے میں سب سے اہم کتاب جو ہماری نظر سے گزری ہے، وہ ہے علامہ ڈاکٹر صالح الفوزان کی کتاب ''الاعلام بنقد کتاب الحلال والحرام في الإسلام'' جبکہ یہ کتاب بھی اردو میں ترجمہ ہو کر چھپ چکی ہے اور اس کے مترجم فجیرہ میں مقیم حافظ محمد اسلم صاحب رحمہ اللہ ہیں۔ جزاہ اللہ خیراً۔[2]

ڈاکٹر قرضاوی نے اپنی کتاب ''حلال وحرام'' میں غیر مردوں کی موجودگی میں چہرے کو ننگے

---

(1) بحوالہ اللباب (ص: ۱۵۱، ۱۵۲)

(2) حافظ صاحب چند سال پہلے وفات پا گئے ہیں۔ غَفَرَ اللّٰهُ لَنَا وَلَهٗ وَرَحِمَنَا وَرَحِمَهٗ.

رکھنے کے جائز ہونے کی رائے کو اختیار کیا ہے، جس پر ان کا تعاقب کرتے ہوئے ڈاکٹر فوزان نے ''الإعلام'' میں لکھا ہے:

''چہرے کے سلسلے میں موصوف نے جو بحث لکھی ہے، اس میں ان سے کئی جگہ خطا سرزد ہوئی ہے اور ان میں سے پہلی یہ ہے کہ انھوں نے جو لکھا ہے کہ عورت کے لیے غیر مردوں کی موجودگی میں چہرے اور ہاتھوں کو ننگا رکھنا جائز ہے اور ان اعضا کے مقامِ ستر نہ ہونے کا اعتبار کرتے ہوئے جو کہا ہے کہ غیر مردوں کا عورت کے ان اعضا کو دیکھنا بھی جائز ہے، یہ کھلی خطا اور قطعاً باطل قول ہے۔

کتاب و سنت کے وہ صحیح آثار و نصوص اس قولِ جواز کی تردید کرتی ہیں، جن میں اس بات کی دلیل بھی موجود ہے کہ عورت کا چہرہ اور دونوں ہاتھ اور سارا جسم مقامِ ستر ہے اور تمام اعضا کا غیر محرم مردوں سے پردے میں رکھنا واجب ہے۔''

پھر آگے موصوف نے وہ دلائل ذکر کیے ہیں، جنھیں ہم پہلے ہی آپ کے گوش گزار کر چکے ہیں۔[1]

(15) شیخ محمد علی صابونی رحمہ اللہ:

شیخ محمد علی صابونی نے آیاتِ احکام کو ترتیب دے کر ان کی تفسیر ''روائع البیان في تفسیر آیات الأحکام'' کے عنوان سے کتاب لکھی ہے، جو دو ضخیم جلدوں پر مشتمل ہے، اس کی جلد دوم (ص: ۱۷۳) میں وہ لکھتے ہیں:

''فتنہ و فساد اور بگاڑ کے سدِ باب کے لیے اسلام نے عورت پر حرام کیا ہے کہ وہ اپنے ستر میں سے غیر مردوں کے سامنے کسی بھی حصے کو ننگا کرے اور یہ بات کہاں تک معقول ہے کہ اسلام عورت کو بالوں اور پاؤں کو تو چھپانے کا حکم دے، لیکن اس بات کی اجازت دے دے کہ وہ اپنے چہرے اور ہاتھوں کو کھلا چھوڑ دے؟ بگاڑ زیادہ کس میں ہے چہرہ ننگا رکھنے میں یا کہ پاؤں ننگے رکھنے میں؟ جبکہ چہرہ ہی تو حسن و جمال کا اصل معیار، بگاڑ کا سرچشمہ اور خطرات کی آماجگاہ ہوتا ہے۔''[2]

---

(1) تفصیل کے لیے دیکھیں: الحلال والحرام (ص: ۱۵۰، ۱۵۱، طبع سیزدھم، المکتب الإسلامي) الإعلام، طبع جامعة الإمام بالریاض اردو ترجمہ (ص: ۱۵۰) از حافظ محمد اسلم صاحب (الفجیرہ) طبع فیصل آباد.

(2) روائع البیان (۲/ ۱۷۳)

نیز کہتے ہیں:

''گویا جو لوگ پاؤں کو مقامِ ستر قرار دیتے ہیں، انھی کی طرف سے چہرے کو مقامِ ستر قرار نہ دینا قطعاً معقول بات نہیں ہے، کیونکہ بگاڑ پیدا کرنے میں پاؤں چہرے کا مقابلہ کہاں کر سکتے ہیں؟''

آگے چل کر مزید لکھتے ہیں:

''جس نے صحابیات رضی اللہ عنہن اور تابعیات رحمہ اللہ علیہنّ اور سلف صالحین کی زندگیوں کے بارے میں مطالعہ کیا اور پڑھا ہے کہ وہ خواتین کس طرح پردے کا اہتمام کیا کرتی تھیں اور کیسے عصمت وعفت کے تحفظ پر توجہ دیتی تھیں، اس سے ان لوگوں کی غلطی کا پتا چل جاتا ہے، جو یہ کہتے ہیں کہ چہرے کا پردہ واجب نہیں ہے۔''[1]

16 مولانا سید مودودی رحمہ اللہ:

اردو لٹریچر میں اس موضوع کی جامع اور معروف کتاب ''پردہ'' کے مؤلف (مولانا سید مودودی) ''نقاب'' کے زیرِ عنوان لکھتے ہیں:

''جو شخص آیتِ قرآنی کے الفاظ اور ان کی مقبول عام اور متفق علیہ تفسیر اور عہدِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے تعامل کو دیکھے گا، اس کے لیے اس حقیقت سے انکار کی مجال باقی نہیں رہے گی کہ شریعتِ اسلامیہ میں عورت کے لیے چہرے کو اجانب سے مستور رکھنے کا حکم ہے اور اس پر خود نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے سے عمل کیا جا رہا ہے۔ نقاب اگر لفظاً نہیں تو معناً وحقیقتاً خود قرآنِ عظیم کی تجویز کردہ چیز ہے۔ جس ذاتِ مقدس پر قرآن نازل ہوا تھا، اس کی آنکھوں کے سامنے خواتینِ اسلام نے اس چیز کو اپنے خارج البیت لباس کا جزو بنایا تھا اور اس زمانے میں بھی اس چیز کا نام نقاب ہی تھا۔''[2]

''جی ہاں! یہ وہی نقاب (Veil) ہے جس کو یورپ انتہا درجہ مکروہ اور گھناؤنی چیز سمجھتا ہے، جس کا محض تصوّر ہی فرنگی ضمیر پر ایک بارِ گراں ہے، جس کو ظلم اور تنگ خیالی اور

---

[1] روائع البیان (۲/ ۳۸٤)

[2] پردہ (ص: ۳۲۰) طبع اسلامک پبلی کیشنز لاہور، عربی ترجمہ: الحجاب (ص: ۳۰۳، ۳۰۵ مؤسسۃ الرسالۃ، بیروت (ص: ۲٦)

وحشت کی علامت قرار دیا جاتا ہے، ہاں یہ وہی چیز ہے جس کا نام کسی مشرقی قوم کی جہالت اور تمدنی پسماندگی کے ضمن میں سب سے پہلے لیا جاتا ہے اور جب یہ بیان کرنا ہوتا ہے کہ کوئی مشرقی قوم تمدّن و تہذیب میں ترقی کر رہی ہے تو سب سے پہلے جس بات کا ذکر بڑے انشراح و انبساط کے ساتھ کیا جاتا ہے، وہ یہی ہے کہ اس قوم سے ''نقاب'' رخصت ہوگئی ہے۔ اب شرم سے سر جھکا لیجیے کہ یہ چیز بعد کی ایجاد نہیں، خود قرآن نے اس کو ایجاد کیا ہے اور حضرت محمد ﷺ اس کو رائج کر گئے ہیں، مگر محض سر جھکانے سے کام نہ چلے گا۔ شُتر مرغ اگر شکاری کو دیکھ کر ریت میں سر چھپا لے تو شکاری کا وجود باطل نہیں ہوجاتا ہے۔ آپ بھی اپنا سر جھکائیں گے تو ضرور سر جھک جائے گا، مگر قرآن کی آیت نہ مٹے گی، نہ تاریخ سے ثابت شدہ واقعات محو ہو جائیں گے۔ تاویلات سے اس پر پردہ ڈالیے گا تو یہ ''شرم کا داغ'' اور زیادہ چمک اٹھے گا۔''[1]

اللہ تعالیٰ حقائق کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنے کی توفیق سے نوازے۔ آمین ثم آمین

(17) امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ:

اس سلسلے میں جن اہلِ علم و تقویٰ نے اظہار کیا ہے، ان میں سے شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ بھی ہیں، جن کی کتاب خاص اسی موضوع پر ہے: ''حجاب المرأة ولبأسها في الصلاة'' جس میں انھوں نے نماز اور غیر نماز کے تمام حالات میں عورت کے لباس کی تفصیلات انتہائی محققانہ و فاضلانہ انداز سے رقم فرمائی ہیں اور عام پردہ دار لباس کی تفصیلات کے علاوہ خاص چہرے کے بارے میں انھوں نے کافی کچھ لکھا ہے، ان کے کئی اقتباسات بھی ذکر کیے جا چکے ہیں۔ جبکہ اسی کتاب میں وہ خاص حجاب و نقاب کے بارے میں لکھتے ہیں:

''إِنَّمَا ضُرِبَ الْحِجَابُ عَلَى النِّسَآءِ لِئَلَّا تُرٰى وُجُوْهُهُنَّ وَأَيْدِيْهِنَّ''[2]

''عورت پر حجاب کا حکم اس لیے نازل کیا گیا ہے، تاکہ ان کے ہاتھ اور منہ بے پردہ نہ رہیں (دیکھے نہ جائیں)۔''

---

[1] پردہ (ص: ۳۲۰)

[2] تفصیل کے لیے ملاحظہ کریں: إعلام الموقعین (۱/ ۲/ ۶۱) تهذیب السنن علی العون (۵/ ۲۸۲، ۲۸۳)

18 علامہ ابن قیم رحمہ اللہ:

علامہ ابن قیم رحمہ اللہ کی آرا اور فتاویٰ بڑے معروف ہیں، وہ تو کنیزوں کے لیے بھی وجوبِ حجاب کے قائل ہیں اور احرام کی حالت میں بھی عورت کے لیے ضروری سمجھتے ہیں کہ وہ غیر مردوں کی موجودگی میں چہرے کا پردہ کرے، ان کے یہاں ستر کی دو قسمیں ہیں: ① نماز میں ستر۔ ② عام حالات میں دوسروں کی نظر سے بچنے کے لیے ستر۔

اس تقسیم کے ضمن میں وہ کہتے ہیں کہ عورت گھر میں ننگے منہ نماز پڑھ سکتی ہے، لیکن غیر محرم مردوں کے سامنے ننگے منہ نہیں آ سکتی۔[1]

19 شیخ محمد صالح العثیمین:

دَورِ حاضر میں شیخ محمد صالح العثیمین کا شمار اہلِ تقویٰ علما میں سے ہوتا ہے۔ موصوف نے پردے کے موضوع پر ایک رسالہ لکھا ہے، جس کا سببِ تالیف بیان کرنے کے بعد وہ لکھتے ہیں:

”اِعْلَمْ أَيُّهَا الْمُسْلِمُ أَنَّ اِحْتِجَابَ الْمَرْأَةِ عَنِ الرِّجَالِ الْأَجَانِبِ وَتَغْطِيَةَ وَجْهِهَا أَمْرٌ وَاجِبٌ، دَلَّ عَلٰى وُجُوْبِهٖ كِتَابُ رَبِّكَ تَعَالٰى وَسُنَّةُ نَبِيِّكَ مُحَمَّدٍ ﷺ وَالْإِعْتِبَارُ الصَّحِيْحُ وَالْقِيَاسُ الْمُطَّرِدُ“[2]

”اے مسلمان! تمھیں معلوم ہونا چاہیے کہ غیر مردوں کی موجودگی میں عورت کا پردہ کرنا اور چہرے کو ڈھانپنا ایک واجب امر ہے اور اس کے وجوب کے دلائل تیرے رب کی کتاب قرآنِ کریم اور تیرے نبی ﷺ کے ارشادات و عمل، اعتبارِ صحیح اور قیاس مطرد میں موجود ہیں۔“

آگے پھر انھوں نے وہ تمام دلائل نقل کیے ہیں، جن میں سے تقریباً سبھی ہم ذکر کر چکے ہیں۔[3]

20 شیخ ابو بکر الجزائری:

ایسے ہی مسجدِ نبوی ﷺ کے واعظ اور مدینہ یونیورسٹی کے دراساتِ علیا کے پروفیسر شیخ ابو بکر

---

[1] بدائع الفوائد (٢/ ٣/ ١٤٢، ١٤٣)

[2] مجموعة رسائل في الحجاب والسفور (ص: ٨٣) و كتاب المرأة المسلمة (ص: ٩) أحكام فقهية حول الحجاب والدماء الطبيعية دار الإفتاء.

[3] المرأة المسلمة (ص: ٩_ ٢٨) المجموعة (٨٣_ ١٠٣)

جابر الجزائری جو "منهاج المسلم" اور "وَهٰذِهِ سِيرَةُ حَبِيبِكَ يَا مُحِبُّ"، جیسی شہرہ آفاق کتابوں کے مولف ہیں، انھوں نے عورت اور پردے کے موضوع پر ایک کتابچہ "فصل الخطاب في المرأة والحجاب" لکھا ہے، اس میں انھوں نے ایک جگہ پہلے سورت نور میں وارد شدہ تعلیمات کے حوالے سے ثابت کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسلامی معاشرے کی طہارت و پاکیزگی کو برقرار رکھنے اور اسے زنا جیسی فحاشی و غلاظت سے پاک رکھنے کے لیے بارہ متعدد وسائل بتائے ہیں، جن میں سے ایک یہ پردہ بھی ہے اور یہ وسیلہ محض ایک عام سا وسیلہ ہی نہیں بلکہ مذکورہ غرض کے لیے سب سے زیادہ مفید اور قوی تر وسیلہ ہے، جسے اگر اللہ تعالیٰ نے نہ بھی نازل کیا ہوتا تو بھی عقل اسے ضرور واجب قرار دے دیتی۔

پھر آگے چل کر "وُجُوبُ الْحِجَابِ عَلَى الْمَرْأَةِ الْمُسْلِمَةِ" کا عنوان قائم کر کے حجاب کے بارے میں لکھا ہے:

"فَإِنَّهٗ وَاجِبٌ عَلَى الْمَرْأَةِ الْمُسْلِمَةِ وُجُوبًا عَيْنًا لَا يَسَعُهَا تَرْكُهَا بِحَالٍ مَّا دَامَتْ لَمْ تَقْعُدْ عَنِ الْحَيْضِ وَالْحَمْلِ وَالنِّكَاحِ"[1]

"یہ حجاب و پردہ مسلمان عورت پر فرض عین ہے اور اسے وہ کسی بھی حال میں ترک نہیں کر سکتی، سوائے اس کے کہ وہ بڑھاپے کے اس پہر میں جا پہنچے، جہاں حیض و حمل اور نکاح کی طلب سب ختم ہو جاتے ہیں۔"

آگے صرف قرآنِ کریم ہی کے چھے مقامات سے وجوبِ حجاب کے دلائل ذکر کیے ہیں، جو ہم ذکر کر چکے ہیں۔

21 مفتی عالم اسلام شیخ ابن باز رحمہ اللہ:

ایسے ہی دورِ حاضر کے مفتی عالمِ اسلام اور تمام مکاتبِ فکر کے یہاں برابر قابلِ احترام شخصیت شیخ عبدالعزیز ابن باز رحمہ اللہ نے بھی اس موضوع پر ایک مختصر مگر جامع مانع قسم کا مقالہ لکھا ہے، جو "حكم السفور والحجاب" کے عنوان سے مستقل رسالے کی شکل میں بھی شائع ہو چکا ہے اور اس موضوع سے تعلق رکھنے والے رسائل اور کتابچوں کے مجموعے "مجموعة رسائل في الحجاب والسفور"

[1] فصل الخطاب (ص: ٢٦۔ ٣٤)

میں بھی شائع ہوا ہے۔ اس میں موصوف ایک جگہ لکھتے ہیں:

’’مسلمانو! اللہ کے بتائے ہوئے اسلامی آداب کو اپناؤ اور اللہ کا حکم مانو اور اپنی عورتوں پر حجاب لازم کرو، کیونکہ یہ طہارت و پاکیزگی کا سبب اور نجات و سلامتی کا ذریعہ ہے۔‘‘

اللہ تعالیٰ نے سورۃ الاحزاب میں فرمایا ہے:

﴿ يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِكَ وَبَنٰتِكَ وَ نِسَآءِ الْمُؤْمِنِيْنَ يُدْنِيْنَ عَلَيْهِنَّ مِنْ جَلَابِيْبِهِنَّ ذٰلِكَ اَدْنٰٓى اَنْ يُّعْرَفْنَ فَلَا يُؤْذَيْنَ وَ كَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴾ [الأحزاب: ٥٩]

’’اے نبی! اپنی بیویوں، بیٹیوں اور تمام مسلمانوں کی عورتوں سے کہہ دیجیے کہ وہ اپنے اوپر بڑی چادریں اوڑھ لیں، اس طرح یہ زیادہ متوقع ہے کہ وہ پہچانی جائیں گی اور انھیں ستایا نہ جائے گا اور اللہ تعالیٰ بڑا غفور و رحیم ہے۔‘‘

پھر وہ لکھتے ہیں:

’’اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے عام عورتوں کو حکم دیا ہے کہ وہ اپنی چادریں اپنے جسمانی محاسن یعنی بالوں اور چہرے وغیرہ پر ڈال لیں، تاکہ عصمت و عفت والی پاکدامن عورتوں کے طور پر پہچانی جائیں، حتیٰ کہ وہ فتنہ و بگاڑ کا موجب نہ بننے پائیں اور نہ انھیں کوئی چھیڑنے کی جراَت یا ستانے کی جسارت کر سکے اور نہ انھیں کوئی تکلیف پہنچے۔‘‘[1]

موصوف اسی رسالے میں تھوڑا آگے چل کر ایک مقام پر لکھتے ہیں کہ سورۃ النور میں ارشادِ الٰہی ہے:

﴿ وَالْقَوَاعِدُ مِنَ النِّسَآءِ الّٰتِيْ لَا يَرْجُوْنَ نِكَاحًا فَلَيْسَ عَلَيْهِنَّ جُنَاحٌ اَنْ يَّضَعْنَ ثِيَابَهُنَّ غَيْرَ مُتَبَرِّجٰتٍۭ بِزِيْنَةٍ وَّاَنْ يَّسْتَعْفِفْنَ خَيْرٌ لَّهُنَّ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴾ [النور: ٦٠]

’’اور عورتوں میں سے وہ خواتین جو بڑھاپے کی اس منزل کو پہنچ چکی ہوں، جنھیں نکاح کی طلب ہی نہیں رہتی، ان پر کوئی گناہ نہیں کہ وہ اپنی چادر اتار سکتی ہیں، لیکن اس سے ان کا مقصد سنگھار دکھانا نہیں ہونا چاہیے اور اگر وہ حیاداری و عفت مآبی اختیار کریں تو یہ ان

[1] حكم الحجاب والسفور (ص: ٤، ٥) مجموعة الرسائل (ص: ٥٣)

کے لیے بہتر ہے، اللہ سننے والا اور جاننے والا ہے۔‘‘

’’اس ارشادِ الٰہی میں اللہ تعالیٰ نے یہ خبر دی ہے کہ بوڑھی عورتیں جو نکاح کی عمر سے گزر چکی ہیں، ان پر گناہ نہیں ہے کہ وہ اگر اپنا بناؤ سنگھار دکھانے کے چکر میں نہ ہوں تو وہ اپنے ہاتھوں اور چہرے کا پردہ اتار سکتی ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ جو عورت زیب و زینت کی نمایش کے چکر میں ہو، اس کے لیے یہ جائز نہیں کہ وہ اپنے ہاتھوں، چہرے یا جسم کے کسی دوسرے حصے کا پردہ اتار دے، بلکہ اس ارادے سے ایسا کرنا گناہ ہے، چاہے وہ بوڑھی ہی کیوں نہ ہو، کیونکہ مثل مشہور ہے:

’’كُلُّ سَاقِطَةٍ لَهَا لَاقِطَةٌ‘‘ (ہر گری ہوئی چیز کو کوئی نہ کوئی اٹھا ہی لیتا ہے)

پھر زیب و زینت کی نمایش اس عورت کو فتنہ و بگاڑ تک پہنچا دیتی ہے، اگرچہ وہ عورت بوڑھی ہی کیوں نہ ہو۔ جب ایک بوڑھی اور عمر رسیدہ وخزاں دیدہ عورت کا یہ حال ہے تو اگر کوئی جوان وخوبرو عورت ایسے کر لے تو پھر کیا عالم ہوگا؟ بلاشبہہ جوان عورت کے زیب و زینت کی نمایش کرنے سے اس کے فعل کا گناہ بہت ہی بڑا، اس کی سزا بہت ہی زیادہ اور اس کے اس فعل سے پیدا ہونے والا فتنہ و بگاڑ فزوں تر ہوگا۔‘‘[1]

کسی شخص کی طرف سے وارد ہونے والے ایک استفتا یا سوال کا جواب دیتے ہوئے اپنے ایک فتوے میں شیخ ابن باز رحمہ اللہ نے لکھا ہے:

’’تمھارے لیے اور کسی بھی دوسری عورت کے لیے یہ جائز نہیں کہ وہ غیر مسلم ممالک میں یا مسلم ممالک میں بے پردہ نکلے، بلکہ مسلم یا کافر غیر محرم مردوں سے حجاب و پردہ واجب ہے۔‘‘

حجاب سے موصوف کی مراد چہرے کا حجاب و پردہ ہے، کیونکہ سوال کرنے والی خاتون کے الفاظ اس بات کی دلیل ہیں، اس نے سوال ہی یہ کیا تھا کہ غیر ممالک میں سفر کے دوران میں کیا میں منہ ننگا کر لوں اور حجاب اتار پھینکوں؟[2]

موصوف نے اپنے متعدد فتاویٰ میں اس بات کی صراحت کی ہے کہ عورت کا شرعی حجاب وہی ہے، جس میں اس کے سارے جسم کے ساتھ ساتھ سر کے بال، ہاتھ اور چہرہ بھی پردے میں ہو۔[3]

---

[1] حكم الحجاب والسفور (ص: ٤، ٥) مجموعة الرسائل (ص: ٥٤، ٥٥)

[2] دیکھیں: فتاویٰ ابن باز (١/ ١٨٩) كتاب الدعوة، مؤسسة الدعوة، الرياض.

[3] فتاویٰ اسلامیہ (٣/ ٢١٠) طبع دار القلم، بيروت.

اس سلسلے میں کئی دیگر مفتی حضرات اور علماے کرام کے اقوال و فتاویٰ نقل کیے جا سکتے ہیں، لیکن اب ہم انھی پر اکتفا کرتے ہیں، تاکہ اب کچھ وقت ہم دوسرے فریق کے دلائل اور ان کے تجزیے کو بھی دے سکیں، جن کے نزدیک ہاتھ اور چہرہ ستر نہیں۔

فریقِ ثانی کے دلائل اور ان کا تجزیہ

دوسرے فریق سے تعلق رکھنے والے حضرات کے نزدیک یہ نہیں کہ پردہ کرنا ہی نہیں چاہیے، بلکہ ان کا کہنا ہے کہ چہرے اور ہاتھوں کو مقامِ ستر میں شمار نہ کیا جائے اور چہرے کے پردے کو واجب قرار نہ دیا جائے، البتہ سلف صالحین کے طریق پر چلتے ہوئے چہرے کا بھی پردہ کیا جائے تو یہ افضل ہے۔

ان کا استدلال بھی قرآن وسنت میں وارد بعض نصوص ہی سے ہے، جن کے بارے میں دو حرفی فیصلہ تو بعض اہلِ علم نے یہ دیا ہے کہ ان کے دلائل یا تو سنداً صحیح نہیں، اگرچہ لفظاً صریح ہیں، لہٰذا وہ قابلِ حجت و استدلال نہیں ہیں، یا پھر کچھ دلائل ایسے ہیں جو سند کے اعتبار سے تو صحیح ہیں، لیکن ان میں اس بات کی صراحت نہیں کہ چہرہ اور ہاتھ مقامِ ستر نہیں، یعنی وہ صحیح تو ہیں مگر صریح نہیں۔ اس فریق کے دلائل پر اس مجمل سے تبصرے کے بعد اب آیئے ان کے دلائل کا مطالعہ کریں۔

پہلی دلیل:

اس سلسلے میں ان کی پہلی دلیل سورۃ النور کی آیت (۳۱) کے الفاظ ﴿اِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا﴾ سے تعلق رکھنے والی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی تفسیر ہے۔ چہرے کے پردے کا موضوع شروع کرتے وقت بھی ہم نے ذکر کیا تھا کہ آیتِ نور کے الفاظ ﴿اِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا﴾ سے فریقین ہی نے استدلال کیا ہے، البتہ فریقِ اول نے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی تفسیر لی ہے، جس کی تائید دیگر آیات و احادیث سے بھی ہوتی ہے، جبکہ فریقِ ثانی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما والی تفسیر پر بنیاد رکھی ہے اور اس کی تائید میں بعض دیگر روایات بھی پیش کی ہیں۔

غرض کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے نزدیک ﴿وَلَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ اِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا﴾ [النور: ۳۱] ”عورتیں اپنی زینت ظاہر نہ کریں، سوائے اس کے خود بخود ظاہر ہو یا ظاہر ہو جائے۔“

''خود بخود ظاہر ہو''، اس سے مراد چہرہ اور ہاتھ لیے گئے ہیں، جیسا کہ سنن کبریٰ بیہقی میں حضرت سعید بن جبیر حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بیان کرتے ہیں کہ انھوں نے ان الفاظِ قرآنیہ کی تفسیر میں فرمایا:

''مَا فِي الْوَجْهِ وَالْكَفَّيْنِ'' ''جو کچھ چہرے پر اور ہاتھوں میں ہے۔''

امام ابن جریر طبری رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر میں حضرت سعید بن جبیر ہی کے حوالے سے نقل کیا ہے کہ آیتِ نور کے ان الفاظ کی تفسیر میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا:

«اَلْكُحْلُ وَالْخَاتَمُ»[1]

''(جو خود بخود ظاہر ہو جائے) اس سے مراد سرمہ اور انگوٹھی ہے۔''

گویا کبھی ﴿إِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا﴾ کی تفسیر چہرے اور ہاتھ اور کبھی سرمے اور انگوٹھی اور کبھی ان سب اعضا و اشیا سے کی ہے۔

اسے بنیاد بنا کر فریقِ ثانی کا کہنا ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما جنھیں ''ترجمان القرآن'' اور ''حبرِ امت'' کہا جاتا ہے، ان کے نزدیک جب مراد یہ اعضا ہیں تو ان کا پردہ ان کے مقاماتِ ستر میں سے نہ ہونے کی وجہ سے واجب نہ ہوا اور صحابی کی تفسیر حجت ہوتی ہے۔

پھر فریقِ ثانی کا کہنا ہے کہ سورت نور کی آیت (۳۰) میں ارشادِ الٰہی ہے:

﴿ قُلْ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ ﴾ [النور: ۳۰]

''مسلمانوں سے کہہ دیجیے کہ وہ اپنی نگاہیں نیچی رکھیں۔''

ان الفاظ میں ان کے بقول اس بات کی طرف اشارہ پایا جاتا ہے کہ عورت کے جسم کا کوئی نہ کوئی حصہ تو کھلا رہتا ہوگا، جس کی طرف نظر کا جانا ممکن ہے، لہٰذا اللہ تعالیٰ نے مومن مردوں کو حکم فرمایا کہ وہ اپنی نگاہیں جھکا کر رکھیں اور وہ کھلا حصہ چہرے اور ہاتھوں کے سوا کوئی اور نہیں ہے، اس طرح اس فریقِ ثانی نے چہرے اور ہاتھوں کو مقامِ ستر سے خارج قرار دیتے ہوئے ان کا پردہ واجب نہیں صرف افضل سمجھا ہے۔

---

[1] تفسير الطبري (١٨/ ٨٤) تفسير ابن كثير (٣/ ٢٨٣) و اللباب (ص: ٨٣، ٥٧) و نقل عن السندي أن أسناده ضعيف جداً بل منكر.

تجزیہ:

ہم یہاں آپ کو یاد دلا دیں کہ ان الفاظ ﴿اِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا﴾ کی تفسیر حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ اور متعدد تابعین و اہلِ علم رحمہم اللہ سے ہم بالتفصیل ذکر کر چکے ہیں کہ ﴿اِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا﴾ سے مراد عورت کے کپڑے ہیں نہ کہ بعض اعضاے جسم، جیسا کہ ''أضواء البیان'' میں علامہ شنقیطی رحمہ اللہ نے زینت پر لغوی و اصولی بحث کرتے ہوئے تفسیرِ ابن مسعود رضی اللہ عنہ ہی کو ترجیح دی ہے۔[1]

یہاں ہم ان تفسیری تفصیلات کا اعادہ کرنا تحصیلِ حاصل سمجھتے ہیں، لہٰذا اس سے صرفِ نظر کرتے ہوئے فریقِ ثانی کی اس دلیل کا تجزیہ پیش کرتے ہیں، یا بالفاظِ دیگر تفسیرِ ابن عباس رضی اللہ عنہما کا مختلف وجوہ سے جائزہ لیتے ہیں:

1. حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی مراد یہ ہے کہ نزولِ حجاب سے پہلے عورتوں کی حالت یہ ہوتی تھی کہ وہ چہرہ اور ہاتھ ننگے رکھتی تھیں اور جب حکمِ حجاب نازل ہوگیا تو چہرے کا پردہ بھی واجب ہوگیا۔

اہلِ علم و تحقیق میں سے شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ اور دورِ حاضر کے محققین میں سے شیخ ابن باز اور شیخ محمد صالح عثیمین رحمہما اللہ نے بھی امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کا موقف ہی اختیار کیا ہے، چنانچہ موصوف ﴿اِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا﴾ کے بارے میں حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی تفسیر کہ اس سے مراد عورت کے کپڑے ہیں اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی تفسیر کہ اس سے مراد چہرہ اور ہاتھ ہیں، ان ہر دو کے اقوال ذکر کرنے کے بعد اپنی تحقیق پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''فَابْنُ مَسْعُوْدٍ ذَكَرَ آخِرَ الْأَمْرَيْنِ وَابْنُ عَبَّاسٍ ذَكَرَ أَوَّلَ الْأَمْرَيْنِ''[2]

''حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے نزولِ حجاب کے بعد کی حالت ذکر کی ہے اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے نزولِ حجاب سے پہلے کی حالت بیان کی ہے۔''

لہٰذا یہ تفسیر حجت نہ ہوئی۔ یہ امر کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اس تفسیر میں نزولِ حجاب سے پہلے کی حالت بیان کی ہے، اس کی دلیل یہ بھی ہے کہ ان ہی سے نزولِ حجاب کے بعد کی حالت کے

---

[1] أضواء البیان (٦/ ١٩٨۔ ٢٠٢)

[2] دیکھیں: حجاب ابن تیمیه تحقیق الألباني (ص: ١٥، ١٨) مجموع الفتاویٰ (٢٢/ ١٠٩) حکم السفور والحجاب لابن باز (ص: ٨، ٩) والمرأة المسلمة لابن عثیمین (ص: ٢٥، ٣١، ٣٢)

بارے میں بھی ایک اثر مروی ہے، جس میں تفسیر طبری کے مطابق علی بن ابوطلحہ بیان کرتے ہیں کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا:

''أَمَرَ اللّٰهُ نِسَآءَ الْمُؤْمِنِيْنَ إِذَا خَرَجْنَ مِنْ بُيُوْتِهِنَّ فِيْ حَاجَةٍ أَنْ يُّغَطِّيْنَ وَجُوْهَهُنَّ مِنْ فَوْقِ رُؤُوْسِهِنَّ بِالْجَلَابِيْبِ وَيُبْدِيْنَ عَيْنًا وَّاحِدَةً'' [1]

''اللہ نے مومن عورتوں کو حکم دیا ہے کہ جب وہ کسی کام سے اپنے گھروں سے نکلیں تو اپنے سروں کا کپڑا لٹکا کر اپنے چہروں کا پردہ کرلیں اور صرف (راستہ دیکھنے کے لیے) ایک آنکھ ننگی رہنے دیں۔''

طبری کے روایت کردہ اس اثر کی سند پر بھی بعض کبار محدثین کرام نے کلام کیا ہے اور اسے ضعیف قرار دیا ہے۔ [2]

غرض کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی چہرے اور ہاتھوں والی تفسیر کی ایک توجیہ یہ ہوسکتی ہے کہ اس اثر میں انھوں نے نزولِ حجاب سے پہلے کی حالت کا تذکرہ کیا ہے۔ [3]

2 حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی اس تفسیر کی دوسری توجیہ یہ بھی ممکن ہے کہ اس تفسیر میں ان کی مراد وہ زینت ہو جس کو ظاہر کرنے کی ممانعت وارد ہوئی ہے، جیسا کہ امام ابن کثیر رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر القرآن میں ذکر کیا ہے، چنانچہ امام ابن کثیر رحمہ اللہ، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی ﴿إِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا﴾ سے مراد تفسیر یعنی چہرہ، ہاتھ اور انگوٹھی بیان کرنے اور اس سے ملتے جلتے الفاظ کے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما اور حضرت عطا، عکرمہ، سعید بن جبیر، ابوشعثاء، ضحاک اور ابراہیم نخعی رحمہم اللہ وغیرہ اہلِ علم سے بھی ملنے کا تذکرہ کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

''وَهٰذَا يَحْتَمِلُ أَنْ يَّكُوْنَ تَفْسِيْراً لِّلزِّيْنَةِ الَّتِيْ نُهِيْنَ عَنْ إِبْدَآئِهَا'' [4]

''احتمال ہے کہ یہ اس زینت کی تفسیر ہو جس کا اظہار کرنا عورتوں کے لیے منع کیا گیا ہے۔''

---

[1] تفسير الطبرى (٢٢/ ٣٣) حجاب الألباني (ص: ٤١) حاشيه، و حكم السفور والحجاب لابن باز (ص: ٨، ٩) والمرأة المسلمة، للعثيمين (ص: ١٤، ١٥) تفسير ابن كثير (٣/ ٥١٨)

[2] الحجاب للألباني.

[3] وقد تكلم عليه الألباني في تعليقه على حجاب ابن تيمية (ص: ١٨، ١٩)

[4] تفسير ابن كثير (٣/ ٢٨٣) دار المعرفة بيروت، المرأة المسلمة للعثيمين (ص: ٣٢)

جیسا کہ امام ابو اسحاق سبیعی نے ابو الاحوص کے طریق سے حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ سے بیان کیا ہے۔

اس احتمال کی تائید بھی اُسی اثر سے ہوتی ہے جو تفسیر طبری کے حوالے سے ابھی ہم نے ذکر کیا ہے کہ خود ابن عباس رضی اللہ عنہما نے چہرے کا پردہ کرنے اور صرف ایک آنکھ ننگی رکھنے کو مومن عورتوں کے لیے اللہ کا حکم قرار دیا ہے۔

3 حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی تفسیر کے بارے میں ان ہر دو احتمالات میں سے اگر کسی ایک کو بھی تسلیم نہ کیا جائے تو پھر یہ کہنا پڑے گا کہ ان کی یہ تفسیر حجت ہی نہیں، جسے قبول کرنا واجب ہو، کیونکہ ان کی یہ تفسیر صرف اس شکل میں واجب القبول حجت ہوتی، جب اس کا معارض و مخالف دوسرا کوئی قول نہ ہو اور جب دو صحابیوں رضی اللہ عنہما سے الگ الگ تفسیر مروی ہے تو پھر ترجیح اسے ہی دی جا سکتی ہے، جسے دوسرے خارجی دلائل قابلِ ترجیح قرار دیں اور اس مسئلے میں ایسا ہی ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی تفسیر مختلف ہے، انھوں نے ﴿اِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا﴾ کی تفسیر چہرے اور ہاتھوں کے بجائے چادر اور کپڑوں سے کی ہے۔ لہٰذا ان دونوں صحابۂ کرام رضی اللہ عنہما کی تفسیروں میں سے جو راجح تر ہے، اس پر عمل کرنا واجب ہے اور راجح تر تفسیر حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ ہی کی ہے، جیسا کہ اس کی تفصیل فریقِ اول کے دلائلِ قرآنیہ میں سے دلیلِ اول کے ضمن میں ذکر کی جا چکی ہے اور انھی کی تفسیر اسلامی تعلیمات سے قریب تر ہے اور اسی میں فحاشی کا سدِ باب اور معاشرے کی اصلاح و طہارت کا راز پنہاں ہے۔

رفعِ اشکال

اب رہا اس اشکال کا حل کہ اللہ تعالیٰ نے سورت نور میں جو مومن مردوں کو حکم فرمایا ہے:

﴿ قُلْ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ ﴾ [النور: ۳۰]

''مومنوں سے کہہ دیجیے کہ وہ اپنی نگاہیں جھکا کر رکھیں۔''

تو ان الفاظ سے بلا وجہ ایک اشکال پیدا کر لیا گیا ہے کہ جب مومنوں کو نظریں نیچی رکھنے کا حکم دیا گیا ہے تو اس سے پتا چلتا ہے کہ عورتوں کے جسم کا کوئی نہ کوئی حصہ تو ننگا رہتا ہی ہوگا، جس سے نظریں نیچے رکھنے کا حکم دیا گیا ہے۔ یہ دراصل بلا وجہ کا پیدا کردہ ایک اشکال ہے، ورنہ درحقیقت ان

الفاظ سے ایسا کوئی مفہوم کشید کرنے کی کوئی گنجایش نہیں اور نہ اکثر اہلِ علم میں سے کسی نے کیا ہے، بلکہ علماے تفسیر نے لکھا ہے کہ یہ حکم عام ہے، تاکہ اگر کسی عورت کا چہرہ بے توجہگی کی وجہ سے ننگا ہو اور کسی کی نظر پڑ جائے تو وہ اپنی نگاہیں جھکا لے یا پھر کوئی عورت نافرمانی پر اتر آئی ہو اور وہ زیب و زینت کی نمایش کر رہی ہو اور ایسے بے پردہ و نیم عریاں حالت میں ہو تو نظر پڑتے ہی جھکا لیں، تاکہ اس کے حسنِ آوارہ کے فتنوں سے بچا جا سکے۔

دوسری دلیل

فریقِ ثانی کی دوسری دلیل وہ حدیث ہے جو سنن ابی داود اور سنن کبریٰ بیہقی میں ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے، جس میں وہ بیان کرتی ہیں کہ (ان کی بہن) حضرت اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہا نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئیں، جبکہ وہ باریک کپڑے کا لباس پہنے ہوئے تھیں تو نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے اعراض کیا۔ (اس حدیث میں نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کیا گیا ہے کہ) آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«يَا أَسْمَاءُ! إِنَّ الْمَرْأَةَ إِذَا بَلَغَتِ الْمَحِيضَ لَمْ يَصْلُحْ لَهَا أَنْ يُّرىٰ مِنْهَا إِلَّا هٰذَا وَهٰذَا، وَأَشَارَ إِلٰى وَجْهِهٖ وَكَفَّيْهِ»[1]

''اے اسماء! جب کوئی عورت بالغ ہوجائے تو اس کے لیے یہ صحیح نہیں ہے کہ اس کے اعضائے جسم میں سے اس اور اس کے سوا کچھ نظر آئے۔ یہ کہتے ہوئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے چہرۂ اقدس اور دونوں ہاتھوں کی طرف اشارہ فرمایا۔''

فریقِ ثانی کا کہنا ہے کہ اس حدیث کی رو سے عورت کے لیے جائز ہے کہ وہ چہرہ اور ہاتھ ننگے رکھ لے اور یہ اعضا مقامِ ستر نہیں ہیں۔

جائزہ:

یہ دلیل اگر صحیح سند سے مروی ہوتی تو اس اختلافی مسئلے میں فیصلہ کن ثابت ہوتی، جبکہ حقیقت اس کے برعکس ہے۔ محدّثینِ کرام نے اس کی سند پر کلام کیا ہے اور اسے کئی وجوہات کی بنا پر ضعیف قرار دیا ہے۔ خود امام ابو داود رحمہ اللہ اس حدیث کو ''کتاب اللباس، باب فيما تبدی المرأة من زينتها''

---

[1] سنن أبي داود مع العون (١١/ ١٦١) سنن البيهقي (٢/ ٢٨٢، ٢٨٣) و (٧/ ٧٦) الحجاب للألباني (ص: ٢٣، ٢٤) و تفسير القرطبي (١٢/ ٢٢٩)

میں روایت کرنے کے بعد فرماتے ہیں:

"هٰذَا مُرْسَلٌ، خَالِدُ بْنُ دُرَيْكٍ لَمْ يُدْرِكْ عَائِشَةَ"[1]

"یہ روایت مرسل ہے، کیونکہ اسے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کرنے والے راوی خالد بن دریک نے انھیں نہیں پایا۔"

جب خالد نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو نہیں پایا، مگر بلا واسطہ ان سے روایت بیان کر دی ہے تو اس کا معنیٰ یہ ہوا کہ یہاں خالد اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے مابین انقطاع پایا جاتا ہے، لہٰذا یہ سند منقطع ہے اور حدیث مرسل اور ضعیف ہے۔

امام بیہقی نے بھی اس حدیث کو سنن کبریٰ میں دو مقامات پر روایت کیا ہے اور انھوں نے بھی امام ابو داود رحمہ اللہ سے اس کا مرسل ہونا نقل کیا ہے۔ امام ابن کثیر رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر میں اس حدیث کو وارد کرنے کے بعد لکھا ہے:

"اسے امام ابو داود اور ابو حاتم رازی رحمہ اللہ نے مرسل کہا اور بتایا ہے کہ خالد بن دریک نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے کوئی حدیث نہیں سنی۔ واللہ اعلم۔"[2]

محدّثِ کبیر حافظ عبدالحق اشبیلی اور حافظ ابن حجر عسقلانی نے بھی یہی بات کہی ہے اور اس سند میں قتادہ کا خالد بن دریک سے عنعنہ بھی ہے، جبکہ وہ مدلس ہے۔[3]

اس روایت کے ضعف کا دوسرا سبب یہ ہے کہ تلخیص السنن میں امام منذری رحمہ اللہ نے کہا ہے:

"اس حدیث کی سند میں ایک راوی سعید بن بشیر ہے، جو نزیلِ دمشق اور بنی نصر کا آزاد کردہ غلام ابو عبدالرحمٰن سعید بن بشیر النصری ہے، اس پر کئی محدّثین نے کلام کیا ہے۔"[4]

امام ابن مہدی نے اس راوی کو متروک شمار کیا ہے اور امام احمد، ابن معین، امام بخاری کے استاد ابن المدینی اور امام نسائی رحمہم اللہ نے اس راوی کو ضعیف کہا ہے۔[5]

---

[1] سنن أبي داود مع العون (١١/ ١٦٢)

[2] تفسير ابن كثير (٣/ ٢٨٣)

[3] جامع التحصيل في أحكام المراسيل للعلائي (١/ ٣٦٣) و تهذيب التهذيب (٣/ ٨٧) واللباب (ص: ٣٩) حكم السفور والحجاب لابن باز (ص: ٩)

[4] عون المعبود (١١/ ١٦٢)

[5] المرأة المسلمة للعثيمين (ص: ٣٢)

حافظ ابو بکر جرجانی رحمہ اللہ نے اس حدیث کے بارے میں ذکر کیا ہے:

''میرے علم کے مطابق اس روایت کو قتادہ سے سعید بن بشیر کے سوا کسی نے بیان نہیں کیا اور وہ کبھی تو خالد بن دریک عن عائشہ رضی اللہ عنہا کہتے ہیں اور کبھی عن ام سلمہ رضی اللہ عنہا کہتے ہیں۔''[1]

یہی وجہ ہوگی کہ محدّثینِ کرام نے ان کے حافظے پر بطورِ خاص کلام کیا ہے، جیسا کہ امام بخاری رحمہ اللہ سے شیخ عبدالقادر حبیب اللہ السندی نے نقل کیا ہے۔ انھوں نے علامہ ذہبی رحمہ اللہ سے نقل کیا ہے کہ انھوں نے اس راوی کو منکر الحدیث قرار دیا ہے، پھر عبداللہ بن نمیر کا قول نقل کیا ہے، جس میں وہ کہتے ہیں کہ سعید بن بشیر قتادہ سے منکر روایات بیان کرتا ہے۔ امام ابو زرعہ نے الضعفاء میں کہا ہے:

''لَا یُحْتَجُّ بِہٖ'' (یہ قابلِ حجت راوی نہیں) یہی بات ابو حاتم رازی نے بھی کہی ہے۔[2]

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے تقریب التہذیب میں سعید بن بشیر کو ضعیف قرار دیا ہے اور اس سند میں قتادہ کا خالد بن دریک سے عنعنہ بھی ہے، جبکہ وہ مدلس ہے۔[3]

ڈاکٹر یوسف القرضاوی نے اپنی کتاب ''الحلال والحرام في الإسلام'' میں زیرِ بحث حدیث نقل کرنے کے بعد لکھا ہے:

''اس حدیث میں تو ضعف پایا جاتا ہے، البتہ اسے بعض وہ احادیث تقویت پہنچاتی ہیں جو بگاڑ سے امن کی شکل میں چہرے اور ہاتھوں کو دیکھنے کی اباحت کا پتا دیتی ہیں۔''[4]

جبکہ ان کا تعاقب کرتے ہوئے شیخ صالح الفوزان نے ''الإعلام'' میں لکھا ہے:

''ہم موصوف سے مطالبہ کرتے ہیں کہ اس حدیث کو تقویت پہنچانے والی جن صحیح احادیث کا انھوں نے دعویٰ کیا ہے، ان کا تعین کریں اور وہ حدود بتائیں جن میں فتنہ و بگاڑ سے امن میں رہا جا سکتا ہو اور وہ بھی اجنبی و غیر محرم عورت کو دیکھتے وقت۔''[5]

---

[1] عون المعبود (١١/ ١٦٢)

[2] اللباب (ص: ٣٩) أضواء البيان للشنقيطي (٦/ ٥٩٧)

[3] تقريب التهذيب (ص: ١٥٤، طبع نشر السنة، لاهور) حكم السفور والحجاب لابن باز (ص: ٩)

[4] الحلال والحرام (ص: ١٥١)

[5] الإعلام (ص: ٦٥، ٦٦) اردو ترجمه (ص: ٦٢، ٦٣)

شواہد:

اسی مذکورہ حدیث کو ''غاية المرام في تخريج أحاديث الحلال و الحرام'' میں شیخ البانی نے شواہد کی بنا پر حسن قرار دیا ہے اور عہدِ نبوی میں خواتینِ اسلام کے عمل کو بھی اس کا شاہد و مؤید باور کروایا ہے، جس کی حقیقت کچھ تو فریقِ اول کے دلائل کے ضمن میں گزر چکی ہے اور اس دعوے کا کھوکھلا پن فریقِ ثانی کے دلائل کے جائزے کے ضمن میں بھی ظاہر ہوجائے گا۔

لیکن آیئے پہلے ان شواہد کو دیکھیں جن کی طرف شیخ موصوف نے ''غاية المرام'' میں اشارہ کیا ہے اور اپنی دوسری کتاب ''حجاب المرأة المسلمة'' میں تفصیل ذکر کی ہے۔ وہاں حاشیے پر انھوں نے مذکورہ حدیث کے ضعف پر دلالت کرنے والا امام ابو داود اور حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کا کلام نقل کرنے کے بعد لکھا ہے کہ یہ حدیث بعض دوسرے طُرق سے بھی مروی ہے، جن سے یہ قوت اختیار کر جاتی ہے۔

پہلا شاہد:

ان میں سے پہلا طریق مراسیل ابی داود میں ہے، جس میں قتادہ رحمہ اللہ بیان کرتے ہیں کہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

« إِنَّ الْجَارِيَةَ إِذَا حَاضَتْ لَمْ يَصْلُحْ أَنْ يُّرٰى مِنْهَا إِلَّا وَجْهُهَا وَيَدَاهَا إِلٰى الْمِفْصَلِ »[1]

''لڑکی جب بالغ ہوجائے تو اس کے چہرے اور گٹوں تک ہاتھوں کے سوا اس کے جسم کا کوئی حصہ نظر آنا ٹھیک نہیں ہے۔''

یہ حدیث مرسل ہے، جو اقسامِ ضعیف میں سے ایک ہے۔

عدمِ حجیتِ مراسیل:

مرسل حدیث ضعیف احادیث کی اقسام میں سے ایک ہے، جو نا قابلِ حجت و استدلال ہوتی ہے، جیسا کہ علامہ ابن حزم نے اپنی کتاب ''الإحكام في أصول الأحكام'' (۲/ ۱۶۹) میں لکھا ہے:

[1] الدر المنثور للسيوطي (٥/ ٤٢) الحجاب للألباني (ص: ٢٤) مراسيل أبي داود (ص: ۱۷۵، طبع معهد الشريعة الصناعة كوٹ ادو و ابن تيمية اكيڈمی، لاهور، بتحقيق مولانا محمد عبده الفلاح)

’’مرسل وہ حدیث ہوتی ہے، جس کی سند کے رواۃ میں سے نبیِ اکرم ﷺ اور رواۃ کے مابین سے ایک یا زیادہ راوی ساقط ہوں، اسے ہی منقطع بھی کہا جاتا ہے۔ ایسی حدیث غیر مقبول ہوتی ہے اور اس سے حجت قائم نہیں ہوتی، کیونکہ اس کی سند کا ساقط شدہ راوی مجہول ہوتا ہے۔‘‘

امام مسلم رحمہ اللہ نے مقدمہ صحیح مسلم میں لکھا ہے:

’’اَلْمُرْسَلُ مِنَ الرِّوَايَاتِ فِيْ أَصْلِ قَوْلِنَا وَقَوْلِ أَهْلِ الْعِلْمِ بِالْأَخْبَارِ لَيْسَ بِحُجَّةٍ‘‘[1]

’’مرسل روایت ہمارے اور علمِ حدیث کے ماہرین علما کے بقول حجت نہیں ہے۔‘‘

اس موضوع کی تفصیل متعلقہ کتب میں دیکھی جا سکتی ہے۔[2]

دوسرا شاہد:

زیرِ بحث حدیثِ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو تقویت پہنچانے والی جو دوسری حدیث یا اس حدیث کا دوسرا طریق ذکر کیا گیا ہے، وہ سنن کبریٰ بیہقی میں ہے، جس میں حضرت اسماء بنت عمیس رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ نبیِ اکرم ﷺ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس تشریف لائے تو ان کے پاس ان کی بہن حضرت اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہا بیٹھی تھیں، جو شامی کپڑے کا کھلی کھلی آستینوں والا لباس پہنے ہوئے تھیں۔ جب آپ ﷺ نے ان کی طرف دیکھا تو اٹھ کر باہر چلے گئے، اس پر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے کہا: ایک طرف ہو جاؤ، نبیِ اکرم ﷺ نے کوئی ایسی چیز دیکھی ہے جو آپ ﷺ کو ناپسند ہے۔ وہ ایک طرف ہو کر جا بیٹھیں، نبیِ اکرم ﷺ جب گھر میں دوبارہ داخل ہوئے تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے پوچھا کہ آپ ﷺ اُٹھ کیوں گئے تھے؟ آپ ﷺ نے فرمایا:

’’تم اس (اسماء) کی حالت نہیں دیکھ رہی ہو؟‘‘ پھر فرمایا:

’’إِنَّهٗ لَيْسَ لِلْمَرْأَةِ الْمُسْلِمَةِ أَنْ يَّبْدُوْ مِنْهَا إِلَّا هٰذَا وَ هٰذَا‘‘

---

[1] مقدمه مراسيل أبي داود للفلاح (ص: ٥) صحيح مسلم مع شرح النووي (١/ ١٣٢)

[2] مقدمه مراسيل أبي داود للفلاح (ص: ٥، ٨)

”کسی مسلمان عورت کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ اس کے اعضائے جسم میں سے اس اور اس کے سوا کچھ ظاہر ہو۔“

پھر آپ ﷺ نے دونوں ہاتھوں کے ساتھ سمجھایا کہ چہرہ اور یہاں تک ہاتھوں کے سوا۔ اس حدیث کو بیان کرنے کے بعد خود امام بیہقی رحمہ اللہ ہی نے کہا ہے:

”وَإِسْنَادُهُ ضَعِيفٌ“ ”اس کی سند ضعیف ہے۔“

البتہ انھوں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور بعض دیگر صحابہ رضی اللہ عنہم کے زینتِ ظاہرہ سے متعلق آثار (کہ وہ چہرہ اور ہاتھ ہیں) کو نقل کر کے لکھا ہے:

”ان آثار کے ساتھ مل کر بات قوی ہو جاتی ہے۔“ نیز تہذیب سنن بیہقی میں علامہ ذہبی رحمہ اللہ نے امام بیہقی رحمہ اللہ کی موافقت کی ہے۔[1]

سنن بیہقی کی حضرت اسماء بنت عمیس رضی اللہ عنہا سے مروی اس حدیث کو مجمع الزوائد میں علامہ ہیثمی رحمہ اللہ نے طبرانی کبیر اور اوسط کی طرف منسوب کیا اور کہا ہے کہ اس کی سند میں ایک راوی ابن لہیعہ ہے، جس کی حدیث حسن ہے اور دیگر تمام رواۃ صحیح کے رواۃ ہیں۔

یہ علامہ ہیثمی رحمہ اللہ کے الفاظ ہیں، جبکہ یہ ابن لہیعہ عام محدّثینِ کرام کے نزدیک معروف متکلم فیہ راوی ہے، بہر حال یہ دو طریق تو ”حجاب المرأة المسلمة“ کے مولف نے نقل کیے ہیں۔

تیسرا شاہد:

جبکہ اس حدیث کا ایک اور طریق تفسیر ابن جریر طبری میں بھی مروی ہے، اس میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں:

”دَخَلَتْ عَلَيَّ ابْنَةُ أَخِي لِأُمِّي عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ طُفَيْلٍ مُزَيَّنَةً فَدَخَلَ النَّبِيُّ ﷺ فَأَعْرَضَ عَنْهَا“

”ماں کی طرف سے میرے بھائی عبداللہ بن طفیل کی بیٹی زیب و زینت کیے میرے پاس آئیں، نبیِ اکرم ﷺ تشریف لائے تو آپ ﷺ نے اس سے اعراض کیا۔“

آگے آپ ﷺ کی طرف ویسے ہی الفاظ منسوب کیے گئے ہیں، جیسے حضرت اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہما

[1] التهذيب (١/ ٣٨) بحواله حجاب الباني (٢٤، ٢٥)

والی حدیث میں گزرے ہیں۔[1]

اس طریق کے بارے میں علامہ ڈاکٹر عبدالقادر سندھی لکھتے ہیں کہ اس طریق کی سند تین وجوہات کی بنا پر سخت ضعیف ہے:

① اس کی سند کا ایک راوی حسین، جس کا نام سعید بن داود المصیصی المحتسب ہے، اسے امام ابو داود ونسائی نے ضعیف و غیر ثقہ قرار دیا ہے، نیز علامہ ذہبی رحمہ اللہ نے اسے اپنی کتاب "دیوان الضعفاء والمتروکین" میں وارد کیا ہے۔[2]

② اس کی سند کے ضعیف ہونے کا دوسرا سبب ایک دوسرا راوی حجاج بن محمد الاعور المصیصی بھی ہے، جو اختلاطِ فاحش میں مبتلا ہوگئے تھے اور جب ابن معین نے اختلاط کرتے دیکھا تو اس کے بیٹے سے کہا: "لَا یَدْخُلُ عَلَیْهِ أَحَدٌ" (کوئی شخص اس سے حدیث سننے اور لکھنے کے لیے اس کے پاس نہ آئے)

③ تیسرا سبب اس روایت کی سند میں پایا جانے والا انقطاع ہے، کیونکہ یہ واقعہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے ابن جریج نے بیان کیا ہے، حالانکہ انھوں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو نہیں پایا اور اس پر مستزاد یہ ہے کہ ابن جریج پر تدلیس التسویۃ کا الزام ہے، جو تدلیس کی بدترین قسم ہے۔ حافظ صلاح الدین علائی نے "جامع التحصیل في أحکام المراسیل" (۲/ ۵۳۸) میں امام بخاری کے استاد ابن المدینی کے حوالے سے لکھا ہے کہ ابن جریج کسی ایک بھی صحابی سے نہیں ملے۔[3]

فنی نقطۂ نظر سے ان طُرق کی یہ حالت ہے اور اب آیئے آپ کو ان کے بارے میں بعض کبار محدّثین کا فیصلہ سنائیں۔

فیصلہ:

فریقِ ثانی نے دوسری دلیل کے طور پر حضرت اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہما کے واقعے پر مشتمل سنن ابو داود وبیہقی والی حدیث پیش کی ہے اور اس کے ضعف کی کچھ تفصیل تو گزر چکی ہے، اس کے بارے میں

---

[1] تفسیر الطبري (۱۸/ ۱۱۹)

[2] دیکھیں: میزان الاعتدال (۲/ ۲۲۶)

[3] دیکھیں: اللباب (ص: ۴۱، ۴۲)

امام ابو حاتم رازی کہتے ہیں:

''یہ روایت تو متابعات اور شواہد کے طور پر پیش کیے جانے کے قابل بھی نہیں، چہ جائیکہ یہ محدّثینِ کرام کے نزدیک حجت و دلیل بننے کا مقام حاصل کر سکے، اس کی سند کا یہ حال ہے تو چہرے اور ہاتھوں کے مقامِ ستر نہ ہونے کی دلیل کیا بن پائے گی؟''[1]

ایسے ہی دوسرے محدّثین حافظ صلاح الدین العلائی ''جامع التحصیل في أحکام المراسیل'' میں حضرت اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہما کے واقعہ والی حدیث اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی بھتیجی والی حدیث دونوں کو ذکر کر کے ان کے بارے میں لکھتے ہیں:

''یہ دونوں روایتیں متابعات وشواہد کے طور پر پیش کیے جانے کے قابل بھی نہیں، چہ جائیکہ حجت و دلیل بن سکیں۔ اگر یہ اسناد کے اعتبار سے صحیح بھی ہیں، تب بھی یہ شاذ و غیر محفوظ ہیں، جبکہ ان کی اسناد کے ضعف کا تو وہ عالم ہے جو ذکر کیا گیا اور (حقیقت یہ ہے کہ) اس سلسلے میں کوئی ایک بھی مرفوع حدیث صحیح نہیں ہے۔''[2]

ضعف کا ایک اور سبب:

فریقِ ثانی کی دوسری دلیل اور اس کے طُرق کے ضعف کا ایک اور سبب یہ بھی ہے کہ خالد بن دُریک کے طریق سے مروی حضرت اسماء رضی اللہ عنہا کے واقعہ والی حدیث ان احادیث و آثار کے بھی مخالف و معارض ہے، جن میں سے ایک میں ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں:

''ہم احرام کی حالت میں نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ ہوتیں، مردوں کے قافلے ہمارے قریب سے گزرنے لگتے تو ہم سر سے کپڑا گرا کر چہرے کا پردہ کر لیتیں۔''[3]

ان کی بہن حضرت اسماء رضی اللہ عنہا ایک دوسری حدیث میں بیان کرتی ہیں:

''ہم احرام کی حالت میں مردوں سے اپنے چہروں کا پردہ کرتی تھیں۔''[4]

ان دونوں احادیث کو پیشِ نظر رکھا جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ اگر خالد بن دریک والی

---

[1] اللباب (ص: ۳۹)

[2] جامع التحصیل (۲/ ۵۳۸) اللباب (ص: ۴۲)

[3] سنن أبي داود، رقم الحدیث (۱۸۳۳) سنن ابن ماجه، رقم الحدیث (۲۹۳۵) مسند أحمد (۶/ ۳۰)

[4] المستدرك للحاکم (۱/ ۴۵۴)

حضرت اسماء رضی اللہ عنہا کے واقعہ پر مشتمل حدیث صحیح ہوتی اور اس پر عمل کیا جا رہا ہوتا تو عورتیں غیر مردوں سے اپنے چہرے نہ ڈھانپتیں، خاص طور پر جبکہ وہ احرام کی حالت میں ہوتیں، مگر ایسا نہیں ہے، بلکہ وہ تو احرام میں بھی غیر محرم مردوں سے چہرے ڈھانپ لیتی تھیں، جو اس بات کی دلیل ہے کہ مذکورہ حدیث صحیح اور معمول بہ نہیں ہے۔

اگر علی وجہ التنزّل یہ مان ہی لیا جائے کہ یہ حدیث صحیح ہے اور معمول بہ رہی ہے تو پھر اسے حکمِ حجاب کے نازل ہونے سے پہلے کے دور پر محمول کیا جائے گا اور نزولِ حجاب سے اس کے حکم کو منسوخ تسلیم کرنا پڑے گا، جیسا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا والی مذکورہ احادیث سے پتا چلتا ہے۔ جب وہ احرام کی حالت میں غیر محرم مردوں سے چہروں کا پردہ کیا کرتی تھیں تو احرام کے علاوہ عام حالت میں بالاولیٰ پردے کا حکم ہوگا۔[1]

صرف اسی پر بس نہیں، بلکہ اہلِ علم کے نزدیک خالد بن دریک والی حدیث سے حجاب کے عدمِ وجوب پر ایک اور اصول کی رو سے بھی استدلال نہیں کیا جا سکتا۔

ایک اصول:

وہ اصول یہ ہے کہ چہرے کے پردے کو واجب ثابت کرنے والے دلائل مسئلے کو اس کی اصل سے منتقل کر کے دوسرے حکم تک لے جانے والے ہیں اور چہرے کو ننگا رکھنے کے جواز پر دلالت کرنے والی احادیث مسئلے کو اس کے اصل حکم پر ہی قائم رکھنے والی ہیں، ایسے ہی علمائے اصول کے نزدیک معروف و طے شدہ بات یہ ہے کہ اصل حکم سے منتقل کرنے والے دلائل مقدم ہوں گے اور یہ اس لیے کہ اصل تو یہی ہے کہ کسی چیز کو اس کی حالتِ اصلیہ پر ہی باقی رہنے دیا جائے اور اگر کوئی ایسی دلیل مل جائے جو اسے اصل سے منتقل کر کے دوسرے حکم تک لے جائے تو یہ چیز اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ اصل پر نئی ناقل دلیل کا حکم وارد ہوگیا ہے اور اس نے اصل کو بدل دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کہا جا سکتا ہے کہ ناقل کے پاس زیادہ علم ہے اور وہ ہے اصلی حکم میں تغیر و تبدیلی کو ثابت کرنا اور ''وَالْمُثْبِتُ مُقَدَّمٌ عَلَى النَّافِيْ'' ثابت کرنے والا نفی کرنے والے پر مقدّم ہوتا ہے۔

چہرے کے پردے سے تعلق رکھنے والے دلائل کے سلسلہ میں اگر یہ بھی مان لیا جائے کہ

[1] الصارم المشهور للتويجري بحواله اللباب (ص: ٤٥، ٤٦)

دونوں طرف ایک جیسے دلائل ہیں۔ تب بھی یہ مذکورہ توجیہ اجمالی و ثابت ہے، جس سے چہرے کے حجاب کا وجوب ہی سامنے آتا ہے۔[1]

اس اصول کے پیشِ نظر بات تو یہیں مکمل ہوجاتی ہے کہ چاہے فریقِ ثانی کے دلائل بھی فریقِ اول کے جیسے ہی کیوں نہ ہوں، پلہ فریقِ اوّل ہی کا بھاری رہے گا، کیونکہ ''اَلنَّاقِلُ عَنِ الْأَصْلِ مُقَدَّمٌ'' ''اصل سے منتقل کرنے والا حکم ہی مقدّم ہوتا ہے۔''

لیکن ہم چاہتے ہیں کہ فریقِ ثانی کی طرف سے پیش کیے جانے والے دیگر دلائل بھی ذکر کر دیں اور ان کا جائزہ لیں، تاکہ علمی امانت ادا ہو جائے۔

تیسری دلیل:

فریقِ ثانی کی تیسری دلیل وہ حدیث ہے، جو صحیح مسلم، سنن نسائی، دارمی، بیہقی اور مسند احمد میں حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، جس میں وہ بیان کرتے ہیں:

''شَهِدْتُّ مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ يَوْمَ الْعِيْدِ فَبَدَأَ بِالصَّلَاةِ قَبْلَ الْخُطْبَةِ بِغَيْرِ أَذَانٍ وَّلَا إِقَامَةٍ، ثُمَّ قَامَ مُتَوَكِّئًا عَلٰى بِلَالٍ فَأَمَرَ بِتَقْوَى اللّٰهِ وَحَثَّ عَلٰى طَاعَتِهٖ وَوَعَظَ النَّاسَ وَذَكَّرَهُمْ ثُمَّ مَضٰى حَتّٰى أَتَى النِّسَآءَ فَوَعَظَهُنَّ وَذَكَّرَهُنَّ''

''میں نبیِ اکرم ﷺ کی معیت میں نمازِ عید کے لیے حاضر ہوا، آپ ﷺ نے اذان و اقامت کے بغیر ہی خطبے سے پہلے نمازِ عید پڑھی، پھر آپ ﷺ حضرت بلال رضی اللہ عنہ کا سہارا لیے (خطبے کے لیے) کھڑے ہوگئے۔ آپ ﷺ نے لوگوں کو تقویٰ و خشیتِ الٰہی اور اطاعتِ الٰہی کا حکم فرمایا اور لوگوں کو وعظ و تذکیر کی، پھر آپ ﷺ عورتوں کے پاس چلے گئے اور انھیں بھی وعظ و نصیحت فرمائی۔''

عورتوں سے مخاطب ہوکر آپ نے فرمایا:

«تَصَدَّقْنَ فَإِنَّ أَكْثَرَكُنَّ حَطَبُ جَهَنَّمَ، فَقَامَتِ امْرَأَةٌ مِنْ سِطَةِ النِّسَآءِ سَعْفَاءَ الْخَدَّيْنِ فَقَالَتْ: لِمَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ؟»

''کثرت سے صدقہ کیا کرو، کیونکہ تم میں سے اکثر جہنم کا ایندھن بننے والی ہیں۔ عورتوں

---

[1] دیکھیں: الحجاب للعثیمین (ص:۳۱)

کے وسط میں بیٹھی ہوئی ایک عورت، جس کے گال پچکے ہوئے اور سیاہی مائل تھے، اس نے عرض کی: اے اللہ کے رسول ﷺ! (اکثر عورتیں، جہنم کا ایندھن) کیوں ہوں گی؟''

آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

«لِأَنَّكُنَّ تُكْثِرْنَ الشَّكَاةَ وَتَكْفُرْنَ الْعَشِيرَ»

''وہ اس لیے کہ تم شکوہ و شکایت کثرت سے کرتی ہو اور شوہروں کی ناشکر گزار ہوتی ہو۔''

حضرت جابر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں:

''فَجَعَلْنَ يَتَصَدَّقْنَ مِنْ حُلِيِّهِنَّ يُلْقِينَ فِي ثَوْبِ بِلَالٍ مِنْ أَقْرَاطِهِنَّ وَخَوَاتِمِهِنَّ''[1]

''عورتوں نے اپنے زیوارت میں کانوں کی بالیاں اور انگوٹھیاں صدقہ کرنا شروع کر دیں۔''

یہ حدیث فریقِ ثانی کی تیسری دلیل ہے اور اس میں محلِ استدلال و استشہاد حضرت جابر رضی اللہ عنہ کے وہ الفاظ ہیں، جن میں وہ اس عورت کے چہرے کا یہ وصف بیان کرتے ہیں کہ وہ پچکے ہوئے سیاہی مائل گالوں والی عورت تھی۔

عدمِ وجوب کے قائلین کا کہنا ہے کہ اس حدیث میں اس بات کی واضح دلیل موجود ہے کہ چہرے کا پردہ واجب نہیں اور اگر چہرے کا پردہ واجب ہوتا تو اس عورت نے بھی چہرہ چھپایا ہوا ہوتا اور حضرت جابر رضی اللہ عنہ اس کے بارے میں یہ نہ کہہ سکتے کہ وہ پچکے ہوئے سیاہی مائل گالوں والی عورت تھی، اس کا چہرہ ننگا تھا، لہٰذا حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے اسے دیکھا اور یہ الفاظ کہے۔ نبیِ اکرم ﷺ کا اس عورت کو اس حال میں دیکھنا اور نکیر و ممانعت نہ کرنا، بلکہ غیر مردوں کی موجودگی میں اسے اسی حالت پر برقرار رہنے دینا، چہرہ ننگا رکھنے کے جواز کی دلیل ہے۔

یہ ہے اس حدیث سے ان کا طریقۂ استدلال، جس پر کئی اعتراضات وارد ہوتے ہیں اور اس میں کئی جھول پائے جاتے ہیں، لہٰذا ہم اس حدیث کا جائزہ لیتے ہیں۔

تیسری دلیل کا تجزیہ:

ان کی اس تیسری دلیل کا مجمل سا جواب تو یہ ہے کہ یہ حدیث تو صحیح ہے، لیکن چہرہ ننگا رکھنے

[1] الحجاب للألباني (ص: ٢٥، ٢٧) صحيح مسلم مع شرح النووي (٣/ ٦/ ١٧٥، ١٧٦) صحيح سنن النسائي، رقم الحديث (١٤٨٤) إرواء الغليل (٦٤٦)

کے جواز پر صراحت سے دلالت نہیں کرتی، یعنی صحیح تو ہے لیکن صریح نہیں ہے، بلکہ اس میں کئی احتمالات پائے جاتے ہیں:

① وہ عورت عمر رسیدہ ہو، جن کے لیے احکامِ پردہ میں خود اللہ تعالیٰ نے کافی حد تک تخفیف فرما دی ہے، جیسا کہ سورۃ النور میں ارشادِ الٰہی ہے:

﴿ وَالْقَوَاعِدُ مِنَ النِّسَآءِ الّٰتِیْ لَا یَرْجُوْنَ نِکَاحًا فَلَیْسَ عَلَیْهِنَّ جُنَاحٌ اَنْ یَّضَعْنَ ثِیَابَهُنَّ غَیْرَ مُتَبَرِّجٰتٍۭ بِزِیْنَةٍ وَّاَنْ یَّسْتَعْفِفْنَ خَیْرٌ لَّهُنَّ وَاللّٰهُ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ ﴾ [النور: ٦٠]

''اور وہ عمر رسیدہ عورتیں جو نکاح کرنے کی عمر سے تجاوز کر چکی ہوں، وہ اگر پردے کی چادریں اتار دیں تو ان پر کوئی حرج نہیں، بشرطیکہ ان کا یہ فعل اظہارِ زیب و زینت کے لیے نہ ہو اور اگر وہ (اس عمر میں بھی) حیا داری و پردہ اختیار کریں تو ان کے لیے بہتر ہے اور اللہ سننے والا جاننے والا ہے۔''

اگر وہ عورت ایسی عمر رسیدہ تھی تو اس کا چہرہ کھولے ہوئے ہونا عام عورتوں کے لیے دلیل نہیں بن سکتا، کیونکہ اسے تو خود اللہ تعالیٰ نے اس کی گنجایش دی ہے۔

② اس حدیثِ جابر رضی اللہ عنہ میں دوسرا احتمال یہ بھی پایا جاتا ہے کہ یہ واقعہ نزولِ حجاب یعنی پردے کا حکم نازل ہونے سے پہلے رونما ہوا ہو۔ اگر ایسا ہو تب بھی یہ واقعہ اس مسئلے میں دلیل نہیں بن سکتا۔

③ اس میں ایک تیسرا احتمال یہ بھی ہے کہ وہ عورت کنیزوں اور خصوصاً ایسی کنیزوں میں ہو، جنھیں چہرے کے پردے میں بعض شرائط کے ساتھ نرمی کا حکم دیا گیا ہے (جیسا کہ تفصیل ذکر کی جا چکی ہے) اور اگر وہ عورت عام کام کاج میں مصروف رہنے والی کنیزوں میں سے تھی تو بھی اس واقعے سے دلیل لینا صحیح نہیں ہے۔[1]

ان تین احتمالات میں سے جو یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ واقعہ پردے کا حکم نازل ہونے سے پہلے کا ہوگا، اس کا تو قائلینِ جوازِ کشف نے یہ جواب دیا ہے کہ یہ واقعہ نزولِ حجاب سے پہلے کا نہیں بلکہ نزولِ حجاب کے بعد کا ہے اور ''حجاب المرأة المسلمة'' کے مولف (علامہ ناصر الدین البانی) نے اپنی اس

[1] از افادات شیخ السندی بحوالہ اللباب (ص: ٤٧)

کتاب میں دو احادیث سے استدلال کرتے ہوئے لکھا ہے کہ یہ واقعہ نزولِ حجاب کے بعد کا ہے۔[1]

جبکہ شیخ محمد صالح العثیمین نے اپنی پردہ سے متعلقہ کتاب میں لکھا ہے:

''حدیثِ جابر رضی اللہ عنہ میں مذکورہ واقعہ عید سے تعلق رکھتا ہے اور عید کی مشروعیت ۲ھ میں ہوئی، جبکہ سورۃ الاحزاب میں نازل ہونے والے پردے کے حکم کا نزول ۲ھ یا ۳ھ میں ہوا۔ لہٰذا معلوم ہوا کہ یہ واقعہ نزولِ حجاب سے پہلے کا ہے۔''[2]

لیکن اگر یہ مان ہی لیا جائے کہ یہ واقعہ نزولِ حجاب کے بعد کا ہے، تب بھی بات نہیں بنتی، کیونکہ دوسرے دو احتمال پھر بھی باقی رہ جاتے ہیں اور معروف اصولی قاعدہ ہے:

''مَا تَطَرَّقَ إِلَيْهِ الْإِحْتِمَالُ سَقَطَ بِهِ الْإِسْتَدْلَال''

''جس میں احتمال واقع ہوجائے، اس سے استدلال کرنے کی صلاحیت ساقط ہوجاتی ہے۔''

پھر اسی پر بس نہیں بلکہ شیخ حمود التویجری نے اپنی کتاب ''الصارم المشهور'' میں لکھا ہے:

''حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں اس بات کا ذکر تو نہیں کہ خود نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس عورت کو ننگے منہ دیکھا تھا اور نکیر کیے بغیر اسے اس کے حال پر ہی چھوڑ دیا تھا۔ لہٰذا جب یہ بات اس میں مذکور ہی نہیں ہے تو یہ حدیث عورت کے لیے ننگے منہ رہنے کے جواز کی رائے رکھنے والوں کی دلیل کیسے بن سکتی ہے؟ اگر کسی کو اس دعوے پر اصرار ہو کہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس عورت کو ننگے منہ دیکھا تھا اور اسے اس حال پر برقرار رہنے دیا تھا تو وہ اس بات کی وضاحت پر مبنی کوئی دلیل پیش کرے۔ بات دراصل صرف اتنی ہے کہ اس حدیث میں آمدہ ذکر کی بنا پر زیادہ سے زیادہ صرف یہ کہا جا سکتا ہے کہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے اس عورت کا ننگا چہرہ دیکھا اور اس کے چہرے کا وصف بیان کر دیا، جو محض اس لیے ہوگیا ہوگا کہ اس عورت کا پردہ بلا قصد و ارادہ اس کے چہرے سے اٹھ گیا ہوگا، ورنہ یہ تو نہیں کہ عورتیں ہوتی ہی ننگے منہ تھیں اور نہ یہ کہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ کے ساتھ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اس عورت کا ننگا چہرہ دیکھا ہو۔

''یہ بات صرف ایک مفروضہ بھی نہیں کہ بلا قصد و ارادہ اس عورت کا چہرہ کھل گیا اور

[1] حجاب المرأة (ص: ٢٥، ٢٦)

[2] الحجاب للعثيمين (ص: ٣٦)

حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی نظر پڑ گئی، بلکہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کرنے والی اس عورت کو صرف حضرت جابر رضی اللہ عنہ کے دیکھنے اور نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اسے نہ دیکھنے کی باقاعدہ دلیل خود حدیث شریف میں موجود ہے اور وہ دلیل یہ ہے کہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس خطبہ مبارکہ کی روایت صرف حضرت جابر رضی اللہ عنہ ہی سے نہیں بلکہ دیگر کئی صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم سے بھی مروی ہے، جن میں سے حضرت عبداللہ بن مسعود، حضرت عبداللہ بن عمر، حضرت عبداللہ بن عباس، حضرت ابوسعید خدری اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہم کے اسمائے گرامی بطورِ خاص قابلِ ذکر ہیں، ان سب صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ خطبہ تو بیان کیا ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا عورتوں کو وعظ کرنا بھی روایت کیا ہے، لیکن ان میں سے حضرت جابر رضی اللہ عنہ کے سوا کسی دوسرے صحابی رضی اللہ عنہ نے اس عورت کا ننگے منہ ہونا اور اس کے گالوں کا پچکے ہوئے اور سیاہی مائل ہونا بیان نہیں کیا اور یہ چیز اس بات کی واضح دلیل ہے کہ اس عورت کو ننگے منہ دیکھنے میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ منفرد یا اکیلے ہیں، جبکہ اس واقعہ یا وعظ کو بیان کرنے والے دوسرے صحابہ رضی اللہ عنہم بھی ہیں، لیکن کسی نے اس عورت کے چہرے کے ننگا ہونے کا اشارہ تک نہیں دیا۔''

وہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم پانچ ہیں اور ان میں سے ایک حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت ہے۔

(1) حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت:

یہ مسند احمد اور مستدرک حاکم میں مروی ہے، اس میں نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کرنے والی عورت کے بارے میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے الفاظ ہیں:

''فَقَالَتِ امْرَأَةٌ لَيْسَتْ مِنْ عُلْيَةِ النِّسَآءِ''[1]

''ایک عورت نے کہا جو اشراف عورتوں میں سے نہیں تھی۔''

ان الفاظ کے بعد انھوں نے بھی حضرت جابر رضی اللہ عنہ جیسی ہی روایت بیان کی ہے تو گویا حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے بیانِ واقعہ کے ضمن میں یہ بات روایت نہیں کی کہ وہ عورت ننگے منہ تھی اور نہ اس کے رخساروں کی حالت و کیفیت بیان کی ہے۔

---

[1] دیکھیں: اللباب (ص: ٤٨) والصارم المشھور.

(2) حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت:

دوسری روایت حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے، جو صحیح مسلم، سنن ابو داود، ابن ماجہ اور مسند احمد میں ہے، اس میں وہ اس عورت کے بارے میں بیان کرتے ہیں:

''فَقَالَتِ امْرَأَةٌ مِّنْهُنَّ جَزْلَةٌ''[1]

''ان میں سے ایک ''جزلہ'' عورت نے کہا۔''

اس سے آگے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کا بیان بھی حضرت جابر رضی اللہ عنہ جیسا ہی ہے۔ معلوم ہوا کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی طرح اس عورت کے رخساروں کا کوئی وصف بیان نہیں کیا، بلکہ اس عورت کو ''جزلہ'' کہا۔

''جزلہ'' کا معنیٰ ماہرینِ لغت نے جو بیان کیا ہے، اس سے وہ بات نہیں بنتی جو قائلینِ کشف بنانا چاہتے ہیں، کیونکہ ابن الاثیر نے ''اِمْرَأَةٌ جَزْلَةٌ'' کا معنیٰ:

''أَیْ تَامَّةُ الْخِلْقَةِ وَیَجُوْزُ أَنْ تَكُوْنَ ذَاتَ كَلَامٍ جَزْلٍ أَیْ قَوِيٍّ شَدِیْدٍ''

''جزلہ عورت سے مراد مکمل خلقت والی عورت ہے اور ہوسکتا ہے وہ عورت بولنے میں شدید اندازِ گفتگو والی ہو۔''

امام نووی رحمہ اللہ نے کہا ہے:

''جَزْلَةٌ أَیْ ذَاتَ عَقْلٍ وَّرَأْيٍ'' (یعنی عقلمند اور صاحبِ رائے عورت)

امام ابن دُرَید نے کہا ہے:

''اَلْجَزْلَةُ: اَلْعَقْلُ وَالْوَقَارُ'' (یعنی عقل و دانش والی با وقار عورت)

ان سب معانی سے وہ بات کشید کرنا ممکن نہیں جو حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی روایت میں وارد ہوئی ہے۔

(3) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت:

اس خطبے کو بیان کرنے والے تیسرے صحابی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما ہیں، جن کی روایت صحیح بخاری و مسلم، سنن ابو داود ونسائی اور مسند احمد میں ہے، ان کی روایت میں الفاظ یہ ہیں:

---

[1] بحواله سابقه (ص: ٤٩) صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٩١٣) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٤٠٠٣) صحيح مسلم مع شرح النووي (١/ ٢/ ٦٥)

”فَقَالَتِ امْرَأَةٌ وَّاحِدَةٌ لَمْ يُجِبْهُ غَيْرُهَا مِنْهُنَّ“[1]

”ان عورتوں میں سے کسی نے کچھ نہیں کہا، بس صرف ایک عورت نے کہا۔“

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بھی جو دیکھا بیان کر دیا، انھوں نے بھی اس عورت کے ننگے منہ ہونے کا کوئی تذکرہ نہیں کیا اور نہ انھوں نے دوسری عورتوں کے بارے میں کچھ کہا ہے کہ وہ ننگے منہ ہوں۔ یاد رہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے نمازِ عید میں شریک ہونے کا واقعہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ مبارکہ کے آخری مہینوں میں پیش آیا تھا (گویا اس وقت تک اس روایت کی رو سے بے نقابی و بے حجابی نہیں آئی تھی)۔

4 حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کی روایت:

اس واقعے کو بیان کرنے والے چوتھے راوی حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ ہیں، جن کی روایت صحیح بخاری و مسلم اور دیگر کتبِ حدیث میں موجود ہے۔[2] لیکن ان کی روایت میں اس عورت کی طرف اشارہ تک نہیں ملتا۔

5 حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت:

اس خطبے کو بیان کرنے والے پانچویں صحابی حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ ہیں، ان کی روایت صحیح مسلم، سنن ترمذی اور مسند احمد میں ہے، انھوں نے بھی صرف اتنا کہا ہے:

”فَقَالَتِ امْرَأَةٌ مِّنْهُنَّ“ ”ان میں سے ایک عورت نے کہا۔“

اس سے آگے انھوں نے بھی اُسی واقعے کو بیان کیا ہے، جیسا کہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں ہے اور کسی عورت کا چہرہ ننگا ہونے کا اس میں کوئی ذکر تک نہیں۔

یہ پانچوں صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی مرویات ہیں، جنھوں نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی طرح ہی اس واقعے کو بیان کیا ہے، لیکن ان میں سے کسی عورت کے ننگے منہ ہونے کا ذکر نہ کرنا اس بات کی واضح دلیل ہے کہ اس بیان میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ منفرد ہیں اور ان کا عورت کو دیکھ لینا کسی طرح بھی جوازِ کشف کی دلیل نہیں بن سکتا، کیونکہ ان کے دیکھ لینے سے یہ تو ثابت نہیں ہوتا کہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اسی

---

[1] صحيح البخاري مع الفتح(٢/ ٤٦٦، ٤٦٧) و صحيح مسلم مع شرح النووي (٣/ ٦/ ١٧٢)

[2] صحيح مسلم مع شرح النووي (٣/ ٦/ ١٧٧)

حالت میں اس عورت کو دیکھا اور خاموشی اختیار فرما کر اسے سندِ جواز مہیا فرمائی ہو، ایسا تو ہرگز نہیں ہے۔

اگر بفرضِ محال مان ہی لیا جائے کہ نبیِ اکرم ﷺ نے بھی اس عورت کو بے حجاب دیکھا ہے اور بلانکیر خاموشی اختیار فرمائی تو بھی اس امر کو ان دو میں سے کسی ایک پر محمول کیا جائے گا۔ (جن کا ذکر ہم پہلے بھی کر آئے ہیں کہ) پہلی بات تو یہ کہ واقعہ پردے کا حکم نازل ہونے سے پہلے پیش آیا ہوگا اور دوسری بات یا دوسرا احتمال یہ بھی ہے کہ ممکن ہے وہ عورت ایسی عمر رسیدہ خواتین میں سے ہو، جو نکاح کی عمر سے گزر چکی ہوں، جنھیں اللہ نے بھی پردے کے معاملے میں کچھ تخفیف فرمائی ہے، بشرطیکہ وہ زیب و زینت کی نمایش کرنے والی نہ ہوں۔ جب حضرت جابر رضی اللہ عنہ والی حدیث کے بارے میں کئی ایک احتمالات پائے جاتے ہیں، تو پھر مذکورہ مسئلے میں اسے دلیل بنانا صحیح نہ رہا، کیونکہ اصولی قاعدہ ہے:

''مَا تَطَرَّقَ إِلَيْهِ الْاِحْتِمَالُ سَقَطَ بِهِ الْاِسْتِدْلَالُ''

''جس میں احتمال واقع ہوجائے، اس سے استدلال ساقط ہوجاتا ہے۔''

حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی حدیث سے استدلال اور اس کے تجزیے کی تفصیل شیخ حمود التویجری کی کتاب ''الصارم المشهور'' علامہ شنقیطی کی تفسیر ''أضواء البيان'' (٦/ ٥٩٧، ٥٩٩) اور ''اللباب في فرضية النقاب'' (ص: ٤٦، ٥٠) میں دیکھی جا سکتی ہے۔

چوتھی دلیل:

فریقِ ثانی کی حجاب و نقاب کے عدمِ وجوب پر چوتھی دلیل وہ حدیث ہے، جس میں نبیِ اکرم ﷺ کے برادرِ عم زاد حضرت فضل بن عباس رضی اللہ عنہما کا ایک واقعہ مذکور ہے۔ چنانچہ صحیح بخاری و مسلم، سنن ابو داود، نسائی، ابن ماجہ، بیہقی، مسند احمد اور محلّی ابن حزم میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے:

''(حجۃ الوداع کے موقع پر دس ذوالحجہ) یومِ نحر کو نبیِ اکرم ﷺ نے حضرت فضل بن عباس رضی اللہ عنہما کو اپنے پیچھے اپنی سواری پر بٹھایا ہوا تھا اور فضل خوبرو جوان تھے۔ آپ ﷺ ایک جگہ رکے اور لوگوں کے سوالوں کا جواب دینے لگے، وہیں قبیلہ بنی خثعم کی ایک خوبصورت عورت بھی آ گئی، فضل رضی اللہ عنہ نے اس کی طرف دیکھنا شروع کیا اور انھیں اس عورت کا حسن بہت بھایا، نبیِ اکرم ﷺ ان کی طرف متوجہ ہوئے تو دیکھا کہ فضل اسے

دیکھ رہا ہے:

«فَأَخْلَفَ بِيَدِهِ فَأَخَذَ بِذُقْنِ الْفَضْلِ فَعَدَّلَ وَجْهَهُ عَنِ النَّظَرِ إِلَيْهَا»

''نبیِ اکرم ﷺ نے فضل رضی اللہ عنہ کو ٹھوڑی سے پکڑا اور ان کا منہ دوسری طرف پھیر دیا، تاکہ وہ اس عورت کو دیکھ نہ پائیں۔''

اسی حدیث میں آگے یہ مذکور ہے کہ اس عورت نے پوچھا: اے اللہ کے رسول ﷺ!

"إِنَّ فَرِيْضَةَ اللّٰهِ فِي الْحَجِّ عَلٰى عِبَادِهِ أَدْرَكَتْ أَبِيْ شَيْخاً كَبِيْراً لَا يَسْتَطِيْعُ أَنْ يَّسْتَوِيَ عَلَى الرَّاحِلَةِ فَهَلْ يُقْضٰى عَنْهُ أَنْ أَحُجَّ عَنْهُ؟"

''اللہ کی طرف سے اس کے بندوں پر عائد کردہ فریضۂ حج میرے باپ پر اُس وقت فرض ہوا، جبکہ وہ انتہائی ضعیف العمر ہوگیا، حتیٰ کہ وہ سواری پر بھی بیٹھا نہیں رہ سکتا۔ اگر میں اس کی طرف سے حج کرلوں تو کیا یہ اس کی طرف سے ہوجائے گا؟''

اس پر نبیِ اکرم ﷺ نے فرمایا:

«نَعَمْ»[1] ''ہاں۔''

جبکہ یہی واقعہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بھی سنن ترمذی، مسند احمد، زوائد مسند اور الاحادیث المختارہ للضیاء المقدسی میں مروی ہے۔ اس کی سند کو امام ترمذی نے حسن صحیح کہا ہے اور محدث البانی نے بھی اس کی سند کو جید قرار دیا ہے۔ اس روایت میں ایک خاص بات یہ مذکور ہے کہ آپ ﷺ سے سوال کرنے کا یہ واقعہ (دس ذوالحجہ) یومِ نحر میں رمی کر چکنے کے بعد قربانی کے وقت پیش آیا تھا، جس سے یہ نتیجہ بھی اخذ کیا جاتا ہے کہ اس عورت کا سوال کرنا ایسے وقت تھا، جبکہ وہ حالتِ احرام میں نہیں تھی۔[2]

اس واقعے سے بھی قائلینِ جوازِ کشف استدلال کرتے ہیں کہ عورت کا چہرہ مقامِ ستر نہیں۔ بقول علامہ ابن حزم (۳/ ۲۱۸) اگر چہرہ مقامِ ستر ہوتا تو نبیِ اکرم ﷺ اس عورت کو لوگوں کے مابین ننگے منہ نہ رہنے دیتے، بلکہ حکم فرماتے کہ سر سے کپڑا گرا کر پردہ کرلے اور اگر اس کا چہرہ ڈھانپا ہوا

---

[1] صحيح البخاري مع الفتح (١١/ ٨ و ٤/ ٦٦، ٦٧ و ٣٧٨٣) و صحيح مسلم مع شرح النووي (٥/ ٩/ ٩٧، ٩٨) صحيح سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٤٧٢) صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (١٥٩٤) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٢٩٠٩، ٢٩٠٧) الموطأ، باب الحج عمن يحج عنه (١/ ٣٥٩) رقم الحديث (٩٧)

[2] دیکھیں: حجاب الألباني (ص: ٢٧، ٢٩) صحيح سنن الترمذي، رقم الحديث (٧٠٢)

ہوتا تو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما یہ نہ جان پاتے کہ وہ خوبرو ہے یا بدصورت۔

ایسے ہی فتح الباری میں ابن بطال سے بھی حافظ ابن حجر نے نقل کیا ہے:

''انھوں نے بھی اس حدیث سے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ عورت کے لیے چہرے کا پردہ کرنا فرض نہیں ہے، لیکن حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے اس دعوے پر ان کا تعاقب بھی کیا اور کہا ہے کہ ان کی یہ بات محلِ نظر ہے۔''

الغرض اس حدیث میں مذکور واقعہ سے فریقِ ثانی نے یوں دلیل لی ہے۔

چوتھی دلیل کا تجزیہ:

لیکن علامہ ابن حزم اور ان کے دیگر ہمنواؤں کے اس استدلال پر دوسرے اہلِ علم نے ان کا تعاقب کیا ہے، اور علامہ موصوف کے الفاظ پر تعجب کا اظہار کرتے ہوئے فرید امین الهنداوی نے ''اللباب في فرضية الحجاب'' میں لکھا ہے کہ نبیِ اکرم نے اس عورت کے لیے ننگے منہ رہنے کو کہاں برقرار رہنے دیا ہے اور اس حدیث کے الفاظ یا مفہوم یا اقتضاے نص کسی سے بھی تو برقرار رہنے دینے کا پتا نہیں چلتا، بلکہ ''فقه النظر في الإسلام'' میں شیخ محمد ادیب کے بقول:

''اس حدیث کا عام مفہوم تو اس بات کو اور پختگی دیتا ہے کہ غیر محرم عورت کو دیکھنا ناجائز ہے اور نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنے برادرِ عمزاد کے فعل پر عملاً نکیر کرنا (ٹھوڑی سے پکڑ کر ان کا منہ گھما دینا) اس پر مستزاد ہے، اس حدیث کی رو سے وہ عورت حالتِ احرام میں تھی، لہٰذا اس کا چہرے کو نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ننگا کر لینا اس کے لیے اس وقت جائز تھا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا عملی طور پر فضل رضی اللہ عنہ کے فعل پر نکیر کرنا بگاڑ کا سبب بننے والی نظر کے سدِ باب کے لیے تھا اور اس حدیث میں کوئی ایسی بات نہیں جو چہرے اور ہاتھوں کو ننگے رکھنے کے جواز کا اشارہ دیتی ہو۔''[1]

''الحلال والحرام في الإسلام'' (اللباب، ص: ٥٤) میں ڈاکٹر یوسف قرضاوی نے جب اس واقعہ کو دلیل بنایا تو ''الإعلام'' میں شیخ صالح الفوزان نے ان کا تعاقب کرتے ہوئے لکھا ہے:

''موصوف کا اس واقعے سے غیر محرم عورت کے چہرے کو دیکھنے کے جواز پر استدلال کرنا

---

[1] اللباب (ص: ٥٢) نقله عن فقه النظر في الإسلام.

نہایت عجیب بات ہے، کیونکہ یہ حدیث تو اس کے برعکس عدمِ جواز پر دلالت کرتی ہے، کیونکہ نبیِ اکرم ﷺ نے فضل رضی اللہ عنہ کو دیکھتے نہیں رہنا دیا، بلکہ ان کا رخ ہی موڑ دیا اور اگر یہ جائز ہوتا تو پھر آپ ﷺ ایسا کیوں کرتے؟''

امام نووی رحمہ اللہ نے شرح صحیح مسلم میں اس حدیث کے فوائد ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

''وَمِنْهَا تَحْرِيمُ النَّظْرِ إِلَى الْأَجْنَبِيَّةِ، وَمِنْهَا إِزَالَةُ الْمُنْكَرِ بِالْيَدِ لِمَنْ أَمْكَنَهُ''[1]

''ان فوائد میں سے ایک یہ ہے کہ غیر محرم عورت کی طرف دیکھنا حرام ہے اور یہ کہ اگر کسی کے لیے ممکن ہو تو برائی کو قوتِ بازو سے مٹانا ضروری ہے۔''

علامہ ابن قیم رحمہ اللہ نے اپنی ایک علمی و ادبی کتاب ''روضة المحبين'' میں حضرت فضل رضی اللہ عنہ کے واقعے والی اسی حدیث کو نقل کر کے نبیِ اکرم ﷺ کے عملی انکار و نکیر کے بارے میں لکھا ہے:

''وَهٰذَا مَنْعٌ وَّ إِنْكَارٌ بِالْفِعْلِ فَلَوْ كَانَ النَّظْرُ جَائِزاً لَأَقَرَّهٗ عَلَيْهِ''[2]

''یہ آپ ﷺ کی طرف سے عملی طور پر ممانعت و نکیر تھی۔ اگر نظر جائز ہوتی تو پھر آپ ﷺ فضل کو دیکھتا رہنے دیتے، لیکن ایسا نہیں ہے۔''

شیخ عثیمین نے اپنی کتاب میں لکھا ہے:

''اگر یہ کہا جائے کہ آپ ﷺ نے اس عورت کو کیوں حکم نہ فرمایا کہ وہ پردہ کر لے تو اس کا جواب یہ ہے کہ وہ عورت احرام سے تھی اور غیر محرم کی عدم موجودگی میں اس کے لیے ننگے منہ رہنا مشروع تھا اور یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ ممکن ہے بعد میں آپ ﷺ نے اسے پردہ کرنے کا حکم فرما دیا ہو، کیونکہ اس کا حکم منقول نہ ہونا اس بات کی دلیل تو نہیں کہ آپ ﷺ نے اسے حکم ہی نہیں دیا تھا۔''[3]

حضرت فضل رضی اللہ عنہ کے خثعمی عورت کی طرف دیکھنے اور نبیِ اکرم ﷺ کے ان کا رخ موڑنے کے واقعہ والی حدیث کا جواب شیخ محمد امین شنقیطی نے اپنی تفسیر ''أضواء البيان'' میں دو طرح سے دیا ہے:

1 اس حدیث کی روایات میں سے کسی میں بھی یہ صراحت وارد نہیں ہوئی کہ وہ عورت ننگے منہ تھی

---

[1] شرح صحيح مسلم للنووي (٥/ ٩/ ٩٨)

[2] روضة المحبين (ص: ٩٢، طبع دار الكتب العلمية، بيروت)

[3] الحجاب للعثيمين (ص: ٣٣)

اور نبی اکرم ﷺ نے اسے ننگے منہ دیکھا اور اس حالت پر اسے برقرار رہنے دیا، بلکہ زیادہ سے زیادہ اس حدیث میں یہ ذکر آیا ہے کہ وہ عورت خوبصورت تھی، جبکہ اس سے یہ لازم تو نہیں آتا کہ وہ ننگے منہ تھی اور نبی اکرم ﷺ نے اسے اسی حالت پر رہنے دیا تھا، بلکہ ممکن ہے کہ بلا قصد و ارادہ کہیں اس کے چہرے سے پردہ اُٹھ گیا ہو اور بعض لوگوں نے اسے دیکھ لیا ہو، جیسا کہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ والی حدیث کے بارے میں بھی ہم نے وضاحت کی ہے اور یہ بھی عین احتمال ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اس عورت کو پہلے دیکھا ہوا ہو اور وہ جانتے ہوں کہ وہ حسین و جمیل عورت ہے، کیونکہ جس وقت فضل رضی اللہ عنہ نے اس عورت کو دیکھا تھا، اس وقت حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما وہاں موجود نہیں تھے، بلکہ انھیں تو نبی اکرم ﷺ نے بوڑھوں، بچوں اور عورتوں کے ساتھ رات کے وقت ہی مزدلفہ سے منیٰ روانہ کر دیا تھا، جیسا کہ صحیح بخاری و مسلم (بحوالہ مشکوٰۃ: ۲/ ۸۰۳ تحقیق البانی) ایسے ہی سنن ابو داود و نسائی اور ابن ماجہ (مشکوۃ: ۲/ ۸۰۳) میں خود حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے۔

''لہٰذا ظاہر ہے کہ یہ واقعہ انھوں نے اپنے بھائی فضل سے سنا ہوگا اور انھوں نے بھی یہ تو نہیں کہا کہ وہ عورت ننگے منہ تھی، ان کا اسے خوبصورت کہنا ممکن ہے اچانک نظر پڑنے کا نتیجہ ہو، یا پھر ہو سکتا ہے کہ وہ پہلے سے اسے پہچانتے ہوں اور اس پر مستزاد یہ کہ عورت کا حسن تو اس کے باپردہ ہونے کے باوجود اس کے قد و قامت ہی سے معلوم ہو جاتا ہے، جیسا کہ عربی لغت و شعر میں یہ بات معروف ہے، لہٰذا یہ ضروری نہیں کہ وہ عورت ننگے منہ ہی ہو۔

۲ اس حدیث کا دوسرا جواب یہ ہے کہ وہ عورت حالتِ احرام میں تھی اور غیر محرم لوگوں کے عدمِ وجود کی صورت میں اسے چہرہ ننگا رکھنے کی اجازت تھی اور کسی نے بھی یہ نہیں کہا کہ فضل کے سوا کسی دوسرے شخص نے بھی اس عورت کو دیکھا ہو اور (نبی اکرم ﷺ کے پیچھے سوار ہونے کی وجہ سے) فضل رضی اللہ عنہ نے اسے دیکھا اور نبی اکرم ﷺ نے نہ صرف اسے زبانی منع کیا، بلکہ ان کی ٹھوڑی پکڑ کر ان کا چہرہ ہی دوسری طرف پھیر دیا تھا، اس عورت کا چہرہ احرام کی وجہ سے ننگا تھا، نہ کہ ننگا رکھنے کے جواز کی بنا پر۔ لہٰذا یہ حدیث قائلین کشفِ جواز کی دلیل نہیں بن سکتی۔[1]

[1] اضواء البیان (٦/ ٦٠٠، ٦٠٢)

علامہ شنقیطی رحمہ اللہ کے ان جوابات سے ملتے جلتے خیالات کا اظہار ہی شیخ تویجری نے الصارم المشہور میں کیا ہے، بلکہ غالباً ان کے خیالات انھیں سے اخذ کردہ ہیں، لہٰذا انھیں دہرانے کی ضرورت نہیں۔[1]

غرض کہ یہ حدیث بھی فریقِ ثانی کے لیے صریح دلیل کا کام نہیں دے سکتی، بلکہ اس میں بھی کئی احتمالات پائے جاتے ہیں۔

پانچویں دلیل:

فریقِ ثانی کی پانچویں دلیل صحیح بخاری و مسلم اور سنن بیہقی میں حضرت سہل بن سعد رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، جس میں وہ بیان کرتے ہیں کہ ایک عورت نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئی اور کہنے لگی: اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم!

"جِئْتُ لِأَهَبَ لَكَ نَفْسِي فَنَظَرَ إِلَيْهَا رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ فَصَعَّدَ النَّظَرَ إِلَيْهَا وَصَوَّبَهٗ ثُمَّ طَأْطَأَ رَأْسَهٗ"

''میں اس لیے آئی ہوں کہ اپنا آپ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے حوالے کر دوں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی طرف سر سے پاؤں تک دیکھا اور پھر سرِ اقدس جھکا لیا۔''

جب اس عورت نے دیکھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس میں رغبت نہیں ہے، تو وہ ایک طرف ہو کر بیٹھ گئی۔[2]

پانچویں دلیل کا تجزیہ:

اس حدیث سے چہرہ ننگا رکھنے پر استدلال کیا جاتا ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس میں ایسی کوئی دلیل نہیں ہے، کیونکہ امام ابن العربی رحمہ اللہ کے بقول اس حدیث میں پیش آمدہ واقعہ نزولِ حجاب سے پہلے کا ہے اور اگر یہ پہلے کا نہیں تو پھر ہوسکتا ہے کہ وہ عورت پردے سے ہو، جیسا کہ امام ابن العربی

---

[1] دیکھیں: اللباب (ص: ٥٣، ٥٤) صحيح البخاري مع الفتح، رقم الحديث (٥١٢١، ٥١٤٩) صحيح مسلم مع شرح النووي (٥/ ٩/ ٢١١، ٢١٢) صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (١٨٥٦) صحيح سنن الترمذي، رقم الحديث (٨٨٨) صحيح سنن النسائي، رقم الحديث (٣١٣١) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٨٨٩) مسند أحمد (٥/ ٣٣٠)

[2] صحيح البخاري مع الفتح (٩/ ١٨٠، ١٨١) و حجاب، الألباني (ص: ٢٩)

سے فتح الباری شرح صحیح بخاری میں منقول ہے۔[1]

شیخ فرید الہنداوی کے بقول سیاقِ حدیث کی رو سے یہ بات بعید از امکان لگتی ہے کہ اس عورت نے ہر کس و ناکس کے لیے اپنے چہرے کو کھلا چھوڑا ہوا ہو، بلکہ عین امکان ہے کہ اس نے اپنے آپ کو نبیِ اکرم ﷺ کی خدمتِ اقدس میں نکاح کے لیے پیش کرتے وقت اپنے چہرے سے نقاب اٹھایا ہو، تاکہ آپ ﷺ اسے بچشم خود دیکھ کر کوئی فیصلہ کر سکیں اور شیخ حمود التویجری سے نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''کئی احادیث کی رو سے ثابت ہے کہ منگنی کی غرض سے عورت کو دیکھنا مباح ہے (جیسا کہ ان میں سے بعض احادیث گزر چکی ہیں) لہٰذا اس مذکورہ حدیث میں منگنی کا ارادہ رکھنے والے شخص کے سوا کسی دوسرے کے سامنے چہرہ ننگا کرنے کے جواز پر دلالت کرنے والی کوئی چیز نہیں ہے، ورنہ یہ چیز حدیث کو بے محل یا نا مناسب مقام پر محمول کرنے والی بات ہوگی۔''[2]

جبکہ اس حدیث کی شرح کے دوران میں فتح الباری میں حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ نے بڑی عمدہ بحث ذکر کی ہے، جس میں وہ لکھتے ہیں:

''اگر عورت سے شادی کا ارادہ ہو تو اس کے اوصاف و محاسن کو بغور دیکھنا جائز ہے، اگرچہ پہلے سے منگنی نہ بھی کی ہوئی ہو اور نہ پہلے سے شادی کی رغبت ہو۔''

آگے چل کر خاص نبیِ اکرم ﷺ کے بارے میں آپ ﷺ کے معصوم ہونے کی بنا پر لکھتے ہیں:

''وَالَّذِيْ تَحَرَّرَ عِنْدَنَا أَنَّهُ ﷺ لَا يَحْرُمُ عَلَيْهِ النَّظَرُ إِلَى الْمُؤْمِنَاتِ الْأَجْنَبِيَّاتِ بِخِلَافِ غَيْرِهِ''[3]

''ہمارے نزدیک جو بات طے ہے وہ یہ ہے کہ عام مسلمانوں کے برعکس نبیِ اکرم ﷺ پر مومن غیر محرم عورتوں کی طرف دیکھنا حرام نہیں تھا (کیونکہ آپ ﷺ تو معصوم تھے)۔''

حافظ موصوف کی اس بات کو سامنے رکھا جائے تو پھر مذکورہ حدیث سے چہرہ ننگا رکھنے کے جواز پر استدلال کرنا اور بھی غیر منطقی ہو جاتا ہے۔

---

[1] فتح الباري (٩/ ٢١٠)

[2] اللباب (ص: ٦٠، ٦١)

[3] فتح الباري (٩/ ٢١٠)

چھٹی دلیل:

فریقِ ثانی کی چھٹی دلیل صحیح بخاری، سنن ابو داود، نسائی، بیہقی، مسند احمد اور محلّی ابن حزم میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ایک حدیث ہے، جس میں وہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اپنے عید پڑھنے کا واقعہ بیان کرتے اور بتاتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت بلال رضی اللہ عنہ کے ساتھ عورتوں کی طرف جاتے اور انھیں وعظ کرتے، ان سے بیعت لیتے، صدقہ کرنے کا حکم فرماتے اور وہ (صحابیات رضی اللہ عنہن) حضرت بلال رضی اللہ عنہ کے کپڑے پر اشیاے صدقہ (کانوں کی بالیاں اور انگوٹھیاں وغیرہ) ڈال دیتی ہیں، اس کی منظر کشی کرتے ہوئے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں:

”فَرَأَيْتُهُنَّ يَهْوِيْنَ بِأَيْدِيهِنَّ يَقْذِفْنَهُ فِي ثَوْبِ بِلَالٍ“ [1]

”میں نے انھیں دیکھا کہ وہ اپنے ہاتھوں (اپنے صدقات بالیاں اور انگوٹھیاں وغیرہ) حضرت بلال رضی اللہ عنہ کے کپڑے میں ڈال رہی تھیں۔“

اس حدیث میں ہاتھوں سے صدقات ڈالنے کے الفاظ سے استدلال کیا گیا ہے، حالانکہ یہ استدلال بہت بے جان سا ہے کہ ان عورتوں کے ہاتھ ننگے تھے۔ اسی لیے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے دیکھ لیے، لہٰذا ہاتھوں اور چہرے کا پردہ واجب نہ ہوا، اگر ہوتا تو وہ ان کے ہاتھ نہ دیکھ پاتے، بلکہ عورتوں نے ہاتھوں کا بھی پردہ کیا ہوا ہوتا، یہ فریقِ ثانی کا طریقۂ استدلال ہے۔

چھٹی دلیل کا تجزیہ:

درحقیقت کئی ایک وجوہات کی بنا پر یہ حدیث ان کی دلیل نہیں بن سکتی:

1. اس حدیث میں اشارہ تک نہیں ملتا کہ عورتوں کے ہاتھ ننگے تھے اور وہ ننگے ہاتھوں سے صدقہ کے زیورات حضرت بلال رضی اللہ عنہ کے کپڑے میں ڈال رہی تھیں۔ جب ایسی کوئی وضاحت مذکور ہی نہیں تو پھر زبردستی اسے کیوں کشید کیا جائے؟

2. یہ بھی تو عین ممکن ہے کہ عورتوں نے اپنی چادروں میں ہاتھ رکھے باپردہ طریقے سے اشیاے صدقہ اس کپڑے میں ڈالی ہوں اور یہ ایسی بات ہے کہ آج بھی خواتین ایسا کرنا چاہیں یا کرتی ہیں تو

---

[1] صحيح البخاري مع الفتح (٢/ ٤٦٥) صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (١٠١١، ١٠١٢، ١٠١٣) صحيح سنن النسائي، رقم الحديث (١٤٩٥) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٢٧٣) حجاب الألباني (ص: ٣١، ٣٢)

انھیں کوئی مشکل پیش نہیں آتی اور نہ آ سکتی ہے، بلکہ چادر کے اندر ہی سے ہاتھ بڑھا کر کچھ بھی کہیں رکھا یا ڈالا جا سکتا ہے۔

③ اس امکان کو بھی ہرگز نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ اس زمانے کے مروج طریقے کے مطابق عورتوں نے دستانے پہن رکھے ہوں، کیونکہ اس وقت اور آج بھی پردہ دار خواتین میں سے بعض عورتیں پردے کے التزام اور اپنی آسانی کی خاطر اپنے ہاتھوں پر دستانے چڑھا لیتی ہیں اور دستانے پہنے ہوئے ہاتھوں کو بھی ہاتھ ہی کہا جائے گا، لہٰذا حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا یہ کہنا کہ عورتیں اپنے ہاتھوں سے اشیاے صدقہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ کے کپڑے میں ڈالنے لگیں، ان الفاظ کا اطلاق دستانے والے ہاتھوں پر بھی ہوتا ہے۔

④ اس حدیث میں تو ہاتھوں سے اشیاے صدقہ گرانے یا ڈالنے کا ذکر ہے، اس سے ایک تو ان ہاتھوں کا ننگا ہونا ہی ثابت نہیں ہوتا اور اگر مان ہی لیا جائے تو بھی اس حدیث سے چہرہ ننگا رکھنے کے جواز پر استدلال کرنا ''دور کی کوڑی لانے'' کے مترادف ہے۔

⑤ اس حدیث کی تخریج کے بعد "حجاب المرأة المسلمة" کے مؤلف نے علامہ ابن حزم (۳/ ۲۱۷) کا قول نقل کیا ہے، جس میں انھوں نے کہا ہے کہ عورت کے ہاتھ اور چہرہ مقامِ ستر نہیں ہیں، تو اس حجاب و نقاب کے تعلق سے واضح کر دیں کہ اس مسئلے میں علامہ ابن حزم رحمہ اللہ کی بات قطعاً ناقابلِ التفات ہے، بلکہ نقاب و حجاب اور گانے بجانے ہر دو کے سلسلے میں موصوف سے دامنِ تحقیق چھوٹ گیا ہے، حتیٰ کہ ان کی کتاب "طوق الحمامة" دیکھتے وقت تو یقین کرنا ہی مشکل ہو جاتا ہے کہ یہ علامہ ابن حزم جیسے نابغۂ روزگار شخص کی تالیف ہے۔[1]

ساتویں دلیل:

ایسے ہی جوازِ کشف کے قائلین حضرت فاطمہ بنت قیس رضی اللہ عنہا سے مروی ان کے واقعۂ طلاق سے بھی استدلال کرتے ہیں، جس میں صحیح مسلم کی روایت کے مطابق وہ بیان کرتی ہیں:

''ان کے شوہر حضرت عَمرو بن حفص نے انھیں تیسری طلاق (طلاقِ بتہ) دے دی، وہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں فرمایا (کہ عَمرو چونکہ

---

[1] اللباب (ص: ٦٢، ٦٣)

موجود ہی نہیں لہٰذا) تم ام شریک رضی اللہ عنہا کے گھر میں عدت گزار لو۔"

پھر فرمایا:

"ام شریک رضی اللہ عنہ تو بڑی غنی اور سخی صحابیہ ہیں اور ان کے یہاں مہمان کثرت سے ہوتے ہیں اور میں نہیں چاہتا کہ اگر کبھی اتفاق سے تمھارا دوپٹا گر جائے یا پنڈلی سے کپڑا اٹھ جائے تو کوئی شخص تمھارے جسم کا کوئی حصہ دیکھے، جسے کسی کا دیکھ لینا تمھیں ناپسند ہو، لہٰذا تم اپنے چچازاد بھائی حضرت ابن ام مکتوم رضی اللہ عنہ کے گھر منتقل ہو جاؤ کہ وہ نابینا ہیں اور اگر کبھی دوپٹا اتار بھی لوگی تو وہ تمھیں نہیں دیکھ سکیں گے، چناں چہ وہ ان کے گھر منتقل ہوگئیں۔"[1]

ساتویں دلیل کا تجزیہ:

اس حدیث سے چہرہ ننگا رکھنے کے جواز پر استدلال کیا گیا ہے اور اس سے استدلال بھی ہر دو فریق نے کیا ہے، چہرے کو مقامِ ستر ماننے والوں نے بھی اور چہرے کو مقامِ ستر نہ ماننے والوں نے بھی!!

اس حدیث میں جو «إِذَا وَضَعْتِ خِمَارَكِ لَمْ يَرَكِ» آیا ہے، یہاں لفظِ "خمار" کے بعد «لَمْ يَرَكِ» کا آنا اس بات کا قرینہ ہے کہ دیکھنے سے سارے جسم اور خصوصاً چہرے کا نہ دیکھنا مراد ہے، جیسا کہ "غريب الحديث لابن الأثير" اور "فتح الباري" سے خمار کی لغوی تشریح ذکر کی جا چکی ہے کہ اس سے اور "الاعتجار" سے مراد وہ کپڑا ہے، جو سر اور چہرے دونوں ہی کو ڈھانپ لے، لہٰذا کہا جا سکتا ہے کہ یہ قائلینِ وجوب حجاب کی دلیل ہے نہ کہ قائلینِ جوازِ کشف کی، جیسا کہ موجبین کے دلائل میں سے تیسری حدیث کے تحت بات گزر چکی ہے، لہٰذا اس کا تفصیلی تجزیہ تحصیلِ حاصل ہے۔

خلاصۂ بحث:

قارئینِ کرام! یہ فریقِ ثانی کے سات موٹے موٹے دلائل ہیں، جن سے انھوں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ عورت کے لیے چہرے کا پردہ واجب نہیں، بلکہ وہ محض افضل و مستحب ہے اور ایسے ہی چند دیگر دلائل بھی ہیں، جن سے استدلال کیا جاتا ہے۔[2]

لیکن ان کی حیثیت بھی کچھ ایسی ہی ہے، جیسی کہ ان سات کی ہے، لہٰذا ان سے صرفِ نظر کرتے

---

[1] الحجاب (ص: ٣٠، ٣١) صحيح مسلم مع شرح النووي (٥/ ٩٩، ١٠٠)

[2] دیکھیں: الحجاب للألباني (ص: ٢٥۔ ٣٣) واللباب (ص: ٣٨۔ ٨٢)

ہیں۔ ان کے برعکس چہرے کے پردے کو واجب قرار دینے والوں کے دلائل کثرت کے ساتھ ہیں، جن میں سے بعض ترک کرنے کے باوجود قرآن کے چھے مقامات سے اور پندرہ احادیث سے، سات آثارِ صحابہ رضی اللہ عنہم سے، حضرت شعیب علیہ السلام کی بیٹی کے عمل اور تفسیرِ فاروق رضی اللہ عنہ سے، متعدد تابعین رحمہم اللہ کے آثار سے، ائمہ وفقہاے مذاہب اربعہ کے اقوال سے اور اہلِ حدیث علما سمیت اکیس مختلف علما کی آرا وتصریحات سے ثابت کیا جا چکا ہے کہ چہرے کا پردہ واجب ہے، محض افضل ومستحب نہیں۔

لہٰذا تمام مسلمان خواتین اور نوجوان لڑکیوں کو چاہیے کہ وہ پردے کا خصوصی اہتمام کریں اور چہرے پر نقاب رکھیں، اسی میں ان کے دین ودنیا کی بھلائی اور عزت وحشمت ہے۔ واللہ الموفق

عورت کے کار وغیرہ کی ڈرائیونگ کرنے کا حکم:

عورتوں کے لیے چہرے کے وجوبِ حجاب ونقاب کی بنیاد پر اہلِ علم نے یہ فتویٰ بھی دیا ہے کہ عورت کے لیے گاڑی چلانا جائز نہیں۔

اس سلسلے میں مفتیِ عالمِ اسلام شیخ ابن باز رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

''اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ وَالصَّلَاۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی رَسُوْلِ اللّٰہِ، أَمَّا بَعْدُ!

روزنامہ ''الجزیرۃ'' میں عورت کے گاڑی چلانے کے بارے میں لوگوں نے کافی لے دے شروع کر رکھی ہے، حالانکہ یہ بات کسے معلوم نہیں کہ عورت کا ڈرائیونگ کرنا بہت سے ایسے مفاسد کا موجب ہے جو اس کے حق میں لکھنے والوں پر بھی مخفی نہیں اور ان مفاسد میں سے عورت کے ساتھ حرام خلوت کا وقوع، بے پردگی، مردوں کے ساتھ بے مہابا اختلاط اور اس ناجائز فعل کا ارتکاب بھی ہے، جس کی وجہ سے یہ امور حرام قرار دیے گئے ہیں اور شریعتِ مطہرہ نے ان تمام وسائل وذرائع کو بھی ممنوع قرار دے دیا ہے، جو کسی حرام کے ارتکاب تک پہنچاتے ہوں اور انھیں بھی حرام کر دیا ہے۔

''اللہ تعالیٰ نے نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن اور عام مومنوں کی عورتوں کو گھروں کی چار دیواری کے اندر قرار پکڑنے کا حکم دیا ہے، ایسے ہی حجاب وپردہ کرنے اور غیر محرم مردوں کے سامنے زیب وزینت کے اظہار سے اجتناب کرنے کا بھی حکم فرمایا ہے، کیونکہ یہ تمام امور اس اباحیت وفحاشی کا سبب ہیں، جو معاشرے کے لیے زہرِ قاتل

ہیں، چنانچہ ارشادِ الٰہی ہے:

﴿ وَ قَرْنَ فِيْ بُيُوْتِكُنَّ وَ لَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِيَّةِ الْاُوْلٰى وَ اَقِمْنَ الصَّلٰوةَ وَ اٰتِيْنَ الزَّكٰوةَ وَ اَطِعْنَ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ﴾ [الأحزاب: ٣٣]

''اور اپنے گھروں میں قرار پکڑو اور اپنا بناؤ سنگھار جاہلیت کی طرح دوسروں کو نہ دکھاتی پھرو اور نماز قائم کرو اور زکات ادا کرو اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو۔''

نیز فرمانِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِكَ وَبَنٰتِكَ وَ نِسَآءِ الْمُؤْمِنِيْنَ يُدْنِيْنَ عَلَيْهِنَّ مِنْ جَلَابِيْبِهِنَّ ذٰلِكَ اَدْنٰٓى اَنْ يُّعْرَفْنَ فَلَا يُؤْذَيْنَ﴾ [الأحزاب: ٥٩]

''اے نبی! اپنی بیویوں، بیٹیوں اور مومنوں کی عورتوں کو حکم فرما دیجیے کہ وہ اپنے اوپر چادریں اوڑھ لیں، تاکہ وہ بہ آسانی پہچانی جاسکیں اور کوئی انھیں ستانے کے درپے نہ ہو۔''

نیز ارشادِ ربانی ہے:

﴿ وَقُلْ لِّلْمُؤْمِنٰتِ يَغْضُضْنَ مِنْ اَبْصَارِهِنَّ وَيَحْفَظْنَ فُرُوْجَهُنَّ وَلاَ يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ اِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَلْيَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلٰى جُيُوبِهِنَّ وَلاَ يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ اِلَّا لِبُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ اٰبَآئِهِنَّ اَوْ اٰبَآءِ بُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ اَبْنَآئِهِنَّ اَوْ اَبْنَآءِ بُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ اِخْوَانِهِنَّ اَوْ بَنِيْٓ اِخْوَانِهِنَّ اَوْ بَنِيْٓ اَخَوٰتِهِنَّ اَوْ نِسَآئِهِنَّ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُنَّ اَوِ التّٰبِعِيْنَ غَيْرِ اُولِى الْاِرْبَةِ مِنَ الرِّجَالِ اَوِ الطِّفْلِ الَّذِيْنَ لَمْ يَظْهَرُوْا عَلٰى عَوْرٰتِ النِّسَآءِ وَلاَ يَضْرِبْنَ بِاَرْجُلِهِنَّ لِيُعْلَمَ مَا يُخْفِيْنَ مِنْ زِيْنَتِهِنَّ وَتُوْبُوْٓا اِلَى اللّٰهِ جَمِيْعًا اَيُّهَ الْمُؤْمِنُوْنَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ﴾ [النور: ٣١]

''اور مومن عورتوں سے فرما دیجیے کہ وہ اپنی نگاہیں نیچی رکھیں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں اور اپنی زیب و زینت کو ظاہر نہ کریں، سوائے اس کے جو ظاہر ہے اور اپنے گریبانوں پر اپنی اوڑھنیاں ڈال لیں اور اپنی زینت کو کسی کے سامنے ظاہر نہ کریں، سوائے اپنے شوہروں، اپنے باپوں، اپنے سسروں، اپنے بیٹوں، اپنے شوہروں کے بیٹوں،

اپنے بھائیوں، اپنے بھتیجوں، اپنے بھانجوں، اپنی میل جول کی عورتوں، اپنے غلاموں، بے غرض زیر دستوں اور ان بچوں کے جو ابھی عورتوں کے بھیدوں سے واقف نہ ہوئے ہوں، وہ زمین پر زور سے پاؤں نہ ماریں کہ ان کی پوشیدہ زینت (پازیب) کا دوسروں کو علم ہو سکے۔ اے مومنو! تم سب اللہ کی طرف تائب ہو جاؤ تا کہ تم فلاح پاؤ۔''

نیز نبیِ اکرم ﷺ کا ارشاد ہے:

《مَا خَلَا رَجُلٌ بِامْرَأَةٍ إِلَّا كَانَ الشَّيْطَانُ ثَالِثَهُمَا》[1]

''کوئی مرد جب کسی عورت کے ساتھ خلوت میں ہوتا ہے تو ان کے مابین تیسرا شیطان آ جاتا ہے۔''

''شریعتِ مطہرہ نے بے عزتی و رسوائی کا موجب بننے والے تمام وسائل و اسباب سے بھی منع کر دیا ہے، جیسے غافل پاکدامن عورتوں پر فحاشی کی تہمت لگانا بھی منع ہے اور اس کی انتہائی سخت سزا مقرر کی گئی ہے، تا کہ معاشرے کو ان امور کے عام ہونے سے پاک رکھا جائے، جو رسوائیوں کا سبب بنتے ہیں۔

''جبکہ عورت کا گاڑی چلانا ان اسباب میں سے ایک ہے جو اس نتیجے تک پہنچانے والے ہیں، جو کسی سے پوشیدہ نہیں ہیں، لیکن شریعت کے احکام سے جہالت اور ان امور کے بُرے نتائج سے لاعلمی، منکرات وممنوعات تک پہنچانے والی اشیا کے بارے میں تساہل برتنے کا سبب ہوتے ہیں اور اسی کے ساتھ ساتھ بکثرت وہ لوگ جو قلبی امراض میں مبتلا ہوتے ہیں، اباحیت پسندی اور غیر محرم عورتوں کو تاڑنے میں تلذذ جن کا شیوہ بن چکا ہوتا ہے، ایسے تمام لوگ اور یہ عوام عورت کی ڈرائیونگ اور اسی طرح کے دوسرے امور میں بلا وجہ و بلا علم نتائج سے بے پرواہ ہو کر غور وخوض کرنے کا سبب بنتے ہیں، جبکہ ارشادِ الٰہی ہے:

﴿ قُلْ اِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّيَ الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَ مَا بَطَنَ وَ الْاِثْمَ وَ الْبَغْيَ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَ اَنْ تُشْرِكُوْا بِاللّٰهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهٖ سُلْطٰنًا وَّ اَنْ تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴾ [الأعراف: ٣٣]

---

[1] صحيح سنن الترمذي، رقم الحديث (٩٣٤) مسند أحمد (١/ ٢٦)

''اے نبی! کہہ دیجیے کہ میرے رب نے ظاہر و باطن ہر قسم کی بے حیائی کی باتوں، گناہ، ناحق کی زیادتی و بغاوت کو حرام کیا ہے اور یہ بھی حرام کیا ہے کہ تم کسی ایسی چیز کو اللہ کا شریک بناؤ، جس کی اللہ نے کوئی سند نہیں اتاری، اور یہ بھی حرام ہے کہ تم اللہ کے ذمے وہ باتیں لگاؤ، جو تم نہیں جانتے ہو۔''

نیز فرمانِ الٰہی ہے:

﴿ وَ لَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّیْطٰنِ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِیْنٌ ۝ اِنَّمَا یَاْمُرُكُمْ بِالسُّوْٓءِ وَ الْفَحْشَآءِ وَ اَنْ تَقُوْلُوْا عَلَی اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴾ [البقرة: ١٦٨، ١٦٩]

''اور شیطان کی پیروی مت کرو، وہ تمھارا صریح دشمن ہے، وہ تمھیں برائیوں اور فحاشیوں کا حکم دیتا ہے اور اس بات پر برانگیختہ کرتا ہے کہ تم اللہ کے ذمے وہ باتیں لگاؤ جو تم نہیں جانتے ہو۔''

نیز نبیِ اکرم ﷺ کا ارشادِ گرامی ہے:

«مَا تَرَكْتُ بَعْدِيْ فِتْنَةً أَضَرُّ عَلَى الرِّجَالِ مِنَ النِّسَآءِ»[1]

''میرے بعد مردوں کے لیے عورتوں سے زیادہ ضرر رساں فتنہ کوئی نہ ہوگا۔''

حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں:

"كَانَ النَّاسُ يَسْأَلُونَ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ عَنِ الْخَيْرِ وَكُنْتُ أَسْأَلُهُ عَنِ الشَّرِّ مَخَافَةَ أَنْ يُدْرِكَنِي، فَقُلْتُ: يَا رَسُولَ اللّٰهِ إِنَّا كُنَّا فِي جَاهِلِيَّةٍ وَّشَرٍّ، فَجَاءَنَا اللّٰهُ بِهَذَا الْخَيْرِ، فَهَلْ بَعْدَ هَذَا الْخَيْرِ مِنْ شَرٍّ؟ قَالَ: نَعَمْ، قُلْتُ: وَهَلْ بَعْدَ ذَلِكَ الشَّرِّ مِنْ خَيْرٍ؟ قَالَ: نَعَمْ، وَفِيهِ دَخَنٌ، قُلْتُ: وَمَا دَخَنُهُ؟ قَالَ: قَوْمٌ يَهْدُونَ بِغَيْرِ هَدْيِيْ، تَعْرِفُ مِنْهُمْ وَتُنْكِرُ، قُلْتُ: فَهَلْ بَعْدَ ذَلِكَ الْخَيْرِ مِنْ شَرٍّ؟ قَالَ: نَعَمْ، دُعَاةٌ إِلَى أَبْوَابِ جَهَنَّمَ، مَنْ أَجَابَهُمْ إِلَيْهَا قَذَفُوهُ فِيهَا، قُلْتُ: يَا رَسُولَ اللّٰهِ! صِفْهُمْ لَنَا، فَقَالَ: هُمْ مِنْ جِلْدَتِنَا، وَيَتَكَلَّمُونَ بِأَلْسِنَتِنَا. قُلْتُ: فَمَا تَأْمُرُنِي إِنْ أَدْرَكَنِي ذَلِكَ؟ قَالَ: تَلْزَمُ جَمَاعَةَ الْمُسْلِمِينَ وَإِمَامَهُمْ،

[1] صحيح البخاري مع الفتح، رقم الحديث (٥٠٩٦) مختصر صحيح مسلم للمنذري، رقم الحديث (٢٠٦٧) صحيح سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٢٣١) صحيح الجامع، رقم الحديث (٥٥٩٧)

قُلْتُ: فَإِنْ لَمْ يَكُنْ لَهُمْ جَمَاعَةٌ وَلَا إِمَامٌ؟ قَالَ: فَاعْتَزِلْ تِلْكَ الْفِرَقَ كُلَّهَا، وَلَوْ أَنْ تَعَضَّ بِأَصْلِ شَجَرَةٍ حَتَّى يُدْرِكَكَ الْمَوْتُ، وَأَنْتَ عَلَى ذَلِكَ"[1]

''لوگ نبیِ اکرم ﷺ سے خیر و بھلائی کے امور کے بارے میں سوال کیا کرتے تھے اور میں شر و برائی کے امور کے بارے میں آپ ﷺ سے پوچھا کرتا تھا کہ میں کہیں ان میں مبتلا نہ ہو جاؤں۔ میں نے عرض کی: اے اللہ کے رسول ﷺ! ہم جہالت اور شر کی زندگی گزار رہے تھے کہ اللہ تعالیٰ خیر (اسلام) لایا تو کیا اس خیر کے بعد شر بھی ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ہاں۔ میں نے پوچھا: کیا اس شر کے بعد پھر خیر کا عہد آئے گا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ہاں اور اس میں ''دخن'' ہوگا، میں نے عرض کی: وہ ''دخن'' کیا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ایک قوم میری تعلیمات کو چھوڑ کر اپنی مرضی کے طریقے پر چل کر بھی اپنے آپ کو ہدایت پر سمجھے گی، تم پہچانو گے اور انکار کرو گے۔ میں نے عرض کی: اس خیر کے بعد پھر شر بھی ہوگا؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ہاں، لوگ جہنم کے دروازوں پر کھڑے اس کی طرف بلا رہے ہوں گے، جس نے ان کی بات مان لی وہ اسے جہنم میں پھینک دیں گے، میں نے عرض کی: اے اللہ کے رسول ﷺ! ہمیں ان لوگوں کے اوصاف بتائیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: وہ ہمیں میں سے ہوں گے اور ہماری ہی زبان بولیں گے۔ میں نے عرض کی: اگر میں اس دور کو پا لوں تو آپ ﷺ مجھے کیا حکم فرماتے ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: مسلمانوں کی جماعت اور ان کے امام کے ساتھ رہو۔ میں نے عرض کی: اگر ان کی کوئی جماعت ہو نہ کوئی امام ہوا؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ان تمام فرقوں سے الگ تھلگ رہو اور اگر تم درخت کی جڑ (اسلام کی بنیاد کتاب و سنت) کو مضبوطی سے پکڑے رہو اور اسی حالت پر تمھیں موت آ جائے تو یہی تمھارے لیے بہتر ہے۔''

میں (ابن باز رحمہ اللہ) ہر مسلمان کو دعوت دیتا ہوں کہ وہ اپنے قول و فعل میں تقویٰ اختیار کرے، فتنوں اور ان کی طرف بلانے والوں سے ہوشیار رہے، ہر وہ امر جو اللہ کی ناراضی کا موجب ہو یا اس کا ذریعہ بننے والا ہو، اس سے دور رہے اور ہر ممکن کوشش کرے کہ وہ ان

[1] صحيح البخاري مع الفتح، رقم الحديث (٣٦٠٦، ٧٠٨٤) صحيح مسلم (٣/ ١٤٧٥) بتحقيق محمد فؤاد عبد الباقي.

لوگوں میں سے نہ ہو، جن کے بارے میں اس حدیث میں نبیِ اکرم ﷺ نے خبر دی ہے۔

''اللہ تعالیٰ ہمیں فتنوں اور فتنہ پروروں سے محفوظ رکھے اور اس امت کے لیے دینِ اسلام کی حفاظت فرمائے اور برائی کی طرف بلانے والوں سے افرادِ امت کو بچائے رکھے اور ہمارے اخبارات میں لکھنے والوں اور تمام مسلمانوں کو ان امور کے سرانجام دینے کی توفیق سے نوازے، جو اس کی رضا وخوشنودی کا موجب ہیں، جن میں مسلمانوں کی صلاح وفلاح اور ان کی دنیا وآخرت میں نجات ہے، اللہ اس کا ولی وخواہاں اور اس پر قادر ہے۔''

وَصَلَّى اللّٰهُ عَلٰى نَبِيِّنَا مُحَمَّدٍ وَّآلِهٖ وَصَحْبِهٖ وَسَلَّمَ.

اسی موضوع (عورت کے کار ڈرائیونگ کرنے) کے بارے میں ہم سعودی عرب کے دوسرے ممتاز عالمِ دین الشیخ محمد بن صالح العثیمین کے فتوے کا ترجمہ ذکر کر رہے ہیں، جس میں انھوں نے اسی مسئلے کے بارے میں قدرے تفصیل سے گفتگو کی ہے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

فضیلۃ الشیخ محمد بن صالح العثمین ...سلمہ اللہ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ ...وبعد

سوال میں عورت کے کار کی ڈرائیونگ کرنے کے حکم کی وضاحت چاہتا ہوں کہ عورت کا کار چلانا شرعاً کیسا ہے؟ اور اس میں آپ کی کیا رائے ہے کہ عورت کے کسی اجنبی ڈرائیور کے ساتھ بیٹھنے سے خود گاڑی چلانے میں خطرہ کم ہے، یعنی اس میں خطرہ کم ہے کہ عورت کسی اجنبی ڈرائیور کے ساتھ بیٹھنے کے بجائے خود گاڑی چلائے؟

جواب اس سوال کے جواب کی بنیاد مسلمان علما کے مابین مشہور دو قاعدوں پر ہے:

1 پہلا قاعدہ یہ ہے کہ جو چیز حرام تک پہنچا دے وہ بھی حرام ہے۔

2 جب مفاسد اور خرابیاں مصالح کے برابر یا ان سے زیادہ ہوں تو مفاسد اور خرابیوں کے دور کرنے کو مصالح ومنافع کے حصول پر مقدّم کرنا ہوگا۔

پہلے قاعدے کی دلیل یہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَلَا تَسُبُّوا الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَيَسُبُّوا اللّٰهَ عَدْوًاۢ بِغَيْرِ عِلْمٍ﴾ [الأنعام: ١٠٨]

''اور (اے ایمان لانے والو!) یہ لوگ اللہ کے سوا جن کو پکارتے ہیں، انھیں گالیاں نہ دو، کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ شرک سے آگے بڑھ کر جہالت کی بنا پر اللہ کو گالیاں دینے لگیں۔''

مصلحت کے تقاضے کے باوجود اللہ نے اس آیتِ کریمہ میں مشرکین کے جھوٹے معبودوں کو گالی دینے سے منع فرمایا ہے، کیوں کہ ان کے معبودوں کو گالی دینا اللہ تعالیٰ کو گالی دینے کا سبب بنتا ہے، یعنی مشرکین کے معبودوں کو گالی دینا انھیں اللہ کو گالی دینے کی طرف لے جائے گا جو حرام ہے۔

دوسرے قاعدے کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے:

﴿يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَ الْمَيْسِرِ قُلْ فِيْهِمَآ اِثْمٌ كَبِيْرٌ وَّ مَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَ اِثْمُهُمَآ اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا﴾ [البقرۃ: ۲۱۹]

''آپ سے پوچھتے ہیں: شراب اور جوئے کا کیا حکم ہے؟ کہو: ان دونوں چیزوں میں بڑی خرابی ہے، اگرچہ ان میں لوگوں کے لیے کچھ منافع بھی ہیں، مگر ان کا گناہ ان کے فائدے سے بہت زیادہ ہے۔''

اس آیتِ کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے جوئے اور شراب کو ان دونوں سے کچھ نفع کے حصول کے باوجود حرام قرار دیا ہے، ان مفاسد کو دور کرنے کے لیے جو ان کے ارتکاب سے یعنی جوا کھیلنے اور شراب پینے سے حاصل ہوتے ہیں۔

ان دونوں قاعدوں کو سامنے رکھتے ہوئے یا ان کی بنا پر عورت کے تنہا گاڑی چلانے کے حکم کی وضاحت ہوجاتی ہے (کیوں کہ) عورت کا گاڑی چلانا بھی بہت سے مفاسد اور خرابیوں پر مشتمل ہے۔ مثلاً:

1. ان مفاسد اور خرابیوں میں سے عورت کا حجاب و پردہ اتار پھینکنا ہے، کیونکہ ڈرائیونگ کرنے سے عورت کا چہرہ ننگا ہوگا، جو دراصل فتنے کی جڑ اور لوگوں کی توجہ کا مرکز ہے۔ عورت کی خوبصورتی اور بدصورتی کا اندازہ بھی اصل میں اس کے چہرے کی وجہ ہی سے کیا جاتا ہے، یعنی جب یہ کہا جاتا ہے کہ یہ خوبصورت عورت ہے یا بدصورت تو ذہن صرف چہرے کی طرف ہی جاتا ہے، جب چہرے کے علاوہ کوئی دوسری چیز مراد ہوتو لازمی طور پر اس کا نام لیا جائے گا اور یوں کہا جائے گا: خوبصورت ہاتھوں والی عورت یا خوبصورت بالوں والی یا پاؤں والی یعنی اس عورت کے

ہاتھ، بال یا پاؤں وغیرہ خوبصورت ہیں۔

''اس وضاحت سے یہ بات واضح ہوگئی کہ توجہ کا اصل مرکز ومحور عورت کا چہرہ ہی ہے۔ ممکن ہے کہ کہنے والا یہ کہے کہ عورت باپردہ ہوکر ڈھاٹا باندھ کر اور کالی عینک لگا کر کار کی ڈرائیونگ کر سکتی ہے تو اس سوال کا جواب یوں دیا جائے گا کہ یہ بات خلافِ واقع ہے، خصوصاً ان عورتوں کے بارے میں جو گاڑی چلانے کی عاشق ہوتی ہیں۔ (اگر یقین نہ آئے تو یہ) سوال ان لوگوں سے پوچھیں، جنھوں نے دوسرے ممالک میں عورتوں کو گاڑی کی ڈرائیونگ کرتے دیکھا ہے اور اگر یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ عورت باپردہ گاڑی چلائے گی تو ممکن ہے کہ ابتدائی مراحل میں باپردہ ہوکر گاڑی چلائے، لیکن اس پر زیادہ دیر تک وہ عمل پیرا نہیں رہ سکے گی اور مداومت اختیار نہیں کر سکے گی، بلکہ مستقبل قریب ہی میں وہ ان عورتوں کے ساتھ جا ملے گی، جو دوسرے ممالک میں بے حجاب و بے پردہ گاڑی چلاتی ہیں، جیسا کہ بے لگام ترقی و انقلاب کا طریق ہے کہ بعض چیزوں یا کسی چیز کو ابتدائی مراحل میں قبول کرنا ذرا آسان نظر آتا ہے اور پھر آہستہ آہستہ بگڑتی ہوئی یہ صورتِ حال معاشرے یا انسان کو ناقابلِ قبول خطرات میں دھکیل دیتی ہے۔

2 عورت کے گاڑی چلانے میں جو مفاسد اور خطرات ہیں، ان میں سے یہ بھی ہے کہ گاڑی کی ڈرائیونگ کرنے سے عورت میں حیا ختم ہوجاتی ہے اور ''حیا ایمان کا ایک جزء ہے۔''[1] جیسا کہ صحیح احادیث میں رسول اللہ ﷺ سے ثابت ہے۔ حیا ہی وہ عمدہ اخلاق اور اچھی عادت ہے جس کا عورت کی فطرت تقاضا کرتی ہے اور حیا ہی عورت کو فساد میں مبتلا ہونے سے یقینی طور پر محفوظ رکھ سکتی ہے، اسی لیے حیا کے بارے میں مثال بیان کی جاتی ہے۔

"أَحْيٰى مِّنَ الْعَذْرَآءِ فِيْ خِدْرِهَا" ''باپردہ کنواری دوشیزہ سے بھی زیادہ حیا دار۔''

جب عورت سے حیا ہی ختم ہوجائے تو پھر اس کے بارے میں کچھ نہ پوچھیے۔

3 عورت کا ڈرائیونگ کرنا اس کے کثرت سے گھر سے نکلنے کا سبب بنتا ہے، جبکہ گھر ہی عورت کے

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٤) صحيح مسلم مع شرح النووي (١/ ٢/ ٦) صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٠١٠) صحيح سنن النسائي، رقم الحديث (٤٦٦٠) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٥٨) صحيح الجامع، رقم الحديث (٣١٩٧)

لیے بہتر ہے۔[1]

جیسا کہ مخلوق کے مصالح کو مخلوق سے زیادہ جاننے والے حضرت محمد رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے۔ چونکہ گاڑی چلانے کے عشاق گاڑی کی ڈرائیونگ میں لذت محسوس کرتے ہیں، اسی لیے وہ بلا وجہ بھی اِدھر، اُدھر بغیر کسی حاجت و ضرورت کے گھومتے رہتے ہیں، تاکہ انھیں گاڑی چلانے میں جو لذت آتی ہے وہ حاصل ہوتی رہے۔

4 عورت مطلق العنان اور آزاد ہو جاتی ہے، جہاں چاہے، جدھر چاہے، جب چاہے اور جونسی غرض و مقصد کے لیے چاہے، وہ خود اکیلی ہی اپنی گاڑی میں بیٹھ کر چلی جاتی ہے۔ بسا اوقات وہ رات گئے تک گھر سے باہر رہتی ہے اور تاخیر سے گھر لوٹتی ہے، جبکہ رات کو تاخیر سے واپس لوٹنا تو لڑکوں کے والدین کے لیے بھی تکلیف دہ ہے تو پھر لڑکیوں کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

5 عورت کا گاڑی چلانا اس کے خاوند اور اہل و عیال کے خلاف اس کی سرکشی و نافرمانی کا باعث بنتا ہے۔ (کیونکہ اگر) اسے کوئی معمولی سی غرض بھی گھر سے نکلنے پر آمادہ کرے تو وہ اکیلی گھر سے نکلے گی اور پھر جہاں اس کا جی چاہے ادھر ہی اپنی گاڑی میں تنہا ہی چلی جائے گی، جیسا کہ بعض نوجوان لڑکوں سے ایسا ہی ہوتا ہے، جو تحمل مزاجی اور بردباری میں عورت سے کہیں زیادہ قوی و طاقتور ہوتے ہیں۔

6 ڈرائیونگ کی وجہ سے بعض جگہوں پر عورت فتنے و فساد کا سبب بنتی ہے، مثلاً:

① روڈ پر ٹریفک کے اشاروں کے پاس رکنے کے وقت۔

② پٹرول پمپ پر گاڑی میں پٹرول ڈلواتے وقت۔

③ عام تفتیش یا چیکنگ کے مقامات پر۔

④ پولیس کے پاس حادثات و مخالفات کی تحقیق کے وقت۔

⑤ ٹائر پنکچر ہونے کی صورت میں ٹائر میں ہوا بھرواتے یا پنکچر لگواتے وقت۔

---

[1] صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (٥٣٠) صحيح ابن خزيمة (٦٨٤) مسند أحمد (٢/ ٧٦، ٧٧) المستدرك للحاكم (١/ ٢٠٩) سنن البيهقي (٣/ ١٣١) اور حدیث کے الفاظ یہ ہیں: ((وَبُيُوْتُهُنَّ خَيْرٌ لَّهُنَّ)) ''ان عورتوں کے لیے ان کے گھر بہتر ہیں۔''

٦ اس وقت بھی عورت مدد کی محتاج ہوگی، جب چلتے چلتے گاڑی میں کوئی خرابی واقع ہوجائے اور گاڑی رک جائے تب اس کا کیا حال ہوگا؟ ایسے میں بسا اوقات اس کا کسی ایسے بدخصلت و کمینے آدمی سے بھی سامنا ہوسکتا ہے، جو اسے اس مشکل سے نکالنے کے عوض اس کی عزت کا سودا کرنے پر مصر ہو، خصوصاً جب عورت ضرورت سے بڑھ کر بے چارگی کی حد تک پہنچ جائے۔

7 ان مفاسد میں سے ساتویں بات یہ ہے کہ سڑکوں پر گاڑیوں کی کثرت و بہتات اور بھیڑ بھاڑ ہوجاتی ہے، جس کے نتیجے میں بعض نوجوانوں کو گاڑی کی ڈرائیونگ سے محروم ہونا پڑتا ہے، جبکہ وہ ڈرائیونگ کے عورت سے زیادہ مستحق ہیں۔

8 عورت کے گاڑی کی ڈرائیونگ سے جو مفاسد اور خرابیاں پیدا ہوجاتی ہیں، ان میں سے آٹھویں خرابی یہ ہے کہ حادثات اور ایکسیڈنٹ کی کثرت ہوجاتی ہے، کیونکہ عورت فطرتی طور پر مرد کی نسبت غیر محتاط، بے فکر اور طاقت و قدرت کے اعتبار سے بے بس ہے، پس جب خطرات دھاوا بولیں گے تو یہ کوئی معقول کارروائی کرنے سے عاجز آجائے گی۔

9 عورت کا ڈرائیونگ کرنا خرچ میں تکلیف دہ و پریشان کن زیادتی کی وجہ سے تنگی میں ڈالنے کا سبب ہے، کیونکہ عورت کی فطرت وطبیعت ہی ایسی ہے کہ وہ اپنے نفس کو لباس وغیرہ سے کامل و مکمل کرنا پسند کرتی ہے۔ کیا آپ کو اس کا اندازہ اس کے کپڑوں سے متعلق شوق وغیرہ سے نہیں ہوسکتا کہ جب بھی کوئی نئے فیشن کا کپڑا بازار میں آئے تو اپنے پاس پہلے سے موجود کپڑوں کو پھینک دیتی ہے اور نئے کپڑے کو جلدی سے خرید لیتی ہے، اگرچہ یہ نیا کپڑا پہلے سے موجود کپڑے کی نسبت نکما ہی کیوں نہ ہو۔

کیا آپ نے عورت کے کمرے کو نہیں دیکھا کہ دیواروں کے ساتھ سنریز وغیرہ آویزاں کر کے اسے کیسے مزین ومزخرف کرتی ہے اور اس کا ڈریسنگ ٹیبل اور میک اپ بکس اس پر مستزاد ہے۔

اسی پر دوسری چیزوں کو قیاس کر لیجیے، بلکہ بہتر یہ ہے کہ گاڑی کو بھی اسی پر قیاس کیجیے، جسے وہ چلائے گی اور جب بھی گاڑی کا کوئی نیا ماڈل آئے گا تو ممکن ہے کہ وہ اپنے پاس پہلے سے موجود گاڑی کو خیر باد کہے اور نئی خرید لے!!

سوال کی دوسری شق:

ہاں سائل کا یہ سوال کہ عورت کا تنہا اور اکیلے گاڑی چلانا اجنبی و غیر محرم ڈرائیور کے ساتھ آگے بیٹھنے سے بہتر ہے اور اس میں خطرہ اندیشہ بھی کم ہے، کیونکہ اجنبی ڈرائیور کے ساتھ آگے بیٹھنے میں خطرہ زیادہ ہے، اس کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

جواب:

میری نظر میں ان دونوں ہی صورتوں یعنی تنہا گاڑی چلانے اور اجنبی ڈرائیور کے ساتھ بیٹھنے میں خطرہ و نقصان ہے اور بعض وجوہ کی بنا پر ان دونوں صورتوں میں سے ہر ایک صورت دوسری سے زیادہ نقصان دہ اور خطرناک ہے، لیکن یہاں ایسی کوئی مجبوری و ضرورت نہیں، جو ان دونوں میں سے کسی ایک کے ارتکاب کو لازم کر سکے۔

نیز میں نے اس سوال کے جواب کے بارے میں اس وقت ذرا تفصیل سے گفتگو کی تھی، جب دین و اخلاق کے محافظ سعودی معاشرے میں عورت کے کار کی ڈرائیونگ کرنے کے بارے میں خوب ہنگامہ برپا ہوا اور اس مسئلے نے شدت اختیار کر کے مضبوط طریقے سے دباؤ ڈالا، تاکہ اس بحث کو جھگڑے کی شکل دے کر اس کی اجازت کے لیے ماحول کو سازگار بنایا جائے اور یہ بات تو قابلِ تعجب نہیں کہ وہ ملک جو اسلام کی آخری پناہ گاہ ہے، اس پر گھات میں بیٹھے ہوئے دشمن کے حملے ہوں، تاکہ وہ اسے ختم کر سکیں، جیسا کہ دشمنانِ اسلام اس پر قابض ہونے اور اپنا تسلط جمانے کا ارادہ رکھتے ہیں، البتہ انتہائی تعجب انگیز بات تو یہ ہے کہ ہمارے شہریوں اور صلبی بیٹوں میں سے ایک ایسی قوم ظہور پذیر ہو، جو ہماری زبان میں بات کریں اور ہمارے جھنڈے کے سائے تلے رہیں، وہ بے لگام مادی و دنیوی ترقی یافتہ کافر حکومتوں میں مروج امور میں پوری دلچسپی لینے لگیں، انھیں بلادِ کفر کے اخلاق رذیلہ بھلے لگیں جن کے ذریعے سے وہ پاکیزہ اخلاق و عادات سے آزاد ہو کر بُرے اخلاق اور گندی عادات کی طرف چل نکلیں، ان کی حالت بالکل ایسی ہی ہو رہی ہے، جیسا کہ امام ابن قیم رحمہ اللہ نے اپنے قصیدے نونیہ میں فرمایا:

هَرَبُوا مِنَ الرِّقِّ الَّذِيْ خُلِقُوْا لَهٗ
وَبَلَوْا بِرِقِّ النَّفْسِ وَالشَّيْطَانِ

''وہ اس غلامی سے بھاگے جس کے لیے وہ پیدا کیے گئے تھے اور شیطان ونفس کی غلامی میں مبتلا ہوگئے۔''

یعنی جب انھوں نے خالق کی عبادت سے جان چھڑائی اور آزادی حاصل کی تو شیطان اور اپنے نفس کی عبادت میں گرفتار ہوگئے۔ ان لوگوں نے یہ گمان کرلیا ہے کہ کافر و بے دین حکومتوں نے مادی طور پر جو پیش رفت وترقی کی ہے، وہ اپنی حریت پسندی و آزاد خیالی کی وجہ سے کی ہے، جبکہ یہ حریت پسندی و آزاد خیالی ان کی اپنی جہالت کی وجہ سے ہے، یا پھر ان کے بہت سے لوگ شرعی احکام اور ان کے عقلی ونقلی دلائل سے جاہل و ناواقف ہیں، جن کے گرد ایسی حکمتیں اور اسرار و رموز جمع ہوتے ہیں، جو دنیا و آخرت میں مخلوق کی اصلاح اور منافع اور کائنات سے مفاسد دور کرنے کے ضامن ہیں۔

فَنَسْأَلُ اللّٰهَ تَعَالٰى لَنَا وَلَهُمُ الْهِدَايَةَ وَالتَّوْفِيْقَ لِمَا فِيْهِ الْخَيْرُ وَالصَّلَاحُ فِيْ الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ.

محمد بن صالح العثیمین

۳/ ۵/ ۱۴۱۱ھ

احکام و آدابِ مساجد اور مقاماتِ نماز

جا نماز کی طہارت کا حکم:

نماز کے لیے لباس کی طہارت کی طرح ہی اس جگہ کا پاک ہونا بھی ضروری ہے، جہاں نماز پڑھی جائے۔ جا نماز کی طہارت کثیر اہلِ علم کے نزدیک نماز صحیح ہونے کے لیے شرط ہے اور بعض کے نزدیک یہ سنت ہے، جبکہ جمہور اہلِ علم کا مسلک ان دونوں کے مابین ہے، ان کے نزدیک یہ واجب ہے، شرط یا سنت نہیں۔ علامہ نواب صدیق حسن خاں رحمہ اللہ نے "الروضة الندية" میں لکھا ہے:

''نماز کے لیے بدن، کپڑے اور جگہ کا پاک ہونا جمہور کے نزدیک واجب ہے۔ بہت سے اہلِ علم نے اسے صحت کے لیے شرط قرار دیا ہے اور بعض نے اسے سنت کہا ہے:

"وَالْحَقُّ الْوُجُوْبُ، فَمَنْ صَلّٰى مُلَابِساً لِنَجَاسَةٍ عَامِدًا، فَقَدْ أَخَلَّ الْوَاجِبَ وَصَلَاتُهُ صَحِيْحَةٌ"[1]

''حق یہ ہے کہ یہ واجب ہے، پس جس نے جان بوجھ کر (بدن، لباس اور مکان میں) گندگی کے ساتھ نماز پڑھ لی، اس نے ایک واجب کو ترک کیا، لیکن اس کی نماز صحیح ہے۔''

امام شوکانی رحمہ اللہ نے ''نیل الاوطار'' میں اس موضوع پر بڑی مدلل بحث کی ہے اور شرط قرار دینے والوں کے دلائل ذکر کر کے ان کا علمی انداز سے تعاقب کیا ہے اور وجوب کے قول کو ترجیح دی ہے۔ تفصیل ''نیل الاوطار'' (۱/۲/ ۱۱۹۔۲۲۲) میں دیکھی جا سکتی ہے۔

امام ابن قدامہ رحمہ اللہ نے "المغني" میں جا نماز کی طہارت اور پاکیزگی کو صحتِ نماز کے لیے بنیادی شرط قرار دیا ہے۔[2]

---

[1] الروضة الندية (١/ ٨٠)

[2] المغنى (٢/ ٤٦٥) تحقيق التركى.

غرض کہ جانماز کی طہارت کو اگرچہ محققین علما کی تحقیقِ دقیق کی رو سے شرط نہ بھی مانیں، تب بھی اس کا حکم وجوب سے ہرگز کم نہیں ہے۔

جانماز کی مختلف اَشکال و اَقسام

یہاں یہ بات بھی واضح کر دیں کہ جانماز سے مراد صرف وہ کپڑا ہی نہیں جو مختلف ڈیزائیوں میں تیار دکانوں پر بکتا ہے، بلکہ جانماز سے مراد ہر وہ جگہ بھی ہے جہاں نماز پڑھی جائے، اس جگہ اور زمین کو بھی جانماز ہی کہا جائے گا اور اس پر جو صف یا مخملیں کپڑے یا قالین کا مخصوص کپڑا بچھایا جائے، اسے بھی جانماز ہی کہا جاتا ہے، ایسے ہی نباتات میں سے کسی چیز کے تنکوں وغیرہ سے بنی چٹائی اور حلال جانور کی رنگی ہوئی کھال کے ٹکڑے (جسے پوستین کہا جاتا ہے) ان سب اشیا کو بھی جانماز کا لفظ شامل ہوجاتا ہے، بشرطیکہ ان پر نماز پڑھی جا رہی ہو ان اشیا پر نبیِ اکرم ﷺ کا نماز پڑھنا کتبِ حدیث میں وارد ہوا ہے، جن میں سے بعض کے بارے میں وارد حدیث ضعیف ہے، جیسے پوستین ہے۔

چٹائی پر نماز:

بساط یا چٹائی پر نبیِ اکرم ﷺ کے نماز ادا فرمانے کا ذکر صحیح بخاری و مسلم، سنن ترمذی، نسائی، ابن ماجہ اور موطا امام مالک میں حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں آیا ہے، اس میں وہ بیان کرتے ہیں کہ میری دادی ملکیہ (رضی اللہ عنہا) نے نبیِ اکرم ﷺ کی دعوت کی، آپ ﷺ جب کھانا تناول فرما چکے تو فرمایا:

«قُوْمُوْا فَلِأُصَلِّ بِکُمْ» ''اٹھو! میں تمھیں نماز پڑھاؤں۔''

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: میں اپنی ایک چٹائی لایا، جو بہت پرانی ہونے کی وجہ سے کالی ہوچکی تھی، میں نے اسے پانی سے صاف کیا، ان کے الفاظ ہیں:

''قُمْتُ إِلٰی حَصِیْرٍ لَّنَا قَدْ اسْوَدَّ مِنْ طُوْلِ مَا لُبِسَ، فَنَضَحْتُہٗ بِمَآءٍ''

آگے وہ فرماتے ہیں:

''فَقَامَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ وَصَفَفْتُ وَالْیَتِیْمُ وَرَآءَہٗ وَالْعَجُوْزُ مِنْ وَّرَائِنَا فَصَلّٰی

لَنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ رَكْعَتَيْنِ ثُمَّ انْصَرَفَ“[1]

”نبیِ اکرم ﷺ کھڑے ہوئے، میں نے اور یتیم نے (جس کا نام ضمیرہ تھا) آپ ﷺ کے پیچھے صف بنائی اور دادی اماں ہمارے پیچھے اکیلی کھڑی ہوگئیں، آپ ﷺ نے ہمیں دو رکعتیں پڑھائیں اور تشریف لے گئے۔“

ایسے ہی ابو سلمہ کے طریق سے صحیح بخاری میں ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے:

«إِنَّ النَّبِيَّ ﷺ كَانَ لَهٗ حَصِيْرٌ يَبْسُطُهٗ وَيُصَلِّيْ عَلَيْهِ»[2]

”نبیِ اکرم ﷺ کے پاس ایک چٹائی تھی، جسے بچھا کر آپ ﷺ اس پر نماز پڑھا کرتے تھے۔“

صحیح مسلم، سنن ترمذی اور دیگر کتبِ حدیث میں حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

”إِنَّهٗ دَخَلَ عَلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ“ ”وہ نبیِ اکرم ﷺ کے پاس گئے۔“

آگے وہ فرماتے ہیں:

”فَرَأَيْتُهٗ يُصَلِّيْ عَلٰى حَصِيْرٍ يَسْجُدُ عَلَيْهِ“[3]

”میں نے آپ ﷺ کو دیکھا کہ ایک چٹائی پر نماز پڑھ رہے ہیں اور سجدہ بھی اسی پر کرتے ہیں۔“

صحیح مسلم اور سنن ابن ماجہ میں یہی بات حضرت ابو کریب رضی اللہ عنہ سے بھی مروی ہے۔[4]

ان سب احادیث سے معلوم ہوا کہ نبیِ اکرم ﷺ چٹائی پر نماز پڑھ لیا کرتے تھے اور سجدہ بھی اسی پر کیا کرتے تھے۔[5]

بعض لوگ جو تکلف سے کام لیتے اور جانماز کے اوپر بھی کنکریاں یا کاغذ وغیرہ رکھ لیتے ہیں کہ زمین کا حصہ پیشانی کے نیچے رہے، ان کے پاس سنتِ رسول اللہ ﷺ سے کوئی دلیل نہیں ہے اور

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٨٠) مختصر صحيح مسلم (٢٣٣) صحيح سنن النسائي، رقم الحديث (٧١١) نيل الأوطار (١/ ٢/ ١٢٦)

[2] صحيح البخاري مع فتح الباري (١/ ٤٩١ و ١/ ٥٨٥)

[3] صحيح مسلم مع شرح النووي (٢/ ٤/ ٢٣٣) صحيح سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٧٣) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٠٢٩) المنتقى مع النيل (١/ ٢/ ١٢٨)

[4] نيل الأوطار (١/ ٢/ ١٢٨)

[5] المغني (٢/ ٤٧٩، ٤٨٠)

امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی صحیح میں "بَابُ الصَّلَاةِ عَلَى الْحَصِيرِ" یعنی چٹائی پر نماز کے بیان کی تبویب میں اس طرف اشارہ کر دیا ہے کہ مصنف ابن ابی شیبہ اور مسند ابو یعلی میں ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے جو مروی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم چٹائی پر نماز نہیں پڑھا کرتے تھے، وہ روایت ان کے نزدیک ثابت نہیں یا پھر صحیح وقوی احادیث کے مقابلے میں شاذ و مردود ہے۔

وہ روایت دراصل یوں ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا گیا کہ اللہ تعالیٰ نے تو قرآن میں فرمایا ہے:

﴿ وَ جَعَلْنَا جَهَنَّمَ لِلْكٰفِرِيْنَ حَصِيْرًا ﴾ [الإسراء: ٨]

''اور ہم نے جہنم کو کافروں کے لیے حصیر بنایا ہے۔''

تو کیا نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم حصیر (چٹائی) پر نماز پڑھا کرتے تھے؟ تو انھوں نے انکار کر دیا اور کہنے لگیں:

"لَمْ يَكُنْ يُصَلِّيْ عَلَى الْحَصِيرِ"[1]

''آپ صلی اللہ علیہ وسلم چٹائی پر نماز نہیں پڑھا کرتے تھے۔''

اس روایت سے غلطی میں نہیں آنا چاہیے، کیونکہ یہ صحیح نہیں ہے۔ حافظ عراقی نے اگرچہ اس کے رواۃ کو ثقہ قرار دیا ہے، لیکن خود انھوں نے بھی ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا ہے کہ اس میں شذوذ و نکارت ہے۔ اگر اس کی کوئی حیثیت تسلیم بھی کر لی جائے تب بھی صحیح وقوی احادیث کی موجودگی میں کہا جائے گا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے اپنے علم کی حد تک نفی کی ہے اور جنھوں نے دیکھا ہے وہ مثبت ہیں اور معروف اصولی قاعدہ ہے کہ نفی کرنے والے پر اثبات کرنے والا مقدم ہوتا ہے، یہی وجہ ہے کہ امام ترمذی رحمہ اللہ کے بقول اکثر اہلِ علم چٹائی وغیرہ پر نماز کو مستحب قرار دیتے ہیں۔[2]

چٹائی کے مختلف سائزوں کے اعتبار سے احادیث میں اس کے مختلف نام وارد ہوئے ہیں، جن میں سے بعض تو ایک دوسرے کے مترادف بھی ہیں، مثلاً وہ احادیث تو ذکر کی جا چکی ہیں، جن میں چٹائی کا لفظ آیا ہے، ایسے ہی حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے صحیحین وغیرہ میں مروی ہے کہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے گھر تشریف لائے اور میرے چھوٹے بھائی سے جن کی چڑیا مر گئی تھی، ہنسی اور مزاح کے انداز سے فرمایا:

---

[1] فتح الباري (١/ ٥٨٥) نيل الأوطار (١/ ٢/ ١٢٨)

[2] سنن الترمذي مع تحفة الأحوذي (٢/ ٢٩٦) نيل الأوطار (١/ ٢/ ١٢٨) فتاویٰ ابن تيمية (٢٢/ ١٦٣۔ ١٩٣)

«يَا أَبَا عُمَيْرُ! مَا فَعَلَ النُّغَيْرُ؟»

''اے ابوعمیر! تمھاری سرخ چونچ والی چڑیا نے کیا کیا؟''

آگے وہ فرماتے ہیں:

''وَنُضِحَ بِسَاطٌ لَّنَا فَصَلّٰى عَلَيْهِ''[1]

''ہماری ایک چٹائی تھی، جسے نرم و صاف کیا گیا، پھر آپ ﷺ نے اس پر نماز پڑھی۔''

سنن ابوداود میں بھی یہ حدیث وارد ہوئی ہے، لیکن وہاں نبیِ اکرم ﷺ کا حضرت ام سلیم رضی اللہ عنہا کے گھر جانا مذکور ہے۔[2]

اس حدیث میں چٹائی کے لیے حصیر کے بجائے بساط کا لفظ آیا ہے۔ امام شوکانی رحمہ اللہ نے نیل الاوطار میں حافظ عراقی سے نقل کیا ہے کہ بساط کا لفظ بھی حصیر پر صادق آتا ہے اور یہ چٹائی جب بہت ہی چھوٹی سی ہو، جس پر صرف ہاتھ اور پیشانی رکھے جا سکتے ہوں، تاکہ گرم جگہ پر سجدہ کرنا ممکن ہو تو ایسے ٹکڑے کو ''خُمرہ'' کہا جاتا ہے جو کھجور کے پتوں کی بنی ہوئی ہوتی ہے۔[3] یہ لفظ بھی احادیث میں وارد ہوا ہے، چنانچہ صحیحین اور سنن ترمذی کے سوا سنن اربعہ میں حضرت عبداللہ بن شداد رضی اللہ عنہ اپنی خالہ میمونہ ام المومنین رضی اللہ عنہا سے روایت بیان کرتے ہیں، جس میں وہ فرماتی ہیں:

''كَانَ النَّبِيُّ ﷺ يُصَلِّي عَلَى الْخُمْرَةِ''[4]

''نبیِ اکرم ﷺ چھوٹی چٹائی پر نماز پڑھا کرتے تھے۔''

سنن ترمذی میں بھی یہ حدیث موجود ہے، لیکن یہ وہاں ام المومنین حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا کے بجائے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے۔[5]

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٢٠٣) صحيح مسلم مع شرح النووي (٧/ ١٤/ ١٢٨) صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (٤١٥٦) صحيح سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٧٤) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٣٧٢٠) مسند أحمد (٣/ ١١٥، ٢٨٨) صحيح الجامع، رقم الحديث (٧٨٣٠) نيل الأوطار (١/ ٢/ ١٢٦)

[2] صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (٦١٣) تحفة الأحوذي (٢/ ٢٩٧)

[3] صحيح سنن الترمذي (١/ ١٠٥) فتح الباري (١/ ٤٣٠) نيل الأوطار (١/ ٢/ ١٢٦)

[4] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٨١) صحيح مسلم مع شرح النووي (٢/ ٤/ ٢٣٠) صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (٦١١) صحيح سنن النسائي، رقم الحديث (٧١٢) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٠٢٩) منتقى الأخبار (١/ ٢/ ١٢٨)

[5] صحيح سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٧٢) موارد الظمآن، رقم الحديث (٣٥٤)

صحیح مسلم، سنن ابو داود، ترمذی اور نسائی میں ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی حدیث میں بھی ''خُمرہ'' کا لفظ وارد ہوا ہے، ایسے ہی صحیح مسلم و سنن نسائی میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں بھی یہ لفظ آیا ہے، نیز بعض دیگر صحابہ و امہات المومنین رضی اللہ عنہم کی مرویات میں بھی یہ لفظ استعمال ہوا ہے۔[1]

ایسے ہی بعض آثارِ صحابہ رضی اللہ عنہم میں ''طنفسہ'' کا لفظ وارد ہوا ہے اور یہ بھی دراصل چٹائی ہی ہوتی ہے، لیکن اس میں اتنا فرق ہوتا ہے کہ اس کے نیچے کوئی مخملیں چیز جیسے اسفنج وغیرہ لگا کر اسے کچھ نرم و گداز کیا گیا ہوتا ہے، چنانچہ تاریخِ امام بخاری کی روایت میں حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

''مَا أُبَالِيْ لَوْ صَلَّيْتُ عَلٰى خَمْسِ طَنَافِسٍ''[2]

''میں اگر پانچ تہوں والی گداز چٹائی پر بھی نماز پڑھ لوں تو مجھے پروا نہیں۔'' یعنی اس کے جائز ہونے پر بھی مجھے کوئی تردد نہیں اور اکہری چٹائی پر نماز کے جواز کی تو بات ہی چھوڑیں۔

حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ کا یہ اثر مصنف ابن ابی شیبہ میں بھی مروی ہے، لیکن وہاں پانچ تہوں کی بجائے اوپر نیچے چھے تہوں یا چھے چٹائیوں کے اوپر نماز پڑھنے کا ذکر ہے۔ امام شوکانی رحمہ اللہ نے نیل الاوطار میں بعض دیگر صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے بھی آثار نقل کیے ہیں، جن میں ان کے تہہ دار موٹی گداز چٹائی پر نماز پڑھنے کا ذکر آیا ہے، چنانچہ مصنف ابن ابی شیبہ میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے بارے میں آیا ہے:

''إِنَّهٗ صَلّٰى عَلٰى طَنْفَسَةٍ'' ''انھوں نے گداز چٹائی پر نماز پڑھی۔''

حضرت ابو وائل رضی اللہ عنہ کے بارے میں مروی ہے:

''إِنَّهٗ صَلّٰى عَلٰى طَنْفَسَةٍ'' ''انھوں نے ایسی ہی چٹائی پر نماز پڑھی۔''

مشہور تابعی حضرت حسن بصری رحمہ اللہ کا قول ہے:

''لَا بَأْسَ بِالصَّلَاةِ عَلَى الطَّنْفَسَةِ''[3] ''گداز چٹائی پر نماز پڑھنے میں کوئی حرج نہیں۔''

جمہور علما و فقہا ان آثار کی بنا پر ایسی مخملیں گداز چٹائی پر نماز کے جواز کے قائل ہیں۔

---

[1] نیل الأوطار شرح منتقی الاخبار (۱/ ۲/ ۱۲۸)

[2] منتقی الاخبار (۱/ ۲/ ۱۹۱) تحقیق طه عبدالرؤف سعد، طبع مکتبة المعارف، ریاض.

[3] نیل الأوطار (۱/ ۲/ ۱۲۹)

پوستین پر نماز؟:

صرف مختلف اقسام کی چٹائیوں پر ہی بس نہیں، بلکہ بعض روایات سے تو پتا چلتا ہے کہ حلال جانور بھیڑ، بکری وغیرہ کی کھال کو دباغت دینے یعنی رنگنے کے بعد اس سے تیار ہونے والی پوستین پر بھی نماز پڑھی جا سکتی ہے، چنانچہ اس سلسلے میں ایک روایت سنن ابو داود، مسند احمد اور مستدرکِ حاکم میں حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، جس میں وہ بیان کرتے ہیں:

«كَانَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ يُصَلِّي عَلَى الْحَصِيرِ وَالْفَرْوَةِ الْمَدْبُوغَةِ»[1]

''رسول اللہ ﷺ چٹائی اور دباغت دی ہوئی کھال (پوستین) پر نماز پڑھ لیا کرتے تھے۔''

اس روایت سے دو چیزوں پر نماز کے جواز کا پتا چلتا ہے، ان میں سے ایک تو ہے چٹائی، جس کے بارے میں متعدد احادیث صحیحین و سنن کی گزری ہیں۔

رہا معاملہ پوستین یا رنگے ہوئے چمڑے یا کھال پر نماز کا تو وہ اسی حدیث میں مذکور ہے اور یہ حدیث ایسی سند سے مروی ہے، جس پر محدّثینِ کرام نے کلام کیا ہے، مثلاً اس کی سند میں ایک راوی ابو عون محمد بن عبیداللہ بن سعید ثقفی ہیں، جنھوں نے اس روایت کو اپنے والد عبیداللہ سے لیا ہے اور وہ خود تو ثقہ ہیں، جن سے امام بخاری و مسلم نے حجت لی ہے، البتہ ان کے والد عبیداللہ سے ان کے بیٹے ابو عون کے سوا کسی نے روایت نہیں بیان کی، لہٰذا ابو حاتم رازی نے اسے مجہول قرار دیا ہے، جیسا کہ سنن ابی داود کے شارح علامہ شمس الحق عظیم آبادی ڈیانوی نے عون المعبود میں تلخیص السنن کے حوالے سے امام منذری سے نقل کیا ہے۔[2]

صاحب نیل الاوطار نے حافظ عراقی سے نقل کیا ہے کہ اس کی سند میں انقطاع پایا جاتا ہے اور ابن حبان نے عبیداللہ کو ثقہ تبع تابعین رحمہم اللہ میں شمار کیا ہے اور کہا ہے کہ وہ انقطاع والی روایات بیان کیا کرتے تھے۔[3]

اس سے معلوم ہوا کہ یہ حدیث ضعیف اور ناقابلِ استدلال ہے۔ عہدِ حاضر کے معروف محدّث علامہ ناصر الدین البانی نے امام سیوطی کی کتاب ''الجامع الصغیر'' کی تحقیق کر کے اسے صحیح اور

---

[1] سنن أبي داود مع العون (٢/ ٣٦٠) رقم الحديث (٦٥٩) منتقى الأخبار (١/ ٢/ ١٢٧)

[2] عون المعبود (٢/ ٣٦٠)

[3] نيل الأوطار (١/ ٢/ ١٢٧)

ضعیف دو حصوں میں تقسیم کر دیا ہے، اس کتاب میں موصوف نے اس حدیث کو ضعیف الجامع میں وارد کیا ہے۔[1] ایسے ہی انھوں نے سنن اربعہ پر بھی کام کیا ہے اور ان چاروں کتبِ حدیث کو بھی صحیح وضعیف دو الگ الگ حصوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ صحیح سنن اربعہ کو خلیجی ممالک کی وزارتِ تربیت وتعلیم کی مرکزی کمیٹی کے دفتر واقع سعودی عرب ریاض کی طرف سے شائع کر دیا گیا ہے اور شیخ موصوف نے صحیح سنن ابی داود سے زیر بحث حدیث کو نکال دیا ہے۔[2]

غرض کہ اس حدیث کے ضعیف ہونے کی وجہ سے پوستین پر نماز ثابت نہیں ہوتی، لہٰذا اسے ترک کرنے میں زیادہ احتیاط ہے۔ ویسے بھی آج کل جو پوستین دستیاب ہے، وہ بہت مہنگی قسم کی ہوتی ہے، لہٰذا اس پر نماز ادا کرنا شاید کبر ونخوت کا سبب بھی بنتا ہے، اس لیے اس کا استعمال ترک کرنا ہی اولیٰ ہے۔

بچھونے پر نماز:

وہ اشیا جنھیں جا نماز بنا کر ان پر نماز پڑھنا جائز ہے، انہی میں سے ایک وہ جگہ اور چادر بھی ہے، جسے بستر یا بچھونے کے طور پر استعمال کیا جاتا ہو، جس پر لیٹا، بیٹھا اور سویا جاتا ہو اور اس میں بھی کوئی فرق نہیں کہ اس بستر پر مرد سوتا ہے یا عورت یا وہ میاں بیوی کا بستر ہو، البتہ اس سلسلے میں جو بنیادی باتیں پیشِ نظر رہنی چاہییں، وہ یہ کہ ایک تو وہ جگہ یا چادر پاک صاف ہونی چاہیے، کیونکہ یہ تو جانماز کے لیے اگر شرط نہیں تو کم از کم واجب ضرور ہے، جیسا کہ کچھ تفصیل ذکر کی جا چکی ہے۔

دوسری بات جس کے کہنے کی بھی کوئی خاص ضرورت نہیں، کیونکہ وہ بڑی عام فہم ہے اور اسے تو ہر شخص جانتا ہی ہے کہ یہاں بستر سے مراد سونے کی جگہ یا چادر وغیرہ ہے، جسے عربی میں اور کتبِ حدیث میں ''فِرَاش''، یعنی بچھونے کے لفظ سے بیان کیا گیا ہے اور فراش سے آج کل کے بیڈ مراد نہ لیے جائیں، بلکہ عام بچھونا مراد لیا جائے تو اسی میں احتیاط ہے اور یہی اولیٰ بھی ہے۔

اس وضاحت کی روشنی میں آیئے وہ احادیث آپ کے سامنے پیش کریں، جن میں بستر یا بچھونے پر نبیِ اکرم ﷺ کے نماز ادا کرنے کا ذکر آیا ہے، چنانچہ صحیح بخاری ''بَابُ الصَّلَاۃِ عَلٰی

[1] ضعیف الجامع (۲/ ٤/ ۲۲۳)

[2] دیکھیں: صحیح سنن أبي داود، (۱/ ۱۲۹)

الْفِرَاشِ“ کے تحت امام صاحب رحمہ اللہ نے متعدد احادیث وارد کی ہیں، جبکہ اس مسئلہ کو ثابت کرنے کے لیے دو آثارِ صحابہ رضی اللہ عنہم بھی تعلیقاً ذکر کیے ہیں، ان میں سے ایک میں ہے:

”وَصَلّٰی أَنَسٌ عَلٰی فِرَاشِہٖ“[1]

”حضرت انس رضی اللہ عنہ نے اپنے بچھونے یا بستر پر نماز پڑھی۔“

حضرت انس رضی اللہ عنہ کے اس اثر کو امام ابن ابی شیبہ نے مصنف میں اور سعید بن منصور نے سنن میں موصولاً بھی روایت کیا ہے، اس قضیے کو تقویت پہنچانے کے لیے امام صاحب نے ایک دوسرا اثر بھی ذکر کیا ہے، جو اگرچہ بظاہر موقوف ہے، لیکن اس کا حکم مرفوع حدیث کا ہے، چنانچہ اس اثر میں حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

”کُنَّا نُصَلِّيْ مَعَ النَّبِيِّ ﷺ فَیَسْجُدُ أَحَدُنَا عَلٰی ثَوْبِہٖ“

”ہم نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نماز پڑھا کرتے تھے اور ہم میں سے کوئی اپنے کپڑے پر سجدہ کرتا۔“

یہ اثر اگلے ہی باب میں امام صاحب نے موصولاً بھی بیان کیا ہے جو صحیح بخاری کے علاوہ صحیح مسلم اور دیگر کتبِ حدیث میں بھی مروی ہے، اس میں ہے:

”کُنَّا نُصَلِّيْ مَعَ النَّبِيِّ ﷺ فَیَضَعُ أَحَدُنَا طَرَفَ الثَّوْبِ مِنْ شِدَّۃِ الْحَرِّ فِيْ مَکَانِ السُّجُوْدِ“[2]

”ہم نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی معیت میں نماز پڑھا کرتے تھے تو گرمی کی شدت کی وجہ سے ہم میں سے کوئی اپنے کپڑے کا کوئی حصہ اپنے سجدے کی جگہ پر رکھتا تھا۔“

صحیح بخاری میں تعلیقاً اور مصنف عبدالرزاق و ابن ابی شیبہ میں موصولاً حضرت حسن بصری رحمہ اللہ سے مروی ہے:

”إِنَّ أَصْحَابَ رَسُوْلِ اللّٰہِ ﷺ کَانُوْا یَسْجُدُوْنَ وَأَیْدِیْھُمْ فِيْ ثِیَابِھِمْ وَیَسْجُدُ الرَّجُلُ مِنْھُمْ عَلٰی قَلَنْسُوَتِہٖ وَعَمَامَتِہٖ“[3]

---

[1] صحیح البخاري (۱/ ۴۹۱)

[2] صحیح البخاري مع الفتح (۱/ ۴۹۲)

[3] صحیح البخاري مع الفتح(۱/ ۴۹۲، ۴۹۳)

''نبیِ اکرم ﷺ کے صحابہ رضی اللہ عنہم سجدہ کرتے، جبکہ ان کے ہاتھ ان کے کپڑوں میں ہوتے تھے اور صحابہ رضی اللہ عنہم اپنی پیشانیوں کو گرمی سے بچانے کے لیے اپنی ٹوپیوں یا پگڑیوں (کے بلوں) پر سجدہ کرتے تھے۔''

ان احادیث و آثار سے یہ تو واضح ہو جاتا ہے کہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کپڑے پر سجدہ کر لیا کرتے تھے، بستر پر نماز پڑھنا بھی اسی قبیل سے ہے۔ صحابیِ رسول ﷺ حضرت انس رضی اللہ عنہ کے اثر میں یہ ثابت ہے کہ انھوں نے بستر پر نماز پڑھی اور ان کے اس فعل کے صحیح ہونے کی تائید خود نبیِ اکرم ﷺ کے عمل مبارک سے بھی ہوتی ہے، چنانچہ صحیح بخاری کے متعدد مقامات پر ایک حدیث حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے، جس سے ہر جگہ ایک نیا ہی مسئلہ ثابت کیا گیا ہے، ایک جگہ اس سے بستر یا بچھونے پر نماز کا جواز بھی اخذ کیا گیا ہے، چنانچہ اس میں وہ بیان کرتی ہیں:

''كُنْتُ أَنَامُ بَيْنَ يَدَيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ وَرِجْلَايَ فِيْ قِبْلَتِهٖ فَإِذَا سَجَدَ غَمَزَنِيْ فَقَبَضْتُ رِجْلِيْ فَإِذَا قَامَ بَسَطْتُهَا''[1]

''میں نبیِ اکرم ﷺ کے سامنے سوئی ہوئی ہوتی اور میرے پاؤں آپ ﷺ کی جائے سجدہ پر ہوتے، جب آپ ﷺ سجدہ کرنے لگتے تو میرے پاؤں کو ہاتھ سے چوکا لگاتے اور میں اپنے پاؤں سمیٹ لیتی اور جب آپ ﷺ کھڑے ہو جاتے تو میں پھر پاؤں پھیلا لیتی۔''

آگے اسی حدیث میں یہ وضاحت بھی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے الفاظ ہی میں موجود ہے کہ یہ ان دنوں کی بات ہے جب ابھی گھروں میں چراغ نہیں ہوا کرتے تھے۔

دوسری جگہ اور بھی واضح انداز سے مروی ہے:

''إِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ كَانَ يُصَلِّيْ وَهِيَ بَيْنَهٗ وَبَيْنَ الْقِبْلَةِ عَلٰى فِرَاشِ أَهْلِهٖ اِعْتِرَاضَ الْجَنَازَةِ''[2]

''نبیِ اکرم ﷺ نماز پڑھتے جبکہ وہ آپ ﷺ اور قبلہ کے مابین اس طرح لیٹی ہوتی تھیں، جس طرح سامنے جنازہ رکھا ہوتا ہے۔''

---

[1] صحيح البخاري مع فتح الباري (١/ ٤٩١)

[2] صحيح البخاري (١/ ٤٩٢)

اس سے اگلی حدیث میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے بھانجے حضرت عروہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں:

"إِنَّ النَّبِيَّ ﷺ يُصَلِّي، وَعَائِشَةُ مُعْتَرِضَةٌ بَيْنَهُ وَبَيْنَ الْقِبْلَةِ عَلَىٰ الْفِرَاشِ الَّذِي يَنَامَانِ عَلَيْهِ"[1]

"نبیِ اکرم ﷺ نماز پڑھتے جبکہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا آپ ﷺ کے سامنے قبلے کی طرف اس بستر پر لیٹی ہوتیں، جس پر آپ دونوں سویا کرتے تھے۔"

ان سب احادیث سے واضح ہوگیا کہ بستر کی جگہ اور بچھونے کی چادر کے اوپر نماز پڑھی جا سکتی ہے، صرف اس کا پاک ہونا ضروری ہے۔ اس تفصیل سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ سنن ابو داود، ترمذی، نسائی اور دیگر کتبِ حدیث میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے جو حدیث مروی ہے:

"كَانَ النَّبِيُّ ﷺ لَا يُصَلِّي فِي شُعُرِنَا أَوْ لُحُفِنَا"[2]

"نبیِ اکرم ﷺ ہماری باندھنے کی چادر پر یا سوتے وقت اوپر لینے یا لپیٹنے کے کپڑے یعنی رضائی یا لحاف پر نماز نہیں پڑھا کرتے تھے۔"

امام بخاری رحمہ اللہ نے اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ یہ روایت ان کے نزدیک ثابت نہیں یا پھر مذکورہ صحیح تر احادیث کے خلاف ہونے کی وجہ سے شاذ اور نا قابلِ قبول ہے۔ امام ابو داود رحمہ اللہ نے اس روایت کے آخر میں اس حدیث کی علت بھی بیان کی ہے اور وہ علت یہ ہے کہ اس کے ایک راوی عبیداللہ کہتے ہیں: "فِي شُعُرِنَا أَوْ فِي لُحُفِنَا" میں جو شک پایا جاتا ہے وہ میرے والد کی طرف سے ہے۔[3]

گویا انھوں نے شک کے ساتھ یہ روایت بیان کی کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے "شُعُرِنَا" یعنی باندھنے کی چادر کہا یا "لُحُفِنَا" یعنی اُوڑھنے کی چادر کہا، ایسے ہی دوسرے مقام پر ایک راوی کو مجہول قرار دیا ہے۔[4]

غرض کہ اس روایت کو شاذ قرار دیتے ہوئے امام بخاری رحمہ اللہ نے ثابت کیا ہے کہ بستر یا

[1] صحيح البخاري (١/ ٤٩٢)

[2] سنن أبي داود، رقم الحديث (٦٤٥) فتح الباري (١/ ٤٩١)

[3] سنن أبي داود مع العون (١/ ١/ ١٧٤) فتح الباري (١/ ٤٩١)

[4] بحواله نيل الأوطار (١/ ٢/ ١٢٥)

بچھونے پر نماز پڑھنا جائز ہے اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی دوسری حدیث زیادہ سے زیادہ احتیاط پر محمول کی جاسکتی ہے۔

بحری جہاز اور کشتی میں نماز:

جن اشیا پر نماز پڑھنا جائز ہے، ان میں سے ایک جہاز یا کشتی بھی ہے اور اگر خطرہ نہ ہو تو جہاز اور کشتی میں، خصوصاً جہاز میں کھڑے ہو کر نماز ادا کرنی چاہیے۔ اگر کھڑے ہو کر نماز پڑھنے میں کشتی سے گرنے کا خدشہ ہو تو پھر اس میں قدرت کے باوجود بیٹھ کر نماز پڑھنا بھی جائز ہے، چنانچہ مستدرکِ حاکم، سنن دارقطنی اور مسند بزار میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے:

« سُئِلَ النَّبِيُّ ﷺ كَيْفَ أُصَلِّيْ فِي السَّفِيْنَةِ؟ قَالَ: صَلِّ فِيْهَا قَائِمًا إِلَّا أَنْ تَخَافَ الْغَرَقَ »[1]

''نبی اکرم ﷺ سے پوچھا گیا کہ بحری جہاز میں کس طرح نماز پڑھوں؟ (تو آپ ﷺ نے فرمایا:) جہاز اور کشتی میں کھڑے ہو کر نماز پڑھو، سوائے اس کے کہ تمھیں (کشتی سے گر کر) پانی میں غرق ہو جانے کا خطرہ ہو (ایسے میں بیٹھ کر پڑھ لو)۔''

اس مرفوع صحیح حدیث کے علاوہ امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی صحیح کے ایک ترجمۃ الباب میں تین آثارِ صحابہ رضی اللہ عنہم و تابعین رحمہم اللہ بھی ذکر کیے ہیں، جن سے اسی مسئلے کا پتا چلتا ہے، چنانچہ صحیح بخاری میں تعلیقاً اور مصنف ابن ابی شیبہ میں موصولاً حضرت انس رضی اللہ عنہ کے آزاد کردہ غلام عبداللہ بن ابی عتبہ رضی اللہ عنہ کے طریق سے مروی ہے، جس میں وہ کہتے ہیں:

''سَافَرْتُ مَعَ أَبِي الدَّرْدَاءِ وَأَبِيْ سَعِيْدِنِ الْخُدْرِيِّ وَجَابِرِ بْنِ عَبْدِ اللّٰهِ وَأُنَاسٍ قَدْ سَمَّاهُمْ''

''میں نے حضرت ابو الدرداء، حضرت ابو سعید خدری، حضرت جابر بن عبداللہ اور بعض دوسرے صحابہ رضی اللہ عنہم کے ساتھ سفر کیا ہے اور دیگر کے بھی انھوں نے نام لیے۔''

آگے وہ فرماتے ہیں:

''وَكَانَ إِمَامُنَا يُصَلِّيْ بِنَا فِي السَّفِيْنَةِ قَائِمًا، وَنُصَلِّيْ خَلْفَهُ قِيَامًا''[2]

---

[1] صحيح الجامع (٢/ ٣/ ٢٤٤) منتقى الاخبار (١/ ٢/ ١٤٢) صفة صلاة النبي للألباني (ص: ٣٧ طبع المكتب الاسلامي)

[2] صحيح البخاري و فتح الباري (١/ ٤٨٨، ٤٨٩)

’’ہمارا پیش امام ہمیں (کشتی یا بحری) جہاز میں کھڑے ہو کر نماز پڑھاتا تھا اور ہم اس کی اقتدا میں کھڑے ہو کر نماز ادا کرتے تھے۔‘‘

حضرت حسن بصری رحمہ اللہ کا قول امام بخاری رحمہ اللہ نے نقل کیا ہے، جس میں وہ فرماتے ہیں:

’’قَائِمًا مَا لَمْ تَشُقَّ عَلٰی أَصْحَابِكَ تَدُوْرُ مَعَهَا وَإِلَّا فَقَاعِدًا‘‘

’’اگر تمھارے ساتھیوں کے لیے مشقت کا باعث نہ ہو تو کھڑے ہو کر نماز پڑھو، ورنہ بیٹھ کر پڑھ لو۔‘‘

گویا اصل یہی ہے کہ کشتی، لانچ (سٹیمر، موٹر بوٹ) اور خصوصاً جہاز میں بھی کھڑے ہو کر نماز ادا کی جائے اور اگر کشتی میں کھڑے ہو کر نماز پڑھنے میں سر چکرانے اور گر کر غرق ہو جانے کا خطرہ ہو تو پھر بیٹھ کر بھی پڑھی جا سکتی ہے۔ صاحبِ نیل الاوطار نے بحری جہاز میں نماز کے صحیح ہونے پر اجماعِ امت ذکر کیا ہے۔[1]

’’الفتاویٰ الهندية‘‘ (۱/ ۷٤) المعروف فتاویٰ عالمگیری میں فقہاے احناف نے کشتی میں نماز کے بارے میں جو احکام درج کیے ہیں، ان سے استفادہ کرتے ہوئے ’’جدید فقہی مسائل‘‘ کے مولف نے لکھا ہے:

’’اگر جہاز میں کھڑے ہو کر نماز ادا کی جا سکتی ہے تو صاحبین (امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے دونوں شاگردوں امام ابو یوسف و امام محمد رحمہما اللہ) کے مسلک کے مطابق بیٹھ کر نماز ادا کرنا درست نہ ہوگی، امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے گو کہ کشتی میں بہ کراہت اس کی اجازت دی ہے، مگر پانی کے جہاز میں چونکہ عذر اور اضطراب کشتی سے کم ہوتا ہے، اس لیے کم از کم جہاز میں فتویٰ صاحبین ہی کی رائے پر ہونا چاہیے کہ کھڑے ہو کر نماز ادا کرنا ضروری ہے۔‘‘[2]

طوفان وغیرہ کی وجہ سے کھڑے ہو کر نماز ادا کرنا ممکن نہ ہو تو بالاتفاق بیٹھ کر پڑھ سکتے ہیں اور سر گرانی (چکر آنے) کے باعث کھڑا ہونا دشوار ہو تو بیٹھ کر ہی نماز ادا کی جائے گی۔

ہوائی جہاز میں نماز:

یہاں یہ بات بھی ذکر کرتے جائیں کہ بحری جہاز کی طرح ہوائی جہاز میں بھی نماز ادا کی جا

[1] نیل الأوطار (۱/ ۲/ ۱٤۳)

[2] جدید فقہی مسائل (ص: ۴۵)

سکتی ہے۔ غالباً اس لیے شریعت نے نہ صرف خانہ کعبہ بلکہ اس کے مقابل آنے والی (اُوپر کی) پوری فضا کو قبلے کا درجہ دیا ہے، تاکہ اُونچی اور بلند سے بلند جگہ پر بھی نماز ادا کی جا سکے، جیسا کہ ''المغني لابن قدامة'' (٢/ ٤٧٦ محقق) سے پتا چلتا ہے۔ شیخ عبدالرحمٰن جزیری مصری نے ''الفقه على المذاهب الأربعة'' (١/ ٢٠٦) میں ہوائی جہاز (اور سٹیمر ریل گاڑی) کو کشتی پر قیاس کرتے ہوئے اس میں نماز کو درست قرار دیا ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

''وَمَثَلَ السَّفِيْنَةِ الْقُطُرُ الْبُخَارِيَّةُ وَالطَّائِرَاتُ الْجَوِيَّةُ وَنَحْوَهَا''

''بحری جہاز کی طرح ہی سٹیمر، ریل گاڑی اور ہوائی جہاز وغیرہ بھی ہیں۔

ہوائی جہاز میں اشارے سے نماز کے بارے میں سماحۃ الشیخ ابن باز رحمہ اللہ سے ایک سوال کیا گیا تو اس پر ان کا فتویٰ صادر ہوا:

''مسلمان پر واجب یہ ہے کہ جب ہوائی جہاز یا صحرا و بیابان میں نماز پڑھے تو ماہرین (جہاز کے عملے وغیرہ) سے قبلے کی جہت معلوم کر لے یا پھر قبلے کی علامات سے پتا چلائے، تاکہ وہ علی وجہ البصیرت قبلہ رُو ہو کر نماز پڑھے۔ اگر وہ ایسا نہ کر سکے تو قبلہ جہت کی تلاش و جستجو کر کے جدھر بھی توقع ہو منہ کر کے نماز پڑھ لے، اس کی نماز ہو جائے گی، چاہے بعد میں یہ پتا ہی کیوں نہ چلے کہ اس نے غلط سمت منہ کر کے نماز پڑھی تھی۔ کیونکہ اس نے تو اپنی طرف سے کوشش کی اور حسبِ استطاعت اللہ کا تقویٰ اختیار کیا۔ جہاز یا صحرا میں قبلے کی تلاش میں کوشش کیے بغیر اپنی مرضی ہی سے کسی طرف منہ کر کے نماز پڑھ لینا جائز نہیں ہے۔ اگر کسی نے ایسا کیا تو اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ نماز کو دُہرائے، کیونکہ اس نے حسبِ استطاعت تقویٰ اختیار کیا اور نہ کوشش کی۔''

''رہا سائل کا ہوائی جہاز میں بیٹھ کر نماز پڑھنا تو اس میں کوئی حرج نہیں، جب کہ کھڑے ہو کر نماز پڑھنے کی گنجایش نہ ہو، جیسا کہ بحری جہاز اور کشتی میں کھڑے نہ ہو سکنے کی شکل میں نماز کا معاملہ ہے۔ اس کی دلیل یہ ارشادِ الٰہی ہے:

﴿فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ﴾ [التغابن: ١٦]

''حسبِ استطاعت اللہ کا تقویٰ اختیار کرو۔''

اگر کوئی نماز کو مؤخر کر کے ادا کر لے، جب کہ وقت میں وسعت ہو تو اس میں بھی کوئی حرج نہیں اور یہ سب فرض نماز کے سلسلے میں ہے۔ اگر نفلی نماز ہو تو اس کے لیے ہوائی جہاز، گاڑی (کار وغیرہ) یا سواری کے جانور پر نماز پڑھتے وقت قبلہ رو ہونا واجب نہیں ہے، کیونکہ نبیِ اکرم ﷺ سے ثابت ہے کہ آپ ﷺ اپنی اونٹنی پر، جدھر بھی وہ جا رہی ہوتی تھی، نفلی نماز پڑھ لیتے تھے۔ لیکن مستحب یہ ہے کہ تکبیرِ تحریمہ کے وقت ایک مرتبہ قبلہ رو ہو جائے، پھر سواری جدھر بھی جائے جاتی رہے، وہ نماز پڑھتا رہے۔ (دورانِ نماز نمازی کو ادھر اُدھر پلٹنے کی بھی ضرورت نہیں ہے) اور اس طرح نماز پڑھنا حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث کی رُو سے ثابت ہے۔[1] واللہ ولی التوفیق

نیز اس سلسلے میں (طیّارے یا ہوائی جہاز میں نماز کے بارے میں) سعودی فتویٰ کمیٹی کی طرف سے بھی ایک فتویٰ صادر ہوا ہے، جس کا مفہوم بھی یہی ہے جو ہم ذکر کر آئے ہیں۔[2]

بیل گاڑی اور بس میں نماز:

ہوائی جہاز، سٹیمر اور ریل گاڑی کی طرح ہی بیل گاڑی اور بس کا معاملہ بھی ہے۔ ان پر بھی نماز جائز ہے۔[3] اگرچہ بس میں جگہ تھوڑی ہوتی ہے، لیکن بسیں بھی اپنی وضع کے لحاظ سے اس نوعیت کی ہوتی ہیں کہ ان میں بھی نماز ادا کی جا سکتی ہے۔ جیسی جیسی جگہ اور موقع ملے، اس کے مطابق ہی حسبِ ضرورت عمل کر لیا جائے۔ کھڑے ہو کر یا بیٹھ کر ایک مرتبہ قبلہ رُو ہو کر نماز شروع کر لیں اور اژدہام وغیرہ کی وجہ سے پھر مڑنا ممکن نہ ہو، نہ بس یا گاڑی سے باہر نکل کر نماز ادا کرنے کا موقع ہو تو ایک ہی جگہ اسی حالت میں نماز پڑھ سکتے ہیں۔ ایسے میں گاڑی کے مڑنے کے ساتھ نمازی کو رُخ بدلنے کی بھی ضرورت نہیں۔ حتیٰ کہ بعض فقہا جو بس یا ٹرین وغیرہ کے رُخ بدلنے کے ساتھ ہی نمازی کے رُخ بدلنے کا مطالبہ بھی کرتے ہیں، ان کے متاخرین علما اژدہام وغیرہ کی صورت میں ایک جگہ نماز مکمل کر لینے کی اجازت بھی دیتے ہیں۔ مثلاً فتاویٰ دارالعلوم دیوبند (۲/ ۱۱۶) میں مولانا مفتی عزیز الرحمٰن رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

---

[1] الفتاویٰ لسماحة الشيخ ابن باز (۱/ ۴۸، ۴۹) سلسلة كتاب الدعوة، الرياض طبع دوم ۱۴۰۸ھ

[2] فتاویٰ اسلامیہ (۱/ ۳۸۵) طبع دار القلم بيروت

[3] جدید فقہی مسائل (ص: ۴۳)

’’اگر فی الحقیقت ہجوم ایں قدر باشد کہ حرکت رکوع وسجود ممکن نیست ونیز بر صلوٰۃ از خارج ریل قادر نیست، بلا استقبال وبلا قیام ادا کنند۔‘‘

’’اگر واقعی ہجوم واژدہام اس قدر ہو کہ رکوع وسجود کے لیے ادھر اُدھر حرکت ممکن نہ ہو اور نہ ریل سے باہر نکل کر نماز پڑھ سکتا ہو تو استقبالِ قبلہ اور بلا قیام (بیٹھے بیٹھے) ہی نماز ادا کر سکتا ہے۔‘‘

چھت اور لکڑی (تخت پوش) پر نماز:

بلا واسطہ زمین پر پیشانی تو اس وقت بھی نہیں لگتی، جب کہ لکڑی سے تیار کیے گئے جانماز پر نماز ادا کی جائے، جسے جانماز کے مطابق بنا کر چار پائے لگائے اور زمین سے تھوڑا سا اُونچا کیا جاتا ہے۔ اسے بعض لوگ تخت پوش کہتے ہیں۔ اگرچہ لغوی اعتبار سے یہ لفظ صحیح نہیں بیٹھتا، کیونکہ تخت پوش تو دراصل وہ کپڑا ہوتا ہے جو تخت کو ڈھانپنے کے لیے بنایا گیا ہوتا ہے۔ ہر لغت میں غلط العام فصیح والا قاعدہ کام دے جاتا ہے کہ جو غلط ترکیب یا لفظ زبان زدِ خاص وعام ہو جائے، اس کا معروف حساب سے استعمال صحیح ہو جاتا ہے۔ یہی صورت ’’تخت پوش‘‘ میں بھی کارفرما ہے۔

ایسے ہی کسی مکان یا مسجد کی چھت پر نماز پڑھنا بھی جائز ہے۔ چنانچہ صحیح بخاری ومسلم، سنن ابی داود، موطا امام مالک اور مسند احمد میں حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں:

«إِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ سَقَطَ عَنْ فَرَسِهٖ فَجَحَشَتْ سَاقُهٗ، أَوْ كَتِفُهٗ، وَآلٰى مِنْ نِّسَآئِهٖ شَهْرًا فَجَلَسَ فِيْ مَشْرَبَةٍ لَّهٗ دَرَجَتُهَا مِنْ جُذُوْعٍ فَأَتَاهُ أَصْحَابُهٗ يَعُوْدُوْنَهٗ فَصَلّٰى بِهِمْ جَالِسًا وَهُمْ قِيَامٌ فَلَمَّا سَلَّمَ قَالَ: إِنَّمَا جُعِلَ الْإِمَامُ لِيُؤْتَمَّ بِهٖ فَإِذَا كَبَّرَ فَكَبِّرُوْا وَإِذَا رَكَعَ فَارْكَعُوْا وَإِذَا سَجد فَاسْجُدُوْا، وَإِنْ صَلّٰى قَائِمًا فَصَلُّوْا قِيَامًا، وَإِنْ صَلّٰى جَالِسًا فَصَلُّوا جُلُوْسًا»[1]

’’نبیِ اکرم ﷺ اپنے گھوڑے سے گر گئے اور اس گرنے سے آپ ﷺ کی پنڈلی یا آپ ﷺ کا کندھا زخمی ہو گیا۔ آپ ﷺ نے ایک مہینے تک اپنی بیویوں کے پاس نہ

[1] صحيح البخاري (١/ ٤٨٧) صحيح مسلم مع شرح النووي (٢/ ٤/ ١٣٠، ١٣١) صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (٥٦١) صحيح الجامع، رقم الحديث (٢٣٥٧)

جانے کی قسم کھالی۔ آپ ﷺ نے یہ عرصہ اپنے اس بالا خانے میں گزارا، جس کی سیڑھی کھجور کے تنوں کی تھی۔ آپ ﷺ کی عیادت کے لیے آپ ﷺ کے صحابہ رضی اللہ عنہم آئے تو آپ ﷺ نے انھیں بیٹھے بیٹھے نماز پڑھائی، جب کہ وہ سب کھڑے تھے۔ جب آپ ﷺ نے سلام پھیر کر نماز مکمل کرلی تو فرمایا: امام اس لیے بنایا جاتا ہے کہ اس کی اقتدا کی جائے، لہٰذا جب وہ تکبیر کہے تو تم بھی تکبیر کہو، جب وہ رکوع کرے تو تم بھی رکوع کرو اور جب وہ سجدہ کرے تو تم بھی سجدہ کرو۔ اگر وہ کھڑا ہو کر نماز پڑھے تو تم بھی کھڑے ہو کر نماز پڑھو اور جب وہ بیٹھ کر نماز پڑھے تو تم سب بھی بیٹھ کر نماز پڑھو۔''

اِس حدیث کو امام بخاری رحمہ اللہ اپنی صحیح میں گیارہ مقامات پر لائے ہیں اور اس سے ہر مرتبہ نئے سے نیا مسئلہ ہی اخذ کیا ہے۔ "بَابُ الصَّلَاةِ فِي السُّطُوحِ وَالْمِنبَرِ وَالْخَشَبِ" کے تحت لاکر اس حدیث سے چھت اور لکڑی پر نماز کے صحیح ہونے پر استدلال کیا ہے، کیونکہ آپ ﷺ کا بالا خانہ امام ابن بطال کے بقول لکڑی سے بنا ہوا تھا، جیسا کہ کھجور کے تنوں کی سیڑھی سے بھی اندازہ ہوتا ہے۔ اگر یہ مانا جائے کہ سیڑھی کے کھجور کا تنا ہونے سے یہ تو لازم نہیں آتا کہ سارا بالا خانہ ہی لکڑی کا ہو تو پھر کم از کم اس حدیث میں چھت پر نماز کے جواز کی دلیل تو صریحاً موجود ہے۔ بخاری شریف کے مذکورہ باب میں تعلیقاً، اور مصنف ابن ابی شیبہ میں موصولاً حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کا اثر مروی ہے:

"صَلّٰى أَبُوْ هُرَيْرَةَ عَلٰى سَقْفِ الْمَسْجِدِ بِصَلَاةِ الْإِمَامِ"[1]

''حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے مسجد کی چھت پر امام کی نماز کے ساتھ باجماعت نماز ادا کی۔''

مصنف ابن شیبہ کی سند میں ایک راوی صالح مولی توامہ ہے، جس میں کچھ ضعف پایا جاتا ہے، لیکن سنن سعید بن منصور میں یہی اثر ایک دوسرے طریق سے بھی حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے جس سے اس اثر کو قوت حاصل ہو جاتی ہے۔[2]

اگر نبی اکرم ﷺ کے بالاخانے کو لکڑی سے تیار شدہ مان لیا جائے تو لکڑی کے تختے پر نماز کا جواز واضح ہے۔ اگر اس بالاخانے کو لکڑی کا نہ بھی مانا جائے تو بعض دیگر احادیث میں لکڑی پر نبی اکرم ﷺ

---

[1] صحيح البخاري (١/ ٤٨٦)

[2] فتح الباري (١/ ٤٨٦)

کا صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو نماز کا طریقہ سکھلانے کے لیے اپنے منبر پر کھڑے ہو کر نماز پڑھانا صحیح بخاری اور دیگر کتب کی معروف حدیث میں وارد ہوا ہے کہ حضرت سہل بن سعد رضی اللہ عنہ سے لوگوں نے پوچھا:

''مِنْ أَيِّ شَيْئٍ الْمِنْبَرُ؟'' ''منبرِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کس چیز سے بنایا گیا تھا؟''

تو اُنھوں نے فرمایا:

''مَا بَقِيَ فِي النَّاسِ أَعْلَمُ مِنِّيْ، هُوَ مِنْ أَثْلِ الْغَابَةِ عَمِلَهٗ فُلَانٌ مَوْلٰى فُلَانَةٍ لِّرَسُوْلِ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم''

''لوگوں میں اس بات کو جاننے والا اب مجھ سے بڑھ کر کوئی نہیں رہا۔ وہ ایک جنگلی درخت کی لکڑی سے تیار کیا گیا تھا۔ اسے فلاں عورت کے آزاد کردہ فلاں غلام نے بنایا تھا۔''

منبر بنانے والے شخص کے نام میں اختلاف ہے۔ البتہ شارح بخاری نے مختلف روایات کی بنا پر سب سے صحیح تر نام میمون رضی اللہ عنہ ذکر کیا ہے، جو حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ یا ان کی اہلیہ حضرت فکیہہ رضی اللہ عنہا کے آزاد کردہ غلام تھے۔[1]

بہر حال اس حدیث میں ہے:

«وَقَامَ عَلَيْهِ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم حِيْنَ عُمِلَ، وَوُضِعَ فَاسْتَقْبَلَ الْقِبْلَةَ، كَبَّرَ وَقَامَ النَّاسُ خَلْفَهٗ»

''جب یہ منبر تیار کر کے مسجد میں لا کر رکھ دیا گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس کے اُوپر کھڑے ہو گئے اور قبلہ رُو ہو کر تکبیر تحریمہ کہی اور لوگ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے کھڑے ہو گئے۔''

آگے حضرت سہل رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

''پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے قراءت کی، پھر رکوع کیا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے دوسرے لوگوں نے بھی رکوع کیا۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے رکوع سے سر اُٹھایا اور الٹے پاؤں منبر سے نیچے اُتر آئے اور زمین پر سجدے کیے، پھر منبر پر تشریف لے گئے اور رکوع کیا اور پھر جب رکوع سے سر اُٹھایا تو الٹے پاؤں منبر سے اتر کر زمین پر سجدہ ریز ہوئے۔''

اور آگے وہ فرماتے ہیں:

---

[1] فتح الباري (١/ ٤٨٦)

«فَهٰذَا شَأْنُهٗ»[1] ''اس طرح آپ ﷺ نے نماز پڑھی۔''

اس حدیث میں ساری نماز منبر پر پڑھنے کا ذکر ہے سوائے سجدوں کے، کیوں کہ منبر پر جگہ نہ ہونے کی وجہ سے سجدہ کرنا ممکن نہیں تھا، لہٰذا آپ ﷺ نے نیچے اُتر کر سجدے کیے۔ اس سے معلوم ہوا کہ لکڑی پر بھی نماز صحیح ہے۔ یہ شرط نہیں کہ لازماً زمین پر ہی نماز ادا کی جائے۔

ایک وضاحت:

اب رہی کتبِ فقہ میں مذکور یہ بات کہ سجدہ زمین پر پیشانی ٹیکنے ہی کا نام ہے: ''وَضْعُ الْجَبْهَةِ عَلَى الْأَرْضِ'' ہوائی جہاز وغیرہ میں یہ بات نہیں پائی جاتی تو اس سلسلے میں عرض ہے کہ اس قسم کے تکلفات شریعت کی روح سے ہم آہنگ نہیں ہیں، بلکہ یہ ایک اتفاقی بات ہے کہ چونکہ عام طور پر زمین پر ہی پیشانی ٹیکنے کی نوبت آتی ہے، اس لیے فقہا نے زمین (اَرض) کا لفظ استعمال کیا ہے۔ یہ ٹھیک اسی طرح ہے جیسے کوئی شخص کہے:

''روئے زمین پر اسلام سے بہتر کوئی دین نہیں۔''

تو کیا اس سے یہ بات سمجھی جائے گی کہ وہ یہ کہنا چاہتا ہے کہ چاند پر اس سے بہتر ایک اور دین موجود ہے؟ ہرگز نہیں۔ یہی معاملہ زمین پر پیشانی ٹیکنے کا بھی ہے۔

شریعت کا اصل منشا یہ ہے کہ کوئی ایسی چیز ہو جس پر انسان کی پیشانی ٹک سکے، جیسا کہ حدیث کی رو سے کشتی میں نماز کی اجازت دی گئی ہے، حالانکہ سطحِ زمین اور کشتی کے مابین پانی کا بے پناہ فاصلہ موجود ہے۔ اس لیے ہوائی جہاز وغیرہ پر بھی اسی طرح نماز درست ہوگی جس طرح زمین پر اور یہ بات تو جدید فقہی مسائل پر گہری نظر رکھنے والے علمائے احناف نے بھی تسلیم کی ہے۔[2]

سواری کے جانور پر نفلی نماز:

عام سواریوں اور مثلاً بحری وہوائی جہاز، کشتی، ریل گاڑی اور بس وغیرہ پر نماز کا جواز ذکر کیا جا چکا ہے۔ لہٰذا یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ سواری کے جانور پر نفلی نماز کے جواز کا تذکرہ بھی دلائل

[1] صحيح البخاري (١/ ٤٨٦) مختصر صحيح مسلم للمنذري (٤٠٨) صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (٩٥٧) صحيح سنن النسائي، رقم الحديث (٧١٣)

[2] جدید فقہی مسائل (ص: ۴۴) از مولانا خالد سیف اللہ رحمانی فاضل دیوبند

کے ساتھ کر دیا جائے۔

امام نووی، ایسے ہی حافظ عراقی اور حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہم کے بقول اس بات پر اجماع ہے کہ سفر میں سواری پر نفلی نماز جائز ہے۔ امام شافعی سمیت جمہور علما کے نزدیک یہ ہر سفر میں جائز ہے، وہ لمبا ہو یا تھوڑا۔ البتہ امام مالک رحمہ اللہ کے نزدیک یہ صرف اس سفر میں جائز ہے، جو نمازِ قصر کا سفر ہے۔ امام طبری رحمہ اللہ کا کہنا ہے کہ امام مالک کی اس معاملے میں کسی نے موافقت نہیں کی۔

چنانچہ اس سلسلے میں صحیح بخاری و مسلم میں حضرت عامر بن ربیعہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

«رَأَيْتُ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ وَهُوَ عَلٰى رَاحِلَتِهٖ يُسَبِّحُ، يُؤْمِي بِرَأْسِهٖ قِبَلَ أَيِّ وَجْهٍ تَوَجَّهَ، وَلَمْ يَكُنْ يَصْنَعُ، ذٰلِكَ فِي الصَّلَاةِ الْمَكْتُوبَةِ»[1]

''میں نے نبیِ اکرم ﷺ کو سواری پر نفلی نماز پڑھتے ہوئے دیکھا۔ آپ ﷺ جدھر بھی جاتے صرف سرِ اقدس سے اشارہ کر کے نماز پڑھتے جاتے آپ ﷺ فرض نماز میں ایسا نہیں کرتے تھے۔''

ایسے ہی صحیح بخاری اور ترمذی و ابوداود میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

«إِنَّ النَّبِيَّ ﷺ كَانَ يُصَلِّي عَلٰى رَاحِلَتِهٖ نَحْوَ الْمَشْرِقِ فَإِذَا أَرَادَ أَنْ يُّصَلِّيَ الْمَكْتُوبَةَ نَزَلَ فَاسْتَقْبَلَ الْقِبْلَةَ»[2]

''نبیِ اکرم ﷺ اپنی سواری پر مشرق کی طرف منہ کیے (نفلی) نماز پڑھ لیتے تھے، لیکن جب آپ ﷺ فرض پڑھنا چاہتے تو سواری سے اُتر جاتے اور قبلہ رُو ہو کر پڑھتے تھے۔''

صحیح بخاری و مسلم، سنن ابو داود، نسائی، موطا امام مالک اور مسند احمد میں حضرت انس بن سیرین رحمہ اللہ بیان کرتے ہیں کہ جب حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ شام آئے تو ہم ان کے استقبال کے لیے نکلے۔ ہم نے انھیں عین التمر نامی مقام پر پایا اور میں نے دیکھا کہ وہ اپنے سواری کے گدھے پر قبلے سے بائیں جانب منہ کیے ہی نماز پڑھ رہے ہیں۔ ان کے الفاظ ہیں:

''فَرَأَيْتُهٗ يُصَلِّي عَلٰى حِمَارٍ، وَوَجْهُهٗ مِنْ ذَا الْجَانِبِ، يَعْنِي عَنْ يَّسَارِ الْقِبْلَةِ''[3]

---

[1] فتح الباري (٢/ ٥٧٥) نيل الأوطار (١/ ٢/ ١٢٦، ١٤٤) شرح صحيح مسلم مع النووي (٣/ ٥/ ٢١٠)

[2] صحيح البخاري مع الفتح (٢/ ٥٧٤، ٥٧٥) صحيح مسلم مع شرح النووي (٣/ ٥/ ٢١٢) المنتقى (١/ ٢/ ١٤٤)

[3] صحيح البخاري (٢/ ٥٧٦) صحيح مسلم مع شرح النووي (٣/ ٥/ ٢١٢) صحيح سنن أبي داود، رقم ←

’’میں نے دیکھا کہ وہ اپنے سواری کے گدھے پر قبلے سے بائیں جانب منہ کیے ہی نماز پڑھ رہے ہیں۔‘‘

آگے وہ فرماتے ہیں کہ میں نے پوچھا کہ میں نے آپ کو غیر قبلہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے دیکھا ہے۔ اس وقت انھوں نے جواب دیا:

’’لَوْلَا أَنِّي رَأَيْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ فَعَلَهٗ لَمْ أَفْعَلْهُ‘‘[1]

’’میں نے اگر نبیِ اکرم ﷺ کو ایسا کرتے نہ دیکھا ہوتا تو میں بھی ایسا ہرگز نہ کرتا۔‘‘

معلوم ہوا کہ سواری پر نماز پڑھنا ان کے یہاں معروف تھا، لہٰذا اس کے بارے میں سوال ہی نہیں کیا گیا اور غیر قبلہ کے بارے میں پوچھا گیا تو انھوں نے وضاحت کر دی کہ میں نے نبیِ اکرم ﷺ کو غیر قبلہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے دیکھا ہے۔ صحیح بخاری و مسلم، سنن ابو داود اور نسائی میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے موقوفاً اور مرفوعاً ملتے جلتے الفاظ سے مروی ہے:

«إِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ كَانَ يُصَلِّيْ سُبْحَتَهٗ حَيْثُمَا تَوَجَّهَتْ بِهٖ نَاقَتُهٗ»[2]

’’میں نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا ہے کہ آپ ﷺ اپنی اونٹنی پر جدھر بھی وہ جا رہی ہوتی نماز پڑھ لیتے تھے۔‘‘

صحیح مسلم کی دوسری روایت میں ہے:

«رَأَيْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ يُصَلِّيْ عَلٰى حِمَارٍ وَّهُوَ مُتَوَجِّهٌ إِلٰى خَيْبَرَ»

’’میں نے نبیِ اکرم ﷺ کو گدھے پر سوار ہو کر خیبر کی طرف جاتے ہوئے نماز پڑھتے دیکھا۔‘‘

یہ حدیث صحیح مسلم کے علاوہ سنن ابو داود، نسائی اور مسند احمد میں بھی مروی ہے۔[3]

← الحديث (١٠٨٤) صحيح سنن النسائي، رقم الحديث (٧١٧) نيل الأوطار (١/ ٢/ ١٤٤) المغني (٢/ ٤٨٠) طبع دار هجر، القاهرة ـ مصر.

[1] صحيح البخاري (٢/ ٢٧٥) صحيح سنن الترمذي (١/ ١١١) صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (١٠٨٦) نيل الأوطار (١/ ٢/ ١٤٤)

[2] صحيح البخاري (٢/ ٥٧٣، ٥٧٥) صحيح مسلم مع شرح النووي (٣/ ٥/ ٢٠٩) صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (١٠٨٣) صحيح سنن النسائي (١/ ١٦١) صحيح سنن الترمذي (٢٨٨) نيل الأوطار (١/ ٢/ ١٤٤)

[3] صحيح مسلم (٣/ ٥/ ٢٠٩) صحيح سنن أبي داود (١٠٨٥) صحيح سنن النسائي، رقم الحديث (٧١٤)

صحیح مسلم کی ایک حدیث میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کا قرآنِ کریم کی یہ آیت تلاوت کرنا بھی وارد ہوا ہے:

﴿ فَأَيْنَمَا تُوَلُّوا فَثَمَّ وَجْهُ اللَّهِ﴾ [البقرۃ: ۱۱۵]

''تم جدھر بھی منہ کرو اللہ تو ادھر بھی ہے۔''[1]

ان احادیث میں کئی مسائل آ گئے:

1 نفلی نماز سواری کے جانور پر بھی جائز ہے، خصوصاً سفرِ قصر میں۔

2 گدھا اگر چہ ماکول اللحم جانوروں میں سے نہیں، لیکن اس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا نماز پڑھنا ثابت ہے۔ امام نووی رحمہ اللہ نے شرح مسلم میں گدھے والی روایت کو اونٹ یا عام سواری والی جمہور کی روایت کے مخالف اور شاذ قرار دیتے ہوئے ناقابلِ قبول کہا ہے۔[2] لیکن شارح بخاری نے گدھے کی سواری اور اس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے نماز پڑھنے کے احتمال ہی کو ترجیح دی ہے اور اس کے لیے اُنھوں نے صحیح مسلم والی حدیثِ ابن عمر رضی اللہ عنہما سے استدلال کیا ہے، جس میں خیبر اور حمار کا لفظ وارد ہوا ہے۔ پھر اس کی تائید مسند سراج سے نقل کی ہے، جس میں یحییٰ بن سعید کے طریق سے حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں:

«إِنَّهُ رَأَى النَّبِيَّ ﷺ يُصَلِّي عَلَى حِمَارٍ وَهُوَ ذَاهِبٌ إِلَى خَيْبَرَ»[3]

''اُنھوں نے نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو خیبر جاتے ہوئے گدھے پر سوار نماز پڑھتے دیکھا۔''

اس سند کو حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے حسن قرار دیا ہے۔ صحیح بخاری میں ایک باب ہے:

''بَابُ صَلَاةِ التَّطَوُّعِ عَلَى الْحِمَارِ''[4] ''گدھے پر نفلی نماز پڑھنے کا بیان۔''

جس سے امام بخاری رحمہ اللہ کے رجحان کا بھی پتا چل جاتا ہے۔

3 شارح بخاری امام مہلّب کے بقول ارشادِ الٰہی:

﴿فَأَيْنَمَا تُوَلُّوا فَثَمَّ وَجْهُ اللَّهِ﴾ ''تم جدھر بھی منہ کرو اللہ تو ادھر بھی ہے۔'' کا حکم نفلی نماز

---

[1] صحيح مسلم مع شرح النووي (۳/ ۵/ ۱۰۹)

[2] صحيح مسلم مع شرح النووي (۳/ ۵/ ۲۱۱، ۲۱۲)

[3] فتح الباري (۲/ ۵۷۶)

[4] صحيح البخاري (۲/ ۵۷۶)

کے ساتھ خاص ہے اور تمام فقہا نے یہی قول اپنایا ہے۔ البتہ امام احمد اور ابو داود رحمہما اللہ کے نزدیک مستحب یہ ہے کہ نماز شروع کرتے اور تکبیر کہتے وقت ایک مرتبہ سواری پر بھی قبلہ رُو ہو جائیں اور پھر وہ چاہے جس طرف بھی جائے مضائقہ نہیں۔ ان کا استدلال سنن ابو داود، مسند احمد اور سنن دارقطنی میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث سے ہے، جس میں وہ بیان کرتے ہیں:

((إِنَّ النَّبِيَّ ﷺ كَانَ إِذَا أَرَادَ أَنْ يَتَطَوَّعَ فِي السَّفَرِ، اِسْتَقْبَلَ بِنَاقَتِهِ إِلَى الْقِبْلَةِ ثُمَّ صَلّٰى حَيْثُ وَجَّهَتْ رِكَابُهُ))[1]

''نبیِ اکرم ﷺ سفر کے دوران میں نماز کا ارادہ فرماتے تو پہلے سواری کو قبلہ رو کرتے اور پھر وہ چاہے جدھر بھی جاتی، آپ ﷺ نماز پڑھتے جاتے تھے۔''

یہ نفلی نماز کے لیے ہے۔ فرض نماز کے لیے قبلہ رُو ہو کر اور جانور سے اتر کر نماز پڑھنا ضروری ہے۔ سوائے صلوٰۃ الخوف کے۔[2]

صلوٰۃ الخوف پیدل اور سوار ہو کر پڑھنا:

سواری کے جانور پر نفلی نماز جائز اور اس کے لیے قبلہ رُو رہنے کی پابندی بھی نہیں۔ جو احادیث ذکر کی جا چکی ہیں، ان کی رو سے یہ پابندی فرض نماز کے ساتھ خاص ہے کہ سواری سے اُتر کر اور قبلہ رُو ہو کر پڑھی جائے سوائے صلوٰۃ الخوف کے، کیونکہ اس بارے میں تو خود اللہ تعالیٰ نے قرآنِ کریم میں رعایت دی اور فرمایا ہے:

﴿ فَإِنْ خِفْتُمْ فَرِجَالًا أَوْ رُكْبَانًا ﴾ [البقرة: ٢٣٩]

''پھر اگر تم کو ڈر ہو کسی کا تو پیادہ پڑھ لو یا سوار ہو کر۔''

صلوٰۃ الخوف کے طریقے اور اس کی مختلف صورتوں کے ذکر کا یہ موقع نہیں، اس کا مستقل ایک باب الگ ہے۔

سواری پر نفلی نماز پڑھنے کا طریقہ:

یہاں سواری پر نفلی نماز ادا کرنے کا طریقہ بھی ذکر کر دیں تو مناسب ہوگا۔ چنانچہ صحیح بخاری

[1] فتح الباري (٢/ ٥٧٥) صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (١٠٨٤)

[2] شرح صحيح مسلم للنووي (٣/ ٥/ ٢١١)

اور دیگر کتبِ حدیث میں جو انس بن سیرین رحمہ اللہ سے مروی حضرت انس رضی اللہ عنہ کے گدھے پر سوار ہو کر نماز ادا کرنے کے واقعہ پر مشتمل حدیث ہے، اس میں ان کے نماز پڑھنے کا تو ذکر آ گیا ہے، لیکن اس کی کیفیت اور طریقہ مذکور نہیں، جب کہ موطا امام مالک میں امام مالک رحمہ اللہ نے یحیٰ بن سعید کے طریق سے جو حدیث روایت کی ہے، اس میں وہ حضرت انس رضی اللہ عنہ کے نماز پڑھنے کی کیفیت بھی بیان کرتے ہیں۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں:

''رَأَیْتُ اَنَساً، وَھُوَ یُصَلِّيْ عَلٰی حِمَارٍ وَّھُوَ مُتَوَجِّهٌ إِلٰی غَیْرِ الْقِبْلَةِ، یَرْکَعُ وَیَسْجُدُ إِیْمَاءً مِنْ غَیْرِ أَنْ یَّضَعَ جَبْھَتَهٗ عَلٰی شَيْءٍ''[1]

''میں نے حضرت انس رضی اللہ عنہ کو دیکھا کہ وہ گدھے پر سوار نماز پڑھ رہے تھے اور وہ قبلہ رُو ہونے کے بجائے کسی دوسری طرف رُخ کیے ہوئے تھے۔ وہ اشارے سے رکوع اور سجود کر رہے تھے۔ اور سجدہ کرنے کے لیے کسی چیز پر اپنی پیشانی نہیں ٹیکتے تھے۔''

اس کا معنیٰ یہ ہوا کہ سواری کے جانور پر بیٹھا آدمی امام احمد وابو ثور رحمہما اللہ کے بقول ایک مرتبہ استحباباً قبلہ رُو ہو جائے یا پھر جمہور کے مسلک کے مطابق جدھر بھی رُخ ہو، تکبیرِ تحریمہ سے نماز کا آغاز کر دے، ہاتھ باندھ کر پہلے ثنا و فاتحہ پھر کوئی دوسری سورت پڑھے اور تکبیر کہہ کر رکوع کرے، جس کے لیے اسے اپنے سر کو معمولی سا نیچے جھکا کر محض قیام سے رکوع کا اشارہ کرنا ہوگا۔ پھر رکوع سے اشارے کے ساتھ ہی قومے کے لیے سیدھا ہو جائے اور سمع اللّٰہ لمن حمدہ الخ کہے۔ پھر تکبیر کہے اور اپنے سر کو رکوع کے اشارے کی نسبت تھوڑا زیادہ جھکائے جو اس بات کا اشارہ ہوگا کہ میں اب سجدہ کر رہا ہوں۔ اس طرح نماز مکمل کرے اور جتنی بھی نفلی رکعتیں چاہے پڑھتا جائے اور سلام پھیرتا جائے۔[2]

سواری پر فرضی نماز:

یہ ساری تفصیل تو نفلی نماز کے بارے میں ہے اور صلاۃ الخوف کے سوا عام حالات میں سواری پر فرضی نماز ادا کرنا ثابت نہیں ہے۔ البتہ ایک روایت سے پتا چلتا ہے کہ کسی خاص عذر و مجبوری کی حالت ہو تو سواری پر بیٹھے بیٹھے فرض نماز بھی پڑھ سکتا ہے۔ وہ روایت حضرت یعلی بن مرّہ رضی اللہ عنہ سے

---

[1] الموطأ مع التنویر (١/ ٦٥١) فتح الباري (٢/ ٥٧٦، ٥٧٧)

[2] نیل الأوطار (١/ ٢/ ٢٤٠) طبع الریاض

سنن ترمذی، دارقطنی، بیہقی، مسند احمد اور تاریخ بغداد میں مروی ہے۔ امام شوکانی رحمہ اللہ نے اسے نسائی کی طرف بھی منسوب کیا ہے۔ اس روایت میں وہ بیان کرتے ہیں:

«إِنَّ النَّبِيَّ ﷺ اِنْتَهٰى إِلٰى مَضِيقٍ هُوَ وَأَصْحَابُهُ، وَهُوَ عَلٰى رَاحِلَتِهِ، وَالسَّمَآءُ مِنْ فَوْقِهِمْ وَالْبَلَّةُ مِنْ أَسْفَلَ مِنْهُمْ فَحَضَرَتِ الصَّلَاةُ فَأَمَرَ الْمُؤَذِّنَ فَأَذَّنَ وَأَقَامَ ثُمَّ تَقَدَّمَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ عَلٰى رَاحِلَتِهِ فَصَلّٰى بِهِمْ يُؤْمِي إِيمَاءً، وَّيَجْعَلُ السُّجُودَ أَخْفَضَ مِنَ الرُّكُوعِ»[1]

''نبی اکرم ﷺ اور آپ ﷺ کے صحابہ تنگنائے یا تنگ جگہ میں تھے اور آپ ﷺ اپنی سواری پر سوار تھے۔ اوپر سے بارش ہو رہی تھی اور نیچے زمین گیلی و دلدل تھی۔ نماز کا وقت ہو گیا تو آپ ﷺ نے موذن کو حکم فرمایا تو اس نے اذان و اقامت کہی۔ پھر آپ ﷺ نے اشارے سے نماز پڑھی اور سجدوں کے لیے رکوع کی نسبت سر کو ذرا زیادہ جھکا کر اشارہ کیا۔''

اس حدیث سے بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ اگر کبھی کسی کو کوئی ایسی صورتِ حال پیش آ جائے یا اس سے ملتے جلتے حالات کا سامنا ہو تو سواری پر فرضی نماز بھی پڑھی جا سکتی ہے۔ امام ترمذی رحمہ اللہ نے امام احمد اور اسحاق بن راہویہ رحمہما اللہ سے روایت بیان کی ہے کہ اگر سواری سے اُتر کر نماز ادا کرنے کے لیے جگہ نہ ہو تو سواری کے جانور پر بھی نماز جائز ہے۔ حافظ عراقی رحمہ اللہ نے شرح ترمذی میں امام شافعی رحمہ اللہ سے بھی یہی قول روایت کیا ہے۔ البتہ امام شافعی رحمہ اللہ نے سواری کے جانور پر نماز کے صحیح ہونے کے لیے بعض شرائط عائد کی ہیں، لیکن امام شوکانی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ان امور کے سواری پر صحت نماز کے شرط ہونے کی کوئی دلیل نہیں ہے اور حضرت یعلی رضی اللہ عنہ والی حدیث سواری کے جانور پر نماز کے صحیح ہونے پر دلالت کرتی ہے اور حضرت عامر رضی اللہ عنہ والی حدیث میں جو سواری کے جانور پر نبیِ اکرم ﷺ کے نماز ادا فرمانے کی نفی کی گئی ہے، وہ حدیث اگرچہ صحیح بخاری و مسلم اور دیگر کتبِ احادیث میں مروی ہے اور اس کے صحیح ہونے میں بھی کوئی شک نہیں، لیکن اس میں زیادہ سے زیادہ یہی ذکر ہے کہ نفی کرنے والے صحابی نے اپنے علم کی حد تک نفی کی ہے اور اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ سواری کے جانور پر نبیِ اکرم ﷺ کا فرض نماز پڑھنا واقع ہی نہیں ہوا کیونکہ:

---

[1] ضعيف. سنن الترمذي، رقم الحديث (٦٥) نيل الأوطار (١/ ٢/ ٢٠٦) إرواء الغليل (٢/ ٣٤٧)

"مَنْ عَلِمَ حُجَّةٌ عَلٰى مَنْ لَّا يَعْلَمُ"[1]

"جسے علم ہو گیا وہ اس پر حجت ہے جسے علم نہ ہو سکا۔"

یہ امام شوکانی رحمہ اللہ کے الفاظ ہیں یا ان کا مفہوم ہے، جب کہ یہاں ہم یہ وضاحت کر دینا بھی ضروری سمجھتے ہیں کہ موصوف کی یہ بات جہاں اہلِ علم کے لیے قابلِ توجہ ہے، وہیں اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ کسی چیز کو ثابت کرنے کے لیے صحیح دلیل کی ضرورت ہوتی ہے، جب کہ سواری کے جانور پر نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے نماز ادا فرمانے کے واقعے پر مشتمل حدیث ضعیف ہے اور ضعیف حدیث سے یہ بات ثابت نہیں ہوتی کہ وہ واجب العمل ہے، اس حدیث کے بارے میں خود امام موصوف نے لکھا ہے:

"امام ترمذی نے کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے۔ عَمر و بن رباح متفرد ہے اور حضرت انس رضی اللہ عنہ کے اپنے فعل سے یہ ثابت ہے۔ اسے امام اشبیلی نے الاحکام میں صحیح قرار دیا ہے۔ اور توزی نے حسن کہا ہے اور امام بیہقی نے ضعیف قرار دیا ہے۔"[2]

صاحب ارواء الغلیل نے بھی اس حدیث کو ضعیف قرار دیا ہے اور امام ترمذی و بیہقی رحمہما اللہ کے تنقیدی اقوال نقل کر کے لکھا ہے کہ اس روایت کی سند میں دو راوی عمرو بن عثمان اور عثمان دونوں کے مجہول و غیر معروف ہونے کی وجہ سے ضعف پایا جاتا ہے۔[3]

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ صحیحین میں مذکور نفی کو چھوڑ کر مثبت کی بات لی جا سکتی تھی، اگر وہ حدیث صحیح ہوتی، لیکن یہاں صحیح حدیث میں وارد نہیں کہ قابلِ حجت ہو لہٰذا فرض نماز جانور سے اُتر کر پڑھنا ہی ضروری ہے۔

---

[1] نیل الأوطار (۱/ ۲۰۷، ۲۰۹)

[2] نیل الأوطار (۱/ ۲/ ۲۰۷، ۲۰۹)

[3] إرواء الغلیل (۲/ ۳۴۸)

کفار کی عبادت گاہوں میں نماز

اور

تصویر کی قباحت وشناعت

گذشتہ اوراق میں ہم بیان کر آئے ہیں کہ کن کن اشیا اور مقامات پر نماز ادا کرنا جائز ہے۔ اسی سلسلہ کلام کو جاری رکھتے ہوئے ہم یہ بتانا چاہتے ہیں کہ نماز کا وقت ہو جائے تو کفار کی عبادت گاہوں میں، چاہے کسی بھی غیر مسلم قوم کا معبد کیوں نہ ہو، نماز پڑھنا جائز ہے، بشرطیکہ اس میں تصویریں یا مجسمے نہ ہوں، خواہ وہ ہندوؤں کا مندر ہے یا سکھوں کا گردوارہ اور مشرکوں کا صنم کدہ، آتش پرستوں کا آتش کدہ ہے یا کسی اور کی عبادت گاہ، بس جائے نماز پاک ہونی چاہیے۔

ہاں ان میں سے اگر کسی معبد میں تصویریں آویزاں ہوں یا بت اور مجسمے پڑے ہوں تو وہاں نماز پڑھنا صحیح نہیں ہوگا۔ چنانچہ صحیح بخاری میں تعلیقاً اور مصنف عبدالرزاق میں موصولاً حضرت عمرِ فاروق رضی اللہ عنہ کے بارے میں مروی ہے کہ جب وہ شام میں تشریف لائے تو وہاں کے عیسائیوں میں سے ان کے کسی بڑے آدمی نے حضرت فاروق رضی اللہ عنہ کی دعوت کی اور ان کی خدمت میں یوں عرض گزار ہوا:

”أُحِبُّ أَنْ تَجِيئَنِي وَتُكْرِمَنِي“

”میں چاہتا ہوں کہ آپ میرے یہاں قدم رنجہ فرمائیں اور میری عزت افزائی کریں۔“

تو حضرتِ فاروق رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

”إِنَّا لَا نَدْخُلُ كَنَائِسَكُمْ مِنْ أَجَلِ التَّمَاثِيلِ الَّتِي فِيهَا الصُّوَرُ“[1]

”ہم تمھارے گرجوں یا کنیسوں میں ان مجسموں کی وجہ سے داخل نہیں ہوتے جن میں تصویریں بنی ہوتی ہیں۔“

---

[1] صحيح البخاري مع فتح الباري (١/ ٥٣١، ٥٣٢)

گویا اس اثر فاروقی کا مفہوم یہ ہوا کہ اگر ان میں مجسمے اور تصاویر نہ ہوں تو ان میں داخل ہونے سے کوئی چیز مانع نہیں ہے۔ اس کی مزید وضاحت حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے اس اثر سے ہو جاتی ہے، جو صحیح بخاری میں تعلیقاً اور الجعدیات للبغوی میں موصولاً مروی ہے:

"كَانَ ابْنُ عَبَّاسٍ يُصَلِّي فِي الْبِيْعَةِ إِلَّا فِيهَا التَّمَاثِيلُ"

"حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما عیسائیوں کے گرجے میں نماز پڑھ لیا کرتے تھے سوائے اس گرجے کے جس میں تصویریں ہوتیں۔"

امام بغوی نے کچھ مزید الفاظ بھی روایت کیے ہیں:

"فَإِنْ كَانَ فِيهَا التَّمَاثِيلُ خَرَجَ فَصَلّٰى فِي الْمَطَرِ"[1]

"اگر ان میں تصویریں ہوتیں تو وہ اس سے باہر نکل کر نماز پڑھتے، چاہے باہر بارش ہی کیوں نہ ہو رہی ہوتی۔"

ان دونوں آثار سے معلوم ہوا کہ غیر مسلموں کی عبادت گاہوں میں نماز پڑھی جا سکتی ہے، بشرطیکہ ان میں مجسمے اور تصاویر نہ ہوں۔[2]

حضرت حسن بصری، عمر بن عبدالعزیز، امام شعبی، اوزاعی اور سعید بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہم نے بھی صاف ستھرے گرجے میں نماز پڑھنے کی اجازت دی ہے اور حضرت فاروق اور ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہما سے بھی یہی مروی ہے۔ البتہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور امام مالک رحمہ اللہ تصویروں کی وجہ سے کنیسے میں نماز پڑھنے کو مکروہ خیال کرتے تھے۔ یہاں یہ بات بھی واضح کر دیں کہ امام ابن قدامہ رحمہ اللہ نے اپنی کتاب المغنی میں چرچ وغیرہ میں نماز کے متعلق جواز پر دو طرح سے استدلال کیا ہے۔ ایک تو صحیح بخاری و مسلم، سنن ابن ماجہ اور مسند احمد میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے:

«أَيْنَمَا أَدْرَكْتَكَ الصَّلَاةُ فَصَلِّ»[3]

"جہاں بھی تمھیں نماز کا وقت ہو جائے نماز پڑھ لو۔"

---

[1] صحيح البخاري مع فتح الباري (١/ ٥٣١)

[2] نيل الأوطار (١/ ٢/ ٢١٠)

[3] صحيح البخاري مع الفتح (١/ ٤٣٦) صحيح مسلم مع شرح النووي (٣/ ٥/ ٣) صحيح سنن النسائي، رقم الحديث (٤١٩)

دوسرا ان کا استدلال فتح مکہ کے وقت نبیِ اکرم ﷺ کے خانہ کعبہ کے اندر دو رکعتیں پڑھنے سے ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ اس وقت خانہ کعبہ میں تصاویر بھی تھیں۔ جب کہ ان کی یہ بات محلِ نظر ہے۔ کیونکہ علامہ ابن قیم رحمہ اللہ نے زاد المعاد میں لکھا ہے کہ نبیِ اکرم ﷺ خانہ کعبہ میں داخل ہوئے اور اس میں نماز پڑھی، لیکن آپ ﷺ اس وقت تک داخل نہیں ہوئے، جب تک تصاویر مٹا نہ دی گئیں، جو اس بات کی دلیل ہے کہ تصویروں کی جگہ میں نماز پڑھنا مکروہ ہے۔[1]

اس مسئلے میں امام ابن قیم رحمہ اللہ کی تحقیق امام ابن قدامہ رحمہ اللہ کی تحقیق سے زیادہ وزنی ہے، کیونکہ صحیح بخاری میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے:

«إِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ لَمَّا قَدِمَ أَبٰى أَنْ يَّدْخُلَ الْبَيْتَ، وَفِيْهِ الْاٰلِهَةُ، فَأَمَرَ بِهَا فَأُخْرِجَتْ... فَدَخَلَ الْبَيْتَ»[2]

”نبیِ اکرم ﷺ جب آئے تو آپ ﷺ نے معبودانِ باطلہ کی بیت اللہ میں موجودگی کی حالت میں اندر جانے سے انکار کر دیا اور جب آپ ﷺ کے حکم سے انھیں اندر سے نکال دیا گیا تو آپ ﷺ اندر داخل ہوئے۔“

اسی حدیث میں یہ بھی مذکور ہے کہ بیت اللہ کے اندر سے حضرت ابراہیم و اسمٰعیل علیہما السلام کی تصویر بھی نکالی گئی۔

معابد و کنائس میں نماز کے بارے میں جب شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ سے سوال کیا گیا تو انھوں نے فرمایا کہ اس میں علما کے تین اقوال ہیں:

1. **مطلق ممانعت:** یہ امام مالک رحمہ اللہ کا قول ہے۔
2. **مطلق اجازت:** یہ امام احمد رحمہ اللہ کے بعض اصحاب کا قول ہے۔
3. یہ قول صحیح ہے اور حضرت عمر بن خطاب نیز بعض دیگر صحابہ رضی اللہ عنہم سے منقول ہے اور امام احمد و دیگر ائمہ و فقہا کی اس پر نص ہے کہ اگر اس یہودی معبد یا عیسائی گرجے میں تصویریں ہوں تو وہاں نماز نہیں پڑھی جائے گی، کیونکہ اللہ تعالیٰ کے فرشتے اس گھر میں داخل نہیں ہوتے جس میں تصویر

---

[1] المغني (٢/ ٤٧٨)

[2] زاد المعاد (٣/ ٤٥٨) تحقيق الأرناؤوط، تحقيق المغني (٢/ ٤٧٨)

ہو اور اس لیے بھی کہ نبیِ اکرم ﷺ اس وقت تک کعبہ شریف میں داخل نہیں ہوئے، جب تک اس میں سے تصاویر مٹا نہ دی گئیں۔''

ایسے ہی حضرت عمرِ فاروق رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

''إِنَّا لَا نَدْخُلُ كَنَائِسَهُمْ وَالصُّوَرُ فِيْهَا''

''ہم ان کے چرچوں میں داخل نہیں ہوا کرتے تھے، جب کہ ان میں تصویریں ہوتیں۔''

وہ عبادت گاہیں قبر پر بنائی گئی مساجد کی طرح ہیں، جب کہ صحیحین میں ہے کہ نبیِ اکرم ﷺ کے سامنے حبشہ کے ایک گرجے کی خوبصورتی اور اس میں لگائی گئی تصویروں کا ذکر کیا گیا تو آپ ﷺ نے فرمایا:

«أُولٰئِكَ إِذَا مَاتَ فِيْهِمُ الرَّجُلُ الصَّالِحُ بَنَوْا عَلٰى قَبْرِهٖ مَسْجِدًا، وَصَوَّرُوْا فِيْهِ تِلْكَ الصُّوَرَ، أُولٰئِكَ شِرَارُ الْخَلْقِ عِنْدَ اللّٰهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ»[1]

''ان میں سے جب کوئی نیک آدمی مر جاتا تو وہ اس کی قبر پر عبادت گاہ بنا دیتے اور اس میں تصویریں بنا دیتے۔ وہ قیامت کے دن اللہ کے نزدیک بدترین لوگ ہوں گے۔''

ہاں اگر ان میں تصویریں نہ ہوں تو صحابہ رضی اللہ عنہم نے گرجے میں نماز پڑھی ہے۔[2] واللہ اعلم

یہیں لمحہ بھر کے لیے ہمارے وہ بہن بھائی بطور خاص توجہ فرمائیں جن کے گھر کے کمروں، انگیٹھیوں، الماریوں، شیلفوں اور میزوں پر اپنوں اور پرائیوں کی تصویریں لگی ہوتی ہیں اور ان میں سے بعض لوگ نماز بھی پڑھتے ہیں، تو ان کی نماز کا کیا ہوگا؟ تصویر کی قباحت وشناعت کا اندازہ تو اس سے کیا جا سکتا ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما برستی بارش میں نماز پڑھنا گوارہ کر لیتے تھے، لیکن اس جگہ نماز نہیں پڑھتے تھے جہاں تصویریں ہوتیں۔ لہٰذا ہمارے ان بہن بھائیوں کو اس سے سبق حاصل کرنا چاہیے، جو اپنے گرد وپیش تصویریں آویزاں کرنے یا رکھنے کے بڑے رسیا ہیں۔ اس سلسلے میں ہم اور زیادہ کچھ نہیں کہنا چاہتے، کیونکہ تصویر سازی اور تصویر آویزی کا موضوع ہم قدرے تفصیل سے الگ ذکر کر چکے ہیں، جو ہماری کتاب ''سود و رشوت اور دیگر ممنوع...'' میں شائع ہو چکا ہے۔

---

[1] صحيح البخاري مع الفتح (٣/ ٢٠٨)

[2] مجموع فتاویٰ ابن تیمیة (٢٢/ ١٦٢، ١٦٣) المغني (٢/ ٤٧٨) بتحقيق التركی

البتہ بعض احادیث سے اشارہ ملتا ہے کہ غیر مسلموں کی عبادت گاہوں میں نماز پڑھنا مکروہ ہے۔ چنانچہ صحیح بخاری و مسلم، سنن نسائی، مصنف ابن ابی شیبہ، مسند احمد و ابی عوانہ، مسند ابی یعلی، سنن بیہقی، طبقات ابن سعد اور دیگر کتبِ حدیث میں امّ المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ اُمّ المؤمنین حضرت اُمّ حبیبہ اور حضرت امّ سلمہ رضی اللہ عنہن نے (ہجرتِ حبشہ سے واپسی پر) حبشہ کے ایک گرجے کا ذکر کیا، جس میں تصویریں تھیں اور یہ بات اُنھوں نے نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ذکر کی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«إِنَّ أُولٰئِكَ إِذَا كَانَ فِيهِمُ الرَّجُلُ الصَّالِحُ فَمَاتَ بَنَوا عَلٰى قَبْرِهٖ مَسْجِداً وَصَوَّرُوْا فِيْهِ تِلْكَ الصُّوَرَ، فَأُولٰئِكَ شِرَارُ الْخَلْقِ عِنْدَ اللّٰهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ»[1]

''ان لوگوں میں اگر کوئی نیک آدمی مر جاتا تو وہ اس کی قبر پر عبادت گاہ بنا دیتے اور اس میں تصویر رکھ دیتے۔ یہ قیامت کے دن اللہ کے نزدیک پوری مخلوق میں سے بدترین لوگ ہوں گے۔''

اس حدیث کو امام بخاری رحمہ اللہ چار مقامات پر لائے ہیں۔ ایک "باب الصلاة في البيعة" میں یعنی گرجے میں نماز کے بیان میں۔ صاحب فتح الباری لکھتے ہیں کہ اس حدیث میں اشارہ پایا جاتا ہے کہ مسلمان کو گرجے میں نماز پڑھ کر اس جگہ کو جانماز کا درجہ نہیں دینا چاہیے۔ اس بات کا پتا بعض دیگر احادیث سے بھی لگتا ہے، جن میں سے ایک صحیح بخاری و مسلم، سنن ابی داود، مسند ابی یعلی، مسند احمد، مسند ابی عوانہ، مسند سراج اور تاریخ دمشق لابن عساکر میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، جس میں ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے:

«قَاتَلَ اللّٰهُ الْيَهُوْدَ إِتَّخَذُوا قُبُوْرَ أَنْبِيَائِهِمْ مَّسَاجِدَ»[2]

''اللہ تعالیٰ یہودیوں کو غارت کرے! اُنھوں نے اپنے انبیا علیہم السلام کی قبروں کو عبادت گاہیں بنا لیا۔''

اُمّ المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے تھے کہ وفات کے

---

[1] صحيح البخاري (١/ ٥٢٣، ٥٢٤) صحيح مسلم مع شرح النووي (٣/ ٥/ ١١) صحيح سنن النسائي، رقم الحديث (٦٨٠) صحيح الجامع، رقم الحديث (٢٠١٠) تحذير الساجد (١٢، ١٣)

[2] صحيح البخاري (١/ ٥٣٢) صحيح مسلم مع شرح النووي (٣/ ٥/ ١٢) صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (٦٧٦٤) صحيح الجامع، رقم الحديث (٥١٠٨) تحذير الساجد (ص: ١٢)

قریب نبیِ مکرم ﷺ نے فرمایا:

«لَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الْيَهُوْدِ وَالنَّصَارىٰ اِتَّخَذُوْا قُبُوْرَ أَنْبِيَائِهِمْ مَّسَاجِدَ»

''اللہ تعالیٰ کی لعنت ہو یہود و نصاری پر کہ اُنھوں نے اپنے انبیا کی قبروں کو عبادت گاہیں بنا لیا۔''

آگے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں:

«يُحَذِّرُ مِثْلَ الَّذِيْ صَنَعُوْا»[1]

''آپ ﷺ ان کے اس فعل کی قباحت پر لوگوں کو تنبیہ کرنا چاہتے تھے۔''

کتاب ''تحذير الساجد من اتخاذ القبور مساجد'' میں مؤلف نے اسی معنیٰ و مفہوم کی چودہ احادیث نقل کی ہیں اور ان سب سے اشارہ ملتا ہے کہ یہود و نصاریٰ کی عبادت گاہیں عموماً ان کے انبیا و صالحین کی قبروں پر بنائی گئی ہوتی تھیں اور پھر ان میں تصویریں بھی ہوتی تھیں۔ اگر کسی عبادت گاہ کے بارے میں ثابت ہو جائے کہ ایسی ہی ہے تو اس میں نماز پڑھنا منع ہوگا اور اگر کوئی عبادت گاہ ان اشیا سے مبرّا ہو تو اس میں نماز جائز ہو گی، جیسا کہ سابق میں ذکر کیے گئے آثارِ صحابہ رضی اللہ عنہم سے پتا چلتا ہے اور انھیں اس موقع پر محمول کرنا ہی اَولیٰ و بہتر ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ کا رجحان بھی جواز کی طرف ہے۔

آگ وغیرہ کے سامنے نماز پڑھنا:

غیر مسلم لوگوں کی عبادت گاہوں میں بوقتِ ضرورت نماز جائز ہے، بشرطیکہ وہ کسی کی قبر پر نہ بنائی گئی ہو اور نہ اُن میں مجسمے یا تصاویر ہوں، یہاں آتش پرستوں کے آتش کدے میں جلتی آگ کے سلسلے میں بھی وضاحت کر دیں کہ اگر وہاں نماز پڑھنے کی نوبت آ ہی جائے تو جانماز کے لیے ایسی جگہ اختیار کریں جہاں ان کی جلائی ہوئی آگ آپ کے اور قبلے کے درمیان نہ آئے۔ کہیں ادھر ادھر رہے تو حرج نہیں۔

اگر کوئی ایسی جگہ ہو جہاں سے جلتی آگ کی انگیٹھی کو ہٹایا جا سکتا ہو یا جلتے تنور کو اپنے اور

---

[1] صحيح البخاري (١/ ٥٣٢) مختصر صحيح مسلم (٢٥٥) صحيح سنن النسائي، رقم الحديث (٦٧٩) تحذير الساجد (ص: ١١، ١٢)

قبلے کے مابین سے ہٹانا ممکن ہو، لیکن پھر بھی آگ کی طرف منہ کر کے اسے اپنے سامنے رکھتے ہوئے نماز پڑھیں تو اختیار کے باوجود ایسا کرنا اور ایسے ہی نماز پڑھنا مکروہ ہے، جیسا کہ مصنف ابن ابی شیبہ میں معروف تابعی امام ابن سیرین رحمہ اللہ کے بارے میں مروی ہے:

''إِنَّهٗ كَرِهَ الصَّلَاةَ إِلٰى التَّنُّوْرِ، وَقَالَ: هُوَ بَيْتُ نَارٍ'' [1]

''وہ تنور کی طرف رُخ کیے نماز پڑھنے کو مکروہ قرار دیتے اور کہا کرتے تھے کہ یہ تنور ''آتش کدہ'' ہے۔''

اگر کوئی ایسی جگہ ہو کہ سامنے آگ جل رہی ہو یا دوسری کوئی چیز ہو جس کی عبادت کی جاتی ہو، لیکن اسے وہاں سے ہٹانا بس میں نہ ہو اور نہ خود اس جگہ سے ہٹ کر نماز پڑھ سکنے کی گنجایش ہو تو ایسے میں جب نمازی دل میں یہ بات رکھ کر نماز شروع کردے کہ میں اس چیز کی نہیں بلکہ اپنے معبودِ حقیقی، خالق و مالکِ کائنات اور پروردگارِ عالم کی عبادت کرنے جا رہا ہوں، آتش برو یا بروئے صنم نہیں بلکہ قبلہ رُو ہوں تو اس صورت میں اس کی نماز بلا کراہت جائز ہوگی اور اس میں کسی قسم کا کوئی مضائقہ بھی نہیں۔ اس چیز کے نمازی کے سامنے قریب یا دور ہونے میں بھی کوئی فرق نہیں ہے، کیونکہ صحیح بخاری ''كِتَابُ الصَّلَاةِ: بَابُ مَنْ صَلّٰى وَقُدَّامَهٗ تَنُّوْرٌ أَوْ نَارٌ أَوْ شَيْئٌ مِّمَّا يُعْبَدُ فَأَرَادَ بِهِ اللّٰهِ'' اور دیگر کتب میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ایک حدیث میں مذکور ہے کہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے سورج گرہن کی نماز پڑھی اور فرمایا:

《أُرِيْتُ النَّارَ فَلَمْ أَرَ مَنْظَراً كَالْيَوْمِ قَطُّ أَفْظَعَ》 [2]

''مجھے آگ دکھائی گئی اور اتنا بھیانک منظر میں نے آج تک نہیں دیکھا۔''

اسی حدیث میں یہ بات بھی مذکور ہے کہ وہ آگ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے عین سامنے لاکر دکھائی گئی تھی، دائیں بائیں سے نہیں، جیسا کہ صحابہ رضی اللہ عنہم کے الفاظ ہیں: اے اللہ کے رسول!

《رَأَيْنَاكَ تَنَاوَلْتَ شَيْئاً فِيْ مَقَامِكَ تَكَعْكَعْتَ》 [3]

''ہم نے دیکھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے قیام کے دوران میں کوئی چیز پکڑی اور پھر پیچھے کو ہٹ

---

[1] فتح الباري (١/ ٥٢٨)

[2] صحيح البخاري (١/ ٥٢٨) صحيح سنن النسائي، رقم الحديث (١٤٠٥)

[3] صحيح البخاري مع الفتح (٢/ ٥٤٠)

آئے تھے؟‘‘

آپ ﷺ کے اس پیچھے کو ہٹ آنے کے الفاظ سے پتا چلتا ہے کہ وہ آگ آپ ﷺ کو سامنے سے دکھائی گئی۔ ایسے ہی صحیح بخاری ومسلم میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں ارشادِ نبوی ﷺ کے الفاظ ہیں:

«عُرِضَتْ عَلَيَّ النَّارُ وَأَنَا أُصَلِّي»[1]

’’میرے سامنے اس وقت آگ پیش کی گئی، جب کہ میں نماز پڑھ رہا تھا۔‘‘

بخاری شریف کی کتاب التوحید میں اس حدیث کے الفاظ ہیں:

«لَقَدْ عُرِضَتْ عَلَيَّ الْجَنَّةُ وَالنَّارُ آنِفًا فِيْ عَرْضِ هٰذَا الْحَائِطِ وَأَنَا أُصَلِّيْ»

’’ابھی نماز کے دوران میں اس دیوار کے پاس میرے سامنے جنت اور نارِ جہنم پیش کی گئیں۔‘‘

ان احادیث سے معلوم ہوا کہ آگ آپ ﷺ کے سامنے لائی گئی اور نماز کے دوران میں لائی گئی اور آپ ﷺ کے قریب ہی تھی۔ یہ تمام امور اور نبیِ اکرم ﷺ کا نماز نہ توڑنا، ایسے میں نماز کے جواز کی دلیل ہے، خصوصاً جب کہ آگ یا اس جیسی کسی پوجی جانے والی چیز کو ہٹانا اختیار میں نہ ہو، جیسا کہ ذکر کیا جا چکا ہے۔

اِضطرار واختیار:

یہاں یہ بات بھی پیشِ نظر رکھیں کہ غیر مسلموں کی عبادت گاہوں میں نماز کے جواز کی نوبت تب آئے گی، جب وہاں سے نکل کر کسی دوسری جگہ نماز پڑھ سکنا ممکن ہی نہ رہا ہو۔ اگر وہاں سے نکلنا ممکن ہو تو نکل کر کسی مسجد یا کھلی جگہ میں نماز پڑھنا ہی ضروری ہے، لہٰذا وہ مقامات یا عبادت گاہیں جہاں کفر وشرک کیا جا رہا ہو، وہاں عبادتِ الٰہی نہ کی جائے، کیونکہ وہ مقام نجس وخبیث ٹھہرا۔ اس بات کا پتا سورۃ التوبہ میں مذکور مسجد ضرار کے واقعے سے بھی چلتا ہے، کیونکہ وہاں ارشادِ الٰہی ہے:

﴿ وَ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مَسْجِدًا ضِرَارًا وَّ كُفْرًا وَّ تَفْرِيْقًاۢ بَيْنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَ اِرْصَادًا لِّمَنْ حَارَبَ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ مِنْ قَبْلُ ﴾ [التوبة: ١٠٧]

’’اور ان میں ایسے (منافق) بھی ہیں، جنھوں نے ایک مسجد بنائی اس غرض کے لیے کہ

[1] صحيح البخاري، كتاب التوحيد ومواقيت الصلاة، باب وقت الظهر (٢/ ٢١) صحيح الجامع (٢/ ٤/ ٣٢)

(دعوتِ حق کو) نقصان پہنچائیں اور (عبادت الٰہی کے بجائے) کفر کریں اور اہلِ ایمان میں پھوٹ ڈالیں اور اس (بظاہر عبادت گاہ) کو اس شخص کے لیے کمین گاہ (مخفی اڈہ) بنائیں جو اس سے پہلے اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے خلاف برسرِ پیکار ہو چکا ہے۔''

نیز فرمایا:

﴿وَ لَيَحْلِفُنَّ اِنْ اَرَدْنَاۤ اِلَّا الْحُسْنٰى وَ اللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ﴾ [التوبة: ١٠٧]

''اور وہ (منافق) ضرور قسم کھائیں گے اور کہیں گے کہ ہمارا ارادہ تو بھلائی کے سوا کسی دوسری چیز کا نہ تھا، مگر اللہ گواہ ہے کہ وہ جھوٹے ہیں۔''

اگلی ہی آیت میں نبیِ اکرم ﷺ سے مخاطب ہو کر فرمایا:

﴿لَا تَقُمْ فِيْهِ اَبَدًا﴾ [التوبة: ١٠٨]

''آپ ﷺ ہرگز اس عمارت میں کھڑے نہ ہونا (نماز نہ پڑھنا)۔''

گویا جو معبد غیر اللہ کی عبادت اور اسلامی کاز کو نقصان پہنچانے کے لیے تعمیر کیا گیا ہو، وہاں نماز نہیں پڑھنی چاہیے یا بالفاظِ دیگر جہاں غیر اللہ کی عبادت ہوتی ہو، وہاں اللہ کی عبادت کرنا بھی درست نہیں۔ اس بات کی دلیل وہ حدیث بھی بن سکتی ہے، جس میں اس مقام پر نذر پوری کرنے کے لیے جانور ذبح کرنے سے روکا گیا ہے، جہاں کبھی اہلِ جاہلیت غیر اللہ کے نام پر جانور ذبح کرتے رہے ہوں، اگرچہ اب وہ وہاں ایسا نہ بھی کرتے ہوں، جیسا کہ سنن ابو داود میں حضرت ثابت بن ضحاک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں:

''ایک آدمی نے یہ نذر مان لی کہ (ینبع سے آگے) بوانہ نامی مقام پر اونٹ ذبح کرے گا۔ اُس نے اِس سلسلے میں نبیِ اکرم ﷺ سے استفسار کیا تو آپ ﷺ نے پوچھا:

«هَلْ كَانَ فِيهَا وَثَنٌ مِّنْ أَوْثَانِ الْجَاهِلِيَّةِ يُعْبَدُ؟»

''کیا وہاں کوئی بت تھا، جس کی عہدِ جاہلیت میں پوجا کی جاتی رہی ہو؟''

اس صحابی رضی اللہ عنہ نے عرض کی: نہیں، پھر آپ ﷺ نے فرمایا:

«أُوفِ بِنَذْرِكَ فَإِنَّهُ لَا وَفَاءَ لِنَذْرٍ فِي مَعْصِيَةِ اللّٰهِ، وَلَا فِيمَا لَا يَمْلِكُ ابْنُ آدَمَ»[1]

[1] صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (٢٨٣٤) المعجم الكبير للطبراني (٢/ ٦٨) حديث (١٣٤١) كتاب التوحيد لشيخ الإسلام محمد بن عبد الوهاب مع قرة عيون الموحدين مترجم ارود (١/ ١٩٨)

’’اپنی نذر پوری کرو اور اس نذر کو پورا کرنا جائز نہیں، جس میں اللہ کی معصیت و نافرمانی ہوتی ہو اور نہ اس چیز سے متعلق نذر پوری کی جائے گی، جو چیز کسی آدمی کی ملکیت نہیں ہے۔‘‘

اس حدیث اور سابقہ آیت کو صاحب کتاب التوحید:

’’بَابُ لَا يُذْبَحُ لِلّٰهِ بِمكَانٍ يُّذْبَحُ فِيْهِ لِغَيْرِ اللّٰهِ‘‘ میں لائے ہیں کہ ’’جس جگہ غیر اللہ کے نام پر جانور ذبح کیے جاتے ہیں، وہاں صرف اللہ کے نام پر جانور ذبح کرنا بھی ناجائز ہے۔‘‘

شارح کتاب التوحید شیخ عبدالرحمٰن بن حسن آل الشیخ نے لکھا ہے کہ مسجد ضرار سے متعلق واقعہ اگرچہ ایک مسجد سے متعلق ہے، لیکن اس ممانعت کا حکم عام ہے۔ لہٰذا وہ مقامات جہاں کفر وشرک ہوتا ہو، ان پر بھی یہی حکم لگے گا کہ وہاں عبادت الٰہی نہ کی جائے، کیوں کہ وہ مقام نجس وخبیث ٹھہرا اور اس حدیث کے بارے میں کہتے ہیں کہ یہ اگرچہ نذر کے بارے میں ہے، لیکن یہ ہر اس عمل کو شامل ہے، جو عبادتِ الٰہی کی غرض سے کیا جائے۔ آگے لکھتے ہیں کہ یہ حدیث اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ گناہ اور شرک کے اڈوں کو عبادت کے لیے منتخب نہیں کرنا چاہیے۔[1]

اس ساری تفصیل سے ایسے مقامات میں نماز کے لیے اختیار و اضطرار کا فرق واضح ہوجاتا ہے کہ ہر ممکن احتراز ہی بہتر ہے اور مجبوراً جائز ہے۔

غیر مسلموں کی عبادت گاہوں کو مساجد میں تبدیل کرنا:

یہاں اس موضوع سے ملتی جلتی بلکہ اس کے متعلق ایک اور بات بھی ذکر کرتے جائیں کہ اگر کوئی جگہ کفار میں سے کسی بھی غیر مسلم قوم کی عبادت گاہ رہی ہو، پھر وہ کسی وجہ سے متروک ہو جائے اور وہ جگہ کسی بھی طریقے سے مسلمانوں کے قبضے میں آجائے، مثلاً فتوحات کے نتیجے میں مغلوبین فرار ہوگئے ہوں اور ان کی عبادت گاہ متروک ہوگئی ہو یا پھر انھوں نے نئی بنالی اور پرانی متروک ہوگئی اور اس جگہ کو مسلمانوں نے ان سے خرید لیا، جیسا کہ آج کل برطانیہ وغیرہ مغربی ممالک میں چرچوں کو خرید کر انھیں مساجد و مدارس اور اسلامی تنظیموں کے دفاتر میں تبدیل کیا گیا ہے۔ مدرسہ سلفیہ، جامع مسجد ماہنامہ صراطِ مستقیم (اردو) اور مرکزی جمعیت اہلِ حدیث کے دفاتر پر مشتمل عظیم عمارت جو برمنگھم

[1] قرة عيون الموحدين (١/ ١٩٥، ٢٠١) اردو، هداية المستفيد ترجمه كتاب فتح المجيد (١/ ٤٤٧، ٤٥٦) مولانا عطاء اللہ ثاقب۔ فتح المجيد عربی (ص: ١١٦، ١١٩)

(برطانیہ) میں واقع ہے، وہ اس بات کی شاہد عدل ہے، کیونکہ وہ ایک پرانا متروک چرچ تھی، جسے خرید کر مسجد و مدرسہ اور دفاتر کی شکل دی گئی ہے اور ایسا کرنا جائز ہے، کیونکہ اسلامی فتوحات کے عہدِ زرّیں میں کثیر صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے غیر مسلموں کی عبادت گاہوں کی محرابوں کو بدل کر انھیں مساجد کی شکل دی۔[1]

لات ومنات نامی مشہور بتوں میں سے لات طائف میں تھا۔ اب اس کی جگہ پر مسجد تعمیر کی جا چکی ہے۔ اگر اس جگہ کو جوں کا توں چھوڑ دیا جاتا تو خطرہ تھا کہ جاہل لوگ اسے پھر سے وثن نہ بنا لیں اور اس کی پوجا شروع کر دیں۔ اس فتنے سے بچنے کے لیے اس مقام پر مسجد تعمیر کر دی گئی، اب لات اور اس کی پوجا کا تصور ہی ختم ہو کر رہ گیا ہے اور شرک کا نام ونشان مٹ گیا ہے۔[2]

عون المعبود شرح ابی داود میں علامہ شمس الحق عظیم آبادی نے لکھا ہے کہ الملک العادل اورنگ زیب عالمگیر نے بھی کفار کے کئی معبدوں کی جگہ پر مساجد تعمیر کیں۔ اسی سلسلے میں سنن ابی داود اور ابن ماجہ میں ایک حدیث بھی ہے جس میں حضرت عثمان بن ابی العاص رضی اللہ عنہ، جنھیں نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے طائف کا حاکم یا انھیں وہاں کے لیے اپنا نمایندہ مقرر فرمایا تھا، وہ بیان کرتے ہیں:

«إِنَّ النَّبِيَّ صلی اللہ علیہ وسلم أَمَرَهُ أَنْ يَجْعَلَ مَسْجِدَ الطَّائِفِ حَيْثُ كَانَ طَوَاغِيتُهُمْ»

''نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں حکم فرمایا کہ طائف کی مسجد وہاں بنائیں، جہاں پہلے بت خانے تھے اور بتوں کی پوجا کی جاتی تھی۔''

امام ابو داود اور منذری نے اس حدیث کی سند پر سکوت فرمایا ہے اور امام شوکانی رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ اس کی سند کے راوی ثقہ ہیں۔ محمد بن عبداللہ بن عیاض کو ابن حبان نے ثقات میں شمار کیا ہے اور ابو ہمام بھی ثقہ ہیں۔[3]

اس تفصیل کی روشنی میں تو حدیث قوی ہو جاتی ہے، البتہ صحیح سنن ابی داود اور صحیح سنن ابن ماجہ کے مولف نے اسے اُن سے ساقط کر دیا ہے، جس سے اس کے ضعیف ہونے کا پتا چلتا ہے۔ البتہ صحابہ رضی اللہ عنہم کے عمل اور بعد کے تعامل سے اسے تقویت ملتی ہے۔ سنن نسائی میں حضرت طلق بن علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

---

[1] نیل الأوطار (۱/ ۲/ ۲۰۹ طبع ریاض)

[2] قرة عیون الوحدین مترجم اردو (۱/ ۲۰۱) ترجمہ مولانا عطاء اللہ ثاقب، مطبع أنصار السنة، لاهور

[3] سنن أبي داود (٤٥٠) سنن سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٧٤٣) منتقى الأخبار مع نيل الأوطار أيضاً

''ہم ایک وفد کی شکل میں نبیِ اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو ہم نے آپ ﷺ کی بیعت کی اور آپ ﷺ کے ساتھ نماز پڑھی اور آپ کو بتایا کہ ہماری زمینوں میں ایک معبد ہے، پھر ہم نے آپ ﷺ کے بچے ہوئے پانی سے کچھ طلب کیا تو آپ ﷺ نے پانی منگوایا۔ اس سے وضو کیا اور کلی کی اور ہمارے لیے ایک برتن میں ڈال دیا اور ہمیں حکم فرمایا:

((أُخْرُجُوْا فَإِذَا أَتَيْتُمْ أَرْضَكُمْ فَاكْسِرُوْا بِيْعَتَكُمْ، وَانْضَحُوْا مَكَانَهَا بِهٰذَا الْمَآءِ وَاتَّخِذُوْهَا مَسْجِداً)) [1]

''جاؤ اور اپنی زمینوں پر پہنچتے ہی اس معبد کو توڑ دینا اور اس کی جگہ پر اس پانی سے چھڑکاؤ کر دینا اور پھر اس جگہ کو مسجد بنا لینا۔''

اس حدیث میں یہ بھی مذکور ہے کہ ہم نے عرض کی:

((إِنَّ الْبَلَدَ بَعِيْدٌ، وَالْحَرَّ شَدِيْدٌ وَالْمَآءُ يَنْشِفُ))

''ہمارا ملک بہت دور ہے اور گرمی بہت سخت ہے اور اس سے پانی خشک ہو جاتا ہے۔''

آپ ﷺ نے فرمایا:

((مَدِّدُهُ مِنَ الْمَآءِ فَإِنَّهٗ لَا يَزِيْدُهٗ إِلَّا طِيْباً)) [2]

''اپنے پانی میں میرے اس بچے ہوئے پانی کو ملا دینا، اس سے تمھارا پانی بہت ہی اچھا اور پاکیزہ ہو جائے گا۔''

---

[1] نیل الأوطار (أیضاً)

[2] صحیح سنن النسائي، رقم الحدیث (٦٧٧) موارد الظمآن (٣٠٤) و مشکاۃ المصابیح (٢٢٣/١)

کفار ومشرکین کے قبرستانوں کو مسمار کر کے انھیں مساجد میں تبدیل کرنا

غیر مسلموں کی عبادت گاہوں کو مساجد میں تبدیل کر کے وہاں نماز پڑھی جاسکتی ہے، بعینہٖ معاملہ کفار ومشرکین کے قبرستانوں کا بھی ہے کہ انھیں مسمار کر کے وہاں سے حاصل ہونے والی بوسیدہ ہڈیوں کو نکال کر اس جگہ کو صاف کر کے وہاں مسجد تعمیر کی جا سکتی ہے۔ یہ معاملہ صرف کفار ومشرکین کے قبرستانوں کے ساتھ خاص ہے۔ انبیا وصالحین کی قبروں کے ساتھ ایسا کرنا ہرگز جائز نہیں، کیونکہ یہ ان کی توہین ہے۔ البتہ کافر کی کوئی عزت وحرمت نہیں، اس لیے ان کی قبروں کے ساتھ یہ معاملہ جائز ہے۔

اس طرح یہ فرق بھی واضح ہو گیا کہ نبیِ اکرم ﷺ نے انبیا وصالحین کی قبروں کو عبادت گاہیں بنانے والوں پر جو لعنت فرمائی ہے، وہ اس لیے تھی کہ انھوں نے ان کی قبروں کو تعظیماً عبادت گاہیں بنایا تھا۔ ادھر خود نبیِ اکرم ﷺ سے ثابت ہے کہ آپ ﷺ نے مشرکین کی قبروں کو مسمار کروا کر وہاں مسجدِ نبوی تعمیر فرمائی تھی۔ آپ ﷺ کے یہود ونصاریٰ پر لعنت فرمانے والے ارشاد اور خود اپنے عملِ مبارک میں بظاہر تضاد نظر آ رہا ہے، جب کہ اس میں تعظیم اور عدمِ تعظیم کے نظریے اور انبیا و صالحین اور مسلمانوں کی حرمت اور کفار ومشرکین کی عدمِ حرمت کے فرق سے آپ ﷺ کے ارشاد وعمل میں موافقت ومطابقت پیدا ہو جاتی ہے۔ آپ ﷺ کا عملِ مبارک اس مسئلے میں صریح دلیل ہے کہ کفار ومشرکین کی قبروں کو مسمار کر کے وہاں سے ہڈیاں نکال کر اس جگہ کو صاف کر کے وہاں مسجد تعمیر کی جاسکتی ہے۔ چنانچہ صحیح بخاری ومسلم، سنن ابو داود اور دیگر کتبِ حدیث وسیرت میں نبیِ اکرم ﷺ کی ہجرتِ مدینہ، آپ ﷺ کا وصولِ مدینہ اور تعمیرِ مسجدِ نبوی کا واقعہ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، جس میں وہ بیان کرتے ہیں:

’’نبیِ اکرم ﷺ مدینہ طیبہ میں وارد ہوئے تو شہر کی بالائی جانب اقامت گزیں قبیلہ

بنو عمرو بن عوف کے یہاں آ کر ٹھہرے۔ ان کے یہاں آپ ﷺ نے چودہ دن قیام فرمایا۔ پھر آپ ﷺ نے قبیلہ بنی نجار کے لوگوں کو پیغام بھیج کر بلایا تو وہ اپنی تلواریں لٹکائے ہوئے حاضر ہوگئے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ یہ واقعہ بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''گویا میں اب نبیِ اکرم ﷺ کو اپنی اونٹنی پر سوار حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو اپنے پیچھے بٹھائے اور بنی نجار کے لوگوں کو آپ ﷺ کے اردگرد جمع ہوئے اس وقت اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھ رہا ہوں (وہ منظر میری نظروں کے سامنے ہو بہو گھوم رہا ہے) یہاں تک کہ آپ ﷺ نے حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ کے صحن میں نزول فرمایا۔ آپ ﷺ کی عادتِ مبارکہ تھی کہ جہاں بھی نماز کا وقت ہوتا، وہیں آپ ﷺ نماز پڑھ لیا کرتے تھے۔ آپ ﷺ تو بکریوں کے باڑے میں نماز پڑھ لیا کرتے تھے، تب آپ ﷺ نے مسجد تعمیر کرنے کا حکم فرمایا اور بنی نجار کے کرتا دھرتا لوگوں سے مخاطب ہوکر فرمایا:

«يَا بَنِيْ نَجَّارٍ! ثَامِنُوْنِيْ بِحَائِطِكُمْ هٰذَا»

''اے بنی نجار! مجھ سے اس باغ کا سودا کرو اور قیمت بتاؤ۔''

اس پر انھوں نے عرض کی:

«لَا وَاللّٰهِ! لَا نَطْلُبُ ثَمَنَهٗ إِلَّا اللّٰهَ»

''اللہ کی قسم ایسا نہیں ہوگا۔ ہم اس باغ کی قیمت (قیامت کے دن) اللہ تعالیٰ سے وصول کریں گے (یہ جگہ ہم مسجد کے لیے لوجہ اللہ وقف کر دیتے ہیں)''

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

«فَكَانَ فِيْهِ مَا أَقُوْلُ لَكُمْ: قُبُوْرُ الْمُشْرِكِيْنَ، وَفِيْهِ خَرِبٌ، وَّفِيْهِ نَخْلٌ، فَأَمَرَ النَّبِيُّ ﷺ بِقُبُوْرِ الْمُشْرِكِيْنَ فَنُبِشَتْ، ثُمَّ بِالْخَرِبِ فَسُوِّيَتْ، وَبِالنَّخْلِ فَقُطِعَ»

''میں تمھیں یہ بتاتا چلوں کہ اس باغ میں مشرکین کی قبریں، پرانے کھنڈرات اور کھجوریں تھیں۔ نبیِ اکرم ﷺ کے حکم سے مشرکین کی قبروں کو مسمار کر کے وہاں سے بوسیدہ ہڈیاں نکال دی گئیں۔ پھر آپ ﷺ کے حکم سے کھنڈرات کو توڑ کر ہموار کیا گیا اور کھجوریں کاٹ دی گئیں۔''

’’کھجوروں کو مسجد کی جانب قبلے میں نصب کر دیا گیا اور مسجد کے سامنے کی دیوار کے دونوں بازوؤں پر (جہاں چوکھٹ کی لکڑیاں ہوتی ہیں) پتھر لگا دیے گئے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پتھر اٹھا اٹھا کر لانے لگے اور ساتھ ہی ساتھ وہ رجزیہ کلام (جنگی ترانے) پڑھتے جاتے تھے اور نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ان کے ساتھ یہ فرماتے جاتے تھے:

اَللّٰھُمَّ لَا خَیْرَ اِلَّا خَیْرُ الْآخِرَۃِ　　فَاغْفِرْ لِلْأَنْصَارِ وَالْمُھٰجِرَۃِ[1]

’’اے اللہ! بھلائی تو صرف آخرت کی بھلائی ہے۔ اس لیے انصار و مہاجرین کی مغفرت فرما دے۔‘‘

اس حدیث میں اس بات کی دلیل موجود ہے کہ ہبہ پا کر یا خرید کر حاصل کردہ مقبرے یا قبرستان میں ایسا تصرف جائز ہے۔ نیز اس بات کی دلیل بھی موجود ہے کہ پرانی قبریں جو حرمت والی نہ ہوں، یعنی کفار و مشرکین کی ہوں، انھیں کھودا یا مسمار کیا جا سکتا ہے اور ایسی جگہ سے ہڈیاں وغیرہ نکال کر وہاں مسجد بنائی جا سکتی ہے اور وہاں نماز پڑھنا جائز ہے۔

اس حدیث سے یہ بات بھی معلوم ہوگئی کہ مسجد نبوی کی جگہ کے مالکوں یعنی نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دادا عبدالمطلب کے ننھیالی قبیلہ بنونجار نے اس جگہ کی قیمت وصول نہیں کی تھی، بلکہ رضائے الٰہی کے حصول کے لیے وہ جگہ وقف کر دی تھی اور اس کا معاوضہ اللہ پر چھوڑ دیا تھا۔ جب کہ کتبِ سیرت میں اس کے برعکس مذکور ہے کہ انھوں نے قیمت لے کر زمین دی تھی۔

دوسری بات یہ کہ صحیح بخاری و دیگر کتبِ حدیث میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی حدیث میں ہے کہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہدِ مبارک تک مسجد نبوی اینٹوں کی تھی، اس کی چھت کھجور کے پتوں اور ٹہنیوں کی تھی اور ستون کھجور کے تنوں کے تھے۔ حضرت ابوبکر صدیق صلی اللہ علیہ وسلم نے اس میں کوئی اضافہ نہ کیا، البتہ حضرت عمرِ فاروق رضی اللہ عنہ نے اس میں کچھ اضافہ کیا۔ اسے نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی رکھی ہوئی بنیادوں پر ہی اینٹوں اور کھجور کی ٹہنیوں سے بنایا اور اس کے ستون لکڑی کے بنائے، پھر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اس میں تبدیلی اور بہ کثرت اضافہ کیا۔ اس کی دیواریں منقش پتھروں سے اور اس کے ستون بھی منقش پتھروں سے بنائے اور اس کی چھت ساگوان کے درخت سے بنائی تھی۔

---

[1] صحیح البخاري مع الفتح (۱/ ۵۲٤) مختصر صحیح مسلم (۲۳٦) صحیح سنن أبي داود، رقم الحدیث (٤۳٤)

قبروں پر مساجد تعمیر کرنے کا حکم

کفار و مشرکین کے قبرستانوں کو کھود کر انھیں مسمار کرنے، وہاں سے بوسیدہ ہڈیاں نکال کر اس جگہ کو صاف کرنے کے بعد وہاں مسجد تعمیر کی جا سکتی ہے اور یہ ان قبروں کے ساتھ خاص ہے، جو کفار و مشرکین کی ہوں، جب کہ انبیا و صالحین اور مسلمانوں کی قبروں کو کھودنا اور مسمار کرنا جائز نہیں، کیونکہ یہ ان کی حرمت واحترام کے منافی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان صاحبِ حرمت لوگوں کی قبروں پر یا مسلمانوں کے قبرستانوں میں مساجد تعمیر کرنا ممنوع ہے اور قبرستان میں جائے نماز بنانا جائز نہیں ہے۔ یہ دو الگ الگ موضوعات ہیں اور ان ہر دو کی اہمیت کے پیشِ نظر ہم ان پر قدرے تفصیل سے روشنی ڈالنا چاہتے ہیں۔

تو آیئے ان دو موضوعات میں سے پہلے ''قبروں پر مساجد تعمیر کرنے'' کے سلسلے میں بحث کریں۔ چنانچہ کسی ایک دو نہیں بلکہ بکثرت احادیثِ رسول ﷺ میں قبروں پر مساجد تعمیر کرنے کی ممانعت وارد ہوئی ہے، جن میں سے بعض احادیث ہم غیر مسلموں کی عبادت گاہوں میں نماز ادا کرنے کے حکم کے ضمن میں بھی ذکر کر آئے ہیں، لیکن اس موضوع کے ساتھ چونکہ ان کا اُس موضوع سے بھی زیادہ گہرا تعلق ہے، لہٰذا ان کے اعادے میں چنداں حرج نہیں ہے۔

پہلی حدیث:

ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے صحیح بخاری و مسلم، مسند احمد، مسند سراج وابی عوانہ اور شرح السنہ بغوی (۱/ ۴۱۵) میں مختلف طرق سے مروی ہے، جس میں وہ بیان کرتی ہیں کہ وہ مرض الموت جس سے نبیِ اکرم جانبر ہو سکے تھے، اس کے دوران میں نبیِ اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

«لَعَنَ اللّٰهُ الْيَهُوْدَ وَالنَّصَارٰى، اِتَّخَذُوا قُبُوْرَ أَنْبِيَآئِهِمْ مَّسَاجِدَ، فَلَوْلَا ذَاكَ أُبْرِزَ قَبْرُهٗ غَيْرَ أَنَّهٗ خُشِيَ أَنْ يُّتَّخَذَ مَسْجِداً»[1]

[1] صحيح البخاري مع الفتح (۳/ ۲۰۰) صحيح مسلم مع شرح النووي (۳/ ۵/ ۱۲) صحيح الجامع (۳/ ۵/ ۲۲) تحذير الساجد (ص: ۹، ۱۰)

''اللہ تعالیٰ یہود ونصاریٰ پر لعنت کرے کہ انھوں نے اپنے انبیا کی قبروں کو عبادت گاہیں بنا لیا۔ اگر یہی خدشہ نہ ہوتا تو نبیِ اکرم ﷺ کی قبر مبارک کو ظاہر رکھا جاتا (یعنی گھر سے باہر بنائی جاتی) لیکن اس میں خدشہ تھا کہ لوگ کہیں اسے عبادت گاہ نہ بنالیں (اس لیے قبر کو گھر کے اندر بنایا گیا تھا)۔''

اس حدیث میں وارد حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے قول سے معلوم ہوا کہ نبیِ اکرم ﷺ کو گھر کے اندر اس لیے دفن کیا گیا، تاکہ بعد میں آنے والوں میں سے ضعیف العقیدہ لوگ کہیں نبیِ اکرم ﷺ کی قبر مبارک کو بھی عبادت گاہ نہ بنا لیں۔ ان الفاظ سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ مرنے کے بعد تدفین کے لیے قبرستان ہی صحیح جگہ ہے۔ انبیا کے سوا کسی کو گھر میں دفن کرنا صحیح نہیں ہے اور نبیِ اکرم ﷺ کا گھر میں دفن کیا جانا اس مسئلے میں دلیل نہیں بن سکتا۔ ویسے بھی سنت یہی ہے کہ میت کو قبرستان میں دفن کیا جائے، کیونکہ نبیِ اکرم ﷺ اپنے صحابہ رضی اللہ عنہم کو قبرستان ہی میں دفن کیا کرتے تھے۔ آپ ﷺ نے اپنے کسی صحابی کو اس کے گھر میں دفن کرنے کا حکم نہیں فرمایا اور نہ کوئی اپنے گھر میں دفن کیا گیا۔ یہی اصل سنت ہے جو آپ ﷺ کے صحابہ رضی اللہ عنہم کو بقیع میں دفن کرنے سے ظاہر ہوتی ہے۔

نبیِ اکرم ﷺ کی تدفین کے وقت صحابہ کرام میں اختلاف ہوگیا تھا کہ آپ ﷺ کو بقیع میں دفن کیا جائے یا کہاں؟ مختلف آرا سامنے آئیں۔ کسی نے کہا کہ ہم آپ ﷺ کو وہاں دفن کرتے ہیں، جہاں آپ ﷺ نماز پڑھا کرتے تھے۔ اس پر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

''مَعَاذَ اللّٰهِ! أَنْ نَجْعَلَهٗ وَثْناً يُّعْبَدُ''

''ہم اللہ کی پناہ مانگتے ہیں کہ آپ ﷺ کی قبر مقدس کو ایسا وثن بنا دیں جس کی پوجا ہوا کرے۔''

بعض نے کہا کہ آپ ﷺ کو بقیع میں دفن کر دیں تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے ضعیف العقیدہ لوگوں سے غلط افعال کے صدور کے خدشے کی بنا پر اس رائے کو بھی ناپسند فرمایا۔ تب صحابہ نے کہا:

''فَمَا تَرٰى أَنْتَ يَا أَبَا بَكْرٍ''

''اے صدیق! آپ ہی بتائیں کہ آپ ﷺ کو کہاں دفن کیا جائے؟''

تو اُنھوں نے فرمایا:

”سَمِعْتُ مِنْ رَّسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ شَيْئًا مَّا نَسِيْتُهُ“

”میں نے نبیِ اکرم ﷺ کی زبانِ مبارک سے ایک بات سن رکھی ہے، جو (مجھے اب تک یاد ہے) بھولا نہیں ہوں۔“ اور وہ یہ کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

«مَا قَبَضَ اللّٰهُ نَبِيًّا قَطُّ إِلَّا دُفِنَ حَيْثُ قُبِضَ رُوْحُهُ»[1]

”اللہ تعالیٰ کسی نبی کی روح جس جگہ پر قبض کرتا ہے، اس کی تدفین اسی جگہ ہوتی ہے۔“

عمر مولیٰ غفرہ عن ابی بکر رضی اللہ عنہ کے طریق سے یہ ابن زنجویہ کی روایت کے الفاظ ہیں۔ جب کہ سنن ترمذی میں ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی حدیث میں ہے:

«مَا قَبَضَ اللّٰهُ نَبِيًّا إِلَّا فِي الْمَوْضِعِ الَّذِيْ يُحِبُّ أَنْ يُّدْفَنَ فِيْهِ»[2]

یہ حدیث ابن زنجویہ کے یہاں منقطع ہے، کیونکہ الجامع الکبیر سیوطی میں مذکور امام ابن کثیر رحمہ اللہ کے بقول عمر مولیٰ غفرہ کے ضعیف ہونے کے ساتھ ساتھ اس نے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کا زمانہ نہیں پایا۔ ایسے ہی سنن ترمذی کی روایت کو خود امام ترمذی نے ایک راوی عبدالرحمٰن ابن ابی بکر الملیکی کے ضعیف الحافظہ ہونے کی وجہ سے غریب قرار دیا ہے، جب کہ محدث العصر شیخ البانی نے اس حدیث کو شواہد وطُرق کی بنا پر صحیح الجامع الصغیر اور احکام الجنائز میں صحیح وثابت قرار دیا ہے۔[3]

وہ طرق وشواہد نقل کرتے ہوئے احکام الجنائز میں بتایا ہے:

① یہ حدیث سنن ابن ماجہ، طبقات ابن سعد اور الکامل لابن عدی میں ابن عباس عن ابی بکر رضی اللہ عنہ کے طریق سے مروی ہے۔

② طبقات ابن سعد اور مسند احمد میں دو منقطع طُرق سے بھی مروی ہے۔

③ موطا امام مالک میں بھی ہے اور انہی کے طریق سے طبقات ابن سعد میں بلاغاً مذکور ہے۔

④ ایسے ہی طبقات ابن سعد میں صحیح سند کے ساتھ مختصراً اور موقوفاً حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، جو مرفوع کے حکم میں ہے۔ اسے حافظ ابن حجر نے بھی فتح الباری میں صحیح مگر موقوف

---

[1] تحذير الساجد (ص: ١٠، ١١)

[2] صحيح سنن الترمذي، رقم الحديث (٨١٢) مختصر شمائل (٣٢٦) صحيح الجامع (٣/ ٥/ ١٥٠) أحكام الجنائز للألباني (ص: ١٣٧)

[3] تحذير الساجد (ص: ١١)

قرار دیا ہے اور گھر میں تدفین کو نبیِ اکرم ﷺ کے خصائص میں سے گنوایا ہے۔[1]

اس تفصیل سے گھروں میں تدفین کی ممانعت واضح ہوگئی کہ گھر میں کسی کو دفن کرنا صحیح نہیں اور نبیِ اکرم ﷺ کا گھر میں دفن کیا جانا مسلمانوں کے عقیدۂ توحید کے تحفظ، ضعیف العقیدہ لوگوں کے بعض افعال کے خدشے کے لیے تھا اور وہ آپ ﷺ کے خصائص میں سے تھا، لہٰذا اسے کوئی شخص دلیل نہیں بنا سکتا۔ آپ ﷺ کی قبر اقدس کا تعمیر میں توسیع کی وجہ سے مسجدِ نبوی کے اندر آ جانا بھی اس بات کی دلیل نہیں ہوئی تھی، بلکہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے آپ ﷺ کو آپ ﷺ کے گھر میں دفن کیا تھا، تاکہ آپ ﷺ کی قبر مبارک کو کوئی شخص عبادت گاہ نہ بنا سکے، جس سے بچنے کی آپ ﷺ خود دعا کیا کرتے اور صحابہ رضی اللہ عنہم کو تاکید فرمایا کرتے تھے، جیسا کہ ان احادیث کی نصوص بھی ہم ذکر کرنے والے ہیں اور اس موضوع سے متعلق نصوص کے بعد نبیِ اکرم ﷺ کی قبرِ مبارک پر مشتمل حجرے کے مسجدِ نبوی میں داخل کیے جانے کی تاریخ بھی ذکر کریں گے۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔ تاکہ قبروں پر مساجد کی تعمیر اور مساجد میں تدفین کے سلسلے میں پایا جانے والا شبہہ زائل ہو جائے اور اس واقعے سے استدلال کا ضُعف واضح ہو جائے۔

دوسری حدیث:

لیکن پہلے آیئے کسی کی قبر پر قبرستان میں تعمیرِ مسجد کی ممانعت پر دلالت کرنے والی احادیث دیکھیں، جن میں سے پہلی حدیث ہم ذکر کر چکے ہیں۔ دوسری حدیث صحیح بخاری و مسلم، سنن ابو داود، مسند احمد و ابی یعلی، مسند سراج و ابو عوانہ، مصنف عبدالرزاق (موقوفاً) اور تاریخ ابن عساکر میں سعید بن مسیّب اور یزید بن اصم کے طریق سے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبیِ اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

«قَاتَلَ اللّٰهُ الْيَهُوْدَ اتَّخَذُوْا قُبُوْرَ أَنْبِيَائِهِمْ مَّسَاجِدَ»[2]

''اللہ تعالیٰ یہودیوں کو غارت کرے کہ انھوں نے اپنے انبیا کی قبروں کو عبادت گاہیں بنا لیا۔''

---

[1] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: فتح الباري (١/ ٥٢٩) باب كراهية الصلاة فى المقابر، أحكام الجنائز (ص: ١٣٧، ١٣٨)

[2] صحيح البخاري (١/ ٥٣٢) صحيح مسلم مع شرح النووي (٣/ ٥/ ١٢) صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (٢٧٦٤) صحيح الجامع، رقم الحديث (٥١٠٨) تحذير الساجد (ص: ١٢)

تیسری اور چوتھی حدیث:

ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما دونوں سے ایک جیسے الفاظ سے صحیح بخاری ومسلم، سنن نسائی و دارمی، مسند احمد وابی عوانہ، طبقات ابن سعد اور مصنف، عبدالرزاق (عن ابن عباس رضی اللہ عنہما وحدہ) میں مروی ہے کہ جب نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کا وقت قریب آ گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے ایک دھاری دار کپڑے کو کبھی چہرے پر ڈال لیتے اور کبھی ہٹا لیتے تھے (گویا جان کنی کا عالم تھا) جب چہرۂ انور سے کپڑا ہٹاتے تو فرماتے:

«لَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الْيَهُوْدِ وَالنَّصَارٰى اِتَّخَذُوْا قُبُوْرَ أَنْبِيَائِهِمْ مَّسَاجِدَ»

''یہود ونصاریٰ پر اللہ کی لعنت ہو کہ انھوں نے اپنے انبیاے کرام کی قبروں کو عبادت گاہ بنا لیا۔''

اس حدیث کے آخر میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں:

«يُحَذِّرُ مِثْلَ الَّذِيْ صَنَعُوْا»

''آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے اس فعل کی قباحت وشناعت پر لوگوں کو تحذیر وتنبیہ فرمانا چاہتے تھے۔''

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ ''فتح الباري'' میں لکھتے ہیں:

''گویا نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو جب علم ہوگیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس دنیا سے رخصت ہونے والے ہیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ خدشہ لاحق ہوا کہ کہیں (بعد میں آنے والے) لوگ میرے ساتھ بھی ایسا ہی معاملہ نہ کرنے لگیں کہ میری قبر کی تعظیم وعبادت شروع کر دیں، جیسا کہ پہلے لوگوں میں سے یہود ونصاریٰ نے کیا۔ لہٰذا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان پر لعنت فرما کر اس بات کی طرف اشارہ فرما دیا کہ جو شخص ان جیسا فعل کرے گا، وہ بھی انھی کی طرح مذموم وملعون ہوگا۔''[1]

پانچویں حدیث:

صحیح بخاری ومسلم، سنن نسائی وبیہقی، مسند احمد و ابی عوانہ (والسیاق لہ) مسند ابی یعلی، مصنف ابن ابی شیبہ، طبقات ابن سعد اور شرح السنہ بغوی میں ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ جب نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مرض الموت میں مبتلا تھے تو نبیِ مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعض ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن نے حبشہ میں واقع ایک گرجے کا ذکر کیا، جس کا نام ماریہ تھا۔ اُم حبیبہ اور اُم سلمہ رضی اللہ عنہما حبشہ جا چکی

[1] فتح الباري (١/ ٥٣٢)

تھیں، جب اس گرجے کی خوبصورتی اور اس میں بنی تصویروں کا ذکر آیا تو نبیِ اکرم ﷺ نے (بستر سے) سرِ اقدس کو اٹھایا اور فرمایا:

«أُولٰئِكَ إِذَا كَانَ فِيهِمُ الرَّجُلُ الصَّالِحُ بَنَوْا عَلٰى قَبْرِهٖ مَسْجِداً ثُمَّ صَوَّرُوْا تِلْكَ الصُّوَرَ أُولٰئِكَ شِرَارُ الْخَلْقِ عِنْدَ اللّٰهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ»[1]

''ان میں سے اگر کوئی نیک آدمی ہوتا تو (اس کے مرنے کے بعد) وہ اس کی قبر پر عبادت گاہ بنا دیتے اور وہ تصویریں تیار کر لیتے تھے۔ وہ لوگ قیامت کے دن اللہ کے نزدیک بدترین لوگ ہوں گے۔''

چھٹی حدیث:

قبروں پر یا قبرستان میں مسجد کی تعمیر کے ممنوع ہونے پر دلالت کرنے والی چھٹی حدیث، صحیح مسلم، مسند ابوعوانہ (واللفظ لہ) معجم کبیر طبرانی اور طبقات ابن سعد (مختصراً) میں حضرت جندب بن عبداللہ بجلی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبیِ اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

«أَلَا (وَإِنَّ) مَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ (كَانُوْا) يَتَّخِذُوْنَ قُبُوْرَ أَنْبِيَاءِ هِمْ وَصَالِحِيهِمْ مَّسَاجِدَ، أَلَا فَلَا تَتَّخِذُوا الْقُبُوْرَ مَسَاجِدَ فَإِنِّي أَنْهَاكُمْ عَنْ ذٰلِكَ»[2]

''خبردار! تم سے پہلے والے لوگ اپنے انبیا و صالحین کی قبروں کو عبادت گاہ بنا لیتے تھے، مگر تم قبروں کو مسجد نہ بنا لینا۔ میں تمھیں اس سے منع کر رہا ہوں۔''

طبقات ابن سعد میں اس حدیث کا ایک شاہد حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے اور دوسرا شاہد معجم طبرانی میں حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، جسے علامہ ہیتمی نے ''الزواجر'' میں سند کے اعتبار سے ''لا بأس به'' قرار دیا ہے، البتہ علامہ ہیثمی نے ''مجمع الزوائد'' میں اسے ضعیف قرار دیا ہے۔[3]

---

[1] صحيح البخاري مع الفتح (٣/ ٢٠٨) و الزواجر أيضاً (١/ ١٤٨)

[2] صحيح مسلم مع شرح النووي (٣/ ٥/ ١٣) المنتقى مع نيل الأوطار (١/ ٢/ ١٣٦) تحذير الساجد (١٤، ١٥) الزواجر (١/ ١٤٨)

[3] الزواجر (١/ ١٤٨) مجمع الزوائد (٥/ ٩/ ٤٥) تحذير الساجد (ص: ١٥)

ساتویں حدیث:

اسی موضوع کی ساتویں حدیث صحیح سند کے ساتھ مصنف ابن ابی شیبہ میں حضرت حارث نجرانی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، جس میں وہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے پانچ دن قبل آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے:

«أَلَا وَإِنَّ مَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ كَانُوْا يَتَّخِذُوْنَ قُبُوْرَ أَنْبِيَاءِ هِمْ وَصَالِحِيْهِمْ مَسَاجِدَ، أَلَا فَلَا تَتَّخِذُوا الْقُبُوْرَ مَسَاجِدَ، إِنِّيْ أَنْهَاكُمْ عَنْ ذٰلِكَ»[1]

''خبردار! تم سے پہلے لوگوں نے اپنے انبیا و صالحین کی قبروں کو عبادت گاہیں بنا لیا، مگر تم قبروں کو مساجد مت بنانا۔ میں تمھیں اس سے منع کر رہا ہوں۔''

آٹھویں حدیث:

مسند احمد و طیالسی اور معجم طبرانی کبیر میں حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے مرض الموت میں فرمایا:

«أَدْخِلُوْا عَلَيَّ أَصْحَابِيْ» ''میرے صحابہ کو میرے پاس لاؤ۔''

صحابہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے جب کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم یمنی چادر اوڑھے اور سر منہ لپیٹے ہوئے تھے۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے چہرۂ اقدس سے کپڑا ہٹایا اور فرمایا:

«لَعَنَ اللّٰهُ الْيَهُوْدَ وَالنَّصَارٰى اِتَّخَذُوْا قُبُوْرَ أَنْبِيَاءِ هِمْ مَّسَاجِدَ»[2]

''اللہ تعالیٰ یہود و نصاریٰ پر لعنت کرے، انھوں نے اپنے انبیا کی قبروں کو عبادت گاہ بنا لیا۔

امام شوکانی رحمہ اللہ نے اس حدیث کی سند کو جید قرار دیا ہے۔ علامہ ہیثمی نے کہا ہے کہ اس کے تمام روای ثقہ ہیں اور شیخ البانی نے اس کی سند کو حسن فی الشواہد کہا ہے۔[3]

نویں حدیث:

مسند احمد و ابی یعلی، مشکل الآثار طحاوی اور تاریخ ابن عساکر میں صحیح سند کے ساتھ امینِ امت

[1] تحذیر الساجد (ص: ١٥)

[2] صحیح الجامع، رقم الحدیث (٥١٠٨) الزواجر (١/ ١٤٨) تحذیر الساجد (ص: ١٥، ١٦)

[3] نیل الأوطار (١/ ٢/ ١٣٦) مجمع الزوائد (٢/ ٢٧) تحذیر الساجد (ص: ١٦)

حضرت ابوعبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانِ مبارک سے جو آخری کلمات صادر ہوئے، وہ یہ تھے:

«أَخْرِجُوْا يَهُوْدَ أَهْلِ الْحِجَازِ وَأَهْلِ نَجْرَانَ مِنْ جَزِيْرَةِ الْعَرَبِ، وَاعْلَمُوْا أَنَّ شِرَارَ النَّاسِ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا (وَفِيْ رِوَايَةٍ: يَتَّخِذُوْنَ) قُبُوْرَ أَنْبِيَاءِهِمْ مَّسَاجِدَ»[1]

''حجاز و نجران کے یہودیوں کو جزیرۂ عرب سے جلا وطن کر دو اور یاد رکھو کہ بدترین لوگ وہ تھے (اور ایک روایت کے مطابق بدترین لوگ وہ ہوں گے) جنھوں نے اپنے انبیا کی قبروں کو عبادت گاہ بنا لیا (یا بنا لیں گے)۔''

اس حدیث کی دوسری روایت میں امتِ اسلامیہ کے وہ لوگ مراد ہیں، جو یہود و نصاریٰ کے نقشِ قدم پر چل کر انبیا و صالحین کی قبروں کو عبادت گاہ و مسجد بنائیں گے، جیسا کہ نمبر (۶) اور سات (۷) میں بھی اسی امت کے لوگ مراد ہیں اور بارہ نمبر پر جو حدیث ہم ذکر کرنے والے ہیں، اس میں بھی ایسے ہی ہے۔

دسویں حدیث:

مسند احمد میں حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

«لَعَنَ اللّٰهُ، (وَفِيْ رِوَايَةٍ: قَاتَلَ اللّٰهُ) الْيَهُوْدَ وَالنَّصَارٰى اتَّخِذُوْا قُبُوْرَ أَنْبِيَاءِهِمْ مَّسَاجِدَ»[2]

''اللہ تعالیٰ یہود و نصاریٰ پر لعنت کرے (اور دوسری روایت کے مطابق انھیں غارت کرے) کہ انھوں نے اپنے انبیا کی قبروں کو عبادت گاہ بنا لیا۔''

گیارھویں حدیث:

مسند احمد وابی یعلی، حلیۃ الاولیاء، طبقات ابن سعد اور مسند حمیدی میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے

---

[1] مسند أحمد (رقم: ١٦٩١) مسند أبي يعلىٰ (ص: ٢٤٨) سنن الدارمي (٢/ ٢٣٣) مسند الحميدي (٨٥) السلسلة الصحيحة (١١٣٢) نيل الأوطار (١/ ٢/ ١٣٦) صحيح الجامع، رقم الحديث (٢٣٣) تحذير الساجد (ص: ١٦)

[2] تحذير الساجد (ص: ١٧)

مروی ہے کہ نبیِ اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

«اَللّٰھُمَّ لَا تَجْعَلْ قَبْرِيْ وَثَناً، لَعَنَ اللّٰہُ قَوْمًا اِتَّخَذُوْا قُبُوْرَ أَنْبِیَاءِ ھِمْ مَّسَاجِدَ»[1]

''اے اللہ! میری قبر کو وثن (بت) نہ بنا دینا (جس کی پوجا ہونے لگے) اللہ کی لعنت ہو اس قوم پر جس نے اپنے انبیا کی قبروں کو پوجا گاہ بنا لیا۔''

بارھویں حدیث:

صحیح ابن خزیمہ و ابن حبان، مصنف ابن ابی شیبہ، معجم طبرانی کبیر، مسند احمد وابی یعلی اور اخبار اصبہان ابو نعیم میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ میں نے نبیِ اکرم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا:

«إِنَّ مِنْ شِرَارِ النَّاسِ مَنْ تُدْرِکُہُ السَّاعَةُ وَھُمْ أَحْیَاءٌ»[2]

''بدترین ہیں وہ لوگ جو زندہ ہوں گے اور قیامت انھیں آلے گی۔''

اس حدیث کا یہ نصف اوّل مذکورہ کتبِ حدیث کے علاوہ صحیح بخاری شریف میں بھی تعلیقاً وارد ہے اور اس حدیث کا باقی نصف یہ ہے:

«وَمَنْ یَّتَّخِذُ الْقُبُوْرَ مَسَاجِدَ»[3]

''اور وہ بھی بدترین لوگ ہیں جو قبروں کو مساجد و عبادت گاہیں بنا لیں گے۔''

تیرھویں حدیث:

طبقات ابن سعد اور تاریخِ دمشق میں ایسے ہی حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

«لَقِیَنِي الْعَبَّاسُ فَقَالَ: یَا عَلِيُّ انْطَلِقْ بِنَا إِلٰی النَّبِيِّ ﷺ، فَإِنْ کَانَ مِنَ الْأَمْرِ شَيْئٌ وَإِلَّا أَوْصٰی بِنَا النَّاسَ فَدَخَلْنَا عَلَیْہِ، وَھُوَ مُغْمیٰ عَلَیْہِ فَرَفَعَ رَأْسَہٗ فَقَالَ: لَعَنَ اللّٰہُ الْیَھُوْدَ اِتَّخَذُوْا قُبُوْرَ الْأَنْبِیَاءِ مَسَاجِدَ (وَ زَادَ فِيْ رِوَایَةٍ) ثُمَّ قَالَھَا ثَلَاثًا»[4]

---

[1] تحذیر الساجد (ص۱۷، ۱۸ وصححه)

[2] صحیح البخاري (۱۳/ ۱۵) کما في تحذیر الساجد (ص: ۱۹)

[3] تحذیر الساجد (ص: ۱۸، ۱۹) وحسّنه، و نقل تحسین ابن تیمیة والهیثمي للحدیث، موارد الظمآن (ص: ۱۰۴)

[4] تحذیر الساجد (ص: ۱۹، ۱۰)

’’مجھے (میرے چچا) حضرت عباس رضی اللہ عنہ ملے اور فرمایا: اے علی رضی اللہ عنہ ! میرے ساتھ نبیِ اکرم ﷺ کی خدمت میں چلو۔ اگر ہمارے لیے کچھ ہوا تو ٹھیک ہے، ورنہ کم از کم آپ ﷺ لوگوں کو ہماری نسبت بھلائی کی وصیت ہی فرمائیں گے۔ لہٰذا ہم آپ ﷺ کے پاس پہنچے، مگر اس وقت آپ ﷺ غشی کے عالم میں تھے۔ پھر آپ ﷺ نے سرِ اقدس کو اٹھایا اور فرمایا: اللہ کی لعنت ہو یہودیوں پر! انھوں نے انبیا کی قبروں کو عبادت گاہ بنا لیا اور ایک روایت میں یہ اضافی الفاظ بھی مروی ہیں کہ آپ ﷺ نے تین مرتبہ یہ بات ارشاد فرمائی۔‘‘

چودھویں حدیث:

الجامع الکبیر سیوطی میں منقول ہے، جسے ابن زنجویہ نے ’’فضائلِ صدیق‘‘ میں روایت کیا ہے کہ امہات المومنین رضی اللہ عنہن سے مروی ہے کہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے پوچھا:

’’كَيْفَ نَبْنِي قَبْرَ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ؟ أَنَجْعَلُهٗ مَسْجِداً؟‘‘

’’ہم نبیِ اکرم ﷺ کی قبرِ مبارک کیسے بنائیں؟ کیا ہم اسے مسجد (عبادت گاہ) بنا دیں؟‘‘

تو اس پر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں نے نبیِ اکرم ﷺ کو فرماتے ہوئے سُنا ہے:

((لَعَنَ اللّٰهُ الْيَهُوْدَ وَالنَّصَارٰى اِتَّخَذُوْا قُبُوْرَ أَنْبِيَاءِهِمْ مَّسَاجِدَ)) [1]

’’اللہ تعالیٰ یہود و نصاریٰ پر لعنت فرمائے کہ انھوں نے اپنے انبیا کی قبروں کو عبادت گاہ بنا ڈالا۔‘‘

قارئینِ کرام! یہ چودہ احادیث ہیں اور ان میں سے بعض کے متعدد شواہد بھی ہیں، جن کی طرف ہم اشارہ کر آئے ہیں۔ ان سب کا مجموعی دو حرفی مفاد یہ ہے کہ کسی نبی یا نیک آدمی کی قبر پر یا عام مسلمانوں کے قبرستان میں مسجد و عبادت گاہ بنانا جائز نہیں ہے، انہی احادیث میں سے بعض کے ضمن میں ہم نے ذکر کیا ہے کہ کسی کا اپنے گھر میں دفن کیے جانے کی وصیت کرنا وغیرہ بھی جائز نہیں، بلکہ تعاملِ صحابہ رضی اللہ عنہم قبرستان میں تدفین ہی ہے۔ اس سلسلے میں نبیِ اکرم ﷺ کے گھر میں دفن کیے جانے اور اس گھر کی توسیع کے نتیجے میں مسجد کے اندر آ جانے سے استدلال کرنا صحیح نہیں ہے۔

[1] حوالہ بالا (ص: ۲۰)

مسجد یا عبادت گاہ بنانے سے مراد

اب یہاں ہم یہ بات بھی واضح کر دینا چاہتے ہیں کہ ان احادیث میں جو آیا ہے کہ یہود و نصاریٰ نے انبیا و صالحین کی قبروں کو مساجد یا عبادت گاہیں بنا لیا یا وہ مسلمان جو نیک لوگوں کی قبروں یا قبرستانوں کو عبادت گاہ بنا لیں گے تو اس سے کیا مراد ہے؟ اہلِ علم نے اسے مسجد بنا لینے یا عبادت گاہ بنا لینے کے تین مفہوم بیان کیے ہیں:

پہلا مفہوم و معنیٰ:

ان میں سے ایک مفہوم تو وہی ہے جو ہم نے ان احادیث کے ترجمے میں اختیار کیا ہے۔ یعنی قبر پر یا قبرستان میں مسجد و عبادت گاہ بنا لینا۔ امام بخاری رحمہ اللہ کا اختیار یہی مفہوم ہے، کیونکہ ہماری ذکر کردہ پہلی حدیث پر امام بخاری رحمہ اللہ نے یوں تبویب کی ہے:

”بَابُ مَا یُکْرَہُ مِنَ اتِّخَاذِ الْمَسَاجِدِ عَلَی الْقُبُوْرِ“

یعنی قبروں پر مساجد تعمیر کرنے کی کراہت کا بیان۔

اس تبویب میں انھوں نے اس بات کی طرف اشارہ کر دیا ہے کہ قبر کو عبادت گاہ بنانے کی ممانعت سے یہ بھی لازم آتا ہے کہ قبر پر مسجد تعمیر کرنا ممنوع ہے۔ علامہ مناوی نے فیض القدیر شرح الجامع الصغیر سیوطی میں اور کرمانی سے نقل کرتے ہوئے حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے فتح الباری میں اس مفہوم کی تصریح کی ہے۔[1]

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے الفاظ ہیں:

”فَلَوْلَا ذَاكَ أُبْرِزَ قَبْرُہٗ غَیْرَ أَنَّہٗ خُشِيَ أَنْ یُّتَّخَذَ مَسْجِداً“

”اگر پوجا کا خدشہ نہ ہوتا (یا قبروں پر مساجد بنانے والوں پر لعنت نہ ہوتی) تو نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی قبرِ مبارک کھلی جگہ پر بنائی جاتی۔“

ان کے ان الفاظ سے پتا چلتا ہے کہ انھوں نے بھی نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ان ارشادات سے یہی مفہوم سمجھا تھا۔ ان کے یہی معنیٰ سمجھنے کا پتا ایک اور حدیث سے بھی چلتا ہے، جو طبقات ابن سعد میں حضرت حسن بصری رحمہ اللہ سے مرسلا مروی ہے:

[1] فتح الباري (٣/ ٢٠٠، ٢٠١) تحذير الساجد (ص: ٢٢، ٢٣، ٢٦، ٢٧)

''اِئْتَمَرُوا أَنْ يَّدْفِنُوْهُ فِي الْمَسْجِدِ''

''صحابہ رضی اللہ عنہم نے مشورہ کیا کہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو مسجد میں دفن کیا جائے۔''

لیکن حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے کہا کہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے میری گود میں سر رکھے ہوئے فرمایا تھا کہ اللہ تعالیٰ ان قوموں کو غارت کرے جنھوں نے اپنے انبیاء کی قبروں کو عبادت گاہیں بنا لیا:

''اِجْتَمَعَ رَأْيُهُمْ أَنْ يَّدْفِنُوْهُ حَيْثُ قُبِضَ فِي بَيْتِ عَآئِشَةَ''[1]

''تمام صحابہ رضی اللہ عنہم کا اس بات پر اتفاق ہو گیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے گھر اس جگہ پر دفن کیا جائے، جہاں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی روح قبض کی گئی۔''

گویا صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی بات پر اتفاق کے ساتھ عمل کر کے اپنی رائے ترک کر دی اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی رائے کی توثیق کر دی۔ یہ اس بات کی بھی دلیل ہے کہ قبر پر مسجد تعمیر کرنے یا قبر کو مسجد میں داخل کر دینے میں کوئی فرق نہیں، دونوں ایک ہی بات ہیں، حتیٰ کہ حافظ عراقی سے علامہ مناوی نے فیض القدیر (۵/۴/۲۷۴) میں نقل کیا ہے کہ انھوں نے کہا ہے:

''جس نے مسجد تعمیر کی اور اس کا ارادہ تھا کہ اس کے کسی حصے میں اسے دفن بھی کیا جائے گا تو وہ شخص بھی حدیث میں مذکور لعنت کا مستحق ہے، بلکہ مسجد میں تدفین حرام ہے۔ اگر وہ تعمیرِ مسجد کے وقت یہ شرط عائد کرے کہ وہ اس میں دفن کیا جائے گا تو اس کی وہ شرط صحیح نہیں، کیونکہ یہ مسجد وقف کرنے کے منافی فعل ہے۔ گذشتہ صفحات میں مذکور حدیث نمبر پانچ بھی اسی مفہوم و معنیٰ کی شاہد و مؤید ہے، جس میں ارشاد ہے:

«أُولٰئِكَ قَوْمٌ إِذَا كَانَ فِيهِمُ الرَّجُلُ الصَّالِحُ فَمَاتَ بَنُوا عَلٰى قَبْرِهٖ مَسْجِداً... أُولٰئِكَ شِرَارُ الْخَلْقِ»

''ان میں سے جب کوئی نیک آدمی مرجاتا تو وہ اس کی قبر پر عبادت گاہ بنا لیتے تھے۔ وہ بدترین لوگ ہوں گے۔''

ان الفاظ میں ان کے بدترین لوگ ہونے کا سبب یہی قبروں پر مساجد کی تعمیر ہے، لہٰذا یہ حدیث قبروں پر مسجدیں تعمیر کرنے کے حرام ہونے پر نصِ صریح ہے۔ اس کی تائید صحیح مسلم، سنن ترمذی،

---

[1] تحذیر الساجد (ص: ۲۷)

مصنف ابن ابی شیبہ اور مسند احمد میں وارد حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث سے بھی ہوتی ہے، جس میں وہ بیان کرتے ہیں:

«نَهَىٰ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ أَنْ يُجَصَّصَ الْقَبْرُ، وَأَنْ يُقْعَدَ عَلَيْهِ، وَأَنْ يُبْنىٰ عَلَيْهِ»[1]

''نبیِ اکرم ﷺ نے اس بات سے منع فرمایا ہے کہ قبر کو گچ (وغیرہ) سے پختہ بنایا جائے اور یہ کہ اس پر (مجاور بن کر) بیٹھا جائے اور یہ کہ اس پر کچھ تعمیر کیا جائے۔''

اس حدیث سے اس بات کی وضاحت بھی ہوگئی ہے کہ قبر پر صرف مسجد بنانا ہی ممنوع نہیں بلکہ کوئی بھی چیز تعمیر کرنا جائز نہیں۔ اس مطلق نہی میں قبّہ یا گنبد وغیرہ بھی آ گئے۔ اس حدیث کو نقل کرنے کے بعد امام شوکانی رحمہ اللہ نے ''شرح الصدور في تحريم رفع القبور'' میں لکھا ہے:

''اس میں قبروں پر کچھ تعمیر کرنے کی ممانعت کی صراحت ہے۔ نیز یہ حدیث اُس پر بھی صادق آتی ہے، جو قبر کے گڑھے کے اردگرد دیوار وغیرہ تعمیر کرے، جیسا کہ کثیر تعداد میں لوگ میت کی قبر پر ایک ہاتھ یا اس سے بھی زیادہ اونچی کرتے ہیں، کیونکہ یہ تو ممکن ہی نہیں کہ نفس قبر ہی کو مسجد یا عبادت گاہ بنایا جاسکے۔ یہ اس بات کی بھی دلیل ہے کہ اس تعمیر سے مراد ہر وہ چیز ہے جو قبر سے متصل اور قریب ہو۔

یہ حدیث اُس پر بھی صادق آتی ہے، جو قبر کے قریب اردگرد کچھ بنائے، جیسا کہ گنبد، مساجد، مزارات وغیرہ ہیں، جب کہ قبر اس کے وسط میں یا کسی بھی ایک جانب میں ہو۔ یہ بھی قبر پر کچھ تعمیر کرنے میں ہی آتا ہے، اور یہ کسی صاحبِ فہم سے پوشیدہ نہیں۔ جیسا کہ کہا جاتا ہے کہ بادشاہ نے فلاں شہر یا گاؤں پر فصیل بنائی ہے یا کہا جائے گا کہ فلاں شخص نے فلاں جگہ پر مسجد بنائی ہے، جب کہ فصیل تو صرف شہر یا گاؤں کے اردگرد ہوتی ہے نہ کہ ان پر اور اس میں بھی کوئی فرق نہیں ہوتا کہ اس دیوار کی تعمیر جن جوانب پر ہوئی ہے، وہ وسطِ شہر یا گاؤں یا جگہ کے قریب ہوں، جیسا کہ چھوٹے شہر، چھوٹے گاؤں یا چھوٹی جگہ میں ہوسکتا ہے یا وسط سے دور ہوں، جیسا کہ بڑے شہر، گاؤں یا جگہ کی شکل میں ہو سکتا ہے۔ جو کہے کہ لغتِ عرب میں یہ اطلاق ممنوع ہے تو وہ لغتِ عرب کو جانتا ہی نہیں، نہ اس کی زبان سمجھتا ہے اور نہ کلامِ عرب میں کلمات کے صحیح استعمال ہی کو جانتا ہے۔''[2]

[1] صحيح مسلم (٢/ ٦٦٧) تحقيق محمد فؤاد عبدالباقي، تحذير الساجد (ص: ٢٩)

[2] شرح الصدور للشوكاني (ص: ٧٠) ضمن مجموعة الرسائل المنيرية (ص: ١٥)

یہاں یہ بات بھی پیشِ نظر رہے کہ قبرِ نبوی پر جو گنبدِ خضراء بنا ہوا ہے، وہ کوئی عہدِ نبوی ﷺ یا دورِ صحابہ رضی اللہ عنہم سے نہیں، بلکہ شیخ محمد سلطان معصومی نے ''المشاهدات المعصومية عند قبر خير البرية'' میں لکھا ہے:

''یہ بات ذہن میں رکھیں کہ ۶۷۸ھ تک حجرۂ نبوی پر، جس میں آپ ﷺ کی قبرِ مقدس ہے، کوئی گنبد نہیں تھا۔ یہ تو ملک ظاہر منصور قلاوون صالحی نے ۶۷۸ھ میں بنوایا تھا۔''

پھر وفاء الوفاء سمہودی سے نقل کرتے ہوئے لکھا ہے:

''جس طرح ولید نے نصاریٰ کے کنائس کی تقلید کرتے ہوئے مسجدِ نبوی کو مزخرف ومزین کیا تھا، ویسے ہی قلاوون نے نبیِ اکرم ﷺ کے ارشادات سے ناواقفیت کی بنا پر گنبد بنوایا، کیونکہ اسی نے مصر وشام میں نصاریٰ کے کنائس کو مزخرف ومزین کیا تھا۔''

ایوب صبری ترکی نے کتاب ''مرأة الحرمين'' کی جلد دوم سے نقل کیا ہے:

''قلاوون نے ۶۷۸ھ میں گنبدِ خضراء بنوایا۔ پھر ۷۵۵ھ میں اس کے بیٹے الملک ناصر حسن بن محمد بن قلاوون نے اسکی تجدید اور نحاسی تزئین کی۔''

آگے شیخ معصومی لکھتے ہیں:

''یقیناً قلاوون کا یہ فعل نبیِ اکرم ﷺ کی صحیح وثابت احادیث کے قطعاً خلاف ہے، لیکن جہالت، تعظیم ومحبت میں غلو اور غیروں کی تقلید بُری بلا ہیں۔''[1]

قبروں پر مساجد کی تعمیر کو ممنوع قرار دینے والی احادیث میں اس بات کی دلیل بھی واضح انداز میں موجود ہے کہ قبروں پر تعمیر کی گئی مساجد میں نماز پڑھنا بھی ممنوع ہے، کیونکہ قبروں پر مساجد بنانے کی ممانعت سے ان مساجد میں نماز کی ممانعت بھی لازم آتی ہے، کیونکہ وسیلے کی ممانعت سے دراصل مقصود کی ممانعت مراد ہوتی ہے اور مسجد کی تعمیر تو ایک وسیلہ ہے۔ مقصود تو نماز وعبادت ہے۔ قبور پر بنائی گئی مساجد میں نماز کا حکم قدرے تفصیل کے ساتھ ہم بعد میں بیان کریں گے۔ ان شاء اللہ

دوسرا مفہوم ومعنیٰ:

قبروں کو مساجد یا عبادت گاہیں بنانے کا دوسرا مفہوم یہ ہے کہ ان پر یا ان کی طرف منہ کر کے

[1] المشاهدات المعصومية (ص: ٢٦) طبع دار الإفتاء۔ سعودی عرب

نماز ادا کی جائے، یعنی ان پر سجدہ کیا جائے۔ علامہ ہیتمی نے ''الزواجر'' میں اور امیر صنعانی نے ''سُبل السلام'' میں قبر پر سجدہ کرنے یا قبر کی طرف منہ کر کے نماز ادا کرنے کا مفہوم بیان کیا ہے۔

چنانچہ علامہ ہیتمی ''الزواجر عن اقتراف الکبائر'' میں لکھتے ہیں:

''وَاتِّخَاذُ الْقَبْرِ مَسْجِداً، مَعْنَاهُ الصَّلَاۃُ عَلَیْہِ أَوْ إِلَیْہِ''[1]

''قبر کو مسجد بنا لینے کا معنیٰ اس پر سجدہ کرنا یا اس کی طرف منہ کر کے نماز ادا کرنا ہے۔''

اور امیر صنعانی ''سبل السلام شرح بلوغ المرام'' میں رقمطراز ہیں:

''وَاتِّخَاذُ الْقُبُوْرِ مَسَاجِدَ أَعَمُّ مِنْ أَنْ یَّکُوْنَ بِمَعْنٰی اَلصَّلَاۃُ إِلَیْھَا أَوْ بِمَعْنٰی اَلصَّلَاۃُ عَلَیْھَا''[2]

''قبروں کو عبادت گاہ بنانا ان کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنے یا ان پر سجدہ کرنے اور نماز پڑھنے ہر دو معنوں سے عام ہے۔'' یعنی وہ ان دونوں معنوں کو بھی شامل ہے۔

نیز اس بات کا بھی احتمال ہے کہ اُنھوں نے اس سے تینوں معانی مراد لیے ہوں، کیونکہ اس کا ایک تیسرا معنیٰ بھی ہے، جو ہم آگے چل کر ذکر کرنے والے ہیں۔ دو معنوں سے بھی عام ہونے میں اس بات کی طرف اشارہ موجود ہے کہ ان کے نزدیک تیسرے معنیٰ کو بھی یہ لفظ شامل ہے اور امام شافعی رحمہ اللہ نے بھی اسی طرح تینوں مفہوم ہی مراد لیے ہیں۔ آگے چل کر ان کا قول بھی ہم ذکر کریں گے۔ ان شاء اللہ لیکن آیئے یہاں پہلے آپ کو وہ احادیث بتائیں۔ جن سے اسی دوسرے معنیٰ و مفہوم کی تائید ہوتی ہے۔

چنانچہ مسند ابی یعلی میں صحیح سند کے ساتھ حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

« إِنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صلی اللہ علیہ وسلم نَھٰی أَنْ یُّبْنٰی عَلَی الْقُبُوْرِ أَوْ یُقْعَدَ عَلَیْھَا أَوْ یُصَلّٰی عَلَیْھَا »[3]

''نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات سے منع فرمایا کہ قبروں پر کوئی عمارت بنائی جائے یا ان پر (مجاور بن کر) بیٹھا جائے یا ان پر نماز پڑھی جائے۔''

---

[1] الزواجر (۱/ ۱٤۸) طبع دار المعرفۃ بیروت

[2] سبل السلام (۱/ ۲۱٤) تحذیر الساجد (ص: ۲۲)

[3] تحذیر الساجد (ص: ۲۲)

اسی دوسرے معنیٰ کی تائید ایک دوسری حدیث سے بھی ہوتی ہے جو تاریخ صغیر امام بخاری میں تعلیقاً اور معجم طبرانی میں موصولاً دو طُرق سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

«لَا تُصَلُّوا إِلٰى قَبْرٍ، وَّلَا تُصَلُّوا عَلٰى قَبْرٍ»[1]

''کسی قبر کی طرف منہ کر کے نماز پڑھو نہ کسی قبر پر نماز پڑھو یا اس پر سجدہ کرو۔

اسی دوسرے مفہوم کی تائید کرنے والی ایک تیسری حدیث صحیح ابن حبان میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، جس میں وہ بیان کرتے ہیں:

«إِنَّ النَّبِيَّ صلی اللہ علیہ وسلم نَهٰى عَنِ الصَّلَاةِ إِلٰى الْقُبُوْرِ»[2]

''نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے قبروں کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنے سے منع فرمایا ہے۔''

اسی معنیٰ کی تائید ایک چوتھی حدیث سے بھی ہوتی ہے، جو صحیح سند کے ساتھ البتہ مرسلاً مصنف عبدالرزاق میں حضرت عَمرو بن دینار رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ جب ان سے قبروں کے درمیان (قبرستان میں) نماز پڑھنے کے بارے میں پوچھا گیا تو انھوں نے فرمایا: مجھے بتایا گیا ہے کہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

«كَانَتْ بَنُوْ إِسْرَائِيْلَ اتَّخَذُوْا قُبُوْرَ أَنْبِيَاءِهِمْ مَسَاجِدَ فَلَعَنَهُمُ اللّٰهُ تَعَالٰى»[3]

''بنی اسرائیل نے اپنے انبیا کی قبروں کو مساجد یا عبادت گاہیں بنا لیا تو اللہ تعالیٰ نے ان پر لعنت فرمائی۔''

حضرت عَمرو کا مذکورہ سوال پر اس حدیث سے استشہاد و استدلال اس بات کا ثبوت ہے کہ ان کے نزدیک بھی قبروں کو مساجد یا عبادت گاہیں بنانے کا یہی معنیٰ تھا کہ ان پر یا ان کی طرف منہ کر کے نماز پڑھی جائے تو یہ موجبِ لعنت فعل ہے، جس سے نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے سختی کے ساتھ روکا ہے۔

تیسرا مفہوم و معنیٰ:

ہماری ذکر کردہ چودہ احادیث میں مذکور قبروں کو مساجد یا عبادت گاہیں بنانے کا تیسرا مفہوم و معنیٰ

---

[1] صحيح الجامع (٣/ ٦/ ١٥٩) الصحيحة (٣/ ١٣) تحذير الساجد (ص: ٢٢، ٢٣)

[2] صحيح ابن حبان (ص: ١٠٥، الموارد)

[3] تحذير الساجد (ص: ٢٣) وقال: وهو مرسل صحيح الاسناد

بعض اہلِ علم نے یہ بھی بیان کیا ہے کہ ان کی تعظیم کے اعتقاد سے ان قبروں کو سجدہ کیا جائے یا نماز و دعا کے لیے ان کی طرف منہ کیا جائے۔ چنانچہ علامہ مناوی نے "فیض القدیر شرح الجامع الصغیر" میں گذشتہ صفحات میں مذکور حدیث نمبر (۳) کے الفاظ «اِتَّخِذُوْا قُبُوْرَ أَنْبِيَاءِ هِمْ مَّسَاجِدَ» کا یہ معنیٰ بیان کیا ہے:

"أَيْ إِتَّخَذُوْهَا جِهَةَ قِبْلَتِهِمْ مَعَ اِعْتِقَادِهِمُ الْبَاطِلِ، وَإِنَّ اتِّخَاذُهَا مَسَاجِدَ، لَازِمٌ لِإِتِّخَاذِ الْمَسَاجِدَ عَلَيْهَا كَعَكْسِهٖ"

"انھوں نے قبروں کو جہتِ قبلہ بنا لیا ہے اور ان کا باطل عقیدہ اس پر مستزاد ہے۔ ان کی طرف سجدہ کرنے سے ان پر مسجد یا سجدہ گاہ بنا لینا لازم آتا ہے اور ان پر مسجد یا سجدہ گاہ بنانے سے ان کی طرف سجدہ کرنا لازم آتا ہے۔"

اسی تعظیم میں غلو کی وجہ سے ان پر لعنت کی گئی ہے۔

معروف مفسر امام بیضاوی نے لکھا ہے کہ یہودی لوگ اپنے انبیا علیہم السلام کی قبروں کو تعظیماً سجدہ کیا کرتے تھے، ان کی قبروں کو قبلہ بناتے تھے اور ان کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے تھے، گویا انھوں نے ان قبروں کو بت بنا لیا تھا، لہٰذا ان پر اللہ تعالیٰ نے لعنت کی اور مسلمانوں کو ایسا کرنے سے منع کیا۔

اس کی ممانعت صراحت کے ساتھ صحیح مسلم، سنن ابی داود، ترمذی، نسائی، بیہقی، طحاوی، مسند احمد اور تاریخ ابن عساکر میں وارد حضرت ابو مرثد غنوی رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں آئی ہے، جس میں ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے:

«لَا تَجْلِسُوْا عَلَى الْقُبُوْرِ، وَلَا تُصَلُّوْا إِلَيْهَا»[1]

"قبروں پر (مجاور بن کر یا ویسے ہی) مت بیٹھو اور نہ (قصداً) ان کی طرف منہ کر کے نماز پڑھو۔"

امام نووی رحمہ اللہ اس حدیث کی شرح میں فرماتے ہیں:

"اس میں قبر کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنے کی صریح ممانعت وارد ہے۔ امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ میرے نزدیک کسی مخلوق کی تعظیم، حتیٰ کہ اس کی قبر کو سجدہ گاہ بنا لیا جائے،

[1] صحيح مسلم مع شرح النووي (٤/ ٧/ ٣٨) صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (٢٧٦٦) صحيح سنن الترمذي (٨٤٠) صحيح سنن النسائي، رقم الحديث (٧٣٢) صحيح الجامع، رقم الحديث (٧٢٢٩) تحذير الساجد (ص: ٢٤) نيل الأوطار (١/ ٢/ ١٣٤) مشكاة المصابيح (١/ ٥٣٣)

اس شخص اور بعد میں آنے والے لوگوں کے فتنے (شرک) میں مبتلا ہونے کے خدشے کی بنا پر یہ مکروہ ہے۔‘‘

یہ کراہت تحریمی ہے، جیسا کہ ان کی کتاب ’’الرسالۃ‘‘ (ص: ۳۴۳) سے پتا چلتا ہے۔

یہ حدیث چونکہ مشکوٰۃ شریف میں بھی وارد ہے، چنانچہ اس کی شرح بیان کرتے ہوئے ملا علی قاری ’’المرقاۃ‘‘ (۲/ ۳۷۲) میں لکھتے ہیں:

’’قبروں کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنے کی ممانعت اس لیے ہے کہ اس میں اس قدر تعظیم اور غلو ہے کہ گویا صاحبِ قبر کو معبود بنا دیا جاتا ہے۔ اگر تو یہ تعظیم حقیقتاً اس قبر اور صاحبِ قبر کی ہے تو یہ کفر یہ فعل ہے اور اس سے مشابہت کرنا مکروہ ہے۔ یہ مکروہ بھی حرام کے معنوں میں ہوگا اور اسی معنیٰ میں اپنے سامنے جنازہ رکھ کر کسی فرض نماز کو ادا کرنا بھی ہے (جیسا کہ آج کل بعض جگہوں پر یہ غلطی کی جاتی ہے، حالانکہ چاہیے تو یہ کہ اگر مسجد ہی میں نماز جنازہ پڑھنی ہو تو فرض نماز مکمل ہونے تک جنازہ کو صفوں کے پیچھے رکھا جائے، جیسا کہ سمجھ دار اور اچھے عقیدے کے پیش امام کرتے ہیں اور فرضوں سے فارغ ہو کر جنازہ لایا جائے اور نماز جنازہ پڑھی جائے)۔‘‘[1]

اس تیسرے معنیٰ کی تائید ایک اور حدیث سے بھی ہوتی ہے جو صحیح بخاری میں تعلیقاً اور مصنف عبدالرزاق میں موصولاً مروی ہے، جس میں ثابت البنانی رحمہ اللہ بیان کرتے ہیں کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

’’كُنْتُ أُصَلِّيْ قَرِيْبًا مِنْ قَبْرٍ، فَرَآنِي عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ فَقَالَ: اَلْقَبْرَ اَلْقَبْرَ‘‘[2]

’’میں ایک قبر کے قریب نماز پڑھ رہا تھا کہ حضرت عمرِ فاروق رضی اللہ عنہ نے قبر قبر کہہ کر مجھے متنبہ کیا۔‘‘

کتاب الصلوٰۃ لابی نعیم میں وارد طریق میں حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ مجھے جب اس بات کا پتا چل گیا کہ میرے نزدیک ہی سامنے قبر ہے تو میں نے وہاں سے آگے گزر کر نماز پڑھی۔[3]

---

[1] یہاں بعض مساجد میں میت کو پورٹیبل دیوار کے پیچھے رکھا جاتا ہے اور نماز کے بعد اس دیوار کو ہٹا کر جنازہ پڑھا جاتا ہے۔

[2] صحيح البخاري مع فتح الباري (١/ ٥٢٣، ٥٢٤) تحذير الساجد (ص: ٢٦ وصححه)

[3] فتح الباري (١/ ٥٢٣)

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ قبر پر یا قبر کی طرف منہ کر کے یا دو قبروں کے مابین کھڑے ہو کر نماز پڑھنا مکروہ ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے اس باب میں اس اثر کو ذکر کرنے سے پہلے ''هَلْ يُنْبَشُ قُبُوْرَ مُشْرِكِيَ الْجَاهِلِيَّةِ'' اور ایک حدیث ذکر کرنے کے بعد یہ جملہ بھی اپنی تبویب کا جزو بنایا ہے: ''وَمَا يُكْرَهُ مِنَ الصَّلَاةِ فِي الْقُبُوْرِ'' ''قبروں میں نماز کی کراہت کا بیان'' جس سے ان کے رجحان کا پتا چلتا ہے۔

تینوں مفاہیم ومعانی مراد ہیں:

یہ تین مفاہیم و معانی ہیں، جو قبروں کو مسجد یا عبادت گاہ بنانے کے سلسلے میں اہلِ علم نے بیان کیے ہیں۔ اگرچہ مختلف علما نے یہ معانی الگ الگ مراد لیے ہیں۔ کسی نے قبروں پر مسجد بنانا مراد لیا ہے، کسی نے قبروں کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنے کا جس میں قبر اور قبر والے کی تعظیم مقصود ہو اور کسی نے قبر پر نماز پڑھنا تعظیم وتبرک کے خیال سے، ذکر کی گئی چودہ احادیث سے بیک وقت یہ تینوں معنیٰ ہی مراد لیے ہیں اور ان تینوں افعال ہی سے کراہت کا اظہار کیا ہے۔

ملا علی قاری نے بھی اپنے ائمہ وشارحین احناف کے حوالے سے مرقاۃ شرح مشکوٰۃ (۱/ ۴۵۶) میں تینوں ہی معنیٰ ذکر کیے ہیں۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

> ''یہود و نصاریٰ پر لعنت بھیجنے کا سبب یا تو یہ تھا کہ وہ اپنے انبیا کی قبروں کو تعظیماً سجدہ کیا کرتے تھے جو شرکِ جلی ہے یا پھر ان پر لعنت کا سبب یہ تھا کہ وہ نماز تو اللہ کے لیے ہی پڑھتے، لیکن اپنے انبیا کی تعظیم اور اس میں مبالغہ کرتے ہوئے انبیا کی قبروں پر سجدے کرتے تھے یا پھر ان کی قبروں کی طرف متوجہ ہو کر نماز پڑھتے، جو یہ شرکِ خفی ہے۔''[1]

[1] تحذير الساجد (ص: ٣١، ٣٢)

ائمہ وفقہا کا مذہب

قبروں کو مسجد یا عبادت گاہ بنانے کے ان مفاہیم و معانی کی تفصیل کے بعد یہ بات بھی ذہن نشین کر لیں کہ ائمہ وفقہاے مذاہبِ اربعہ میں سے ہر کسی کا اس بات پر اتفاق ہے کہ قبروں پر مسجد یا عبادت گاہ بنانا حرام اور گناہ کبیرہ ہے۔ چنانچہ شافعیہ میں سے ہم حافظ عراقی کا قول ذکر کر چکے ہیں کہ انھوں نے قبر پر مسجد بنانے کو حرام قرار دیا ہے۔ ایسے ہی علامہ ہیتمی نے ''الزواجر'' میں جو کبیرہ گناہ گنوائے ہیں، ان میں سے کبیرہ گناہ نمبر ترانوے، چورانوے، پچانوے، چھیانوے، ستانوے اور اٹھانوے بالترتیب یہ ہیں: قبروں کو مساجد یا عبادت گاہ بنانا، ان پر چراغ جلانا، ان کی پوجا کرنا یا انھیں وثن بنانا، ان کا طواف کرنا، انھیں چھونا اور ان کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنا۔ پھر ان افعال کے کبیرہ ہونے کے دلائل کے طور پر انھوں نے متعدد احادیث ذکر کی ہیں۔ تفصیل کے لیے ''الزواجر عن اقتراف الکبائر'' (١/ ١٤٨، ١٤٩) دیکھی جا سکتی ہے۔

حنفیہ میں سے امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے شاگرد امام محمد رحمہ اللہ نے ''کتاب الآثار'' (ص: ٤٥) میں کہا ہے:

''لَا نَرىٰ أَنْ يُّزَادَ عَلٰى مَا خَرَجَ مِنَ الْقَبْرِ، وَنَكْرَهُ أَنْ يُّطَيَّنَ أَوْ يُجْعَلَ عِنْدَهٗ مَسْجِداً''

''ہمارے نزدیک قبر سے نکلنے والی مٹی سے زیادہ قبر پر ڈالنا جائز نہیں اور قبر کو لیپنا اور اس کے پاس مسجد بنانا ہمارے نزدیک مکروہ ہے۔''

یہ امر معروف ہے کہ احناف کے نزدیک مطلق مکروہ سے مراد مکروہ تحریمی ہوتا ہے۔ علامہ آلوسی نے بھی اپنی تفسیر ''روح المعاني'' (٥/ ٣١) میں علامہ ہیتمی کے مذکورہ افعال کو کبیرہ گناہ قرار دینے کی توثیق ہی کی ہے۔

مالکیہ میں سے امام قرطبی رحمہ اللہ نے پانچویں نمبر پر ذکر کی گئی حدیث ذکر کرنے کے بعد لکھا ہے:

''ہمارے علما نے کہا ہے کہ یہ مسلمانوں پر حرام ہے کہ وہ انبیا اور علما کی قبروں کو مساجد بنا لیں۔''[1]

ایسے ہی علماے حنابلہ بھی اس بات کے قائل ہیں کہ قبروں پر مساجد تعمیر کرنا حرام ہے اور ایسی مساجد میں نماز جائز نہیں۔ تفصیل کے لیے ''شرح منتهىٰ الارادات'' (١/ ٣٥٣) ''زاد العاد'' (٣/ ٥٧١، ٥٧٢) ''فتاوىٰ شيخ الإسلام ابن تيمية'' (٢٢/ ١٩٤، ٢٧/ ١٤٠، ٣٧/ ٥٥) دیکھیں: دار الافتاء مصر نے بھی شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کے اس فتوے کو بنیاد بنا کر مسجد میں تدفین کے عدمِ جواز کا فتویٰ صادر کیا ہے، جو ''مجلة الأزهر'' (جلد ١١ ص: ٥٠١، ٥٠٣) میں شائع کیا گیا تھا۔ اسی مجلّے کی ١٩٣٠ء کی جلد (ص: ٣٥٠، ٣٦٤) میں ایک دوسرا مقالہ شائع کیا گیا تھا، جو قبروں پر مطلق کوئی چیز تعمیر کرنے کے حرام ہونے کے بارے میں تھا۔[2]

اس ساری تفصیل سے یہ بات واضح ہوگئی کہ تمام مذاہب کے معتبر علما مذکورہ احادیث کی بنا پر اس بات کے قائل ہیں کہ قبروں پر مساجد تعمیر کرنا حرام ہے اور ایسی مساجد میں نماز جائز نہیں۔

قبروں پر بنائی گئی مساجد میں نماز کا باطل یا مکروہ ہونا

ایسی مساجد میں نماز کے عدمِ جواز کی تھوڑی سے وضاحت بھی کرتے جائیں، چنانچہ جیسا کہ ہم پہلے بھی ذکر کر چکے ہیں کہ قبروں پر مساجد تعمیر کرنے کی ممانعت سے ان مساجد میں نماز کی ممانعت بھی لازم آتی ہے، کیونکہ وسیلے سے ممانعت، مقصود سے بالاولی ممانعت کی متقاضی ہوتی ہے۔ ایسی مساجد میں نماز کی ممانعت کے بارے میں امام احمد رحمہ اللہ اور بعض دیگر اساطینِ علم کا قول تو یہ ہے کہ ان میں نماز پڑھنا باطل ہے اور نماز ہوگی ہی نہیں۔ اگر اس قول کو تھوڑا سا سخت شمار کیا جائے تو پھر اس کے سوا کوئی چارہ ہی نہیں کہ قبروں پر بنائی گئی مساجد میں نماز پڑھنے والے نمازیوں کو دو حصوں یا دو قسموں میں تقسیم کیا جائے:

① پہلی قسم کے لوگ تو وہ ہوں گے، جو قصد و ارادے کے ساتھ اور حصولِ تبرک کی نیت سے کسی قبر پر بنی ہوئی مسجد میں نماز پڑھیں، جیسا کہ کثیر تعداد میں لوگ کرتے ہیں۔ ایسے لوگوں کی نماز تو باطل ہو گی، کیونکہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے قبروں پر مساجد کی تعمیر سے منع فرمایا ہے اور ایسا کرنے

[1] تفسير القرطبي (١٠/ ٢٤٧) دار الكتب العلمية، بيروت

[2] تحذير الساجد (ص: ٤٥)

والوں پر لعنت فرمائی ہے۔ ایسی مسجد میں نماز کی ممانعت بالأولیٰ ہے۔ یہ ممانعت وہاں پڑھی گئی نماز کے باطل ہونے کا تقاضا کرتی ہے۔ امام احمد رحمہ اللہ کا بطلانِ نماز کا فتویٰ ایسے ہی لوگوں پر محمول کیا جا سکتا ہے، اگر چہ ان کے یہاں ایسی تفصیل نہیں ہے۔

٢ دوسری قسم ان لوگوں کی ہے جو مقصد و ارادے اور حصولِ تبرک کے لیے اس مسجد میں نماز نہ پڑھیں، بلکہ ان کا ایسی مسجد میں نماز پڑھنا محض اتفاق ہو۔ ایسے اتفاقیہ نماز پڑھنے والوں کی نماز باطل تو نہیں ہوگی، البتہ کم از کم مکروہ تو ضرور ہی ہوگی اور جمہور اہلِ علم کا یہی مسلک ہے۔[1]

اسبابِ کراہت

ایسی مساجد میں نماز کے مکروہ ہونے کے دو اسباب ہیں:

پہلا سبب:

قبروں پر تعمیر کی گئی مساجد میں نماز پڑھنے میں یہود و نصاریٰ کے فعل کے ساتھ مشابہت پائی جاتی ہے، کیونکہ وہ قبروں پر مساجد تعمیر کرتے اور انھیں عبادت گاہیں بناتے تھے، اسی فعل کی وجہ سے وہ ملعون قرار پائے، جیسا کہ احادیث گزری ہیں۔ ان کے کسی ایسے فعل میں ان کی مشابہت کی جائے، جس پر وہ ملعون ٹھہرائے گئے تو وہ مشابہت والا فعل مکروہ کیوں نہ ہوگا؟ اگر چہ باطل نہ بھی شمار کیا جائے۔

دوسرا سبب:

قبروں پر تعمیر کی گئی مساجد میں نماز کے مکروہ ہونے کا دوسرا سبب یہ ہے کہ اس میں ان قبروں میں مدفون لوگوں کی غیر شرعی تعظیم کا ایک ذریعہ پایا جاتا ہے، لہٰذا احتیاطاً وہاں نماز کی ممانعت ہوگی، خصوصاً جب کہ قبروں پر بنائی گئی مساجد کے عقائدی مفاسد اہلِ نظر سے پوشیدہ نہیں ہیں۔

اہلِ علم نے ایسی مساجد میں نماز کی کراہت کے ان دونوں اسباب کا تذکرہ کیا ہے۔ چنانچہ علمائے احناف میں سے علامہ ابن الملک سے ملا علی قاری نے "المرقاۃ شرح المشکاۃ" (١/ ٤٧٠) میں نقل کیا ہے کہ انھوں نے فرمایا:

"إِنَّمَا حَرَّمَ اتِّخَاذَ الْمَسَاجِدِ عَلَيْهَا لِأَنَّ فِي الصَّلَاةِ فِيهَا اِسْتِنَانًا بِسُنَّةِ الْيَهُوْدِ"

"قبروں پر مساجد کی تعمیر اس لیے حرام کی گئی ہے، کیوں کہ اس میں یہودیوں کے فعل کے

[1] تحذیر الساجد (ص: ١٢٣)

ساتھ مشابہت پائی جاتی ہے۔''

شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے اپنی کتاب ''القاعدة الجليلة في التوسل والوسيلة'' (ص: ۲۲، ۲۳ طبع دار الإفتاء) میں لکھا ہے کہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات کو حرام کیا ہے کہ کسی کی قبر کو عبادت گاہ بنایا جائے اور وہاں پر نماز پڑھنے کا قصد و ارادہ کیا جائے، جیسے عام مساجد میں نماز پڑھنے کا قصد و ارادہ کیا جاتا ہے۔ اگرچہ قبروں پر بنائی گئی مسجدوں میں نماز ادا کرنے والوں کا ارادہ خاص عبادتِ الٰہی ہی کا کیوں نہ ہو، لیکن چونکہ یہ اس بات کا ذریعہ بن سکتا ہے کہ لوگ صاحبِ قبر کی وجہ ہی سے پکارنے لگیں یا اس کے وسیلے سے دُعائیں کرنے لگیں یا پھر اس کے پاس دعائیں کرنے لگیں، لہٰذا نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسی جگہ پر اللہ کی عبادت کرنے سے بھی منع فرما دیا، تاکہ کہیں یہ شرک کا دروازہ نہ کھول دے۔

آگے شرک کا دروازہ بند کرنے اور عقیدے کے تحفظ اور مشرکین کی مشابہت سے بچنے کے لیے نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے طلوعِ آفتاب، زوالِ آفتاب اور غروبِ آفتاب میں نماز سے منع کرنے کی مثال دینے اور اس کی تشریح کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ اسی طرح جب نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے انبیا و صالحین کی قبروں کو عبادت گاہیں بنانے سے منع فرما دیا تو ان کی قبروں کے پاس نماز پڑھنے کا قصد و ارادہ کرنے سے بھی منع فرما دیا، تاکہ یہ کہیں ان قبروں والوں کو پکارنے کا ذریعہ اور شرک کا پیش خیمہ نہ بن جائے۔[1]

تمام معتدبہ علما کا اس اَمر پر تو اتفاق ہے کہ ایسی مساجد میں نماز پڑھنا مکروہ ہے، البتہ اس کے باطل ہونے یا نہ ہونے میں اختلاف ہے۔ حنابلہ کا مذہب یہی ہے کہ نماز صحیح نہیں ہوگی، جیسا کہ علامہ ابن قیم رحمہ اللہ نے ''زاد المعاد'' (۳/ ۵۷۲) میں قبر پر بنائی گئی مسجد کے بارے میں کہا ہے:

''وَلَا تَصِحُّ الصَّلَاةُ فِيْ هٰذَا الْمَسْجِدِ لِنَهْيِ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ عَنْ ذٰلِكَ، وَلَعْنِهٖ مَنِ اتَّخَذَ الْقَبْرَ مَسْجِدًا''[2]

''ایسی مسجد میں نماز صحیح نہیں، کیونکہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے منع فرمایا ہے اور قبر کو عبادت گاہ بنانے والوں پر لعنت فرمائی ہے۔''

---

[1] القاعدة الجليلة (ص: ۲۲، ۲۳ طبع دار الإفتاء)

[2] زاد المعاد (۳/ ۵۷۲)

"اقتضاء الصراط المستقیم" میں شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے ایسی مسجد میں نماز کو مکروہ بلکہ غیر صحیح قرار دیا ہے۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں:

"وَتُكْرَهُ الصَّلَاةُ فِيهَا مِنْ غَيْرِ خِلَافٍ أَعْلَمُهُ، وَلَا تَصِحُّ عِنْدَنَا فِي ظَاهِرِ الْمَذْهَبِ لِأَجْلِ النَّهْيِ وَاللَّعْنِ الْوَارِدِ فِي ذٰلِكَ، وَلِأَجْلِ أَحَادِيثَ أُخَرَ"[1]

"ایسی مساجد میں نماز مکروہ ہے اور اس میں میرے علم کے مطابق کوئی اختلاف نہیں۔ ہمارے ظاہر مذہب کے مطابق وہاں پڑھی گئی نماز قبروں پر مساجد کے سلسلے میں واردشدہ ممانعت اور لعنت کی وجہ سے صحیح نہیں ہے اور بعض دیگر احادیث کی وجہ سے بھی وہاں نماز صحیح نہیں ہے۔"

نیز موصوف اپنے فتاویٰ میں فرماتے ہیں:

"فَالْمَسْجِدُ الَّذِيْ عَلَى الْقَبْرِ لَا يُصَلّٰى فِيهِ، لَا فَرْضٌ وَلَا نَفْلٌ، فَإِنَّهُ مَنْهِيٌّ عَنْهُ"[2]

"جو مسجد قبروں پر بنائی گئی ہو، ایسی مسجد میں فرض یا نفل کوئی بھی نماز پڑھنا ممنوع ہے۔"

قبرستان میں نماز، ایک، دو یا زیادہ قبریں:

یہاں اس بات کی وضاحت بھی کر دیں کہ اگر مسجد کے بغیر کوئی قبرستان ہو یا کہیں دو ایک ہی قبریں ہوں تو وہاں نماز کے بارے میں کراہت کا حکم کس شکل میں ہوگا؟ صرف ایک ہی قبر کا ہونا کافی ہے یا کم از کم تین قبریں ہوں؟ اس سلسلے میں شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے "اقتضاء الصراط المستقیم" میں لکھا ہے کہ ہمارے اصحاب کا اس میں اختلاف ہے کہ قبروں کی حد تین ہے یا اکیلی قبر کے پاس نماز پڑھنے کی بھی ممانعت ہوگی، چاہے اس کے پاس دوسری قبر نہ بھی ہو۔ اس اختلاف کے بارے میں دو قول مذکور ہیں، ایک یہ کہ وہاں کم از کم تین قبریں ہوں اور دوسرا یہ کہ ایک قبر کا حکم بھی یہی ہے۔[3]

جب کہ موصوف نے اپنی دوسری کتاب "الاختیارات العلمیة" میں اسی کو ترجیح دی ہے

---

[1] اقتضاء الصراط المستقيم (٢/ ٦٦٩) تحقيق ناصر العقل

[2] مجموع الفتاویٰ (٢٢/ ٩٥)

[3] اقتضاء الصراط المستقيم (٢/ ٢٢٩)

کہ قبر چاہے ایک بھی کیوں نہ ہو، اس کے پاس نماز پڑھنا ٹھیک نہیں ہے اور لکھا ہے کہ امام احمد رحمہ اللہ اور ان کے عام اصحاب کے کلام میں یہ فرق نہیں ملتا کہ قبر ایک ہو یا تین، بلکہ ان کے کلام وتعلیل اور استدلال سے پتا چلتا ہے کہ قبر چاہے کہیں ایک ہی کیوں نہ ہو، وہاں نماز منع ہے اور یہی بات صحیح بھی ہے، کیونکہ مقبرہ یا قبرستان ہر اس جگہ کو کہا جائے گا جہاں کوئی دفن ہو۔ قبرستان کوئی جمع کا صیغہ تو نہیں ہے۔ (قبر کی جمع تو قبور یا مقابر ہے) آگے لکھتے ہیں کہ ہمارے اصحاب نے کہا ہے:

''قبر کے اردگرد جو بھی جگہ ہو، جس پر مقبرے کا اطلاق ہوتا ہو، اس ساری جگہ میں کہیں بھی نماز نہیں پڑھی جائے گی۔''

اس سے پتا چلتا ہے کہ صرف قبر ہی نہیں، بلکہ اس کے متعلق صحن وغیرہ میں بھی نماز کی ممانعت کا وہی حکم ہے جو قبر کا ہے۔ امام آمدی وغیرہ اہلِ علم نے کہا ہے کہ ایسی مسجد میں بھی نماز جائز نہیں جس کا قبلہ قبر کی طرف ہو، یہاں تک کہ مقبرے اور مسجد کی دیوار کے درمیان کوئی دوسری چیز حائل نہ ہو۔ بعض اہلِ علم نے کہا ہے کہ امام احمد رحمہ اللہ کا یہی منصوص قول ہے۔[1]

بلا استقبال بھی کراہت:

یہاں یہ بات بھی پیشِ نظر رکھیں کہ قبروں پر بنائی گئی مساجد میں نماز صرف اسی وقت مکروہ نہیں جب بوقتِ نماز قبر کی طرف منہ ہو، بلکہ ایسی مسجد میں بہرصورت نماز مکروہ ہے، چاہے قبر سامنے ہو یا پیچھے یا قبر دائیں ہو یا بائیں۔ جب قبر سامنے قبلے کی جانب پڑتی ہو تو اس وقت کراہت اور بھی زیادہ ہو جاتی ہے، کیونکہ اس طرح نمازی سے دو مخالفِ شرع باتیں سرزد ہوتی ہیں: پہلی قبر پر بنائی گئی مسجد میں نماز اور دوسری قبر کی طرف منہ کر کے نماز، جو صحیح نص کی رُو سے ویسے ہی منع ہے، چاہے مسجد میں ہو یا مسجد کی کسی اور جگہ پر ہو، جیسا کہ صحیح مسلم، سنن ابو داود، ترمذی، نسائی، بیہقی، طحاوی، مسند احمد اور تاریخ ابن عساکر کی حدیث گزر چکی ہے، جس میں حضرت ابو مرثد غنوی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

«لَا تَجْلِسُوْا عَلَى الْقُبُوْرِ، وَلَا تُصَلُّوْا إِلَيْهَا»[2]

---

[1] الاختیارات العلمیة (ص: ۲۵) تحذیر الساجد (ص: ۱۲۷)

[2] حوالہ جاتِ مذکورہ و صحیح الجامع للصغیر للألباني (۷۱۰۶) أحكام الجنائز للألباني (ص: ۲۰۹)

''قبروں پر (مجاور بن کر) مت بیٹھو اور نہ ان کی طرف منہ کر کے نماز پڑھو۔''

امام بخاری رحمہ اللہ نے بھی اپنی صحیح کے ''باب ما یکرہ من اتخاذ المساجد علی القبور'' کی تبویب میں اسی بات کی طرف اشارہ کیا ہے، کیونکہ انھوں نے اس تبویب کے ساتھ ہی تعلیقاً یہ واقعہ بھی ذکر کر دیا ہے کہ جب حسن بن علی رضی اللہ عنہما فوت ہوئے تو ان کی بیوی نے ان کی قبر پر ایک سال تک خیمہ لگائے رکھا اور پھر اُٹھا لیا۔ تو لوگوں نے ایک غیبی آواز سنی:

''أَلَا هَلْ وَجَدُوْا مَا فَقَدُوْا؟''

''بتاؤ! بھلا انھیں ان کا فوت شدہ شخص واپس مل گیا ہے؟''

غیب ہی سے اس کا جواب بھی آیا اور کہنے والے نے کہا:

''بَلْ يَئِسُوْا فَانْقَلَبُوْا'' ''کچھ نہیں ملا بلکہ مایوس ہو کر چلے گئے۔''

اس اثر کو اس باب کے تحت لانے میں امام صاحب نے قبلہ جہت قبر ہونے یا قبر کے قریب ہونے کی شکل میں نماز پڑھنے کی کراہت کی طرف لطیف سا اشارہ کر دیا ہے اور وہ اس طرح کہ جو شخص قبر پر لگائے گئے خیمے میں رہے گا، وہ یقیناً وہاں نماز بھی پڑھے گا، جس سے قبر کے پاس عبادت گاہ بنانا لازم آتا ہے اور ممکن ہے کہ قبر جہتِ قبلہ ہو تو ایسے میں کراہت اور بھی بڑھ جائے گی۔ امام بخاری کے اس لطیف اشارے کو حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے فتح الباری میں اور علامہ عینی حنفی رحمہ اللہ نے ''عمدة القاري شرح صحيح البخاري'' میں بیان کیا ہے۔[1]

علمائے احناف میں سے مولانا محمد یحییٰ کاندھلوی نے ''الكوكب الدري على جامع الترمذي'' میں لکھا ہے:

''قبروں پر مساجد کا تعمیر کرنا (ناجائز ہے) کیونکہ اس میں یہودیوں کے اپنے انبیا و کبرا کی قبروں پر معابد کی تعمیر سے تشبہ پایا جاتا ہے۔ نیز اس میں میت کی تعظیم اور قبر کے جہتِ قبلہ ہونے کی صورت میں بت پرستوں سے مشابہت بھی پائی جاتی ہے۔''

آگے وہ لکھتے ہیں:

''وَكِرَاهَةُ كَوْنِهٖ فِيْ جَانِبِ الْقِبْلَةِ أَكْثَرُ مِنْ كِرَاهَةِ كَوْنِهٖ يَمِيْناً أَوْ يَسَاراً، وَإِنْ

[1] فتح الباري (٣/ ٢٠٠ طبع دار الإفتاء) عمدة القاري (٤/ ٨/ ١٣٤) دارالفكر بيروت

كَانَ خَلْفَ الْمُصَلِّي فَهُوَ أَخَفُّ مِنْ كُلِّ ذٰلِكَ، لٰكِنْ لَا يَخْلُوْ عَنْ كِرَاهَةٍ"[1]

''قبر کے قبلے کی جانب ہونے کی شکل میں اس کے دائیں بائیں ہونے کی نسبت زیادہ کراہت ہے۔ اگر قبر نمازی کے پیچھے ہو تو اس کے دائیں بائیں اور آگے ہونے والی تمام صورتوں کی نسبت کراہت کم ہوگی، لیکن یہ بھی کراہت سے خالی پھر بھی نہیں ہے۔''

یہ معروف بات ہے کہ فقہ حنفی کی کتب میں اگر کراہت تنزیہی کی وضاحت نہ کی جائے، بلکہ مطلق مکروہ کہا جائے تو اس سے مراد کراہتِ تحریمی ہوتی ہے، یعنی وہ فعل حرام ہوتا ہے۔ مولانا کاندھلوی نے قبر کے پاس نماز پڑھنے کی چاروں صورتوں کو تین درجوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ پہلا اور سب سے زیادہ کراہت والا درجہ یہ ہے کہ قبر نمازی کے سامنے یعنی قبلہ جانب ہو۔ دوسرا یعنی قدرے کم کراہت والا درجہ یا صورت یہ ہے کہ قبر نمازی کے دائیں بائیں ہو، سامنے نہ ہو اور ان دونوں سے کم درجۂ کراہت تب ہوگا، جب قبر نمازی کے پیچھے ہو، اس میں کچھ ہلکے درجے کی کراہت ہے، لیکن کراہت سے بالکلیہ خالی یہ بھی نہیں ہے۔

---

[1] الكوكب الدري (ص: ١٥٣) تحذير الساجد (ص: ١٣١، ١٣٢)

ازالۂ شبہات

① مسجدِ نبوی ﷺ کا استثنا:

گذشتہ اوراق میں یہ بات قدرے تفصیل کے ساتھ ذکر کی جا چکی ہے کہ ہر وہ مسجد جس میں کوئی قبر بنا دی گئی ہو یا وہ مسجد ہی کسی قبر پر بنائی ہو، اس مسجد میں نماز پڑھنا مکروہ ہے، لیکن یہاں اس بات کی وضاحت بھی کرتے جائیں کہ یہ حکم تمام مساجد کے لیے عام ہے، سوائے مسجدِ نبوی ﷺ کے، کیونکہ مسجدِ نبوی ﷺ کو وہ فضیلت حاصل ہے جو قبروں پر بنائی گئی مساجد میں سے کسی دوسری مسجد کو حاصل نہیں ہے۔

1. چنانچہ صحیح بخاری مسلم، سنن ترمذی، نسائی، ابن ماجہ اور مسند احمد میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے، صحیح مسلم، سنن نسائی و ابن ماجہ اور مسند احمد میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے، صحیح مسلم میں اُمّ المومنین حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا سے اور مسند احمد میں حضرت جبیر بن مطعم، حضرت سعد اور حضرت ارقم رضی اللہ عنہم سے مروی ہے کہ نبیِ اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

«صَلَاةٌ فِيُ مَسُجِدِيُ هٰذَا أَفُضَلُ مِنُ أَلُفِ صَلَاةٍ فِيُمَا سِوَاهُ مِنَ الُمَسَاجِدِ إِلَّا الُمَسُجِدَ الُحَرَامَ»[1]

”میری اس مسجد (مسجدِ نبوی ﷺ) میں پڑھی گئی ایک نماز کا ثواب دیگر مساجد میں پڑھی گئی ایک ہزار نماز سے زیادہ ہے سوائے مسجد حرام (مکہ مکرمہ) کے۔“

2. سنن ابن ماجہ اور مسند احمد میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ارشادِ نبوی ﷺ ہے:

«صَلَاةٌ فِيُ مَسُجِدِيُ هٰذَا أَفُضَلُ مِنُ أَلُفِ صَلَاةٍ فِيُمَا سِوَاهُ إِلَّا الُمَسُجِدَ الُحَرَامَ، وَصَلَاةٌ فِي الُمَسُجِدِ الُحَرَامِ أَفُضَلُ مِن مِّائَةِ أَلُفِ صَلَاةٍ فِيُمَا سِوَاهُ»[2]

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (١١٩٠) صحيح مسلم مع شرح النووي (٥/ ٩/ ١٦٣ تا ١٦٥) صحيح سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٦٨، ٣٠٧٥) صحيح سنن النسائي، رقم الحديث (٢٧١٢ تا ٢٧١٤) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٤٠٤ تا ١٤٠٦) صحيح الجامع (٣٨٣٩)

[2] سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٤٠٤ تا ١٤٠٦) ارواء الغليل (٤/ ٣٤١) صحيح الجامع، رقم الحديث (٣٨٣٨)

''میری مسجد میں پڑھی گئی ایک نماز دیگر مساجد میں پڑھی گئی ایک نماز سے ہزار گنا زیادہ افضل ہے سوائے مسجدِ حرام کے اور مسجدِ حرام میں پڑھی گئی ایک نماز دیگر تمام مساجد میں پڑھی گئی ایک لاکھ نمازوں سے بھی زیادہ افضل ہے۔''

٣ صحیح ابن حبان اور مسند احمد میں حضرت عبد اللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما سے مروی ارشادِ نبوی ﷺ ہے:

«صَلَاةٌ فِيْ مَسْجِدِيْ هٰذَا أَفْضَلُ مِنْ أَلْفِ صَلَاةٍ فِيْمَا سِوَاهُ مِنَ الْمَسَاجِدِ إِلَّا الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ، وَصَلَاةٌ فِي الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ أَفْضَلُ مِنْ صَلَاةٍ فِيْ مَسْجِدِيْ هٰذَا بِمِائَةِ صَلَاةٍ»[1]

''میری اس مسجد میں ایک نماز کا ثواب دیگر تمام مساجد سے ہزار گنا زیادہ ہے سوائے مسجدِ حرام کے اور مسجدِ حرام میں ایک نماز کا ثواب میری اس مسجد سے سو گنا زیادہ ہے۔''

٤ صحیح مسلم اور سنن نسائی میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ارشادِ نبوی ﷺ ہے:

«صَلَاةٌ فِيْ مَسْجِدِيْ هٰذَا أَفْضَلُ مِنْ أَلْفِ صَلَاةٍ فِيْمَا سِوَاهُ مِنَ الْمَسَاجِدِ إِلَّا الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ فَإِنِّيْ آخِرُ الْأَنْبِيَاءِ، وَإِنَّ مَسْجِدِيْ آخِرُ الْمَسَاجِدِ»[2]

''میری اس مسجد میں ایک نماز کا ثواب دوسری عام مساجد سے ایک ہزار گنا زیادہ ہے سوائے مسجدِ حرام کے، میں آخری نبی ہوں اور میری مسجد آخری مسجد (نبوی) ہے۔''

مسجد نبوی کو ایک تو یہ فضیلتیں حاصل ہیں، جو کسی دوسری مسجد کو، خصوصاً قبروں پر بنائی گئی مساجد کو قطعاً حاصل نہیں ہیں۔

2 روضة الجنة:

اس کے علاوہ مسجدِ نبوی ﷺ کو ایک اور فضیلت بھی حاصل ہے کہ اس کا ایک حصہ ایسا ہے، جسے نبیِ اکرم ﷺ نے ''جنت کا ٹکڑا'' یا ''جنت کے باغیچوں میں سے ایک باغیچہ'' قرار دیا ہے، جیسا کہ صحیح بخاری و مسلم، سنن نسائی اور مسند احمد میں حضرت عبد اللہ بن زید المازنی رضی اللہ عنہ سے اور سنن ترمذی میں حضرت علی اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہما سے مروی ارشادِ نبوی ﷺ ہے:

---

1. صحيح ابن حبان، رقم الحديث (١٠٢٧) الموارد، صحيح الجامع، رقم الحديث (٣٨٤٠)
2. صحيح مسلم مع شرح النووي (٥/ ٩/ ١٦٤، ١٦٥) صحيح سنن النسائي، رقم الحديث (٦٧٠)

«مَا بَيْنَ بَيْتِي وَمِنْبَرِي رَوْضَةٌ مِّنْ رِّيَاضِ الْجَنَّةِ»[1]

’’میرے گھر اور منبر کے درمیان والی جگہ جنت کے باغیچوں میں سے ایک باغیچہ ہے۔‘‘

جب کہ صحیح بخاری و مسلم، سنن ترمذی، موطا امام مالک، مسند احمد اور السنۃ لابن ابی عاصم میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ہی سے مروی ہے کہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

«مَا بَيْنَ بَيْتِي وَمِنْبَرِي رَوْضَةٌ مِّنْ رِّيَاضِ الْجَنَّةِ وَمِنْبَرِي عَلٰى حَوْضِي»[2]

’’میرے گھر اور منبر کی درمیانی جگہ جنت کے باغیچوں میں سے ایک باغیچہ ہے اور میرا منبر میرے حوض (کوثر کی جگہ) پر ہے۔‘‘

یہاں ہم دو باتوں کی طرف اشارہ کرنا مناسب سمجھتے ہیں۔ ان میں سے پہلی یہ کہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے صادر ہونے والے الفاظ کی رو سے ’’روضہ‘‘ اس جگہ کو کہا جائے گا، جو نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر کی چار دیواری سے لے کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے منبر کی جگہ کے درمیان ہے۔ موجودہ توسیعِ مسجدِ نبوی اور تعمیراتِ جدیدہ کے ضمن میں اس مخصوص قطعہ ارض کو ممتاز کرنے کے لیے اس کے ستونوں کو سفید سنگ مرمر لگا دیا گیا ہے، تاکہ عام مسجدِ نبوی اور ’’روضة الجنة‘‘ کے مابین امتیاز میں آسانی رہے۔

نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی قبرِ مبارک کو روضہ شریفہ کے نام سے پکارا جاتا ہے، وہ غالباً انھی احادیث کی بنا پر ہوتا ہوگا، جب کہ یہ احادیث قبرِ شریف کے بارے میں نہیں، بلکہ دوسری جگہ کے بارے میں ہیں، لہٰذا روضۂ مبارکہ یا ’’روضہ شریفہ‘‘ کا نام اسی جگہ کو دینا چاہیے جسے خود نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ نام دیا ہے۔

3 ’’بَيْنَ بَيْتِي وَمِنْبَرِي‘‘:

ہم دوسری اہم وضاحت یہ کرنا چاہتے ہیں کہ امام نووی رحمہ اللہ نے ’’المجموع شرح المهذّب‘‘ میں ’’بَيْنَ بَيْتِي وَمِنْبَرِي‘‘ کے بجائے ’’بَيْنَ قَبْرِي وَمِنْبَرِي‘‘ کے الفاظ سے حدیث

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (١١٩٥) صحيح مسلم مع شرح النووي (٥/ ٩/ ١٦١، ١٦٢) صحيح سنن النسائي، رقم الحديث (٦٧١) صحيح سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٠٧٤) صحيح الجامع، رقم الحديث (٥٥٨٦)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (١١٩٦) صحيح مسلم مع شرح النووي (٥/ ٩/ ١٦٢) صحيح سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٠٧٤) صحيح الجامع، رقم الحديث (٥٥٨٧)

ذکر کر کے اسے صحیحین کی طرف منسوب کیا ہے اور شرح مسلم میں بھی اشارہ کیا ہے۔[1]

حالانکہ یہ ان کا وہم ہے، کیونکہ صحیح بخاری و مسلم میں "قبري" کا لفظ قطعاً نہیں ہے، بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ "بَيْنَ قَبْرِيْ وَمِنْبَرِيْ" کے الفاظ جو زبان زدِ عام ہیں، یہ بعض رواۃ کی غلطی کا نتیجہ ہیں، جیسا کہ امام قرطبی، امام ابن تیمیہ اور حافظ ابن حجر رحمہم اللہ نے جزماً کہا ہے اور صحاح میں سے کسی بھی کتاب میں اس لفظ کے ساتھ حدیث مروی نہیں ہے۔ محض بعض روایات میں اس لفظ کا آ جانا اسے صحیح کے درجے تک نہیں پہنچا دیتا، کیونکہ یہ دراصل بالمعنیٰ روایت ہے۔

چنانچہ امام ابن تیمیہ "القاعدة الجليلة في التوسل والوسيلة" (ص: ٧٤) میں اس حدیث کو ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ یہی الفاظ یعنی "بَيْنَ بَيْتِيْ وَمِنْبَرِيْ" صحیح و ثابت ہیں اور بعض رواۃ نے بالمعنیٰ روایت بیان کرتے وقت "بَيْنَ قَبْرِيْ وَمِنْبَرِيْ" کہا ہے، حالانکہ جب آپ ﷺ نے یہ حدیث ارشاد فرمائی تھی، اس وقت آپ ﷺ فوت ہوئے تھے نہ آپ ﷺ کی قبر کا وجود تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جب آپ ﷺ کی تدفین کے سلسلے میں صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم میں نزاع ہوا تو کسی نے بھی اس حدیث کو دلیل نہیں بنایا اور اگر یہ لفظ ان کے علم میں ہوتا تو اس نزاعی مسئلے میں نص صریح ہوتا، لیکن بعد میں ایک دوسرے ارشاد کے پیشِ نظر آپ ﷺ کو ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے حجرے میں دفن کیا گیا، جہاں آپ ﷺ نے وفات پائی تھی۔ بِأَبِيْ هُوَ وَأُمِّيْ صَلَوَاتُ اللّٰهِ وَسَلَامُهٗ عَلَيْهِ.[2]

قبروں پر بنائی گئی یا قبروں پر مشتمل مساجد میں نماز کے مکروہ ہونے کا حکم تمام مساجد کو شامل ہے، سوائے مسجدِ نبوی کے، کیونکہ اسے کچھ فضائل حاصل ہیں جو قبروں پر بنائی گئی مساجد میں سے کسی مسجد کو بھی حاصل نہیں ہیں۔ کراہت کا حکم بلا استثنا سب مسجدوں کے لیے کر دیا جائے تو اس کا معنیٰ یہ ہوگا کہ یہ فضائل رفع ہو گئے، جو جائز بات نہیں ہے۔

"تحذير الساجد من اتخاذ القبور مساجد" کے مولف (شیخ البانی) نے یہ معنیٰ شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کے اس کلام سے اخذ کیا ہے، جو اوقاتِ مکروہہ میں سببی نمازوں کی اباحت کے

---

[1] صحيح مسلم مع شرح النووي (٥/ ٩/ ١٦١)

[2] الجواب الباهر ضمن الفتاویٰ (٢٧/ ٣٢٥) اردو مترجم عطاء اللّٰہ ثاقب (ص: ٢٤) والمطبوع مستقلًا (ص: ١٠ طبع دارالافتاء) تحقيق شيخ عبدالرحمٰن المعلمی، تحذير الساجد (ص: ١٣٥، ١٣٦)

سلسلے میں ہے کہ جس طرح اوقاتِ مکروہہ میں سببی نماز اس لیے مباح ہے کہ وہ ضائع نہ ہونے پائے، کیونکہ اس کا وقت گزر جانے کے بعد اس کی فضیلت کا حاصل کرنا ممکن نہیں رہے گا، اسی طرح مسجدِ نبوی کے بارے میں بھی کہا جائے گا کہ اس کی فضیلت کے حصول کے پیشِ نظر وہ دیگر مساجد سے مستثنیٰ ہے۔[1]

شیخ الاسلام موصوف اپنی دوسری کتاب ''الجواب الباھر في زوار المقابر'' جس کا کتبِ توحید وعقیدہ کے مترجم مولانا عطاء اللہ ثاقب رحمہ اللہ نے اردو ترجمہ بھی کر دیا ہے، جو سعودی دار الافتاء والدعوۃ والارشاد کی پاکستان برانچ کے خرچے پر ہزاروں کی تعداد میں تقسیم کی گئی ہے، اس کتاب میں شیخ الاسلام لکھتے ہیں:

''ایسی مساجد میں نماز پڑھنا مطلقاً ممنوع ہے جو قبروں پر بنائی گئی ہوں، بخلاف مسجدِ نبوی (عَلَىٰ صَحِبِهٖ أَفْضَلُ الصَّلَوَاتِ وَأَتَمُّ التَّسْلِيْمِ) کے، کیوں کہ اس میں ایک نماز کا ثواب عام مساجد کی بنسبت ہزار نمازوں کے برابر ملتا ہے، کیوں کہ اس کی بنیاد تقوے پر رکھی گئی ہے۔ مسجدِ نبوی کو فضیلت وعظمت کا یہ بلند درجہ رسولِ مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ میں بھی حاصل تھا اور حجرہ مبارکہ کے اس میں شامل ہونے سے پہلے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلفائے راشدین کے دور میں بھی، جب کہ خود رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم اور مہاجرین و انصار رضی اللہ عنہم اس میں نماز ادا کیا کرتے تھے۔ اس میں نماز ادا کرنے کی جو فضیلت وعظمت اس دَور میں تھی، وہ اس میں حجرہ مبارکہ کے شامل ہونے کے بعد بھی باقی رہی۔ حجرہ مبارکہ (ولید بن عبد الملک کے دور میں) اس وقت مسجدِ نبوی میں شامل ہوا، جب عہدِ صحابہ رضی اللہ عنہم ختم ہو چکا تھا۔''[2]

آگے جا کر موصوف نے ایک جگہ لکھا ہے:

''مسجدِ نبوی (بذاتِ خود) ہی فضیلت والی ہے، کیونکہ (اُسے نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اور قیامت تک آنے والے مسلمانوں کے نماز پڑھنے کے لیے بنایا۔ اسے یہ شرف حاصل ہے اور) اس میں نماز کی فضیلت وارد ہے اور یہ فضیلت کیوں نہ ہو خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد بھی تو یہ ہے:

---

[1] مجموع الفتاویٰ (۲۲/ ۲۹۸) القاعدۃ الجلیلۃ (ص: ۲۲، ۲۳) تحذیر الساجد (ص: ۱۳۶)

[2] الجواب الباھر ضمن مجموع الفتاویٰ (۲۷/ ۳۴۸، ۴۰۱) اردو (ص: ۵۵) مطبوع مستقلًا (ص: ۹، ۲۶، ۷۱)

«صَلَاةٌ فِيْ مَسْجِدِيْ هٰذَا خَيْرٌ مِّنْ أَلْفِ صَلَاةٍ فِيْمَا سِوَاهُ إِلَّا الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ»[1]

''میری مسجد میں ایک نماز پڑھنے کا ثواب دوسری کسی مسجد سے ہزار گنا زیادہ ہے سوائے مسجدِ حرام کے۔''

رسول اللہ ﷺ کا یہ بھی ارشاد گرامی ہے:

«لَا تُشَدُّ الرِّحَالُ إِلَّا إِلٰى ثَلَاثَةِ مَسَاجِدَ: اَلْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَالْمَسْجِدِ الْأَقْصٰى وَمَسْجِدِيْ هٰذَا»[2]

''تین مساجد کے علاوہ کسی بھی مسجد کے لیے رختِ سفر نہ باندھا جائے، یعنی مسجدِ حرام، مسجدِ اقصیٰ اور میری یہ مسجد نبوی۔''

''مسجدِ نبوی کو یہ فضیلت حجرۂ نبوی کے مسجد میں داخل کرنے سے پہلے ہی حاصل ہے۔ حجرے کو مسجدِ نبوی میں داخل کرنے سے پہلے اس میں ایسے لوگ نماز ادا کرتے رہے ہیں جن کا مقابلہ قیامت تک آنے والے افراد میں سے کوئی بھی نہ کر سکے گا (اور یہ بات بھی واضح کر دیں کہ) کسی شخص کے ذہن میں یہ وہم ہرگز نہیں آنا چاہیے کہ مسجدِ نبوی کو یہ فضیلت اس لیے ملی کہ اس میں حجرۂ مبارکہ داخل کر دیا گیا ہے اور اب اس کی فضیلت آنحضرت ﷺ اور خلفاے راشدین رضی اللہ عنہم کے عہد سے بھی زیادہ ہے۔ (ہرگز نہیں) اگرچہ خلفائے راشدین اور اس وقت کے افرادِ امت کو فضیلت حاصل ہے اور اب نہ وہ افراد ہیں اور نہ وہ دَورِ مسعود۔ البتہ مسجدِ نبوی کو اس وقت بھی یہ فضیلت حاصل تھی، جب کہ ابھی حجرۂ مبارکہ مسجد میں داخل نہیں کیا گیا تھا۔ اگرچہ حالات و واقعات اور افرادِ امت میں بے شمار تبدیلیاں آ چکی ہیں، بہر کیف یہ خیال کرنا غلط ہے کہ مسجدِ نبوی کو حجرۂ مبارکہ کی وجہ سے فضیلت حاصل ہوئی ہے۔ جب بعض افراد نے حجرۂ مبارکہ کو مسجد میں داخل کیا، ان کا مقصد تو صرف یہ تھا کہ مسجد وسیع ہو جائے، اس مصلحت (وضرورت) کے

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (١١٨٩) صحيح مسلم مع شرح النووي (٥/ ٩/ ١٦٧، ١٦٨) صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (١٧٨٨) صحيح سنن النسائي، رقم الحديث (٢٧٦) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٤٠٩)

[2] زاد المسير (٧/ ٣٦٠) و حاشية زاد المسير (٧/ ٣٦٠)

پیشِ نظر نبیِ اکرم ﷺ (کی ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن) کے مکانات کو مسجد میں داخل کر دیا گیا۔ اگرچہ (سلف صالحینِ امت میں سے) بعض افراد نے اس عمل (مسجد میں اِدخالِ حجرہ کے فعل) کو ناپسند کیا ہے۔"[1]

اس تفصیل سے اس شبہے کا ازالہ ہو گیا کہ قبر والی ہر مسجد میں نماز مکروہ ہے، لیکن مسجدِ نبوی اپنے مخصوص فضائل کی وجہ سے اس حکم سے مستثنیٰ ہے۔ لہٰذا جب کسی دوسری مسجد کو وہ اسبابِ فضیلت حاصل نہیں ہیں تو اسے کراہت کے حکم سے مستثنیٰ بھی نہیں کیا جائے گا۔

4 حجرۂ نبوی کا مسجدِ نبوی میں داخل کیا جانا:

یہیں بعض دیگر اشکالات و شبہات کا ازالہ بھی کرتے جائیں کہ جو سمجھا جاتا ہے کہ اگر مسجد میں قبر کی تعمیر مکروہ ہوتی تو نبیِ اکرم ﷺ کی قبرِ مبارک مسجدِ نبوی میں کیوں ہوتی؟

اس سوال کا جواب یا اس شبہے کے ازالے کے لیے ضروری ہے کہ حجرۂ نبوی جس میں آپ ﷺ کو دفن کیا گیا تھا، اس کے مسجد میں داخل کیے جانے کی تاریخ و پس منظر ذہن میں ہو، کیونکہ یہ تو کوئی بھی صاحبِ علم نہیں کہے گا کہ نبیِ اکرم ﷺ کو آپ ﷺ کی مسجد میں دفن کیا گیا تھا، بلکہ آج بظاہر جو نظر آ رہا ہے، یہ عہد صحابہ رضی اللہ عنہم کے بعد وقوع پذیر ہوا تھا۔ آپ ﷺ کی تدفین حضرت ابو بکر صدیق اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے بیان کردہ ایک ارشادِ نبوی ﷺ کے پیشِ نظر مسجد میں نہیں، بلکہ آپ ﷺ کے گھر میں ہوئی تھی۔

وہ گھر یا حجرہ ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا والا وہی حجرۂ مبارکہ ہے، جہاں نبیِ اکرم ﷺ نے اپنی حیات طیبہ کے آخری دن اور مرض الموت کا وقت گزارا تھا۔ آپ ﷺ کی تدفین کے سلسلے میں صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے مابین پیدا ہونے والے نزاع اور حضرت صدیق اور صدیقۂ کائنات رضی اللہ عنہما کے ارشادِ نبوی ﷺ سے استدلال کرنے اور تمام صحابہ رضی اللہ عنہم کے بالاتفاق اس پر عمل کرنے کا واقعہ کتبِ حدیث کے حوالے سے ہم ذکر کر چکے ہیں۔

اگر اس واقعے کو سامنے رکھا جائے تو یہ فیصلہ کرنا آسان ہو جاتا ہے کہ نبیِ اکرم ﷺ کی

[1] الجواب الباهر ضمن مجموع الفتاویٰ (۲۷/ ۴۲۳، ۴۲۴) مترجم اُردو (ص: ۱۷۲، ۱۷۳) عربي مطبوع مستقلاً (ص: ۶۰، ۷۵)

تدفین آپ ﷺ کے گھر میں ہوئی تھی، مسجد میں نہیں اور گھر میں تدفین بھی آپ ﷺ کا ایک خاصا تھا، جو دوسرے کسی غیر نبی کے لیے جائز نہیں، جیسا کہ اس موضوع کی تفصیلات حوالوں کے ساتھ ہم ذکر کر چکے ہیں۔[1]

جب اس شبہے یا اشکال کی یہ شق اس طرح حل ہو جائے تو پیچھے صرف یہ بات رہ جاتی ہے کہ اگر نبیِ اکرم ﷺ کو آپ ﷺ کے گھر میں دفن کیا گیا تھا تو پھر آپ ﷺ کے اس حجرۂ مبارکہ یا قبرِ اقدس کو مسجدِ نبوی ﷺ میں کب اور کس نے داخل کیا؟

اس سلسلے میں مؤرخینِ اسلام امام ابن جریر، امام ابن کثیر اور ایسے ہی شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہم نے اپنی متعدد کتب میں لکھا ہے کہ ۸۸ھ میں ولید بن عبدالملک کے حکم سے مسجدِ نبوی میں توسیع کی گئی تو مسجد نبوی کے قریب ہی واقع نبیِ اکرم ﷺ کی ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن کے مکانات بھی مسجدِ نبوی میں شامل کر لیے۔ اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا مکان یا وہ حجرہ جس میں نبیِ اکرم ﷺ مدفون ہیں، اس حجرے کو بھی مسجد میں شامل کر لیا گیا، جس سے اس وقت مسجدِ نبوی کا طول دو سو ہاتھ اور عرض بھی دو سو ہاتھ ہو گیا۔[2]

حجرۂ نبوی کو مسجد میں شامل کرنے کا یہ واقعہ اس وقت پیش آیا، جب صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم میں سے کوئی زندہ نہیں رہا تھا، بلکہ وہ سب وفات پا چکے تھے، جیسا کہ پہلے بھی شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کے حوالے سے بات گزری ہے۔[3]

حافظ ابن عبد الہادی رحمہ اللہ نے "الصارم المنكي في الرد على السبكي" میں لکھا ہے کہ ولید بن عبد الملک کے عہدِ حکومت میں حجرہ مسجدِ نبوی میں داخل کیا گیا، جب کہ مدینہ طیبہ میں موجود صحابہ رضی اللہ عنہم فوت ہو چکے تھے۔ صحابہ میں سے مدینے میں سب سے آخر میں فوت ہونے والے صحابی حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما تھے، جو (ولید کے والد) عبد الملک کے عہدِ حکومت میں فوت ہوئے تھے، وہ ۷۸ھ میں فوت ہوئے تھے۔ ولید ۸٦ میں مسندِ حکومت پر بیٹھا اور ۹٦ھ میں فوت ہوا۔ مسجدِ نبوی کی توسیع وتعمیرِ جدید اور نبیِ اکرم ﷺ کے حجرۂ مبارکہ کو مسجدِ نبوی میں داخل کرنے کا دور انہی (۸٦ھ

[1] نیز دیکھیں: فتح الباري (١/ ٥٢٩)

[2] تاريخ طبري (٥/ ٢٢٢، ٢٢٣) البداية والنهاية (٥/ ٩/ ٤٧، ٧٥) طبع دارا الفكر بيروت.

[3] الجواب الباهر عربي (ص: ١٠، ١٣، ٢٦، ١٧) ضمن الفتاویٰ (٢٧/ ٣٤٨، ٣٩٩، ٤٠٠، ٤١٨) مترجم اردو (ص: ٢٢، ٥٥)

سے لے کر ۹۶ھ) کے مابین ہی تھا۔[1]

حافظ ابن عبدالہادی نے ابو زید عمر بن شبہ النمیری کتاب ''أخبار المدینة'' سے نقل کیا ہے کہ انھوں نے اپنے مشائخ واساتذہ سے اخذ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ جب حضرت عمر بن عبد العزیز رحمہ اللہ ولید کی طرف سے مدینے کے گورنر تھے تو انھوں نے ۹۱ھ میں مسجدِ نبوی کی تجدید وتعمیر کی، اسے منقش پتھروں سے بنایا، اس کی چھت کو ساگوان کی لکڑی اور سونے کے پانی سے مزین کیا، نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن کے حجرے یا مکانات گرا دیے گئے اور انھیں مسجد میں شامل کر دیا۔ انھوں نے قبرِ مقدس کو بھی مسجد میں شامل کر دیا۔ آگے موصوف نے وہ آثار ذکر کیے ہیں جو حضرت عمر بن عبد العزیز رحمہ اللہ کی تجدید وتعمیرِ مسجدِ نبوی اور توسیع واضافہ شدہ جگہ پر نماز کے مسجدِ نبوی ہی میں نماز کے حکم میں ہونے (توسیع میں بھی نماز کے عام مساجد سے ہزار گنا زیادہ ثواب ہونے) سے تعلق رکھتے ہیں۔

حافظ ابن عبدالہادی نے اپنے کلام میں حجرۂ نبوی کے مسجدِ نبوی میں داخل کیے جانے کے سال کی تعیین نہیں کی، کیوں کہ اس سلسلے میں ابن جریر اور ابن شبّہ کی سال کی تعیین کہ وہ اوّل الذکر کے مطابق ۸۶ھ سے لے کر ۹۶ھ کے مابین اور ثانی الذکر کے مطابق ۹۱ھ ہے۔ ہر دو کی استنادی حیثیت تو محدّثین کرام کی طرز پر قابلِ حجت نہیں، البتہ اس سلسلے میں مؤرخین کا اتفاق ہے کہ یہ توسیع کا واقعہ جس میں حجرۂ نبوی کو مسجدِ نبوی میں داخل کیا گیا ہے، یہ ولید کے عہدِ حکومت میں رو پذیر ہوا اور یہ اس بات کے ثبوت کے لیے کافی ہے کہ اس وقت تک صحابہ رضی اللہ عنہم میں سے کوئی بھی موجود نہیں تھا۔ البتہ ایک روایت جو مشیخۃ ابو عبداللہ الرازی میں ہے، اس میں مذکور ہے کہ حضرت سہل بن سعد رضی اللہ عنہ نے سو سال کی عمر میں ۹۱ھ میں مدینے میں وفات پائی اور وہ مدینے میں فوت ہونے والے آخری صحابی تھے، لیکن یہ روایت معضل ہے اور حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے ''الإصابة في تمییز الصحابة'' میں امام زہری رحمہ اللہ کا قول بھی ایسا ہی ذکر کیا ہے، جب کہ وہ بھی معضل یا مرسل ہے۔ نیز ''الإصابة'' میں ہی ہے کہ بعض نے حضرت سہل رضی اللہ عنہ کی وفات اس سے پہلے بتائی ہے اور ابن ابی داود نے اس زعم کا اظہار کیا ہے کہ ان کی وفات اسکندریہ میں ہوئی تھی۔ تقریب التہذیب میں حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے جزماً کہا ہے کہ ان کی وفات ۸۸ھ میں ہوئی تھی۔[2]

---

[1] دیکھیں: الصارم المنكي (ص: ۱۹٦، ۱۹۷) طبع دار الإفتاء، سعودی عرب.

[2] التقریب (ص: ۲۱۳ طبع نشر السنة لاهور) تحذیر الساجد (ص: ۵۹، ٦۰) حاشیه

بہرحال ایسی کوئی قابلِ حجت نص نہیں پائی جاتی جو اس بات کا ثبوت ہو کہ نبیِ اکرم ﷺ کی قبرِ مبارک کو مسجدِ نبوی میں داخل کرنے کے واقعہ کے وقت کوئی صحابی زندہ موجود تھا۔ امام نووی رحمہ اللہ نے شرح مسلم (۳/ ۵/ ۱۴) میں جو کہا ہے کہ یہ واقعہ عہدِ صحابہ رضی اللہ عنہم میں رونما ہوا تھا، ان کا استدلال بھی شاید اسی معضل یا مرسل روایت سے ہوگا، جو ابھی ہم نے ذکر کی ہے، جب کہ ایسی روایت قابلِ حجت نہیں ہوتی۔ اور اگر اسے صحیح مان بھی لیا جائے تو زیادہ سے زیادہ صرف ایک صحابی کے وجود کا پتا چلتا ہے، لہٰذا مطلق صحابہ رضی اللہ عنہم کا زمانہ اس پر صادق نہیں آئے گا، جس سے کہ عام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے وجود کا احساس ہوتا ہو۔

اس واقعہ کے وقت صحابہ کرام کے باقی نہ ہونے کو اس بات سے بھی تقویت ملتی ہے کہ امام ابن کثیر رحمہ اللہ نے "البدایة و النهایة" میں اور امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے "الجواب الباهر" میں قبرِ نبوی کو مسجدِ نبوی میں داخل کرنے کا واقعہ ذکر کرنے کے بعد لکھا ہے کہ معروف تابعی حضرت سعید بن مسیّب رحمہ اللہ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے حجرہ کو (جس میں نبیِ اکرم ﷺ کی قبرِ مبارک ہے) مسجدِ نبوی میں داخل کرنے کے فعل پر نکیر کی تھی، گویا انھیں یہ خدشہ لاحق ہوا کہ کہیں لوگ آپ ﷺ کی قبرِ اقدس کو عبادت گاہ نہ بنالیں۔[1]

ایک تابعی عالم کو یہی زیب دیتا تھا اور اگر اس وقت کوئی صحابی زندہ ہوتا تو وہ بھی ہرگز خاموش نہ رہتا، بلکہ اگر صحابہ رضی اللہ عنہم کا دور ہوتا تو یہ واقعہ رونما ہی نہ ہوتا کہ ان کے شایانِ شان یہی تھا۔

بعض لوگوں نے جو یہ مغالطہ دینے کی کوشش کی ہے کہ یہ واقعہ حضرت عثمانِ غنی رضی اللہ عنہ کے عہدِ خلافت میں رونما ہوا، یہ بات صحیح نہیں ہے۔ حضرتِ صدیق رضی اللہ عنہ کے زمانے میں تو مسجدِ نبوی جوں کی توں رہی، جس حالت میں نبیِ اکرم ﷺ چھوڑ کر گئے تھے۔ البتہ حضرتِ فاروق اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہما نے اس میں توسیع و اضافہ کیا، جیسا کہ صحیح بخاری شریف کے حوالے سے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت ہم ذکر کر چکے ہیں۔

حضرت عمر و عثمان رضی اللہ عنہما کی توسیعِ مسجدِ نبوی:

مسجدِ نبوی میں خلیفہ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے کسی قسم کا کوئی اضافہ نہیں کیا، بلکہ وہ اپنی اسی حالت پر رہی جس میں نبیِ اکرم ﷺ چھوڑ گئے تھے۔ دیواریں اینٹوں کی، چھت کھجور کی ٹہنیوں اور ستون کھجور

[1] الجواب الباهر (ص: ١٦٦، ١٦٨) اردو، عربي (ص: ٧١) البداية والنهاية (٥/ ٩/ ٧٥)

کے تنوں کے۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے کچھ تجدید و توسیع کی، لیکن پھر بھی مسجد کی شکل و صورت وہی رہی جو نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہدِ مبارک میں تھی، البتہ حضرت عثمانِ غنی رضی اللہ عنہ نے خاص تبدیلیاں کیں۔ انھوں نے دیواریں اور ستون منقش پتھروں سے بنوائے اور چھت کو ساگوان کی لکڑی سے مزین کروایا۔[1]

شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ "الجواب الباهر في زوار المقابر" میں لکھتے ہیں کہ خلفاے راشدین حضرت عمرِ فاروق اور حضرت عثمانِ غنی رضی اللہ عنہما کے عہدِ خلافت میں مسجد کی دیواریں اینٹ گارے سے، ستون کھجور کے تنے سے اور اس کی چھت کھجور کی ٹہنیوں اور پتوں سے بنائی گئی تھی اور ان کے اس فعل پر کسی صحابی نے کوئی تنقید نہیں کی تھی۔ البتہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی توسیع پر صحابہ و تابعین میں اختلاف پیدا ہوا تھا۔ ایک جگہ وہ لکھتے ہیں کہ اکثر صحابہ رضی اللہ عنہم اور کبار تابعین رحمہم اللہ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی تجدید و توسیع سے اتفاق نہیں کیا، کیوں کہ انھوں نے مسجدِ نبوی کو منقش پتھر، چونے اور ساگوان کے درخت سے مزین کر دیا تھا۔[2]

یہ اور دیگر مؤرخین نے مسجدِ نبوی کی تجدید و توسیع کے سلسلے میں جو کچھ لکھا ہے، ان میں سے کسی بھی معتبر مؤرخ نے یہ نہیں لکھا کہ قبرِ نبوی کو خلفائے راشدین یا صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے زمانے میں مسجدِ نبوی میں داخل کیا گیا تھا۔ حضرت عمرِ فاروق رضی اللہ عنہ کی تعمیر و توسیع کو صحابہ و تابعین کا پسند کرنا اور بنظرِ استحسان دیکھنا اس لیے تھا کہ انھوں نے مسجدِ نبوی کی سادگی کو بحال رکھا اور حضرت عثمانِ غنی رضی اللہ عنہ کی تعمیر و توسیع میں زیب و زینت کا عنصر آ گیا، جسے قدسی نفوس صحابہ رضی اللہ عنہم اور تابعین رحمہم اللہ کی طبائع نفیسہ نے نظرِ استحسان سے نہ دیکھا، لیکن یہ نہیں کہ انھوں نے حجرۂ نبوی کو مسجدِ نبوی میں شامل کیا۔

یہ تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی توسیع کے متعلق ہوا، جب کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی توسیع کو صحابہ و تابعین کا بنظرِ استحسان دیکھنا تو ان کا مسجد کی سادگی کو بحال رکھنے کی وجہ سے تھا اور اس پر مستزاد یہ کہ ان کے بارے میں ثابت ہے کہ انھوں نے قبر کے بارے میں اپنا نظریہ واضح طور پر بیان بھی کر دیا، اس سے تعرض کی تو کوئی صورت ہی نہیں ہے۔ چنانچہ طبقات ابن سعد اور تاریخ دمشق ابن عساکر میں ہے کہ حضرت فاروق رضی اللہ عنہ نے جب قبرِ مقدس والی جانب چھوڑ کر دیگر جوانب میں مسجدِ نبوی کی توسیع کی تو حجرۂ مبارکہ یا قبرِ اقدس والی جانب کے بارے میں فرمایا:

---

[1] صحيح البخاري مع الفتح (١/ ٥٤٠ عن ابن عمر رضي الله عنهما)

[2] الجواب الباهر اردو (ص: ١٦٦) وضمن مجموع الفتاوى (٢٧/ ٤١٨)

''إِنَّهٗ لَا سَبِيْلَ إِلَيْهَا''[1]

''اس طرف توسیع کرنے کی تو کوئی سبیل ہی نہیں ہے۔''

احتیاط:

یہاں اس امر کی وضاحت بھی مناسب رہے گی کہ جب مسلمانوں کی کثرت اور مسجدِ نبوی میں توسیع کی حاجت وضرورت کے پیشِ نظر وسعت دی گئی، ازواجِ رسول رضی اللہ عنہن کے حجرے یا مکانات اور قبرِ نبوی بھی مسجد میں شامل کر دی گئی تو اس وقت بڑی احتیاط سے کام لیا گیا، تاکہ قبرِ مقدس نمازیوں کو نظر نہ آنے پائے، چنانچہ امام نووی رحمہ اللہ نے شرح صحیح مسلم میں لکھا ہے کہ جب مسلمانوں کی کثرت ہوگئی اور مسجدِ نبوی میں توسیع کی ضرورت محسوس ہوئی تو وہ توسیع واضافہ اتنا زیادہ کیا گیا کہ اُمہات المومنین رضی اللہ عنہن کے گھر اور ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا گھر بھی مسجد میں شامل کر لیا گیا، جس میں نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا مدفن بھی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دو صحابہ (دو خلفا) حضرت ابوبکر صدیق وعمرِ فاروق رضی اللہ عنہما بھی اسی حجرہ میں دفن ہیں۔

توسیع کے دوران میں قبروں پر گول اور اونچی دیواریں اس انداز سے بنائی گئیں کہ وہ قبریں مسجد سے نظر نہ آئیں اور عوام الناس ان کی طرف نماز نہ پڑھیں، جو ایک ممنوع فعل تک پہنچانے کا ایک سبب بنے۔ پھر انھوں نے قبروں کے دونوں شمالی کونوں سے دیواریں بنائیں اور انھیں اس انداز سے پھیرا کہ آگے جا کر وہ دونوں باہم مل گئیں، یہ اس لیے کیا گیا تاکہ کوئی شخص قبر کی طرف استقبال نہ کر سکے۔[2]

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے ''الجواب الباھر'' میں اس سلسلے میں لکھا ہے کہ جب نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی قبرِ اقدس والا حجرہ شریفہ مسجد میں داخل کیا گیا تو اس کا دروازہ بند کر دیا گیا اور اس کے اردگرد ایک اور دیوار بنا دی گئی، تاکہ (آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی مانگی ہوئی دعا کے مطابق) آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر کو میلہ گاہ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر کو عبادت گاہ بننے سے بچایا جا سکے۔[3]

ان تمام تفصیلات کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے یہ بات بآسانی سمجھ میں آسکتی ہے کہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم

---

[1] تحذير الساجد (ص: ٦٤، ٦٥) ونقل تصحيح السيوطي للأثر، المشاهدات المعصومية (ص: ٢٣ دار الإفتاء)

[2] شرح صحيح مسلم للنووي (٣/ ٥/ ١٤)

[3] الجواب الباهر (ص: ١٣ طبع دار الإفتاء) اردو (ص: ٢٨) ضمن مجموع الفتاوىٰ (٢٧/ ٣٢٨)

کی مسجد کئی وجوہات کی بنا پر اس حکم سے مستثنیٰ اور الگ ہے، جس کی رو سے قبر پر تعمیر کی گئی یا قبر کو شامل مسجد میں نماز مکروہ قرار دی گئی ہے۔ سابقۃ الذکر تفصیلات سے یہ بھی واضح ہو گیا کہ نبیِ اکرم ﷺ کی قبرِ اقدس خلفائے راشدین اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے عہد میں مسجدِ نبوی میں داخل نہیں کی گئی، بلکہ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ، پھر یزید اور عبدالملک کے زمانوں کے بھی بعد ولید بن عبدالملک کے زمانے میں قبر نبوی، مسجدِ نبوی میں داخل کی گئی، جب کہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم میں سے کوئی صحابی مدینہ طیبہ میں زندہ باقی نہیں رہا تھا، بلکہ وہ تابعین رحمہم اللہ کا زمانہ تھا۔ رئیس التابعین حضرت سعید بن مسیّب رحمہ اللہ نے ولید پر نکیر کی اور اس کے اس اقدام کو انھوں نے بنظرِ استحسان نہیں دیکھا۔ لہٰذا نہ تو قبرِ نبوی کے مسجدِ نبوی میں ہونے سے مسجد میں قبر کے جواز پر استدلال صحیح ہے اور نہ اس سے قبر پر مسجد تعمیر کرنے کا جواز اخذ کرنے کی کوئی گنجایش ہے، کیوں کہ نبیِ اکرم ﷺ نے اس سے سختی سے منع فرمایا ہے۔ قبروں پر مساجد کے سلسلے میں بعض دیگر شبہات و اشکالات بھی وارد کیے گئے ہیں، جن کا محدّثانہ و عالمانہ اور تفصیلی جائزہ کتاب ”تحذير الساجد من اتخاذ القبور مساجد“ (ص: ٤٧ تا ١٠٠ طبع جمعية إحياء التراث الإسلامي كويت) میں دیکھا جا سکتا ہے۔

یہ قبریں... یہ آستانے

پچھلے اوراق میں ہم نے قبروں پر مساجد تعمیر کرنے کے ممنوع ہونے، قبر پر بنی یا قبر کو شامل مسجد میں نماز کے مکروہ ہونے (سوائے مسجدِ نبوی کے) اور قبروں کے مابین یا مزار و قبرستان میں یا کسی درگاہ و قبر کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنے کے ممنوع ہونے کی تفصیلات ذکر کی ہیں، جن سے واضح طور پر پتا چل جاتا ہے کہ کسی بزرگ کی قبر کے پاس اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنا بھی کس قدر فتنہ انگیز اور شرعاً ناپسندیدہ فعل ہے۔ اگر کوئی شخص اللہ تعالیٰ کی عبادت کے بجائے خود اس بزرگ کی عبادت شروع کر دے، جیسے اس کی قبر کا طواف کرنا، اس کی قبر کو سجدہ کرنا، اسے پکارنا، اس سے مشکل کشائی اور حاجت روائی کا مطالبہ کرنا، اس کی قبر پر اس کے نام کی قربانی کرنا وغیرہ۔

ایسے شخص کا ان افعال کا ارتکاب کیسا گناہ ہوگا؟ اس کا اندازہ کرنا کوئی مشکل کام نہیں، یعنی اللہ تعالیٰ کی عبادت بھی کسی قبر کے پاس ہونے کی وجہ سے ممنوع اور گناہ ہے تو صاحبِ قبر کی عبادت کے شرکِ اکبر اور گناہِ کبیرہ ہونے میں کیا شک رہ جاتا ہے۔ حتیٰ کہ شیخ الاسلام امام محمد بن عبدالوہاب تمیمی رحمہ اللہ نے کتاب التوحید میں مستقل ایک باب قائم کیا ہے "باب ما جاء من التغليظ فيمن عبد الله عند قبر رجل صالح"، پھر اس باب کے تحت متعدد احادیث لا کر مسئلہ خوب نکھارا ہے۔[1]

ہماری ذکر کردہ سابقہ تفصیلات سے یہ بھی پتا چلتا ہے کہ نبیِ اکرم ﷺ نے ان افعال (حتیٰ کہ اقوال) کی بھی بیخ کنی کر دی ہے جو عقیدۂ توحید میں نقص و اضمحلال کا باعث بنتے ہیں۔ آپ ﷺ نے شجرۂ توحید کی آبیاری کے لیے بڑی دور رس تدابیر اور کوششیں کیں۔ ان کوششوں کا ہی نتیجہ تھا کہ

[1] تفصیل کے لیے دیکھیں: كتاب التوحيد مع القول السديد عربي (ص: ٨٠ دار الإفتاء) اُردو مترجم (ص: ٨٨ الدار السلفية بمبئ ترجمه مولانا محمد يوسف سواتى) قرة عيون الموحدين للشيخ عبد الرحمٰن حسن عربي، و مترجم اُردو (١/ ٢٩٣ وما بعد طبع أنصار السنة لاهور) فتح المجيد شرح كتاب التوحيد (ص: ١٨٠ دارالافتاء) هداية المستفيد اردو ترجمه فتح المجيد (١/ ٦٤٣ وما بعد طبع مكتب الدعوة الإسلامية پاكستان، ترجمه مولانا عطاء الله ثاقب)

آپ ﷺ کے اردگرد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جیسے قدسی نفوس لوگوں کی ایسی فوج ظفر موج جمع ہوگئی کہ رہتی دنیا تک تاریخ ان کی مثال نہیں لا سکے گی۔ یہ سب نبیِ اکرم ﷺ کی مساعی جمیلہ ہی کا پھل تھا۔ صَلوَاتُ اللّٰهِ وَسَلَامُهُ عَلَيْهِ.

یہ باتیں تو ضمنی طور پر آ گئیں، ورنہ ہمارا اصل موضوع تو ان مقامات کی قرآن وسنت کی روشنی میں تعیین کرنا ہے، جہاں نماز پڑھنا جائز نہیں، جن میں سے ایک مقبرہ یا قبرستان بھی ہے۔ جس کی تفصیل پہلے بھی گزر چکی ہے۔ اس سے بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ یہ قبریں اور یہ آستانے ہمارے عقائد پر کیا اثرات مرتب کر رہے ہیں اور ہم لوگ کیسے کیسے فتنوں میں مبتلا کیے جا رہے ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ نبیِ اکرم ﷺ نے مذکورہ شرکیہ افعال تو کجا، ان قبروں اور آستانوں کے پاس یا مابین نماز پڑھنے سے بھی منع فرما دیا اور سابق میں ذکر کی گئی کئی احادیث پر مستزاد بعض دیگر احادیث بھی ہیں، جن میں سے ایک صحیح بخاری و مسلم، سنن ابو داود، ترمذی، نسائی اور مسند احمد میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبیِ اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

«اِجْعَلُوْا مِنْ صَلَاتِكُمْ فِيْ بُيُوْتِكُمْ وَلَا تَتَّخِذُوْهَا قُبُوْرًا»[1]

''اپنی نماز میں سے (فرضوں کے سوا کچھ نفلی نماز) اپنے گھروں میں بھی پڑھو اور انھیں قبرستان نہ بناؤ۔''

اس حدیث میں سنتیں اور نوافل اپنے گھروں میں ادا کرنے کی طرف ترغیب دلائی گئی ہے۔ گھروں میں نماز کو نفلی نمازوں کے ساتھ خاص کرنے کا قرینہ خود نبیِ اکرم ﷺ کے ایک ارشاد میں موجود ہے، جو صحیح مسلم، سنن ابن ماجہ، مسند احمد اور تاریخ بغداد، میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبیِ اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

«إِذَا قَضٰى أَحَدُكُمُ الصَّلَاةَ فِيْ مَسْجِدِهٖ فَلْيَجْعَلْ لِبَيْتِهٖ نَصِيْبًا مِنْ صَلٰوتِهٖ فَإِنَّ اللّٰهَ تَعَالٰى جَاعِلٌ فِيْ بَيْتِهٖ مِنْ صَلٰوتِهٖ خَيْرًا»[1]

[1] صحيح البخاري مع الفتح (٤٣٣) صحيح مسلم مع شرح النووي (٣/ ٦/ ٦٧، ٦٨) صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (٩٢١) صحيح سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٧٢) صحيح سنن النسائي، رقم الحديث (١٥٠٧) صحيح الجامع، رقم الحديث (١٥٤) منتقى الأخبار مع نيل الأوطار (١/ ٢/ ١٣٥)

[2] صحيح مسلم مع شرح النووي (٣/ ٦/ ١٦٧) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٣٧٦) مسند أحمد (٣/ ٥٩، ←

’’جب تم میں سے کوئی شخص مسجد میں اپنی (فرض نماز) مکمل کر لے تو اپنی نماز کا کچھ حصہ گھر کے لیے چھوڑ دے، کیوں کہ اللہ تعالیٰ گھر میں پڑھی گئی نماز کے ذریعے اس کے گھر میں خیر و برکت کرتا ہے۔‘‘

مسند احمد و ابی یعلی میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے ایک دوسرے صحابی حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کے حوالے سے یہ حدیث بیان کی ہے اور اس میں یہ الفاظ بھی ہیں کہ جب مسجد میں فرض پڑھ کر گھر کو لوٹے تو: « فَلْيُصَلِّ فِيْ بَيْتِهٖ رَكْعَتَيْنِ »[1]

’’اسے چاہیے کہ اپنے گھر میں (کم از کم) دو رکعتیں پڑھے۔‘‘

اس سے واضح ہو گیا کہ گھر میں جس نماز کی ترغیب دلائی گئی ہے، وہ فرض نہیں بلکہ نفلی نماز ہے۔ اگرچہ قاضی عیاض رحمہ اللہ نے بعض اہلِ علم سے نقل کیا ہے کہ اس سے کبھی کبھار گھر میں بھی فرض نماز (باجماعت) ادا کرنا مراد ہے، تاکہ عورتیں بھی اقتدا کر سکیں جو مسجد کو نہیں جاتیں۔ جب کہ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس مفہوم کا بھی احتمال تو ہے، لیکن راجح بات پہلی ہی ہے کہ اس سے مراد نفلی نمازیں اور سنتیں وغیرہ ہیں نہ کہ فرائض۔ شیخ محی الدین نے سختی کے ساتھ کہا ہے کہ اس سے فرض ہرگز مراد نہیں۔[2]

بہرحال ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے کہ اپنے گھروں میں بھی کچھ نماز پڑھا کرو، انھیں قبرستان مت بنادو۔ اس کے اہلِ علم نے متعدد مفہوم بیان کیے ہیں:

1. پہلا یہ کہ اپنے آپ کو مُردوں کی طرح نہ بنا دو، کیونکہ وہ اپنے گھروں یعنی قبروں میں نماز نہیں پڑھتے۔
2. دوسرا مفہوم یہ کہ گھروں کو صرف سونے کی جگہ ہی نہ بنا دو کہ ان میں کوئی نماز نہ پڑھو۔ نیند موت کی بہن ہے اور میت نماز نہیں پڑھتی۔
3. تیسرا مفہوم یہ ہے کہ جو شخص گھر میں نماز نہیں پڑھتا، اس نے اپنے آپ کو گویا میت اور اپنے

← ٣١٦) تاریخ خطیب (٤/ ٣١١) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (١٣٩٢) صحيح الجامع، رقم الحديث (٧٣١) نيل الأوطار (١/ ٢/ ١٣٥)

[1] مسند أحمد (٣/ ١٥/ ٥٩) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (١٣٩٢) صحيح الجامع، رقم الحديث (٧٣٣)

[2] فتح الباري (١/ ٥٢٩) نيل الأوطار (١/ ٢/ ١٣٥)

گھر کو گویا قبرستان بنا دیا ہے۔ اس تیسرے مفہوم کی تائید صحیح مسلم میں حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث سے بھی ہوتی ہے، جس میں ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے:

«مَثَلُ الْبَيْتِ الَّذِي يُذْكَرُ اللّٰهِ فِيهِ، وَالْبَيْتِ الَّذِي لَا يُذْكَرُ فِيهِ مَثَلُ الْحَيِّ وَالْمَيِّتِ »[1]

''وہ گھر جس میں اللہ کا ذکر کیا جاتا ہو اور وہ گھر جس میں اللہ کا ذکر نہ کیا جاتا ہو ان کی مثال زندہ شخص اور مردہ کی ہے۔''

(۴) اس حدیثِ مذکور کا چوتھا مفہوم یہ ہے کہ قبریں چونکہ نماز کی جگہیں نہیں ہوتیں، لہٰذا ان میں نماز پڑھنا مکروہ ہے اور جو شخص گھر میں کوئی نماز نہیں پڑھتا، نہ نفل نہ سنتیں، اس نے اپنے اس فعل سے اپنے گھر کو گویا قبرستان بنا رکھا ہے، جہاں نماز جائز نہیں۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے یہی مراد لیا ہے۔ اور حدیث کے الفاظ: « لَا تَتَّخِذُوهَا قُبُورًا » ''اپنے گھروں کو قبریں نہ بنا دو'' سے استنباط کیا ہے کہ قبریں مقامِ عبادت نہیں ہوتیں تو قبرستان میں نماز مکروہ ہوئی۔ اور اس پر انھوں نے تبویب یوں کی ہے:

''باب كراهية الصلاة في المقابر''[2] ''قبرستان میں نماز مکروہ ہونے کا بیان''

اس تبویب میں امام بخاری رحمہ اللہ نے ایک دوسری حدیث کی طرف بھی اشارہ کر دیا ہے، جس میں قبرستان میں نماز کی ممانعت وارد ہوئی ہے، لیکن وہ حدیث چونکہ بخاری شریف کے معیار پر پوری نہیں اتر رہی تھی، لہٰذا اسے وارد نہیں کیا۔ محض تبویب میں اشارہ کر دیا ہے۔ وہ حدیث سنن ابو داود، ترمذی، ابن ماجہ، صحیح ابن حبان و ابن خزیمہ، سنن کبریٰ بیہقی، مسند احمد و سراج، مسند شافعی اور مستدرک حاکم میں حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

«اَلْأَرْضُ كُلُّهَا مَسْجِدٌ إِلَّا الْحَمَام وَالْمَقْبَرَة»[3]

''ساری زمین مسجد ہے سوائے حمام اور قبرستان کے۔''

---

[1] صحيح البخاري مع الفتح (٦٤٠٧) صحيح مسلم مع شرح النووي (٣/ ٦/ ٦٨) صحيح الجامع (٥٨٢٧)

[2] صحيح البخاري (١/ ٥٢٨)

[3] صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٦٣) صحيح سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٦٢) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٧٤٥) صحيح ابن حبان: الموارد (٣٣٨) المستدرك للحاكم (١/ ٢٥١) صحيح الجامع، رقم الحديث (٢٧٦٧) إرواء الغليل (١/ ٣٢٠) منتقى الأخبار مع نيل الأوطار (١/ ٢/ ١٣٣)

اس حدیث کی سند کو امام ترمذی رحمہ اللہ نے مرسل قرار دیا ہے، جب کہ امام بخاری رحمہ اللہ اگرچہ اسے اپنی صحیح میں نہیں لائے، البتہ اپنی ایک دوسری کتاب ''جزء القراء ۃ'' میں اس کے صحیح ہونے کی طرف انھوں نے بھی اشارہ کیا ہے۔ امام حاکم، علامہ ذہبی، امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ اور محققین کی ایک جماعت نے اس حدیث کو صحیح قرار دیا ہے۔[1]

علامہ ابن حزم رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ قبروں کی طرف منہ کر کے یا قبرستان میں نماز پڑھنے کی ممانعت سے تعلق رکھنے والی احادیث تو تواتر وشہرت کے درجے کو پہنچی ہوئی ہیں، جن کو ترک کرنا کسی کے بس میں نہیں ہے۔ سلف صالحین میں سے حضرت عمر، علی، ابو ہریرہ، انس اور ابن عباس رضی اللہ عنہم صحابہ میں سے اور ابراہیم نخعی، نافع بن جبیر بن مطعم، طاؤس، عمرو بن دینار اور خیثمہ وغیرہم رحمہم اللہ تابعین میں سے قبرستان میں نماز کے ممانعت کے قائل ہیں اور امام احمد کا بھی یہی مسلک ہے چاہے کہیں صرف ایک ہی قبر کیوں نہ ہو۔ حضرت سفیان ثوری رحمہ اللہ، اوزاعی رحمہ اللہ اور امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ بھی قبرستان میں نماز کے مکروہ ہونے ہی کے قائل ہیں۔ امام شافعی رحمہ اللہ کے یہاں کچھ تفصیل ہے اور امام مالک رحمہ اللہ جواز کے قائل ہیں، جب کہ یہ احادیث ان کے قول کی تردید کر رہی ہیں۔[2]

امام ابن المنذر رحمہ اللہ نے کہا ہے:

''اِجْعَلُوْا فِيْ بُيُوْتِكُمْ مِنْ صَلَاتِكُمْ وَلَا تَتَّخِذُوْهَا قُبُوْراً''

''اپنے گھروں میں بھی کچھ نماز پڑھا کرو اور انھیں قبرستان نہ بنا دو۔''

اکثر اہلِ علم نے اس ارشاد سے استدلال کرتے ہوئے کہا ہے کہ قبرستان نماز کی جگہ نہیں ہے۔ امام بغوی نے شرح السنۃ میں اور امام خطابی نے بھی معالم السنن میں یہی بات کہی ہے۔[3]

قبرستان میں نماز کی ممانعت میں کیا حکمت ہے؟ اس سلسلے میں ایک تو کہا جاتا ہے کہ نمازی کے نیچے نجاست ہونے کی وجہ سے ممانعت ہے اور بعض نے فوت شدگان کی حرمت واحترام کی وجہ سے ممانعت شمار کی ہے۔[2] جب کہ دراصل یہ شرک کا دروازہ بند کرنے کے لیے ہے۔ جیسا کہ تفصیل ذکر کی جا چکی ہے۔

---

[1] حواله جات بالا و جزء القراء ۃ امام بخاري (ص: ۳۲ مترجم اردو مولانا خالد گھرجاکھی) فتاوی ابن تیمیة رحمہ اللہ (۲۲/ ۱۶۰)

[2] نيل الأوطار (۱/ ۲/ ۱۳٤)

[3] فتح الباري (۱/ ٥۲۹)

[4] نيل الأوطار (۱/ ۲/ ۱۳٤)

حمام میں نماز کی کراہت و ممانعت:

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ والی حدیث میں مقبرہ یا قبرستان کے ساتھ ہی حمام میں بھی نماز کی ممانعت وارد ہوئی ہے۔ امام احمد، ابو ثور اور ظاہریہ کا یہی مسلک ہے کہ حمام میں نماز جائز نہیں۔ صحابہ میں سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی اسی ہی کی روایت ملتی ہے۔ علامہ ابن حزم کے بقول اس سلسلے میں ان کا کوئی مخالف بھی معلوم نہیں ہو سکا۔ تابعین رحمہم اللہ میں سے نافع بن جبیر بن مطعم، ابراہیم نخعی، خیثمہ اور زیاد رحمہم اللہ سے بھی اسی کی روایات ملتی ہیں رحمۃ اللہ علیہم۔

جمہور نے حمام کے پاک صاف ہونے کی شکل میں نماز جائز مگر مکروہ قرار دی ہے، اس کے لیے انھوں نے عمومی احادیث سے استدلال کیا ہے، جن میں سے صحیح بخاری و مسلم، سنن ابن ماجہ اور مسند احمد میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے:

«أَيْنَمَا أَدْرَكَتْكَ الصَّلَاةُ فَصَلِّ»[1]

”تمھیں جہاں بھی نماز کا وقت ہو جائے تو وہیں نماز پڑھ لو۔“

ان کا کہنا ہے کہ ممانعت کا حکم صرف اس حالت پر محمول ہے جب کہ حمام نجس ہو، لیکن امام شوکانی رحمہ اللہ کے بقول عدمِ جواز والا پہلا قول ہی برحق ہے، کیونکہ قبرستان اور حمام میں نماز کی ممانعت والی احادیث عمومی جواز پر دلالت کرنے والی احادیث سے ان دونوں جگہوں کو خاص کر دیتی ہیں، یعنی جہاں بھی نماز کا وقت ہو جائے نماز پڑھ، لیکن قبرستان اور حمام میں مت پڑھو۔

حمام میں نماز کی ممانعت میں کیا حکمت پنہاں ہے؟ اس سلسلے میں ایک تو یہ کہا گیا ہے کہ اس میں بکثرت نجاست ہوتی ہے، اس لیے اس میں نماز جائز نہیں اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ حمام شیطان کا ڈیرہ ہوتے ہیں۔[2] شیطان کے ڈیروں پر نماز پڑھنا ممنوع ہے، جیسا کہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک سفر کے دوران میں تمام صحابہ رضی اللہ عنہم سمیت نمازِ فجر سے سوئے رہ جانے اور سورج کی کرنوں سے جاگنے کے بعد اس جگہ سے کچھ آگے جا کر نماز پڑھنے کے واقعہ کے ضمن میں ہم ذکر کر چکے ہیں کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے بقول نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

[1] نيل الأوطار (١/ ١/ ١٩٨) التحفة الأحوذي (١/ ٢٨٠) التلخيص الحبير لابن حجر (١/ ١/ ١٢٥)

[2] نيل الأوطار (١/ ٢/ ١٣٤)

«فَإِنَّ هٰذَا مَنْزِلٌ حَضَرَنَا فِيهِ الشَّيْطَانُ»[1]

''یہ ایسی جگہ (یا وادی) ہے جس میں شیطان حاضر ہو چکا ہے (یعنی یہاں وہ ڈیرہ لگا چکا ہے۔لہٰذا یہاں سے روانہ ہو جاؤ)۔''

پھر آگے جا کر فجر کی نماز ادا فرمائی۔امام نووی رحمہ اللہ نے شرح مسلم میں لکھا ہے:

"فِيْ دَلِيلٌ عَلىٰ اِسْتِحْبَابِ اِجْتِنَابِ مَوَاضِعِ الشَّيْطَانِ، وَهُوَ أَظْهَرُ الْمُعْنَيَيْنِ فِيْ النَّهْيِ عَنِ الصَّلَاةِ فِيْ الْحَمَّامِ"

''اس حدیث میں اس بات کی دلیل پائی جاتی ہے کہ شیطان کے ڈیروں سے اجتناب کرنا مستحب ہے۔حمام میں نماز پڑھنے کی ممانعت کے دو معنوں میں سے بھی ظاہر ترین یہی معنیٰ ہے۔''

اس عدم جواز یا ممانعت کی روایت حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی ملتی ہے، جس میں وہ فرماتے ہیں:

«لَا يُصَلِّيَنَّ إِلٰى حِشٍّ وَلَا فِيْ حَمَّامٍ وَلَا فِي الْمَقْبَرَةِ»

''پاخانہ گاہ (لیٹرین) کی طرف منہ کرکے اور حمام کے اندر اور قبرستان میں ہرگز نماز نہ پڑھے۔''

یہی وہ اثر ہے، جسے ذکر کر کے علامہ ابن حزم رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم میں سے ہمیں اس مسئلے میں کسی کا اختلاف معلوم نہیں ہو سکا۔

اونٹوں کے باڑے میں نماز کی کراہت وممانعت:

شیطان کے ڈیروں میں نماز کی ممانعت کے سلسلے میں یہ بات بھی پیش نظر رہے کہ اونٹوں کے باندھے جانے والے باڑوں کو بھی ایسی جگہوں میں سے شمار کیا گیا ہے، جہاں نماز پڑھنا مکروہ ہے اور اس سلسلے میں متعدد احادیث میں متعدد الفاظ وارد ہوئے ہیں۔مثلاً حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم میں سے اکثر کی مرویات میں تو "معاطن الإبل" کے الفاظ وارد ہوئے، جب کہ حضرت جابر بن سمرہ اور حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہما سے مروی حدیث میں "مبارك الإبل"، ایسے ہی حضرت سلیک رضی اللہ عنہ سے مروی

[1] صحيح مسلم مع شرح النووي (٣/ ٥/ ١٨٣) فتح الباري (١/ ٤٥٠)

حدیث میں بھی یہی الفاظ ہیں۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں ''أعطان الإبل''، حضرت اسید بن حضیر رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں ''مناخ الإبل''، اور حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں ''مرابد الإبل'' ہے۔ معنیٰ ان سبھی کا تقریباً ایک یعنی اونٹوں کا باڑہ ہی ہے۔

جن احادیث میں اونٹوں کے باڑوں میں نماز پڑھنے سے روکا گیا ہے، ان احادیث میں سے ایک صحیح مسلم، سنن ترمذی اور مسند احمد میں حضرت جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

«إِنَّ رَجُلًا سَأَلَ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ أَ أَتَوَضَّأُ مِنْ لُحُومِ الْغَنَمِ؟ قَالَ: إِنْ شِئْتَ فَتَوَضَّأْ، وَإِنْ شِئْتَ فَلَا تَتَوَضَّأْ، قَالَ: أَتَوَضَّأُ مِنْ لُحُومِ الْإِبِلِ؟ قَالَ: نَعَمْ فَتَوَضَّأْ مِنْ لُحُومِ الْإِبِلِ... قَالَ: أُصَلِّيْ فِيْ مَرَابِضِ الْغَنَمِ؟ قَالَ: نَعَمْ، قَالَ: أُصَلِّيْ فِيْ مُبَارِكِ الْإِبِلِ؟ قَالَ: لَا»[1]

''ایک آدمی نے نبیِ اکرم ﷺ سے پوچھا: کیا میں بکری کا گوشت کھانے کے بعد نئے سرے سے وضو کروں؟ نبیِ اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: اگر تم چاہو تو بکری کا گوشت کھا کر وضو کر لو اور اگر نہ چاہو تو نہ کرو۔ پھر اس شخص نے پوچھا: کیا میں اونٹ کا گوشت کھا کر وضو کروں؟ نبیِ اکرم ﷺ نے فرمایا: ہاں اونٹ کا گوشت کھا کر وضو کر لو۔ اس نے پوچھا: کیا میں بکریوں کے باڑے میں نماز پڑھ لوں؟ نبیِ اکرم ﷺ نے فرمایا: ہاں (پڑھ لو) اس نے پوچھا: کیا میں اونٹوں کے باڑے میں نماز پڑھ لوں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: نہیں۔''

جب کہ سنن ترمذی، ابن ماجہ اور مسند احمد میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ارشادِ نبوی ﷺ ہے:

«صَلُّوْا فِيْ مَرَابِضِ الْغَنَمِ، وَلَا تُصَلُّوْا فِيْ أَعْطَانِ الْإِبِلِ»[2]

''بکریوں کے باڑے میں نماز پڑھ لو، لیکن اونٹوں کے باڑے میں نماز مت پڑھو۔''

ایسی ہی دیگر احادیث کے پیشِ نظر امام احمد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اونٹوں کے باڑے میں نماز کسی حال میں بھی جائز نہیں اور جس نے نماز پڑھ لی ہو، وہ نماز دہرائے۔ امام مالک رحمہ اللہ سے پوچھا گیا

---

[1] صحيح مسلم مع شرح النووي (٢/ ٣/ ٤٨) فتح الباري (١/ ٥٢٧) نيل الأوطار (١/ ٢/ ١٣٧) إرواء الغليل (١/ ١٥٢) صحيح سنن الترمذي، رقم الحديث (٧٠) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٤٩٤)

[2] صحيح سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٨٥) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٧٦٨) المنتقىٰ مع نيل الأوطار (١/ ٢/ ١٣٧) مسند أحمد (٢/ ٤٥١، ٤٩١) صحيح الجامع، رقم الحديث (٣٧٨٧)

کہ اونٹوں کے باڑے میں نماز پڑھ لوں، جب کہ کسی دوسری جگہ نماز پڑھنا ممکن نہ ہو تو انھوں نے فرمایا: نہیں اور پوچھا گیا کہ اگر میں باڑے کی زمین پر کپڑا ڈال لوں تب؟ فرمایا: پھر بھی نہیں۔

علامہ ابن حزم رحمہ اللہ نے بھی کہا ہے کہ اونٹوں کے باڑے میں نماز جائز نہیں اور جمہور کا کہنا ہے کہ اگر نجاست موجود نہ ہو تو مکروہ ہے اور اگر نجاست موجود ہو تو پھر حرام ہے، لیکن جمہور کی یہ بات محققین کے نزدیک درست نہیں، کیوں کہ اس ممانعت کی وجہ نجاست نہیں۔ اگر نجاست ہوتی تو پھر اونٹ اور بکری میں فرق کیا ہے؟

ممانعت کی حکمت:

اس ممانعت کی حکمت میں اہلِ علم کے کئی اقوال ہیں۔ امام نووی رحمہ اللہ نے شرح صحیح مسلم میں لکھا ہے کہ اس ممانعت (اور ان کے نزدیک کراہت) کا سبب اونٹوں کا بدک جانا اور نمازی کو نقصان پہنچانے کا خدشہ وغیرہ ہے۔[1] جب کہ حافظ ابن حجر نے فتح الباری میں لکھا ہے کہ بکریاں جنتی جانور ہیں اور اونٹ کی تخلیق شیطان سے ہوئی ہے۔[2] اور بکری کا گوشت کھانے کے بعد نماز کے لیے از سر نو وضو کرنے کی ضرورت نہیں، لیکن اونٹ کا گوشت کھانے کے بعد نماز کے لیے وضو کرنے کا نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم فرمایا ہے اور اس کی علت و سبب بھی اونٹ کا شیطان میں سے ہونا ہی ہے، جیسا کہ اس موضوع کی تفصیل اور اعلام الموقعین کے حوالے سے اس علت و سبب کا تذکرہ علامہ ابن قیم رحمہ اللہ کی زبانی مسائلِ وضو میں بھی کیا جا چکا ہے۔[3]

علامہ ابن قیم رحمہ اللہ، حافظ ابن حجر رحمہ اللہ اور امام شوکانی رحمہ اللہ کی تصریحات کی رو سے اونٹوں کے باڑے میں شیطانوں کے اڈے یا ڈیرے ہوتے ہیں، اس لیے وہاں نماز پڑھنے کی ممانعت وارد ہوئی ہے۔ اونٹوں کے شیطان فطرت ہونے کا ثبوت تو خود احادیث میں بھی موجود ہے۔ چنانچہ مسند احمد میں حضرت عبداللہ بن مغفل رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

«لَا تُصَلُّوْا فِيْ أَعْطَانِ الْإِبِلِ فَإِنَّهَا خُلِقَتْ مِنَ الْجِنِّ، أَلَا تَرَوْنَ إِلٰی عُيُوْنِهَا

[1] صحیح مسلم مع شرح النووي (٢/ ٣/ ٤٩)

[2] فتح الباري (١/ ٣٤٢، ٥٢٧)

[3] دیکھیں: اعلام الموقعين (١/ ١/ ٣٩٥، ٣٩٦)

وَهَيْئَتِهَا إِذَا نَفَرَتْ》[1]

''اونٹوں کے باڑوں میں نماز مت پڑھو، یہ جنوں میں سے پیدا کیے گئے ہیں، جب یہ بھڑکے ہوئے ہوں تو تم ان کی آنکھیں اور ہیئت و حالت نہیں دیکھتے ہو۔''

ایسے ہی سنن ابو داود اور مسندِ احمد میں حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے مروی ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے:

《لَا تُصَلُّوْا فِيْ مُبَارِكِ الْإِبِلِ فَإِنَّهَا مِنَ الشَّيَاطِيْنِ، وَصَلُّوْا فِيْ مَرَابِضِ الْغَنَمِ فَإِنَّهَا بَرَكَةٌ》[2]

''اونٹوں کے باڑوں میں نماز نہ پڑھو، کیوں کہ وہ شیطانوں میں سے ہیں اور بکریوں کے باڑوں میں نماز پڑھ لو، کیونکہ یہ تو نری برکت ہیں۔''

ایسے ہی سنن نسائی میں حضرت عبداللہ بن مغفل رضی اللہ عنہ سے اور سنن ابن ماجہ میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی احادیث میں بھی یہ بات وارد ہوئی ہے۔[3]

ان سب احادیث سے اونٹوں کے باڑے میں نماز نہ پڑھنے کا اصل سبب بھی معلوم ہوگیا۔ یہاں پر یہ بات بھی ذہن میں رہے کہ اونٹوں کے باڑے میں نماز پڑھنا جہاں وہ اکٹھے ہوتے ہوں یا رہتے ہوں اور اونٹ کو سامنے بٹھا کر اسے سترہ بنا کر کسی کھلی جگہ پر نماز پڑھنا اور اونٹ کے اوپر بیٹھ کر سفر میں نفلی نماز پڑھنا؛ یہ تینوں الگ الگ چیز ہیں۔ پہلی صورت ممنوع ہے، جیسا کہ احادیث گزری ہیں اور دوسری دونوں صورتیں جائز ہیں۔ ان میں سے اونٹ کے اوپر سوار ہو کر نماز پڑھنے کا ذکر بھی قریب ہی سواری پر نماز پڑھنے کے ضمن میں گزرا ہے۔ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے سواری پر بیٹھے بیٹھے نفلی نماز پڑھنا ثابت ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سواری عموماً اونٹنی ہوتی تھی، جیسا کہ عضباء اور قصواء نامی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اونٹنیاں معروف ہیں۔ خصوصاً نماز وتر کے سلسلے میں حدیث مشہور ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی اونٹنی پر ہی پڑھ لیا کرتے تھے۔ اونٹنی کو سامنے بٹھا کر نماز پڑھنا بھی ثابت ہے۔ جس سے پتا چلتا ہے کہ مذکورہ تینوں صورتوں میں سے پہلی صورت کا حکم الگ ہے اور دوسری دونوں صورتوں کا الگ۔ پہلی میں نماز

---

[1] نيل الأوطار (١/ ٢/ ١٣٧)

[2] صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (١٦٩) صحيح الجامع، رقم الحديث (٧٣٥١) إرواء الغليل (١/ ١٥٢، ١٥٤)

[3] صحيح سنن النسائي، رقم الحديث (٧٠٩) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٧٦٨) التلخيص الحبير (١/ ١/ ٢٧٦)

ناجائز اور دوسری و تیسری میں نماز جائز ہے۔ دوسری دونوں صورتوں سے متعلقہ احادیث کی تفصیل کا مقام تو سترہ اور نمازِ وتر ہے، البتہ چونکہ سواری پر یا اونٹنی پر نماز کے سلسلے میں احادیث قریب ہی گزری ہیں، لہٰذا اونٹنی کو سترہ بنا کر نماز پڑھنے کے بارے میں بھی صرف ایک حدیث ذکر کر دیتے ہیں، جو صحیح بخاری میں حضرت نافع رحمہ اللہ سے مروی ہے:

«رَأَيْتُ ابْنَ عُمَرَ يُصَلِّي إِلَىٰ بَعِيرِهِ، وَقَالَ: رَأَيْتُ النَّبِيَّ ﷺ يَفْعَلُهُ»[1]

”میں نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کو دیکھا کہ وہ اونٹ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھ رہے تھے اور انھوں نے کہا کہ میں نے دیکھا ہے کہ نبیِ اکرم ﷺ ایسے ہی نماز پڑھ لیا کرتے تھے۔“

ایک روایت میں ہے:

«إِنَّهُ كَانَ يُعْرِضُ رَاحِلَتَهُ فَيُصَلِّي إِلَيْهَا»[2]

”آپ ﷺ اپنی اونٹنی سامنے بٹھا لیتے اور اسے سترہ بنا کر نماز پڑھ لیتے تھے۔“

ایسے ہی اونٹ پر بیٹھ کر نبیِ اکرم ﷺ کا وتر پڑھنا بھی ثابت ہے، جیسا کہ صحیحین وسننِ اربعہ اور مسند احمد میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے:

«إِنَّ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ أَوْتَرَ عَلَىٰ بَعِيرِهِ»[3]

”نبیِ اکرم ﷺ نے اپنی اونٹنی پر سوار ہو کر نماز وتر پڑھی۔“

یہاں یہ بھی ذکر کر دیں کہ بکریوں کے باڑوں میں جو نماز کے جواز پر دلالت کرنے والی احادیث ہیں، جن میں بعض ہم ذکر کر چکے ہیں، ان میں صرف بکریوں ہی کا ذکر آیا ہے، جب کہ بھیڑیں بھی چونکہ انہی کے قبیل سے ہیں، لہٰذا ان کا یا ان کے باڑوں کا حکم بھی وہی ہوگا، جو بکریوں کا ہے۔ امام ابن المنذر رحمہ اللہ نے تو یہ بھی ذکر کیا ہے کہ اس معاملے میں گائے کا حکم بھی وہی ہے جو

---

[1] صحيح البخاري مع الفتح (١/ ٥٢٧، ٥٨٠)

[2] صحيح البخاري مع الفتح (١/ ٥٨٠)

[3] صحيح البخاري مع الفتح، رقم الحديث (٩٩٩) صحيح مسلم مع شرح النووي (٣/ ٥/ ٢١٠) صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (١٠٨٣) صحيح سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٩٣) صحيح سنن النسائي، رقم الحديث (١٥٩٤) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٢٠٠) صحيح الجامع، رقم الحديث (٥٠٢٣) المنتقىٰ مع نيل الأوطار (٢/ ٣/ ٢٥٨)

(بھیڑ) بکری کا ہے اور ظاہر ہے کہ گائے اور بھینس کا حکم ایک ہے۔ لہٰذا وہ بھی بھیڑ، بکریوں کے حکم ہی میں شامل ہوں گی۔ البتہ مسند احمد میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ایک حدیث میں ہے:

«إِنَّ النَّبِيَّ ﷺ كَانَ يُصَلِّيْ فِيْ مَرَابِضِ الْغَنَمِ وَلَا يُصَلِّيْ فِيْ مَرَابِضِ الْإِبِلِ وَالْبَقَرِ»[1]

''نبیِ اکرم ﷺ بکریوں کے باڑوں میں نماز پڑھ لیا کرتے تھے، لیکن اونٹوں اور گایوں کے باڑوں میں نماز نہیں پڑھا کرتے تھے۔''

اگر یہ حدیث ثابت و صحیح ہو تو اس سے پتا چلتا ہے کہ گائے (اور بھینس) اونٹ کے حکم میں ہیں کہ ان کے باڑوں میں نماز پڑھنا جائز نہیں۔ لیکن حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے فتح الباری میں لکھا ہے کہ یہ حدیث اس سند کے اعتبار سے ضعیف ہے، لہٰذا یہ قابلِ حجت نہیں ہے۔[2]

اس طرح گائے بھینس کو اونٹ کے حکم میں داخل کرنے کا جواز نہیں بنتا، بلکہ اس حدیث کے کسی دوسری سند سے ثابت ہونے تک گائے، بھینس کا حکم بھیڑ، بکری ہی کا رہے گا، کیونکہ جواز ہے اور جب حافظ ابن حجر رحمہ اللہ جیسے علمِ حدیث کے بحرِ زخّار و موّاج کو اس حدیث کی کوئی دوسری سند نہیں ملی، جس سے اس کا ضعف منجبر ہو اور یہ حکم کم از کم حسن کے پایہ یا درجے ہی کو پہنچ جائے تو کسی دوسرے کو ایسی سند کا ملنا محال نہ سہی مشکل ضرور نظر آتا ہے۔

مقاماتِ عذاب پر نماز کی کراہت:

جس طرح ان مختلف مقامات پر نماز پڑھنے کی ممانعت آئی ہے، ایسے ہی مقاماتِ عذاب کے بارے میں بھی پتا چلتا ہے کہ وہاں نماز نہیں پڑھنی چاہیے۔ جن جگہوں پر اللہ کا عذاب نازل ہوا ہو، ان مقاماتِ عذاب پر نماز پڑھنا تو الگ رہا وہاں تو رکنا بھی صحیح نہیں۔ نہ وہاں کے کنویں یا تالاب سے پانی پینا چاہیے، بلکہ ایسی جگہ سے جلدی جلدی گزر جانے کا حکم ہے۔ ایسے مقامات پر رُکنے اور رہائش پذیر و سکونت اختیار کرنے کی ممانعت کا اشارہ تو قرآنِ کریم سے بھی ملتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے زجر و توبیخ کرنے اور ڈانٹ پلانے کے انداز میں ارشاد فرمایا ہے:

---

[1] فتح الباري (١/ ٥٢٧)

[2] فتح الباري (١/ ٥٢٧)

﴿وَ سَكَنْتُمْ فِيْ مَسٰكِنِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْۤا اَنْفُسَهُمْ وَ تَبَيَّنَ لَكُمْ كَيْفَ فَعَلْنَا بِهِمْ وَ ضَرَبْنَا لَكُمُ الْاَمْثَالَ﴾ [ابراھیم: ٤٥]

''اورتم انہی بستیوں میں آباد وسکونت پذیر ہوگئے ہو جنھوں نے اپنے آپ پر ظلم کیا اور یہ بات تم پر روشن ہو چکی ہے کہ ہم نے ان کے ساتھ کیا سلوک کیا (عذاب بھیج کر) اور ہم نے تمہارے سامنے ان کے تمام واقعات بیان بھی کر دیے ہوئے ہیں۔''

تفسیر کبیر رازی میں ہے کہ ان کے گناہوں کی سزا میں ہم نے ان پر جو عذاب نازل کیے، وہ سب تم کو معلوم ہو چکے تھے مگر تم زبان سے اقرار نہیں کرتے تھے۔[1]

کتابوں اور پیغمبروں کی زبانی ان کے واقعاتِ عذاب تمھیں بتا دیے گئے ہیں، لیکن تب بھی تمھیں عبرت نہ ہوئی۔ مولانا محمود الحسن رحمہ اللہ اور شبیر احمد عثمانی رحمہ اللہ کے مشترکہ حاشیہ وتفسیری فوائد میں علامہ عثمانی نے اس آیت کے حاشیے میں لکھا ہے کہ تمھارے پچھلے ان ہی بستیوں میں یا ان کے آس پاس آباد ہوئے، جہاں اگلے ظالم سکونت رکھتے تھے اور ان کی عادات و اطوار اختیار کیں، حالانکہ تاریخی روایات اور متواتر خبروں سے ان پر روشن ہو چکا تھا کہ ہم اگلے ظالموں کو کیسی سزا دے چکے ہیں ہم نے اممِ ماضیہ کے یہ قصے کتبِ سماویہ میں درج کر کے انبیاء علیہم السلام کی زبانی ان کو آگاہ بھی کر دیا تھا، مگر انھیں ذرہ بھی عبرت نہ ہوئی۔ اسی سرکشی، عناد اور عداوتِ حق پر اڑے رہے:

﴿حِكْمَةٌ بَالِغَةٌ فَمَا تُغْنِ النُّذُرُ﴾ [القمر: ٥][2]

''ایسی حکمت جو نصیحت کے مقصد کو بدرجۂ اتم پورا کرتی ہے، مگر تنبیہات ان پر کارگر نہیں ہوتیں۔''

گویا سورت ابراہیم کی اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کو سرزنش کی ہے اور ڈانٹ پلائی ہے جو ان بستیوں میں سکونت پذیر ہوئے، جن پر ان کے ظلم کی پاداش میں اللہ تعالیٰ نے عذاب نازل کیے تھے۔ ایسے ہی حدیث شریف میں بھی مقاماتِ عذاب کے بارے میں ایسی ہی تعلیمات ملتی ہیں۔ چنانچہ صحیح بخاری و مسلم اور مسند احمد میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب غزوہ تبوک کے لیے جا رہے تھے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم بھی تھے تو راستے میں قومِ ثمود

---

[1] أشرف الحواشي ، فوائد سلفيه، مولانا محمد عبدہٗ

[2] تفسير فوائد و حاشيه مولانا محمود الحسن وعلامه عثماني، طبع ورز برگ جرمني ١٩٧٥ء باهتمام دارالتصنيف شاهراه لياقت كراچی.

کا علاقہ حجرِ ثمود (مدائن صالح علیہ السلام) آیا تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم سے مخاطب ہو کر فرمایا:

«لَا تَدْخُلُوْا عَلٰى هٰؤُلَآءِ الْمُعَذَّبِيْنَ إِلَّا أَنْ تَكُوْنُوْا بَاكِيْنَ فَإِنْ لَّمْ تَكُوْنُوْا بَاكِيْنَ فَلَا تَدْخُلُوْا عَلَيْهِمْ لَا يُصِيْبُكُمْ مَا أَصَابَهُمْ»[1]

''تم ان عذاب کے مارے لوگوں کے علاقے میں روتے ہوئے داخل ہونا اور اگر روتے ہوئے داخل نہیں ہو سکتے تو پھر وہاں داخل ہی نہ ہونا، تاکہ کہیں تم بھی اسی عذاب میں مبتلا نہ کر دیے جاؤ، جو ان پر نازل کیا گیا تھا۔''

بخاری شریف کی ''كتاب المغازي: باب نزول النبي ﷺ الحجر'' والی روایت میں یہ الفاظ بھی ہیں:

«ثُمَّ قَنَّعَ رَأْسَهٗ وَأَسْرَعَ السَّيْرَ حَتّٰى أَجَازَ الْوَادِيْ»[2]

''نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے (مذکورہ الفاظ ارشاد فرمانے کے بعد) اپنا سر منہ باندھ لیا اور رفتار تیز کر لی، یہاں تک کہ وادیِ حجر (مدائن صالح علیہ السلام) کو عبور کر لیا۔''

ان الفاظِ حدیث سے پتا چلتا ہے کہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم وہاں سے تیزی کے ساتھ گزر گئے۔ صحیح بخاری میں بئر ثمود کے بارے میں مذکور ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا پانی پینے سے منع فرمایا، جیسا کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے الفاظ ہیں:

«لَمَّا نَزَلَ الْحِجْرَ أَمَرَهُمْ أَنْ لَّا يَشْرَبُوْا»[3]

''جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم وادیِ حجر (مدائن صالح علیہ السلام) میں داخل ہوئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو حکم فرمایا کہ وہاں سے پانی مت پییں۔''

اسی سلسلے میں قومِ ثمود کا علاقہ یا وادیِ حجر (مدائن صالح علیہ السلام) سے متعلق حدیثِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم بھی ذکر کی جا چکی ہے، جس سے امام بخاری رحمہ اللہ نے یہ مسئلہ اخذ کیا ہے کہ ایسے مقامات پر نماز نہیں پڑھنی چاہیے، جیسا کہ اس حدیث پر ان کی تبویب ''باب الصلاة في مواضع الخسف والعذاب'' (۱/ ۵۳۰) سے پتا چلتا ہے۔

---

[1] صحيح البخاري مع الفتح (۱/ ۵۳۰ و ۸/ ۳۸۱) مختصر مسلم للمنذري، رقم الحديث (۱۸۳٤)

[2] صحيح البخاري مع الفتح (۸/ ۱۲۵)

[3] صحيح البخاري مع فتح الباري (۷۳۱/۷)

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ نبیِ اکرم ﷺ وادیِ حجر (مدائن صالح علیہ السلام) میں رکے ہی نہیں، جیسا کہ کتاب المغازی والی حدیث کے الفاظ سے پتا چلتا ہے تو آپ ﷺ کا وہاں نہ رکنا اس بات کی دلیل ہے کہ آپ ﷺ نے وہاں نماز بھی نہیں پڑھی۔

جس طرح اس واقعہ میں ہے کہ نبیِ اکرم ﷺ وادیِ حجر (مدائن صالح علیہ السلام) سے سر منہ باندھے جلدی جلدی آگے نکل گئے، بالکل اسی طرح آپ ﷺ نے حجۃ الوداع کے موقع پر وادیِ محسّر سے گزرتے وقت کیا تھا، کیونکہ محسّر وہ وادی ہے جہاں خانہ کعبہ کو گرانے کی نیتِ بد سے آنے والے ابرہہ کافر اور اس کے لشکر پر اللہ تعالیٰ کا عذاب نازل ہوا تھا اور ابابیلوں کی کنکریوں نے پورے لشکر کو کھائے ہوئے بھوسے کی مانند ریزہ ریزہ کر دیا تھا، جس کی تفصیل تیسویں پارے کی سورت فیل کی تفسیر میں دیکھی جا سکتی ہے۔

حجۃ الوداع کے موقع پر جب آپ ﷺ مزدلفہ سے منیٰ کی طرف چلے اور وادیِ محسّر سے گزرنے لگے تو وہاں سے جلدی سے نکل گئے، جیسا کہ صحیح مسلم، سنن ابو داود، ابن ماجہ، دارمی، بیہقی، منتقیٰ ابن جارود اور مستخرج ابو نعیم میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ کے الفاظ ہیں:

«حَتّٰى أَتَىٰ بَطْنَ مُحَسِّرٍ فَحَرَّكَ قَلِيْلًا»[1]

''یہاں تک کہ آپ ﷺ وادیِ محسّر میں آئے تو وہاں سے تھوڑا تیزی کے ساتھ آگے (منیٰ کو) نکل گئے۔''

یاد رہے کہ یہ وادیِ محسّر چونکہ مشاعرِ حج کے مابین واقع ہے، جہاں سالانہ لوگوں کی آمد ورفت ہوتی ہے، لہٰذا سعودی حکومت نے اس وادی تک جانے والے راستوں کے آغاز و انتہا پر باقاعدہ شناختی بورڈ یا سنگِ میل نصب کر رکھے ہیں، تاکہ حجاج یا عام زائرین بہ آسانی شناخت کر سکیں کہ یہاں سے وادیِ محسّر شروع ہو رہی ہے، ایامِ حج میں ہم ہر سال اپنے ریڈیو پروگرام ''سوئے حرم'' میں اس بات کی یاد دہانی بھی کرواتے رہے ہیں، کیونکہ بعض لوگ اس وادی میں رات کو ڈیرہ ڈال دیتے ہیں، حالانکہ وہاں سے تو جلدی جلدی نکل جانے کا حکم ہے، جیسا کہ صحیح مسلم اور دیگر کتبِ حدیث والی اس حدیث سے سنتِ نبوی ﷺ کا پتا چل رہا ہے جو ابھی ہم نے ذکر کی ہے۔ وہاں رات گزارنے والے ظاہر

[1] صحيح مسلم مع شرح النووي (٤/ ٨/ ١٩٠) صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (١٦٧٦) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٣٠٧٤)

ہے کہ نمازِ مغرب وعشا اور فجر تین نمازیں بھی اسی وادی میں پڑھتے ہیں۔ جس میں اصحاب الفیل پر اللہ کا عذاب نازل ہوا تھا، جو دوسری لیکن پہلی سے بڑی غلطی ہے۔

ان دو وادیوں یعنی قومِ ثمود کی وادیِ حجر (مدائن صالح علیہ السلام) اور اصحاب الفیل والی وادیِ محسّر کے علاوہ اس سلسلے میں ایک ارضِ بابل کی وہ جگہ بھی ہے، جس کے بارے میں مفسّرین کرام اور مورخینِ اسلام نے لکھا ہے کہ نمرود بن کنعان نے بابل میں ایک ایسی فلک بوس عمارت تعمیر کروائی جس کی اونچائی پانچ ہزار ہاتھ تھی، اللہ تعالیٰ نے نمرود اور اس کے پیروکاروں کو اس عمارت سمیت نہ صرف زمین بوس کیا، بلکہ زمین ہی میں دھنسا دیا تھا۔ اس واقعہ کی تفصیل سورت نحل آیت ۲۶ اور سورت ابراہیم آیت ۴۵ کی تفسیر میں دیکھی جاسکتی ہے، جہاں اللہ تعالیٰ نے پہلے مشرکوں اور متکبروں کا تذکرہ فرمایا ہے اور پھر سورت نحل میں فرمایا ہے:

﴿فَاَتَى اللّٰهُ بُنْيَانَهُمْ مِّنَ الْقَوَاعِدِ فَخَرَّ عَلَيْهِمُ السَّقْفُ مِنْ فَوْقِهِمْ وَ اَتٰهُمُ الْعَذَابُ مِنْ حَيْثُ لَا يَشْعُرُوْنَ﴾ [النحل: ٢٦]

''اللہ نے ان کی عمارت کی بنیادوں سے خبر لی اور دھڑ دھڑا کر اوپر سے ان پر چھت آ گری اور جدھر سے انھیں خیال بھی نہ تھا، ادھر سے عذاب آ پہنچا۔''

زمین میں دھنسائے جانے والوں میں سے ہی قارون بھی تھا، جس کا واقعہ اور تذکرۂ دولت قرآنِ کریم، سورت قصص میں مذکور ہے، جہاں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿خَسَفْنَا بِهٖ وَ بِدَارِهِ الْاَرْضَ﴾ [القصص: ٧٦ تا ٨٨]

''ہم نے اسے اور اس کے گھر کو زمین میں دھنسا دیا۔''[1]

ایسے ہی سورۂ عنکبوت کی آیت ۳۸، ۳۹ اور ۴۰ کی تفسیر بھی دیکھیں، وہاں بھی اللہ تعالیٰ نے قومِ عاد وثمود اور قارون وفرعون و ہامان کا ذکر کر کے فرمایا کہ ان میں سے بعض پر ہم نے پتھراؤ کیا اور بعض پر چنگاڑ کا عذاب بھیجا اور بعض کو زمین میں دھنسا دیا اور ان میں سے بعض کو ہم نے غرق کر دیا۔ یہ تو معذّبین میں سے بعض کا اشاراتی تذکرہ ہوا، جب کہ مقاماتِ عذاب پر نماز کی کراہت جو ہمارا اصل موضوع ہے، اس سلسلے میں صحیح بخاری میں تعلیقاً اور مصنف ابن ابی شیبہ میں موصولاً مروی

[1] فتح الباري (١/ ٥٣٠) تفسير القرطبي (٤/ ٩/ ٢٥٠، ١٠/ ٦٥) اور دیگر تفاسیر ملاحظہ فرمائیں۔

ہے، جس میں عبداللہ بن ابو المُحِلّ رحمہ اللہ بیان کرتے ہیں:

”كُنَّا مَعَ عَلِيٍّ فَمَرَرْنَا عَلَى الْخَسَفِ الَّذِيْ بِبَابِلَ فَلَمْ يُصَلِّ حَتّٰى أَجَازَهُ“

”حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ ہمارا گزر بابل کے اس مقام سے ہوا، جہاں (نمرود کے محل کو) دھنسانے کا واقعہ رونما ہوا تھا تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے وہاں نماز نہیں پڑھی، یہاں تک کہ وہاں سے آگے نہ نکل گئے۔“

یہ تو راوی کا بیان ہے، جب کہ مصنف ابن ابی شیبہ ہی میں ایک دوسرے طریق سے خود حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ارشاد گرامی بھی مروی ہے:

”مَا كُنْتَ لَأُصَلِّيْ فِيْ أَرْضٍ خَسَفَ اللّٰهُ بِهَا“[1]

”میں اس زمین پر نماز پڑھنے والا نہیں ہوں، جہاں اللہ تعالیٰ نے (مجرموں متکبروں کو) زمین میں دھنسا دیا تھا۔“

یہ الفاظ انھوں نے تین مرتبہ دہرائے، جب کہ سنن ابی داود میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ارشاد ایک دوسرے انداز سے بھی مروی ہے، جس میں وہ فرماتے ہیں:

«نَهَانِيْ حَبِيْبِيْ عَلَيْهِ السَّلَامُ... أَنْ أُصَلِّيْ فِيْ أَرْضِ بَابِلَ فَإِنَّهَا مَلْعُوْنَةٌ»[2]

”مجھے میرے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے منع فرمایا ہے کہ میں ارضِ بابل پر نماز پڑھوں، کیونکہ وہ تو ملعون مقام ہے۔“

لیکن یہ حدیث امام خطابی اور حافظ ابن حجر رحمہ اللہ اور دیگر محدّثینِ کرام کے بقول ضعیف ہے۔[3] لہٰذا یہ قول قابلِ استدلال نہیں، البتہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما والی مرفوع احادیث اور حضرت علی رضی اللہ عنہ والے موقوف آثار سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ مقاماتِ عذاب پر نماز نہیں پڑھنی چاہیے۔ امام خطابی رحمہ اللہ نے اس حدیث کا ضعف ذکر کرنے کے بعد لکھا ہے:

”مجھے اہلِ علم میں سے کسی کا پتا نہیں جو ارضِ بابل میں نماز پڑھنے کو حرام قرار دیتا ہو۔ موصوف کا یہ قول ان کے اپنے علم کی حد تک ہے، جب کہ ہم نے جو تفصیل ذکر کی ہے، اس سے

---

[1] فتح الباري (١/ ٥٣٠)

[2] سنن أبي داود مع العون (٢/ ١٥٦) فتاویٰ ابن تیمیة (٢٢/ ١٥٨)

[3] التلخيص الحبير (١/ ١/ ٢٧٧)

حرمت نہیں تو کم از کم کراہت کا پتا چل رہا ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ ہر ممکن کوشش کرکے ایسے مقاماتِ عذاب پر نماز ادا کرنے سے گریز کیا جائے تو یہی بہتر ہے۔''[1]

سنن ترمذی و ابن ماجہ، مسند عبد بن حمید اور معانی الاثار طحاوی میں ایک روایت ہے، جس میں سات مقامات پر نماز پڑھنے کی ممانعت آئی۔ چنانچہ اس میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں:

«إِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ نَهٰى أَنْ يُّصَلّٰى فِيْ سَبْعَةِ مَوَاطِنَ فِي الْمَزْبَلَةِ وَالْمَجْزَرَةِ وَالْمَقْبُرَةِ وَقَارِعَةِ الطَّرِيْقِ وَفِي الْحَمَّامِ وَفِيْ أَعْطَانِ الْإِبِلِ وَفَوْقَ ظَهْرِ بَيْتِ اللّٰهِ»[2]

''نبی اکرم ﷺ نے سات جگہوں پر نماز پڑھنے سے منع فرمایا: ① کوڑا کرکٹ پھینکنے کی جگہ (روڑی پر) ② کمیلے اور بچڑ خانے میں ③ قبرستان میں ④ عام گزرگاہ یا چلتی راہ میں ⑤ حمام میں ⑥ اونٹوں کے تھانوں (باڑوں) میں ⑦ اور خانہ کعبہ کی چھت پر۔''

اس حدیث کو ''المنتقیٰ'' میں نقل کرکے ابو البرکات المجد ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے بھی امام ترمذی کا قول نقل کیا ہے کہ اس حدیث کی سند قوی نہیں ہے۔ اس کے ایک راوی زید بن جبیرہ کی یادداشت میں کلام ہے۔ یہی حدیث لیث بن سعد نے عبداللہ بن عمر العمری عن نافع عن ابن عمر عن النبی ﷺ کی سند سے بھی بیان کی ہے، لیکن اس لیث بن سعد والی حدیث سے تو ابن عمر والی حدیث جو زید، داود اور نافع کی سند والی ہے، وہ اچھی اور زیادہ صحیح ہے۔ عمری کو بھی بعض محدّثین نے حافظے کے اعتبار سے ضعیف قرار دیا ہے، جب کہ امام الحرمین جوینی اور ابن سکن نے اسے صحیح کہا ہے۔ شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے اپنے فتاویٰ میں اسے نقل کرکے اس پر کوئی خاص رد و قدح نہیں کی، جس سے ان کا رجحان بھی اس حدیث کے کسی درجہ قوی ہونے کی طرف ہی لگتا ہے، لیکن اکثر محدّثین اس کے ضعف کی طرف ہی گئے ہیں۔

لہٰذا یہ روایت پایہ ثبوت و استدلال کو نہیں پہنچتی، البتہ اس میں جن سات مقامات کا ذکر آیا ہے، ان میں سے قبرستان، حمام اور اونٹوں کے باڑوں کا ذکر دوسری احادیث کے حوالے سے آچکا

[1] المغني لابن قدامة (٢/ ٤٧٧، ٤٧٨) تحقيق التركي

[2] سنن الترمذي مع التحفة (٢/ ٣٢٣، ٣٢٤) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٧٢٦) المنتقىٰ مع نيل (١/ ٢/ ١٣٨) فتاویٰ ابن تيمية (٢٢/ ١٥٨)

ہے۔ رہی کوڑا کرکٹ ڈالنے کی جگہ تو وہ اور کمیلہ یا بچڑ خانہ دونوں نجاست کی جگہیں ہیں، جہاں کسی حائل کے بغیر نماز پڑھنا تو بالاتفاق حرام ہے اور اگر نجاست اور نمازی کے مابین کوئی چیز حائل ہو تو پھر وہاں جواز اور عدمِ جواز میں اہلِ علم کے مابین اختلاف پایا جاتا ہے۔ بچڑ خانے کو جنوں کا اڈہ بھی کہا گیا ہے اور عام گزر گاہ یا چلتے راستے میں نماز کی ممانعت کے بارے میں ایک اور حدیث بھی ہے، جس میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں:

«نَهٰى أَنْ يُّصَلّٰى عَلٰى قَارِعَةِ الطَّرِيْقِ أَوْ يُضْرَبُ الْخَلَاءُ عَلَيْهَا أَوْ يُبَالَ فِيْهَا»[1]

''عام گزرگاہ پر نماز پڑھنے اور اس پر پیشاب یا پاخانہ کرنے سے منع کیا گیا ہے۔''

لیکن اس طریق میں ایک راوی ابن لہیعہ ہے، جو خرابیِ یادداشت کی وجہ سے ضعیف ہے۔ باقی تمام راوی ثقہ ہیں۔ راستے میں نماز پڑھنے کی ممانعت کی کئی حکمتیں بیان کی گئی ہیں، ان میں سے ایک یہ ہے کہ نمازی کو دلجمعی نہیں ملتی جو خشوع وخضوع کو مانع ہے، حالانکہ یہ نماز کا اہم جزو ہے۔ بیت اللہ کی چھت پر پڑھی گئی نماز کے بارے میں کہتے ہیں کہ وہ تو بیت اللہ کے اوپر پڑھی گئی نہ کہ بیت اللہ کی طرف منہ کر کے، جب کہ امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک اگر نمازی کے سامنے دو تہائی ہاتھ کے بقدر بیت اللہ کی عمارت کا حصہ آ جائے تو نماز ہو جائے گی اور امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک ایسی بھی کوئی شرط نہیں، کیونکہ چھت پر نماز پڑھنے والا ایسے ہی ہوگا کہ گویا وہ فضا میں نماز پڑھ رہا ہے اور بیت اللہ کی فضا کی طرف ہی منہ کیے ہوئے ہے۔

چھبیس مقامات پر نماز:

بہرحال قاضی امام ابن العربی، علامہ حافظ زین الدین عراقی اور بعض دیگر اہلِ علم نے چھبیس ایسے مقامات گنوائے ہیں، جہاں نماز کی ممانعت ہے۔ جن میں سے بعض ہم بادلائل ذکر کر چکے ہیں اور اب آیئے ان سب مقامات کا اجمالی تذکرہ بھی کر دیں۔ چنانچہ امام ابو بکر ابن العربی نے ''عارضة الأحوذي'' میں تیرہ مقامات ذکر کیے ہیں، جن میں سے سات تو اس حدیث والے ہیں:

1. کوڑا کرکٹ پھینکنے کی جگہ یا روڑی۔
2. کمیلہ ومذبح یا بچڑ خانہ۔

---

[1] إرواء الغليل (١/ ٣١٩)

3 قبرستان۔

4 عام گزرگاہ یا چلتی راہ۔

5 حمام۔

6 اونٹوں کے باڑے۔

7 خانہ کعبہ کی چھت۔

ان سات مقامات کے بعد جن جگہوں کا تذکرہ امام ابن العربی نے کیا ہے، ان میں سے:

8 قبرستان یا مقبرہ کی طرف منہ کرکے نماز پڑھنا۔

9 پاخانہ گاہ یا لیٹرین کی نجاست بھری دیوار کی طرف منہ کرکے نماز پڑھنا۔

10 چرچ میں۔

11 یہودیوں کے معبد میں۔

12 تماثیل وتصاویر کی طرف منہ کرکے نماز پڑھنا۔

13 دار العذاب یا مقامِ عذاب میں۔

ان تیرہ مقامات پر حافظ عراقی نے مزید چھے مقامات کا اضافہ کیا ہے، جس سے یہ انیس ہو جاتے ہیں، لہٰذا حافظ عراقی والے مقامات سمیت:

14 کسی کے جبراً غصب کیے ہوئے گھر میں نماز پڑھنا۔

15 کسی سوئے ہوئے کی طرف منہ کرکے یا کسی باتیں کرنے والے شخص کی طرف منہ کرکے نماز پڑھنا۔

16 کسی وادی کے بطن میں نماز پڑھنا۔

17 کسی کی جبراً غصب کی ہوئی زمین پر نماز پڑھنا۔

18 مسجد ضرار میں نماز پڑھنا۔

19 تنور کی طرف منہ کرکے نماز پڑھنا۔

علامہ ابن حزم رحمہ اللہ نے ان انیس پر دو اور مقامات کا اضافہ کیا ہے، اس طرح وہ اکیس ہوں گے جن میں سے:

20 وہ مسجد جس میں اللہ تعالیٰ یا اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم یا کسی بھی دینی امر کا مذاق اڑایا جاتا ہو۔

21 وہ جگہ جہاں ان تینوں میں سے کسی کے ساتھ کفر کیا جاتا ہو۔

اہلِ یمن میں سے ہادوی مکتبِ فکر کے علما نے ان اکیس پر مزید تین مقامات شمار کیے ہیں، جن کو شامل کرنے سے چوبیس ہو جاتے ہیں۔ جن میں سے:

22 بدعتی یا بے وضو شخص کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنا۔

فاسق (کبیرہ گناہوں کے مرتکب) کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنا۔

23 چراغ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنا۔

سادات میں سے امام یحییٰ رحمہ اللہ نے ان کے علاوہ مزید دو مقام گنوائے ہیں، جن کو شمار کرنے سے کل چھبیس مقامات ہو گئے۔ ان میں سے:

24 جنابت والے مرد و زن کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنا۔

25 حائضہ عورت کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنا۔[1]

سابقہ اوراق میں ہم نے امام ابن العربی، حافظ عراقی، علامہ ابن حزم، ہادوی مکتب فکر اور سادات کے ایک عالم امام یحییٰ رحمہ اللہ کے حوالے سے چھبیس ایسے مقامات ذکر کیے ہیں، جہاں نماز پڑھنے کو ممنوع قرار دیا گیا ہے، جن میں سے گیارہ مقامات ایسے ہیں جن کے بارے میں ہم پہلے قدرے تفصیل سے ذکر کر چکے ہیں کہ بعض جگہوں پر نماز پڑھنا ممنوع ہے، بعض پر مکروہ اور بعض پر بعض شرطوں کے ساتھ جائز ہے مثلاً:

1 قبرستان۔

2 حمام۔

3 اونٹوں کے باڑے میں نماز پڑھنا ممنوع و مکروہ ہے۔ ایسے ہی:

4 قبرستان یا مقبرہ کی طرف منہ کر کے

5 تصاویر و تماثیل کی طرف منہ کر کے اور

6 دار العذاب یا مقامِ عذاب پر نماز پڑھنا، اسی طرح:

7 مسجدِ ضرار میں نماز پڑھنا بھی جائز نہیں ہے۔

---

[1] دیکھیں: نيل الأوطار (۲/۱/ ۱۳۹، ۱٤۰) تحفة الأحوذي (۲/ ۳۲٦، ۳۲۷) عارضة الأحوذي (۱/ ۲/ ۱۱٤، ۱۱۵)

8 عیسائیوں کے گرجا اور

9 یہودیوں کے معبد میں اگر تصویریں بنی ہوں یا ثابت ہو جائے کہ وہ کسی نبی یا نیک آدمی کی قبر پر بنائے گئے ہیں تو وہاں بھی نماز جائز نہیں۔ اگر ایسا نہ ہو اور وہاں سے نکل کر نماز پڑھنا ممکن نہ ہو تو وہاں نماز جائز ہو جائے گی، جب کہ تصاویر و تماثیل کے سامنے نماز کی ممانعت پر اس صحیح حدیث سے بھی استدلال کیا جا سکتا ہے، جو بخاری و مسلم، سنن نسائی، موطا امام مالک اور مسند احمد میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے، جس میں وہ بیان کرتی ہیں کہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے میرے یہاں ایک پردہ دیکھا، جس پر تصویریں بنی تھیں تو اسے دیکھ کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا رنگ غصے سے بدل گیا اور فرمایا:

''اے عائشہ! قیامت کے دن سب سے زیادہ عذاب ان لوگوں کو ہوگا جو (تصویر سازی کر کے) اللہ سے مقابلہ کرتے ہیں۔''[1]

ایک روایت میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز پڑھی تو فرمایا:

«أَزِيْلِيْ عَنِّيْ قِرَامَكِ هٰذَا فَإِنَّهٗ لَا تَزَالُ تَصَاوِيْرُهٗ تَعْرِضُ لِيْ فِيْ صَلَاتِيْ»[2]

''اپنا یہ پردہ یہاں سے ہٹا دو، کیونکہ اس کی تصویریں میری نماز میں سامنے آتی رہی ہیں۔''

10، 11 تنور اور چراغ:

تنور اور چراغ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنا، دراصل ایک ہی بات ہے، جو آگ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنے والے آتش پرستوں سے مشابہت کی وجہ سے ممنوع ہے، لیکن اگر غیر اختیاری طور پر کہیں نماز پڑھنی پڑ جائے اور نمازی کے دل میں فقط رب ذوالجلال والاکرام کی عبادت کرنے کا پختہ عقیدہ ہو تو ان جگہوں پر بھی اس ناچاری کی شکل میں اور مذکورہ صورت میں نماز ہو جائے گی۔[3]

12، 13 روڑی اور کمیلہ:

اب رہی کوڑا کرکٹ پھینکنے کی جگہ یا روڑی اور کمیلہ تو یہ دونوں جگہیں ایسی ہیں جہاں نجاست

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٩٥٤) صحيح مسلم مع شرح النووي (٧/ ١٤/ ٨٨) صحيح سنن النسائي، رقم الحديث (٤٩٤٩) صحيح الجامع، رقم الحديث (٩٩٧)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٧٤ و ٥٩٥٩) صحيح الجامع، رقم الحديث (١٤٠٥)

[3] و انظر ايضاً المغني (٢/ ٤٦٨، ٤٨٠)

ہوتی ہے، جس کی وجہ وہاں نماز پڑھنا منع ہے، جب کہ بچڑ خانے کے بارے میں سے تو یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ شیطانوں کا ڈیرہ ہوتا ہے۔

14 عام گزرگاہ:

عام گزرگاہ یا چلتی راہ پر نماز کی ممانعت دو حدیثوں یا طُرق میں وارد ہوئی ہے۔ اگرچہ ان میں سے کوئی بھی کلام سے خالی نہیں۔ دلجمعی و خشوع کی خاطر چلتے راستے سے تھوڑا ہٹ کر نماز ادا کرنے میں ہی احتیاط ہے۔

15 خانہ کعبہ کی چھت:

خانہ کعبہ کی چھت پر نماز کا ذکر بھی آیا ہے، جب کہ وہ حدیث ضعیف ہے۔ اس لیے ائمہ وفقہا کے مابین اس بارے میں اختلاف ذکر کیا جا چکا ہے۔ طیارے یا ہوائی جہاز میں نماز کے سلسلے میں جو تفصیل ذکر کی جا چکی ہے، وہ ذہن میں رکھی جائے تو امام شافعی و ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہما والا مسلکِ جواز ہی اقرب لگتا ہے، لیکن خانہ کعبہ کی بے ادبی کے پیشِ نظر یہ جواز مع الکراہہ ہوگا۔

16 لیٹرین:

پاخانہ گاہ یا لیٹرین کی نجاست بھری دیوار کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنے کی ممانعت و کراہت کے بارے میں بعض مرفوع احادیث اور موقوف آثارِ صحابہ رضی اللہ عنہم و تابعین رحمہم اللہ وارد ہوئے ہیں، جیسا کہ الکامل لابن عدی میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ انھوں نے سات صحابہ رضی اللہ عنہم کے مابین کھڑے ہو کر فرمایا:

«نُهِيَ عَنِ الصَّلَاةِ فِي الْمَسْجِدِ تُجَاهَهُ حُشٌّ»[1]

''اس مسجد میں نماز منع ہے جس کے سامنے پاخانہ گاہ ہو۔''

لیکن اس حدیث کی سند کو حافظ عراقی نے غیر صحیح قرار دیا ہے اور مصنف ابن ابی شیبہ میں ہی مروی ہے کہ انھوں نے فرمایا:

«لَا يُصَلّٰى إِلٰى حُشٍّ»

''پاخانہ گاہ کی طرف منہ کر کے نماز نہیں پڑھی جائے گی۔''

اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں بھی مصنف ابن ابی شیبہ ہی میں مروی ہے کہ انھوں نے فرمایا:

[1] نیل الأوطار (١/ ٢/ ١٣٩)

«لَا یُصَلّٰی تُجَاہَ حُشٍّ»

''پاخانہ گاہ کی طرف منہ کر کے نماز نہیں پڑھی جائے گی۔''

حضرت ابراہیم نخعی تابعی رحمہ اللہ کا اثر بھی مصنف ابن ابی شیبہ میں یوں مروی ہے:

''کَانُوْا یَکْرَھُوْنَ ثَلَاثَۃَ أَشْیَاءَ'' [1] ''صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم تین چیزوں کو مکروہ سمجھتے تھے۔''

ان تین میں سے انھوں نے ایک پاخانہ گاہ بھی شمار کی۔

اگر پہلی حدیث صحیح سند سے ثابت ہوتی تو اس معاملے میں نص تھی، لیکن وہ چونکہ ضعیف ہے، لہٰذا فقہا کے مابین پاخانہ گاہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنے کی کراہت و عدمِ کراہت میں اختلاف پایا جاتا ہے، البتہ احتیاط کا تقاضا یہی ہے کہ مساجد کے حمام مسجد کے سامنے نہیں، بلکہ پیچھے کی جانب بنائے جائیں اور ایسا ہی ہوتا بھی ہے، البتہ اگر کہیں مسجد سے باہر کسی جگہ نماز پڑھنے کی نوبت آ جائے تو جانماز ایسی جگہ بچھائیں، جہاں سامنے (قبلے کی جانب) لیٹرین نہ آتی ہو۔[2]

17 غصب کی ہوئی زمین میں نماز:

کسی کے جبراً غصب کیے ہوئے گھر یا زمین پر نماز کی کراہت اس لیے شمار کی گئی ہے کہ اس نے غیر کے مال کو اس کی اجازت کے بغیر استعمال میں لے رکھا ہے۔[3]

غصب شدہ زمین پر تعمیر کی گئی مسجد میں نماز پڑھنے سے احتراز کیا جائے۔ اگر قریب دوسری کوئی مسجد نہ ہو تو ایسی متنازع مسجد میں نماز ہو جائے گی۔ علامہ ابن حزم رحمہ اللہ کا موقف یہ ہے کہ ایسی مسجد میں نماز نہیں ہوتی۔ لیکن دیگر محدّثینِ کرام رحمہم اللہ نے ان کے اس موقف سے اتفاق نہیں کیا۔[4]

18، 19 سوئے ہوئے یا باتیں کرتے ہوئے شخص کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنا:

سوئے ہوئے یا باتیں کرتے ہوئے شخص کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنے کی کراہت پر سنن ابو داود

---

1. نیل الأوطار (۱/ ۲/ ۱۳۶)
2. دیکھیں: المغني لابن قدامة (۲/ ٤٦٨، ٤٧٠)
3. دیکھیں: المغني (۲/ ٤٧٦، ٤٧٧)
4. دیکھیں: المحلی (۲/ ٤/ ۳۳) مسئلہ نمبر (۳۹٤) المغنی (۲/ ٤٧٦، ٤٧٧) و فتویٰ صادرة از دار الإفتاء جامعہ سلفیہ فصیل آباد در ھفت روزہ ''اھلحدیث'' (جلد: ۲۲، شمارہ: ٤٥، بابت ١٤/ جمادی الأولیٰ ١٤١٢ھ = ۲۲/ نومبر ۱۹۹۱ء)

و ابن ماجہ میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی مرفوع حدیث سے استدلال کیا جاتا ہے، جس میں مذکور ہے:

«لَا تُصَلُّوا خَلْفَ النَّائِمِ وَالْمُتَحَدِّثِ»[1]

''سوئے ہوئے اور باتیں کرتے ہوئے شخص کی طرف منہ کر کے نماز نہ پڑھو۔''

اس حدیث کی سند میں ایک راوی ایسا ہے، جس کا نام نہیں لیا گیا، لہٰذا بقول امام خطابی رحمہ اللہ اس مجہول العین راوی کی وجہ سے اس کی سند ضعیف و نا قابلِ استدلال ہے۔

باتیں کرنے والے ایسے ہی سونے والے کے پیچھے نماز پڑھنے کی کراہت پر اس حدیث سے بھی استدلال ممکن ہے، جس میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا بیان سنن ابو داود و ابن ماجہ، بیہقی، شرح السنۃ بغوی (تعلیقاً) اور مستدرک حاکم میں مرفوعاً مروی ہے:

«لَا تُصَلُّوا خَلْفَ النَّائِمِ وَلَا الْمُتَحَدِّثِ»[2]

''سوئے ہوئے اور باتیں کرنے والے کے پیچھے نماز نہ پڑھو۔''

ایسے ہی معجم طبرانی اوسط میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے بھی یہ مرفوعاً مروی ہے اور مصنف ابن ابی شیبہ میں یہ امام مجاہد سے بھی مرسلاً مروی ہے۔[3]

اس حدیث پر امام ابو داود نے، امام خطابی رحمہ اللہ نے معالم السنن میں، علامہ ذہبی رحمہ اللہ نے تلخیص المستدرک میں، علامہ ہیثمی رحمہ اللہ نے مجمع الزوائد میں، حافظ بیہقی رحمہ اللہ نے سنن کبریٰ میں اور حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے فتح الباری میں کلام کیا ہے۔[4]

جبکہ طُرق و شواہد کی بنا پر علامہ البانی رحمہ اللہ نے اسے صحیح اور کم از کم حسن قرار دیا ہے۔[5]

---

[1] سنن أبي داود مع العون (٢/ ٣٨٧، ٣٨٨) نيل الأوطار أيضاً، فتح الباري (١/ ٥٨٧) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٩٥٩)

[2] صحيح سنن أبي داود (١/ ١٣٤) صحيح سنن ابن ماجه (١/ ٥٨) إرواء الغليل (٢/ ٩٤) و حسنه، شرح السنة (٢/ ٤٦٣) صحيح الجامع (٧٣٤٩)

[3] مجمع الزوائد (١/ ٢/ ٦٥)

[4] دیکھیے: مجمع الزوائد (١/ ٢/ ٦٥) إرواء الغليل (١/ ٩٥، ٩٦) فتح الباري (١/ ٥٧٨) معالم السنن (١/ ١/ ١٦١)

[5] دیکھیں: الإرواء (٢/ ٩٤، ٩٧)

امام بخاری نے اپنی صحیح میں ایک باب قائم کیا ہے: ''باب الصلاة خلف النائم'' انھوں نے اس میں ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا بیان نقل کیا ہے، جو صحیح مسلم، سنن ابو داود، صحیح ابن خزیمہ اور مسند احمد میں بھی مروی ہے، جس میں وہ بیان فرماتی ہیں:

«كَانَ النَّبِيُّ ﷺ يُصَلِّي وَأَنَا مُعْتَرِضَةٌ عَلٰى فِرَاشِهٖ فَإِذَا أَرَادَ أَنْ يُّوْتِرَ أَيْقَظَنِي فَأَوْتَرْتُ»[1]

''نبیِ اکرم ﷺ نماز پڑھتے تھے، جبکہ میں آپ ﷺ کے بستر پر لیٹی (سوئی) ہوتی تھی۔ جب آپ ﷺ وتر پڑھنے لگتے تو مجھے بھی جگا دیتے اور میں بھی وتر پڑھ لیتی تھی۔''

''باب الصلاة إلى السرير'' میں بھی امام صاحب یہ حدیث لائے ہیں، جس میں ہے:

«لَقَدْ رَأَيْتُنِي مُضْطَجِعَةً عَلَى السَّرِيْرِ فَيَجِيْءُ النَّبِيُّ ﷺ فَيَوَسِّطُ السَّرِيْرَ فَيُصَلِّي»[2]

''نبیِ اکرم ﷺ میرے پاس تشریف لاتے جبکہ میں چارپائی پر لیٹی (سوئی) ہوتی تھی، تو نبیِ اکرم ﷺ چارپائی کے وسط (درمیان) میں نماز پڑھتے۔''

''باب من قال: لا يقطع الصلاة شيء'' میں ہے، جو صحیح مسلم، سنن ابن ماجہ، صحیح ابن خزیمہ، سنن دارمی، بیہقی، مسند طیالسی، شرح السنۃ، مصنف عبدالرزاق، موطا امام مالک اور مسند احمد میں بھی ہے:

«وَاللّٰهِ لَقَدْ رَأَيْتُ النَّبِيَّ ﷺ يُصَلِّي، وَأَنَا عَلَى السَّرِيْرِ بَيْنَهٗ وَبَيْنَ الْقِبْلَةِ»[3]

''واللہ میں نے نبیِ اکرم ﷺ کو نماز پڑھتے دیکھا، جبکہ میں آپ ﷺ اور قبلے کے درمیان چارپائی پر لیٹی ہوئی ہوتی تھی۔''

اس حدیث کے مختلف طُرق میں وارد ہونے والے الفاظ سے پتا چلتا ہے کہ نبیِ اکرم ﷺ نے سوئے ہوئے کے پیچھے نماز پڑھی ہے، لہٰذا اس حدیث اور ممانعت والی حدیث کے مابین کچھ تعارض سا پیدا

---

[1] صحيح البخاري مع الفتح (١/ ٥٨٧) صحيح مسلم مع شرح النووي (٣/ ٦/ ٢٤) صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (٦٥٥) الإحسان (١١١، ١١٢)

[2] صحيح البخاري (١/ ٥٨١)

[3] صحيح البخاري (١/ ٥٨٨) مختصر صحيح مسلم (٢٦٠) شرح السنة (٢/ ٤٥٨) الإحسان (٦/ ١٥٠، ١٥١)

ہو گیا ہے، جسے اہلِ علم نے یوں حل کیا ہے کہ سامنے سوئے ہوئے شخص سے ممکن ہے کوئی ایسی چیز ظاہر ہو جو نمازی کو نماز سے غافل کر دے اور اس کی توجہ ہٹا دے اور حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے امام بخاری رحمہ اللہ کے انداز کو بھانپتے ہوئے لکھا ہے کہ وہ بیان کرنا چاہتے ہیں کہ اگر نمازی کو ایسی حالت کا خدشہ نہ ہو یا سامنے والے شخص سے ایسی بات کا اندیشہ نہ ہو تو ایسے میں ان کے پیچھے نماز پڑھنا مکروہ نہیں ہے، ورنہ مکروہ ہے۔ امام مالک نیز حضرت مجاہد اور طاؤس رحمہم اللہ کا مکروہ کہنا اسی پہلی صورت سے تعلق رکھتا ہے۔[1]

اس طرح دونوں قسم کی احادیث میں کوئی تعارض نہ رہا۔ سونے والے شخص کی طرح ہی حدیث میں باتیں کرنے والے کے پیچھے نماز پڑھنے کی ممانعت وارد ہوئی ہے، لہٰذا امام خطابی رحمہ اللہ نے نقل کیا ہے کہ امام شافعی و احمد رحمہما اللہ باتیں کرنے والے شخص کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنے کو بھی مکروہ قرار دیتے تھے، لکھا ہے کہ ابو عمر کسی بولتے شخص کے سامنے نماز نہیں پڑھتے تھے، سوائے جمعہ کے دن خطیب کے سامنے پڑھنے کے۔[2] امام بغوی رحمہ اللہ نے بھی شرح السنۃ میں لکھا ہے کہ اس بات کی ممانعت بیان کی جاتی ہے کہ دو آدمی باتیں کر رہے ہوں اور ان کے مابین (سامنے) کوئی نماز پڑھ رہا ہو۔[3]

سنن ابو داود و ابن ماجہ والی حدیث کی طرح ہی الکامل لابن عدی میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے اور طبرانی اوسط میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی احادیث بھی ہیں، لیکن وہ دونوں بھی واہی ہیں۔ امام خطابی رحمہ اللہ کے بقول امام شافعی و احمد رحمہما اللہ نے باتیں کرنے والے شخص کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنے کو مکروہ کہا ہے، کیونکہ اس کی باتیں نمازی کی نماز سے توجہ ہٹا دیتی ہیں۔[4]

20 وادی کے بطن میں نماز:

کسی وادی کے بطن میں نماز کی ممانعت کا ذکر سات مقامات والی حدیث کے بعض طُرق میں مقبرہ کے بجائے ”بطن الوادي“ کے لفظ سے وارد ہوا ہے، جس کے بارے میں امام نووی رحمہ اللہ نے ”روضة الطالبين“ میں کہا ہے: وادی کے بطن میں نماز کی ممانعت قطعاً نہیں ہے۔ ابن صلاح نے

---

1. فتح الباري (١/ ٥٨٧، ٥٨٨)
2. معالم السنن (١/ ١/ ١٦١)
3. شرح السنة للبغوي (٢/ ٤٦٤)
4. دیکھیں: فتح الباري (١/ ٥٨٧، ٥٨٨) عون المعبود (٢/ ٣٨٧، ٣٨٨) نيل الأوطار أيضاً.

کہا ہے کہ کتبِ حدیث میں اس کا کوئی ثبوت یا ذکر مجھے نہیں ملا۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے "التلخیص الحبیر" میں کہا ہے کہ یہ اضافہ باطل ہے۔ ویسے بھی بطنِ وادی میں نماز ممنوع و مکروہ کیسے ہو سکتی ہے، جبکہ ابن صلاح کے بقول خود بیت اللہ شریف اور مسجدِ حرام بطنِ وادی میں ہی ہیں۔[1]

21، 22، 23 بدعتی یا بے وضو، جنبی اور حائضہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنا:

بدعتی یا بے وضو، جنبی اور حائضہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنے کی ممانعت و کراہت پر اس روایت سے استدلال کیا گیا ہے، جو امام یحییٰ نے اپنی کتاب الانتصار میں ذکر کی ہے، جس میں ہے:

«لَا صَلَاةَ إِلٰی مُحْدِثٍ، لَا صَلَاةَ إِلٰی جُنُبٍ، لَا صَلَاةَ إِلٰی حَائِضٍ»[2]

''بدعتی یا بے وضو، جنبی اور حائضہ کی طرف منہ کر کے نماز نہیں ہوتی۔''

لیکن اس حدیث کی استنادی حیثیت کے بارے میں امام شوکانی رحمہ اللہ نے کچھ نہیں کہا، جبکہ "الانتصار" نامی کتاب بھی کوئی ایسی مستند نہیں ہے کہ اس میں وارد حدیث کو بلا تحقیق قبول کیا جا سکتا ہو۔

24 فاسق کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنا:

فاسق کی طرف نماز سے ممانعت و کراہت اس کی اہانت و تذلیل کرنے کی غرض سے ہے کہ گویا وہ انسان نہیں، نجاست کا ڈھیر ہے، لیکن اس کی ہمیں واضح دلیل نہیں ملی۔

25، 26 اللہ و رسول صلی اللہ علیہ وسلم یا کسی دینی اَمر سے مذاق:

علامہ ابن حزم نے جو اللہ و رسول صلی اللہ علیہ وسلم یا کسی دینی امر سے مذاق یا کفر والی مسجد یا جگہ پر نماز کی کراہت ذکر کی ہے تو اس پر قرآن و سنت کے عمومی دلائل سے استدلال کیا ہے۔

خانہ کعبہ کے اندر نماز کی مشروعیت

بیت اللہ کی چھت پر نماز کا ذکر تو ہو چکا ہے، جبکہ اس کی نوبت کا آنا انتہائی ناممکن اور نادر سی بات ہے، لیکن چونکہ ایک روایت میں اس کا ذکر آ گیا ہے اور اہلِ علم نے اپنی کتب میں اس کا تذکرہ کیا ہے، لہٰذا ہم نے بھی اس کا حکم ذکر کر دیا ہے کہ حدیثِ ممانعت کے ضعیف ہونے کی وجہ سے خانہ کعبہ کی

1. التلخیص الحبیر (١/ ٢١٥ـ ٢٧٦)
2. نیل الأوطار (١/ ٢/ ١٤٠)

چھت پر نماز کے مکروہ ہونے میں اختلاف ہے، البتہ امام شافعی و ابو حنیفہ رحمہما اللہ کے نزدیک یہ جائز ہے۔ چونکہ خانہ کعبہ کی چھت پر چڑھنا بے ادبی کے ضمن میں آتا ہے، لہٰذا یہ جواز مع الکراہہ شمار کیا جائے گا۔

خانہ کعبہ ہی سے متعلق ایک دوسری صورت یہ بھی ہے کہ اس کے اندر نماز کا کیا حکم ہے؟ اس سلسلے میں نبیِ اکرم ﷺ سے ثابت ہے کہ آپ ﷺ نے خانہ کعبہ میں دو رکعتیں نفلی پڑھی تھیں، چنانچہ صحیح بخاری و مسلم، سنن ابو داود و نسائی، موطا امام مالک اور سنن دارمی میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبیِ اکرم ﷺ، حضرت اسامہ بن زید، بلال بن رباح اور عثمان بن طلحہ رضی اللہ عنہم کعبہ شریف میں داخل ہوئے اور انھوں نے اندر سے خانہ کعبہ کے دروازے کو بند کر دیا اور کچھ دیر اندر رہے۔ جب باہر نکلے تو میں نے نبیِ اکرم ﷺ کے بارے میں حضرت بلال رضی اللہ عنہ سے پوچھا:

﴿مَا صَنَعَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ﴾ ''نبیِ اکرم ﷺ نے خانہ کعبہ کے اندر کیا کیا؟''

تو حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے جواب دیا کہ نبیِ اکرم ﷺ نے ایک ستون کو اپنی دائیں جانب رکھا اور دو کو اپنی بائیں جانب اور تین ستونوں کو اپنے پیچھے اور ان دنوں خانہ کعبہ کی چھت چھے ہی ستونوں پر قائم تھی، (جگہ کی تحدید و تعیین کے بعد حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے فرمایا):

﴿ثُمَّ صَلّٰی﴾ ''پھر نبیِ اکرم ﷺ نے نماز پڑھی۔''

یہاں اس بات کی وضاحت نہیں کہ آپ ﷺ نے کتنی رکعتیں پڑھی تھیں، جبکہ ایک دوسری حدیث میں اس کی بھی وضاحت موجود ہے، چنانچہ صحیح بخاری اور مسند احمد میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ سے پوچھا:

﴿هَلْ صَلّٰی النَّبِيُّ ﷺ فِي الْكَعْبَةِ؟﴾

''کیا نبیِ اکرم ﷺ نے کعبہ شریف کے اندر نماز پڑھی ہے؟''

تو حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے جواب دیا:

﴿نَعَمْ رَكْعَتَيْنِ بَيْنَ السَّارِيَتَيْنِ عَنْ يَّسَارِكَ إِذَا دَخَلْتَ ثُمَّ خَرَجَ فَصَلّٰی فِيْ وِجْهَةِ الْكَعْبَةِ رَكْعَتَيْنِ﴾[1]

---

[1] صحيح البخاري مع الفتح (٦/ ١٣١، ١٣٢، ١/ ٥٠٠) صحيح مسلم مع شرح النووي (٥/ ٩/ ٨١، ٨٢) صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (١٧٨٠، ١٧٨١) صحيح سنن النسائي، رقم الحديث (٧٢٣) إرواء الغليل (١/ ٣٢٠) المنتقىٰ (١/ ٢/ ١٤٠)

''ہاں آپ ﷺ نے ان دوستونوں کے مابین دو رکعتیں پڑھیں، جو اندر داخل ہونے والے کے بائیں ہاتھ پر آتے ہیں، پھر خانہ کعبہ سے آپ ﷺ جب باہر تشریف لائے تو آپ ﷺ نے کعبہ شریف کے سامنے (اس کی طرف منہ کر کے) بھی دو رکعتیں پڑھیں۔''[1]

اس طرح واضح ہوگیا کہ نبیِ اکرم ﷺ نے خانہ کعبہ کے اندر دو رکعتیں پڑھی تھیں، لہٰذا خانہ کعبہ میں نماز مشروع ہے۔ خانہ کعبہ کے اندر داخل ہونے کا موقع تو آج صرف امرا و ملوک اور حکام یا خاص الخاص لوگوں ہی کو مل سکتا ہے، البتہ اگر کوئی شخص بیت اللہ کی تعمیر قریش کے وقت خالی چھوڑی گئی جگہ حطیم یا حجرِ اسماعیل علیہ السلام میں دو رکعتیں پڑھنے کی سعادت حاصل کر لے تو اس کی وہ دو رکعتیں بھی خانہ کعبہ کے اندر ہی شمار ہوں گی، کیونکہ وہ جگہ بھی خانہ کعبہ ہی کا حصہ ہے۔ حطیم یا حجرِ اسماعیل علیہ السلام وہ جگہ ہے جو نیم دائرے کی شکل میں ہے اور طواف کرنے والے کو بابِ کعبہ اور مقامِ ابراہیم سے تھوڑا آگے گزر کر بائیں ہاتھ پر نظر آتی ہے، جس میں کعبہ شریف کی چھت کا پرنالہ بھی اترتا ہے، جسے ''میزابِ رحمت'' بھی کہا جاتا ہے۔ اس حطیم میں نماز کی سعادت حاصل کر لینا قدرے آسان ہے اور کئی مرتبہ ہمیں بھی اللہ تعالیٰ نے اس شرف سے نوازا ہے۔ وله الحمد والشكر على ذلك.[2]

آگے نکلنے سے پہلے ایک بات یہ بھی ذکر کرتے چلیں کہ اللہ تعالیٰ غریقِ رحمت کرے امام بخاری کو۔ انھوں نے اپنی صحیح میں نبیِ اکرم ﷺ کے دخولِ کعبہ کے واقعہ پر مشتمل اس حدیث کو متعدد مقامات پر ذکر کر کے اس سے کتنے ہی مسائل اخذ کیے ہیں:

1. پہلے قبلہ و استقبالِ قبلہ کی وضاحت کرنے کے لیے کتاب الصلوۃ، باب قول اللہ تعالیٰ:
﴿وَ اتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّى﴾ [البقرة: ۱۲۵] میں لائے۔
2. پھر خانہ کعبہ اور عام مساجد کے دروازوں اور انھیں بند کرنے کی وضاحت کے لیے ''باب الأبواب والغلق لكعبة والمساجد'' میں لائے۔
3. آگے جا کر ستونوں کے مابین جماعت کے بغیر یعنی منفرد کے نماز پڑھنے کا حکم بیان کرنے کے لیے اس حدیث کو ''باب الصلاة بين السواري في غير الجماعة'' کے تحت وارد کیا۔

---

[1] صحيح البخاري مع الفتح (۱/ ۵۰۰)
[2] حطیم کی تحدید و قبلے کی تفصیل کے لیے فتح الباری (۳/ ۴۴۳) اور شرح مسلم نووی (۵/ ۹/ ۹۱۰) ملاحظہ فرمائیں۔

4 آگے "كتاب التهجد" میں دن یا رات کے وقت نفلی نماز کو دو دو رکعتیں کر کے پڑھنے کا پتا دینے کے لیے اس حدیث کو "باب ما جاء في التطوع مثنىٰ مثنىٰ" کے تحت ذکر کیا۔

5 پھر کتاب الحج میں خانہ کعبہ کو اندر سے بند کر لینے اور اس میں کسی بھی جگہ نماز پڑھ لینے کا جواز اور حکمت بیان کرنے کے لیے "باب إغلاق البيت ويصلي في أي نواحي البيت شاء" کے تحت اس حدیث کو روایت کیا ہے۔

6 آگے خانہ کعبہ میں نماز پڑھنے کا جواز و مشروعیت بیان کرنے کے لیے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے موقوفاً اس حدیث کو "باب الصلاة في الكعبة" میں لائے ہیں۔

7 کتاب الجہاد میں اپنی سواری پر اپنے پیچھے کسی کو سوار کرنے کا جواز بیان کرنے کے لیے اسے "باب الردف على الحمار" کے تحت روایت کیا ہے، جس میں پہلے حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کو اپنے گدھے پر اپنے پیچھے سوار کرنے والی حدیث ذکر کی ہے اور پھر یہ حدیث وارد کی ہے، کیونکہ اس حدیث میں شروع میں یہ بھی مذکور ہے:

« إِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ أَقْبَلَ يَوْمَ الْفَتْحِ مِنْ أَعْلٰى مَكَّةَ عَلٰى رَاحِلَتِهٖ مُرْدِفًا أُسَامَةَ بْنَ زَيْدٍ، وَمَعَهٗ بِلَالٌ، وَمَعَهٗ عُثْمَانُ بْنُ طَلْحَةَ »

''نبیِ اکرم ﷺ فتح مکہ کے دن مکہ شریف کی بالائی جانب سے اپنی اونٹنی پر سوار تشریف لائے، جبکہ آپ ﷺ کے پیچھے حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما بھی سوار تھے اور حضرت بلال اور حضرت عثمان بن طلحہ رضی اللہ عنہما بھی آپ ﷺ کے ہمراہ تھے۔'' (رضوان اللہ علیہم اجمعین)

8 کتاب المغازی میں جا کر غزوۂ فتح مکہ کے موقع پر نبیِ اکرم ﷺ کے مکہ شریف کی بالائی جانب کی طرف سے مکہ مکرمہ میں داخل ہونے کا پتا دینے کے لیے اس حدیث کو "باب دخول النبي ﷺ من أعلىٰ مكة" کے تحت وارد کیا ہے۔

9 پھر کتاب المغازی ہی کے ایک دوسرے مقام پر "باب حجة الوداع" کے تحت لائے ہیں، لیکن دخولِ کعبہ کا واقعہ چونکہ فتح مکہ کے وقت پیش آیا تھا، لہٰذا امام صاحب اس واقعہ کو حجۃ الوداع کے تحت کیوں لائے ہیں؟ یہ ایک عقدۂ لا ینحل ہے، البتہ اس آخری ایک باب کو

چھوڑ کر دیگر ابواب سے آپ بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ موصوف رحمہ اللہ نے اس ایک واقعے پر مشتمل آٹھ مختلف اور اہم مسائل اخذ کیے ہیں۔

دخولِ کعبہ کا موقع:

نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے خانہ کعبہ میں داخل ہونے اور دو رکعت پڑھنے سے تعلق رکھنے والے واقعے پر مشتمل حدیث ذکر کی جا چکی ہے، البتہ اس واقعے سے متعلق بعض امور کی وضاحت کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے، چنانچہ یہ بات تو خود صحیح بخاری ''کتاب الجهاد: باب الردف على الحمار'' کے تحت آنے والی حدیث ہی میں مذکور ہے کہ خانہ کعبہ میں داخل ہونے والا واقعہ فتح مکہ کے موقع پر رونما ہوا تھا۔ جیسا کہ اس حدیث کے شروع ہی میں مذکور ہے:

《 إِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ أَقْبَلَ يَوْمَ الْفَتْحِ مِنْ أَعْلٰى مَكَّةَ 》[1]

''فتح مکہ کے موقع پر نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مکہ مکرمہ کی بالائی جانب سے تشریف لائے۔''

ان الفاظ میں صراحت موجود ہے، لہٰذا مزید کسی شہادت کی ضرورت نہیں۔

حجۃ الوداع کے موقع پر دروازہ بند کر لینے کی حکمت:

یہ بات معروف ہے کہ حجۃ الوداع کے موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم خانہ کعبہ میں داخل نہیں ہوئے تھے۔[2] حدیث میں یہ بات بھی گزری ہے کہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم، اسامہ بن زید، بلال اور عثمان بن طلحہ رضی اللہ عنہم خانہ کعبہ میں داخل ہوگئے تھے:

《 فَأَغْلَقُوْا عَلَيْهِمُ الْبَابَ 》 ''ان سب نے اندر سے خانہ کعبہ کا دروازہ بند کر لیا۔''

اندر سے دروازہ بند کیوں کیا گیا اور آخر اس کی حکمت کیا ہے؟ اس سلسلے میں ابن بطال نے کہا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ اس لیے کیا، تاکہ لوگ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو نماز پڑھتے نہ دیکھ سکیں اور دیکھ لینے کی صورت میں کہیں یہ نہ سمجھنے لگیں کہ یہ دخولِ کعبہ اور نماز لازمی سنت ہے (یہ بات ظاہر ہے کہ باعثِ مشقت ہو جاتی) لیکن شارح بخاری حافظ ابن حجر رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ یہ تعلیل یا حکمت ضُعف کے ساتھ ساتھ باہم متناقض بھی ہے، کیونکہ اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی نماز کو چھپانا ہی ضروری سمجھتے تو پھر حضرت

---

[1] صحيح البخاري مع الفتح (٦/ ١٣١)

[2] فتح الباري (٣/ ٤٦٨)

بلال اور دوسرے حضرات رضی اللہ عنہم بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو نماز پڑھتے ہوئے نہیں دیکھ سکتے تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان سے بھی پردہ رکھتے، لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا نہیں کیا، بلکہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ کی طرف سے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کے سوال پر یہ صراحت موجود ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز پڑھی اور کسی ایک صحابی کا کسی فعلِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو نقل کر دینا اس حکم کے اثبات کے لیے کافی ہوتا ہے۔

آگے وہ لکھتے ہیں کہ بظاہر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا اندر سے دروازہ بند کر لینا، اس حکمت کے لیے نہیں تھا جو بیان کی گئی ہے، بلکہ اس کی اصل غرض و غایت یا حکمت یہ تھی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو (اور دیگر تین صحابہ رضی اللہ عنہم کو) خانہ کعبہ میں داخل ہوتے دیکھ کر سب ہجوم کر کے نہ آ جائیں یا پھر یہ کہ اس طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دل کو زیادہ سکون ملتا اور دلجمعی و خشوع زیادہ ہوتا۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ دروازہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس لیے بند کر لیا، تا کہ خانہ کعبہ کی ہر چہار اطراف میں منہ کر کے نماز پڑھنا ممکن ہو سکے، کیونکہ دروازہ کھلا ہونے کی شکل میں اس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنا صحیح نہیں ہے اور حضرت عثمان بن طلحہ رضی اللہ عنہ کو اس لیے اپنے ساتھ اندر جانے کی اجازت بخشی، تا کہ کہیں وہ یہ نہ سمجھ بیٹھیں کہ انھیں تولیتِ کعبہ سے سبکدوش کر دیا گیا ہے (کیونکہ ان کا خاندان یکے بعد دیگرے خانہ کعبہ کا متولی چلا آ رہا تھا) حضرت اسامہ و بلال رضی اللہ عنہما دونوں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مستقل خدمت گزاری کے لیے رہنے والے تھے، لہٰذا انھیں بھی اپنے ساتھ ہی خانہ کعبہ کے اندر لے گئے تھے۔[1]

ایک اشکال کا ازالہ:

نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دخولِ کعبہ اور اس میں نماز پڑھنے والے واقعے سے متعلق جو احادیثِ ابن عمر رضی اللہ عنہما ہم نے ذکر کی ہیں، ان میں تو مذکور ہے کہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ کے بقول نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دو رکعتیں پڑھی تھیں، جبکہ صحیح بخاری (۸/ ۱۸) ہی کی ایک روایت میں خود حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما ہی سے مروی ہے کہ وہ یہ پوچھنا ہی بھول گئے کہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے خانہ کعبہ میں کتنی رکعتیں پڑھی تھیں؟

اس سے بخاری شریف کے ایک شارح اسماعیلی نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کو نماز کی کیفیت یعنی خانہ کعبہ کے اندر نماز کی جگہ کی تعیین و تحدید بتائی تھی، نماز کی رکعتوں کی تعداد نہیں بتائی تھی اور وہ بھی ان سے پوچھنا بھول گئے تو پھر یہ دو رکعتوں کا ذکر کیسے آ گیا؟

[1] فتح الباري (١/ ٥٦٠، ٣/ ٤٦٣، ٤٦٤) نيل الأوطار (١/ ٢/ ١٤١)

اس کا جواب صاحبِ فتح الباری نے دو طرح سے دیا ہے:

1 اس بات کا احتمال موجود ہے کہ اس دو رکعتوں والی روایت میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے کم از کم یقینی و متحقق مقدارِ رکعات پر اعتماد کیا ہو اور وہ یوں کہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے ان کے سامنے یہ ثابت کر دیا کہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے خانہ کعبہ میں نماز پڑھی تھی اور نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے قطعاً یہ منقول و ثابت نہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دن کے وقت دو رکعتوں سے کم کبھی نفلی نماز پڑھی ہو تو گویا دو رکعتیں نماز یقینی امر تھا، جو نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی عادتِ مبارکہ کے استقرا سے معلوم و معروف ہے۔

اس تفصیل کی روشنی میں ''رکعتین'' کا لفظ حضرت بلال رضی اللہ عنہ کا نہیں بلکہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کے کلام سے ہے۔

2 اس اشکال کا دوسرا جواب یہ بھی ممکن ہے، بلکہ اس سے پہلے جواب کی تائید بھی ہوتی ہے کہ عمر بن شبہ کی ''کتاب مکہ'' میں ایک روایت انھوں نے باسند بیان کی ہے، جس میں ہے:

''فَاسْتَقْبَلَنِيْ بِلَالٌ فَقُلْتُ: مَا صَنَعَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ هٰهُنَا؟ فَأَشَارَ بِيَدِهٖ أَيْ صَلّٰى رَكْعَتَيْنِ بِالسَّبَابَةِ وَالْوُسْطٰى''

''میرے سامنے حضرت بلال رضی اللہ عنہ آئے تو میں نے ان سے پوچھا کہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہاں خانہ کعبہ میں کیا کیا ہے؟ تو انھوں نے (صراحتاً جواب دینے کے بجائے) اپنی انگشتِ شہادت اور درمیانی انگلی سے اشارہ کر کے بتایا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دو رکعتیں پڑھی ہیں۔''

اس حدیث کی بنا پر کہا جا سکتا ہے کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے رکعتوں کی تعداد کے بارے نہ تو لفظاً سوال کیا اور نہ انھیں حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے لفظاً جواب دیا، بلکہ انھوں نے ان کے اشارے سے دو رکعتیں سمجھی تھیں نہ کہ زبان سے۔ اس طرح ان کا یہ کہنا کہ میں نے ان سے یہ نہیں پوچھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کتنی رکعتیں پڑھیں؟ اس کو اس بات پر محمول کیا جائے گا کہ اس سے ان کی مراد یہ ہے کہ انھوں نے اس معاملے میں تحقیق نہیں کی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دو رکعتوں سے زیادہ بھی نماز پڑھی ہے یا نہیں؟[1]

اس طرح ان دو طرح کی روایات کے مابین پائے جانے والے اشکال کا ازالہ ہوگیا۔

---

[1] فتح الباري (١/ ٥٠٠) نيل الأوطار (١/ ٢/ ١٤١)

لفظِ ''رکعتین'' کی تحقیق:

قاضی عیاض رحمہ اللہ نے جو نقل کیا ہے کہ دو رکعتوں کا لفظ ''رکعتین'' اس حدیث کے ایک راوی یحییٰ بن سعید القطان کی غلطی کی وجہ سے حدیث میں آ گیا ہے، کیونکہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے تو کہا ہے کہ میں یہ پوچھنا بھول گیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کتنی رکعتیں پڑھیں تھیں؟ لہٰذا یحییٰ کو نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے خانہ کعبہ سے نکل کر دو رکعتیں پڑھنے سے خانہ کعبہ کے اندر بھی دو رکعتوں کے پڑھنے کا وہم ہوگیا ہے۔ قاضی عیاض رحمہ اللہ نے جس سے بھی بات نقل کی ہے، وہ ''جبل من جبال الحفظ'' یعنی یادداشت کے پہاڑ: یحییٰ القطان کو پہچان ہی نہیں سکے اور مذکورہ دونوں طرح کی روایات کے مابین توافق و تطابق پیدا نہ کر سکے تو یہ الزام تھوپ دیا۔

حالانکہ صاحبِ فتح الباری کے بقول یحییٰ القطان نے پہلی اور بعد والی دونوں جگہ پر دو دو رکعتیں ذکر کی ہیں اور کسی وہم میں ہرگز مبتلا نہیں ہوئے۔ پھر اس معاملے میں یحییٰ بن سعید القطان منفرد نہیں ہیں کہ پہلی دو رکعتوں کو ان کی غلطی کا نتیجہ قرار دیا جا سکے، بلکہ کئی دیگر کبار رواۃِ حدیث نے ان کی اس لفظ پر متابعت کی ہے، مثلاً صحیح بخاری و سنن نسائی میں ابو نعیم نے، صحیح خزیمہ میں ابو عاصم نے، اسماعیلی کے یہاں عمر بن علی نے اور مسند احمد میں عبداللہ بن نمیر نے یحییٰ بن سعید کی طرح ہی سیف بن سلیمان سے ''رکعتین'' کا لفظ روایت کیا ہے۔ پھر سیف اس لفظ کو امام مجاہد رحمہ اللہ سے روایت کرنے میں منفرد نہیں، بلکہ مسند احمد میں خصیف نے بھی سیف کی طرح ہی یہ لفظ مجاہد سے روایت کیا ہے۔ پھر حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے ''رکعتین'' کا لفظ روایت کرنے میں امام مجاہد منفرد نہیں ہیں، بلکہ سنن نسائی و مسند احمد میں ان کی متابعت اور حضرت عثمان بن ابو طلحہ رضی اللہ عنہ سے مسند احمد و معجم طبرانی میں ایک قوی سند کے ساتھ اور مسند بزار میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے بھی ایسی ہی روایت ملتی ہے، پھر معجم طبرانی میں صحیح سند کے ساتھ حضرت عبدالرحمن بن صفوان رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

﴿ فَلَمَّا خَرَجَ سَأَلْتُ مَنْ كَانَ مَعَهُ، فَقَالُوْا: صَلّٰى رَكْعَتَيْنِ عِنْدَ السَّارِيَةِ الْوُسْطٰى ﴾[1]

''جب نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم خانہ کعبہ سے باہر تشریف لائے تو میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کعبہ

---

[1] فتح الباري (۱/ ۵۰۱)

شریف کے اندر جانے والوں سے پوچھا تو انھوں نے بتایا کہ آپ ﷺ نے دوستونوں کے پاس دو رکعتیں پڑھی ہیں۔‘‘

معجم طبرانی میں جید سند کے ساتھ حضرت شیبہ بن عثمان رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں ہے:

((لَقَدْ صَلّٰی رَكْعَتَيْنِ عِنْدَ الْعُمُوْدَيْنِ)) [1]

’’نبیِ اکرم ﷺ نے دوستونوں کے پاس دو رکعتیں پڑھیں۔‘‘

اس ساری تفصیل سے یہ بات کھل کر سامنے آ گئی کہ دو رکعتوں کا لفظ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے ثابت ہے اور یحییٰ بن سعید القطان کو کوئی وہم نہیں ہوا، اس پر دیگر رواۃ کی متابعات شاہدِ عدل ہیں۔ [2]

ایک تعارض کا حل:

یہ تو خانہ کعبہ میں نمازِ نبوی ﷺ کے ثابت ہوجانے کے بعد صرف دو رکعتوں کی تحدید کے سلسلے میں بحث ہے کہ آپ ﷺ نے دو رکعتیں پڑھیں یا زیادہ؟ دو رکعتوں کا لفظ ’’رکعتین‘‘ کس کا کہا ہوا ہے؟ یہ طے ہوگیا کہ یہ لفظ وہم یا غلطی سے نہیں آیا، بلکہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما ہی سے نہیں، بلکہ متعدد طُرق سے ان سے اور دیگر حضرات سے بھی اس کی روایات ثابت ہیں۔

اب خانہ کعبہ میں نماز کے سلسلے میں ایک تعارض کی طرف بھی آیئے کہ دو رکعتیں یا زیادہ کی بات تو الگ رہی، کیا آپ ﷺ نے خانہ کعبہ میں نماز پڑھی بھی ہے یا نہیں؟ اس سوال کی نوبت کیوں آئی؟ یہ اس لیے کہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ سے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت اور دیگر مرویات سے تو پتا چلتا ہے کہ نبیِ اکرم ﷺ نے نماز پڑھی، جبکہ بخاری شریف ہی میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبیِ اکرم ﷺ نے خانہ کعبہ میں نماز نہیں پڑھی تھی، چنانچہ ’’كتاب الحج: باب من كبر في نواحي الكعبة‘‘ میں ان سے مروی ہے:

((إِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ لَمَّا قَدِمَ أَبٰى أَنْ يَّدْخُلَ الْبَيْتَ، وَفِيْهِ الْآلِهَةُ فَأَمَرَ بِهَا فَأُخْرِجَتْ))

’’جب نبیِ اکرم ﷺ مکہ مکرمہ تشریف لائے تو خانہ کعبہ میں بتوں کی موجودگی میں وہاں

---

[1] فتح الباري (١/ ٥٠١)

[2] فتح الباري (١/ ٥٠٠، ٥٠١)

داخل ہونے سے انکار کر دیا، پھر آپ ﷺ کے حکم سے ان معبودانِ باطلہ کو نکالا گیا۔‘‘

اسی حدیث کے آخر میں یہ الفاظ ہیں:

﴿فَدَخَلَ الْبَيْتَ فَكَبَّرَ فِيْ نَوَاحِيْهِ، وَلَمْ يُصَلِّ فِيْهِ﴾[1]

’’تب آپ ﷺ خانہ کعبہ میں داخل ہوئے اور اس کے سب کونوں میں تکبیریں پڑھیں، جبکہ اس میں نماز نہیں پڑھی۔‘‘

اس طرح ایک ہی پائے کی یعنی صحیح بخاری ہی میں وارد دو حدیثوں کے مابین تعارض و تضاد ہوگیا، لیکن یہ کوئی ایسا عقدہ نہیں جو لا ینحل ہو۔ شارحین بخاری میں سے صاحبِ فتح الباری نے اس تعارض و تضاد کو حل کرتے ہوئے لکھا ہے کہ خانہ کعبہ میں تکبیریں کہنے کے سلسلے میں تو کوئی تعارض نہیں ہے، کیونکہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے تکبیروں کو ثابت کیا ہے کہ آپ ﷺ نے کہی تھیں، جبکہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے اس تکبیروں کے موضوع کو چھیڑا ہی نہیں۔

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کا حل:

اب رہا معاملہ خانہ کعبہ میں نماز پڑھنے یا نہ پڑھنے کا تو اس مسئلے میں حضرت بلال رضی اللہ عنہ کا نماز پڑھنے کو ثابت کرنا، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے نماز کی نفی کرنے سے راجح ہے، کیونکہ فتح مکہ کے موقع پر جب نبیِ اکرم ﷺ خانہ کعبہ میں داخل ہوئے تھے، اس وقت حضرت بلال رضی اللہ عنہ بھی نبیِ اکرم ﷺ کے ساتھ خانہ کعبہ میں موجود تھے (اور آپ ﷺ نے اندر سے دروازہ بند کر لیا تھا) جبکہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اس وقت آپ ﷺ کے ساتھ نہیں تھے۔ نماز کی نفی کو کبھی تو وہ حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کے حوالے سے بیان کرتے ہیں اور کبھی اپنے بھائی حضرت فضل رضی اللہ عنہ کے حوالے سے، جبکہ یہ ثابت ہی نہیں کہ حضرت فضل رضی اللہ عنہ اس وقت نبیِ اکرم ﷺ کے ساتھ تھے اور جس روایت میں ان کا ذکر آیا ہے، وہ ویسے ہی شاذ ہے۔ یعنی حضرت فضل رضی اللہ عنہ کی خانہ کعبہ میں موجودگی والی روایت شاذ ہے۔

چنانچہ مسند احمد میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے طریق سے ان کے بھائی حضرت فضل رضی اللہ عنہ سے نبیِ اکرم ﷺ کے خانہ کعبہ میں نماز پڑھنے کی نفی آئی ہے اور اس کے بارے میں بھی یہ احتمال ہے کہ انھوں نے یہ بات حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ سے سن کر کہی ہو، کیونکہ وہ خود تو اندر موجود ہی نہیں تھے اور

---

[1] صحيح البخاري مع الفتح (١/ ٥٠١، ٣/ ٤٦٨)

صحیح مسلم میں حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے نماز کی نفی روایت کی ہے، جبکہ مسند احمد اور بعض دیگر کتبِ حدیث میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ سے نماز کا اثبات روایت کیا ہے تو اس طرح خود حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ سے نماز کی نفی و اثبات کی روایات باہم متعارض ہوگئیں، لہٰذا حضرت بلال رضی اللہ عنہ والی بات کہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز پڑھی تھی، وہی راجح اور زیادہ صحیح ہوگی، کیونکہ وہ مثبت ہے اور دوسروں کی بات منفی ہے (اور مثبت منفی پر مقدّم ہوتی ہے) دوسرے اس لیے بھی کہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ والی روایت میں اثبات پر کوئی تعارض و اختلاف نہیں ہے، جبکہ نفی کرنے والوں کی روایات میں باہم نفی و اثبات کا تعارض و اختلاف بھی موجود ہے۔[1]

امام نووی رحمہ اللہ کا حل:

بعض شارحینِ حدیث نے حضرت بلال رضی اللہ عنہ کے نماز کو ثابت کرنے اور حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کے نماز کی نفی کرنے والی روایات میں کئی دیگر طریقوں سے مطابقت پیدا کی ہے۔ ان میں سے امام نووی رحمہ اللہ اور بعض دیگر شُراحِ حدیث نے کہا ہے کہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ کی روایتِ اثبات اور حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کی روایتِ نفی میں اس طرح بھی مطابقت ممکن ہے کہ جب نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھی خانہ کعبہ میں داخل ہوئے تو شروع میں دعا کرنے لگ گئے اور حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو دعا کرتے ہوئے دیکھا۔ یہ دیکھ کر حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ بھی دعا میں مشغول ہوگئے۔ وہ خانہ کعبہ میں ایک طرف تھے اور نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم دوسری طرف۔ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا سے فارغ ہوکر نماز پڑھی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو نماز پڑھتے ہوئے حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے دیکھ لیا، لیکن حضرت اسامہ ذرا دور ہونے اور دعا میں مشغول ہونے کی وجہ سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو نماز پڑھتے ہوئے نہ دیکھ سکے، یہ اس لیے بھی ممکن ہے کہ دروازہ بند تھا، جس سے اندر کافی اندھیرا ہوگیا ہوگا اور اس تاریکی کے ساتھ ہی اس بات کا احتمال مستزاد ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کسی ستون کی اوٹ میں ہونے کی وجہ سے حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ سے اوجھل ہوگئے ہوں، لہٰذا انھوں نے اپنے خیال کے مطابق نماز کی نفی کر دی۔[2]

---

[1] فتح الباري (٣/ ٤٦٨) نيل الأوطار (١/ ٢/ ١٤١)

[2] فتح الباري (٣/ ٤٦٨) نيل الأوطار (١/ ٢/ ١٤١)

امام طبری رحمہ اللہ کا حل:

امام طبری رحمہ اللہ نے نفی و اثبات کی شکل میں پائے جانے والے اس تعارض و اختلاف میں اس طرح موافقت و مطابقت پیدا کی ہے کہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ مستقل نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ خانہ کعبہ میں موجود رہے اور انھوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو نماز پڑھتے ہوئے دیکھ لیا، جبکہ حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ شاید کسی کام سے کچھ وقت کے لیے غائب ہوگئے ہوں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو نماز پڑھتے نہ دیکھ سکے ہوں، اس بات کی تائید مسند طیالسی کی ایک جید سند والی روایت سے ہوتی ہے، جس میں حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں:

«دَخَلْتُ عَلٰی رَسُوْلِ اللّٰہِ صلی اللہ علیہ وسلم فِي الْکَعْبَۃِ، فَرَأٰی صُوَرًا فَدَعَا بِدَلْوٍ مِّنْ مَّاءٍ فَأَتَیْتُہٗ بِہٖ فِضَرَبَ بِہِ الصُّوَرَ»[1]

''میں کعبہ شریف میں نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہنچا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے وہاں تصویریں بنی دیکھیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پانی کا ڈول طلب فرمایا، جو میں لے کر آیا، اس سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ تصویریں مٹا دیں۔''

اس روایت سے حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کا پانی لانے کے لیے خانہ کعبہ سے کچھ وقت کے لیے غائب ہونا ثابت ہوتا ہے۔ امام قرطبی رحمہ اللہ کے بقول اس غیاب کے باوجود ان کا نماز کی نفی کرنا دراصل اس لیے تھا کہ وہ بہت جلدی پانی لے کر واپس لوٹ آئے تھے، لہٰذا اس غیاب کو انھوں نے کوئی خاص اہمیت نہ دیتے ہوئے نماز کی نفی کر دی اور یہ بھی تب ہے، جب اس واقعے کو فتح مکہ کے موقع پر وقوع پذیر مانا جائے، بصورتِ دیگر پھر عمر بن شبّہ نے اپنی ''کتابِ مکہ'' میں جو روایت بیان کی ہے، اس سے بھی حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کے نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو نماز پڑھتے نہ دیکھ سکنے ہی کا پتا چلتا ہے، چنانچہ اس حدیث میں ہے:

«دَخَلَ النَّبِيُّ صلی اللہ علیہ وسلم الْکَعْبَۃَ، وَدَخَلَ مَعَہٗ بِلَالٌ، وَجَلَسَ أُسَامَۃُ عَلٰی الْبَابِ فَلَمَّا خَرَجَ وَجَدَ أُسَامَۃَ قَدِ احْتَبٰی فَأَخَذَ بِحَبْوَتِہٖ فَحَلَّھَا»[2]

''نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم خانہ کعبہ میں داخل ہوئے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہی حضرت بلال رضی اللہ عنہ

[1] فتح الباري (٣/ ٤٦٨) وقال: جيد

[2] فتح الباري (٣/ ٤٦٩) نيل الأوطار (٢/ ١٤٢)

بھی خانہ کعبہ میں داخل ہوئے، جبکہ حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ دروازے پر بیٹھ گئے اور جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم باہر تشریف لائے تو دیکھا کہ حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ گوٹھ مارے بیٹھے ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی گوٹھ کھول دی۔‘‘

اس سے معلوم ہوا کہ حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ جب اس طرح بیٹھ گئے اور یوں بیٹھنے سے جسم کو راحت ملی تو شاید اونگھ آ گئی ہو، یعنی نیند کا غلبہ ہونے سے آنکھ لگ گئی ہو، لہٰذا نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو نماز پڑھتے نہ دیکھ سکے ہوں اور جب ان سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے نماز پڑھنے کے بارے میں سوال کیا گیا تو انھوں نے نماز کی نفی کر دی۔ ان کی یہ نفی دراصل اس لیے تھی کہ ان کا اونگھنا صرف معمولی سے وقت کے لیے تھا، کوئی لمبی نیند نہیں تھی، لہٰذا اس تھوڑے سے وقت کے لیے اپنے اونگھ جانے کو کوئی حیثیت نہ دیتے ہوئے انھوں نے نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے خانہ کعبہ کے اندر نماز پڑھنے کی نفی کر دی۔ ان ہر دو صورتوں میں حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کا نفی کرنا اپنی رؤیت و مشاہدہ کے اعتبار سے ہے نہ کہ نفس الامر کی نفی ہے، یعنی ان کی نفی صرف اس بات کی ہے کہ انھوں نے نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو نماز پڑھتے نہیں دیکھا، ان کی نفی سے نماز کے مطلقاً وقوع کی نفی مراد نہیں ہے۔[1]

اس ساری تفصیل سے یہ بات واضح ہوگئی کہ خانۂ کعبہ میں نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے نماز پڑھنے یا نہ پڑھنے سے متعلق احادیث میں سے حضرت بلال رضی اللہ عنہ کا قول اور وہی حدیث راجح ہے، جس میں نماز پڑھنے کا ذکر آیا ہے۔ مذکورہ اسباب و وجوہات کی بنا پر نماز نہ پڑھنے کا پتا دینے والی حدیث مرجوح ہے۔ بعض اہلِ علم نے ایک حدیث کو دوسری پر ترجیح دیے بغیر بھی کئی طریقوں سے ان ہر دو طرح کی احادیث میں موافقت و مطابقت پیدا کی ہے۔

تعارض حل کرنے کے دیگر طریقے:

اہلِ علم میں سے بعض محدّثینِ کرام رحمہم اللہ نے اس تعارض کو حل کرنے کے لیے بعض دیگر طریقے بھی اختیار کیے ہیں:

1. دونوں طرح کی احادیث میں سے جن احادیث میں اثبات ہے، انھیں صلوٰۃ کے لغوی معنوں یعنی دعا وغیرہ پر محمول کیا جائے اور جن احادیث میں نفی ہے، انھیں صلوٰۃ کے شرعی یا اصطلاحی

[1] فتح الباري (٣/ ٤٦٨، ٤٦٩) نيل الأوطار (١/ ٢/ ١٤١)

معنوں یعنی نماز پر محمول کیا جائے۔ یہ طریقہ ان چند علما نے بیان کیا ہے، جن کے نزدیک خانہ کعبہ میں فرضی و نفلی کوئی بھی نماز پڑھنا مکروہ ہے، لیکن اس حل کی تردید ان طرقِ حدیث میں موجود ہے، جن میں خانہ کعبہ کے اندر نماز کی رکعتوں کی تعداد وغیرہ آئی ہے، جو آپ کے سامنے ذکر کی جا چکی ہیں۔ ان احادیث کو پیشِ نظر رکھا جائے تو واضح ہوجاتا ہے کہ کعبہ شریف میں پڑھی گئی نماز سے مراد شرعی و اصطلاحی نماز ہی ہے نہ کہ دعا۔

② اس تعارض کا دوسرا حل امام قرطبی رحمہ اللہ نے یہ پیش کیا ہے کہ جن احادیث میں نماز کا ذکر ہے، انھیں نفلی نماز پر محمول کیا جائے اور جن میں نہ پڑھنے کا ذکر آیا ہے، انھیں فرض نماز پر محمول کیا جائے۔ یہ امام مالک رحمہ اللہ کے مشہور قول کی رو سے ہے، جس سے دوسرے ائمہ و فقہا کا اتفاق نہیں، اس کی تفصیل ہم تھوڑا بعد میں ذکر کرتے ہیں۔

③ اس کا تیسرا حل بخاری شریف کے ایک شارح مہلب رحمہ اللہ نے یہ پیش فرمایا ہے کہ ممکن ہے نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم دو مرتبہ خانہ کعبہ میں داخل ہوئے ہوں، ایک مرتبہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز پڑھی ہو اور ایک مرتبہ نہ پڑھی ہو۔

④ امام ابن حبان رحمہ اللہ نے ایک چوتھا حل بیان کرتے ہوئے کہا ہے کہ میرے نزدیک زیادہ صحیح طریقۂ موافقت یہ ہے کہ دونوں طرح کی احادیث کو دو الگ الگ اوقات کے ساتھ خاص کیا جائے کہ جب فتح مکہ کے موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم خانہ کعبہ میں داخل ہوئے، حضرت بلال رضی اللہ عنہ کے حوالے سے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت کے مطابق آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز پڑھی اور حجۃ الوداع کے موقع پر کعبہ شریف میں نماز نہیں پڑھی، کیونکہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کے حوالے سے نماز کی نفی کی ہے، جبکہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے صرف حضرت بلال رضی اللہ عنہ ہی سے نہیں بلکہ (دوسری روایت میں) خود حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کے حوالے سے بھی نماز پڑھنا ثابت کیا ہے۔ اگر ان دونوں طرح کی احادیث کو اس طرح دو اوقات کے ساتھ الگ الگ خاص کر دیا جائے تو تعارض ہی ختم ہوجاتا ہے۔

صاحبِ فتح الباری نے کہا ہے کہ یہ طریقۂ توافق و تطابق تو بہت ہی اچھا ہے، لیکن خود اس

---

(1) فتح الباري (٣/ ٤٦٩) نيل الأوطار (١/ ٢/ ١٤٢)

طریقے پر پھر امام نووی رحمہ اللہ کا تعاقب آ جاتا ہے، جس میں وہ کہتے ہیں کہ بلا اختلاف نبیِ اکرم ﷺ صرف فتح مکہ کے وقت خانہ کعبہ میں داخل ہوئے ہیں، حجۃ الوداع کے موقع پر نہیں۔ امام نووی رحمہ اللہ کی اس بات کی تائید ازرقی کی کتابِ مکہ میں واردان روایات سے بھی ہوتی ہے، جن میں کئی اہلِ علم نے کہا ہے کہ نبیِ اکرم ﷺ صرف ایک ہی مرتبہ فتح مکہ کے موقع پر خانہ کعبہ میں داخل ہوئے تھے۔ رہا حجۃ الوداع کا موقع تو اس وقت آپ ﷺ داخل نہیں ہوئے اور جب یہ بات ہے تو پھر اس امر میں کوئی چیز مانع نہیں کہ نبیِ اکرم ﷺ خانہ کعبہ میں فتح مکہ ہی کے موقع پر دو دفعہ داخل ہوئے ہوں اور ایک مرتبہ سے مراد ایک سفر ہو نہ کہ ایک مرتبہ داخل ہونا۔[1]

اس تفصیل سے مسئلہ حل ہوگیا کہ نبیِ اکرم ﷺ نے خانہ کعبہ میں نماز پڑھی ہے اور یہ فتح مکہ کا موقع تھا، اگرچہ اسی سفر کے دوران میں کبھی دوسری مرتبہ بھی خانہ کعبہ میں داخل ہوئے ہوں گے، لیکن اس مرتبہ نماز نہ پڑھی اور یہی سب سے بہترین موافقت و مطابقت ہے۔

نفل یا فرض بھی؟:

خانہ کعبہ میں نماز سے متعلق ایک آخری موضوع بھی مختصراً عرض کرتے چلیں کہ متعلقہ احادیث سے تو نفلی نماز ہی کا پتا چلتا ہے، لیکن استقبالِ کعبہ کے مسئلے میں نفل و فرض ہر دو نمازوں کا حکم ایک جیسا ہے۔ لہٰذا نفلی نماز کی طرح ہی فرضی نماز بھی خانہ کعبہ میں مشروع ہے۔ جمہور اہلِ علم کا یہی مسلک ہے (اور احادیث صحیحہ سے بظاہر اسی کی تائید ہوتی ہے) البتہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا کہنا ہے کہ کعبہ شریف کے اندر قطعاً کوئی نماز نہیں ہوتی۔ ان کا یہ کہنا ہے کہ اندر نماز پڑھنے سے کعبہ شریف کے بعض حصوں کی طرف پشت یا پیٹھ ہوتی ہے، جبکہ حکم اس کی طرف منہ کرنے کا ہے اور یہ منہ کرنے کا حکم سارے کعبہ کی طرف منہ کرنے پر محمول ہوگا (لہٰذا بعض کی طرف پشت ہونے کی صورت میں نماز نہیں ہوگی) بعض مالکی فقہا، ظاہریہ اور امام طبری رحمہ اللہ نے بھی یہی موقف اختیار کیا ہے۔ مالکیہ میں سے مازری نے کہا ہے کہ ہمارے مسلک میں مشہور موقف یہی ہے کہ کعبۃ اللہ کے اندر نماز منع ہے اور اگر کوئی پڑھ لے تو وہ دہرائے، جبکہ ابن عبدالحکم نے کہا ہے کہ نماز ہو جائے گی۔

---

[1] فتح الباري (٣/ ٤٦٦، ٤٦٧) نیز دیکھیں: المغني (٢/ ٤٧٥، ٤٧٦) حنابلہ کے نزدیک خانہ کعبہ کے اندر اور اس کی چھت پر فرض نماز جائز نہیں ہے۔

علامہ ابن عبدالبر اور امام ابن العربی رحمہما اللہ نے بھی یہی کہا ہے کہ نماز ہو جائے گی۔ ابن حبیب نے بھی نماز دہرانے ہی کا کہا ہے، جبکہ اصبغ نے اس شکل میں دہرانے کا کہا ہے، جب جان بوجھ کر اندر نماز پڑھی ہو۔ یہ تو فقہائے مالکیہ کے اقوال ہیں، جبکہ امام ترمذی رحمہ اللہ نے امام مالک رحمہ اللہ کی طرف مطلقاً یہ قول منسوب کیا ہے کہ ان کے نزدیک خانہ کعبہ کے اندر نوافل جائز ہیں، ان کے بعض اصحاب نے ان نوافل سے وہ فرض نماز شمار کی ہے، جو نہ تو نمازوں کی موکدہ سنتیں ہوں اور نہ وہ غیر فرض نمازیں ہوں، جن کی جماعت کرانا مشروع ہے۔

امام ابن دقیق العید نے عمدۃ الاحکام کی شرح میں لکھا ہے کہ امام مالک رحمہ اللہ فرض نماز پڑھنے کو مکروہ و ممنوع سمجھتے تھے۔ گویا انھوں نے بھی فرض و نفل میں فرق کی طرف اشارہ کیا ہے اور جو اختلاف کعبہ شریف کے اندر نماز پڑھنے کے جواز و عدمِ جواز میں ہے، وہی حطیم میں نماز پڑھنے کی شکل میں بھی آتا ہے، ہاں اگر کعبہ شریف کی طرف پشت کرے اور حطیم کی طرف منہ کرے تو پھر اس جہت کو کعبہ میں سے شمار نہ کرنے والے قول کی بنا پر اس شخص کی نماز صحیح نہیں ہوگی۔ یہ بات معقول بھی ہے کہ کعبہ کے سائے تلے عمارتِ کعبہ کی طرف پشت کر کے نماز پڑھے تو اس کی نماز کیسے صحیح ہوگی؟ ہاں اگر حطیم میں کھڑا ہو اور منہ عمارتِ کعبہ کی طرف ہو تو پھر اس کی نماز صحیح اور کعبہ کے اندر پڑھی گئی شمار ہوگی، جیسا اس کا ذکر گزر چکا ہے۔

تعمیرِ مسجد کے فضائل

وہ مقامات جہاں نماز نہیں ہوتی اور وہ مقامات جہاں نماز ہو جاتی ہے، ان سب کا تذکرہ ہوتا آ رہا ہے، اسی سلسلۂ گفتگو کو ہم مساجد اور ان کے آداب و احترام کے تذکرے کے ساتھ پایۂ تکمیل تک پہنچانے والے ہیں۔ وبید اللہ التوفیق. تو آیئے مساجد کے آداب اور لوازمِ احترام سے پہلے فضائلِ تعمیرِ مسجد کے سلسلے میں قرآنِ کریم اور احادیثِ شریفہ میں وارد نصوص کے ساتھ تھوڑا وقت گزاریں۔

قرآن کی نظر میں:

قرآن کی سورت توبہ میں تعمیرِ مساجد کے فضائل بیان کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿مَا كَانَ لِلْمُشْرِكِيْنَ اَنْ يَّعْمُرُوْا مَسٰجِدَ اللّٰهِ شٰهِدِيْنَ عَلٰۤى اَنْفُسِهِمْ بِالْكُفْرِ اُولٰٓئِكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ وَ فِي النَّارِ هُمْ خٰلِدُوْنَ ۝ اِنَّمَا يَعْمُرُ مَسٰجِدَ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَ اَقَامَ الصَّلٰوةَ وَ اٰتَى الزَّكٰوةَ وَ لَمْ يَخْشَ اِلَّا اللّٰهَ فَعَسٰۤى اُولٰٓئِكَ اَنْ يَّكُوْنُوْا مِنَ الْمُهْتَدِيْنَ﴾ [التوبة: ۱۷، ۱۸]

''مشرکوں کا کام نہیں کہ آباد کریں اللہ کی مسجدیں اور تسلیم کر رہے ہوں اپنے اوپر کفر کو، ان کے تمام اعمال برباد ہوگئے اور ہمیشہ نارِ جہنم میں رہیں گے۔ اللہ کی مسجد وہی آباد کرتا ہے جو اللہ اور روزِ قیامت پر ایمان رکھتا ہو اور نماز قائم کرتا ہو اور زکات ادا کرتا ہو اور اللہ کے سوا کسی سے نہ ڈرتا ہو، سو امیدوار ہیں وہ لوگ کہ ہدایت والوں میں سے ہوں گے۔''

اس آیت کی تفسیر بیان کرتے ہوئے مذاہبِ باطلہ و افکارِ ضالہ کے لیے شمشیر برہنہ فاتحِ قادیان مولانا ثناء اللہ امرتسری رحمہ اللہ، جن کے ساتھ مباہلے کے نتیجے میں مرزائیوں کا پیشوا مرزا غلام احمد اپنے انجام کو پہنچا تھا، وہ اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں:

''مشرکوں کو بھی ایک غلط خیال جم رہا ہے کہ ہم مسجد الحرام کی تعمیر و آبادی کرتے ہیں، اللہ کے ہاں ہمیں ثواب ملے گا، حالانکہ قانونِ الٰہی میں مشرکوں سے ممکن ہی نہیں کہ جس حالت میں وہ اپنے حق میں کفر کے مقر ہوں، وہ اللہ کی مسجدیں بھی آباد کریں، کیونکہ مسجدیں خالص توحیدی عبادت کے لیے ہیں اور یہ کام خالص موحدین کا حصہ ہے، ان مشرکوں کے تو تمام اعمال ضائع و برباد ہیں اور یہ ہمیشہ جہنم میں رہیں گے۔ حقیقت میں اللہ کی مسجدوں کو وہی لوگ آباد کرتے ہیں، جو اللہ اور روزِ قیامت پر ایمان رکھتے ہیں اور خود نماز پڑھتے ہیں، زکات ادا کرتے ہیں اور اللہ کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے، کیونکہ مسجد کی آبادی یہ ہے کہ اس میں اللہ کی خالص عبادت ہو۔''[1]

غرض کہ تعمیرِ مسجد کی خدمت انجام دینے والوں کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ سرٹیفکیٹ دیا گیا ہے کہ وہ ایمان لانے والے ہوتے ہیں۔ ان دونوں آیتوں کی تفسیر کے لیے تفسیر ابن کثیر (۲/ ۳۴۰، ۳۴۱) تفسیر قرطبی (۴/ ۶/ ۵۸) تفسیر مولانا شبیر احمد عثمانی (ص: ۲۴۵) اور دیگر کتبِ تفسیر دیکھی جا سکتی ہیں۔

---

[1] تفسیر ثنائی (ص: ۲۲۶) طبع ثنائی اکیڈمی لاہور

حدیث کی روشنی میں:

مساجد کی دیکھ ریکھ اور تعمیر و ترقی میں کوشاں اور ان کی آبادی میں دلی سکون محسوس کرنے والوں کے بارے میں اس قرآنی شہادتِ ایمان سے بڑھ کر اس عمل کی اور فضیلت کیا ہوسکتی ہے، جبکہ اسی پر بس بھی نہیں، بلکہ حدیث شریف میں بھی تعمیرِ مسجد کے بہت سارے فضائل وارد ہوئے ہیں۔

جنت میں گھر:

صحیح بخاری و مسلم، سنن ترمذی و ابن ماجہ اور مسند احمد میں حضرت عثمان ذوالنورین رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

1. «مَنْ بَنٰی لِلّٰہِ مَسْجِدًا بَنٰی اللّٰہُ لَہٗ بَیْتًا فِي الْجَنَّۃِ»[1]

''جس نے رضائے الٰہی کے لیے مسجد تعمیر کی، اللہ تعالیٰ اس کے لیے جنت میں گھر تعمیر کرتا ہے۔''

ایک اور روایت میں ہے:

«بَنٰی اللّٰہُ لَہٗ مِثْلَہٗ فِي الْجَنَّۃِ»[2]

''اللہ اس کے لیے ویسا ہی مکان جنت میں بناتا ہے۔''

2. رضائے الٰہی کا حصول شرط ہے، ورنہ ریا کاری تو عمل کو برباد کر دیتی ہے۔ اس لیے تعمیرِ مسجد کے لیے نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بنیاد بتائی ہے کہ اخلاص وللّٰہیت ہو۔ فخر ومباہات اور نمود ونمایش نہ ہو، چنانچہ اس بات کی صراحت ایک دوسری حدیث میں موجود ہے، جس میں طبرانی اوسط کی روایت کے مطابق ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا بیان فرماتی ہیں کہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«مَنْ بَنٰی مَسْجِدًا لَا یُرِیْدُ بِہٖ رِیَاءً وَّلَا سُمْعَۃً بَنٰی اللّٰہُ لَہٗ بَیْتًا فِي الْجَنَّۃِ»[3]

''جس نے کوئی مسجد بنائی، جس سے اس کی غرض ریا کاری نہیں ہے (بلکہ لوجہ اللہ بنائی)

---

[1] صحیح البخاري، رقم الحدیث (٤٥٠) مختصر صحیح مسلم، رقم الحدیث (٢٤٠) صحیح سنن الترمذي، رقم الحدیث (٢٦٣) سنن ابن ماجه، رقم الحدیث (٧٣٢) صحیح الجامع، رقم الحدیث (٦١٣١)

[2] صحیح البخاري، رقم الحدیث (٤٥٠) صحیح مسلم مع شرح النووي (٣/ ٥/ ١٤) صحیح الترغیب، رقم الحدیث (٢٦٤) صحیح الجامع، رقم الحدیث (٦١٣١) نیل الأوطار (١/ ٢/ ١٤٧)

[3] صحیح الترغیب، رقم الحدیث (٢٧٢)

اللہ اس کے لیے جنت میں گھر بنا تا ہے۔''

٣ بعض احادیث میں اس اجر وفضیلت کے لیے ایک اور شرط بھی لگائی گئی ہے کہ وہ مسجد ایسی جگہ پر ہو، جہاں لوگ نماز پڑھتے ہوں۔ ایسا نہ ہو کہ کہیں مسجد بنا دی، اسے خوب سجایا، لیکن نماز و جماعت کا کوئی اہتمام نہیں، بلکہ بند کیے رکھی یا ایسی جگہ بنائی جہاں لوگوں کا گزر ہی نہیں ہوتا تو ظاہر ہے کہ ایسی مسجد کا ثواب بھی تو ایسا ہی ہوگا۔ مسند احمد اور طبرانی میں حضرت واثلہ بن اسقع رضی اللہ عنہ سے مروی ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے:

«مَنْ بَنٰى مَسْجِدًا يُّصَلّٰى فِيْهِ بَنٰى اللّٰهُ عَزَّوَجَلَّ لَهٗ فِي الْجَنَّةِ أَفْضَلَ مِنْهُ»[1]

''جس نے ایسی مسجد بنائی جس میں نماز پڑھی جاتی ہے، اس کے لیے اللہ تعالیٰ جنت میں اس سے بھی عالیشان مکان بناتا ہے۔''

٤ سنن نسائی، مسند احمد اور شرح السنۃ بغوی میں حضرت عمرو بن عنبسہ رضی اللہ عنہ سے اور صحیح ابن حبان و سنن ابن ماجہ میں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے مروی ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے:

«مَنْ بَنٰى لِلّٰهِ مَسْجِدًا يُذْكَرُ فِيْهِ بَنَى اللّٰهُ بَيْتًا فِي الْجَنَّةِ»[2]

''جس نے ایسی مسجد تعمیر کی، جس میں اللہ کا ذکر ہوتا ہے، اللہ اس کے لیے جنت میں گھر بناتا ہے۔''

پہلی حدیث میں ((يُصَلّٰى فِيْهِ)) اور اس حدیث میں « يُذْكَرُ فِيْهِ » کے الفاظ ہیں، جبکہ معنیٰ و مفہوم دونوں کا نماز پڑھنے کو بالاولیٰ شامل ہے، کیونکہ نماز بھی تو ''ذکرِ الٰہی'' ہے۔

٥ یہ بھی کوئی ضروری نہیں کہ بہت بڑی جامع مسجد ہی بنائیں، تب جا کر یہ اجر وثواب ملتا ہے، بلکہ مسجد چھوٹی ہو یا بڑی، ہر طرح کی مسجد بنانے پر ثواب ملتا ہے، جیسا کہ سنن ترمذی میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں اس بات کی صراحت موجود ہے کہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

---

[1] صحيح الترغيب، رقم الحديث (٢٧١)

[2] مسند أحمد (٤/ ١١٣) شرح السنة (٢٤٢٠، باب ثواب العتق) صحيح سنن النسائي، رقم الحديث (٦٦٤) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٧٣٥) صحيح ابن حبان: الموارد (٣٠٠) صحيح الترغيب، رقم الحديث (٢٦٦) مشكاة المصابيح (٢/ ١٠١١)

«مَنْ بَنٰى لِلّٰهِ مَسْجِدًا صَغِيرًا كَانَ أَوْ كَبِيراً بَنَى اللّٰهَ لَهٗ بَيْتًا فِي الْجَنَّةِ»[1]

''جس نے کوئی چھوٹی یا بڑی مسجد بنائی، اللہ اس کے لیے جنت میں گھر بناتا ہے۔''

۶ بعض احادیث میں تو اس حد تک بھی ذکر آیا ہے کہ اگر کوئی شخص کبوتر کی مانند پرندے ''قطاۃ'' کے گھونسلے جتنی مسجد بنائے، تب بھی اسے اللہ تعالیٰ جنت میں گھر عطا فرمائے گا۔ ''قطاۃ'' کبوتر کی مانند وہ پرندہ ہے جو پانی کی تلاش میں کوسوں (میلوں) دور نکل جاتا ہے۔ پھر اپنے گھونسلے میں چلا آتا ہے اور اپنے بچے کو پانی پلاتا ہے اور یہ وہیں رہتا ہے، جہاں عموماً قرب و جوار میں گھاس اور پانی موجود ہو۔ عرب کے لوگ اس کی آواز سے پہچان لیتے تھے کہ یہاں قریب ہی کہیں پانی موجود ہے۔ عرب اس پرندے کو ''صدوق'' بھی کہتے ہیں۔[2]

اس پرندے قطاۃ کے گھونسلے کے برابر مسجد تعمیر کرنے پر بھی جنت میں گھر کی بشارت مسند بزار، معجم طبرانی صغیر اور صحیح ابن حبان میں حضرت ابو ذر غفاری رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں ہے، جس میں نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشادِ گرامی ہے:

«مَنْ بَنٰى لِلّٰهِ مَسْجِداً قَدْرَ مَفْحَصِ قَطَاةٍ بَنَى اللّٰهُ لَهٗ بَيْتًا فِي الْجَنَّةِ»[3]

''جس نے قطاۃ کے گھونسلے کے برابر بھی مسجد بنائی، اللہ اس کے لیے جنت میں گھر بنائے گا۔''

۷ جبکہ مسند احمد و بزار میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے:

«مَنْ بَنٰى لِلّٰهِ مَسْجِداً وَلَوْ كَمَفْحَصِ قَطَاةٍ لِبَيْضِهَا بَنَى اللّٰهُ لَهٗ بَيْتًا فِي الْجَنَّةِ»[4]

''جس نے اگرچہ صرف اتنی مسجد بنائی جتنا کہ قطاۃ انڈے دینے کے لیے گھونسا بناتا ہے، اللہ اس کے لیے بھی جنت میں گھر بناتا ہے۔''

۸ سنن ابن ماجہ اور صحیح ابن خزیمہ میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے تو اس سے بھی چھوٹی مسجد پر جنت میں گھر کی بشارت وارد ہوئی ہے، چنانچہ وہ بیان کرتے ہیں کہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

[1] صحيح الترغيب والترهيب (٢٦٩) ضعيف سنن الترمذي، رقم الحديث (٥٠) ضعيف الجامع، رقم الحديث (٥٥١٨)

[2] لغات الحديث (٥/ ١٢٦) كتاب ق، مصباح اللغات (ص: ٦٩٣ طبع مكتبه برهان جامع مسجد دهلى)

[3] ابن حبان: الموارد (٣٠١) صحيح الترغيب، رقم الحديث (٢٦٥)

[4] صحيح الترغيب، رقم الحديث (٢٦٨) صحيح الجامع، رقم الحديث (٦١٢٩)

«مَنْ بَنٰى لِلّٰهِ مَسْجِدًا وَلَوْ كَمَفْحَصِ قَطَاةٍ أَوْ أَصْغَرَ بَنَى اللّٰهُ لَهٗ بَيْتًا فِي الْجَنَّةِ» [1]

''جس نے اللہ کی رضا کے لیے مسجد بنائی، اگرچہ وہ قطاۃ نامی پرندے کے گھونسلے جتنی یا اس سے بھی چھوٹی ہی کیوں نہ ہو، اللہ اس کے لیے جنت میں گھر بناتا ہے۔''

قطاۃ کے گھونسلے والے الفاظ مصنف ابن ابی شیبہ میں حضرت عثمان والی حدیث میں، طبرانی اوسط میں حضرت انس اور ابن عمر رضی اللہ عنہم سے مروی احادیث میں اور حلیۃ الاولیاء میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں بھی وارد ہوئے ہیں۔[2]

اکثر اہلِ علم نے گھونسلے کے ذکر کو مبالغے پر محمول کیا ہے، کیونکہ قطاۃ کے انڈے دینے اور سونے والا گھونسلا تو اتنا بھی نہیں ہوتا کہ اتنی جگہ پر کوئی نماز پڑھی جا سکے۔ اس لفظ کے برائے مبالغہ ہونے کی تائید حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث کے الفاظ سے بھی ہوتی ہے، جو ابھی ہم نے ذکر کی ہے۔

بعض اہلِ علم نے کہا ہے کہ اس سے مراد مبالغہ نہیں، بلکہ اس سے اس کا ظاہر معنیٰ ومفہوم ہی مراد ہے کہ کہیں مسجد میں اتنی ہی ضرورت تھی جو پوری کر دی گئی تو اس اضافے کا یہ مقام ہوگا یا پھر یہ کہ مسلمانوں کی ایک جماعت یعنی کئی افراد نے مشترکہ طور پر ایک مسجد تعمیر کی اور ہر ایک کے حصے میں پوری مسجد سے اتنی جگہ کا تعمیر ہونا ہی آیا جتنا گھونسلا ہوتا ہے، تب بھی اسے اللہ تعالیٰ جنت میں گھر عطا کرے گا اور جنت میں گھر کا مِلنا دخولِ جنت کی صاف صاف ضمانت ہے، کیونکہ جو جنت میں داخل نہیں ہوتا، وہ اس گھر میں کیسے داخل ہوگا، جو اُس کے لیے جنت میں بنایا جائے گا؟ گویا جنت میں گھر ملنے کا صاف صاف مفہوم جنت میں داخل کیا جانا ہے۔[3]

9. جنت میں داخل کیے جانے اور جنت میں گھر عطا کیے جانے کی بشارتیں بعض دیگر احادیث میں بھی وارد ہوئی ہیں، جن میں سے ایک امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ سے سنن ابن ماجہ میں مروی ہے، جس میں وہ بیان کرتے ہیں کہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

«مَنْ بَنَى لِلّٰهِ مَسْجِدًا بَنَى اللّٰهُ لَهٗ بَيْتًا فِي الْجَنَّةِ» [4]

---

[1] سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٧٣٨) صحيح الجامع، رقم الحديث (٢١٦٨) صحيح الترغيب (٢٦٧)

[2] فتح الباري (١/ ٥٤٥) نيل الأوطار (١/ ٢/ ١٤٨، ١٤٩)

[3] حوالہ جاتِ سابقہ۔

[4] سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٧٣٧) صحيح الجامع، رقم الحديث (٦١٢٧)

''جس نے اللہ کی رضا حاصل کرنے کی خاطر مسجد بنائی، اللہ اس کے لیے جنت میں گھر بناتا ہے۔''

⑩ مسند احمد میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے اور معجم طبرانی میں حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ سے مروی ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے:

«مَنْ بَنٰى لِلّٰهِ مَسْجِدًا بَنَى اللّٰهُ لَهٗ بَيْتًا فِي الْجَنَّةِ أَوْسَعَ مِنْهُ»[1]

''جس نے اللہ کی رضا کے لیے مسجد بنائی، اللہ اس کے لیے اس مسجد سے بھی بڑا گھر بناتا ہے۔''

⑪ سنن ابن ماجہ وبیہقی اور صحیح ابن خزیمہ میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ایک حدیث میں ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے کہ مرنے کے بعد مومن کو اس کے جن اعمال کی نیکیاں پہنچتی رہتی ہیں، ان میں سے مندرجہ ذیل اعمال ہیں:

1. اس کا سکھلایا ہوا اور نشر کیا ہوا علم۔
2. نیک اولاد۔
3. وراثت میں چھوڑا ہوا مصحف یعنی قرآنِ مجید۔
4. اس کا بنایا ہوا مسافر خانہ۔
5. اس کی جاری کردہ پانی کی نہر (یا کنوں، نلکا وغیرہ)۔
6. اس کا نکالا ہوا وہ صدقہ جو اس نے باہوش وحواس اور تندرست ہونے کی حالت میں کیا ہو۔
7. ان چھے اعمال کے علاوہ ایک ساتواں عمل اس حدیث میں نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو بتایا ہے وہ ہے:

«أَوْ بَنٰى مَسْجِداً»[2] ''یا اس نے کوئی مسجد بنا دی ہو۔''

یہ جو بعض احادیث میں اس مسجد سے بھی بڑا اور کھلا گھر دینے یا اس مسجد سے افضل مکان دینے کا یا اسی کے مثل گھر عطا کرنے کا ذکر آیا ہے تو یہ ہے ''جزاء من جنس العمل'' رہا مثل، افضل یا وسیع تو یہ کوئی مقابلے کی باتیں نہیں، کیونکہ ایک صحیح حدیث کی رو سے جنت کی تو ایک بالشت جگہ

---

[1] فتح الباري (١/ ٥٤٦) صحيح الترغيب، رقم الحديث (٢٧٠)

[2] سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٢٤٢) صحيح الترغيب (٧٤، ١٠٨، ٢٧٣) ایسے ہی شعب الایمان بیہقی میں سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے اور معجم طبرانی میں حضرت ابو قرصافہ رضی اللہ عنہ سے بھی بعض حسن احادیث مروی ہیں۔ (الفتح: ١/ ٥٤٥)

دنیا و ما فیہا سے بہتر ہے۔ جنت میں گھر اگرچہ کمیت میں ایک ہی ہوگا، البتہ کیفیت اور حسن و جمال نیز شان و شوکت میں بدرجہا بہتر ہوگا۔

⑫ ہم تعمیرِ مسجد کے فضائل کو ایک ایسی حدیث پر ختم کرنا چاہتے ہیں، جس کے بعد کسی دوسری فضیلت کے ذکر کی ضرورت ہی نہیں رہ جاتی اور وہ حدیث ایسی ہے، جس میں نبیِ اکرم ﷺ نے مساجد کو اللہ کے گھر قرار دیا ہے۔ خانہ کعبہ تو اللہ کا گھر ہے، جو ''بیت اللہ'' کے نام سے معروف ہے، جبکہ مسجد تعمیر کرنے والے کو قیامت کے دن جنت کی بشارت اور جنت میں گھر دینے کی خوشخبری کے لیے نبیِ اکرم ﷺ نے جو عمل بتایا ہے، وہ ''الفوائد للسمویہ'' میں ام المومنین حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا کی روایت کے مطابق یہ عمل ہے:

((مَنْ بَنٰی لِلّٰہِ بَیْتًا)) [1] ''جس نے اللہ کے لیے گھر بنایا۔''

اندازہ فرمائیں کہ نبیِ اکرم ﷺ کی تعبیر جمیل کے مطابق جو شخص اللہ کا گھر تعمیر کرے گا، اسے خالقِ کائنات سے کیا کیا خوشنودیاں اور انعامات نہیں ملیں گے۔ اسی حدیث میں یہ صراحت بھی آ گئی کہ مسجدیں اللہ کے گھر ہوتے ہیں، یہ کوئی عام سی عمارتیں نہیں ہوتیں، انھیں تو اللہ کے گھر ہونے کا شرفِ عظیم حاصل ہوتا ہے، لہٰذا ان کی عزت و قدر اور احترام و اکرام بھی اسی نظر سے کرنا چاہیے۔

مساجد کی زرکاری و گُل کاری کی ممانعت:

البتہ یہاں ایک بات پیشِ نظر رہے کہ اسلام سادگی کا مذہب ہے، اس کی تعلیمات سادہ ہیں اور وہ اپنے ماننے والوں سے سادگی کا مطالبہ کرتا ہے، حتیٰ کہ مساجد کے سلسلے میں بھی اسی سادگی کا حکم دیا ہے کہ ان میں زرکاریاں یا گُل کاریاں کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ یہ نقش و نگار اور بیل بوٹے اسلام کے مزاج سے کوئی نسبت نہیں رکھتے۔ خاص مساجد کے علاوہ بھی بعض امور سے اس بات کا پتا چلتا ہے، مثلاً صحیح بخاری و مسلم، مسند احمد اور دیگر کتبِ حدیث میں ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ انھوں نے اپنے گھر میں کوئی ایسا پردہ لگایا، جس میں تصاویر تھیں:

((فَدَخَلَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ فَنَزَعَہٗ)) [2]

---

[1] فتح الباري (۱/ ۵۴۵) و حسنه.

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (۵۹۵۴، ۵۹۵۵) صحيح مسلم مع شرح النووي (۷/ ۱۴/ ۸۶ تا ۸۹) نيل الأوطار (۲۴۷۹، ۱۱۰۹، ۱/ ۲/ ۱۰۳ واللفظ له)

’’نبیِ اکرم ﷺ تشریف لائے تو آپ ﷺ نے اس پردے کو اتار دیا۔‘‘

جبکہ چھبیس مقامات، جہاں نماز کی ممانعت شمار کی گئی ہے، انھی کے ضمن میں ہم ایک حدیث ذکر کر آئے ہیں کہ صحیح بخاری و مسند احمد کے مطابق حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے بقول ہی نبیِ اکرم ﷺ نے ایسے پردے کی موجودگی میں نماز پڑھی تو فرمایا:

«أَزِيْلِيْ عَنِّيْ قِرَامَكِ هٰذَا، فَإِنَّهٗ لَا تَزَالُ تَصَاوِيْرُهٗ تَعْرِضُ لِيْ فِيْ صَلَاتِيْ»[1]

’’اپنا یہ پردہ میرے سامنے سے غائب کر دو، کیونکہ اس کی تصویریں میری نماز میں میرے سامنے آتی رہی ہیں۔‘‘

ان احادیث میں ایک تو تصویروں کو آویزاں کرنے کی ممانعت و مذمت ہے، دوسرے یہ کہ ایسی کوئی سجاوٹ والی چیز جو تصویروں یا عام نقش و نگار والی ہو، نمازی کے سامنے یا قریب اس کا وجود ایک ناپسندیدہ چیز ہے، کیونکہ اس سے نماز میں خشوع و خضوع متاثر ہوتا ہے۔ یہ تو گھر یا عام جگہ کا معاملہ ہے، جس سے اسلام کا مزاج سمجھا جا سکتا ہے کہ وہ مساجد جو بنی ہی صرف عبادت کے لیے ہوں، ان میں نقش و نگار اور بیل بوٹوں کو کیسے گوارا کرے گا؟ یہی وجوہات ہیں کہ تعمیرِ مساجد کا بے شمار اجر و ثواب بیان کرنے اور اس کی ترغیب دلانے کے ساتھ ساتھ نبیِ اکرم ﷺ نے اس بات سے منع فرما دیا ہے کہ مساجد میں بیل بوٹے اور نقش و نگار بنا کر انھیں مزخرف نہ کیا جائے اور نہ ان کی تعمیر میں اسراف و تبذیر سے کام لیا جائے، چنانچہ سنن ابی داود اور صحیح ابن حبان میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبیِ اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

«مَا أُمِرْتُ بِتَشْيِيْدِ الْمَسَاجِدِ»[2]

’’مجھے اس بات کا حکم نہیں دیا گیا کہ میں اونچی اونچی مساجد تعمیر کروں۔‘‘

اس حدیث میں وارد لفظ ’’تشیید‘‘ کا معنیٰ شرح السنۃ میں امام بغوی نے، ایسے ہی ابن رسلان نے اونچی اونچی عمارت والی مسجد بنانا ہی لکھا ہے، اس سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ قرآنِ کریم کی سورۃ النور میں جو ارشادِ الٰہی ہے:

---

[1] رياض الصالحين (ص: ٦٣١۔ ٦٣٣) نيل الأوطار (١/ ٢/ ١٦٣، ١٦٤)

[2] صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٣١) صحيح الجامع (٣/ ٥/ ١٢٧) مشكاة المصابيح (١/ ٢٢٤)

﴿ فِيْ بُيُوْتٍ اَذِنَ اللّٰهُ اَنْ تُرْفَعَ وَيُذْكَرَ فِيْهَا اسْمُهٗ ﴾ [النور: ٣٦]

''ایسے گھروں میں جنھیں بلند کرنے اور جن میں اپنے نام کی یاد کا اللہ نے اذن دیا ہے۔''

اس آیت میں اگرچہ ﴿تُرْفَعَ﴾ کا ظاہری و حقیقی معنیٰ تو بلند کرنا ہی ہے، لیکن اس لفظ سے اس کا مجازی معنیٰ مراد لینا ضروری ہے اور ﴿تُرْفَعَ﴾ کا وہ مجازی معنیٰ ہے، مساجد کی تعظیم کرنا کہ اس میں کسی غیر اللہ کا ذکر نہ ہو، انھیں ہر قسم کی ظاہری و باطنی نجاستوں اور غلاظتوں سے پاک صاف رکھا جائے اور ان میں شور و شغب کی آوازیں بلند نہ کی جائیں، بلکہ انھیں ایسے تمام امور سے بالاتر رکھا جائے۔

اس حدیث کی روشنی میں اس آیت کا یہی مجازی معنیٰ ہی متعین ہوتا ہے، ورنہ قرآن و سنت میں تصادم لازم آئے گا، جو درحقیقت ہوتا ہی نہیں، جیسا کہ اہلِ علم نے طے کیا ہے، جس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں۔ پھر اونچی اونچی مساجد کی تعمیر انھیں مزخرف کرنے اور ان میں بیل بوٹے بنانے کا راستہ کھولتی ہے، لہٰذا انھیں اس انداز سے بنانے ہی کی ممانعت کر دی گئی ہے، تاکہ کسی فتنے کا خدشہ ہی نہ رہے۔ مساجد کو نقش و نگار سے سجانا یہود و نصاریٰ کا فعل شمار کیا گیا ہے، جیسا کہ سنن ابو داود اور صحیح ابن حبان میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی حدیث کے آخر میں خود حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول موقوفاً مروی ہے، جسے بخاری شریف کے ایک ترجمۃ الباب میں امام بخاری نے تعلیقاً بیان کیا ہے، اس میں وہ فرماتے ہیں:

« لَتُزَخْرِفُنَّهَا كَمَا زَخْرَفَتِ الْيَهُوْدُ وَالنَّصَارٰى »[1]

''تم مساجد کو یہودیوں اور عیسائیوں کی طرح خوبصورت و مزین کرو گے۔''

اونچی اونچی مساجد کی تعمیر پہلے تزئین و زخرفہ کا سبب بنتی ہے، جسے یہود و نصاریٰ کا فعل قرار دیا گیا ہے، پھر یہ مساجد کی تزئین و تجمیل فخر و مباہات کا ذریعہ بن جاتی ہے، جس پر نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے وعید فرمائی ہے۔[2]

فخر و مباہات:

جب اونچی اونچی مساجد تعمیر کی جائیں گی تو ان پر نقش و نگار ہوگا، پھر ایک دوسرے کی دیکھا

---

[1] فتح الباري (١/ ٥٤٠) نيل الأوطار (١/ ٢/ ١٥٠)

[2] صحيح البخاري مع الفتح (١/ ٥٣٩) صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٣١) ابن حبان: الموارد (٣٠٥) منتقى الأخبار (١/ ٢/ ١٤٩، ١٥٠)

دیکھی زیادہ آرایش وتزئین کی کوششیں شروع ہوجائیں گی، حتیٰ کہ یہ سلسلہ باہم فخر ومباہات کا سبب بن جائے گا، جس کی نبیِ اکرم ﷺ نے سخت مذمت فرمائی ہے، جیسا کہ صحیح بخاری میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے تعلیقاً اور موقوفاً اور صحیح ابن خزیمہ، مسند ابی یعلی اور شرح السنۃ بغوی میں موصولاً اور مرفوعاً مروی ہے کہ نبیِ اکرم ﷺ نے فرمایا:

«يَأْتِي عَلَى أُمَّتِي زَمَانٌ يَبَاهَوْنَ بِالْمَسَاجِدِ، وَلَا يُعَمِّرُوْنَهَا إِلَّا قَلِيْلًا»[1]

''میری امت کے لوگوں پر ایسا وقت بھی آئے گا کہ وہ مساجد پر فخر و مباہات کریں گے، لیکن سوائے چند لوگوں کے انھیں (نماز و جماعت اور ذکرِ الٰہی سے) آباد کوئی نہیں کریں گے۔''

ایسے ہی سنن ابو داود، نسائی، ابن ماجہ، صحیح ابن حبان اور مسند احمد میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبیِ اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

«لَا تَقُوْمُ السَّاعَةُ حَتّٰى يَتَبَاهٰى النَّاسُ فِيْ الْمَسَاجِدِ»[2]

''اس وقت تک قیامت نہیں آئے گی جب تک لوگ مساجد کے بارے میں فخر و مباہات میں نہ مبتلا ہوجائیں گے۔''

مسجدِ نبوی ﷺ کی تجدید وتوسیع:

یہ بات ہم حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی زبانی صحیح بخاری شریف کے حوالے سے پہلے بھی ذکر کر چکے ہیں کہ نبیِ اکرم ﷺ کی مسجد مبارک (مسجد نبوی ﷺ) آپ ﷺ کے عہدِ مبارک میں اینٹوں کی بنی ہوئی تھی، کھجور کی ٹہنیوں اور پتوں کی چھت تھی اور کھجور کے تنوں ہی کے ستون تھے، حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اس میں کوئی اضافہ نہیں کیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس میں کچھ توسیع کی، لیکن اسے نبیِ اکرم ﷺ کی تعمیر کے مطابق ہی اینٹوں اور کھجور کے پتوں یا ٹہنیوں سے بنایا اور کھجور کے تنوں کے

[1] صحيح البخاري مع الفتح (١/ ٥٣٩) نيل الأوطار (١/ ٢/ ١٥١)

[2] صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٣٢) صحيح سنن النسائي، رقم الحديث (٦٦٥) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٧٣٩) موارد الظمآن (٣٠٧، ٣٠٨) صحيح الجامع، رقم الحديث (٣/ ٦/ ١٧٤۔ ١٧٥) فتح الباري (١/ ٥٣٩)

ستون بنائے۔ پھر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اس میں بہت توسیع کی، اس کی دیواریں منقش پتھروں اور چونے سے بنائیں۔ اس کے ستون بھی منقش پتھروں کے بنائے اور اس کی چھت ساگوان کی لکڑی کی بنوائی۔ یہ بخاری شریف (۱/ ۵۴۰) "كتاب الصلاة، باب بنيان المسجد" میں وارد شدہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث کے الفاظ ہیں۔ ایسے ہی حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے بھی مروی ہے۔[1]

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بارے میں صحیح بخاری میں مذکور ہے کہ انھوں نے جب مسجدِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی تجدید و توسیع کروائی تو فرمایا:

"أُكِنُّ النَّاسَ مِنَ الْمَطَرِ" "میں لوگوں کو بارش سے بچاتا ہوں۔"

ساتھ ہی معمار کو حکم فرمادیا:

"إِيَّاكَ أَنْ تُحَمِّرَ وَتُصَفِّرَ فَتَفْتِنُ النَّاسَ"

"خبردار! مسجد کو لال پیلا رنگ نہ کرو، یہ لوگوں کے لیے باعثِ فتنہ ہوگا۔"

اندازہ فرمائیں کہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہدِ مبارک میں جب چار دانگِ عالم کی دولت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے قدموں میں ڈھیر ہوگئی تھی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم چاہتے تو عالی شان سے عالی شان مسجد بنوا سکتے تھے، لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مٹی کی اینٹوں اور کھجور کے تنوں اور پتوں سے مسجد بنوائے رکھی، حضرت صدیق رضی اللہ عنہ نے اس میں سرِمو فرق نہیں آنے دیا۔

پھر جب حضرتِ فاروق کی خلافت کا زمانہ آیا تو کھجور کے پتوں اور تنوں کے بوسیدہ ہو جانے کی وجہ سے مسجدِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی تجدید اور مسلمانوں کی تعداد بڑھ جانے کی وجہ سے اس کی توسیع کی ضرورت محسوس ہوئی تو باوجود بے شمار فتوحات کے اور دور دراز کے ملکوں کا مال آ جانے کے حضرتِ فاروق رضی اللہ عنہ نے بھی مسجدِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کو انھی اشیا سے بنوایا، جن سے اسے نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بنوایا تھا، وہ چاہتے تو دنیا جہان کی دولتیں قدموں میں ڈھیر تھیں، اتنی عالی شان مسجد بنوا لیتے کہ دنیا دیکھتی، لیکن انھوں نے ایسا کرنا تو کجا، معمار کو لال پیلے رنگ و روغن سے بھی سختی کے ساتھ منع فرما دیا، تاکہ یہ رنگ و روغن اور یہ گُل کاریاں کہیں لوگوں کے لیے باعثِ فتنہ نہ بن جائیں، یعنی نماز کے دوران توجہ نہ ہٹا دیں اور ان کے خشوع و خضوع میں حارج اور نماز میں مخل نہ ہوں۔ شارح بخاری امام ابن بطال رحمہ اللہ نے کہا ہے

---

[1] فتح الباري (۱/ ۵۳۹) منتقى الأخبار (۱/ ۲/ ۱۵۱)

کہ حضرت عمرِ فاروق رضی اللہ عنہ کو گویا نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ابوجہم کی بیل بوٹوں یا دھاریوں والی چادر انھیں واپس لوٹانے اور یہ فرمانے والی یہ بات یاد تھی:

« إِنَّهَا أَلْهَتْنِي عَنْ صَلَاتِي » ''اس نے مجھے میری نماز سے بے دھیان کر دیا تھا۔''

اس سے حضرتِ فاروق رضی اللہ عنہ نے یہ بات سمجھی تھی کہ مسجد کو نقش و نگار اور رنگا رنگ بیل بوٹوں سے پاک رکھنا ہی ضروری ہے، اسی لیے انھوں نے ایسی مسجد تعمیر کروائی اور معمار کو ایسا حکم فرمایا۔

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس بات کا احتمال بھی موجود ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس خاص اس مسئلے سے تعلق رکھنے والا کچھ علم ہو، چنانچہ سنن ابن ماجہ میں عمرو بن میمون کے طریق سے امیر المومنین حضرت عمرِ فاروق رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً مروی ہے:

« مَا سَاءَ عَمَلُ قَوْمٍ قَطُّ إِلَّا زَخْرَفُوْا مَسَاجِدَهُمْ »[1]

''کوئی قوم جب بُرے افعال پر اتر آتی ہے تو وہ اپنی مسجدوں کو سجانا شروع کر دیتی ہے۔''

اس حدیث کی سند کے تمام رواۃ ثقہ ہیں، سوائے جبارۃ بن مغلس کے، ان کے بارے میں محدّثین نے کلام کیا ہے۔ بہر حال جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا دورِ خلافت آیا تو اس وقت بھی بیت المال میں بہت پیسہ تھا، انھوں نے بھی مسجد میں توسیع و تجدید کی اور پہلے کی نسبت تعمیرِ مسجد میں استعمال ہونے والے مواد میں بھی کچھ تبدیلی کر دی، مثلاً پہلے مٹی کی اینٹوں سے دیواریں بنی ہوئی تھیں، انھوں نے وہ منقش پتھر سے بنوائیں، ایسے ہی پہلے تو مسجد کے ستون کھجور کے تنوں سے بنوائے گئے تھے، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے وہ بھی منقش پتھر کے بنوائے۔ پہلے مسجدِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی چھت بھی کھجور کی ٹہنیوں یا پتوں کی تھی، لیکن حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ہندوستان میں پائی جانے والی ساگوان کی لکڑی سے مسجدِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی چھت کو بنوایا، جیسا کہ صحیح بخاری میں یہ بات وارد ہوئی ہے۔ بظاہر یہ کوئی زخرفہ یا بے جا قسم کی نقش نگاری بھی نہیں تھی، لیکن پہلے کی نسبت کچھ فرق واضح طور پر موجود تھا۔

چونکہ ایسا کرنے سے مسجد میں نبوی طرز کی سادگی کے بجائے زیب و زینت کا کچھ عنصر آ گیا تھا، لہٰذا قدسی نفوس صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اور تابعین رحمہم اللہ کی طبائع نفیسہ پر اتنا بھی گراں گزرا، انھوں نے ان کی تجدید و توسیع پر نکیر کی تھی اور اسے نظرِ استحسان سے بھی نہیں دیکھا تھا۔ الجواب الباہر میں شیخ الاسلام

[1] سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٧٤١)

امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کی تحقیق کے مطابق اکثر صحابہ وتابعین نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی توسیع وتجدید سے اتفاق نہیں کیا تھا۔[1]

ایسے ہی فتح الباری میں بھی بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی طرف سے عدمِ استحسان کا تذکرہ (۱/ ۵۴۰) اشارتاً اور (۱/ ۵۴۵) صراحتاً موجود ہے اور حضرت کعب الاحبار رضی اللہ عنہ کا اسمِ گرامی بطورِ خاص مذکور ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم، خلفاے راشدین اور عام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم عام زندگی کے معمولات کی طرح ہی تعمیرِ مسجد کے معاملے میں بھی سادگی پسند تھے اور وہ مساجد کے بناؤ سنگھار کو ناپسند کرتے تھے۔ مساجد کی زیب و زینت کا آغاز عہدِ صحابہ رضی اللہ عنہم کے آخری دور میں شروع ہوا اور سب سے پہلے ولید بن عبدالملک نے مساجد میں نقش و نگار کیے، جس پر فتنہ کھڑا ہونے کے ڈر سے اکثر اہلِ علم خاموش رہے۔

رخصت اور تقریب:

بعض اہلِ علم نے مساجد کی سجاوٹ کرنے کی اجازت دی ہے، جن میں سے امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ بھی ہیں، لیکن اس کے لیے بھی انھوں نے یہ شرائط ذکر کی ہیں:

۱. فخر ومباہات یا نمود ونمایش کے لیے نہیں، بلکہ یہ فعل خالص احترام وتعظیمِ مسجد کے جذبے سے ہو۔

۲. مسجد کی سجاوٹ پر مسلمانوں کے بیت المال سے دولت صرف نہ کی جائے (جو حوائج ضروریہ کے لیے ہوتی ہے، بلکہ اس پر اپنی جیب خاص سے پیسا خرچ ہو، امام صاحب موصوف رحمہ اللہ کی رائے جیسا ہی ایک شارح بخاری البدر ابن المنیر کا قول بھی ہے۔

موصوف فرماتے ہیں:

”لَمَّا شَيَّدَ النَّاسُ بُيُوتَهُمْ، وَزَخْرَفُوهَا نَاسَبَ أَنْ يُّصْنَعَ ذٰلِكَ بِالْمَسَاجِدِ صَوْنًا لَهَا عَنِ الْإِسْتِهَانَةِ“[2]

”جب لوگوں نے اپنے گھر اونچے اونچے بنا لیے اور ان کی سجاوٹیں کر ڈالیں تو اب مناسب یہی تھا کہ مساجد کے ساتھ بھی ایسا ہی کیا جائے، تاکہ ان کے وقار واحترام میں

---

[1] الجواب الباهر ضمن مجموع الفتاویٰ (۲۷/ ۴۱۸) و مترجم اُردو (ص: ۱۶۶)

[2] فتح الباري (۱/ ۵۴۱) نیل الأوطار (۱/ ۲/ ۱۵۰)

کمی نہ آنے پائے۔‘‘

بالکل اسی معنیٰ ومفہوم پر مشتمل ایک فتویٰ بھی ہماری نظر سے گزرا ہے، جو کہ چند ماہ پیشتر ہی ایک دینی پرچے میں شائع ہوا تھا، جس کے فتویٰ نویس غالباً مولانا حافظ عبدالستار الحماد تھے۔ امام ابن المنیر کا قول نقل کر کے شارح بخاری حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے اس کا تعاقب کیا ہے، جو حافظ عبدالستار الحماد کا تعاقب بھی شمار کیا جا سکتا ہے، اس میں صاحب فتح الباری لکھتے ہیں:

’’إِنَّ الْمَنْعَ إِنْ كَانَ لِلْحَثِّ عَلَىٰ إِتِّبَاعِ السَّلَفِ فِي تَرْكِ الرَّفَاهِيَةِ ۔فَهُوَ كَمَا قَالَ۔ وَإِنْ كَانَ لِخَشْيَةِ شُغُلِ بَالِ الْمُصَلِّي بِالزَّخْرَفَةِ فَلَا، لِبَقَاءِ الْعِلَّةِ‘‘[1]

’’اگر مساجد میں نقش و نگار کی ممانعت کا سبب سلف صالحین کے ترکِ تنعّم کی اتباع کے نقطۂ نظر سے تھا تو پھر ایسے ہی ہے، جیسے موصوف نے کہا ہے اور اگر اس کا سبب یہ تھا کہ یہ نمازی کی توجہ کھینچتے ہیں تو پھر ان کی بات صحیح نہیں ہے، کیوں کہ یہ سبب تو آج بھی موجود ہے۔‘‘

اگر تھوڑی سی گہرائی کے ساتھ سوچا جائے تو صاحبِ فتح الباری رحمہ اللہ کے تعاقب میں مذکور دونوں وجوہات یعنی ترکِ تنعّم میں اتباعِ سلف صالحین اور نمازی کے مساجد میں بنائے جانے والے نقش و نگار میں کھو کر نماز سے بے توجہ ہوجانے سے بھی ایک کا تعین کیا جا سکتا ہے کہ بیل بوٹوں اور نقش و نگار کی ممانعت محض ترکِ تنعّم میں اتباعِ سلف صالحین کے لیے نہیں تھی، بلکہ یہ حقیقت دوسرے سبب کے لیے ہی تھی کہ ان سے نمازی کی توجہ متاثر ہوتی ہے اور خشوع وخضوع میں فرق پڑتا ہے، حالانکہ یہ نماز کے لیے خاص اہمیت رکھنے والی چیزیں ہیں، حتیٰ کہ نماز بلاخشوع کو ’’جسم بلا روح‘‘ قرار دیا گیا ہے۔[2] جس نماز میں خشوع وخضوع نہ ہو، وہ نماز ایسے ہی ہے، جیسے کوئی بے جان و بے روح لاش ہو۔ اس ممانعت کے دوسرے سبب کے لیے ہونے پر ان احادیث سے استدلال کیا جا سکتا ہے جو ہم نے پچھلے اوراق میں ذکر کر دی ہیں، جن میں سے بعض مندرجہ ذیل ہیں:

1 نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز پڑھنے کے بعد حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو پردہ ہٹا دینے کا حکم فرمایا۔

---

[1] فتح الباري أيضاً و نيل الأوطار (١/ ٢/ ١٥٠)

[2] نيل الأوطار (١/ ٢/ ١٥١)

2 دوسری روایت کی رو سے خود کھینچ کر اتار دیا۔

3 تیسری وہ حدیث ہے، جس میں نبیِ اکرم ﷺ کا ابوجہم کی چادر واپس لوٹانا مذکور ہے، جس میں بیل بوٹے یا دھاریاں تھیں اور آپ ﷺ نے یہ کہتے ہوئے وہ چادر لوٹا دی کہ اس نے مجھے نماز میں بے دھیان کر دیا ہے۔

ان تینوں احادیث سے اور خصوصاً ان میں سے جس میں یہ مذکور ہے کہ نماز میں اس پردے کی تصویریں میرے سامنے آتی رہی ہیں، یہ دلیل لی جا سکتی ہے کہ یہ ممانعت نماز میں التفات کے انسداد کے لیے ہے، عیش و عشرت ترک کرنے میں سلف صالحین کے اتباع کی نظر سے نہیں۔

مساجد میں نقش و نگار کرنے کی ممانعت کے دلائل تو ذکر کر دیے گئے ہیں اور یہی قول قوی اور راجح بھی ہے، جبکہ جواز کے قائلین نے بھی بعض دلائل پیش کیے ہیں، لیکن وہ بڑے بے جان سے ہیں، حتیٰ کہ امام شوکانی رحمہ اللہ نے تو ان کے دلائل کے بارے میں نیل الاوطار میں یہ تک کہہ دیا ہے کہ مویشیوں کی منڈی میں تو شاید ایسے دلائل کوئی کام دے جائیں، لیکن علم کے میدان میں وہ کسی کام کے نہیں ہیں۔[1]

جب ان کی پوزیشن یہ ہے تو پھر انھیں ذکر کر کے بات کو طول کیوں دیا جائے! ہاں ایک بات جو یہاں کہنا ضروری ہے اور اس سے ویسے بھی مانعین اور قائلین دونوں کے مابین کچھ تقریب و موافقت اور مطابقت پیدا ہو جاتی ہے کہ مسجد کو فخر و مباہات کا ذریعہ بنائے بغیر حسبِ ضرورت جتنی بڑی مسجد بھی بنانا چاہیں بنا لیں، دورِ حاضر کی عمدہ تعمیرات کے انداز سے خوبصورت بھی بنا لیں، تاکہ بڑی بڑی عمدہ قسم کی بنی ہوئی عمارتوں کے مقابلے میں وہ مساجد کچھ کمتر محسوس نہ ہوں، البتہ ان کی محرابوں یا دیواروں کو صرف ایک ہی رنگ کریں، جو سفید یا کریم ہو اور ان پر اور چھتوں پر کہیں بھی بیل بوٹے بنائیں نہ گُل کاریاں کریں، بلکہ زرکاری و گل کاری کے بغیر ہی سادہ انداز سے رہنے دیں، اس طرح مسجد خوبصورت بھی بنے گی، سادہ بھی ہوگی اور ممانعت کی حدود سے بھی نکل جائے گی، اس سلسلے میں خلیجی ممالک کی مساجد پر ہمیں بہت اطمینان ہے۔ كثر الله أمثالها في بلادنا. آمین

مساجد کی نظافت اور صفائی وستھرائی:

حسبِ ضرورت مسجد بنائی جائے، چاہے کتنی ہی بڑی کیوں نہ ہو، اسے سفید یا کریم رنگ کیا

[1] نیل الأوطار (۱/ ۲/ ۱۵۱)

جائے اور بیل بوٹوں سے پاک صرف سادہ ہی رکھا جائے تو پھر اس کی صفائی ستھرائی میں کوئی ممانعت نہیں، بلکہ الٹا نبیِ اکرم ﷺ نے اس کا حکم فرمایا ہے، چنانچہ سنن ابو داود، ترمذی، ابن ماجہ، صحیح ابن خزیمہ اور مسند احمد میں ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے:

«أَمَرَنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ بِبِنَاءِ الْمَسَاجِدِ فِي الدُّوْرِ، وَأَنْ تُنَظَّفَ وَأَنْ تُطَيَّبَ»[1]

''نبیِ اکرم ﷺ نے ہمیں قبائل کے ڈیروں (دیہات) میں مساجد بنانے کا حکم فرمایا اور یہ بھی حکم فرمایا کہ انھیں پاک صاف اور خوشبو سے معطر رکھیں۔''

ایک دوسری حدیث مسند احمد میں حضرت سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، جس میں وہ بیان کرتے ہیں:

«أَمَرَنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ أَنْ نَتَّخِذَ الْمَسَاجِدَ فِيْ دِيَارِنَا وَأَمَرَنَا أَنْ نُّنَظِّفَهَا»[2]

''نبیِ اکرم ﷺ نے ہمیں حکم فرمایا کہ ہم اپنے قبائل کے ڈیروں (دیہات) میں مساجد بنائیں اور انھیں صاف ستھرا رکھیں۔''

مسجد کی صفائی وستھرائی کا اہتمام کرنے والوں کے مقام ومرتبے کا اندازہ ان احادیث سے کیا جا سکتا ہے، جن میں سے ایک صحیح بخاری ومسلم، سنن ابن ماجہ اور ابن خزیمہ میں ہے، جس میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں:

«إِنَّ رَجُلًا أَسْوَدَ أَوِ امْرَأَةً سَوْدَاءَ، كَانَ يَقُمُّ الْمَسْجِدَ، فَمَاتَ فَسَأَلَ النَّبِيُّ ﷺ عَنْهُ فَقَالُوْا: مَاتَ. قَالَ: أَفَلَا كُنْتُمْ آذَنْتُمُوْنِيْ بِهٖ؟ دُلُّوْنِيْ عَلٰى قَبْرِهٖ، أَوْ قَالَ: قَبْرِهَا فَأَتٰى قَبْرَهٗ فَصَلّٰى عَلَيْهِ»[3]

''ایک کالے رنگ کا مرد یا کالی عورت مسجدِ نبوی ﷺ کی صفائی کیا کرتی تھی۔ وہ وفات پا گئی۔

---

[1] صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٣٦) صحيح سنن الترمذي، رقم الحديث (٤٨٧) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٧٥٩) ابن خزيمة، رقم الحديث (٥٧٤) ابن حبان: الموارد (٣٠٦) صحيح الترغيب والترهيب (١/ ١١٢)

[2] صحيح الترغيب والترهيب (١/ ١١٢)

[3] صحيح البخاري مع الفتح (١/ ٥٥٢، ٥٥٣) مختصر صحيح مسلم للمنذري (٥٧٩) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٥٢٧) صحيح الترغيب (١/ ١١٢)

نبیِ اکرم ﷺ نے اس مرد یا عورت کے بارے میں پوچھا تو آپ ﷺ کو بتایا گیا کہ وہ وفات پا گئی ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ تم نے مجھے اس کی خبر کیوں نہ دی؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ مجھے اس کی قبر بتاؤ، پھر آپ ﷺ اس کی قبر پر گئے اور اس کی نمازِ جنازہ پڑھی۔''

اس حدیث میں مرد یا عورت کہا گیا ہے، جبکہ سنن ابن ماجہ اور صحیح ابن خزیمہ میں حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں یہ صراحت موجود ہے کہ وہ عورت تھی، چنانچہ وہ بیان کرتے ہیں:

« كَانَتْ سَوْدَاءُ تَقُمُّ الْمَسْجِدَ، فَتُوُفِّيَتْ لَيْلًا فَلَمَّا أَصْبَحَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ أُخْبِرَ بِهَا فَقَالَ: أَلَا آذَنْتُمُوْنِيْ؟ فَخَرَجَ بِأَصْحَابِهٖ فَوَقَفَ عَلٰى قَبْرِهَا فَكَبَّرَ عَلَيْهَا، وَالنَّاسُ خَلْفَهٗ، وَدَعَا لَهَا ثُمَّ انْصَرَفَ »[1]

''ایک کالے رنگ کی عورت نبیِ اکرم ﷺ کی مسجد کی صفائی کیا کرتی تھی۔ وہ رات کے وقت وفات پا گئی۔ صبح جب نبیِ اکرم ﷺ کو خبر دی گئی تو آپ ﷺ نے فرمایا: تم نے مجھے اطلاع کیوں نہ دی؟ پھر آپ ﷺ اپنے صحابہ رضی اللہ عنہم کے ساتھ اس عورت کی قبر پر تشریف لے گئے اور صفیں بنائی گئیں، آپ ﷺ نے اس کی نمازِ جنازہ پڑھائی اور اس کے لیے دعاے مغفرت و رحمت کے بعد واپس تشریف لے آئے۔''

صحیح بخاری شریف میں یہ حدیث پہلے تو ''باب کنس المسجد، والتقاط الخرق والقذی والعیدان'' کے تحت لائی گئی ہے، جس میں مرد یا عورت میں سے کسی کو ترجیح نہیں دی گئی، جبکہ تھوڑا ہی آگے چل کر امام صاحب نے ایک اور باب قائم کیا ہے: ''باب الخدم للمسجد'' اور اس میں سیاقِ حدیث کے دوران میں ہی ''وَلَا أَرَاهُ إِلَّا امْرَأَةً'' کے الفاظ بھی وارد کیے ہیں، جس سے اس کے عورت ہونے کو ترجیح دی ہے، جبکہ دوسری حدیث میں ذکر ہی صرف عورت کا ہے۔[2]

سنن کبریٰ بیہقی میں حسن سند کے ساتھ حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں اس عورت کا نام ''ام محجن'' آیا ہے، جبکہ ابن مندہ کی حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی روایت میں اس کا نام ''خرقاء'' وارد ہوا ہے۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اگر خرقاء نام محفوظ ہے تو پھر یہ نام ہوگا اور اس نیک

[1] سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٥٣٣) صحيح الترغيب (٢٧٥)

[2] فتح الباري (١/ ٥٥٣)

خاتون کی کنیت ام محجن ہوگی۔[1]

صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر دیے بغیر اس عورت کو دفن کر دینے کا سبب صحیح ابن خزیمہ میں، ایسے ہی سنن کبریٰ بیہقی میں مذکور ہے کہ اس کی وفات رات کے وقت ہوئی:

"فَكَرِهْنَا أَنْ نُّوقِظَكَ" "ہمیں یہ اچھا نہیں لگا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو جگا کر (بے آرام) کریں۔"

صحیح بخاری میں کتاب الجنائز میں جو حدیث وارد کی گئی ہے، اس میں ہے:

((فَحَقَرُوْا شَأْنَهٗ)) "صحابہ رضی اللہ عنہم نے اسے معمولی سمجھتے ہوئے ایسا کیا۔"

بہر حال ان احادیث سے معلوم ہوا کہ مسجد کی صفائی ستھرائی کی بہت فضیلت و اہمیت ہے، اس کا اندازہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سوال کرنے اور پھر قبر پر جا کر صحابہ رضی اللہ عنہم کے ساتھ اس کی نمازِ جنازہ کا اہتمام کرنے اور اس کے لیے دعاے مغفرت و رحمت سے ہوتا ہے۔[2]

مسجد کے لیے خادم:

امام بخاری رحمہ اللہ نے اس حدیث سے یہ مسئلہ بھی اخذ کیا ہے کہ مسجد کے لیے صفائی ستھرائی کرنے کے لیے کسی خادم کو مخصوص کیا جا سکتا ہے، کیونکہ ان احادیث میں مذکور ایک نیک خاتون نے اپنے آپ کو مسجدِ نبوی کی اس خدمت کے لیے وقف کیا ہوا تھا اور نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے اس خدمت باسعادت پر برقرار رہنے دیا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا اسے برقرار رہنے دینا ہی دراصل اس مذکورہ مسئلے کی دلیل ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے اس دلیل کی تائید قرآنِ کریم کے ان الفاظ سے بھی حاصل کی ہے، جس میں ارشادِ الٰہی ہے کہ عمران کی بیوی (حنّہ بنت فاقوذام) نے عرض کی:

﴿ رَبِّ اِنِّيْ نَذَرْتُ لَكَ مَا فِيْ بَطْنِيْ مُحَرَّرًا ﴾ [آل عمران: ۳۵]

"اے میرے پروردگار! جو میرے پیٹ میں ہے، میں اسے آزاد کر کے تیری نذر کر چکی ہوں۔"

صحیح بخاری کے ایک ترجمۃ الباب میں تعلیقاً اور تفسیر ابن ابی حاتم میں موصولاً ترجمان القرآن حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے اس آیت کی تفسیر بھی مروی ہے، جس میں وہ بیان فرماتے ہیں:

﴿رَبِّ اِنِّيْ نَذَرْتُ لَكَ مَا فِيْ بَطْنِيْ مُحَرَّرًا﴾ سے مراد یہ ہے:

---

[1] صحيح البخاري مع الفتح (۳/ ۲۰۵)

[2] علامہ زرکشی نے إعلام الساجد (ص: ۳۳۵) میں اس موضوع پر مستقل فصل (۲۷) قائم کی ہے۔

”لِلْمَسْجِدِ یَخْدِمُہٗ“، مَیں اپنے پیٹ والے بچے کو (اے اللہ!) تیری نذر کرتی ہوں تاکہ وہ مسجد کی خدمت کیا کرے۔“

امام بخاری رحمہ اللہ نے یہ تفسیر وارد کر کے اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ مسجد کی تعظیم و تکریم کے لیے اس کی خدمت کرنا سابقہ امتوں میں بھی مشروع تھا، حتیٰ کہ بعض نے تو اپنی اولاد کو اس خدمت کے لیے اللہ کی نذر کر دیا تھا۔ بہر حال احادیث سے مسجد کی مذکورہ طریق پر خدمت کرنے اور اس کی فضیلت و اہمیت کا پتا چلتا ہے۔

کعبۃ اللہ اور مسجد کا احترام:

یہاں یہ بات بھی ذکر کر دیں کہ جہاں مسجد کی صفائی رکھنے کی اتنی فضیلت ہے، وہیں مسجد میں کسی بھی طرح گندگی پھیلانے کی سخت ممانعت ہے، حتیٰ کہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ دیکھی کہ مسجد کی قبلے جہت والی یعنی مغربی دیوار پر رینٹ (سینے یا سر سے آنے والی بلغمی تھوک) دیکھا تو غصے سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرہ اقدس متغیر ہوگیا۔ بعض احادیث میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسجد میں اور قبلہ رو تھوکنے سے سختی کے ساتھ منع فرمایا، جبکہ کچھ لوگ انتہائی بے پروائی سے سلام پھیرتے ہی اٹھتے ہیں اور مسجد کی قبلہ رو کھلنے والی کھڑکی کھول کر قبلہ رو کھنکارنے اور تھوکنے لگتے ہیں، حالانکہ یہ احترامِ قبلہ کے سراسر منافی فعل ہے۔ یہ فعل صرف مسجد کے اندر ہی نہیں، بلکہ کسی اور بھی جگہ اور کسی بھی حالت میں روا نہیں ہے۔

جب یہ موضوع سامنے آ ہی گیا ہے تو کیوں نہ اس کی قدرے تفصیلی وضاحت کر دی جائے، تاکہ مسجد کے آداب و احترام کے ساتھ ساتھ ہی احترامِ قبلہ اور تھوکنے کے بعض آداب بھی واضح ہوجائیں۔ ان سب مسائل کی بنیاد چونکہ تھوکنے کے صحیح و غیر صحیح طریقے ہی سے تعلق رکھتی ہے، لہٰذا اس کی مختلف صورتوں کے ذکر کرنے اور قبلہ رو تھوکنے کی ممانعت کے دلائل کے تذکرے سے یہ مسائل کھل کر سامنے آجائیں گے۔

قبلہ رو تھوکنے کی صورتیں:

قبلہ رو تھوکنے کی عموماً چار ہی صورتیں ہوسکتی ہیں:

1. مسجد میں کھڑے ہو کر یا بیٹھے بیٹھے قبلہ رو تھوکنا۔
2. نماز کی حالت میں قبلہ رو تھوکنا۔

3 مسجد سے باہر کسی بھی جگہ پر قبلہ رو تھوکنا۔

4 حالتِ نماز کے بغیر یعنی عام حالت میں قبلہ رو تھوکنا۔

یہ چار ہی کل صورتیں ہوسکتی ہیں اور ان چاروں کی ممانعت کتبِ حدیث میں وارد ہوئی ہے۔

پہلی دو صورتوں کی ممانعت:

ان میں سے پہلی دو صورتوں یعنی مسجد میں اور بحالتِ نماز قبلہ رو تھوکنے کے بارے میں نبیِ اکرم ﷺ نے سخت وعید فرمائی ہے، چنانچہ صحیح بخاری شریف اور دیگر کتب یعنی صحیح مسلم، سنن ابو داود، ترمذی اور نسائی میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبیِ اکرم ﷺ نے مسجد کی قبلے جانب والی دیوار پر رینٹ (بلغمی تھوک) دیکھی تو آپ ﷺ پر یہ بہت ہی گراں گزرا، حتیٰ کہ اس گرانی کے آثار آپ ﷺ کے چہرۂ اقدس پر دیکھے گئے۔ آپ ﷺ بہ نفسِ نفیس اُٹھے اور اسے کُھرچ کر زائل کیا اور فرمایا:

«إِنَّ أَحَدَكُمْ إِذَا قَامَ فِيْ صَلٰوتِهٖ فَإِنَّهٗ يُنَاجِيْ رَبَّهٗ وَإِنَّ رَبَّهٗ بَيْنَهٗ وَبَيْنَ الْقِبْلَةِ فَلَا يَبْزُقَنَّ أَحَدُكُمْ قِبَلَ قِبْلَتِهٖ، وَلٰكِنْ عَنْ يَسَارِهٖ وَتَحْتَ قَدَمَيْهِ»[1]

”تم میں سے جب کوئی شخص نماز کے لیے کھڑا ہوتا ہے تو وہ اپنے پروردگار سے مناجات کر رہا ہوتا ہے اور اس کا پروردگار اس کے اور قبلے کے مابین ہوتا ہے، لہٰذا اسے قبلہ رو قطعاً نہیں تھوکنا چاہیے، بلکہ اپنی بائیں جانب یا پھر پاؤں کے نیچے تھوک لے۔“

آگے یہ الفاظ بھی ہیں کہ آپ ﷺ نے اپنے کپڑے کا ایک کنارا پکڑا اور اس میں تھوک کر باہم مل دیا اور فرمایا:

«أَوْ يَفْعَلُ هٰكَذَا» ”یا پھر اس طرح کر لے۔“

اس حدیث کی شرح بیان کرتے ہوئے علامہ بدر الدین عینی حنفی نے ”عمدة القاري“ میں امام قرطبی رحمہ اللہ کا قول نقل کیا ہے، جس میں وہ فرماتے ہیں:

”اَلْحَدِيْثُ دَالٌّ عَلٰى تَحْرِيْمِ الْبُصَاقِ فِي الْقِبْلَةِ“[2]

---

1 صحيح البخاري مع الفتح (١/ ٥٠٨) صحيح مسلم مع شرح النووي (٣/ ٥/ ٤٠، ٤١) صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٤٩، ٤٥٠، ٤٥١) صحيح سنن الترمذي، رقم الحديث (٤٦٨) صحيح سنن النسائي، رقم الحديث (٦٩٨)

2 عمدة القاري (٢/ ٤/ ١٥٠ دارالفكر بيروت)

''یہ حدیث قبلہ رو تھوکنے کے حرام ہونے پر دلالت کرتی ہے۔''

خود علامہ عینی رحمہ اللہ نے بھی مختلف اقوال ذکر کرنے کے بعد اسی بات کو ترجیح دی ہے کہ قبلہ رو تھوکنا حرام ہے، اس حدیث میں نبیِ اکرم ﷺ نے ممانعت کا جو سبب ذکر فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نمازی اور قبلے کے مابین ہوتا ہے، اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ قبلہ رو تھوکنا حرام ہے، یہ مسجد میں ہو یا باہر۔[1]

بخاری شریف کی اس سے اگلی حدیث میں، جو صحیح مسلم، سنن ابو داود اور موطا امام مالک میں بھی مروی ہے، اس میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان فرماتے ہیں کہ نبیِ اکرم ﷺ نے مسجد کی قبلے جہت والی دیوار پر تھوک دیکھی تو اسے کھرچ ڈالا اور لوگوں سے مخاطب ہو کر فرمایا:

«إِذَا كَانَ أَحَدُكُمْ يُصَلِّيْ فَلَا يَبْصُقْ قِبَلَ وَجْهِهٖ، فَإِنَّ اللّٰهَ قِبَلَ وَجْهِهٖ إِذَا صَلّٰى»[2]

''تم میں سے جب کوئی شخص نماز پڑھ رہا ہو تو وہ اپنے سامنے نہ تھوکے، کیونکہ نماز کی حالت میں اللہ تعالیٰ اس کے سامنے ہوتا ہے۔''

نماز کی حالت میں اللہ تعالیٰ نمازی کے سامنے اور اس کی طرف متوجہ ہوتا ہے، اس حالت میں اس کی طرف تھوکنا کتنا ناگوار فعل ہے؟ یہ بات نبیِ اکرم ﷺ نے ایک حدیث میں مثال دے کر سمجھائی ہے، چنانچہ سنن ابو داود، صحیح ابن خزیمہ، مسند احمد اور مستدرک حاکم میں حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبیِ اکرم ﷺ کو کھجور کے گچھے والی ٹیڑھی لکڑی کا ہاتھ میں رکھنا بہت پسند تھا۔ ایک دن آپ ﷺ مسجد میں داخل ہوئے تو آپ ﷺ کے دستِ مبارک میں ایسی ہی ایک لکڑی تھی، آپ ﷺ نے مسجد کی قبلے والی دیوار پر کئی جگہ رینٹ لگی دیکھی۔ آپ ﷺ نے ان جگہوں کو خوب صاف کر دیا، پھر آپ ﷺ نے غضبناک ہو کر لوگوں سے فرمایا:

«أَيُحِبُّ أَحَدُكُمْ أَنْ يَّسْتَقْبِلَهٗ رَجُلٌ فَيَبْصُقُ فِيْ وَجْهِهٖ؟»

---

[1] فتح الباري (١/ ٥٠٨)

[2] صحيح البخاري (١/ ٥٠٩) صحيح مسلم مع شرح النووي (٣/ ٥/ ٣٨) صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٥٤) موطأ مالك مع تنوير الحوالك (١/ ١/ ٢٠٠) صحيح الترغيب (١/ ١١٤) شرح السنة (٢/ ٣٨٤) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٧٦٣)

”کیا تم میں سے کوئی شخص یہ پسند کرتا ہے کہ کوئی دوسرا اس کے سامنے آئے اور اس کے منہ پر تھوک دے؟“

یہ مثال دے کر سمجھاتے ہوئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مزید فرمایا:

«إِنَّ أَحَدَكُمْ إِذَا قَامَ إِلَى الصَّلَاةِ فَإِنَّمَا يَسْتَقْبِلُ رَبَّهُ، وَالْمَلَكُ عَنْ يَمِينِهِ، فَلَا يَبْصُقْ بَيْنَ يَدَيْهِ وَلَا عَنْ يَمِينِهِ»[1]

”تم میں سے جب کوئی شخص نماز کے لیے کھڑا ہوتا ہے تو وہ اپنے پروردگار کے روبرو ہوتا ہے اور اس کی دائیں جانب فرشتہ ہوتا ہے، لہٰذا اسے اپنے سامنے اور دائیں جانب نہیں تھوکنا چاہیے۔“

ایسے ہی صحیح مسلم، سنن نسائی، سنن ابن ماجہ اور مسند احمد میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مسجد کی قبلے جانب والی دیوار پر رینٹ لگی دیکھی تو (غصے کی حالت میں) لوگوں سے مخاطب ہو کر فرمایا:

«مَا بَالُ أَحَدِكُمْ يَقُومُ مُسْتَقْبِلَ رَبِّهِ فَيَتَنَخَّعُ أَمَامَهُ! أَيُحِبُّ أَحَدُكُمْ أَنْ يُّسْتَقْبَلَ فَيُتَنَخَّعَ فِي وَجْهِهِ؟ إِذَا بَصَقَ أَحَدُكُمْ فَلْيَبْصُقْ عَنْ شِمَالِهِ أَوْ لِيَتْفُلْ هٰكَذَا فِي ثَوْبِهِ»

”تم میں سے کوئی کس طرح گوارا کر لیتا ہے کہ اپنے پروردگار کے سامنے کھڑے ہو کر اپنے سامنے ہی تھوک لیتا ہے! کیا تم میں سے کوئی شخص یہ پسند کرتا ہے کہ اس کے سامنے ہی کوئی تھوک دے؟ (پھر فرمایا) جب تم میں سے کوئی شخص تھوکے تو اسے چاہیے کہ اپنی بائیں جانب تھوکے یا پھر یوں کپڑے میں تھوک (کر اسے مل) لے۔“

آگے راویِ حدیث بیان کرتے ہیں کہ پھر اسماعیل بن علیہ نے اپنے کپڑے میں تھوک کر اسے مل کر دکھا دیا۔[2]

---

[1] صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٥٥) صحيح ابن خزيمة (٢/ ٤٦) صحيح الترغيب (١/ ١١٥)

[2] صحيح مسلم مع شرح النووي (٣/ ٥/ ٤٠) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٧٦١) صحيح الجامع، رقم الحديث (٥٥٧٠) صحيح الترغيب (١/ ١١٤/ ١١٥)

صحیح مسلم اور سنن ابو داود میں حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبیِ اکرم ﷺ ہماری مسجد میں تشریف لائے، جبکہ آپ ﷺ کے دستِ مبارک میں کھجور کے گچھے والی لکڑی تھی، آپ ﷺ نے مسجد کی قبلے جہت والی دیوار پر رینٹ لگی دیکھی تو اسے اس لکڑی سے کھرچ کر صاف کر دیا اور پھر فرمایا:

«أَيُحِبُّ أَنْ يُّعْرِضَ اللّٰهُ عَنْهُ؟ إِنَّ أَحَدَكُمْ إِذَا قَامَ يُصَلِّيْ فَإِنَّ اللّٰهَ قِبَلَ وَجْهِهٖ فَلَا يَبْصُقَنَّ قِبَلَ وَجْهِهٖ وَلَا عَنْ يَّمِيْنِهٖ، وَلْيَبْصُقَنَّ عَنْ يَّسَارِهٖ تَحْتَ رِجْلِهِ الْيُسْرٰى، فَإِنْ عَجِلَتْ بِهٖ بَادِرَةٌ فَلْيَتْفُلْ بِثَوْبِهٖ هٰكَذَا وَ وَضَعَ عَلٰى فِيْهِ، ثُمَّ دَلَكَهٗ»[1]

”کیا کوئی یہ بات پسند کرتا ہے کہ اللہ اس سے منہ پھیر لے؟ تم میں سے جب کوئی نماز کے لیے کھڑا ہوتا ہے تو اللہ اس کے سامنے ہوتا ہے، لہٰذا اسے اپنے سامنے اور دائیں جانب ہرگز نہیں تھوکنا چاہیے، بلکہ اسے اپنے بائیں پاؤں کے نیچے تھوکنا چاہیے اور اگر کبھی ناچار تھوک آ جائے تو اس طرح اپنے کپڑے میں تھوک لے۔ پھر آپ ﷺ نے منہ پر کپڑا رکھ کر (اس میں تھوکتے ہوئے) مل کر دکھایا۔“

ایسے ہی پہلی دو صورتوں کے ممنوع ہونے کا پتا سنن ابی داود، مسند احمد اور صحیح ابن حبان میں مذکور اس واقعے سے بھی چلتا ہے، جس میں حضرت ابو سہیلہ سائب بن خلاف رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ ایک شخص نے لوگوں کی امامت کروائی اور قبلہ شریف کی جانب تھوک دیا، جبکہ نبیِ اکرم ﷺ اسے ایسا کرتے ہوئے دیکھ رہے تھے۔ جب وہ فارغ ہوگیا تو آپ ﷺ نے لوگوں سے فرمایا:

«لَا يُصَلِّيْ لَكُمْ هٰذَا» ”آیندہ یہ شخص تمھیں نماز نہ پڑھائے۔“

اس واقعے کے بعد ایک مرتبہ اس نے لوگوں کو نماز پڑھانا چاہا تو انھوں نے اسے روک دیا اور نبیِ اکرم ﷺ کا اس کے بارے میں ارشاد اسے سنایا۔ پھر جب یہ بات نبیِ اکرم ﷺ کے سامنے ذکر کی گئی تو آپ ﷺ نے ہاں فرما کر اس ارشاد کی تصدیق فرما دی اور میرا خیال ہے کہ آپ ﷺ نے یہ بھی فرمایا:

---

[1] صحيح مسلم مع شرح النووي (٩/ ١٨/ ١٣٦، ١٣٧) صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٥٩) صحيح الترغيب (١/ ١١٦)

«إِنَّكَ آذَيْتَ اللّٰهُ وَرَسُوْلَهٗ»[1]

''تم نے (قبلہ روتھوک کر) اللہ اور اس کے رسول ﷺ کو اذیت پہنچائی ہے۔''

ایسے ہی معجم طبرانی کبیر میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبیِ اکرم ﷺ نے ایک شخص کو حکم فرمایا کہ وہ لوگوں کو ظہر کی نماز پڑھائے، اس نے لوگوں کو نماز پڑھانے کے دوران ہی قبلہ روتھوک دیا۔ جب نمازِ عصر کا وقت ہوا تو آپ ﷺ نے اس کی جگہ کسی دوسرے شخص کو نماز پڑھانے کا پیغام بھیج دیا، اس سے پہلا آدمی ڈر گیا اور نبیِ اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر اس نے پوچھا: اے اللہ کے رسول ﷺ: '' أَ أُنْزِلَ فِيَّ شَيْئٌ'' (کیا میرے بارے میں کوئی حکم نازل ہو گیا ہے؟) آپ ﷺ نے فرمایا:

«لَا، وَلٰكِنَّكَ تَفَلْتَ بَيْنَ يَدَيْكَ وَأَنْتَ قَائِمٌ تَؤُمُّ النَّاسَ فَآذَيْتَ اللّٰهَ وَالْمَلَائِكَةَ»[2]

''نہیں (آسمان سے تو کوئی حکم نازل نہیں ہوا) لیکن تم نے لوگوں کی امامت کروانے کے دوران ہی کھڑے کھڑے قبلہ روتھوک کر اللہ تعالیٰ اور فرشتوں کو اذیت پہنچائی ہے۔''

مطلقاً ممانعت:

ہماری دنیا کا ایک عام اصول ہے کہ کسی کی طرف منہ کر کے تھوکنا برا سمجھا جاتا ہے اور سامنے والا بگڑ جاتا ہے کہ تم نے میری طرف منہ کر کے تھوکا کیوں ہے؟ کیونکہ عرفِ عام میں یہ تحقیر کی علامت ہے، جبکہ قبلہ و کعبہ اور بیت اللہ شریف اس تحقیر اور توہین آمیز انداز سے کہیں بالا ہیں، اس جہت یا جانب کا احترام واجب ہے اور قبلہ رو ہو کر تھوکنا حرام ہے، وہ مسجد کے اندر ہو یا باہر، کوئی نماز پڑھ رہا ہو یا نماز کے بغیر عام معمول کی حالت میں ہو، یہ مطلقاً ہی ممنوع ہے۔

دلائلِ ممانعت:

اس ممانعت کے دلائل کے سلسلے میں جن احادیث سے استدلال کیا جاتا ہے، ان میں سے صحیحین اور سنن میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث ہے، جو سابقہ اوراق میں ذکر کر چکے ہیں، اس

[1] صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٥٦) الإحسان في تقريب صحيح ابن حبان (٤/ ٥١٦) صحيح الترغيب (١/ ١١٧) فتح الباري (١/ ٥٠٨)

[2] صحيح الترغيب (١/ ١١٧، ١١٨)

کے الفاظ ہیں:

1 «فَلَا يَبْزُقَنَّ أَحَدُكُمْ قِبَلَ قِبْلَتِهِ» ''تم میں سے کوئی شخص قبلے کی طرف ہرگز نہ تھوکے۔''

اس کی شرح بیان کرتے ہوئے حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ نے فتح الباری میں لکھا ہے:

''هٰذَا التَّعْلِيْلُ يَدُلُّ عَلٰى أَنَّ الْبُزَاقَ فِي الْقِبْلَةِ حَرَامٌ سَوَاءً كَانَ فِي الْمَسْجِدِ أَمْ لَا، وَلَا سِيَّمَا مِنَ الْمُصَلِّيْ'' [1]

''یہ سبب (کہ اللہ نمازی کے روبرو ہوتا ہے) اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ قبلے کی طرف تھوکنا حرام ہے، وہ مسجد کے اندر ہو یا کہیں باہر، خصوصاً جبکہ یہ نمازی سے صادر ہو۔''

آگے موصوف نے تین صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم سے مروی احادیث ذکر کی ہیں، جن سے اس نہی کے تحریمی ہونے کی تائید ہوتی ہے، ان میں سے بعض ہم ذکر کر چکے ہیں اور بعض آگے چل کر آنے والی ہیں۔

2 علامہ عینی رحمہ اللہ نے ''عمدة القاري'' میں امام قرطبی رحمہ اللہ سے نقل کرتے ہوئے لکھا ہے:

''اَلْحَدِيْثُ دَالٌّ عَلٰى تَحْرِيْمِ الْبُصَاقِ فِي الْقِبْلَةِ''

''یہ حدیث قبلہ رو تھوکنے کے حرام ہونے پر دلالت کرتی ہے۔''

3 آگے مختلف اقوال ذکر کرنے اور اس کے بارے میں پائے جانے والے اختلاف کی طرف اشارہ کرنے کے بعد لکھا ہے:

''وَالْأَصَحُّ أَنَّهُ لِلتَّحْرِيْمِ'' ''صحیح تر بات یہ ہے کہ یہ ممانعت و نہی تحریمی ہے۔''

آگے اس نہی کے تحریمی ہونے کے دلائل کے طور پر حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کی ذکر کردہ تین احادیث سمیت انھوں نے چار صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم سے مروی احادیث نقل کی ہیں، جن میں سے بعض ہم بھی ذکر کر چکے ہیں اور بعض کا تذکرہ اپنے موقع پر آنے والا ہے۔

4 صحیحین اور سنن ابو داود کے حوالے سے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ایک حدیث ہم بھی ذکر کر آئے ہیں، جس میں ہے:

«فَلَا يَبْصُقُ قِبَلَ وَجْهِهِ فَإِنَّ اللّٰهَ قِبَلَ وَجْهِهِ»

''قبلہ رو مت تھوکے کیونکہ قبلے کی طرف اس کا پروردگار ہوتا ہے۔''

---

[1] فتح الباري (۱/ ۵۰۸) نيل الأوطار (۱/ ۲/ ۳۴۲) عمدة القاري (۲/ ٤/ ۱۵۰)

ان الفاظ کی شرح بیان کرتے ہوئے امام نووی رحمہ اللہ شرح صحیح مسلم میں لکھتے ہیں:

”فَلَا يُقَابِلُ هٰذِهِ الْجِهَةَ بِالْبُصَاقِ الَّذِي هُوَ الْاِسْتِخْفَافُ بِمَنْ يَّبْزُقُ إِلَيْهِ وَإِهَانَتُهٗ وَتَحْقِيْرُهٗ“[1]

”یہ قبلے والی جہت ایسی ہے کہ ادھر تھوکنا نہیں چاہیے، کیوں کہ یہ فعل توہین و تحقیر کے مترادف ہے۔“

5 بخاری شریف کے ایک ترجمۃ الباب میں امام صاحب، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ایک اثر لائے ہیں، جسے ابن ابی شیبہ نے صحیح سند کے ساتھ موصولاً روایت کیا ہے، اس میں وہ فرماتے ہیں:

”إِنْ وَطِئْتَ عَلٰى قَذَرٍ رَطْبٍ فَاغْسِلْهُ وَإِنْ كَانَ يَابِسًا فَلَا“[2]

”اگر تم کسی گیلی غلاظت کو پاؤں تلے روند لو تو پاؤں دھو لو اور اگر وہ غلاظت خشک ہو تو پھر پاؤں دھونے کی ضرورت نہیں۔“

جس باب میں امام بخاری اس اثر کو لائے ہیں، وہ مسجد سے رینٹ کھرچنے کے بارے میں ہے، لہٰذا عام آدمی کو بظاہر اس سے اس کا کوئی تعلق نظر نہیں آتا، لیکن حافظ ابن حجر رحمہ اللہ جیسے رازدارِ امام بخاری سے وہ تعلق بھی پوشیدہ نہ رہا، لہٰذا انھوں نے فتح الباری میں لکھا ہے:

”وَمُطَابَقَتُهٗ لِلتَّرْجَمَةِ الْإِشَارَةُ إِلٰى أَنَّ الْعِلَّةَ الْعُظْمٰى فِي النَّهْيِ احْتِرَامُ الْقِبْلَةِ لَا مُجَرَّدُ التَّأَذِّي بِالْبُزَاقِ وَنَحْوِهٖ“[3]

”اس اثر کی اس باب سے مطابقت یہ ہے کہ اس سے امام صاحب اس بات کی طرف اشارہ فرما گئے ہیں کہ قبلہ رو تھوکنے کی ممانعت کی اصل اور بڑی علت یا سبب احترامِ قبلہ ہے، تھوک وغیرہ سے محض لوگوں کا اذیت پانا وجہ ممانعت نہیں ہے۔“

آگے وہ فرماتے ہیں:

”اگرچہ لوگوں کے لیے اس کا باعثِ اذیت ہونا بھی ایک سبب ممانعت ہے، لیکن سب

---

[1] شرح صحيح مسلم للنووي (٣/ ٥/ ٣٨)

[2] صحيح البخاري مع الفتح (١/ ٥٠٩، ٥١٠)

[3] فتح الباري (١/ ٥١٠)

سے اہم سبب احترامِ قبلہ ہی ہے، یہی وجہ ہے کہ رینٹ کے خشک یا تر ہونے میں فرق نہیں کیا گیا، اس کے برعکس جن اشیا کی ممانعت کا سبب فقط ان کا غلیظ یا گندہ ہونا ہے، ان میں سے کسی خشک کو روند لینے سے کچھ فرق نہیں پڑتا۔''[1]

گویا قبلہ رو تھوکنا احترامِ قبلہ کے منافی فعل ہے، وہ چاہے کہیں بھی اور کسی بھی حالت میں ہو۔

6 مطلقاً قبلہ رو تھوکنے کی ممانعت کے دلائل میں سے سنن ابو داود اور صحیح ابن حبان و ابن خزیمہ میں حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث بھی ہے، جس میں نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشادِ گرامی ہے:

«مَنْ تَفَلَ تُجَاهَ الْقِبْلَةِ جَاءَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَتَفَلُهُ بَيْنَ عَيْنَيْهِ»[2]

''جس نے قبلہ شریف کی طرف منہ کر کے تھوکا تو وہ قیامت کے دن اس حال میں آئے گا کہ اس کا وہ تھوک اس کی دونوں آنکھوں کے مابین (اس کی پیشانی پر) ہوگا۔''

7 صحیح ابن حبان و ابن خزیمہ (واللفظ لہ) اور مسند بزار میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

«يُبْعَثُ صَاحِبُ النُّخَامَةِ فِي الْقِبْلَةِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَهِيَ فِي وَجْهِهِ»[3]

''قبلے کی طرف تھوکنے والا قیامت کے دن اس حال میں اٹھایا جائے گا کہ وہ تھوک اس کی پیشانی پر ہوگا۔''

8 مطلقاً قبلہ رو تھوکنے کی ممانعت اس حدیث میں بھی وارد ہوئی ہے، جو صحیح بخاری و مسلم اور دیگر کتب میں دو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم حضرت ابوہریرہ اور حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہما سے مروی ہے، جس میں وہ بیان کرتے ہیں کہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مسجد کی دیوار پر رینٹ لگی دیکھی تو ایک کنکری لے کر اسے کھرچ ڈالا اور ارشاد فرمایا:

---

[1] فتح الباري (١/ ٥١٠)

[2] صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٢٣٩) موارد الظمآن (٣٣٢) صحيح ابن خزيمة (٩٢٥، ١٣١٤) الإحسان (٤/ ٥١٨) صحيح الترغيب (١/ ١١٦) فتح الباري (١/ ٥٠٨) نيل الأوطار (١/ ٢/ ٣٤٢) عمدة القاري (٢/ ٤/ ١٥٠)

[3] موارد الظمآن (٣٣٣) صحيح ابن خزيمة (١٣١٣) مصنف ابن أبي شيبة (٢/ ٣٦٥) الإحسان ترتيب ابن حبان (٤/ ٥١٧) سبل السلام (١/ ١٤٩)

«إِذَا تَنَخَّمَ أَحَدُكُمْ فَلَا يَتَنَخَّمَنَّ قِبَلَ وَجْهِهِ وَلَا عَنْ يَمِينِهِ، وَلْيَبْصُقْ عَنْ يَسَارِهِ أَوْ تَحْتَ قَدَمِهِ الْيُسْرٰى»[1]

''تم میں سے کوئی شخص جب تھوکے تو اپنے سامنے (قبلہ رو) ہرگز نہ تھوکے اور نہ دائیں جانب تھوکے، بلکہ اسے چاہیے کہ اپنی بائیں جانب یا بائیں پاؤں کے نیچے تھوکے۔''

9 امام نووی رحمہ اللہ اس حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں کہ ہر حالت میں قبلہ رو تھوکنا منع ہے، کوئی نماز میں ہو یا نماز سے خارج اور مسجد میں ہو یا مسجد سے باہر ہو۔[2]

10 حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے امام نووی رحمہ اللہ کے اس قول کو نقل کرنے کے بعد مطلقاً ممانعت پر دلالت کرنے والے بعض آثار بھی ذکر کیے ہیں۔[3]

11 امیر صنعانی نے ''سبل السلام شرح بلوغ المرام'' میں لکھا ہے کہ سیدنا ابوہریرہ اور ابوسعید رضی اللہ عنہما سے مروی حدیث میں مطلقاً قبلہ رو تھوکنے کی ممانعت آئی ہے (نماز اور مسجد کی کوئی قید نہیں ہے) امام نووی رحمہ اللہ سے مطلقاً ممانعت والا قول نقل کیا اور لکھا ہے کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں تو نماز کی قید ہے، جبکہ دوسری کئی احادیث میں یہ قید نہیں، بلکہ وہ مطلقاً قبلہ رو تھوکنے کی ممانعت کا پتا دیتی ہیں، مسجد کے اندر ہو یا باہر اور نمازی سے ہو یا غیر نمازی سے۔ آگے انھوں نے تین احادیث نقل کی ہیں، جو ہم بھی ذکر کر چکے ہیں۔[4]

دائیں جانب تھوکنے کی ممانعت:

قبلہ رو تھوکنے کی ممانعت کے بارے میں وارد احادیثِ رسول ﷺ اور اقوالِ محدثین رحمہم اللہ کے بعد کسی خوش فہمی و خود فریبی میں مبتلا رہنا مناسب نہیں، بلکہ ہمیں اس طرف توجہ دینی چاہیے اور یہ تو قبلہ و کعبہ اور بیت اللہ کی عظمت و بزرگی اور عقیدت و احترام کا معاملہ ہے، جبکہ لگے ہاتھوں یہ بھی ذکر کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ نبیِ اکرم ﷺ نے تو دائیں جانب تھوکنے سے بھی منع فرمایا، کیونکہ دائیں

1 صحيح البخاري مع الفتح (١/ ٣٠٩ ـ ٥١١) صحيح مسلم مع شرح النووي (٣/ ٥/ ٣٨ ـ ٣٩) مسند أحمد (٣/ ٥٨، ٨٨، ٩٣) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (١٢٨٤) صحيح الجامع، رقم الحديث (٤٣٨)

2 شرح صحيح مسلم للنووي (٣/ ٥/ ٣٩)

3 فتح الباري (١/ ٥١٠)

4 سبل السلام (١/ ١/ ١٤٩) المكتبة التجارية الكبرىٰ، مصر.

جانب کو بائیں پر فوقیت و شرف حاصل ہے، چنانچہ صحیحین، سنن اربعہ اور مسند احمد میں ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے:

«كَانَ النَّبِيُّ ﷺ يُعْجِبُهُ التَّيَمُّنُ فِي تَنَعُّلِهِ وَتَرَجُّلِهِ وَطُهُوْرِهِ وَفِي شَأْنِهِ كُلِّهِ»[1]

''نبیِ اکرم ﷺ کو جوتا پہننے، کنگھی کرنے اور طہارت کرنے حتیٰ کہ تمام اُمور (کی ابتدا کرنے) میں دایاں پہلو محبوب تھا۔''

یہی وجہ ہے کہ آپ ﷺ کھانے، پینے، نہانے، کپڑا پہننے، کوئی چیز پکڑنے، پکڑانے، مسجد میں داخل ہونے، تسبیح کرنے، لیٹنے، غرض کہ ہر معاملے میں دائیں ہاتھ، دائیں پاؤں اور دائیں پہلو کو پسند فرماتے تھے اور آپ ﷺ نے اسی کی اپنی امت کے افراد کو تاکید بھی فرمائی ہے۔

البتہ ناک صاف کرنے اور استنجا کرنے کے لیے بائیں ہاتھ کو اور لیٹرین میں داخل ہوتے وقت اور مسجد سے نکلتے وقت بائیں پاؤں کو اولیت دیتے تھے، اس کا سبب بھی بڑا واضح ہے کہ دائیں ہاتھ اور پاؤں کو جو شرف حاصل ہے، یہ امور اس کے شایانِ شان نہیں ہیں، لہٰذا ان کے لیے بائیں کو خاص کر دیا گیا ہے۔ دائیں یا بائیں ہاتھ، پاؤں یا پہلو سے متعلق ان سب امور کے دلائل کتبِ حدیث میں موجود ہیں، جن کا سرِ دست تذکرہ خارج از موضوع ہے، لہٰذا ہم اس سے صرفِ نظر کرتے ہیں۔

ممانعت کے دلائل:

البتہ دائیں جانب تھوکنے کی ممانعت کے دلائل کے سلسلے میں عرض ہے کہ صحاح و سنن اور معاجم و مسانید میں جہاں جہاں قبلہ رو تھوکنے کی ممانعت آئی ہے، وہیں وہیں دائیں جانب تھوکنے کی ممانعت بھی وارد ہوئی ہے، جن میں سے قبلہ رو تھوکنے کی طرح ہی بعض احادیث نماز و مسجد کے ساتھ خاص ہیں، جبکہ بعض دیگر اس قید سے آزاد اور مطلق ممانعت پر دلالت کرتی ہیں۔ وہ احادیث چونکہ ذکر کی جا چکی ہیں، لہٰذا انھیں یہاں دُہرانے کی ضرورت نہیں، البتہ ان کے بارے میں شارحینِ حدیث اور ائمہ و علما نے جو تشریحی افادات رقم فرمائے ہیں، ان میں سے بعض اور چند آثارِ صحابہ رضی اللہ عنہم کے تذکرے پر ہی ہم اکتفا کرتے ہیں۔

---

[1] صحيح البخاري (١/ ٢٦٩ـ ٥٢٣) صحيح مسلم مع شرح النووي (٢/ ٣/ ١٦٠، ١٦١) صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٤٨٧) صحيح سنن الترمذي، رقم الحديث (٤٩٨) صحيح سنن النسائي، رقم الحديث (٤٦٨٤) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٤٠١) شرح السنة (٢١٦) صحيح الجامع، رقم الحديث (٤٩١٨)

1 چنانچہ ابھی قریب ہی ہم نے ابو ہریرہ و ابو سعید رضی اللہ عنہما کی جو حدیث صحیحین کے حوالے سے ذکر کی ہے، نیز بخاری والی حدیثِ انس رضی اللہ عنہ جس میں ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے:

«لَا يَتْفُلَنَّ أَحَدُكُمْ بَيْنَ يَدَيْهِ وَلَا عَنْ يَّمِيْنِهٖ وَلٰكِنْ عَنْ يَّسَارِهٖ أَوْ تَحْتَ رِجْلِهٖ»[1]

''تم میں سے کوئی شخص دائیں جانب ہرگز مت تھوکے، بلکہ اپنی بائیں طرف یا پاؤں کے نیچے تھوکے۔''

ان دونوں حدیثوں کی شرح میں حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے لکھا ہے:

''لَيْسَ فِيْهَا تَقْيِيْدُ ذٰلِكَ بِحَالَةِ الصَّلَاةِ''[2]

''ان دونوں حدیثوں میں (دائیں جانب تھوکنے کی ممانعت کے لیے) حالتِ نماز کی بھی کوئی قید یا شرط نہیں ہے۔''

آگے ان روایات کی طرف بھی اشارہ کیا ہے، جن میں یہ قید وارد ہوئی ہے۔

2 انہی کی طرح علامہ بدر الدین عینی رحمہ اللہ نے بھی ''عمدۃ القاري'' میں ایک جگہ تو لکھا ہے:

''ثُمَّ هٰذَا الْحَدِيْثُ غَيْرُ مُقَيَّدٍ بِحَالَةِ الصَّلَاةِ''[3]

''ویسے بھی یہ حدیث نماز کے ساتھ مقید نہیں ہے۔''

اس سے اگلے صفحے پر لکھتے ہیں: ''وَلَيْسَ فِيْهِ قَيْدٌ بِالصَّلَاةِ'' اس حدیث میں نماز کی کوئی شرط نہیں ہے۔

حافظ عسقلانی اور علامہ عینی کی شروحِ بخاری میں ان تصریحات سے یہ بات واضح ہوگئی کہ قریب ہی میں ذکر کی گئی دونوں حدیثوں میں دائیں جانب تھوکنے کی ممانعت مطلق ہے، نماز کی کوئی قید و شرط نہیں ہے۔ یہ حدیثیں صحیح بخاری و مسلم کے علاوہ سنن و مسانید اور معاجم میں بھی مروی ہیں۔

3 شارح صحیح مسلم امام نووی رحمہ اللہ نے دائیں جانب تھوکنے کو جزماً ممنوع قرار دیا ہے، وہ نماز کی حالت میں ہو یا حالتِ نماز کے بغیر، چاہے مسجد میں ہو یا مسجد کے باہر ہو۔[4]

---

[1] صحيح البخاري مع الفتح (١/ ٥١٠)

[2] فتح الباري (١/ ٥١٠)

[3] عمدة القاري (٢/ ٤/ ١٥٢)

[4] شرح صحيح مسلم للنووي (٣/ ٥/ ٣٩) فتح الباري (١/ ٥١٠)

4 علامہ صنعانی رحمہ اللہ نے ''بلوغ المرام'' کی شرح ''سبل السلام'' میں لکھا ہے:

''وَمِثْلُ الْبُصَاقِ إِلَى الْقِبْلَةِ الْبُصَاقُ عَنِ الْيَمِينِ فَإِنَّهُ مَنْهِيٌّ عَنْهُ مُطْلَقًا أَيْضًا'' [1]

''قبلہ رو تھوکنے کی طرح ہی دائیں جانب تھوکنا بھی مطلق ممنوع ہے۔''

یہ بات ذکر کرنے کے بعد انھوں نے بھی وہ احادیث یا آثار بھی ذکر کیے ہیں، جو ان کی اس بات کے مؤید ہیں۔ یہ آثار دراصل سب سے پہلے حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ نے ''فتح الباری'' میں ذکر فرمائے تھے، پھر ''عمدۃ القاری'' میں علامہ عینی رحمہ اللہ نے، ''سبل السلام'' میں امیر صنعانی رحمہ اللہ نے اور نیل الاوطار میں امام شوکانی نے بھی نقل کیے ہیں، جو درجِ ذیل ہیں:

① سب سے پہلا اثر مصنف عبدالرزاق اور دیگر کتبِ احادیث و آثار میں مروی ہے، جس میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے بارے میں مذکور ہے:

''إِنَّهُ كَرِهَ أَنْ يَّبْصُقَ عَنْ يَّمِينِهِ، وَلَيْسَ فِي الصَّلَاةِ'' [2]

''وہ دائیں جانب تھوکنے کو مکروہ سمجھتے تھے، اگرچہ کوئی نماز کی حالت میں نہ ہو۔''

② دوسرا اثر حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، جس میں وہ فرماتے ہیں:

''مَا بَصَقْتُ عَنْ يَّمِينِي مُنْذُ أَسْلَمْتُ'' [3]

میں جب سے مسلمان ہوا ہوں، تب سے میں نے کبھی دائیں جانب نہیں تھوکا۔''

③ تیسرا اثر مجددِ امت حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کے بارے میں ہے، جس میں ہے:

''إِنَّهُ نَهَى ابْنَهُ عَنْهُ مُطْلَقًا'' [4]

''انھوں نے اپنے بیٹے کو مطلقاً دائیں جانب تھوکنے سے منع فرما دیا تھا۔''

اسبابِ ممانعت:

یہاں یہ بات بھی ذہن نشین رکھیں کہ قبلہ رو تھوکنے کی ممانعت تو ظاہر ہے:

① احترام و مقامِ قبلہ کی وجہ سے ہے۔

---

[1] سبل السلام (۱/ ۱/ ۱۴۹)

[2] فتح الباري (۱/ ۵۱۰) عمدة القاري (۲/ ٤/ ۱۵۲) سبل السلام (۱/ ۱/ ۱٤۹) نيل الأوطار (۱/ ۲/ ۳٤۱)

[3] حواله جات بالا.

[4] حواله جات بالا.

② جبکہ دائیں جانب تھوکنے کی ممانعت کا سبب نبیِ اکرم ﷺ کے یہاں دائیں ہاتھ، پاؤں، پہلو اور جانب کا محبوب و مرغوب ہونا ہے، جیسا کہ پہلے بھی اشارہ کیا جا چکا ہے۔

③ ایک اور سبب یہ بھی ہے کہ آدمی کے دائیں پہلو میں نیکیاں لکھنے والا فرشتہ ہوتا ہے، جیسا کہ صحیح بخاری میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ارشادِ نبوی ﷺ میں دائیں جانب تھوکنے کی ممانعت کے ساتھ ہی اس کا سبب بھی مذکور ہے:

"فَإِنَّ عَنْ يَّمِيْنِهٖ مَلَكًا"[1] "اس کی دائیں جانب فرشتہ ہوتا ہے۔"

بعض اشکالات اور ان کا حل:

قبلہ رو یا دائیں جانب تھوکنے کے اس موضوع کو ختم کرنے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں ان بعض اشکالات کا حل بھی پیش کر دیا جائے، جو سابقہ تفصیلات میں سے بعض مقامات پر پیش آتے ہیں یا بالفاظ دیگر اس سلسلے میں جو بعض سوالات ذہن میں اٹھتے ہیں، ان کا جواب دے دیا جائے، تاکہ کوئی خلش باقی نہ رہ جائے۔

پہلا اشکال یا سوال:

اگر ابھی ذکر کی گئی حدیث کی رو سے کہا جائے کہ دائیں جانب والے فرشتے سے مراد کاتب یعنی نیکیاں لکھنے والا فرشتہ ہے تو اس میں یہ اشکال پیدا ہوتا ہے کہ صرف دائیں جانب ہی کو کیوں مخصوص کیا گیا ہے جبکہ بائیں جانب دوسرا فرشتہ بھی تو ہوتا ہے؟

پہلا جواب:

اس اشکال کو حل کرنے کے لیے اہلِ علم نے اس کے کئی جوابات دیے ہیں، جن میں سے پہلا جواب بعض قدما نے یہ دیا ہے کہ دائیں جانب والے فرشتے کو خاص وجہ سے مخصوص کیا گیا ہو، لیکن یہ بات محلِ نظر ہے۔[2] اس کے محلِ نظر ہونے کا باعث بڑا واضح ہے کہ اس سلسلے میں بائیں جانب والے فرشتے کا کیوں خیال نہیں رکھا گیا، جبکہ وہ بھی تو فرشتہ ہی ہے؟ اگرچہ وہ نیکیاں نہیں، بلکہ برائیاں لکھنے پر مامور ہے۔

---

[1] صحيح البخاري (١/ ٥١٢)

[2] فتح الباري (١/ ٥١٣)

دوسرا جواب:

اس اشکال کا دوسرا جواب بعض متاخرین اہلِ علم نے یہ دیا ہے کہ نماز بدنی اعمال میں سے سب سے بڑا اور اہم عمل ہے، لہٰذا دورانِ نماز برائیاں لکھنے والے فرشتے کو کوئی دخل ہی حاصل نہیں ہوتا۔ مصنف ابن ابی شیبہ کی موقوف روایت جو حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، اس سے بھی اس بات کی تائید ہوتی ہے، کیونکہ اس میں ہے کہ دائیں جانب بھی نہ تھوکیں:

''فَإِنَّ عَنْ يَّمِيْنِهٖ كَاتِبُ الْحَسَنَاتِ''[1]

''اس کی دائیں جانب نیکیاں لکھنے والا فرشتہ ہوتا ہے۔''

علامہ عینی رحمہ اللہ یہی جواب نقل کر کے لکھتے ہیں:

''یہ بات بھی محلِ نظر ہے، کیونکہ برائیاں لکھنے والا فرشتہ اگرچہ دورانِ نماز لکھتا نہیں، لیکن کم ازکم اپنی جگہ سے غائب بھی تو نہیں ہوتا، بلکہ وہ بھی موجود رہتا ہے۔''[2]

تیسرا جواب:

اس اشکال کا تیسرا جواب یہ ہے کہ طبرانی میں حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں ہے:

''فَإِنَّهٗ يَقُوْمُ بَيْنَ يَدَيِ اللّٰهُ وَمَلَكُهٗ عَنْ يَّمِيْنِهٖ، وَقَرِيْنُهٗ عَنْ يَّسَارِهٖ''[3]

''نمازی اپنے اللہ کے سامنے اس طرح کھڑا ہوتا ہے کہ فرشتہ اس کی دائیں جانب اور قرین (شیطان) اس کی بائیں جانب ہوتا ہے۔''

اس شکل میں دائیں جانب تو فرشتہ ہوا، لہٰذا ادھر تھوکنا ممنوع ہے اور اگر بائیں جانب تھوکا جائے گا تو وہ قرین یا شیطان پر پڑے گا۔ ممکن ہے کہ اس وقت بائیں جانب والا فرشتہ ایسی جگہ ہوتا ہو کہ وہ تھوک سے بچ جاتا ہو یا پھر نماز کی حالت میں بائیں جانب والا فرشتہ بھی دائیں جانب ہی چلا جاتا ہوگا۔ علامہ عینی رحمہ اللہ نے بھی ''فَأَحْسَنُ مَا يُجَابُ بِهٖ'' کہتے ہوئے یہی تیسرا جواب ہی پسند کیا ہے۔[4]

---

[1] فتح الباري (١/ ٥١٣)

[2] عمدة القاري (٢/ ٤/ ١٥٥)

[3] فتح الباري (١/ ٥١٣)

[4] فتح الباري (١/ ٥١٣) سبل السلام (١/ ١٥١) عمدة القاري (٢/ ٤/ ١٥٥)

ان تینوں طرح کے جوابات کا تعلق بظاہر نماز کی حالت میں دائیں جانب تھوکنے کی ممانعت سے ہے۔ ممانعت کا کم از کم کوئی ایک سبب تو واضح اور ظاہر ہے، جبکہ نماز سے باہر اور عام حالت میں دائیں جانب تھوکنے کی ممانعت کا سبب بھی وہی ہے جو ذکر کیا جا چکا ہے کہ دایاں پہلو نبیِ اکرم ﷺ کو بہت محبوب تھا، لہٰذا اس طرف منہ موڑ کر تھوکنا بھی ممنوع ہے۔

دوسرا اشکال یا سوال:

سابق میں ذکر کیے گئے موضوع کے بارے میں دوسرا اشکال معتزلہ کی طرف سے یہ پیدا کیا گیا ہے کہ قبلہ رو تھوکنے کی ممانعت کا جو یہ سبب احادیث میں آتا ہے:

«إِنَّ رَبَّهٗ بَيْنَهٗ وَبَيْنَ الْقِبْلَةِ»[1] ''اس کے اور قبلے کے مابین اس کا پروردگار ہوتا ہے۔''

صحیح مسلم اور سنن ابو داود میں ہے:

«فَإِنَّ اللّٰهَ قِبَلَ وَجْهِهٖ»[2] ''یقیناً اللہ تعالیٰ اس کے سامنے ہوتا ہے۔''

سنن ابو داود، مسند احمد، صحیح ابن خزیمہ اور مستدرک حاکم میں ہے:

«فَإِنَّمَا يَسْتَقْبِلُ رَبَّهٗ»[3] ''وہ اپنے رب کے سامنے ہوتا ہے۔''

یا پھر ہے:

«فَإِنَّ اللّٰهَ عَزَّوَجَلَّ بَيْنَ أَيْدِيْكُمْ»[4] ''پس یقیناً اللہ تعالیٰ تمھارے سامنے ہے۔''

اس سے انھوں نے اپنے باطل نظریے کو ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ اللہ تعالیٰ بذاتہٖ ہر جگہ پر موجود ہے۔

جواب:

ان کا یہ اشکال ان کی جہالت اور کم عقلی کا منہ بولتا ثبوت ہے، کیونکہ اگر اللہ تعالیٰ کو ان کے بقول ہر جگہ بذاتِ خود موجود مانا جائے تو پھر بائیں جانب اور پاؤں کے نیچے تھوکنا بھی ممنوع ہونا ضروری تھا،

---

[1] صحيح البخاري (١/ ٥٠٨)

[2] صحيح مسلم مع شرح النووي (٩/ ١٨/ ١٣٦، ١٣٧) صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٥٤) صحيح الترغيب (١/ ١١٦)

[3] صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٥٥)

[4] صحيح الترغيب (١/ ١١٥)

حالانکہ ان دو جگہوں پر تھوکنے کے جواز کا ذکر بھی انھی احادیث میں مذکور ہے، جن میں قبلہ رو تھوکنے کی ممانعت کے سبب یعنی قبلہ رو اور تھوکنے والے کے مابین اللہ تعالیٰ کے ہونے کا بھی ہوسکتا ہے۔

ان احادیث سے اللہ تعالیٰ کے مستوی علی العرش ہونے کی نفی بھی نہیں ہوتی، بلکہ ان احادیث میں تو یہ بتایا گیا ہے کہ بندہ جدھر بھی منہ کرے، وہ اللہ کے روبرو ہی رہتا ہے، بلکہ یہ اس کی تمام مخلوقات کے لیے عام ہے۔ اسے آسانی کے ساتھ اس مثال سے سمجھا جا سکتا ہے کہ ایک دائرہ بنایا جائے تو اس کے مرکز سے نکلنے والے ہر خط کو جہاں سے بھی نکالیں وہ دائرے یا محیط کے روبرو ہی ہوگا۔ اللہ تعالیٰ کا معاملہ تو اس سے بھی کہیں واضح تر ہے کہ وہ تو ہر چیز کو محیط ہے، لہٰذا اس کی تمام مخلوقات گویا اس کے روبرو ہوتی ہیں، لہٰذا یہ تمام اشکالات و اعتراضات باطل ٹھہرتے ہیں اور قبلہ رو تھوکنے کی ممانعت احترامِ قبلہ کے لیے ہے۔

اس موضوع کی تفصیل شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کی کتب خصوصاً "الحموية" اور "الواسطية" میں دیکھی جا سکتی ہے، ایسے ہی فتح الباری (۱/ ۵۰۸) میں حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے بھی اللہ تعالیٰ کے ہر جگہ پر ہونے کا رد کیا ہے۔ دورِ حاضر کے معروف عالم شیخ ابن باز رحمہ اللہ نے حاشیہ فتح الباری میں اللہ کے مستوی علی العرش ہونے کی بھر پور تائید کی ہے اور اسی بات کو محدّثِ عصر شیخ البانی نے صحیح الترغیب والترہیب (۱/ ۱۱۶) کے حاشیے میں بڑے عمدہ طریقے سے سمجھایا ہے اور یہ بھی تب ہے، جب اللہ کے روبرو ہونے کا کہا جائے، ورنہ تو اس کی ضرورت ہی نہیں رہتی، جیسا کہ امام خطابی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس کے سامنے اس کے پروردگار ہونے والی عبارت میں دراصل حذف ہے۔ اصل عبارت کا مفہوم یہ بنتا ہے کہ اللہ کی عظمت یا اس کا ثواب سامنے ہوتا ہے۔ علامہ ابن عبدالبر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ کلام مجازاً کعبہ شریف کی عظمتِ شان کو بیان کرنے کے لیے صادر ہوا ہے۔[1] اگر ان میں سے کسی مفہوم کو لے لیا جائے تو کوئی اعتراض رہتا ہے نہ اشکال۔

تیسرا اشکال یا سوال:

اب آخر میں ایک تیسرا سوال یہ بھی کیا جا سکتا ہے کہ بعض احادیث میں جو آیا ہے کہ نماز کے دوران میں قبلہ رو اور دائیں جانب مت تھوکو، بلکہ بائیں جانب پاؤں کے نیچے تھوکو، لہٰذا اگر بائیں جانب یا پاؤں کے نیچے تھوکا جائے تو یہ مسجد میں تھوکنا بھی ہوسکتا ہے، جو ناجائز اور آدابِ مسجد کے خلاف ہے۔

[1] فتح الباري (١/ ٥٠٨)

جواب:

اس کا جواب امام نووی رحمہ اللہ نے یہ دیا ہے کہ قبلہ رو اور دائیں جانب تھوکنے کی ممانعت تو مسجد اور خارج از مسجد دونوں کے لیے عام ہے، جبکہ بائیں جانب اور پاؤں سے نیچے تھوکنے کا تعلق مسجد سے باہر ہونے کی صورت سے ہے، لہٰذا مسجد میں نماز پڑھنے والے کو اگر ناچار تھوکنا ہی پڑے تو وہ اپنے کپڑے میں تھوکے، جیسا کہ احادیث گزری ہیں اور مسجد میں تھوکنا چونکہ گناہ ہے، لہٰذا مسجد میں نہ تھوکے، جیسا کہ صحیحین، سنن ابو داود، ترمذی اور نسائی میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے:

«اَلْبُصَاقُ فِي الْمَسْجِدِ خَطِيئَةٌ»[1] ''مسجد میں تھوکنا گناہ ہے۔''

اسی حدیث میں یہ بھی ہے:

«وَكَفَّارَتُهَا دَفْنُهَا»

''(اگر کسی سے یہ خطا سرزد ہو ہی جائے تو) اس کا کفارہ یہ ہے کہ اسے مسجد کی زمین میں دفن کرے۔''

یہ بھی تب ہے جب مسجد میں ریت مٹی یا کنکریٹ ہو اور اگر مسجد پختہ ہو تو پھر اسے باہر پھینک کر جگہ کو صاف کرے، جیسا کہ امام نووی رحمہ اللہ نے اس کی یہ تفصیل ذکر کی ہے۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے بھی فتح الباری میں لکھا ہے کہ اگر پاؤں کے نیچے پختہ جگہ یا قالین و دری وغیرہ ہو تو پھر کپڑے میں تھوکے اور کپڑا بھی نہ ہو تو پھر تھوک کو نگل لینا ہی اولیٰ ہے بہ نسبت اس کے کہ ممنوع فعل کا ارتکاب کیا جائے۔[2]

اس موضوع کی تفصیلات نیل الاوطار (۱/ ۲/ ۳۴۱، ۳۴۲) اور سبل السلام (۱/ ۱/ ۱۵۰، ۱۵۱) میں بھی دیکھی جا سکتی ہیں۔ المختصر مسجد میں ہرگز نہ تھوکیں، اگر کوئی چارہ ہی نہ رہے تو کپڑے میں تھوکیں اور کپڑا نہ ہونے کی صورت میں نگل لینا اولیٰ ہے۔ آخری شکل میں تھوکنا ہی پڑے تو پھر بعد میں صاف کریں۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے اس تفصیل و تفریق کو اچھا قرار دیا ہے۔[3]

---

[1] صحيح البخاري (١/ ٥١١) صحيح مسلم مع شرح النووي (٣/ ٥/ ٤١) صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٤٩، ٤٥٠) صحيح سنن الترمذي، رقم الحديث (٤٦٨) صحيح سنن النسائي، رقم الحديث (٦٩٨) صحيح الجامع، رقم الحديث (٢٨٨٦) صحيح الترغيب (١/ ١١٧)

[2] فتح الباري (١/ ٥١١، ٥١٢) صحيح مسلم مع شرح النووي (٢/ ٥/ ٤١)

[3] فتح الباري (١/ ٥١٣) نيل الأوطار (١/ ٢/ ٣٤١)

ویسے بھی نماز میں اور مسجد کے اندر تھوکنے کی حماقت تو کوئی شاذ ہی کرتا ہوگا، کیونکہ اب ایسا دور کہاں؟ البتہ عام حالات میں قبلہ رو تھوکنے یا دائیں جانب تھوکنے کی بات ہے تو وہ لاعلمی کی وجہ سے عام ہے اور اس کے بارے میں متنبہ کرنا ہماری اصل غرض ہے۔ لگے ہاتھوں ہم نے یہ قلیل الوقوع مسئلہ بھی بیان کر دیا ہے، لہٰذا اصولی طور پر اور ضروری حد تک یہ موضوع تو مکمل ہوگیا ہے۔

نیکی قبول... گناہ معاف:

یہاں ہم ایک بات کی وضاحت کر دینا مناسب سمجھتے ہیں کہ اسلام وہ دین کامل اور آسان دین ہے کہ اس کے احکام فطرتِ انسانی کے عین موافق ہیں اور کوئی ایسا حکم نہیں دیا گیا، جو انسانی طاقت سے باہر ہو، جیسا کہ سورۃ البقرہ میں ارشادِ الٰہی ہے:

﴿ لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ﴾ [البقرة: ٢٨٦]

''اللہ تعالیٰ کسی شخص پر بوجھ نہیں ڈالتا، مگر جتنا کہ وہ اٹھا سکے۔''

اس آیت کی رو سے پہلی بات تو یہ کہ اسلام کا کوئی حکم ایسا نہیں جس پر عمل کرنا ناممکن ہو، البتہ اتنا ہے کہ بعض احکام اگرچہ معمولی سے ہوتے ہیں، لیکن وہ انسان سے توجہ چاہتے ہیں، جیسے یہی قبلہ رو تھوکنے کی ممانعت کا حکم ہے کہ یہ انتہائی آسان سی بات ہے کہ اگر لا ابالی پن یا بے پروائی نہ برتی جائے تو اس میں کوئی مشکل ہی پیش نہیں آتی۔ مومن سے یہی توقع رکھی جاتی ہے کہ اس کا کوئی فعل ایسا نہیں ہوتا جو بے پروائی میں اس سے سرزد ہو، بلکہ وہ ہر قدم پھونک کر رکھتا ہے کہ مبادا کہیں غلطی یا سنت کی خلاف ورزی کا ارتکاب ہوجائے، لیکن اس تمام تر حزم و احتیاط کے باوجود بھی مومن سے خطا اور غلطی کا ارتکاب ہوجانا بشری تقاضا ہے، کیونکہ عصمت صرف اللہ تعالیٰ کا خاصا ہے۔

یا پھر وہ اپنی عنایتِ خاصہ سے اپنے انبیا کو معصومیت کا شرف عطا کرتا ہے، کیونکہ انھوں نے امتوں کی رہبری کا منصب سنبھالنا ہوتا ہے۔ انبیا و رسل علیہم السلام کے سوا کوئی انسانی طبقہ معصوم نہیں ہے، نہ صحابہ رضی اللہ عنہم، نہ تابعین رحمہم اللہ، نہ ائمہ، نہ اولیا، بلکہ ہر کسی سے خطا کا سرزد ہوجانا ممکن ہے اور جب خطا کا صدور ممکن ہے تو اللہ نے ہمیں اس عظیم نعمت سے بھی سرفراز رکھا ہے کہ ہماری خطائیں مختلف طریقوں سے معاف کرتا ہے، حتیٰ کہ نیک کام کرنے سے خطا معاف ہوجاتی ہے، جیسا کہ خود ربِ کائنات کا سورت ہود میں ارشادِ گرامی ہے:

﴿وَ اَقِمِ الصَّلٰوةَ طَرَفَيِ النَّهَارِ وَ زُلَفًا مِّنَ الَّيۡلِ اِنَّ الۡحَسَنٰتِ يُذۡهِبۡنَ السَّيِّاٰتِ ذٰلِكَ ذِكۡرٰى لِلذّٰكِرِيۡنَ﴾ [هود: ١١٤]

''اور (اے پیغمبر!) دن کے دونوں کناروں پر (فجر وعصر یا فجر ومغرب کی) نماز درستی سے ادا کریں اور رات کے حصوں میں (عشاء یا مغرب وعشاء) یہ اس لیے کہ نیکیاں برائیوں کو مٹا دیتی ہیں، یہ ان لوگوں کے لیے نصیحت ہے جو نصیحت مانتے ہیں۔''

نیکیوں سے برائیاں کیسے معاف ہوتی ہیں اور کس نیکی سے کتنی بلکہ کتنے سالوں کی برائیاں معاف کر دی جاتی ہیں؟ ان کی تفصیل ذکر کرنا شروع کر دی جائے تو بات پھر طویل ہو جائے گی، لہٰذا یہاں چند اشارات پر ہی اکتفا کرتے ہیں کہ زیادہ نہیں تو آپ کم از کم سورت ہود کی اسی آیت کا پس منظر یا سببِ نزول ہی کتبِ تفسیر سے پڑھ لیں یا پھر وضو کے فضائل، نمازِ پنج گانہ کے فضائل، عمرے کے فضائل، رمضان کے فضائل، یومِ عرفہ و عاشوراء کے روزے کے فضائل، جمعہ کے فضائل، حج کے فضائل اور دو مسلمانوں کے باہم مل کر سلام و مصافحے کے فضائل ہی پڑھ لیں، بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہو جائے گی کہ اللہ کس طرح نیکیوں کی وجہ سے برائیوں کو معاف کرتا ہے۔

بھول چوک معاف:

وہ برائیاں جو عمداً یعنی جان بوجھ کر کی جاتی ہیں، جو فطرت انسانی کے تقاضوں کے تحت شیطان کے بہکاوے میں آ کر ہو جاتی ہیں، انھیں بھی اللہ تعالیٰ موقع بہ موقع نیک اعمال کے ذریعے سے معاف کرتا رہتا ہے، جبکہ وہ افعال جو ناجائز تو ہیں، لیکن ان کے ارتکاب میں انسان کی مرضی کو کوئی دخل نہیں ہوتا، وہ اضطراری و غیر اختیاری حالت میں ہوں یا بھول چوک سے ان کا ارتکاب ہو جائے اور ارتکاب کرنے والے کو بوقتِ ارتکاب پتا بھی نہ ہو کہ مجھ سے کوئی ایسا فعل سرزد ہوئے جا رہا ہے، جو ممنوع ہے، تو ایسی بھول چوک پر ربِ غفور و رحیم ویسے ہی کوئی مؤاخذہ نہیں کرتا، یعنی ایسے امور پر کوئی پکڑ ہی نہیں ہوتی، کیونکہ کتبِ فقہ و اصول میں ایک جملہ حدیث کے طور پر معروف ہے، جس میں ہے:

«رُفِعَ عَنْ أُمَّتِي الْخَطَأُ وَالنِّسْيَانُ» ''میری امت کی بھول چوک معاف کر دی گئی ہے۔''

ایسے ہی الکامل لابن عدی میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مرفوعاً مروی ہے:

«عَفَا لِي عَنْ أُمَّتِي الْخَطَأَ وَالنِّسْيَانَ وَمَا اسْتُكْرِهُوا عَلَيْهِ»[1]

''میری امت کی بھول چوک اور مجبوری میں کیے گئے افعال معاف کر دیے گئے ہیں۔''

لیکن اس روایت کی سند کے دور راوی عبدالرحیم اور اس کے باپ زید دونوں پر محدّثین نے سخت تنقید کی ہے اور پہلے کو کذاب اور دوسرے کو ضعیف کہا ہے۔ لہٰذا یہ روایت تو قابلِ حجت نہیں۔ پہلا معروف جملہ حدیث کے طور پر مشہور ہے، لیکن وہ حدیث ثابت نہیں ہے، بلکہ اس مفہوم کی حدیث دراصل سنن ابن ماجہ و بیہقی میں ہے، جو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما ہی سے مرفوعاً مروی ہے کہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

«إِنَّ اللّٰهَ وَضَعَ عَنْ أُمَّتِي الْخَطَأَ وَالنِّسْيَانَ وَمَا اسْتُكْرِهُوا عَلَيْهِ»[2]

''بے شک اللہ تعالیٰ نے میری امت کو بھول چوک اور مجبوری میں کیے گئے افعال معاف کر دیے ہیں۔''

نیز سنن ابن ماجہ و بیہقی میں حضرت ابو ذر غفاری رضی اللہ عنہ سے مروی ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ ہیں:

«إِنَّ اللّٰهَ تَجَاوَزَ عَنْ أُمَّتِي الْخَطَأَ وَالنِسْيَانَ وَمَا اسْتُكْرِهُوا عَلَيْهِ»[3]

''اللہ تعالیٰ نے میری امت کی بھول چوک اور مجبوری و ناچاری میں کیے گئے افعال کو معاف کر دیا ہے۔''

یاد رہے کہ اس حدیث کا ایک دوسرا طریق بھی ہے، جسے امام طحاوی رحمہ اللہ نے شرح معانی الآثار میں، دارقطنی نے سنن میں، حاکم نے مستدرک میں، ابن حبان نے صحیح میں اور ابن حزم رحمہم اللہ نے اصول الاحکام میں روایت کیا ہے۔ یہ حدیث حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے تین دیگر طُرق سے بھی مروی ہے، ان میں سے طریقِ ثانی کو امام حاکم رحمہ اللہ نے صحیح بخاری و مسلم کی شرط کے مطابق صحیح قرار دیا ہے۔ علامہ ابن حزم رحمہ اللہ نے اس سے حجت اخذ کی ہے اور علامہ احمد شاکر رحمہ اللہ نے "أصول الأحكام" کے حاشیے میں اسے صحیح کہا ہے۔ امام ابن حبان رحمہ اللہ نے بھی اسے صحیح کہا ہے۔ امام نووی رحمہ اللہ نے

---

[1] إرواء الغليل (١/ ١٢٣) التلخيص الحبير (١/ ١/ ٢٨٣)

[2] صحيح سنن ابن ماجه (١/ ٣٤٨) التلخيص الحبير (١/ ١/ ٢٨١) مشكاة المصابيح (٣/ ٧٧١) نصب الراية (٢/ ٦٤۔ ٦٦، (٣/ ٢٣٣)

[3] صحيح سنن ابن ماجه (١/ ٣٤٧)

اسے اربعین اور روضۃ الطالبین میں حسن درجے کی حدیث شمار کیا ہے، جبکہ حافظ ابن حجر نے "تلخیص الحبیر" میں امام نووی کی تحسین کو برقرار رکھا ہے۔[1]

ایسے ہی یہ حدیث حضرت ثوبان، ابن عمر، ابوبکرہ، ابو درداء رضی اللہ عنہم سے اور حضرت حسن بصری رحمہ اللہ سے مرسلاً بھی مروی ہے۔ ان سب میں بعض اسبابِ ضُعف پائے جاتے ہیں، جن کی تفصیل علامہ زیلعی رحمہ اللہ نے "نصب الرایۃ" میں اور حافظ ابن رجب نے "شرح الأربعین" جامع العلوم والحکم (ص: ۳۵۰، ۳۵۲) میں ذکر کی ہے، جبکہ امام سخاوی نے "المقاصد الحسنۃ" (ص: ۲۳۰) میں لکھا ہے کہ ان تمام طُرق سے پتا چلتا ہے کہ اس حدیث کی کوئی اصل ضرور ہے۔[2]

اس سب کے بیان کرنے کی ضرورت اس لیے پیش آئی ہے کہ ابن ابی حاتم نے اپنے والد سے اور عبداللہ بن احمد بن حنبل رحمہ اللہ نے اپنے والد سے اس حدیث کے بارے میں جو جرح نقل کی ہے اور بعض دیگر اہلِ علم نے بھی کلام کیا ہے، اس کے بارے میں وضاحت ہوجائے کہ اگر بعض نے جرح کی ہے تو کتنے ہی محدّثین نے اسے حسن اور صحیح بھی قرار دیا ہے۔ دورِ حاضر کے معروف محدّث شیخ ناصر الدین البانی حفظہ اللہ نے بھی ارواء الغلیل، تحقیق مشکوٰۃ اور صحیح ابن ماجہ میں اسے صحیح قرار دیا ہے اور جرح کا معقول جواب دینے کے علاوہ صحیح مسلم شریف سے ایک حدیث بھی وارد کی ہے، جسے ان سے قبل علامہ ابن رجب نے بھی شرح الاربعین میں نقل کیا ہے اور اسے زیرِ بحث حدیث کا شاہد و مؤید قرار دیا ہے، جس میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما بیان فرماتے ہیں:

«لَمَّا نَزَلَتْ ﴿رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَآ اِنْ نَّسِيْنَآ اَوْ اَخْطَاْنَا﴾ قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى: قَدْ فَعَلْتُ»[3]

"جب یہ آیت نازل ہوئی جس میں ارشادِ الٰہی ہے: اے ہمارے پروردگار! ہماری بھول چوک پر ہمارا مؤاخذہ نہ کرنا، تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: میں نے یہ کر دیا ہے۔"

صحیح مسلم ہی میں یہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے بھی مروی ہے اور حافظ ابن رجب نے جو کہا ہے

---

[1] الأربعین للنووي (ص: ١٦٧) تحقیق عبدالرحیم انصاری، التلخیص الحبیر (١/ ١/ ٢٨١، ٢٨٣) إرواء الغلیل (١/ ١٢٣، ١٢٤)

[2] دیکھیں: نصب الرایۃ (٢/ ٦٤، ٦٥، ٦٦) جامع العلوم والحکم لابن رجب (ص: ٣٥٠، ٣٥٢، دار المعرفۃ)

[3] صحیح مسلم مع شرح النووي (١/ ٢/ ١٤٦) جامع العلوم (ص: ٣٥٢) الإرواء (١/ ١٢٤)

کہ کسی نے بھی اس حدیث کو مرفوعاً بیان نہیں کیا، تو بات دراصل یہ ہے کہ ان کے اس قول سے حدیث پر کوئی اثر نہیں پڑتا، کیونکہ یہ ایسی بات ہے کہ جس میں رائے یا اجتہاد کو کوئی دخل ہی نہیں، لہٰذا ایسی حدیث مرفوع کے حکم میں ہی ہوتی ہے۔

غرض کہ اس ساری تفصیل سے معلوم ہوا کہ بھول چوک معاف ہے اور قبلہ رو تھوکنا ممنوع ہے۔ اگر کوئی جان بوجھ کر تھوکے گا تو اس کا مؤاخذہ ہوگا، جیسا کہ احادیث میں وعید گزری ہے اور اگر کبھی بھول چوک ہوجائے تو اللہ غفور و رحیم ہے۔ بھول چوک کے احکام کی تفصیل کے لیے دیکھیں: ''جامع العلوم والحکم لابن رجب'' اور ''النسیان و أثره في الأحکام الشرعیة'' للشیخ یحییٰ حسین الفیفی طبع مؤسسة الرسالة بیروت۔[1]

آدابِ مسجد اور آدابِ کعبہ کے مابین مشترک یہ موضوع تو ضروری حد تک مکمل ہوا، جبکہ دیگر کتنے ہی آداب و احکامِ مساجد ابھی باقی ہیں، جن میں سے بعض اُمور کا تذکرہ ضروری ہے۔

---

[1] اس سلسلے میں (قبلہ رومت تھوکیے) اور احترامِ قبلہ کے عنوانات کے تحت ہمارا ایک مفصل مقالہ ماہنامہ محدّث بنارس اور ماہنامہ صراطِ مستقیم اور پاکستان کے بعض مجلّات میں شائع ہو چکا ہے۔

مسجد میں گمشدہ بچوں یا دیگر چیزوں کا اعلان کرنا

آداب و احکامِ مساجد میں سے ایک مسجد میں گمشدہ بچوں یا دیگر چیزوں کا اعلان کرنا بھی ہے۔عرب ممالک میں تو الحمد للہ امنِ عامہ کا یہ عالَم ہے کہ مساجد میں ایسے اعلانات کی نوبت ہی نہیں آتی۔ یہاں بچے اٹھائے جاتے ہیں نہ کبھی گمشدگی کا شور سنا گیا ہے۔حصولِ انصاف میں آسانی اور قانون کی بالادستی والے ملکوں میں ایسا ہی ہوتا ہے اور ایسا ہی ہونا بھی چاہیے،لیکن اسے کیا کہیے کہ کتنے ہی ایسے ممالک ہیں، جو امن وامان کی ان بہاروں سے محروم ہیں!!

بہر حال چونکہ ایسے ممالک موجود بلکہ بکثرت موجود ہیں، جہاں بچوں کی گمشدگی کے واقعات رونما ہوتے رہتے ہیں۔ وہ حقیقی گمشدگی ہو یا بردہ فروشوں کی کارستانیوں کا نتیجہ۔ بسا اوقات بعض دوسری چیزوں کی گمشدگی کے اعلانات کی ضرورت بھی پیش آجاتی ہے،لہٰذا بچوں کے لیے ظاہر ہے کہ موثر ترین ذرائع اِبلاغ تو ٹیلی ویژن، ریڈیو اور روزنامہ اخبارات وغیرہ ہی ہوسکتے ہیں۔ ایسے ہی فوری اقدام کے لیے مقامی طور پر یہ بھی کیا جاسکتا ہے کہ کوئی گاڑی کرائے پر لیں اور ایک لاؤڈ سپیکر اس پر فٹ کرکے اس کے ذریعے سے سارے شہر کے اہم مقامات کالونیوں،محلّوں اور گلی کوچوں میں گمشدگی کا اعلان کریں۔ یہ زیادہ موثر اور زود اثر طریقہ ہے، جب کہ ذرائعِ ابلاغ والا طریقہ اگرچہ کچھ تاخیر طلب ہوتا ہے،لیکن اتنا ہی وہ وسیع تر پیمانے پر ہوجاتا ہے۔

ہمارے برصغیر کے ممالک میں اس راست اقدام کے بجائے ہوتا یہ ہے کہ کسی کی مرغی بھی گم ہوجائے تو تھوڑی دیر اِدھر اُدھر پوچھ تاچھ کے بعد امام مسجد کے پاس جانکلتے ہیں کہ میاں جی، قاری صاحب یا مولوی صاحب! ہماری مرغی گم ہوگئی یافلاں چیز نہیں مل رہی۔آپ مسجد کے لاؤڈاسپیکر سے ذرا اعلان کردیں اور چیز ملے نہ ملے وہ حضرت اعلان کرکے اس ’’فریضے‘‘ سے گویا سبکدوش ہوجاتے ہیں۔

تو آیئے ذرا شریعت سے دریافت کریں کہ ایسے اعلانات جائز بھی ہیں یا نہیں اور نبیِ اکرم ﷺ نے اس سلسلے میں ہمیں کیا ہدایات دی ہیں؟ چنانچہ صحیح مسلم اور دیگر کتبِ حدیث میں اس موضوع کے

بارے میں بڑی کھلی کھلی نصوص اور واضح ہدایات خود نبیِ اکرم ﷺ سے مروی ہیں کہ مسجد میں ایسے اعلانات شرعا درست نہیں ہیں۔

عدمِ جواز کی پہلی دلیل:

عدمِ جواز کے دلائل میں سے پہلی دلیل وہ حدیث ہے جو صحیح مسلم "كتاب المساجد: باب النهي عن نشد الضالة في المسجد" میں، ایسے ہی سنن ابو داود، ابن ماجہ، مسند احمد اور صحیح ابن حبان میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبیِ اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

« مَنْ سَمِعَ رَجُلًا يُنْشِدُ ضَالَّةً فِي الْمَسْجِدِ فَلْيَقُلْ: لَا رَدَّهَا اللّٰهُ عَلَيْكَ، فَإِنَّ الْمَسَاجِدَ لَمْ تُبْنَ لِهٰذَا »[1]

''جو شخص کسی کو مسجد میں اپنی کسی گمشدہ چیز کا اعلان کرتے ہوئے سنے تو اسے یہ کہے کہ اللہ تعالیٰ تجھے وہ چیز واپس نہ کرے، کیونکہ مساجد اس کام کے لیے تو نہیں بنائی گئی ہیں۔''

دوسری دلیل:

اس مسئلے میں دوسری دلیل وہ حدیث ہے جو صحیح مسلم شریف کے اسی صفحے پر اگلی ہی حدیث ہے اور سنن نسائی، ابن ماجہ، مصنف عبدالرزاق، مصنف ابن ابی شیبہ، طیالسی اور سنن بیہقی میں بھی مروی ہے، اس میں حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں:

« إِنَّ رَجُلًا نَشَدَ فِي الْمَسْجِدِ فَقَالَ: مَنْ دَعَا إِلَى الْجَمَلِ الْأَحْمَرِ فَقَالَ النَّبِيُّ ﷺ: لَا وَجَدْتَّ، إِنَّمَا بُنِيَتِ الْمَسَاجِدُ لِمَا بُنِيَتْ لَهٗ »[2]

''ایک آدمی نے مسجد میں اعلان کیا کہ اس کا گمشدہ سرخ اونٹ کسی نے دیکھا ہو؟ اس پر نبیِ اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: تو اپنے اونٹ کو نہ پائے، کیونکہ مساجد جن مقاصد کے لیے بنائی گئی ہیں، وہ انہی کے لیے ہیں۔''

---

[1] صحيح مسلم مع شرح النووي (٣/ ٥/ ٥٤) صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٣٨) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٧٦٧) مسند أحمد (٢/ ٣٤٩) بحواله حاشيه الاحسان (٤/ ٥٣٥) صحيح الجامع (٣/ ٥/ ٣٠٣) صحيح الترغيب (١/ ١١٨)

[2] صحيح مسلم مع شرح النووي (٣/ ٥/ ٥٤) صحيح سنن النسائي، رقم الحديث (٦٩٣) ولكنه عن جابر، سنن ابن ماجه (٧٦٥) الإحسان (٤/ ٥٣١) صحيح الترغيب (١/ ١١٨)

مساجد کن مقاصد کے لیے بنائی گئی ہیں؟ ایک اعرابی کے مسجد میں پیشاب کرنے کے واقعے میں اس کی وضاحت بھی خود نبیِ اکرم ﷺ نے فرما رکھی ہے۔ چنانچہ صحیح بخاری ایسے ہی صحیح مسلم "كتاب الطهارة: باب وجوب غسل البول" میں، مسند احمد، سنن ابو داود، نسائی، ابن ماجہ، دارمی اور مسند ابی عوانہ میں حدیث ہے، جس میں حضرت ابو ہریرہ و انس رضی اللہ عنہما کے مطابق مساجد کے اغراض و مقاصد بیان کرتے ہوئے نبیِ اکرم ﷺ ارشاد فرمایا:

«إِنَّمَا هِيَ لِقِرَاءَةِ الْقُرْآنِ، وَذِكْرِ اللّٰهِ وَالصَّلَاةِ»[1]

"یہ مسجدیں صرف اللہ کے ذکر، نمازوں کو ادا کرنے اور قرآنِ کریم کی تلاوت کے لیے بنائی جاتی ہیں۔"

گویا نبیِ اکرم ﷺ نے مساجد کے اغراض و مقاصد بیان کر کے اور پہلی دونوں حدیثوں میں اپنے ارشاد و عملِ مبارک ہر دو سے واضح طور پر گمشدگی کے اعلانات کے سلسلے میں حکم امتناعی جاری فرما دیا ہے۔ امام نووی رحمہ اللہ نے شرح صحیح مسلم میں پہلی دونوں حدیثوں کی شرح میں لکھا ہے کہ ان دونوں حدیثوں سے کئی احکام کا استفادہ ہوتا ہے، جن میں سے ایک مسجد میں کسی گمشدہ چیز کے اعلان کی ممانعت بھی ہے۔

تیسری دلیل:

اس بات کی تیسری دلیل سنن ابن ماجہ "كتاب المساجد: باب النهي عن إنشاد الضوال في المساجد" میں مروی حدیث ہے، جس میں راویِ حدیث صحابی رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں:

«نَهٰى عَنْ إِنْشَادِ الضَّالَّةِ فِي الْمَسْجِدِ»[2]

"نبیِ اکرم ﷺ نے ایسی گمشدہ اشیا (بشمول حیوانات وغیرہ) کے مسجد میں اعلان کرنے سے منع فرمایا۔"

آپ ﷺ نے نہ صرف ایسے اعلانات سے منع فرمایا ہے، بلکہ ایسا اعلان کرنے والے شخص کے حق میں بد دعا فرمائی کہ تیری وہ چیز تجھے کہیں سے بھی نہ ملے اور اعلان سننے والوں کو بھی حکم فرمایا

---

[1] الإحسان (١٤٠١، ١٤٠٢) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٥٢٩) صحيح الجامع (١/ ٢/ ٢٦٢) الإرواء (١/ ١٩٠۔ ١٩١)

[2] سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٧٦٦)

کہ ایسے شخص کے لیے اسی قسم کی بد دعا کریں۔ امام نووی رحمہ اللہ کے بقول آپ ﷺ کا یہ بد دعا کرنا اور اسی کی تلقین فرمانا ایسے شخص کے لیے اس کے فعل کی فوری سزا کے طور پر ہے کہ اس نے نبیِ اکرم ﷺ کے ارشاد وحکم کی نافرمانی کیوں کی؟

چوتھی دلیل:

سنن ابو داود، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ، صحیح ابن خزیمہ، شرح السنۃ بغوی اور مسند احمد میں ایک چوتھی دلیل بھی ہے، جس میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں:

﴿ نُهِيَ عَنِ الشِّرَاءِ وَالْبَيْعِ فِي الْمَسْجِدِ، وَأَنْ يُّنْشَدَ فِيْهِ ضَالَّةٌ، وَأَنْ يُّنْشَدَ فِيْهِ شِعْرٌ، وَنُهِيَ عَنِ التَّحَلُّقِ قَبْلَ الصَّلَاةِ يَوْمَ الْجُمُعَةِ ﴾[1]

’’نبیِ اکرم ﷺ نے مسجد میں کوئی چیز بیچنے، خریدنے اور کسی گمشدہ چیز کے اعلان کرنے اور مسجد میں (لا یعنی قسم کی) شعر گوئی کرنے سے منع فرمایا اور آپ ﷺ نے جمعہ کے دن نماز سے پہلے مسجد میں حلقے بنانے سے بھی منع فرمایا۔‘‘

اس حدیث میں صرف ایک نہیں بلکہ کئی چیزوں کی ممانعت آ گئی ہے، جن میں سے مسجد میں خرید وفروخت اور شعر گوئی وغیرہ کا ذکر تو قدرے تفصیل سے آگے چل کر کریں گے۔ سر دست یہ ذہن میں رکھیں کہ اس حدیث کی رو سے بھی مسجد میں گمشدہ اشیا کے اعلانات کی ممانعت آئی ہے۔

پانچویں دلیل:

سنن نسائی، صحیح ابن خزیمہ اور مستدرک حاکم میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک آدمی آیا، جس نے مسجد میں کسی گمشدہ چیز کا اعلان کیا تو نبیِ اکرم ﷺ نے فرمایا:

﴿ لَا وَجَدْتَّ ﴾ ’’تو اسے نہ پائے۔‘‘

چھٹی دلیل:

سنن ترمذی، نسائی، صحیح ابن خزیمہ اور مستدرک حاکم میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبیِ اکرم ﷺ نے فرمایا:

---

[1] صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (٩٥٦) صحيح سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٦٥) صحيح سنن النسائي، رقم الحديث (٦٩٠) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٧٤٩، ١١٣٣) صحيح ابن خزيمة (١٣٠٤) شرح السنة (٢/ ٣٧٢، حسنه الأرناؤوط) صحيح الجامع (٣/ ٦/ ٥٣) فتح الباري (١/ ٥٤٩)

«إِذَا رَأَيْتُمْ مَنْ يَبِيعُ أَوْ يَبْتَاعُ فِي الْمَسْجِدِ فَقُولُوا: لَا أَرْبَحَ اللّٰهُ تِجَارَتَكَ، وَإِذَا رَأَيْتُمْ مَنْ يُنْشِدُ ضَالَّةً فَقُولُوا: لَا رَدَّهَا اللّٰهُ عَلَيْكَ»[1]

''جب تم میں سے کوئی شخص کسی کو مسجد میں خرید وفروخت کرتے دیکھے تو اسے کہے کہ اللہ تیری تجارت کو سود مند اور نفع بخش نہ کرے اور جب کوئی شخص کسی کو اپنی گمشدہ چیز کا اعلان کرتے دیکھے تو کہے کہ اللہ تجھے وہ چیز واپس نہ لوٹائے۔''

محدّثین کرام اور فقہاے عظام نے اپنی تالیفات میں ان احادیث کو نقل کرتے وقت جو تبویب کی ہے، اس سے بھی پتا چلتا ہے کہ ان حضرات کے نزدیک بھی ایسے اعلانات ایک ممنوع فعل ہیں۔ چنانچہ صحیح مسلم میں وارد احادیث کی تبویب امام نووی رحمہ اللہ نے یوں کی ہے:

''اَلنَّهْيُ عَنْ نَشْدِ الضَّالَّةَ فِي الْمَسْجِدِ''

''مسجد میں کسی گم شدہ چیز کے اعلان کی ممانعت کا بیان۔''

امام ابو داود کی تبویب ہے: ''بَابٌ فِي كَرَاهِيَةِ إِنْشَادِ الضَّالَّةِ فِي الْمَسْجِدِ''

''مسجد میں کسی گمشدہ چیز کے اعلان کے مکروہ (وممنوع) ہونے کا بیان۔''

امام ترمذی کی تبویب یوں ہے:

''بَابُ مَا جَاءَ فِي كَرَاهِيَةِ الْبَيْعِ وَالشِّرَاءِ وَإِنْشَادِ الضَّالَّةِ فِي الْمَسْجِدِ''[2]

امام نسائی نے یوں تبویب کی ہے:

''بَابُ النَّهْيِ عَنْ إِنْشَادِ الضَّالَّةِ فِي الْمَسْجِدِ''

امام ابن ماجہ نے دو طرح سے تبویب کی ہے:

1. ''بَابُ النَّهْيِ عَنْ إِنْشَادِ الضَّوَالَ فِي الْمَسْجِدِ''
2. ''بَابُ النَّهْيِ عَنْ إِنْشَادِ الضَّالَّةِ فِي الْمَسْجِدِ''

معنیٰ ومفہوم سبھی کا ایک ہی ہے۔[3]

---

[1] صحيح سنن النسائي (١/ ١٥٤۔ ١٥٥)

[2] صحيح سنن الترمذي، رقم الحديث (١٠٦٦) صحيح ابن خزيمة (١٣٠٥) المستدرك للحاكم (٢/ ٥٦) صحيح الترغيب (١/ ١١٨)

[3] دیکھیں: الساجد بأحكام المساجد (ص: ٣٢٤)

مجوّزین اور ان کے دلائل:

بعض لوگوں نے کچھ لغوی میں میخ نکالتے ہوئے یا بال کی کھال اتارتے ہوئے کہا ہے کہ احادیث میں جو "ضالة" آیا ہے، اس سے مراد گمشدہ جانور ہیں۔ لہٰذا اگر بچہ گم ہوجائے تو اس کے اعلان کی ممانعت نہیں ہوگی۔ بعض دیگر نے بقائے نفس اور احترامِ آدمیت کا نقطہ اٹھاتے ہوئے ایک فقہی اصول "الضرورات تبیح المحذورات" کا سہارا لیا ہے اور بچوں کے بارے میں اعلان کا جواز کشید کیا ہے۔ کچھ حضرات وہ بھی ہیں جو مصالح مرسلہ کے حوالے سے اسے جائز کرتے جا رہے ہیں، جبکہ ان تینوں قسم کے لغوی و قیاسی دلائل کا جائزہ لینے اور ان کے بغور مطالعہ کرنے سے پتا چلتا ہے کہ ان میں کوئی جان نہیں ہے، بلکہ تنکے کا سہارا لینے کی کوشش کی جارہی ہے۔ آیئے ذرا ان دلائل کا کچھ جائزہ لیں۔

پہلی دلیل:

اس سلسلے میں بعض لوگ پہلی دلیل کے طور پر لفظ "ضالة" کے لغوی معنیٰ ومفہوم کی بحث کرکے ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ اعلان کی ممانعت کے سلسلے میں احادیث میں بھی لفظ "ضالة" آیا ہے اور اس سے مراد گمشدہ جانور ہیں، مثلاً اونٹ، بھیڑ اور بکری وغیرہ، لہٰذا احادیث میں جو ممانعت ہے وہ جانوروں کی گمشدگی کے اعلانات کی ہے، جب کہ انسان کا بچہ ایک دوسری چیز ہے اور اگر بچہ گم ہوجائے تو اس کی گمشدگی کا مسجد میں اعلان کرنا جائز ہے۔

جائزہ:

ان کی یہ دلیل چونکہ محض لغوی بحث ہے، لہٰذا اس کا جائزہ بھی ہم کتبِ لغت ہی کے حوالے سے لیتے ہیں تو اس سلسلے میں عرض ہے کہ "ضالة" کا معنیٰ صرف گمشدہ حیوانات یا جانور ہی نہیں، بلکہ اس کا اطلاق گمشدہ حیوانات کے علاوہ دوسری اشیا پر بھی ہوتا ہے۔ چنانچہ عربی لغت کی کتابوں میں سے "المعجم الوسیط" میں "الضالة" کا معنیٰ یوں لکھا ہے:

« كُلُّ مَا ضَلَّ أَيْ ضَاعَ مِنَ الْمَحْسُوْسَاتِ وَالْمَعْقُوْلَاتِ أَوْ مِنَ الْبَهَائِمِ خَاصَّةً [1] »

"یعنی "ضالة" ہر گمشدہ چیز کو کہتے ہیں خواہ محسوسات سے تعلق رکھتی ہو یا معقولات سے

---

[1] المعجم الوسیط (۱/ ۵۲۳ طبع ترکی)

یا پھر خاص طور پر یہ لفظ حیوانات کے لیے بولا جاتا ہے۔‘‘

گویا عموماً تو یہ حیوانات کے لیے ہے، لیکن اس کا اطلاق دیگر محسوسات و معقولات پر بھی ہوتا ہے۔ چنانچہ بعض احادیث سے پتا چلتا ہے کہ یہ لفظ حکمت و دانائی کی بات کے لیے بھی بولا گیا ہے، جیسا کہ سنن ترمذی کتاب العلم باب (۱۱۹) اور سنن ابن ماجہ کتاب الزہد باب (۱۵) اور ضعفاء ابن حبان میں حدیث ہے:

«اَلْکَلِمَةُ الْحِکْمَةُ ضَالَّةُ الْمُؤْمِنِ فَحَیْثُ وَجَدَهَا فَهُوَ أَحَقُّ لَهَا»

’’حکمت و دانائی کی بات مومن کی ایک گمشدہ دولت ہے۔ جہاں بھی وہ پائی جائے، وہی اس کا اصل مستحق ہے۔‘‘

لیکن ہمیں چونکہ یہاں صرف اس میں وارد لفظ ’’ضالة‘‘ کے لغوی معنیٰ و مفہوم کی تعیین مطلوب ہے، لہٰذا اس کے لیے اس حدیث سے بھی تائید لی جاسکتی ہے کہ حکمت و دانائی کی بات کے لیے بھی ’’ضالة‘‘ کا لفظ وارد ہوا ہے۔ گویا ’’المعجم الوسیط‘‘ میں جو معقولات پر بھی اس لفظ کے اطلاق کی بات آئی ہے تو وہ اس حدیث کے الفاظ سے ثابت بھی ہوگئی۔ قرآنِ کریم کے مطالعے سے تو پتا چلتا ہے کہ یہ لفظ یا اس فعل کا صیغہ انسانوں کی گمشدگی کے لیے بھی استعمال ہوا ہے۔ چنانچہ سورۃ سجدہ میں اللہ تعالیٰ نے کفّار کا قول نقل فرمایا ہے کہ وہ کہیں گے:

﴿وَ قَالُوْٓا ءَ اِذَا ضَلَلْنَا فِی الْاَرْضِ ءَ اِنَّا لَفِیْ خَلْقٍ جَدِیْدٍ﴾ [السجدة: ۱۰]

’’اور وہ کہنے لگے کہ ہم جب (مرکر) زمین میں گم ہوجائیں گے تو کیا از سرِ نو پیدا ہوں گے؟‘‘

ایسے ہی سورۃ الاعراف میں ہے کہ موت کے وقت اللہ کے فرشتے جب منکرینِ حق سے پوچھیں گے کہ کہاں ہیں وہ جنھیں تم اللہ کے علاوہ پکارا کرتے تھے؟ تو وہ جواب دیں گے:

﴿قَالُوْا ضَلُّوْا عَنَّا﴾ [الأعراف: ۳۷] ’’وہ کہیں گے کہ ہم سے غائب ہوگئے ہیں۔‘‘

ان آیات میں زیرِ بحث لفظ کے فعل ماضی کے صیغے انسانوں کی گمشدگی کے بارے میں آئے ہیں۔ قرآنِ کریم میں اس لفظ اور اس کے مشتقات کو کن کن معنوں میں استعمال کیا گیا ہے، اس کی تفصیل کے لیے ’’المعجم المفهرس لألفاظ القرآن الکریم‘‘ (ص: ۴۲۱۔ ۴۲۴) کا مطالعہ مفید رہے گا۔

ایسے ہی مسند احمد (۴/ ۴۴۷، ۵/ ۳، ۴، ۵) میں ایک حدیث ہے، جس میں بنی اسرائیل کے ایک شخص کا واقعہ مذکور ہے، جس نے اپنے بچوں کو وصیت کی تھی کہ میرے مرنے کے بعد مجھے آگ میں جلا کر میری راکھ کو ہوا میں اڑا دینا اور اس کی وجہ بیان کرتے ہوئے وہ کہتا ہے:

«لَعَلِّيْ أَضِلُّ اللّٰهَ تَبَارَكَ وَتَعَالٰى»

''شاید (ایسا کرنے سے) میں اللہ تبارک وتعالیٰ سے اوجھل رہ سکوں اور اس کے حضور پیش ہونے سے بچ جاؤں۔''

گویا قرآنِ کریم اور احادیث کے یہ استعمالات اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ لفظ ''ضَلَّ'' انسانی گمشدگی کے لیے بھی بولا جاتا ہے، اگرچہ اس کا زیادہ تر استعمال ذہول یا راہِ راست سے بھٹک جانے کے لیے ہے، اسی لیے عموماً ان الفاظ کا ترجمہ گمراہ ہوجانے اور گمراہی سے کیا جاتا ہے۔

اس ساری لغوی بحث وتفصیل کے پیشِ نظر کہا جا سکتا ہے کہ لغوی دلیل پر مبنی جس بات کو بنیاد بنا کر گمشدہ بچوں کے متعلق مساجد میں اعلان جائز قرار دیا جاتا ہے تو وہ بات یا دلیل ہی سرے سے بے بنیاد ہے، لہٰذا اس دلیل پر اعتماد کرتے ہوئے ایسے اعلانات کو جائز قرار نہیں دیا جا سکتا۔

دوسری دلیل:

بعض اہلِ علم نے یہ نقطہ اٹھایا ہے کہ بقاے نفس اور احترامِ آدمیت کے پیشِ نظر بچوں کی گمشدگی کے اعلان کو جائز ہونا چاہیے اور پھر اسے ایک فقہی قاعدے کے تحت لانے کی کوشش کی جاتی ہے، جس میں کہا گیا ہے:

«اَلضَّرُوْرَاتُ تُبِيْحُ الْمَحْذُوْرَاتِ»

''ضرورتیں ممنوع اشیا کو بھی مباح کر دیتی ہیں۔''

جائزہ:

ان کی یہ دوسری دلیل بھی پہلی دلیل کی طرح ہے، کیونکہ اس قاعدہ کلیہ کی نوبت صرف اسی صورت میں آتی ہے، جب اس کا کوئی دوسرا متبادل انتظام نہ ہوسکتا ہو، لیکن ہمارے یہاں عموماً اور غالبًا کوئی ایسی جائز ضرورت یا مجبوری نہیں ہوتی، جس کی بنا پر ہم احادیث میں وارد صریح حکمِ امتناعی کی خلاف ورزی کرتے ہوئے اس امر کو جائز قرار دیں، کیونکہ مسجد سے باہر اس کا معقول بندوبست ہو

سکتا ہے، جیسا کہ اس موضوع کو شروع کرتے وقت ہم اس کا طریقہ بلکہ کئی طریقے ذکر کر آئے ہیں۔

ہاں اگر واقعی کوئی ایسی مجبوری ہو اور مسجد سے باہر اس کا انتظام کرنا ناممکن ہو تو پھر اس اعلان کی گنجایش نکل سکتی ہے، لیکن چونکہ یہ ناممکنات میں سے نہیں ہے، لہٰذا محض پیسے بچانے کے لیے ضرورت کا ہوّا کھڑا کر کے ''اَلضُّرُوْرَاتُ تُبِیْحُ الْمَحْظُوْرَاتِ'' کے قاعدے سے فائدہ اٹھانا اس قاعدے کا ناجائز استعمال ہوگا۔

تیسری دلیل:

ایسے اعلانات کے جواز کے لیے بعض حضرات ایک تیسری دلیل کے طور پر مصالح مرسلہ کا سہارا بھی لیتے ہیں اور اسی اصطلاح کو سامنے رکھ کر بچوں کی گمشدگی کے اعلان کو جائز قرار دیتے ہیں۔

جائزہ:

اس سلسلے میں عرض یہ ہے کہ آج کل کے جدید مسائل میں بلاشبہہ ''مصالح مرسلہ'' بڑی کار آمد چیز ہے، لیکن صریح نصوص کے مقابلے میں مصالح مرسلہ کا سہارا لینا ایک چور دروازہ کھولنا ہے، کیونکہ مصالح مرسلہ کا سہارا لینے کی جو شرائط فقہاے کرام نے ذکر فرمائی ہیں، ان میں سے ایک اہم ترین شرط یہ بھی ہے کہ کسی نص یا اجماع سے ثابت شدہ شرعی حکم کی مخالفت نہ ہوتی ہو اور وہ مصلحت وضرورت بھی قطعی وکلی یا قطعی واجتماعی قسم کی ہو۔ اگر ایسا نہیں ہے تو پھر اس سے عام نصوص کی تخصیص بھی ناممکن ہے، چہ جائیکہ ان نصوص کو معطل ہی کر دیا جائے!!

پھر مصالح مرسلہ سے فیصلہ کرنا بھی ایک مختلف فیہ مسئلہ ہے۔ جمہور علماے اصول تو نفی کے قائل ہیں، لیکن اس کے اعتبار کی صورت میں کم از کم اس کی شرائط تو پوری ہونی چاہییں۔ چونکہ یہ ایک خالص اصولی مسئلہ ہے، لہٰذا ہم اس کی تفصیل میں نہیں جاتے، بلکہ جنھیں تفصیل مطلوب ہو، وہ کتبِ اصولِ فقہ کی طرف رجوع کرے۔ مثلاً شیخ محمد خضری بک مصری کی کتاب ''أصول الفقه'' (ص: ۳۴۲۔ ۳۴۸) جامعہ امام محمد بن سعود الاسلامیہ الریاض کے مدیر ڈاکٹر عبداللہ ترکی کی کتاب ''أصول مذهب الإمام أحمد'' (ص: ۴۵۹۔ ۴۹۳) امام شوکانی کی کتاب ''إرشاد الفحول إلى تحقيق الحق من علم الأصول'' (ص: ۲۴۱۔ ۲۴۳) امام آمدی کی کتاب ''الإحكام في أصول الإحكام'' اور ''المستصفى'' غزالی وغیرہ کتب اس سلسلے میں بطورِ خاص قابلِ ذکر ہیں۔

یہاں آپ یہ بات پیشِ نظر رکھیں کہ اگر ہر چھوٹی بڑی ضرورت کا اعتبار کرتے ہوئے اور نصوص کی موجودگی میں بھی مصالح مرسلہ کا سہارا لینا شروع کر دیا جائے تو پھر یہ ایک چور دروازہ کھولنے کے مترادف ہے، جس کے ذریعے سے ہر قسم کے دنیوی، تجارتی اور غیر تجارتی سبھی قسم کے اعلانات جائز قرار پائیں گے اور مساجد ایک اکھاڑا اور بے ہنگم شور کا ذریعہ بن جائیں گی، بلکہ ہمارے بعض لوگوں کے ایسے فتویٰ جات کے نتیجے میں آج کل ایسے اعلانات کا مشاہدہ ہمارے ممالک میں کثرت کے ساتھ بلکہ ہر روز ہوتا ہے جو مسجد کے تقدس و احترام کے منافی ہے۔

ایک مناسب حل:

اب آیئے دیکھیں کہ جب مساجد سے ایسے اعلانات ناجائز ہیں تو پھر کیا اس کا کوئی دوسرا مناسب حل بھی ہے یا نہیں؟ تو اس سلسلے میں عرض ہے کہ ایک تو ہم موضوع کے شروع ہی میں ذکر کر آئے ہیں کہ اس کے دوسرے کئی طریقے ہیں، جو جائز و مفید اور موثر بھی ہیں۔ بس ان میں ذرا خرچہ ہوتا ہے، تو بھئی بچے سے قیمتی کیا چیز ہوسکتی ہے اور چلیے اگر اسے کچھ لوگوں کے لیے ناقابلِ عمل ہی سمجھا جائے تو پھر اس مسئلے کا ایک دوسرا اور مناسب حل یہ بھی ہے کہ اہلِ گاؤں یا شہر کے اہلِ محلّہ کے باہمی تعاون سے مسجد کے ساتھ لیکن مسجد سے باہر اس کا بندوبست کریں۔ بالکل اسی طرح جیسے نمازیوں کے لیے طہارت خانے اور ٹوٹیاں وغیرہ کا انتظام مسجد کے لوازمات سمجھ کر کیا جاتا ہے، اسی طرح ان اعلانات کے لیے بھی مسجد سے باہر انتظام کر دیا جائے، کیونکہ نبیِ اکرم ﷺ کے ارشادات کا تقاضا یہی ہے کہ انھیں ان کے اصل حال پر رکھتے ہوئے اپنایا جائے۔

کوئی ایسا مستقل انتظام کر دینے سے یہ تقاضا بھی پورا ہوجائے گا، بقاے نفس اور احترامِ آدمیت کے جذبے پر بھی عمل ہوجائے گا اور مصالح مرسلہ کی شرائط کو توڑ کر انھیں ناجائز طور پر استعمال کرنے کی نوبت آئے گی نہ بلا ضرورت "اَلضَّرُوْرَاتُ تَبِیْحُ الْمَحْذُوْرَاتِ" کا سہارا لینے کی ضرورت پڑے گی۔

ہاں اگر باہر سے کوئی گمشدہ چیز ملے تو اس کے متعلق نمازیوں کو اطلاع دینے میں ان شاء اللہ مؤاخذہ نہ ہوگا، کیونکہ یہ کسی گمشدہ چیز کی تلاش کا اعلان نہیں ہے اور ان ممانعت والی احادیث کی زد میں بھی نہیں آتا، اگرچہ بہتر اور مناسب تو اس کے لیے بھی یہی ہے کہ اس سے بھی بچنے کی کوشش کی

جائے، جیسا کہ حضرت عمرِ فاروق رضی اللہ عنہ کے متعلق بعض آ ثار سے پتا چلتا ہے کہ انھوں نے گمشدہ چیز لانے والے کو مسجد کے دروازے پر اعلان کرنے کا حکم فرمایا تھا، جیسا کہ المغنی لابن قدامہ (۵/ ۶۹۶) میں مذکور ہے۔[1]

مساجد میں خرید وفروخت:

مساجد میں گمشدگی کے اعلانات کی ممانعت کے سلسلے میں بعض احادیث کے ضمن میں یہ بات گزری ہے کہ مساجد میں خرید وفروخت یعنی کسی چیز کا سودا کرنا جائز نہیں، بلکہ ایسا کرنے والے کے لیے نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بد دعا فرمائی ہے، چنانچہ سنن ابو داود، ترمذی، ابن ماجہ، مسند احمد اور شرح السنہ میں حضرت ابن عَمرو رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

«نُهِيَ عَنِ الشِّرَاءِ وَالْبَيْعِ فِي الْمَسْجِدِ، وَأَنْ يُّنْشَدَ فِيهِ ضَالَّةٌ، وَأَنْ يُّنْشَدَ فِيهِ شِعْرٌ، وَنُهِيَ عَنِ التَّحَلُّقِ قَبْلَ الصَّلَاةِ يَوْمَ الْجُمُعَةِ»[2]

''نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مسجد میں خرید وفروخت کرنے سے منع فرمایا اور اس بات سے منع فرمایا کہ مسجد میں گمشدہ اشیا کا اعلان کیا جائے اور اس سے بھی منع فرمایا کہ مسجد میں فضول شعر گوئی کی جائے اور جمعہ کے دن نماز سے قبل مسجد میں حلقے بنانے سے بھی منع فرمایا۔''

ایسے ہی سنن ترمذی صحیح ابن خزیمہ و ابن حبان، مستدرک حاکم، سنن بیہقی، دارمی، اور المنتقیٰ ابن الجارود میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

«إِذَا رَأَيْتُمْ مَنْ يَّبِيعُ أَوْ يَبْتَاعُ فِي الْمَسْجِدِ فَقُوْلُوْا: لَا أَرْبَحَ اللّٰهُ تِجَارَتَكَ، وَإِذَا رَأَيْتُمْ مَنْ يُنْشِدُ ضَالَّةً فَقُوْلُوْا: لَا رَدَّهَا اللّٰهُ عَلَيْكَ»[3]

''جب تم کسی شخص کو مسجد میں کچھ خریدتے یا بیچتے دیکھو تو اسے کہو: اللہ تمھاری تجارت کو سود

---

[1] اس موضوع کے لیے ہم نے دیگر مراجع اور مصادر کے علاوہ سب سے زیادہ استفادہ اس فتوے سے کیا ہے، جو دار الافتاء جامعہ سلفیہ فیصل آباد سے صادر ہوا اور ہفت روزہ ''اہلحدیث'' لاہور میں نشر ہوا۔ [قمر]

[2] تحفة الأحوذي (١/ ١٢٦)

[3] صحيح سنن الترمذي، رقم الحديث (١٠٦٦) صحيح ابن خزيمة (١٣٠٢، ١٣٠٥) المستدرك للحاكم (٢/ ٥٦) سنن البيهقي (٢/ ٤٤٧) سنن دارمي (١/ ٣٢٦) ابن السني (ص: ١٥٣) منتقىٰ ابن الجارود (ص: ٥٦٢) اس کی مفصل تخریج کے لیے ملاحظہ ہو: الإحسان ترتيب صحيح ابن حبان (٤/ ٥٢٨ تا ٥٣٠) رقم الحديث (١٦٥٠، ١٦٥١)

مند اور نفع بخش نہ بنائے اور جب کسی کو گمشدگی کا اعلان کرتے دیکھو تو اسے کہو کہ تمھاری چیز اللہ تمھیں واپس نہ لوٹائے۔''

ایسی ہی دیگر احادیث کے پیشِ نظر مسجد میں کسی چیز کے خریدنے یا بیچنے کو ممنوع قرار دیا گیا ہے۔ امام مازری سے نقل کرتے ہوئے حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے فتح الباری (۱/ ۵۵۰) میں لکھا ہے کہ مسجد میں خرید وفروخت کے جواز میں تو اختلاف ہے، البتہ اگر کوئی عقدِ بیع وشرا ہو جائے تو اس کے صحیح ہونے پر سب کا اتفاق ہے۔ ظاہر ہے کہ خرید وفروخت خالص کاروبارِ دنیا ہے، جو مساجد کے اغراض و مقاصد سے کوئی تعلق نہیں رکھتا، اس لیے مسجد میں بیٹھ کر کسی قسم کا سودا نہیں کرنا چاہیے اور غالباً ایسا نہیں ہوتا، لہٰذا ہم اس موضوع کو طول نہیں دینا چاہتے۔[1]

مساجد میں شعر گوئی:

انھی دونوں حدیثوں میں سے پہلی حدیث میں دوسری بات یہ مذکور ہے کہ مسجد میں شعر گوئی سے نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا ہے: ﴿وَأَنْ يُّنْشَدَ فِيْهِ شِعْرٌ﴾

''نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے بھی منع فرمایا ہے کہ مسجد میں فضول شعر گوئی کی جائے۔''

شارح بخاری لکھتے ہیں کہ اس موضوع کی متعدد احادیث ہیں، لیکن ان سب کی اسانید پر کلام کیا گیا ہے، البتہ یہ حدیث جو ابھی ہم نے ذکر کی ہے، اس کی سند کو بعض محدّثین نے حسن قرار دیا ہے، اس کی سند ابن عمرو رضی اللہ عنہ تک تو صحیح ہے، لہٰذا بقول حافظ ابن حجر رحمہ اللہ جو لوگ ابن عَمرو کے نسخے کو صحیح قرار دیتے ہیں، ان کے نزدیک یہ حدیث صحیح ہے۔

ممانعت والی احادیث کے علاوہ صحیح بخاری ومسلم، سنن ابو داود، ترمذی، نسائی، مسند حمیدی، صحیح ابن حبان و ابن خزیمہ، مصنف عبدالرزاق، سنن بیہقی، شرح السنۃ بغوی، طحاوی، مستدرک حاکم اور دیگر کتبِ سنن میں ایک واقعہ معروف ہے کہ حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ جو شاعر و مداحِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے لقب سے معروف ہیں، انھیں نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم فرمایا تھا کہ کفار ومشرکین کی طرف سے ہماری ہجو یا مذمت میں کہے گئے اشعار کا جواب دیں اور فرمایا تھا:

﴿يَا حَسَّانُ أَجِبْ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم﴾

---

[1] تفصیل کے لیے دیکھیں: إعلام المساجد للزركشي (ص: ٣٢٤۔ ٣٢٥) شرح السنة للبغوي (٢/ ٢٧٢۔ ٢٧٦)

''اے حسان! اللہ کے رسول ﷺ کے دفاع میں ان کفار کی ہجو کا جواب دو۔''

پھر اسی پر بس نہیں، بلکہ حضرت حسّان رضی اللہ عنہ کے لیے دعا کرتے ہوئے فرمایا:

﴿اَللّٰھُمَّ أَیِّدْهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ﴾[1]

''اے اللہ! ان کی حضرت جبرائیل علیہ السلام کے ذریعے سے مدد فرما۔''

بعض طُرق میں یہ تفصیل بھی موجود ہے کہ حضرت عمرِ فاروق رضی اللہ عنہ نے حضرت حسّان رضی اللہ عنہ کو مسجد میں شعر کہتے سنا تو تعجب کے انداز سے فرمایا کہ تم مسجد میں شعر گوئی کر رہے ہو تو انھوں نے جواباً فرمایا تھا:

''كُنْتُ أُنْشِدُ فِيْهِ، وَفِيْهِ مَنْ هُوَ خَيْرٌ مِّنْكَ''[2]

''میں اس وقت بھی اس مسجد میں شعر کہا کرتا تھا، جب اس میں آپ سے بدرجہا بہتر شخصیت (نبیِ اکرم ﷺ) موجود تھی۔''

پھر ساتھ ہی حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی طرف متوجہ ہوئے اور انھیں قسم دے کر پوچھا کہ تم نے نبیِ اکرم ﷺ کو یہ کہتے ہوئے نہیں سنا کہ اے حسان! اللہ کے رسول ﷺ کی طرف سے ان کفار کو جواب دے اور دعا فرمائی کہ اے اللہ! حسان کی حضرت جبریل علیہ السلام کے ذریعے سے مدد فرما؟ تو حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے ہاں کہہ کر ان کی تصدیق کی۔

"باب الشعر في المسجد" میں امام بخاری رحمہ اللہ جو متن لائے ہیں، اس سے امام ابن بطال کے مطابق یہ تو پتا نہیں چلتا کہ حضرت حسان رضی اللہ عنہ کی شعر گوئی مسجدِ نبوی ﷺ میں اور رسول اللہ ﷺ کی موجودگی میں تھی، لیکن صحیح بخاری ہی کے ایک دوسرے مقام "كتاب بدء الخلق: باب ذكر الملائكة" میں وارد حدیث کے متن میں ہے کہ نبیِ اکرم ﷺ نے حضرت حسان رضی اللہ عنہ کو فرمایا تھا:

﴿أَجِبْ عَنِّي﴾[3] ''میری طرف سے جواب دو۔''

---

[1] صحيح البخاري مع الفتح (ص: ٤٥٣، رقم الحديث: ٣٢١٢، ٦١٥٢) مختصر صحيح مسلم (١٧١٣) شرح السنة (٢/ ٣٧٤) مفصل تخریج کے لیے ملاحظہ فرمائیں: الإحسان ترتيب صحيح ابن حبان (٤/ ٥٣٢ تا ٥٣٤) رقم الحديث (١٦٥٣)

[2] صحيح البخاري مع الفتح (٦/ ٣٠٤) صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (١٤٩١) صحيح مسلم مع شرح النووي (٨/ ١٢/ ٤٥)

[3] صحيح البخاري مع الفتح (٦/ ٣٠٤) صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (١٤٩١) صحيح مسلم مع شرح النووي (٨/ ١٢/ ٤٥)

ارشادِ نبوی ﷺ کے ان دو لفظوں سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعہ مسجدِ نبوی ﷺ میں نبیِ اکرم ﷺ کی موجودگی میں پیش آیا تھا، بلکہ سنن ابو داود، ترمذی شریف، شرح السنۃ اور مسند احمد میں ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی ایک حدیث میں تو بڑی واضح صراحت کے ساتھ موجود ہے:

«كَانَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ يَنْصِبُ لِحَسَّانَ مِنْبَرًا فِي الْمَسْجِدِ فَيَقُومُ عَلَيْهِ يَهْجُو الْكُفَّارَ»[1]

''نبیِ اکرم ﷺ حضرت حسان رضی اللہ عنہ کے لیے مسجدِ نبوی ﷺ میں منبر رکھوایا کرتے تھے، جس پر چڑھ کر وہ کفار کی ہجو میں شعر کہا کرتے تھے۔''

اب ایک طرف ممانعت کی احادیث ہیں تو دوسری طرف جواز کی، ان ہر دو طرح کی احادیث سے جو اختلاف سا بنتا نظر آتا ہے، اس سے پریشان مت ہوں۔ محدّثین کرام اور اہلِ علم نے ان دونوں طرح کی احادیث کے مابین مطابقت و موافقت پیدا کر کے اس اختلاف کو رفع کر دیا ہے۔

مطابقت و موافقت:

مساجد کی شعر گوئی سے متعلق دو طرح کی احادیث گزری ہیں، جن میں سے بعض میں ہے کہ نبیِ اکرم ﷺ نے مسجد میں شعر گوئی سے منع فرمایا، جبکہ صحیح بخاری و مسلم اور دیگر کتب کی بعض احادیث میں وارد نبیِ اکرم ﷺ کے خود عملِ مبارک سے پتا چلتا ہے کہ یہ ناجائز نہیں ہے، بلکہ آپ ﷺ نے مسجد میں حضرت حسّان بن ثابت انصاری رضی اللہ عنہ سے فرمایا تھا کہ کفار و مشرکین جو میری ہجو میں شعر کہہ رہے ہیں تو تم میرے دفاع کے لیے ان کا جواب دو اور اس غرض کے لیے وہ مسجد میں برسرِ منبر شعر گوئی کیا کرتے تھے۔ ان دو طرح کی احادیث میں جو بظاہر اختلاف نظر آتا ہے، محدّثینِ کرام اور اہلِ علم نے اسے رفع کرنے کے لیے کہا ہے:

1. حضرت حسّان رضی اللہ عنہ کی شعر گوئی عام سی شاعری کی طرح نہیں تھی، جس میں کوئی ایسی ویسی بات ہوتی، بلکہ نبیِ اکرم ﷺ کی طرف سے کفار کو ان کے نبیِ اکرم ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی

[1] صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (١٤٩٣) صحيح سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٢٨٢) المستدرك للحاكم (٣/ ٤٨٧) مسند أبي يعلىٰ (٣/ ١١٢٩) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (١٦٥٧) فتح الباري (١/ ٥٤٨)

گستاخی میں کہے گئے ہجو یہ اشعار کا جواب دینے کا حکم ملا تھا۔

۲ مسجد میں ایسے اشعار پڑھنے کی ممانعت ہے جن کا تعلق عہدِ جاہلیت سے ہو اور ان میں ہمچو ما دیگر سے نیست کا متکبرانہ نظریہ، بلاوجہ کا غلو اور ایسے ہی دیگر جاہلانہ امور کا تذکرہ ہو، باطل ولغو قسم کی گفتگو ہو، گل وبلبل، شراب و شباب اور غازہ ورخسار کا ذکر ہو، گویا جاہلانہ اور عاشقانہ ہر دو طرح کی شاعری ہو تو ایسے اشعار کی ممانعت ہے، لیکن جو اشعار ایسے ہوں کہ حق بات پر مبنی ہوں تو وہ مسجد میں بھی پڑھے جا سکتے ہیں، کیونکہ خبیث لغو اشعار یا بیہودہ گفتگو احترام وتقدسِ مسجد کے منافی ہے، جبکہ اچھے اور مبنی برحق شعر میں یہ بات نہیں پائی جاتی۔[1]

یہاں اچھے بُرے اور حق و ناحق قسم کے اشعار کے مابین امتیاز کی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں، کیونکہ ہر سلیم فطرت مسلمان یہ امتیاز کر سکتا ہے، البتہ یہاں ایک بات بطورِ خاص ذہن نشین کر لیں کہ مساجد میں ایسے اشعار پڑھے تو جا سکتے ہیں، جن میں توحیدِ باری تعالیٰ کو اچھے پیرائے میں پیش کیا گیا ہو، نبیِ اکرم ﷺ کے منصبِ نبوت و رسالت کا بیان ہو، اتباعِ کتاب و سنت، اطاعتِ الٰہی اور اطاعتِ رسول ﷺ کی رغبت دلائی گئی ہو، حسنِ اخلاق کو اختیار کرنے کی تلقین ہو، حقوق اللہ اور حقوق العباد ادا کرنے پر اُبھارا گیا ہو اور اس کے لیے اچھی اور صاف ستھری زبان استعمال کی گئی ہو۔ ایسے اشعار کو حمد کہیں یا نعت، نظم کہیں یا کچھ اور، ان کی گنجایش تو ملتی ہے۔

لیکن اگر کسی شاعر یا نعت گو نے اپنے کلام میں نبیِ اکرم ﷺ کی نعت کے بھیس میں ایسی باتیں کہی ہوں جو آپ ﷺ کے مقام ومرتبے کے منافی بلکہ حقیقت کے بھی خلاف ہوں تو ایسے اشعار سے مساجد کو پاک ومحفوظ رکھنا تو کجا انھیں تو کہیں بھی نہیں پڑھنا چاہیے اور نہ سننا ہی چاہیے۔ یہی معاملہ حمد کا بھی ہے۔ مثلاً کوئی شاعر راہِ صواب سے ہٹ کر یہ سمجھتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نعوذ باللہ ہر جگہ بذاتہٖ موجود ہے اور ہر چیز میں ہے جیسے حلولیہ یا وحدۃ الوجود کے باطل عقیدے والے معتزلہ سے متاثر ہو کر شعر کہے ہوں تو ایسے شاعر کے اشعار کو صرف مسجد سے ہی نہیں، اپنے گھر کی یا دفتر کی لائبریری سے بھی دُور رکھیں اور اپنی مجلسوں میں بھی ایسے لوگوں کی پذیرائی نہیں ہونی چاہیے۔

ایسے ہی ذاتِ باری تعالیٰ یا صفاتِ باری تعالیٰ سے متعلق شرکیہ اشعار بھی ہیں، اسی طرح ہی

[1] فتح الباري (١/ ٥٤٨) تحقيق شرح السنة (٢/ ٣٧٤)

اللہ تعالیٰ کی شان میں گستاخیاں شمار ہونے والے اَشعار بھی ہیں، جنھیں اگرچہ نعت ہی کیوں نہ کہا جاتا ہو، جیسے کوئی کہے: ؎

اللہ کے پلے میں وحدت کے سوا کیا ہے
جو کچھ لینا ہے مانگ لیں گے محمد ﷺ سے

نعت گوئی میں شعرا سے کم علمی یعنی علمِ دین کی کمی کی وجہ سے بہت کوتاہیاں اور لرزشیں ہوئی ہیں، حتیٰ کہ اگر کوئی منصف مزاج آدمی، جس کا عقیدہ بھی اہلِ سنت کے متفقہ عقائد کے مطابق ہو، آج تک لکھے جانے والے اُردو نعتیہ کلام کا ذخیرہ اپنے سامنے رکھ لے اور حق و ناحق یا صحیح و غیر صحیح اشعار الگ الگ کرتا چلا جائے تو بعید نہیں کہ غلط عقائد، مبالغہ آمیزی، نام نہاد عقیدت مگر فی الحقیقۃ جہالت جیسے عوامل کی تاثیر میں لکھے جانے والے ناحق و غیر صحیح اشعار کا پلڑا ہی بھاری نکلے۔

اب آپ ہی بتایئے کہ بھلا ایسے اشعار مساجد میں پڑھے جانے بلکہ ''گائے جانے'' کے قابل کہاں ہیں؟ یہ ''گائے جانے'' کے الفاظ اس لیے کہہ رہے ہیں کہ عوام کا مزاج تو بگڑا ہی تھا، شاعروں نے بھی ''چلو تم اُدھر کو جدھر کی ہوا ہو'' کی رو سے ہوا کا رُخ دیکھ کر فلمی گانے پڑھے یا سنے اور پھر انھی کے ردیف و قافیے یا طرز پر نعتیہ اشعار بھی کہہ دیے، جنھیں پھر ان گانوں کی طرز پر ہی سنایا جاتا ہے۔ اب اگر ایسے اشعار نبیِ اکرم ﷺ کی شان میں مبالغہ و غلو جیسی صفات یا گستاخیوں اور شرکیہ عقائد و نظریات پر بھی مشتمل ہوں تو ایسے اشعار کو مساجد میں پڑھنا تو کجا، کہیں بھی پڑھنا کیسے روا ہوسکتا ہے؟

نبیِ اکرم ﷺ نے مدینہ طیبہ کے پرانے نام کو اس کے معنیٰ و مفہوم کے صحیح نہ ہونے اور اسے ایک طرح سے بھُلا دینے کے لیے یثرب کا نام ''طیبہ'' و ''طابہ'' رکھا اور جو مدینۃ الرسول ﷺ مدینہ طیبہ یا مدینہ منورہ ہے، اسے اس کے پرانے نام سے یاد کرنے کو مکروہ قرار دیا، لیکن آج کا نعت گو اور نعت خواں اَشعار میں پھر بھی یثرب ہی کہنے اور سنانے پر اصرار کرے تو ایسے شخص کے اشعار کو اور اسی طرح کے دوسرے امورِ غیر صحیحہ پر مشتمل اشعار کو مساجد میں پڑھنا روا نہیں ہوسکتا۔ بعینہٖ کلام یا نعتوں میں کون کون سے غیر صحیح امور پائے جاتے ہیں؟ ان میں سے تقریباً تمام بڑے امور کا تذکرہ کسی حد تک ہماری سیرۃ النبی ﷺ سے متعلق کتاب میں آچکا ہے، جو آپ پڑھ چکے ہیں۔[1] لہٰذا ہم یہاں ان

[1] الحمدللہ سیرۃ النبی ﷺ سے متعلقہ یہ کتاب بھی اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے چھپ چکی ہے ہیں اور اس کتاب کا نام ''سیرۃ امام الانبیاء ﷺ'' ہے۔

کی تفصیل میں نہیں جانا چاہتے۔

۳ ان تفصیلات سے قطع نظر مساجد میں شعر گوئی کے جواز و عدمِ جواز میں موافقت پیدا کرنے کے لیے اہلِ علم نے جو تیسری بات کہی ہیں، وہ یہ ہے کہ صحیح قسم کے اشعار کے کبھی کبھی مسجد میں پڑھ لینے میں حرج نہیں، لیکن اگر یہ بکثرت ہو، حتیٰ کہ اہلِ مسجد کو تعلیم و تدریس اور ذکر و تلاوتِ قرآن وغیرہ امور سے روکنے کا باعث بنے تو ایسی شعر گوئی بھی ممنوع ہے۔[1]

مساجد کے خطبا اور واعظین کی ذمے داریاں:

فضول قسم کے شعر گوئی کرنے والے نعت خواں عموماً جاہل اور علمِ دین سے خالی ہوتے ہیں، لہٰذا یہ علما اور مساجد کے خطبا و واعظین کی ذمے داری ہے کہ وہ ایسے لوگوں کا مواد چیک کر لیا کریں، اگر ٹھیک ہو تو فبہا ورنہ روک دیا جائے، لیکن اب اس کا کیا کریں کہ مسئولین ہی صحیح العقیدہ نہیں ہوتے اور جو ہوتے ہیں وہ اپنی ذمے داریاں نہیں نبھاتے، جبکہ اہلِ علم نے اس سلسلے میں ان کی ذمے داری کے امور گن کر بتائے ہیں، مثلاً علامہ محمد جمال الدین قاسمی رحمہ اللہ نے اپنی نفیس کتاب ”إصلاح المساجد من البدع والعوائد“ میں نقل کیا ہے کہ واعظین کی ذمے داریاں چند امور میں منحصر ہیں:

1 عوام کو اللہ تعالیٰ کی معرفت، اس کی صفاتِ عالیہ، اس کے حق میں محال اور جائز امور اور انبیا و رسل علیہم السلام کے مقام و مرتبے سے آگاہ کریں۔

2 دین کے ارکان مثلاً نماز، روزہ، حج اور زکات کی تعلیم دیں اور ان کے آداب و احکام اور ان کے دنیوی و اخروی فوائد بتائیں۔

3 امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ ادا کریں، یعنی بھلائی کی دعوت دیں اور ہر برائی سے باز کریں اور دینی آداب و فضائل پر کاربندی کے ساتھ ساتھ لوگوں کو نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کی پابندی پر اُبھاریں۔

4 وہ عوام الناس کو اچھے اعمال کے اختیار کرنے پر آمادہ کریں اور انھیں یہ سمجھائیں کہ ہر شخص کو اس کے اچھے اور بُرے کاموں کا پورا پورا بدلہ ملے گا۔

5 یہ کہ جائز شرعی امور میں تعاون کرنے کی لوگوں کو ترغیب دلائیں، اولاد کی اچھی تربیت پر توجہ

---

[1] فتح الباري (١/ ٥٤٩) تحقيق شرح السنة (٦/ ٣٧٤)

دلائیں، ہر کام کو صحیح طور پر سرانجام دینے پر زور دیں، امانت کے تحفظ کی ضرورت واضح کریں اور آپس میں اخوت و بھائی چارگی کا احساس بیدار کریں، کیونکہ یہی قوموں کی زندگی کا سرچشمہ اور دنیا و آخرت میں ان کی بہبود کا باعث ہے۔

6 دلوں کو فاسد اوہام و خیالات سے پاک کریں، کیونکہ انھی کی وجہ سے باطل عقیدہ جنم لیتا ہے، اس طرح لوگوں میں اللہ تعالیٰ کے سامنے جھکنے اور عاجزی کرنے کا جذبہ پیدا ہوگا۔

آگے چل کر علامہ محمد جمال الدین قاسمی رحمہ اللہ نقل کرتے ہیں:

''اللہ جانتا ہے کہ واعظین نے اپنے ان فرائض و واجبات یا ذمے داریوں کو پورا نہیں کیا، بلکہ وہ اوہام و خرافات اور باطل و موضوع احادیث و اقوال کا سہارا لے کر اپنی محفلوں میں رنگ بھرتے، مگر درحقیقت اپنے وعظوں میں زہر گھولتے ہیں، اپنی نفسانی خواہشات کے مطابق نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب غلط حدیثوں اور حقائق سے بعید باتوں کو منسوب کرتے ہیں اور ترغیب و ترہیب میں تشدّد و مبالغہ اور سہولت سے حسبِ منشا کام لیتے ہیں۔''

پھر اس قسم کے واعظین سے مخاطب ہو کر لکھتے ہیں:

''اے واعظو! نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر جھوٹ باندھنے سے تمھیں انسیت سی ہوگئی ہے اور تم اسی کو حقائق کہتے ہو، حالانکہ یہ کھلا ہوا اور واضح گناہ ہے، جس کے حرام ہونے پر تمام علمائے اسلام کا اتفاق ہے۔ خود نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے (جو بہتر (۷۲) صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم سے کوئی بیس کتب میں مروی ہے) جسے صحیح و متواتر حدیث قرار دیا گیا ہے:

﴿مَنْ كَذَبَ عَلَيَّ مُتَعَمِّدًا فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ﴾ [1]

''جس نے جان بوجھ کر مجھ پر جھوٹ باندھا تو وہ اپنا ٹھکانا جہنم میں بنا لے۔''

امام نووی رحمہ اللہ نے اس سلسلے میں لکھا ہے:

''من گھڑت حدیث کا علم یا ظن ہوجانے کے بعد اس کی روایت حرام ہے۔ (سوائے اس کا ضعف واضح کرنے والے کے لیے) اور جو جانتے ہوئے ایسا کرے گا، وہ اسی

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٠٧، ١١٠) مختصر صحيح مسلم (١٨٦١، ١٨٦٢) صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (٣١٠٢) صحيح سنن الترمذي، رقم الحديث (٢١٤١، ١٢٥٠) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٣٠، ٣٣) صحيح الجامع، رقم الحديث (٦٥١٩)

حدیث میں مذکور وعید کا مستحق ہوگا، اس سلسلے میں یہ بھی کوئی فرق نہیں کہ اس جھوٹ کا تعلق احکام سے ہے یا ترغیب وترہیب اور مواعظ سے، کیونکہ ہر مسئلے میں نبیِ اکرم ﷺ کی طرف جھوٹی حدیث منسوب کرنا حرام ہے۔ تمام دانشمندوں کا اتفاق ہے کہ کسی بھی شخص کی طرف جھوٹ بات کا انتساب حرام ہے تو پھر نبیِ اکرم ﷺ کی طرف کسی بات کو غلط طور پر منسوب کرنا کتنا بڑا گناہ ہوگا؟''[1]

مساجد کے قصہ خواں:

حقیقت تو یہ ہے کہ وہ لوگ جو مساجد میں برسرِ منبر موضوع ومن گھڑت اور باطل روایات و حکایات بیان کرنے سے نہیں چوکتے اور سمجھتے ہیں کہ انھی کہانیوں سے تو خطبے یا تقریر میں رنگ آتا ہے اور پھر وہ صحیح وغیر صحیح میں تمیز کیے بغیر اپنی لچھے دار تقریروں میں یہ قصے کہانیاں بیان کرتے رہتے ہیں۔ انھیں خطبا و واعظین کے بجائے مساجد کے قصہ خوان کہنا چاہیے، جنھیں امام غزالی رحمہ اللہ نے اپنی کتاب ''إحیاء علوم الدین'' میں یہی نام دیا ہے۔ انھوں نے مساجد کے منکرات یعنی مساجد میں مروج غلط امور کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

''مساجد کے منکرات میں سے قصہ خواں اور واعظین کا وہ کلام بھی ہے، جو بدعت پر مشتمل ہوتا ہے۔ اگر کوئی قصہ خواں جھوٹے واقعات بیان کرے تو وہ فاسق ہے۔ اسے ٹوکنا ضروری ہے اور اگر کوئی واعظ بدعتی ہو تو اس کے ساتھ بھی یہی معاملہ کرنا چاہیے۔''[2]

اس ساری تفصیل سے معلوم ہوا کہ مساجد میں صرف غلط یا فضول قسم کی شعر گوئی ہی ممنوع نہیں بلکہ ایسی وعظ گوئی یا قصہ خوانی بھی ممنوع ہے، جس کی بنیاد ہی ضعیف وموضوع یا کمزور اسناد والی اور من گھڑت وجعلی روایات پر رکھی گئی ہو، ہاں اگر لاعلمی کی وجہ سے ایسا کچھ ہوجائے تو الگ بات ہے، ویسے مسجد میں کچھ کہنے سے پہلے اپنے آپ کو اس کا اہل بنانا چاہیے اور جو کچھ کہنے کا خیال ہو، اس کی تحقیق کر لینی چاہیے، تاکہ اس وعید سے بچ سکیں۔

غرض کہ ان تمام امور سے مساجد جیسے مقدس مقامات کو محفوظ رکھنا چاہیے اور متولیانِ مساجد کا

[1] إصلاح المساجد للقاسمي، اردو ترجمہ از ڈاکٹر مقتدیٰ حسن ازہری (ص: ۱۵۰ تا ۱۵۲، الدار السلفیة بمبئی)
[2] إصلاح المساجد اردو (ص: ۱۴۹، ۱۵۰)

فرض بنتا ہے کہ اگر انھیں غیر عالم ہونے کی وجہ سے خود توفیق نہ ہو تو کم از کم اہلِ علم کے تعاون سے اپنی مساجد کو ایسے امور سے بچانے کا اہتمام کریں، کیونکہ مساجد کے تقدس و احترام کا یہی تقاضا ہے۔

دنیوی بات چیت:

اب ہم یہ چاہتے ہیں کہ ایک اور اہم بات کی طرف بھی اشارہ کر دیں، جو پاک و ہند کی اکثر مساجد میں بہت مروج ہے اور وہ ہے اپنے دنیوی امور کے بارے میں باتیں کرنے کے لیے مسجد میں حلقہ بنا کر بیٹھ جانا۔ عموماً ہوتا یوں ہے کہ گاؤں یا محلے کی مسجد میں نماز کے بعد بعض لوگ اپنے ساتھ والے کے ساتھ سر جوڑ کر باتیں کرنے لگتے ہیں، پھر کوئی تیسرا آ جاتا ہے، حتیٰ کہ وہ ایک حلقے کی شکل بنا لیتے ہیں، پھر ہر کوئی بھانت بھانت کی بولی بولتا جاتا ہے، سارے دن کا کیا کرایا اور کھایا پیا سامنے رکھ دیتے ہیں۔ گائے، بھینس اور بھیڑ بکریوں کی قیمتوں میں اتار چڑھاؤ، گندم چاول کے مارکیٹ ریٹ اور دنیا بھر کی اول فول خبریں اُگلتے چلے جاتے ہیں اور ان میں سے جو جتنی زیادہ باتیں کرے اور بڑھ چڑھ کر بولے، وہ اتنا ہی زیادہ سیانا اور جو اخباری ونشریاتی اداروں کا نام لے کر جھوٹی سچی خبریں سنائے، وہ زیادہ پڑھا لکھا سمجھا جاتا ہے اور اسے بہ نظرِ اعجاب دیکھا جاتا ہے، حالانکہ یہ تمام امور تقدس و احترامِ مسجد کے منافی اور آدابِ مسجد کے خلاف ہیں، کیونکہ دنیوی بات چیت کے لیے ایسے حلقے بنانے والوں کے بارے میں نبیِ اکرم ﷺ نے پیشین گوئی فرمائی اور ان کی مذمت کرتے ہوئے ان کے پاس نہ بیٹھنے کا حکم فرمایا ہے، چنانچہ صحیح ابن حبان اور معجم طبرانی میں حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبیِ اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

«سَيَكُوْنُ فِيْ آخِرِ الزَّمَانِ قَوْمٌ يَّجْلِسُوْنَ فِي الْمَسْجِدِ حِلَقًا حِلَقًا، أَمَامُهُمُ الدُّنْيَا، فَلَا تُجَالِسُوْهُمْ، فَإِنَّهُ لَيْسَ لِلّٰهِ فِيْهِمْ حَاجَةٌ»[1]

''آخری زمانے میں ایک قوم ایسے لوگوں کی ہوگی، جو مساجد میں حلقے بنا کر بیٹھے گی اور دنیا داری کی باتیں کرے گی۔ تم ان لوگوں کے ساتھ مت بیٹھو، اللہ تعالیٰ کو ایسے لوگوں کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔''

یہ معجم طبرانی کے الفاظ ہیں، جبکہ صحیح ابن حبان کے الفاظ ہیں:

---

[1] السلسلة الصحيحة (٣/ ١٥١، ١٥٢)

«سَيَكُونُ فِي آخِرِ الزَّمَانِ قَوْمٌ يَكُونُ حَدِيثُهُمْ فِي مَسَاجِدِهِمْ، لَيْسَ لِلّٰهِ فِيهِمْ حَاجَةٌ»[1]

''آخری زمانے میں ایک قوم ایسے لوگوں پر مشتمل ہوگی، جن کی سبھی باتیں مساجد میں ہوں گی، اللہ کو ایسے لوگوں سے کوئی سروکار نہیں۔''

امام حاکم رحمہ اللہ نے مستدرک میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے:

«يَأْتِي عَلَى النَّاسِ زَمَانٌ يَحْلِقُونَ فِي مَسَاجِدِهِمْ، وَلَيْسَ هَمُّهُمْ إِلَّا الدُّنْيَا وَلَيْسَ لِلّٰهِ فِيهِ حَاجَةٌ فَلَا تُجَالِسُوهُمْ»[2]

''لوگوں پر ایک ایسا وقت بھی آئے گا کہ وہ مسجدوں میں حلقے بنا کر بیٹھیں گے اور ان کا ہدف دنیوی بات چیت کے سوا کچھ نہ ہوگا۔ ایسے لوگوں کی اللہ کو کوئی حاجت نہیں ہے، تم ان لوگوں کے پاس مت بیٹھو۔''

انہی احادیث کے پیشِ نظر اہلِ علم نے مسجدوں میں دنیوی باتیں کرنے اور اس کے لیے حلقے بنانے کو ممنوع لکھا ہے، چنانچہ امام ابن الحاج نے لکھا ہے کہ دنیوی معاملات اور لوگوں کو روز مرہ زندگی میں پیش آنے والے واقعات کے بارے میں باتیں کرنے کے لیے لوگ اگر مسجد میں اجتماعی صورت میں بیٹھیں تو انھیں اس سے روکنا چاہیے، انھوں نے اس موضوع کے متعلق مختلف آثار نقل کرنے کے بعد لکھا ہے:

''مسجد میں صرف نماز، تلاوت، ذکر وفکر یا تعلیم و تدریس کے لیے بیٹھا جا سکتا ہے اور ان کاموں میں بھی آواز اس حد تک بلند نہیں ہونی چاہیے کہ دوسرے نمازیوں اور ذکرِ الٰہی میں مشغول لوگوں کے لیے باعثِ خلل ہو۔''[3]

تنبیہ:

یہاں ہم یہ بھی ذکر کر دیں کہ ابن الحاج کی یہ بات اپنی جگہ بجا ہے کہ دوسرے لوگوں کے

---

[1] موارد الظمآن في زوائد ابن حبان (ص: ٩٩)

[2] إصلاح المساجد (ص: ١٤٥) اُردو، وقال الألباني في تحقيقه: حديث حسن.

[3] صحيح الترغيب (١/ ٣١) صحيح الجامع، رقم الحديث (٤٢١٤)

لیے خلل کا باعث نہیں بننا چاہیے، جبکہ دوسرے لوگوں کے لیے بھی ضروری ہے کہ اگر کسی کی فرض نماز یا اس کے متعلقات یعنی سننِ رواتب یا مؤکدہ سنتیں باقی ہیں تو وہ انھیں ادا کرے، اسی طرح اگر تعلیم و تدریس ایسی زبان میں ہے، جسے وہ نہیں جانتا اور وہ کما حقہٗ فائدہ نہیں اُٹھا سکتا تو بھی اسے اختیار ہے کہ تلاوت یا ذکر و فکر اور عام نفلی نماز میں مشغول رہے۔

فضیلتِ علم و طالب علم:

مذکورہ صورت میں افضل یہی ہے کہ وہ تعلیم و تدریس کے حلقے میں جا بیٹھے، کیونکہ تلاوت و نوافل کی عبادت سے تعلیم و تدریسِ علم کی عبادت کو زیادہ افضل بتایا گیا ہے، چنانچہ معجم طبرانی اوسط اور مسند بزار میں حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ سے مروی ارشادِ نبوی ﷺ ہے:

﴿فَضْلُ الْعِلْمِ خَيْرٌ مِّنْ فَضْلِ الْعِبَادَةِ، وَخَيْرُ دِيْنِكُمُ الْوَرَعُ﴾[1]

''علم کی فضیلت، عبادت کی فضیلت سے بہتر ہے اور تمھارا بہتر دین تو ورع و تقویٰ ہے۔''

ایسے ہی صحیح مسلم، سنن ابو داود، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ، صحیح ابن حبان اور مستدرک حاکم میں ملتے جلتے مگر مختلف الفاظ سے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبیِ اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

﴿مَنْ سَلَكَ طَرِيْقًا يَّلْتَمِسُ فِيْهِ عِلْمًا، سَهَّلَ اللّٰهُ لَهٗ بِهٖ طَرِيْقًا إِلَى الْجَنَّةِ، وَمَا اجْتَمَعَ قَوْمٌ فِيْ بَيْتٍ مِنْ بُيُوْتِ اللّٰهِ يَتْلُوْنَ كِتَابَ اللّٰهِ وَيَتَدَارَسُوْنَهٗ بَيْنَهُمْ إِلَّا حَفَّتْهُمُ الْمَلَائِكَةُ، وَنَزَلَتْ عَلَيْهِمِ السَّكِيْنَةُ، وَغَشِيَتْهُمُ الرَّحْمَةُ وَذَكَرَهُمُ اللّٰهُ فِيْمَنْ عِنْدَهٗ﴾[2]

''جو شخص حصولِ علم کے لیے اس راہ پر چل نکلے، اللہ تعالیٰ اس کے لیے جنت کی راہ آسان کر دے گا۔ کوئی قوم جب اللہ کے کسی گھر میں (مسجد و مدرسہ وغیرہ) میں بیٹھے اور کتاب اللہ کی تلاوت و تدریس میں مشغول ہو جائے تو اللہ کے فرشتے انھیں گھیر لیتے ہیں، ان پر اللہ کی طرف سے سکینت نازل ہوتی ہے، رحمتِ الٰہی انھیں ڈھانپ لیتی ہے اور

[1] صحيح الترغيب (١/ ٣١) صحيح الجامع، رقم الحديث (٤٢١٤)

[2] صحيح مسلم مع شرح النووي (٩/ ١٧/ ٢١) صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٠٩٧) صحيح سنن الترمذي، رقم الحديث (٢١٣٤) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٢٢٥) موارد الظمآن (٧٨) صحيح الترغيب (١/ ٣١، ٣٢)

اللہ ان کا ذکر اپنے مقربین فرشتوں میں کرتا ہے۔‘‘

حصولِ علم کے لیے درس و تدریس کے حلقوں میں جا کر بیٹھنے والوں کی فضیلت کا اندازہ تو اس حدیث سے بھی کیا جا سکتا ہے جو سنن ابو داود، ترمذی، ابن ماجہ، صحیح ابن حبان اور سنن بیہقی میں حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

«مَنْ سَلَكَ طَرِيقًا يَّلْتَمِسُ فِيهِ عِلْمًا سَهَّلَ اللّٰهُ لَهٗ طَرِيقًا إِلَى الْجَنَّةِ، وَإِنَّ الْمَلَائِكَةَ لَتَضَعُ أَجْنِحَتَهَا لِطَالِبِ الْعِلْمِ رِضًا بِمَا يَصْنَعُ»[1]

’’جو شخص حصولِ علم کی راہ اختیار کرتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کے لیے جنت کی راہ آسان فرما دیتا ہے اور اس طالبِ علم کے ساتھ اپنی رضا مندی کا اظہار کرنے کے لیے فرشتے اپنے پر ٹھہرا لیتے ہیں۔‘‘

ابن ماجہ، صحیح ابن حبان، معجم طبرانی، مستدرک حاکم اور مسند احمد میں حضرت صفوان بن عسال مرادی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا، جبکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی سرخ چادر پر ٹیک لگائے مسجد میں تشریف فرما تھے تو میں نے عرض کی کہ میں حصولِ علم کے لیے حاضر ہوا ہوں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«مَرْحَبًا بِطَالِبِ الْعِلْمِ، إِنَّ طَالِبَ الْعِلْمِ تَحُفُّهُ الْمَلَائِكَةُ بِأَجْنِحَتِهَا، ثُمَّ يَرْكَبُ بَعْضُهُمْ بَعْضاً حَتّٰى يَبْلُغُوا السَّمَاءَ الدُّنْيَا مِنْ مَحَبَّتِهِمْ لِمَا يَطْلُبُ»[2]

’’طالب علم کو خوش آمدید! بے شک طالب علم کو فرشتے اپنے پَروں میں لپیٹ لیتے ہیں، پھر ایک دوسرے پر سوار ہو کر آسمانِ دنیا تک چڑھ جاتے ہیں اور یہ طالب علم سے ان کا اظہارِ محبت ہوتا ہے۔‘‘

ایسی ہی احادیث میں سے ایک سنن ترمذی، ابن ماجہ، صحیح ابن حبان اور مستدرک میں بھی ہے، جس میں زرّ بن حبیش رحمہ اللہ بیان فرماتے ہیں:

’’میں حضرت صفوان بن عسّال رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوا تو انھوں نے پوچھا: کیا لینے

[1] صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٠٩٦) صحيح سنن الترمذي، رقم الحديث (٢١٥٩) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٢٢٣) موارد الظمآن (٨٠) صحيح الترغيب (١/ ٣٣)

[2] سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٢٢٦) الموارد (٧٩) صحيح الترغيب (١/ ٣٤)

آئے ہو؟ میں نے عرض کی کہ میں حصولِ علم کی کوشش میں سرگرداں ہوں تو انھوں نے فرمایا کہ میں نے نبیِ اکرم ﷺ کو یہ فرماتے سنا ہے:

«مَا مِنْ خَارِجٍ خَرَجَ مِنْ بَيْتِهٖ فِيْ طَلَبِ الْعِلْمِ، إِلَّا وَضَعَتْ لَهُ الْمَلَائِكَةُ أَجْنِحَتَهَا رِضًا بِمَا يَصْنَعُ»[1]

''کوئی بھی شخص جب حصولِ علم کی غرض لے کر اپنے گھر سے نکلتا ہے تو اس کے اس فعل پر اپنی رضا مندی کا اظہار کرنے کے لیے فرشتے اپنے پر بچھا لیتے ہیں۔''

معجم طبرانی کبیر اور مستدرک حاکم میں حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبیِ اکرم ﷺ نے فرمایا:

«مَنْ غَدَا إِلَى الْمَسْجِدِ لَا يُرِيْدُ إِلَّا أَنْ يَّتَعَلَّمَ خَيْراً أَوْ يُعَلِّمَهٗ، كَانَ لَهٗ كَأَجْرِ حَاجٍّ، تَامًّا حَجَّتُهٗ»[2]

''جو شخص محض اس غرض سے مسجد کی طرف گیا کہ وہ علم سیکھے یا سکھلائے تو اسے پورے ایک حج کا ثواب ملے گا۔''

سنن ابن ماجہ و بیہقی اور مستدرک حاکم میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ارشادِ نبوی ﷺ ہے:

«مَنْ جَاءَ مَسْجِدِيْ هٰذَا لَمْ يَأْتِهٖ إِلَّا لِخَيْرٍ يَتَعَلَّمُهٗ أَوْ يُعَلِّمُهٗ، فَهُوَ بِمَنْزِلَةِ الْمُجَاهِدِيْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ، وَمَنْ جَآءَ لِغَيْرِ ذٰلِكَ فَهُوَ بِمَنْزِلَةِ الرَّجُلِ يَنْظُرُ إِلٰى مَتَاعِ غَيْرِهٖ»[3]

''جو شخص میری مسجد میں محض اس غرض سے آئے کہ وہ کوئی بھلائی (علم) سیکھے گا یا سکھلائے گا، تو وہ اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والوں جیسا شمار ہوگا اور جو کسی دوسری غرض سے آئے گا وہ ایسے ہی ہوگا، جیسے کوئی کسی دوسرے کی چیز کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھتا ہے۔''

درسِ قرآن و حدیث سننے والوں کے مقام و مرتبے کا اندازہ اس حدیث سے بھی لگایا جا سکتا ہے، جو کم و بیش چوبیس (۲۴) صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم سے اور کم و بیش ایک سو ستاون (۱۵۷) طُرق سے،

---

[1] سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٢٢٦) موارد الظمآن (٧٩) صحيح الترغيب (١/ ٣٨) صحيح الجامع، رقم الحديث (٥٧٠٢)

[2] صحيح الترغيب (١/ ٣٨)

[3] سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٢٢٧) صحيح الجامع، رقم الحديث (٦١٨٤) صحيح الترغيب (١/ ٣٩)

سینتیس (۳۷) ائمہ نے صحیحین کے سوا دیگر کتبِ حدیث و سنت میں سے پینتالیس (۴۵) سے زیادہ کتب میں روایت کی ہے، جس کی تخریج و تحقیق اور تعلیق و تشریح پر بعض اہلِ علم نے مستقل کتابیں لکھی ہیں۔ حال ہی میں مدینہ یونیورسٹی کے ایک پروفیسر عبدالمحسن حمد العباد نے روایت و درایت کے اعتبار سے اس حدیث کے مطالعہ پر مشتمل ''دراسة حديث « نضر الله امرأ سمع مقالتي » رواياتاً و درايتاً'' لکھی ہے جو دو سو سے زیادہ صفحات پر مشتمل ہے۔

اس حدیث میں ارشادِ نبوی ﷺ ہے:

« نَضَّرَ اللّٰهُ امْرَأً سَمِعَ مَقَالَتِيْ فَحَفِظَهَا وَوَعَاهَا ثُمَّ ذَهَبَ بِهَا إِلٰى مَنْ لَمْ يَسْمَعْهَا »[1]

''اللہ اس شخص کو سرسبز و شاداب (پُر رونق اور سرخرو) رکھے، جس نے میری بات سنی اور اسے خوب اچھی طرح سے یاد کیے رکھا، پھر وہ ان لوگوں تک جا نکلے جنھوں نے وہ بات (حدیث) نہیں سنی (اور انھیں جا کر سنائے)۔''

سنن ترمذی اور صحیح ابن حبان کے الفاظ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے یوں مروی ہیں:

« نَضَّرَ اللّٰهُ امْرَأً سَمِعَ مِنَّا شَيْئًا فَبَلَّغَهٗ كَمَا سَمِعَ فَرُبَّ مُبَلَّغٍ أَوْعٰى مِنْ سَامِعٍ »[2]

''اللہ اس شخص کو شاداب و سرخرو رکھے، جس نے ہم سے کچھ سنا اور جیسا سنا آگے پہنچا دیا، آگے والے لوگوں میں سے کتنے لوگ اس سننے والے سے زیادہ یاد رکھنے والے ہوتے ہیں۔''

صحیح ابن حبان میں « نَضَّرَ اللّٰهُ امْرَأً » کے بجائے « رَحِمَ اللّٰهُ امْرَأً » ہے کہ ''اللہ اس پر رحم فرمائے۔''

فضیلتِ علم و طالب علم اور فضیلتِ علما ایک طویل موضوع ہے، جس پر بعض ائمہ نے ضخیم کتب تصنیف کی ہیں۔ علامہ ابن عبدالبر کی کتاب ''جامع بيان العلم و فضله'' غالباً سب سے ضخیم اور جامع کتاب ہے۔ تفصیل مطلوب ہو تو ایسی کتب کی طرف رجوع کیا جا سکتا ہے۔ ایسے ہی

[1] صحيح الترغيب (١/ ٤١) مجمع الزوائد (١/ ١/ ١٣٩) صحيح الجامع (٣/ ٦/ ٢٩، ٣٠) السلسلة الصحيحة (١/ ٦٨٩) دراسة حديث نضر الله... (ص: ٣٣۔ ٧٤)

[2] صحيح سنن الترمذي، رقم الحديث (٢١٤٠) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٢٣٢) صحيح ابن حبان، الموارد، رقم الحديث (٧٤)

"الترغيب والترهيب للمنذري" اور خصوصاً "صحيح الترغيب والترهيب للألباني" کی جلد اول میں کتاب العلم (ص: ۳۱ تا ۶۱) بھی قابلِ مطالعہ ہے، ہم یہاں تفصیل میں جانے کے بجائے انھی اشارات پر اکتفا کرتے ہیں، کیونکہ ان سے اتنا تو واضح طور پر معلوم ہو ہی جاتا ہے کہ علم و طالب علم کا کیا مقام و مرتبہ ہے اور نوافل و تلاوت پر علمی حلقوں میں بیٹھنے کو ترجیح حاصل ہے۔ لہٰذا اگر مسجد میں خالص قرآن و حدیث کا درس ہو رہا ہو تو ایسے درس کے حلقوں میں بیٹھنا عام نفلی نمازوں سے بہتر ہے۔ فقہ حنفی کی معتبر کتاب "درِ مختار" میں لکھا ہے:

"فَاسْتِمَاعُ الْعِظَةِ أَوْلٰی" [1] "اور وعظ و درس کا سننا اولیٰ اور بہتر ہے۔"

حاشیہ ابن عابدین میں بھی مصنف نے درّ مختار والے کی تائید اور مزید تشریح کی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ امام سیوطی نے اپنی کتاب "الأمر بالاتباع والنهي عن الابتداع" میں لکھا ہے کہ بدعات یا نو ایجاد امور میں سے ایک یہ بھی ہے کہ کوئی انسان جہالت و لاعلمی کے باوجود علمی مجلسوں کو چھوڑ کر نفلی عبادت میں مصروف رہے۔ یہ ایک ایسی غلطی ہے جس سے انسان بہت ہی مخالفِ شریعت آفتوں کا شکار ہو جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے سورت طٰہٰ میں خود اپنے نبی حضرت محمد ﷺ کو اس بات کی تلقین فرمائی ہے:

﴿ وَقُلْ رَبِّ زِدْنِيْ عِلْمًا ﴾ [طٰہٰ: ۱۱۴]

"آپ کہہ دیجیے کہ اے میرے رب! میرا علم زیادہ کر۔"

اس آیت میں علم کی زیادتی کو طلب کرنے کا حکم دیا گیا ہے اور سورت کہف میں حضرت موسیٰ و خضر علیہما السلام کے واقعہ کے شروع ہی میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا قول منقول ہے:

﴿ هَلْ اَتَّبِعُكَ عَلٰٓى اَنْ تُعَلِّمَنِ مِمَّا عُلِّمْتَ رُشْدًا ﴾ [الكهف: ٦٦]

"کیا میں آپ کے ساتھ اس شرط پر رہ سکتا ہوں کہ آپ کو جو کچھ اللہ نے دیا ہے، اس میں سے مجھے بھی سکھائیں گے؟"

انبیاے کرام علیہم السلام کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اعلیٰ قسم کی تعلیم دی جاتی ہے اور ان کی مدد و نصرت کی جاتی ہے، لیکن اس کے باوجود بھی انھیں حکم دیا جا رہا ہے کہ وہ مزید علم کی طلب رکھیں، اس کا سبب

---

[1] در مختار مع رد المحتار (۱/ ٦٦٣، طبع ایچ ایم سعید کمپنی کراچی)

یہ ہے کہ علم کی کوئی انتہا نہیں، ہر شخص علم کا مزید محتاج رہتا ہے۔[1]

غرض کہ علم سیکھنا فرض ہے اور علم و علما سے دوری جہالت کے تسلط کو مضبوط بناتی ہے۔ حصولِ علم کے فرض ہونے کا پتا اس حدیث سے بھی چلتا ہے، جو سنن ابن ماجہ، الکامل لابن عدی اور شعب الایمان بیہقی میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے، معجم طبرانی صغیر اور تاریخ بغداد خطیب میں حضرت حسین بن علی رضی اللہ عنہما سے، معجم طبرانی اوسط میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے، معجم طبرانی کبیر میں حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے، تاریخ بغداد میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے، طبرانی اوسط اور شعب الایمان بیہقی میں حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، جس میں ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے:

﴿طَلَبُ الْعِلْمِ فَرِیْضَةٌ عَلٰی کُلِّ مُسْلِمٍ﴾[2]

''علم حاصل کرنا ہر مسلمان (مرد و زن) کا فرض ہے۔''

جامع بیان العلم وفضلہ لابن عبدالبر میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث کے شروع میں تو ایسے ہی ہے، البتہ آخر میں مزید یہ اضافی الفاظ بھی منقول ہیں:

﴿وَإِنَّ طَالِبَ الْعِلْمِ یَسْتَغْفِرُ لَهٗ کُلُّ شَيْئٍ حَتّٰی الْحِیْتَانَ فِي الْبَحْرِ﴾[3]

''طالب علم کے لیے دنیا کی ہر چیز دعاے مغفرت کرتی ہے، حتیٰ کہ سمندر میں مچھلیاں بھی اس کے لیے بخشش کی دعائیں کرتی ہیں۔''

﴿طلب العلم فریضة علی کل مسلم﴾ تک تو یہ حدیث صحیح ہے، جبکہ اس کے آخر میں جو بعض طُرق میں ﴿... و مسلمة﴾ کا لفظ آیا ہے، وہ صحیح نہیں آیا ہے۔ محدّثین نے اس پر کلام کیا ہے، ویسے بھی اس کے بغیر بھی لفظِ مسلم مرد و زن سب کو شامل ہے۔

یہاں اس بات کی صراحت بھی کرتے جائیں کہ جس علم کے حصول کو فرض قرار دیا گیا ہے اور جس کے حصول کی ترغیب دلائی گئی ہے اور جس علم کے حلقوں میں بیٹھنے کی طرف پُر زور انداز سے دعوت دی گئی ہے، اس سے علمِ قرآن اور سنت مراد ہے نہ کہ قصے کہانیوں کی کوئی کتاب۔ ان حلقوں سے مراد بھی درسِ قرآن و حدیث کے حلقے ہیں نہ کہ وہ حلقے جن میں محض باتیں ہو رہی ہوں یا قصہ

[1] إصلاح المساجد (ص: ١٥٩، ١٦٠ مترجم)

[2] سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٢٢٤) صحيح الجامع (٢/ ٤/ ١٠) صحيح الترغيب (١/ ٣٤)

[3] صحيح الجامع (٢/ ٤/ ١١)

گوئی کا دَور چل رہا ہو، کیونکہ مساجد میں ضعیف اور موضوع روایات پر مبنی تقریر یا خطاب اور ایسی باتوں کے لیے حلقہ بنانا ممنوع ہے، جیسا کہ تفصیل گزر چکی ہے اور نفلی عبادت سے افضل اس حلقے میں بیٹھنا ہے، جس میں قرآن وسنت کا درس ہو رہا ہو۔

بعض لوگ اس حلقے میں بیٹھنے سے اعراض کرتے ہیں، جس میں کوئی عالمِ دین وعظ ونصیحت کرتا ہے اور قرآن وحدیث کے جواہر اور حکمت و دانائی کے موتی بانٹتا ہے۔ ایسے حلقوں کو چھوڑ کر اگر کوئی شخص دوسری طرف محض وقت گزاری کے لیے مجمع لگا لے اور اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے میں مشغول ہو جائے تو ایسے شخص پر صحیح بخاری کی وہ حدیث صادق آتی ہے، جسے امام صاحب رحمہ اللہ نے: "باب من قعد حيث ينتهي به مجلس، ومن رأى فرجة في الحلقة فجلس فيها" (یعنی اس شخص کا باب جو جہاں جگہ پائے بیٹھ جائے اور جو کسی حلقے میں کوئی خالی جگہ دیکھے، وہاں جا بیٹھے) اس باب میں وارد حدیث میں حضرت ابو واقد لیثی رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مسجد میں بیٹھے ہوئے تھے، صحابہ رضی اللہ عنہم بھی موجود تھے، اسی اثنا میں تین آدمی آئے، دو نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو گئے اور ایک واپس چلا گیا اور ان دو میں سے ایک حلقے کی خالی جگہ میں بیٹھ گیا اور دوسرا پیچھے ہی بیٹھ گیا۔ جب نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فارغ ہوئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«أَلَا أُخبِرُكُم عَنِ النَّفَرِ الثَّلَاثَةِ؟ أَمَّا أَحَدُهُمُ فَآوٰى إِلَى اللّٰهِ فَآوَاهُ اللّٰهُ وَأَمَّا الْآخَرُ فَاسْتَحْيَا، فَاسْتَحْيَا اللّٰهُ مِنْهُ، وَأَمَّا الْآخَرُ فَأَعْرَضَ، فَأَعْرَضَ اللّٰهُ عَنْهُ»[1]

''میں تمھیں تین افراد کے بارے میں بتاتا ہوں۔ ایک نے اللہ سے جگہ مانگی تو اللہ نے اسے جگہ مہیا فرما دی۔ دوسرے کو حیا آ گئی تو اللہ کو بھی اس سے حیا معلوم ہوئی اور تیسرے نے اعراض کیا تو اللہ تعالیٰ نے بھی اس سے اعراض کیا۔''

اس حدیث کی شرح بیان کرتے ہوئے حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے فتح الباری میں لکھا ہے کہ اس حدیث سے علمی مجلسوں کے حلقوں کا استحباب ثابت ہوتا ہے اور یہ بھی کہ علمی مجلسوں میں با اَدب رہنا چاہیے اور جو خلا ہو، اسے پُر کرنا چاہیے۔ اسی طرح حدیث سے ان لوگوں کی تعریف نکلتی ہے، جو بھلائی (علم) کی طلب میں دوسروں کے ساتھ نکلتے ہیں۔ آگے لکھتے ہیں کہ علمی حلقوں کی حاضری اور عالم کا

[1] صحيح البخاري مع الفتح (١/ ١٥٦ و ٥٦٢)

مسجد میں بیٹھنا باعثِ فضیلت و برکت ہے۔[1]

موصوف کی اس بات کے ساتھ ہی یہ بھی عرض کرتے جائیں کہ یہ بات کسی سے مخفی نہیں کہ علم کی اشاعت کے لیے عالم کا بیٹھنا عوام کے لیے بہت بڑی نعمت ہے اور لوگوں کا فرض تو یہ بنتا ہے کہ وہ علم حاصل کریں، چاہے اس کے لیے انھیں دور دراز کا سفر کر کے ہی کیوں نہ جانا پڑے اور اگر کوئی علم سکھانے والا ان کے پاس ہی موجود ہو اور وہ اس سے منہ موڑے رہیں تو یہ پھر ان کی شقاوت و بدبختی ہے۔ قرونِ اولیٰ میں لوگ صرف ایک حدیثِ رسول ﷺ کے حصول کے لیے مہینوں کا سفر طے کیا کرتے تھے، لیکن آج احادیث اور حکمت کی باتوں کا بازار سب سے زیادہ سونا پڑا ہے اور لوگ نفسانی خواہشات کے پیچھے بھاگے پھرتے ہیں۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔[2]

بدبودار چیز کھا کر مسجد میں جانا

آدابِ مسجد میں سے یہ بھی ہے کہ کوئی بدبودار چیز کھا کر مسجد میں اس وقت تک نہ جائیں، جب تک منہ سے اس کی بدبو زائل نہ ہو جائے، کیونکہ اس سے دوسروں کو تکلیف پہنچتی ہے، جیسے کچا پیاز یا لہسن اور مولی وغیرہ ہیں۔ ان کے بارے میں صحیح بخاری و مسلم، سنن ابو داود، مسند ابوعوانہ، ابن السنی اور مسند احمد میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبیِ اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

﴿مَنْ أَكَلَ ثَوْمًا أَوْ بَصَلًا فَلْيَعْتَزِلْنَا أَوْ لِيَعْتَزِلْ مَسْجِدَنَا وَلْيَقْعُدْ فِي بَيْتِهِ﴾[3]

''جس نے لہسن یا پیاز کھایا تو وہ ہم سے دور ہی رہے یا وہ ہماری مسجد سے دور رہے، اسے چاہیے کہ وہ اپنے گھر میں ہی بیٹھا رہے۔''

ایسے ہی صحیح بخاری و مسلم، سنن ترمذی ونسائی، صحیح ابن حبان، مسند ابی عوانہ، سنن بیہقی، صحیح ابن خزیمہ، مصنف عبدالرزاق و ابن ابی شیبہ، بغوی، طحاوی اور طبرانی صغیر میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبیِ اکرم ﷺ نے فرمایا:

---

[1] فتح الباري (١/ ١٥٧)

[2] إصلاح المساجد (ص: ١٤٥، ١٦١) إعلام الساجد (ص: ٣٢٨)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٨٥٥) صحيح مسلم مع شرح النووي (٣/ ٥/ ٥٠) صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٢٣٨) صحيح ابن خزيمة (٣/ ٨٣ تحقيق الأعظمى) إرواء الغليل (٢/ ٣٣٤) صحيح الجامع (٣/ ٥/ ٢٥٥)

«مَنْ أَكَلِ هٰذِهِ الْبَقْلَةِ، الثَّوْمِ وَالْبَصَلِ وَالْكُرَاثِ فَلَا يَقْرُبَنَّا فِيْ مَسَاجِدِنَا فَإِنَّ الْمَلَائِكَةِ تَتَأَذّٰى مِمَّا يَتَأَذّٰى مِنْهُ بَنُوْ آدَمَ»[1]

''جس نے لہسن، پیاز اور گندنا میں سے کچھ کھایا، وہ ہماری مساجد میں ہمارے قریب نہ آئے، کیونکہ فرشتوں کو بھی ان چیزوں سے اذیت پہنچتی ہے جن چیزوں سے انسانوں کو اذیت پہنچتی ہے۔''

ایسے ہی سنن ابو داود و بیہقی، مصنف ابن ابی شیبہ، صحیح ابن حبان اور ابن خزیمہ میں حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

«مَنْ أَكَلَ هٰذِهِ الشَّجَرَةَ الْخَبِيْثَةَ فَلَا يَقْرُبَنَّ مَسْجِدَنَا ثَلَاثًا»[2]

''جس نے اس خبیث پودے (لہسن) میں سے کچھ کھایا تو وہ ہماری مسجد کے قریب نہ آئے۔ یہ بات آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تین مرتبہ دہرا کر فرمائی۔''

امام ابن حبان نے اسحاق سے نقل کیا ہے، جو اس حدیث کی سند کے ایک راوی ہیں کہ اس درخت سے مراد لہسن ہے۔ ایسے ہی صحیح مسلم، سنن ابن ماجہ، صحیح ابن حبان، سنن کبریٰ بیہقی، شرح السنہ، مسند ابی عوانہ و مسند احمد اور موطا امام مالک میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

«مَنْ أَكَلَ مِنْ هٰذِهِ الشَّجَرَةِ فَلَا يُؤْذِيْنَا فِيْ مَجَالِسِنَا، يَعْنِيْ الثُّوْمَ»[3]

''جس نے اس خبیث پودے (لہسن) سے کچھ کھایا تو وہ ہماری مجلسوں میں آ کر ہمیں تکلیف ہرگز نہ پہنچائے۔''

حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے صحیح بخاری و مسلم میں مروی ہے کہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

---

[1] صحيح مسلم مع شرح النووي (٣/ ٥/ ٥٩) صحيح سنن النسائي، رقم الحديث (٦٨٣) صحيح سنن الترمذي، رقم الحديث (١٤٧٥) صحيح الجامع (٣/ ٥/ ٢٥٦) إرواء الغليل (٢/ ٣٣٤) شرح السنة (٢/ ٣٨٧/ ٣٨٩) الإحسان (٤/ ٥٢٢، ٥٢٣) رقم الحديث (١٦٣٤)

[2] صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٢٣٩) سنن البيهقي (٣/ ٧٦) صحيح ابن خزيمة (٣/ ٨٣) موارد الظمآن (٣١٧) الإحسان (٤/ ٥٢١_٥٢٢)

[3] صحيح مسلم مع شرح النووي (٣/ ٥/ ٤٩) موطأ مع الزرقاني (١/ ٤٠، دار المعرفة) صحيح الجامع (٣/ ٥/ ٢٥٨) الإحسان (٤/ ٥٢٣، ٥٢٤)

«مَنْ أَكَلَ هٰذِهِ الشَّجَرَةَ يَعْنِي الثُّوْمَ فَلَا يَقْرَبَنَّ مُصَلَّانَا»[1]

''جس نے اس خبیث پودے یعنی لہسن میں سے کچھ کھایا تو وہ ہماری جا نماز کے قریب بھی نہ پھٹکے۔''

صحیح مسلم و ابو داود، سنن ابن ماجہ، صحیح ابن حبان و ابن خزیمہ اور سنن بیہقی میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے:

«مَنْ أَكَلَ مِنْ هٰذِهِ الشَّجَرَةِ فَلَا يَقْرُبَنَّ الْمَسَاجِدَ»[2]

''جس نے اس (لہسن) کے پودے میں سے کچھ کھایا وہ مساجد کے قریب نہ آئے۔''

صحیح بخاری و مسلم اور مسند ابی عوانہ میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے:

«مَنْ أَكَلَ مِنْ هٰذِهِ الشَّجَرَةِ فَلَا يَقْرُبَنَّا وَلَا يُصَلِّيَنَّ مَعَنَا»[3]

''جس نے اس (لہسن) کے پودے میں سے کچھ کھایا تو وہ ہمارے قریب نہ آئے اور نہ ہمارے ساتھ وہ نماز پڑھے۔''

صحیح مسلم، سنن ابو داود، صحیح ابن خزیمہ اور مسند احمد میں حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے:

«مَنْ أَكَلَ هٰذِهِ الشَّجَرَةَ الْخَبِيْثَةَ شَيْئًا فَلَا يَقْرَبَنَّا فِي الْمَسْجِدِ، يَاَيُّهَا النَّاسُ إِنَّهٗ لَيْسَ لِيْ تَحْرِيْمُ مَا أَحَلَّ اللّٰهُ وَلٰكِنَّهَا شَجَرَةٌ أَكْرَهُ رِيْحَهَا»[4]

''جس نے اس خبیث پودے میں سے کچھ کھایا وہ ہماری مسجد میں ہمارے قریب نہ آئے اے لوگو! مجھے حق نہیں کہ میں اللہ کی حلال کردہ چیز کو حرام کروں، لیکن ہمیں اس پودے کی بو ناگوار ہے۔''

---

[1] صحيح البخاري مع الفتح (٨٥٣) صحيح مسلم مع شرح النووي (٣/ ٥/ ٤٨) صحيح الجامع (٣/ ٥/ ٢٥٨)

[2] صحيح مسلم مع شرح النووي (٣/ ٥/ ٤٨) صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٢٤٠) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٠١٦) صحيح ابن خزيمة (٣/ ٨٢) صحيح الجامع (٣/ ٥/ ٢٥٧) تحقيق الإحسان (٤/ ٥٢٢)

[3] صحيح البخاري مع الفتح (٨٥٦) صحيح مسلم مع شرح النووي (٤٩/٥/٢) صحيح الجامع (٣/ ٥/ ٢٥٨)

[4] صحيح مسلم مع شرح النووي (٣/ ٥/ ٥٠، ٥١) صحيح ابن خزيمة (٣/ ٨٤) صحيح الجامع (٣/ ٥/ ٢٥٧) سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٨٢٣)

ابو داود صحیح ابن حبان، سنن بیہقی اور مسند احمد میں حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ سے مروی ارشادِ نبوی ﷺ ہے:

«مَنْ أَكَلَ مِنْ هٰذِهِ الشَّجَرَةِ الْخَبِيثَةِ فَلَا يَقْرُبَنَّ مُصَلَّانَا حَتّٰى يَذْهَبَ رِيحُهَا »[1]

''جس نے اس خبیث پودے میں سے کچھ کھایا تو وہ تب تک ہماری جا نماز کے قریب نہ آئے جب تک اس کی بو زائل نہ ہو جائے۔''

لہسن، پیاز، مولی اور گندنا وغیرہ بدبودار چیزیں کھاتے ہی مسجد میں نہیں جانا چاہیے، بلکہ یہ چیزیں اگر کھانا ہی ہوں تو اتنا پہلے کھائیں کہ مسجد میں جانے تک ان کی بد بو زائل ہو چکی ہو یا پھر کوئی ایسی میٹھی چیز یا کھانا استعمال کرنا چاہیے جو ان کی بدبو کو ختم کر دے، تاکہ مسجد میں آس پاس کے نمازیوں کو اذیت نہ ہو اور اگر کوئی دوسرا نہ ہو تو کم از کم اللہ کے فرشتے تو ہوتے ہی ہیں، انھیں اس بدبو سے تکلیف نہ ہو۔

مذکورہ ترکاریوں کو پکا لینے کے بعد ان کا حکم:

یہاں یہ بات بھی پیشِ نظر رہے کہ ان ترکاریوں کو کھانے کے بعد مسجد میں جانے کی ممانعت صرف اس شکل میں ہے جب انھیں کچا کھایا جائے اور منہ سے ان کی بو پھوٹتی رہے۔ اگر تاخیر یا کسی چیز کے استعمال سے ان کی بو زائل ہو جائے تو پھر ممانعت نہیں ہوگی، کیونکہ ممانعت کا اصل سبب بدبو ہے نہ کہ یہ ترکاریاں۔ اس بات کی صراحت بعض طُرقِ حدیث میں بھی وارد ہوئی ہے کہ یہ حکم صرف ان ترکاریوں کے کچا کھائے جانے کی صورت میں ہے یا ان کی بدبو کے وجود کی صورت میں ہے۔ چنانچہ اس سلسلے میں ذکر کی گئی احادیث میں سے پہلی حدیث جو صحیح بخاری و مسلم، سنن ابو داود، مسند ابو عوانہ، سنن بیہقی اور مسند احمد کے حوالے سے ذکر کی گئی ہے۔ اس حدیث کے آخری حصے میں ہے:

«قُلْتُ مَا يَعْنِيْ بِهٖ؟» ''میں نے پوچھا کہ اس سے آپ (نبیِ اکرم ﷺ کی) کیا مراد ہے؟

تو انھوں نے بتایا:

«مَا أَرَاهُ إِلَّا نَيِّئَةً» ''میرے خیال میں آپ ﷺ کی مراد کچے لہسن سے تھی۔''

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے فتح الباری میں لکھا ہے کہ یہ سوال کس کی طرف سے ہے اور جواب کس نے دیا ہے، اس کا ٹھیک پتا تو نہیں چل سکا، البتہ میرا خیال ہے کہ سوال ابن جریج نے کیا ہے

[1] صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٢٤١) ابن حبان، الموارد (٣١٩) صحيح الجامع (٣/ ٥/ ٢٥٧)

اور یہ جواب امام عطا رحمہ اللہ کی طرف سے ہے۔ مصنف عبدالرزاق میں وارد امر سے اس بات کا ہی اشارہ ملتا ہے، البتہ کرمانی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ سوال امام عطاء رحمہ اللہ کی طرف سے ہے اور جواب حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے دیا ہے تو اس شکل میں اس کا صاف مطلب یہ ہوا کہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی لہسن سے مراد اس کا کچے کا استعمال ہے۔[1]

اسی حدیث کے آخر میں یہ الفاظ بھی ہیں کہ مخلد بن یزید نے ابن جریج سے روایت کرتے ہوئے کہا ہے کہ اس سے مراد اس کی بدبو ہے۔ مصنف عبدالرزاق میں ہے:

«أَرَاهُ يَعْنِي النَّيِّئَةَ الَّتِي لَمْ تُطْبَخْ»[2]

''میرا خیال ہے کہ اس سے مراد کچا لہسن ہے، جو پکایا نہ گیا ہو۔''

مستخرج ابونعیم میں بھی یہی الفاظ ہیں:

''يُرِيدُ النَّيِّئَ الَّتِي لَمْ يُطْبَخْ''[3]

''اس سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی مراد کچا لہسن ہے، جو پکایا نہ گیا ہو۔''

کچے لہسن کو پکا لینے سے اس کا حکم ہی بدل جاتا ہے، پھر اس کے استعمال میں کراہت نہیں رہتی، کیونکہ اس طرح اس کی بدبو ختم ہوجاتی ہے، چنانچہ اس سلسلے میں صحیح مسلم، سنن نسائی و ابن ماجہ، صحیح ابن خزیمہ اور مسند احمد میں ہے کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے ایک خطبہ میں فرمایا:

''إِنَّكُمْ أَيُّهَا النَّاسُ تَأْكُلُونَ مِنْ شَجَرَتَيْنِ مَا أَرَاهُمَا إِلَّا خَبِيْثَتَيْنِ، هٰذَا الْبَصَلُ وَالثُّوْمُ، وَلَقَدْ رَأَيْتُ نَبِيَّ اللّٰهِ ﷺ وَجَدَ رِيحَهَا مِنَ الرَّجُلِ أَمَرَ بِهٖ فَأُخْرِجَ إِلٰى الْبَقِيْعِ فَمَنْ أَكَلَهَا فَلْيُمِتْهَا طَبْخًا''[4]

''اے لوگو! تم یہ پودے لہسن اور پیاز کھاتے ہو، جبکہ میں انھیں خبیث سمجھتا ہوں۔ میں نے نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک آدمی کو بقیع کی طرف نکلوا دیا تھا،

---

[1] فتح الباري (٢/ ٣٤١)

[2] فتح الباري (٢/ ٣٤١)

[3] مصدر سابق.

[4] صحيح مسلم مع شرح النووي (٣/ ٥/ ٥٣، ٥٤) صحيح سنن النسائي، رقم الحديث (٦٨٤) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٣٣٦٣) صحيح ابن خزيمة (٣/ ٨٤) إرواء الغليل (٨/ ١٥٦)

کیونکہ اس سے ان کی بو آ رہی تھی اور جو شخص یہ کھانا چاہے، اسے چاہیے کہ انھیں (ہنڈیا میں) پکا کر ان کی بو کو مار لے۔''

اس حدیث پر امام ابن خزیمہ رحمہ اللہ نے یوں تبویب کی ہے:

"باب الدليل على أن النهي عن إتيان المسجد لآكلهن نيئاً غير مطبوخ"[1]

''اس بات کی دلیل کا بیان کہ مساجد میں آنے کی ممانعت ان لوگوں کے لیے ہے جو اسے پکائے بغیر کچا ہی کھائیں۔''

یہی بات حضرت علی رضی اللہ عنہ سے موقوفاً اور مرفوعاً دونوں طرح مروی ہے، چنانچہ سنن ابو داود و ترمذی میں شریک بن حنبل بیان کرتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بیان کیا:

"نَهٰى عَنْ أَكْلِ الثُّوْمِ إِلَّا مَطْبُوْخًا"[2]

''انھوں نے لہسن کھانے سے منع فرمایا، الا یہ کہ اسے ہنڈیا میں پکا لیا جائے۔''

اور دوسری روایت میں ہے:

«لَا يَصْلُحُ أَكْلُ الثُّوْمِ إِلَّا مَطْبُوْخًا»

''پکائے بغیر لہسن کھانا ٹھیک نہیں۔''

امام ترمذی رحمہ اللہ نے اس حدیث کی سند پر کلام کیا ہے، لیکن یہ حدیث اپنی دوسری مؤید حدیث کی بنا پر محدّثینِ کرام کے نزدیک صحیح ہے، چنانچہ سنن ابو داود اور مسند احمد میں حضرت مرہ مزنی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

«نَهٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ عَنْ هَاتَيْنِ الشَّجَرَتَيْنِ وَقَالَ لِمَنْ أَكَلَهَا: فَلَا يَقْرُبَنَّ مَسْجِدَنَا، وَقَالَ: إِنْ كُنْتُمْ لَا بُدَّ آكِلِيْهِ فَأَمِيْتُمُوْهَا طَبْخًا، قَالَ: يَعْنِي الْبَصَلَ وَالثُّوْمَ»[3]

''نبیِ اکرم ﷺ نے ان دو پودوں یا ترکاریوں یعنی لہسن اور پیاز سے منع کیا اور فرمایا: جو

---

[1] صحيح ابن خزيمة (٣/ ٨٣)

[2] صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٢٤٣) صحيح سنن الترمذي، رقم الحديث (١٤٧٧) إرواء الغليل (٨/ ١٥٥)

[3] صحيح سنن أبي داود (٢/ ٧٢٦، رقم الحديث: ٣٢٤٢) إرواء الغليل (٨/ ١٥٥)

شخص ان میں سے کچھ کھائے تو وہ ہماری مسجد کے قریب نہ آئے اور فرمایا: اگر تم ضرور ہی یہ کھانا چاہو تو انھیں پکا کر ان کی بو مار لیا کرو۔‘‘

یہی بات حضرت عمرِ فاروق رضی اللہ عنہ سے بھی مروی ہے جو ابھی گزری ہے اور وہ بھی اس حدیث کی موید و شاہد ہے۔ اس ساری تفصیل سے معلوم ہوا کہ لہسن پیاز وغیرہ کو جب سالن میں پکا کر کھایا جائے، جبکہ مرچ مسالے اور گھی میں روسٹ ہو جانے سے اس کی بو زائل ہو چکی ہو تو پھر اس کے کھانے میں حرج نہیں ہے۔[1]

حرام نہیں:

یہاں اس بات کی وضاحت بھی کرتے جائیں کہ یہ ترکاریاں بذاتہٖ حرام تو کیا مکروہ بھی نہیں، ان کا کھانا مباح ہے۔ بس صرف یہ شرط ہے کہ انھیں پکا کر کھایا جائے یا پھر کھاتے ہی مسجد وغیرہ میں نہ جایا جائے۔ اس کے حرام نہ ہونے کی دلیل کے طور پر ایک حدیث ذکر کی جا چکی ہے، جس میں صحیح مسلم، سنن ابو داود، صحیح ابن خزیمہ اور مسند احمد کے مطابق حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ لہسن کھا کر کوئی شخص ہماری مسجد میں ہمارے پاس نہ آئے اور فرمایا:

﴿ إِنَّهُ لَيْسَ لِيْ تَحْرِيْمُ مَا أَحَلَّ اللّٰهُ، وَلٰكِنَّهَا شَجَرَةٌ أَكْرَهُ رِيْحَهَا ﴾[2]

’’مجھے حق نہیں کہ میں اللہ کی حلال کردہ اشیاء کو حرام کروں، لیکن اس پودے کی بو مجھے ناگوار ہے۔‘‘

اس حدیث پر امام ابن خزیمہ رحمہ اللہ نے یوں تبویب کی ہے:

’’بَابُ الدَّلِيْلِ عَلٰى أَنَّ النَّهْيَ عَنْ ذٰلِكَ لِتَاذِّي النَّاسِ بِرِيْحِهٖ لَا تَحْرِيْمًا لِأَكْلِهٖ‘‘[3]

’’اس بات کی دلیل کا بیان کہ لہسن کھا کر مسجد جانے کی ممانعت اس کی بو سے لوگوں کا اذیت پانا ہے، اسے کھانے کی حرمت نہیں۔‘‘

پیاز و لہسن وغیرہ حرام نہیں ہیں اور انھیں کچے کھا کر مسجد میں جانے کی ممانعت محض ان کی بو کی

---

[1] إعلام الساجد (ص: ٣٢٩، ٣٣٠)

[2] صحيح مسلم مع شرح النووي (٣/ ٥/ ٥٠، ٥١)

[3] صحيح ابن خزيمة (٣/ ٨٤)

وجہ سے ہے۔ پکے لہسن وغیرہ کو کھانے کے بعد چاہے فوراً ہی کیوں نہ مسجد میں چلے جائیں، کوئی ممانعت نہیں ہے، کیونکہ یہ حلال ہیں، حرام نہیں ہیں، چنانچہ صحیح مسلم اور مسند احمد میں حضرت جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ کے طریق سے، اور صحیح ابن خزیمہ میں سفیان بن وہب کے طریق سے حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، جبکہ یہی حدیث سنن ترمذی، صحیح ابن حبان اور مسند ابو داود طیالسی میں خود حضرت جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

«كَانَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ إِذَا أُتِيَ بِطَعَامٍ أَكَلَ مِنْهُ، وَبَعَثَ بِفَضْلِهِ إِلَيَّ، وَإِنَّهُ بَعَثَ إِلَيَّ يَوْمًا بِفَضْلِهِ لَمْ يَأْكُلْ مِنْهَا لِأَنَّ فِيهَا ثُومًا، فَسَأَلْتُهُ: أَحَرَامٌ هُوَ؟ قَالَ: لَا، وَلٰكِنِّي أَكْرَهُهُ مِنْ أَجْلِ رِيحِهِ» [1]

''نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں جب کھانا بھیجا جاتا تو آپ ﷺ کھانا کھا چکنے کے بعد فاضل کھانا میری طرف بھیج دیتے تھے۔ ایک دن آپ ﷺ نے فاضل کھانا میری طرف بھیجا تو پتا چلا کہ اس سے آپ ﷺ نے لہسن ہونے کی وجہ سے کچھ نہیں کھایا، میں نے پوچھا: کیا یہ لہسن حرام ہے تو آپ ﷺ نے فرمایا: نہیں لیکن مجھے اس کی بو ناگوار ہے۔''

ابن خزیمہ میں ہے:

«اَسْتَحْيِي مِنْ مَلَائِكَةِ اللّٰهِ وَلَيْسَ بِمُحَرَّمٍ» [2]

''یہ حرام تو نہیں، لیکن میں اللہ کے فرشتوں سے حیا کرتے ہوئے نہیں کھاتا۔''

امام ابن خزیمہ نے اس حدیث پر یوں تبویب کی ہے:

"باب ذكر ما خص الله نبيه ﷺ من ترك أكل الثوم والبصل والكراث مطبوخاً"

''اس بات کا بیان کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی ﷺ کے خصائص میں سے یہ بات بھی رکھی کہ آپ ﷺ پکا ہوا لہسن، پیاز اور گندنا بھی نہیں کھاتے تھے۔''

صحیح ابن خزیمہ میں حضرت ام ایوب رضی اللہ عنہا سے مروی حدیث میں ہے:

"نَزَلَ عَلَيْنَا النَّبِيُّ ﷺ فَتَكَلَّفْنَا لَهُ طَعَامًا فِيهِ بَعْضُ الْبُقُولِ فَلَمَّا وُضِعَ بَيْنَ يَدَيْهِ

---

[1] صحيح سنن الترمذي، رقم الحديث (١٤٧٦) ابن حبان: الموارد (٣٢٠) صحيح ابن خزيمة (٣/ ٥/ ٨٦) صحيح مسلم مع شرح النووي (٧/ ١٤/ ٩)

[2] صحيح ابن خزيمة (٣/ ٨٥، ٨٦) إرواء الغليل (٨/ ١٥٤)

قَالَ لِأَصْحَابِهِ: كُلُوا فَإِنِّي لَسْتُ كَأَحَدٍ مِّنْكُمْ، إِنِّي أَخَافُ أَنْ أُوذِيَ صَاحِبِي"[1]

''نبیِ اکرم ﷺ نے ہمیں اپنی میزبانی کے شرفِ عظیم سے نوازا تو ہم نے آپ ﷺ کے لیے پُر تکلف کھانا تیار کیا، جس میں بعض سبزیاں (لہسن وغیرہ) تھیں۔ جب کھانا آپ ﷺ کی خدمت میں پیش کیا گیا تو آپ ﷺ نے اپنے صحابہ رضی اللہ عنہم سے فرمایا: تم لوگ کھالو، میرا معاملہ تم جیسا نہیں ہے، مجھے خدشہ ہے کہ اس کے کھانے سے کہیں میرے صاحب (جبرائیل علیہ السلام) کو تکلیف نہ پہنچے۔''

امام ابن خزیمہ رحمہ اللہ نے اس حدیث پر یوں تبویب کی ہے:

"باب الدليل على أن النبي ﷺ خص بترك أكلهن لمناجاة الملائكة"

''اس بات کی دلیل کا بیان کہ فرشتوں سے مناجات کے شرف کی وجہ سے لہسن وغیرہ کو ترک کرنا نبیِ اکرم ﷺ کا خاصا تھا۔''

ان احادیث سے ایک تو یہ معلوم ہوا کہ یہ ترکاریاں حلال ہیں حرام نہیں ہیں اور یہ بھی کہ نبیِ اکرم ﷺ کا انھیں ترک کرنا حضرت جبرائیل علیہ السلام سے ہم کلامی کے شرف کی وجہ سے تھا نہ کہ حرمت کی وجہ سے۔ اب اگر کوئی شخص پکے ہوئے لہسن وغیرہ کو بھی ترک کر دے تو وہ بھی اس کی مرضی ہے۔ ورنہ امت کے لیے کراہت والی کوئی بات نہیں، جیسا کہ پہلے ذکر کردہ حدیث میں حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ نے جب دیکھا کہ نبیِ اکرم ﷺ نے لہسن کی وجہ سے کھانا نہیں کھایا تو سبب پوچھا، تب آپ ﷺ نے بتایا کہ یہ حرام تو نہیں، البتہ میں اسے اس کی بو کی وجہ سے ناپسند کرتا ہوں تو اس حدیث میں آگے یہ الفاظ بھی ہیں کہ حضرت ابو ایوب رضی اللہ عنہ نے بھی وہ کھانا کھانے سے انکار کر دیا اور فرمایا:

"فَإِنِّي أَكْرَهُ مَا كَرِهْتَ"[2]

''میں بھی اسے پسند نہیں کرتا جو چیز آپ ﷺ کو ناگوار ہے۔''

یہ میزبانِ رسول صحابی حضرت ابو ایوب رضی اللہ عنہ کا اپنا اختیار تھا، ورنہ نبیِ اکرم ﷺ نے انھیں اس کے کھانے سے منع نہیں فرمایا تھا، لہٰذا اگر کوئی شخص نظافت و طہارت اور منہ کی ہوا کو عمدہ سے عمدہ تر رکھنے کی غرض سے پکا ہوا لہسن بھی نہ کھائے تو وہ اس کی مرضی ہے، البتہ اس کے کھانے کی ممانعت نہیں ہے۔

---

[1] صحيح ابن خزيمة (٣/ ٨٦) وقواه الألباني بما قبله.

[2] صحيح مسلم مع شرح النووي (٧/ ١٤/ ٩، ١١)

عذر کی حالت میں:

اس بو کی موجودگی میں اس کا کچا کھانا ٹھیک نہیں اور یہ حکم بھی خاص ان کے لیے ہے جو محض منہ کے ذائقے کے لیے اسے استعمال کریں۔ اگر کوئی شخص کسی عذر کی وجہ سے اسے استعمال کرتا ہے تو اسے اس کی اجازت دی گئی ہے، جیسا کہ مجبوری کی حالت میں ایک صحابی رضی اللہ عنہ نے اسے استعمال کیا اور نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا عذر قبول فرمایا۔ چنانچہ سنن ابو داود، صحیح ابن حبان و ابن خزیمہ، مسند احمد اور بیہقی میں حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں:

"أَكَلْتُ ثُومًا، ثُمَّ أَتَيْتُ النَّبِيَّ ﷺ فَوَجَدْتُهُ قَدْ سَبَقَنِيْ بِرَكْعَةٍ فَلَمَّا صَلّٰى قُمْتُ أَقْضِي، فَوَجَدَ رِيحَ الثُّومِ فَقَالَ: مَنْ أَكَلَ هٰذِهِ الْبَقْلَةَ، فَلَا يَقْرُبَنَّ مَسْجِدَنَا حَتّٰى يَذْهَبَ رِيحُهَا"

''میں نے ایک دن لہسن کھایا اور مسجدِ نبوی میں نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا۔ میرے پہنچنے تک آپ صلی اللہ علیہ وسلم نماز کی ایک رکعت پڑھ چکے تھے تو میں اپنی بقیہ رکعت پڑھنے لگا۔ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے لہسن کی بو محسوس کی اور فرمایا: جو شخص یہ ترکاری کھائے، وہ اس کی بو زائل ہو جانے تک ہماری مسجد کے قریب نہ آئے۔''

حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے جب اپنی نماز مکمل کر لی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی: اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم:

«إِنَّ لِيْ عُذْرًا» ''میں نے عذر و مجبوری کی وجہ سے لہسن کھایا ہے۔''

«نَاوِلْنِيْ يَدَكَ، فَوَجَدْتُّهُ سَهْلًا فَنَاوَلَنِيْ يَدَهُ فَأَدْخَلْتُهَا مِنْ كُمِّيْ إِلٰى صَدْرِيْ فَوَجَدَهُ مَعْصُوبًا»

''مجھے اپنا دستِ مبارک پکڑائیں تو میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بہت آسان پایا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا دستِ مبارک مجھے پکڑا دیا، جسے میں نے گریبان کے راستے اپنے سینے پر جا رکھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے میرے سینے کو اس حال میں پایا کہ اس پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔''

تب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

((إِنَّ لَكَ عُذْرًا))[1] ''تم معذور ہو۔''

گویا کسی بیماری وغیرہ میں اسے کچا یا نیم پختہ کھا لیا جائے تو کوئی حرج نہیں۔

تمام مساجد کے لیے ایک عام حکم:

لہسن، پیاز، مولی اور گندنا کو بلا عذر کچا کھا کر مسجد جانے کی ممانعت کے سلسلے میں جو احادیث ہم نے ذکر کی ہیں، ان میں سے بعض احادیث میں آپ نے دیکھا ہے کہ ارشادِ نبوی ﷺ ہے:

((أَوِ لُيَعْتَزِلْ مَسْجِدَنَا)) ''وہ ہماری مسجد سے الگ رہے۔''

((فَلَا يَقْرُبَنَّ مَسْجِدَنَا)) ''وہ ہماری مسجد کے قریب نہ آئے۔''

((فَلَا يَقْرُبُنَّا فِيْ الْمَسْجِدِ)) ''وہ مسجد میں ہمارے قریب نہ آئے۔''

ان الفاظ کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے بعض نے کہہ دیا ہے کہ لہسن وغیرہ کھا کر مسجد نہ جانے کا حکم نبیِ اکرم ﷺ کی مسجد (مسجد نبوی) کے ساتھ ہی خاص ہے، دوسری مساجد کے لیے یہ حکم نہیں ہے، لیکن حقیقت یہی ہے کہ یہ حکم تمام مساجد کے لیے یکساں ہے، کیونکہ دوسری کئی احادیث میں خود نبیِ اکرم ﷺ نے عام مساجد کے لیے مطلقاً یہی حکم صادر فرمایا ہے، جیسا کہ بعض احادیث میں گزرا ہے۔

((فَلَا يَقْرُبُنَّا فِيْ مَسَاجِدِنَا)) ''وہ ہماری مسجدوں میں ہمارے قریب نہ آئے۔''

بلکہ ایک حدیث میں تو یہ الفاظ بھی گزرے ہیں:

((فَلَا يُؤْذِيْنَا فِيْ مَجَالِسَنَا)) ''وہ ہماری مجلسوں میں آ کر ہمیں اذیت نہ پہنچائے۔''

ان احادیث سے پتا چلتا ہے کہ یہ حکم تمام مساجد کے لیے عام ہے، مسجدِ نبوی ﷺ کے لیے خاص نہیں ہے۔ ویسے بھی ان احادیث میں سے بعض میں اس کا جو سبب بتایا گیا ہے، وہ یہ ہے کہ اس کی بو سے ہمیں تکلیف ہوتی ہے اور ظاہر ہے کہ یہ ہر مسجد کے نمازیوں کے لیے باعثِ تکلیف ہے، پھر اسی پر بس نہیں، بلکہ فرمایا کہ جس چیز سے بنی آدم کو تکلیف ہوتی ہے۔ اسی سے فرشتوں کو بھی تکلیف ہوتی ہے اور یہ فرشتے بھی ظاہر بات ہے کہ ہر مسجد میں ہوتے ہیں، لہٰذا یہ واضح ہوگیا کہ اس حکم کو کسی

[1] صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٢٤١) صحيح ابن خزيمة (٣/ ٨٦، ٨٧) ابن حبان، الموارد (٣١٩) إصلاح المساجد (ص: ١٢٤)

کا مسجدِ نبوی ﷺ کے ساتھ خاص ماننا صحیح نہیں ہے۔ ائمہ حدیث کی تبویب بھی یہی پتا دیتی ہے۔[1]

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے فتح الباری میں ابن جریج رحمہ اللہ کے حوالے سے مصنف عبدالرزاق میں مروی ایک اثر نقل کیا ہے، جس میں ابن جریج رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ میں نے (معروف تابعی اور معتبر امام) امام عطا رحمہ اللہ سے پوچھا:

"هَلِ النَّهْيُ لِلْمَسْجِدِ الْحَرَامِ خَاصَّةً أَوْ فِي الْمَسَاجِدِ؟"

''کیا یہ ممانعت مسجد حرام کے لیے خاص ہے یا عام مساجد کے لیے؟''

تو انھوں نے جواب دیا:

"لَا، بَلْ فِي الْمَسَاجِدِ"[2] ''نہیں بلکہ اس کا حکم تمام مساجد کے لیے عام ہے۔''

ایسے ہی شارح بخاری امام ابن بطال رحمہ اللہ نے بھی تخصیص والے قول کو ضعیف قرار دیا ہے۔ علامہ زرکشی نے "إعلام الساجد بأحكام المساجد" میں اس تخصیص کی طرف اشارہ کر کے لکھا ہے:

"وَالْمَشْهُوْرُ خِلَافَ ذٰلِكَ"[3] ''لیکن مشہور عدمِ تخصیص ہی ہے۔''

امام شوکانی رحمہ اللہ نے نیل الاوطار میں امام نووی رحمہ اللہ اور ابن دقیق العید رحمہ اللہ سے بھی عدمِ تخصیص کی تائید ہی نقل کی ہے۔[4]

مساجد کے علاوہ بعض دیگر مقامات:

یہیں یہ بات بھی ذکر کرتے جائیں کہ یہ حکم نہ صرف یہ کہ مسجدِ نبوی ﷺ یا مسجدِ حرام کے ساتھ خاص نہیں، بلکہ تمام مساجد کے لیے عام ہے اور مساجد میں ان کے صحن بھی شامل ہیں، بلکہ مسجد کے ہال سے منسلک جو جو جگہیں بھی ہیں، جہاں نماز پڑھی جاتی ہے، چاہے وہ کبھی کبھار بوقتِ ضرورت ہی زیرِ استعمال کیوں نہ آتے ہوں، ان سب کا حکم بھی مسجد ہی کا ہے، جیسا کہ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے صحیح مسلم کی اس حدیث سے استدلال کرتے ہوئے لکھا ہے، جس میں لہسن کی بو والے شخص کو نبیِ اکرم ﷺ

---

[1] دیکھیے: صحیح ابن خزیمة (٣/ ٨٢ تا ٨٥، باب: ١٥٤۔ ١٦١) فتح الباري (٢/ ٢٤٠)

[2] فتح الباري (٢/ ٣٤٠، طبع دار الافتاء)

[3] إعلام الساجد (ص: ٣٣٠)

[4] نيل الأوطار (١/ ٢/ ١٥٤)

نے بقیع کی طرف نکال دینے کا حکم فرمایا۔[1]

ساتھ ہی ساتھ یہ بھی کہ ان ترکاریوں کو کچی اور بدبودار کیفیت میں کھا کر مساجد تو ایک طرف ایسی مجالس و مقامات پر بھی نہیں جانا چاہیے، جہاں لوگ قرآن و حدیث کا درس سننے کے لیے جمع ہوئے بیٹھے ہوں، کیونکہ یہ آدابِ مجلس کے خلاف ہے۔ ایسی مجالس کے بارے میں بھی اس حکم کا ذکر امام قرطبی رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر ''الجامع لأحکام القرآن'' (۱۲/ ۲۶۸) میں اور امام زرقانی رحمہ اللہ نے موطا کی شرح (۱/ ۴۱) میں کیا ہے۔[2]

اس معاملے میں عیدگاہ و جنازہ گاہ کا مسجد سے الحاق تو بڑا معقول ہے، جبکہ بعض اہلِ علم نے تو کچا لہسن و پیاز کھا کر ولیمہ وعقیقہ جیسی دعوت اور ایسی ہی دیگر تقریبات میں بھی جانے سے منع کیا ہے۔[3] یہ سب محض اس لیے ضروری ہے کہ آدمی تمام اجتماعی جگہوں پر خصوصاً مقاماتِ عبادت و ذکرِ الٰہی پر حاضری کے وقت نظافت اور پاکیزگی کی عمدہ ترین حالت میں ہو۔

مولی کا حکم:

لہسن، پیاز اور گندنا کا یہ حکم تو صحیح احادیث سے ثابت ہے، جبکہ بو کو اصل علت یا باعثِ ممانعت مانتے ہوئے بعض اہلِ علم نے مولی کو بھی لہسن وغیرہ کے حکم ہی میں شمار کیا ہے، چنانچہ ابن التین نے نقل کیا ہے کہ امام مالک رحمہ اللہ نے فرمایا:

''اَلْفَجُلُ إِنْ کَانَ یَظْھَرُ رِیْحُہٗ فَھُوَ کَالثُّوْمِ''[4]

''اگر مولی کی بو بھی ظاہر ہو رہی ہو تو اس کا حکم بھی لہسن ہی کا ہے۔''

قاضی عیاض رحمہ اللہ نے مولی کھا کر مسجد میں آنے کی ممانعت کو اس قید کے ساتھ مشروط کیا ہے کہ مولی کھانے والا آدمی بار بار ڈکاریں مار رہا ہو، تب ممنوع ہے کہ وہ مسجد میں آئے، ورنہ نہیں۔[5]

اس سلسلے میں معجم طبرانی صغیر میں ایک حدیث ہے، جس میں باقاعدہ مولی کا نام وارد ہوا ہے،

---

[1] فتح الباري (۲/ ۳٤٤)

[2] دیکھیں: تحقیق الإحسان (٤/ ٥٢٤) تحقیق شرح السنة (۲/ ۳۸٦)

[3] حواله جات بالا، و نیل الأوطار (۱/ ۲/ ۱٥٤)

[4] فتح الباري (۲/ ۳٤٤) شرح الزرقاني (۱/ ٤۱)

[5] حواله جات بالا، و نیل الأوطار (۲/ ۱٥٤)

چنانچہ ابو الزبیر حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے ایک روایت بیان کرتے ہیں، جس میں مولی کا بھی ذکر ہوا ہے، لیکن اس روایت کی سند میں ضعف پایا جاتا ہے۔[1] لہٰذا اس سے استدلال تو صحیح نہیں، البتہ اس کی بو والی علت معقول ہے، لہٰذا احتیاط ہی میں بہتر ہے۔

بعض دیگر اشیا:

بعض لوگوں نے بدبو والی علت کو بنیاد بنا کر کئی دیگر امور کو بھی مسجد میں داخل ہونے کے موانع میں سے شمار کیا ہے، جیسے کسی کے منہ یا بغلوں سے ناگوار بو مسلسل آتی ہو اور بعض لوگوں کو کوئی ایسا زخم ہوتا ہے، جس سے سخت قسم کی بو پھوٹتی رہتی ہے اور بعض نے صنعتِ ماہی گیری والوں کو بھی شمار کر لیا ہے کہ مسلسل مچھلیوں میں رہتے رہتے ان کی بو ان میں رچ بس گئی ہوتی ہے، جو محض وضو کرنے سے زائل نہیں ہوتی، اس قسم کے امور کی طرف اشارہ کرنے کے بعد امام ابن دقیق العید نے لکھا ہے کہ یہ توسّع کہ ان سب امور کو لہسن وغیرہ والی احادیث کے تحت داخل کر لیا جائے، یہ کوئی ٹھیک نہیں ہے، یعنی اس پر انھوں نے رضا مندی کا اظہار نہیں کیا۔[2]

حتیٰ کہ البدر ابن المنیر نے حاشیہ بخاری میں اور امام قرطبی رحمہ اللہ نے تو اپنی تفسیر میں یہ تک نقل کیا ہے کہ موذی مرض کے مریض جیسے جذام یا کوڑھ وغیرہ کے مریض لوگ ہیں، انھیں بھی مساجد میں نہیں جانا چاہیے، جب تک کہ بیماری ختم نہ ہوجائے۔[3] لیکن حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے اس بات کو محلِ نظر قرار دیتے ہوئے فتح الباری میں لکھا ہے کہ کوڑھی کی بیماری و علت آسمانی امر ہے، اس کے بس سے باہر ہے، جبکہ لہسن یا پیاز کھانے والا اس معاملے میں خود مختار ہوتا ہے، لہٰذا کوڑھی کو اس پر قیاس کرنا صحیح نہیں۔[4]

لمحہ فکریہ:

امام ابن دقیق العید اور حافظ ابن حجر رحمہما اللہ کے دلائل بڑے مضبوط ہیں، البتہ ہم یہاں اس بات کی طرف توجہ دلانا ضروری سمجھتے ہیں کہ امام ابن دقیق العید کی عدمِ رضا مندی اگر کسی حد تک اپنی جگہ بجا ہے تو منہ اور بغلوں کی بدبو کی بیماری والے لوگوں، بدبودار زخم والے مریضوں اور صنعت ماہی گیری

[1] فتح الباري (٢/ ٣٤٤)

[2] فتح الباري (٢/ ٣٤٤) إعلام الساجد (ص: ٣٣٠)

[3] تفسير القرطبي (١٢/ ٢٦٨)إعلام الساجد (ص: ٣٣٠)

[4] فتح الباري (٢/ ٣٤٠)

میں کام کرنے والے لوگوں کو کچا لہسن کھانے والے پر قیاس کرنے والے علما کی بات بھی سراسر پھینک دینے والی نہیں، بلکہ اگر ان لوگوں کو کچا لہسن کھانے والوں کے حکم میں شمار کرنے کی کوئی نصِ صریح والی دلیل نہیں تو کم از کم یہ بات ان لوگوں کے لیے لمحۂ فکریہ تو ضرور مہیا کرتی ہے کہ وہ مختلف تدابیر اختیار کر کے مسجد میں آیا کریں اور صفائی و ستھرائی کا اس قدر خیال رکھیں کہ ان پر اس حکم کے اطلاق کا کسی کو شبہہ بھی نہ ہو۔

چند تدابیر:

1. جن کو منہ یا بغلوں سے بدبو پھوٹنے کا مرض ہو، وہ ایک تو ہر ممکن طریقے سے بغلوں کو صاف رکھا کریں، ان میں بال نہ بڑھنے دیں، جو غلاظت و بدبو کا باعث بنیں اور یہ تو عام حالت میں ہوا جبکہ بوقتِ نماز مسجد میں جاتے ہوئے کسی اچھی سی خوشبو کا استعمال کر لیا کریں۔

2. دانتوں کو برش وغیرہ کر لیا کریں اور پانچوں وقت کے اس عمل سے بعید نہیں کہ یہ مرض بھی جاتا رہے اور برش کرنے کے لیے بہتر ہو کہ پیلو کی مسواک استعمال کیا کریں، جو نبیِ اکرم ﷺ کی مرغوب و پسندیدہ مسواک بھی ہے اور طبی لحاظ سے مفید بھی، جس کی تفصیل ہم مسائلِ طہارت و وضو کے ضمن میں ذکر کر چکے ہیں۔ لہٰذا اُسے دہرانے کی ضرورت نہیں۔ پیلو کی مسواک میسر نہ ہونے کی صورت میں کریم یا منجن سے بھی کام چلایا جا سکتا ہے، جبکہ اصل غرض صفائی ہے۔

3. رہا وہ شخص جسے کوئی ایسا زخم یا پھوڑا ہے جو بدبو چھوڑتا رہتا ہے یا جس سے خون اور پیپ کے مسلسل رستے رہنے سے بدبو پیدا ہو جاتی ہو، ایسے شخص کو چاہیے کہ وہ اس زخم کے سلسلے میں بے پروائی نہ کرے، جو نتیجتاً بدبو کا سبب بنے، بلکہ اس کو خوب اچھی طرح سے ڈریسنگ اور مرہم کروائے رکھے، تاکہ بدبو کا سدِ باب ہو سکے اور اس پر کچا لہسن کھانے والے کے حکم کے اطلاق کی نوبت ہی نہ آنے پائے، یہی جذام یا کوڑھ والے کے لیے بھی ضروری ہے۔

4. اب رہے وہ لوگ جو ماہی گیری یا مچھلی کے شکار کے پیشے سے منسلک ہیں، ان کے بارے میں یہ تو واضح امر ہے کہ ماہی گیری یا مچھلی کا شکار ایک مباح و جائز پیشہ ہے، اس کی کسی طرح کوئی ممانعت و کراہت ہرگز نہیں، لیکن اس کا یہ مطلب بھی تو نہیں کہ وہ مچھلیاں پکڑتے پکڑتے اور انھیں ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرتے کرتے، انہی کپڑوں میں سیدھے مسجد میں آ نکلیں اور

وضو کر کے مسجد کے ہال میں داخل ہو جائیں اور دوسرے لوگوں کو مچھلی کی بو سے پریشان کریں۔ مچھلی بلاشبہہ پاک وحلال ہے، اس کے کسی کپڑے کو لگ جانے سے وہ نجس نہیں ہو جاتا، لیکن اس پیشے سے منسلک لوگوں کو اپنے دوسرے بھائیوں کی خاطر ہی سہی، مسجد میں ذرا ڈھنگ سے آنا چاہیے۔ اگر بار بار وہ نہا نہیں سکتے تو جسم کے مچھلی لگنے والے اعضا کو تو اچھی طرح دھو سکتے ہیں۔

5 ایسے ہی کپڑوں کو بار بار دھونا ممکن نہ ہو تو کپڑوں کا ایک جوڑا نماز کے لیے خاص تو کیا ہی جا سکتا ہے کہ جب نماز کا ارادہ ہو تو ضروری اعضائے جسم کو دھو کر نماز والے کپڑے پہن لیں اور وضو کر کے خوشبو وغیرہ لگا کر مسجد میں چلے جائیں، تاکہ اگر کلی طور پر نہیں تو کم از کم خاصی حد تک تو بو زائل ہو جائے اور لوگ اذیت سے بچ جائیں۔

اگر اس قسم کی معمولی تدابیر اختیار کی جائیں تو یقیناً بو کا سد باب ہو سکتا ہے اور کسی کو ضرورت ہی نہیں رہتی کہ ان کے بارے میں لہسن کھانے والوں کا حکم سوچتا پھرے۔ اگر بے پروائی ہی کرنا ہو تو وہ صرف عام حالات میں ہو تو ہو، مسجد میں داخل ہونے کے معاملے میں ہرگز نہیں ہونی چاہیے۔

پسینے سے عدمِ احتراز:

یہ امور تو ایسے ہیں جن میں کسی نہ کسی حد تک آدمی کو معذور تصور کرنا پڑتا ہے، مثلاً کوڑھی کا مرض قدرتی امر ہے، ماہی گیری کا پیشہ اس کی مجبوری ہے، بدبو دار زخم اور منہ یا بغلوں کی بو والے امراض میں مبتلا لوگ بھی اس سلسلے میں لاچار ہیں، صرف بے پروائی ترک کر کے کچھ اہتمام کرتے رہیں تو وہ دوسروں کو تکلیف پہنچانے سے بچ سکتے ہیں، لیکن اس سب کچھ کے باوجود بھی وہ کسی درجہ معذور مانے جا سکتے ہیں، جبکہ ہمارے ہی بھائیوں میں سے کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو کسی بھی درجے میں مجبور و لاچار نہیں ہوتے، انھیں کسی قسم کا کوئی شرعی عذر بھی نہیں ہوتا، اس کے باوجود وہ بے پروائی و لا ابالی پن میں یا پھر اپنی عادت سے مجبور ہو کر مساجد میں دوسروں کے لیے اذیت کا باعث بنتے ہیں۔ ہماری مراد ان لوگوں سے ہے، جو اپنے جسموں سے پسینے کی بدبو زائل کرنے کی کوئی تدابیر اختیار نہیں کرتے۔ یہ تو مانا جا سکتا ہے کہ وہ محنت کش ہوتے ہیں، محنت و مشقت کرنے سے انھیں پسینہ آتا ہے، اس حد تک تو کوئی حرج نہیں، محنت وحرکت تو باعثِ برکت ہے، لیکن یہ کہاں ضروری ہے کہ محنت والے کپڑوں کو آٹھ آٹھ دن بدلا ہی نہ جائے اور بدبو کو ان میں خوب اچھی طرح پاؤں جمانے دیے جائیں؟

ایسے لوگوں کو چاہیے کہ اول تو محنت کے وقت والے کپڑے الگ رکھیں اور فارغ ہوتے ہی دوسرے پہن لیا کریں، جن سے وہ مسجد میں نماز پڑھا کریں اور بوقتِ کار اتار لیا کریں اور کام والے کپڑے پہن لیا کریں، جیسا کہ عموماً ہوتا بھی ہے کہ کام کے کپڑے الگ اور معمولِ عام کے کپڑے الگ، اس طرح وہ لوگوں کو پسینے کی بو سے بچا سکتے ہیں اور اس پر کوئی بڑا خرچہ بھی نہیں آتا، محض تھوڑا سا اہتمام ہی مطلوب ہے۔

انہی لوگوں میں ایک دوسری عام عادت یہ بھی پائی جاتی ہے کہ وہ بنیان وغیرہ داخلی لباس استعمال نہیں کرتے اور یہ شاید رواج کسی حد تک عادت ہے۔ اسے اگرچہ فرض و واجب کا درجہ تو حاصل نہیں، لیکن پسینے کی بو سے خود کو اور لوگوں کو محفوظ رکھنے کا ایک طریقہ یا تدبیر یہ بھی ہے کہ بنیان خالص کاٹن یا سوتی دھاگے سے تیار کی گئی ہو اور وہ پسینہ جذب کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے، جس سے قمیص کا بچاؤ ہو جاتا ہے اور بُو کم سے کم پیدا ہوتی ہے، لیکن پسینہ جب سیدھا قمیص کے کپڑے کو لگے گا، جو عموماً پولیسٹر اور نائیلون وغیرہ کی آمیزش سے تیار کردہ ہوتا ہے اور اپنے انہی اجزا کی وجہ سے جذب کرنے کی بہت تھوڑی صلاحیت رکھتا ہے اور پولیسٹر یا نائیلون سے مل کر پسینہ بدبو پیدا کرنے لگتا ہے، لہٰذا فیشن یا رسم و رواج سے قطعہ نظر پسینے کی بدبو سے بچنے کے لیے بھی بنیان وغیرہ کا استعمال انتہائی مناسب ہے اور ایک بہترین تدبیر بھی، تاکہ مسجد میں نماز کے دوران میں لوگ اذیت سے محفوظ رہیں۔

اگر ایسے لوگ ہماری ذکر کردہ تدابیر و تجاویز پر عمل کرنے لگیں تو یقیناً وہ کچا لہسن کھانے والوں کے حکم سے بھی بچ جائیں گے اور اس طرح وہ صاف ستھرے بھی رہیں گے جو خود انہی کی صحت و تندرستی کے لیے بھی مفید ہے۔ لوگوں کو ان سے گھن آئے گی نہ ان کی بو، زخم اور قمیص کی پشت پر لگے پسینے کے ساتھ جسم سے خارج ہونے والے نمکیات وغیرہ دیکھ کر دوسروں کو ذہنی کوفت و اذیت پہنچے گی۔

تمباکو نوشی:

اسی قسم کے لوگوں میں سے ایک خاصا بڑا طبقہ ان لوگوں پر مشتمل ہے، جو ایک دوسری عادت میں مبتلا ہوتے ہیں اور مساجد میں دوسروں کے لیے اذیت و پریشانی کا باعث بنتے ہیں اور وہ ہیں تمباکو نوشی کرنے والے لوگ!!

یہ عام مشاہدے کی بات ہے کہ کثرت سے سگریٹ نوشی کرنے والے کے نہ صرف منہ سے بلکہ ہاتھوں کی انگلیوں کے پوروں سے بلکہ ان کے تو کپڑوں سے بھی تمباکو کی مکروہ ترین بدبو آتی رہتی ہے۔ کپڑوں یا ہاتھوں سے آنے والی بو تو کسی حد تک کم ہوتی ہے، جو شاید اتنی تکلیف دہ نہ ہو، جتنی تکلیف دہ اور اذیت رساں وہ بدبو ہوتی ہے جو ان کے منہ سے نکلتی ہے اور نماز کے دوران تمباکو نوشی کرنے والے کے دائیں یا بائیں ایک ایک اور بعض دفعہ حساس قسم کے دو دو اور تین تین نمازیوں کو تکلیف دہ بدبو پہنچتی اور انھیں پریشان کرتی رہتی ہے۔ یقین مانیں کے بعض دفعہ مسجد میں کسی ایسی جگہ پر نماز پڑھنے کی نوبت آ جاتی ہے، جہاں کوئی تمباکو نوش نماز پڑھ کر گیا ہوتا ہے تو جہاں وہ سجدہ کر کے گیا تھا، وہاں سجدہ ریز ہونے پر دم گھٹنے کی حد تک تکلیف اس بو سے ہوتی ہے جو اس جگہ سے آ رہی ہوتی ہے، اس جگہ پر چند لمحات کے سجدے میں اس تمباکو نوش کی مہربانی سے دم گھٹنے لگتا ہے۔ آپ خود ہی اندازہ فرمائیں کہ ایسے میں خشوع وخضوع کیسے حاصل ہوگا؟ اور جب یہ حاصل نہ ہوگا تو اس کوتاہی کا ذمے دار کون ہوگا؟ یقیناً تمباکو نوش ہے، لہٰذا اس کے ممکنہ عقاب کا سزاوار بھی وہی ہوگا، تو یہ کتنے خسارے یا گھاٹے کا سودا ہے؟!

پھر اگر یہ حقہ، سگریٹ، بیڑی، سگار اور نسوار جیسی اشیا مادی وطبی اعتبار سے ہی کچھ مفید یا کوئی معمولی ضرر رساں ہوتیں تو شاید زیادہ کچھ کہنے کی ضرورت نہ رہتی، لیکن یہ اشیا تو ہر اعتبار سے ہی انتہائی نقصان دہ بھی ہیں، جسے مسلمان تو کجا غیر مسلم حکومتوں، اداروں اور صحافت نے بھی خاص موضوع بنایا اور اس کے نقصانات واضح کیے ہیں۔ یہاں ہم صرف تمباکو کی مختلف شکلوں کا ہی نام لے رہے ہیں، کیونکہ نمازیوں اور مساجد میں جانے والوں کا عمومی شوق اسی حد تک ہی رہتا ہے، ہاں اگر کسی کی شقاوت و بدبختی اس سے بھی آگے حشیش یا چرس وافیون اور شراب وغیرہ تک بھی لے جاتی ہے تو وہ اس کی کم نصیبی ہے، ورنہ عموماً ایسا نہیں ہوتا۔ چرس اور گھانجا کا بدبودار ہونا کس سے مخفی ہے؟ لیکن ہم فی الحال اس بات کو صرف تمباکو نوشی تک ہی محدود رکھ رہے ہیں، چنانچہ غیر مسلم انجمنوں نے انسدادِ تمباکو نوشی کی باقاعدہ مہمیں چلائیں اور غیر مسلم مفکرین نے تمباکو کے خلاف بیانات نشر کیے اور تمباکو کی خرابیاں بیان کیں۔

عقل سلیم میں تو یہ چیز بری ہی ہے، طبی تحقیقات نے بھی اس کے اضرار ونقصانات ثابت کر

دیے ہیں کہ تمباکو سخت مضرِ صحت ہے اور اس سے کئی خطرناک بیماریاں پیدا ہوتی ہیں، جن میں سے ایک کینسر بھی ہے اور آج میڈیکل نے ثابت کر دیا ہے کہ سگریٹ نوشی کرنے والی عورتوں کو چھاتی (پستان) کا کینسر اکثر صرف اس تمباکو نوشی کی وجہ سے ہوتا ہے اور کئی سروے رپورٹس سے ایسی عورتوں کی کثیر تعداد کا پتا چلایا گیا ہے جو سگریٹ نوشی کی وجہ سے چھاتی کے کینسر میں مبتلا ہیں، ان سب نقصانات اور منہ کی بدبو کے باوجود خواتین کا اپنے شوہروں کی سگریٹ نوشی پر صبر و اثبات اور مردوں کا اپنی بیویوں کی سگریٹ نوشی پر خاموش تماشائی بنے رہنا قابلِ ہمت ہی کہا جا سکتا ہے، اللہ ان کے حال پر رحم فرمائے۔ آمین

اس کے نفسیاتی، اجتماعی اور مالی یا مادی نقصانات اس کینسر وغیرہ پر مستزاد ہیں۔ یہ سارے نقصانات صرف ایک تمباکو نوش شخص تک ہی محدود نہیں رہتے، بلکہ اس کے بیوی بچے اور اعزہ و اقارب بھی اس کی زد میں آ جاتے ہیں۔ شریعتِ اسلامیہ کا تمباکو کے بارے میں حرمت یا کم از کم کراہتِ تحریمی کا حکم اپنی جگہ ہے۔ یہاں ان سب امور کی طرف محض اشارہ کر دینے پر ہی ہم اکتفا کر رہے ہیں، کیونکہ تمباکو نوشی کی تاریخ، نقصانات اور شرعی حکم پر مشتمل ہماری کتاب شائع ہو چکی ہے، لہٰذا تفصیل کے لیے اس کی طرف رجوع کیا جا سکتا ہے۔[1]

غرض تمباکو نوشی کے مالی، اخلاقی، اجتماعی، مادی اور طبی نقصانات کے پیشِ نظر اسے فوری طور پر ترک کر دینا چاہیے۔ اگر کسی کو طب وغیرہ پر اعتماد نہ ہو اور طویل تمباکو نوشی کے باوجود اس کے بُرے اثرات سے کسی حد تک بچا رہا ہو تو وہ اللہ کا شکر بجا لائے اور ماضی کو بھول کر آیندہ کے لیے فوراً تائب ہو جائے، کیونکہ سائنس اور طب سے نہ سہی، شریعت سے فرار تو ممکن نہیں اور شریعت نے اس کے نقصانات کے پیشِ نظر ہی اس کی ممانعت کر رکھی ہے۔ تمام دیگر امور سے قطع نظر تمباکو نوشی کرنے والے کے منہ سے جو بدبو کے بھبوکے نکلتے ہیں اور مساجد کی صفوں، دریوں اور قالینوں کو بدبودار کرتے ہیں، حتیٰ کہ دوسروں کے لیے ان کے بعد ان کی جائے سجدہ پر سجدہ ریز ہونا مشکل ہو جاتا ہے، محض اسی بات کو ہی سامنے رکھا جائے، تب بھی نمازی آدمی کے لیے اس کا

---

[1] ریڈیو سے نشر شدہ تمام موضوعات کی طرح اس کے آڈیو کیسٹ بھی متحدہ عرب امارات کے تقریباً ہر شہر کے علاوہ بحرین، مسقط، عمان اور دوحہ قطر حتیٰ کہ پاک و ہند میں بھی کئی جگہوں پر دستیاب ہیں۔

جواز باقی نہیں رہتا۔

یہ سب امور غور وفکر اور سوچ بچار کرنے والوں کے لیے ہیں، ورنہ ضد اور ہٹ دھرمی کا تو کوئی علاج ہی نہیں، انھیں تو آپ قرآنِ کریم کی آیات اور صحیح احادیث سے ثابت شدہ حرام چیز شراب کے بارے میں کہیں تو وہ پھر بھی کوئی نہ کوئی راستہ نکالنے کے لیے ہاتھ پاؤں ماریں گے۔ اللہ تعالیٰ تمبا کونوشی کرنے والوں اور خصوصاً نمازیوں کو اسے ترک کرنے کی توفیق سے نوازے۔ آمین ثم آمین

مسجد میں کھانا پینا:

کچھ امور ایسے بھی قابلِ ذکر ہیں، جن کے بارے میں انسان کو بادی النظر میں ایسے لگتا ہے کہ جیسے یہ تقدس واحترامِ مسجد کے منافی ہوں گے اور شرعاً ممنوع بھی۔ جبکہ درحقیقت ایسا نہیں، بلکہ وہ شرعاً جائز ہوتے ہیں اور بعض شرائط وآداب کو پیشِ نظر رکھا جائے تو پھر ان میں کوئی حرج نہیں ہے۔ ان جائز امور میں سے ایک مسجد میں کھانا پینا بھی ہے، بشرطیکہ آدابِ مسجد کا خیال رکھا جائے اور اسے ہر قسم کی غلاظت سے اور کھانے کے اجزا سے محفوظ رکھا جائے۔ یہ اس طرح بآسانی ممکن ہے کہ مسجد میں بیٹھ کر اگر کبھی کھانے کی نوبت آجائے تو کسی کونے میں کوئی دستر خوان وغیرہ بچھا کر اس پر کھانا رکھیں اور احتیاط کے ساتھ کھالیں۔ مسجد کو کھانے کے اجزا اور سالن وغیرہ سے محفوظ رکھیں، تاکہ وہ بعد میں چیونٹیوں وغیرہ کی آمد کا سبب نہ بننے پائے۔ اس طرح کی احتیاط پر عمل کر کے مسجد میں بیٹھ کر کھانا کھایا جائے اور یہ محض بوقتِ ضرورت ہو تو جائز ہے، لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ مسجد کو ہوٹل ہی بنا لیں۔ گرمی کے موسم میں کہیں سے پارسل میں کھانا لیا اور مسجد کی ائیر کنڈیشنڈ فضا میں جا بیٹھے اور دستر خوان بچھا کر کھانے لگے، ایسا نہیں بلکہ یہ محض بے گھر اور مسافر قسم کے لوگوں کے لیے اور کبھی کبھار ہے۔ چنانچہ سنن ابن ماجہ، صحیح ابن حبان، مسند احمد اور زوائد المسند لابن الامام احمد میں حضرت عبداللہ بن حارث بن جزء رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں:

« كُنَّا نَأْكُلُ عَلٰى عَهْدِ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ فِي الْمَسْجِدِ الْخُبْزَ وَاللَّحْمَ، ثُمَّ نُصَلِّيْ وَلَا نَتَوَضَّأُ »[1]

---

[1] سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٣٣٠٠) مسند أحمد (٤/ ١٩٠، ١٩١) بحواله الإحسان، حاشيه (٤/ ٥٤٠) المنتقى مع نيل الأوطار (١/ ٢/ ٢٣٠) الاحسان (٤/ ٥٤٠) الموارد (٢٢٣)

''ہم نبیِ اکرم ﷺ کے عہدِ مسعود میں مسجد میں بیٹھ کر گوشت روٹی کھا لیا کرتے تھے اور پھر از سرِنو وضو کیے بغیر نماز پڑھ لیتے تھے (یعنی پہلے وضو سے)۔''

ایسے ہی سنن ابن ماجہ، شمائل ترمذی اور مسند احمد میں ابن لہیعہ کے طریق سے ایک حدیث مروی ہے، جس میں حضرت عبداللہ بن حارث رضی اللہ عنہ کے الفاظ یوں نقل کیے گئے ہیں:

''أَكَلْنَا مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ فِي الْمَسْجِدِ لَحْمًا قَدْ شَوٰى، فَمَسَحْنَا أَيْدِيْنَا بِالْحَصْبَاءِ ثُمَّ قُمْنَا نُصَلِّيْ وَلَمْ نَتَوَضَّأْ''[1]

''ہم نے نبیِ اکرم ﷺ کے ساتھ مسجد میں بیٹھ کر بھونا ہوا گوشت کھایا، کنکریوں سے ہاتھ پونچھ لیے اور از سرِ نو وضو کیے بغیر نماز کے لیے اُٹھ گئے۔''

علامہ بوصیری نے ''مصباح الزجاجة في زوائد ابن ماجه'' میں کہا ہے کہ ابن لہیعہ کی وجہ سے یہ سند ضعیف ہے، جبکہ شیخ الارناؤوط نے ''الإحسان في تقريب صحيح ابن حبان'' (٤/ ٥٤٠) کے حاشیے میں لکھا ہے کہ اس طریق سے تو یہ سند ضعیف ہے، لیکن اس سے پہلا طریق اسے تقویت دے رہا ہے۔

یاد رہے کہ بوقتِ ضرورت مسجد میں کھانا کھانے کے جواز کا نفسِ مسئلہ تو ان دونوں احادیث کے علاوہ بھی متعدد احادیث سے ثابت ہے، جن میں سے سب سے اہم حدیث وہ ہے جو صحیح بخاری اور دیگر حدیث کی کتب میں ہے، جس میں اصحابِ صفہ رضی اللہ عنہم کے مسجدِ نبوی ﷺ ہی میں مستقل سکونت اختیار کرنے کا ذکر آیا ہے۔[2] ظاہر ہے کہ وہ اپنی جگہ پر ہی کھاتے پیتے بھی تھے، کیونکہ ان کے کوئی گھر اور اہل و عیال نہیں تھے، بلکہ وہ فقراء تھے، اسی طرح صحیح بخاری و مسلم، مسند ابی عوانہ اور معجم طبرانی میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث ہے، جس میں عکل اور عرینہ کے (سات) آدمیوں کے مدینہ آنے اور اصحابِ صفہ کے ساتھ رہنے کا واقعہ ہے۔[3] وہ لوگ بھی اصحابِ صفہ کے ساتھ ہی مسجدِ نبوی ﷺ میں رہے اور وہیں کھاتے پیتے رہے۔

---

[1] سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٣٣١١) مسند أحمد و زوائده (٤/ ١٩٠، ١٩١) بحواله تحقيق الإحسان (٤/ ٥٤٠) مختصر الشمائل المحمدية (ص: ١٣٩)

[2] صحيح البخاري (١/ ٥٣٦)

[3] دیکھیں: منتقى الأخبار (١/ ٤٨، ١/ ٢/ ١٦٢)

ایسے ہی صحیح بخاری و مسلم کی وہ حدیث بھی ہے، جس میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے نجد کی طرف ایک دستہ روانہ فرمایا، جو (یمامہ کے حاکم اور) بنی حنیفہ کے سردار ثمامہ بن اثال کو پکڑ کر لایا اور انھوں نے اسے مسجدِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے ستون سے باندھ دیا۔ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تین دن اس کے پاس تشریف لاتے اور اس سے گفتگو فرماتے اور وہ سخت وسست بلکہ تلخ و درشت باتیں کرتا رہا۔ آخر تیسرے دن آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے کھول دینے کا حکم فرمایا اور بس اس حسنِ اخلاق کے نتیجے میں وہ مسلمان ہوگیا۔ اس واقعہ اسلام کی تفصیل ''صحیح بخاري مع فتح الباري'' (۸/ ۸۷، ۸۸) میں دیکھی جا سکتی ہے۔[1]

اس واقعے سے مسجد میں کھانا کھانے کے جواز پر یوں استدلال کیا جاتا ہے کہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے تین دن تک وہ قیدی کی حیثیت سے مسجد کے ایک ستون کے ساتھ بندھے رہے۔ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی شانِ رحمت للعالمینی سے قطعاً بعید ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اسے کھانا نہ پہنچاتے ہوں اور ظاہر ہے کہ وہ مسجد میں ہوتے ہوئے ہی کھانا کھایا کرتے تھے۔[2]

ایسے ہی صحیح بخاری و مسلم میں ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے ایک واقعہ مروی ہے، جس میں وہ بیان فرماتی ہیں کہ غزوہ خندق کے موقع پر حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ ایک قریشی مشرک حبان بن عرقہ کے تیر سے زخمی ہوگئے، آگے وہ فرماتی ہیں:

''فَضَرَبَ عَلَيْهِ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ خَيْمَةً فِي الْمَسْجِدِ لِيَعُوْدَهُ مِنْ قَرِيْبٍ''[3]

''نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے لیے مسجدِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں خیمہ نصب کروا دیا، تاکہ قریب سے ان کی بیمار پرسی کر سکیں۔''

ایسے ہی صحیح بخاری و مسلم، سنن ابن ماجہ اور صحیح ابن خزیمہ میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے اور سنن ابن ماجہ و صحیح ابن خزیمہ میں حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی مسجدِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی صفائی کرنے والی ایک عورت کا واقعہ بھی ہے۔[4]

---

[1] صحيح البخاري مع الفتح (۸/ ۸۷، ۸۸) صحيح مسلم مع شرح النووي (٦/ ١٢/ ٨٧ تا ٩٠)

[2] دیکھیں: نيل الأوطار (١/ ٢/ ١٦٣)

[3] صحيح البخاري مع الفتح (١/ ٥٥٦) صحيح مسلم مع شرح النووي (٦/ ١٢/ ٩٤)

[4] صحيح البخاري مع الفتح، رقم الحديث (٤٦٠ و ٤٥٨) صحيح الترغيب (١/ ١١٢) صحيح مسلم مع ←

اس عورت کے لیے بھی مسجدِ نبوی ﷺ میں خیمہ لگایا گیا تھا اور ان دونوں کے واقعات سے بھی مسجد میں کھانا کھانے کے جواز پر استدلال کیا جاتا ہے، کیونکہ خیمے میں رہنا اس میں کھانا کھانے کو مستلزم ہے۔

اسی طرح وفدِ ثقیف کی آمد کا واقعہ صحیح مسلم، سنن ابو داود، نسائی، سنن ابن ماجہ، دارمی اور مسند احمد میں وارد ہوا ہے، جس میں یہ بھی مذکور ہے کہ نبیِ اکرم ﷺ نے انھیں مسجد میں رکھا تھا۔[1]

ظاہر ہے کہ وفد کو کھانا وغیرہ مسجد میں ہی کھلایا جاتا تھا۔

غرض کہ مسجد میں کھانا کھانے کے جواز کا پتا دینے والی احادیث بکثرت ہیں، البتہ مسجد کی نظافت و صفائی اور تقدس و احترام کا لحاظ رکھنا ضروری ہے۔ امام مالک رحمہ اللہ سے نقل کیا گیا ہے کہ وہ ایک دو لقمے کھانے کے جواز کے قائل تھے، زیادہ کے نہیں، جیسا کہ علامہ زرکشی نے "إعلام الساجد" (ص: ۳۲۹) میں نقل کیا ہے تو ان کا یہ قول بھی تقدس و احترام کے پیشِ نظر ہی ہوگا، ورنہ احادیث سے ثابت جواز کی مخالفت تو ان کا مقصود ہرگز نہیں ہوسکتا۔

مسجد میں سونا اور بعض دیگر امور:

ان احادیث میں کھانا کھانے کا ذکر تو ضمناً آیا ہے، جبکہ ایک دوسرا مسئلہ اصلاً بھی مذکور ہے اور وہ ہے بوقتِ ضرورت مسجد میں سونے کا جواز۔

①، ② اصحابِ صفہ والی اور بعد والی دوسری حدیث سے واضح طور پر یہ جواز بھی معلوم ہوتا ہے، کیونکہ ان کی سکونت ہی مسجد میں تھی۔

③ دوسری حدیث میں مذکور ہے کہ حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ اور مسجد کی صفائی کرنے والی نیک خاتون رضی اللہ عنہا کے مسجد میں خیمے تھے۔

④ عکل و عرینہ کے (سات) افراد بھی صفہ ہی میں آ کر رہے تھے۔

⑤ پانچویں حدیث وہ ہے، جو صحیح بخاری، سنن ابو داود، ترمذی، نسائی، شرح السنۃ بغوی، سنن کبریٰ بیہقی، ابن حبان اور مسند احمد میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے بارے میں متعدد طُرق سے مروی ہے، جس میں حضرت نافع، سالم اور حمزہ فرماتے ہیں کہ حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ نے بتایا:

← شرح النووي (٤/ ٧/ ٢٥، ٢٦) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٥٢٧، ١٥٣٣)

[1] نيل الأوطار (١/ ٢/ ١٦٣) المعجم الفهرس لألفاظ الحديث (٧/ ٢٦٤)

"إِنَّهُ كَانَ يَنَامُ وَهُوَ شَابٌّ أَعْزَبُ لَا أَهْلَ لَهُ فِي مَسْجِدِ النَّبِيِّ ﷺ"[1]

"وہ نبیِ اکرم ﷺ کی مسجدِ (نبوی) میں سویا کرتے تھے، کیونکہ وہ ابھی اہل وعیال والے نہیں، بلکہ غیر شادی شدہ تھے۔"

مسند احمد کے الفاظ ہیں:

«كُنَّا فِي زَمَنِ رَسُولِ اللّٰهِ ﷺ نَنَامُ فِي الْمَسْجِدِ، وَنَقِيلُ فِيهِ وَنَحْنُ شَآبٌّ»[2]

"نبیِ اکرم ﷺ کے عہدِ مبارک میں ہم مسجد میں دوپہر اور رات کو سویا کرتے تھے اور ہم جوان تھے۔"

⑥ چھٹی حدیث صحیح بخاری وطبرانی اور دیگر کتب میں مروی ہے، جس میں حضرت سہل بن سعد رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبیِ اکرم ﷺ ایک مرتبہ جگر گوشۂ رسول حضرت فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا کے گھر تشریف لے گئے تو دیکھا کہ گھر میں ان کے شوہر نامدار حضرت علی رضی اللہ عنہ نہیں ہیں۔ پوچھا کہ وہ کہاں ہیں؟ تو انھوں نے بتایا کہ میرے اور ان کے درمیان کچھ گرمی سردی ہوگئی ہے اور وہ ناراض ہو کر گھر سے نکل گئے ہیں اور آج کی دوپہر گھر پر قیلولہ (دوپہر کا معمولی سا سونا) بھی نہیں کیا۔ نبیِ اکرم ﷺ نے کسی کو بھیجا کہ جاؤ! دیکھو وہ کہاں ہیں؟ تو اس نے واپس آ کر بتایا، اے اللہ کے رسول ﷺ! "هُوَ فِي الْمَسْجِدِ رَاقِدٌ" "وہ مسجد میں سوئے ہوئے ہیں۔"

نبیِ اکرم ﷺ مسجد تشریف لے گئے اور دیکھا کہ وہ اس طرح لیٹے ہیں کہ ان کے ایک پہلو سے چادر ہٹی ہوئی ہے اور انھیں مٹی لگی ہوئی ہے۔ آپ ﷺ نے ان سے مٹی جھاڑنا شروع کر دیا اور ساتھ ہی ساتھ پیار سے فرماتے گئے:

«قُمْ يَا أَبَا تُرَابٍ! قُمْ يَا أَبَا تُرَابٍ!»[3] "اے مٹی والے! اٹھو، اے مٹی والے! اٹھو۔"

اس حدیث سے بھی بوقتِ ضرورت مسجد میں سونے کے جواز کا پتا چلتا ہے، لیکن بقول شارح

---

[1] صحيح البخاري (١/ ٥٣٥) صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٦٨) صحيح سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٦٤) صحيح سنن النسائي، رقم الحديث (٦٩٧) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٧٥١) شرح السنة (٢/ ٢٩٢، تا ٣٧٩) صحيح ابن خزيمة (٢/ ٢٨٦) مسند أحمد (٢/ ٧٠، ٧١) سنن البيهقي (٢/ ٤٩٢) الإحسان (٤/ ٥٣٧، ٨٣٨) نيل الأوطار (١/ ٢/ ٢٢٨، طبع الرياض)

[2] مسند أحمد (٢/ ٧٠، ٧١)

[3] صحيح البخاري مع فتح الباري (١/ ٥٣٥، ٣٥٦)

بخاری حافظ ابن حجر رحمہ اللہ دوپہر کے قیلولہ اور رات کی نیند میں فرق کرنا ممکن ہے۔ چونکہ مسجد میں سونے کے عام جواز پر صرف یہی حدیث دال ہے، لہٰذا جب یہ فرق مان لیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ رات کے سونے کی صریح دلیل کوئی نہ ہوئی، جو جواز کے حکم کا پتا دے۔ لہٰذا ان احادیث کے پیشِ نظر تبلیغی جماعت والوں کے رویے پر اعتراض تو نہیں، البتہ نظرِ ثانی کا مشورہ دیا جا سکتا ہے۔

غرض کہ ان احادیث کی بنا پر جمہور اہلِ علم مسجد میں سونے کے جواز کے قائل ہیں، البتہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مسجد میں سونے کی کراہت کا قول مروی ہے، سوائے اس کے جو محض سونے کے لیے نہیں، نماز کے لیے آئے اور سو بھی لے تو حرج نہیں، کیونکہ امام بغوی نے شرح السنۃ میں ان کا قول تعلیقاً نقل کیا ہے کہ وہ فرماتے تھے:

"لَا تَتَّخِذُوْهُ بَيْتًا وَمَقِيْلًا"[1]

"مسجد کو قیلولہ (دوپہر کے سونے) اور رات کے سونے کی جگہ نہ بناؤ (سوائے نمازی کے)۔"

جبکہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ مطلقاً مسجد میں سونے کو مکروہ سمجھتے تھے۔ امام مالک رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جس کا اپنا گھر ٹھکانا موجود ہو تو مسجد میں سونا مکروہ ہے اور جس کا گھر نہ ہو، اس کے لیے مباح ہے۔[2]

مسجد میں سونے یا لیٹنے کے آداب:

جب مسجد میں بوقتِ ضرورت سونا جائز ہے تو محض آرام کرنے کے لیے تھوڑا سا لیٹنا کیسے ناجائز ہوسکتا ہے، بلکہ مسجد میں لیٹنے کا ثبوت تو صحیح احادیث میں خود نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی ملتا ہے، البتہ چونکہ مسجد ہے، لہٰذا اس کے تقدس و احترام کے پیشِ نظر ان آداب کا خیال رکھنا چاہیے، جو اس کے لیے ضروری ہیں، جیسے کوئی دری، چٹائی یا گدّا وغیرہ ڈال لینا اور ایسا لباس پہننا جس میں ننگے ہونے کا خدشہ نہ ہو اور انڈر ویئر کا ضرور پہننا، تاکہ بدخوابی کی صورت میں مسجد کی سطح زمین یا اس پر بچھائی گئی دری، صف یا قالین وغیرہ ہر قسم کی آلائشوں سے محفوظ رہے۔

پاؤں دراز کر کے ایک دوسرے پر رکھنا:

مسجد میں لیٹنے کا انداز تو خود نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے، جسے اختیار کرنے والے کے لیے

---

[1] شرح السنة (٢/ ٧٣٩)

[2] فتح الباري (١/ ٥٣٥) نيل الأوطار (١/ ٢/ ٢٢٨) شرح السنة (٢/ ٧٣٩)

ننگا ہونے یا شرمگاہ کھلنے کے امکانات ختم نہیں تو کم از کم ہو جاتے ہیں، چنانچہ صحیح بخاری و مسلم، شرح السنۃ بغوی اور موطا امام مالک میں حضرت عباد بن تمیم اپنے چچا (عبداللہ بن زید بن عاصم المازنی) سے بیان کرتے ہیں کہ انھوں نے فرمایا:

«إِنَّهٗ رَأَی رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ فِي الْمَسْجِدِ وَاضِعًا إِحْدٰی رِجْلَيْهِ عَلَی الْأُخْرٰی»[1]

''میں نے نبیِ اکرم ﷺ کو مسجد میں اس انداز سے لیٹے ہوئے دیکھا کہ آپ ﷺ نے ایک قدم مبارک دوسرے پر رکھا ہوا تھا۔''

جبکہ صحیح بخاری اور موطا امام مالک میں حضرت سعید بن مسیّب رحمہ اللہ اور شرح السنۃ بغوی میں ابن شہاب زہری رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''إِنَّ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ وَعُثْمَانَ بْنَ عَفَّانَ رضی اللہ عنہما يَفْعَلَانِ ذٰلِكَ''

''حضرت عمر اور عثمان رضی اللہ عنہما ایسا کیا کرتے تھے۔''

امام حمیدی رحمہ اللہ نے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے حضرت عمرِ فاروق اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہما کے اس فعل کے ساتھ ساتھ ہی حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا بھی یہی فعل نقل کیا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اس انداز سے لیٹ کر پاؤں پر پاؤں رکھنا بھی جائز ہے۔ امام بغوی رحمہ اللہ و علامہ وحید الزمان رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ چت لیٹ کر اگر پاؤں دراز ہوں، کوئی گھٹنا کھڑا نہ ہو اور کپڑا بھی ساتر ہو تو شرم گاہ نہیں کھلتی، بلکہ یہ زیادہ ساتر ہوگا، بہ نسبت دراز مگر الگ الگ پاؤں رکھنے کے۔[2]

ایسے ہی امام خطابی، بیہقی، امام نووی، حافظ ابن حجر اور علامہ زرقانی و دیگر اہلِ علم نے بھی اس طرح چت لیٹنے کو جائز قرار دیا ہے۔

ایک تعارض اور اس کا حل:

پاؤں پر پاؤں رکھ کر چت لیٹنے کی صحیح مسلم اور دیگر کتبِ سنن میں وارد حدیث میں ممانعت بھی آئی ہے، جس میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

---

[1] صحيح البخاري (١/ ٥٦٣) صحيح مسلم مع شرح النووي (٧/ ١٤/ ٧٧، ٧٨) موطا الإمام مالك مع الزرقاني (١/ ٣٥٣) شرح السنة (٢/ ٣٧٧) منتقى الأخبار (١/ ٢/ ٢٢٧) صحيح مسلم (٣/ ١٦٦٢) تحقيق محمد فؤاد عبدالباقي، بيروت.

[2] شرح السنة (٢/ ٣٧٨) لغات الحديث (ص: ٥) كتاب الأم (ص: ٥٨، طبع نور محمد کارخانہ تجارت کراچی)

«إِنَّ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ نَهٰى عَنْ أَنْ يَّرْفَعَ الرَّجُلُ إِحْدٰى رِجْلَيْهِ عَلَى الْأُخْرٰى وَهُوَ مُسْتَلْقٍ عَلٰى ظَهْرِهٖ»[1]

''نبیِ اکرم ﷺ نے اس بات سے منع فرمایا کہ کوئی شخص اپنا ایک پاؤں اٹھا کر دوسرے پر رکھے اور پشت کے بل چت لیٹا ہوا بھی ہو۔''

دوسری روایت کے الفاظ ہیں:

«وَلَا تَضَعْ إِحْدٰى رِجْلَيْكَ عَلَى الْأُخْرٰى إِذَا اسْتَلْقَيْتَ»[2]

''جب تم چت لیٹے ہوئے ہو تو اپنا ایک پاؤں دوسرے پر مت رکھو۔''

تیسری روایت میں ہے:

«لَا يَسْتَلْقِيَنَّ أَحَدُكُمْ، ثُمَّ يَضَعُ إِحْدٰ رِجْلَيْهِ عَلَى الْأُخْرٰى»

''تم میں سے کوئی شخص چت نہ لیٹے کہ پھر وہ اپنا ایک پاؤں دوسرے پر رکھے۔''

امام نووی رحمہ اللہ شرح مسلم میں لکھتے ہیں کہ یہ ممانعت اس شکل پر محمول ہوگی، جس میں چت لیٹ کر آدمی اپنا گھٹنا کھڑا کر لے اور دوسرا پاؤں اس کے اوپر رکھ لے، جیسا کہ انفرادی حالت میں ہوسکتا ہے اور اس کی ممانعت کی وجہ یہ ہے کہ ایسا کرنے سے ستر کے کھل جانے کا اندیشہ ہوتا ہے اور جو پہلی جواز والی صورت ذکر کی گئی ہے، اس کے بارے میں لکھا ہے کہ بے پردگی نہ ہونے کی صورت میں اس طرح چت لیٹنے میں کوئی حرج و کراہت نہیں ہے۔ آپ ﷺ کا اس انداز سے لیٹنا ممکن ہے کہ بیانِ جواز کے لیے ہو کہ میں نے تمھیں چت لیٹ کر پاؤں پر پاؤں رکھنے سے منع کیا تھا، لیکن اگر ایسے لیٹنا ہی ہو تو پھر یوں پاؤں پر پاؤں رکھ لیا کرو (اور گھٹنا نہ اٹھایا کرو) اور قاضی سے نقل کر کے لکھا ہے کہ ممکن ہے، آپ ﷺ نے چت لیٹے پاؤں پر پاؤں رکھنے کی صورت بھی محض تھکاوٹ کی وجہ سے اور طلبِ راحت کی خاطر اختیار فرمائی ہو، ورنہ عموماً آپ ﷺ کی عادتِ مبارکہ یہ تھی کہ آپ ﷺ لوگوں میں مختلف طریقوں سے بیٹھا کرتے تھے، لیٹتے نہیں تھے۔

بیٹھنے کے چار مسنون انداز:

آپ ﷺ کے بیٹھنے کی بھی عموماً چار صورتیں ہوتی تھیں:

[1] صحيح مسلم (٣/ ١٦٦١) تحقيق محمد فؤاد عبدالباقي، إحياء التراث العربي.

[2] صحيح مسلم (٣/ ١٦٦١) تحقيق محمد فؤاد عبدالباقي، إحياء التراث العربي.

1 احتباء:

یہ عربی میں گوٹ (گوٹھ) مار کر بیٹھنے کو کہتے ہیں اور یہ عربوں کے بیٹھنے کا اکثر مروج انداز تھا، کیونکہ وہ جنگلوں اور ریگستانوں میں رہنے والے لوگ ہوتے ہیں، جہاں ٹیک لگانے کے لیے دیوار وغیرہ تو ہوتی نہیں، لہٰذا وہ لوگ گوٹھ مار کر بیٹھتے تھے اور اسی سے ہے:

''اَلْإِحْتِبَاءُ حِیْطَانُ الْعَرَبِ'' ''احتباء اہلِ عرب کی دیواریں ہیں۔''

احتباء یا گوٹھ مارنا یہ ہے کہ کسی کپڑے سے یا ہاتھوں سے اپنے پاؤں اور پیٹ کو ملا کر کمر سے جکڑ لیا جائے۔ امام طیبی نے کہا ہے کہ دونوں گھٹنے کھڑے کر کے تلوے زمین پر لگا کر بیٹھے اور دونوں ہاتھ پنڈلیوں پر ہوں تو اس بیٹھک کو احتباء (گوٹھ مار کر بیٹھنا) کہا جاتا ہے۔[1]

بیٹھنے کے اس انداز کے جواز کا پتا صحیح بخاری و مسلم، الادب المفرد اور مستدرک امام حاکم کی اس حدیث سے چلتا ہے، جس میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حضرت حسن رضی اللہ عنہ سے پیار و محبت کا واقعہ بیان کرتے ہیں، اس میں یہ بھی ہے کہ ایک دن نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم گھر سے نکلے تو مجھے مسجد میں پایا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے میرا ہاتھ پکڑا تو میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ چل دیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سوق بنی قینقاع پہنچے اور اِدھر اُدھر پھرے اور واپس ہوئے۔

((حَتّٰی جِئْنَا الْمَسْجِدَ فَجَلَسَ فَاحْتَبٰی))[2]

''حتیٰ کہ ہم دوبارہ مسجد میں پہنچے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم گوٹھ مار کر بیٹھ گئے۔''

خود حضرت ابو سعید رضی اللہ عنہ کا احتباء کرنا بھی ''صحیح بخاری مع الفتح'' (۱/ ۵۴۱) کی ایک حدیث میں ثابت ہے، ہاں اگر آدمی صرف ایک ہی کپڑا پہنے ہوئے ہو، جس میں اس طرح بیٹھنے سے ستر کھلنے کا اندیشہ ہو تو پھر ایسے بیٹھنے کی ممانعت ہے، چنانچہ صحیح بخاری و مسلم اور سنن نسائی میں حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ والی حدیث کی ممانعت اسی حالت پر محمول ہوگی، جس میں وہ بیان کرتے ہیں کہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دو قسم کی بیع و شرا اور دو قسم کے لباس سے منع فرمایا، اس میں ہے:

---

[1] لغات الحدیث (۱/ ۱۵)

[2] صحیح البخاري مع الفتح (٤/ ٣٣٩، ١٠/ ٢٧٩) صحیح مسلم مع شرح النووي (٨/ ١٥/ ١٩٣) لیکن اس میں احتباء کے الفاظ نہیں ہیں۔ الأدب المفرد (ص: ٥١٩)

«وَاللِّبْسَةُ الْأُخْرٰی احْتِبَاءُہٗ بِثَوْبِہٖ، وَھُوَ جَالِسٌ، لَیْسَ عَلٰی فَرْجِہٖ مِنْہُ شَیْئٌ»[1]

''دوسرا ممنوع اندازِ لباس یہ ہے کہ کوئی شخص بیٹھا ہوا اور اپنے اکلوتے کپڑے سے گوٹھ مار لے، جبکہ اس کے ستر پر کوئی کپڑا نہ ہو۔''

تو یہ ممانعت صرف ایک ہی چادر باندھنے کی صورت میں ہے، کیونکہ اس طرح بسا اوقات ستر کھل جاتا ہے۔[2]

2 تربُّع:

تربُّع عربی زبان میں چار زانو ہو کر بیٹھنے کو کہتے ہیں، جسے ہم چوکڑی مار کر بیٹھنا بھی کہتے ہیں۔ اس سلسلے میں امام بخاری کی کتاب الادب المفرد، استیعاب ابن عبدالبر اور تہذیب الکمال مزی میں حنظلہ بن حذیم رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں:

«أَتَیْتُ النَّبِيَّ صلی اللہ علیہ وسلم فَرَأَیْتُہٗ جَالِسًا مُتَرَبِّعًا»[3]

''میں نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو چار زانو بیٹھے ہوئے دیکھا۔''

صحیح مسلم، سنن ابو داود، ترمذی اور نسائی میں حضرت جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں:

''کَانَ النَّبِيُّ صلی اللہ علیہ وسلم إِذَا صَلّٰی الْفَجْرَ تَرَبَّعَ فِيْ مَجْلِسِہٖ، حَتّٰی تَطْلُعَ الشَّمْسُ حَسْنَآءَ''[4]

''نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فجر کی نماز کے بعد اپنی جگہ پر چار زانو ہو کر بیٹھ جاتے، حتیٰ کہ سورج خوب اچھی طرح چڑھ آتا۔''

ایسے ہی الادب المفرد اور معانی الآثار طحاوی میں عمران بن مسلم بیان کرتے ہیں:

---

1. صحیح البخاري (۱۰/ ۲۷۸) صحیح مسلم مع شرح النووي (۵/ ۱۰/ ۱۵۵) لیکن مذکورہ الفاظ نہیں ہیں۔ صحیح سنن أبي داود (۲/ ۷۶۸، ۷۶۹) سنن الترمذي مع التحفة (۵/ ۴۵۰، ۴۵۱) الأدب المفرد (ص: ۵۱۵) صحیح سنن النسائي (۳/ ۱۰۸۱)
2. لغات الحدیث أیضاً.
3. الأدب المفرد (ص: ۵۱۷)
4. صحیح مسلم مع شرح النووي (۳/ ۵/ ۱۷۱) سنن أبي داود مع العون (۳/ ۱۹۹) صحیح سنن الترمذي، رقم الحدیث (۴۷۹) صحیح سنن النسائي، رقم الحدیث (۱۲۸۵، ۱۲۸۶)

”رَأَیْتُ أَنَسَ ابْنَ مَالِكٍ یَجْلِسُ ھٰكَذَا ۔مُتَرَبِّعًا۔ وَیَضَعُ اِحْدٰی قَدَمَیْهِ عَلَی الْأُخْرٰی“[1]

”میں نے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کو چار زانو بیٹھے دیکھا کہ انھوں نے اپنا ایک پاؤں دوسرے پر رکھا ہوا تھا۔“

ایسے چار زانو چوکڑی مار کر بیٹھنے کے بارے میں بعض آثار بھی ہیں، جو اس طرح بیٹھنے کے جواز ومشروعیت کا پتا دیتے ہیں۔[2]

بعض صحابہ رضی اللہ عنہم سے مروی ہے:

”لَمْ یُرٰی مُتَرَبِّعًا قَطُّ“[3]

”نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کبھی بھی چوکڑی مار کر بیٹھے نہیں دیکھے گئے۔“

تو اس کے بارے میں علامہ وحید الزمان رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ شاید اس راوی نے نہیں دیکھا ہوگا۔

3 قرفصاء:

بیٹھنے کا تیسرا انداز قرفصاء ہے، جبکہ عرب لوگ کہتے ہیں:

”قَرْفَصَ الرَّجُلُ“ ”آدمی اپنے پاؤں پر بیٹھا اور رانوں کو پنڈلیوں سے ملا دیا۔“

اس کو استیفاز بھی کہتے ہیں، یعنی اکڑوں بیٹھنا جو جلدی اور ضرورت کی حالت میں ہوتا ہے، جسے ہم پاؤں پر بیٹھنا بھی کہتے ہیں۔ یہ انداز بھی نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے، چنانچہ سنن ابو داود و ترمذی، الادب المفرد اور طبرانی میں حضرت قیلہ رضی اللہ عنہا بیان فرماتی ہیں:

”رَأَیْتُ النَّبِيَّ صلی اللہ علیہ وسلم قَاعِداً الْقُرْفَصَاءَ“[4]

”میں نے نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اکڑوں (پاؤں کے بل) بیٹھے دیکھا۔“

---

[1] الأدب المفرد (ص: ٥١٧)

[2] لغات الحدیث، جلد دوم، کتاب: ر (ص: ٢٦)

[3] صحیح سنن أبي داود، رقم الحدیث (٤٠٥٧) صحیح الترمذي، رقم الحدیث (٢٢٥٦) لیس فیه کیفیة الجلوس، الأدب المفرد (ص: ٥١٧) مختصر الشمائل (ص: ١٠١)

[4] سنن أبي داود مع العون (١٣/ ١٩٥، ١٩٦) سنن الترمذي مع التحفة (٨/ ٦٨، ٦٩) و حسنه المنذري و أبو عمر ابن عبدالبر. لغات الحدیث (٥/ ١٣٢) صفة صلاة النبي صلی اللہ علیہ وسلم للألباني (ص: ٩٣)

4 اقعاء:

بیٹھنے کی چوتھی شکل اقعاء ہے۔ اقعاء بھی دوطرح کا ہے، چنانچہ مجمع البحار میں ہے کہ اقعاء نماز میں یہ ہے کہ آدمی اپنے سرین زمین پر لگا دے اور رانوں نیز پنڈلیوں کو کھڑا کرے اور دونوں ہاتھ زمین پر رکھے۔ یہی بات ابوعبید نے بھی کہی ہے۔

یہ اقعاء نماز میں ممنوع ہے، بلکہ اسے کتے کے بیٹھنے کا انداز کہا گیا ہے۔تشہد میں ایسے بیٹھنے سے نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا ہے، چنانچہ مسند احمد و طیالسی اور مصنف ابن ابی شیبہ میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

’’نَهَانِيْ خَلِيْلِيْ عَنْ اِقْعَاءٍ كَاِقْعَاءِ الْكَلْبِ‘‘[1]

’’مجھے میرے پیارے نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کتے کی طرح اقعاء کر کے بیٹھنے سے منع فرمایا ہے۔‘‘

جبکہ اس اقعاء کی دوسری شکل یہ ہے کہ پیروں کے پنجے زمین پر ہوں اور پاؤں کھڑے ہوں اور آدمی اپنے پاؤں کی ایڑیوں پر سُرین رکھ کر بیٹھے، دوسجدوں کے درمیان والے جلسے میں اور عام حالت میں اس طرح بیٹھنا جائز ہے، جیسا کہ صحیح مسلم و ابوعوانہ اور سنن بیہقی میں ہے:

’’وَهِيَ سُنَّةُ نَبِيِّكَ وَكَانَ ـأَحْيَانًاـ يُقْعِيْ‘‘[2]

’’یہ تمھارے نبیِ اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) کی سنت ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کبھی کبھار اقعاء کر کے بھی بیٹھتے تھے۔‘‘

ایسے ہی صحیح مسلم، سنن ابو داود اور ترمذی میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی اس کا جواز مروی ہے اور انھوں نے اسے سنت قرار دیا ہے۔سنن بیہقی میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے بھی صحیح یا کم ازکم حسن سند سے یہ مروی ہے۔[3]

امام ابو اسحاق حربی نے غریب الحدیث نامی اپنی کتاب میں صحیح سند سے امام طاوس رحمہ اللہ کا قول نقل کیا ہے:

---

[1] صفة صلاة النبي للألباني (ص: ٩٣٠)

[2] صفة صلاة النبي صلی اللہ علیہ وسلم (ص: ٩٠) سلسلة الأحاديث الصحيحة (١/ ٦٦٤)

[3] صفة صلاة النبي و سلسلة الأحاديث الصحيحة أيضاً.

"إِنَّهُ رَأَى ابْنَ عُمَرَ وَابْنَ عَبَّاسٍ يُقْعِيَانِ"[1]

"انھوں نے حضرت ابن عمر اور ابن عباس رضی اللہ عنہم کو اقعاء کرتے دیکھا ہے۔"

غرض کہ یہ بیٹھنے کی چار شکلیں عربوں میں معروف تھیں اور نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بھی مختلف اوقات میں ان مختلف اندازوں سے بیٹھا کرتے تھے۔

آمدم برسرِ مطلب:

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے امام خطابی رحمہ اللہ سے نقل کرتے ہوئے فتح الباری میں لکھا ہے کہ اس طرح پاؤں پر پاؤں رکھ کر لیٹنے کی ممانعت منسوخ ہوچکی ہے یا پھر ممانعت کو اس صورت پر محمول کرنا پڑے گا، جس میں ستر کھلنے کا خدشہ ہو اور جواز کو دوسری باپردہ صورت پر۔ امام بیہقی و بغوی رحمہما اللہ نے بھی اسی جمع و تطبیق کو ہی مانا ہے اور ابن بطال اور ان کے رفقا نے بھی نسخ کے قول ہی کو اختیار کیا ہے، جبکہ حافظ ابن عبدالبر رحمہ اللہ نے شرح الموطا میں لکھا ہے کہ امام مالک رحمہ اللہ پہلے نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مسجد میں پاؤں پر پاؤں رکھ کر لیٹنے کی فعلی حدیث لائے ہیں اور پھر حضرت عمر و عثمان رضی اللہ عنہما کا بھی یہی عمل بیان کیا ہے تو اس سے معلوم ہوتا ہے کہ امام مالک رحمہ اللہ ممانعت والی احادیث کو منسوخ سمجھتے تھے، جب کہ مازری نے سب سے الگ بات کہی ہے کہ یوں لیٹنا نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے خصائص میں سے تھا، عام آدمی کے لیے یہ نہیں ہے۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے اس سلسلے میں بڑا عمدہ محاکمہ کیا اور لکھا ہے کہ خلفاے راشدین رضی اللہ عنہم کا عمل اس بات کی واضح دلیل ہے کہ یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے خصائص میں سے ہرگز نہیں تھا، ورنہ وہ ایسا کبھی نہ کرتے (جبکہ ان سے ایسے بکثرت لیٹنا منقول ہے) اور نسخ کا دعویٰ بھی صحیح نہیں، کیونکہ محض احتمال سے کسی مسئلے کو منسوخ نہیں مانا جا سکتا اور سب سے صحیح تر بات اسے قرار دیا ہے کہ ممانعت کی حدیث اس صورت پر محمول ہوگی، جس میں (گھٹنا کھڑا کر کے اس پر پاؤں رکھنے کے نتیجے میں) ستر کھل جانے کا خدشہ ہو اور جواز کی حدیث اس (پہلی) صورت پر محمول ہوگی، جس میں (پاؤں دراز کر کے ایک کو دوسرے پر رکھنے سے) ستر کھلنے کا اندیشہ نہ ہو۔ امام بیہقی و بغوی رحمہما اللہ اور دیگر محدّثین سے بھی اسی کی تائید نقل کی ہے اور اسے ہی اولیٰ کہا ہے۔ امام خطابی اور امام بغوی رحمہما اللہ نے کہا ہے کہ ان پہلی احادیث میں اس بات کی دلیل پائی جاتی ہے کہ مسجد میں ٹیک لگا کر بیٹھنا اور کسی بھی دیگر انداز سے آرام کرنا جائز ہے۔[2]

---

[1] صفة صلاة النبي و سلسلة الأحاديث الصحيحة أيضاً.

[2] دیکھیں: فتح الباري (١/ ٥٦٣) شرح السنة (٢/ ٣٧٥، ٣٧٦) شرح الزرقاني (١/ ٣٥٣)

پیٹ کے بَل نہ لیٹنا:

مسجد میں سونے اور لیٹنے بلکہ گھر یا کسی بھی جگہ پر لیٹنے اور سونے کے آداب میں سے دوسرا ادب یہ ہے کہ پیٹ کے بل نہ لیٹا جائے، چنانچہ سنن ابو داود ’’كتاب الأدب، باب الرجل ينطبع على بطنه‘‘ میں یعیش بن طخفہ بن قیس الغفاری اپنے والد طخفہ رضی اللہ عنہ کے حوالے سے، ایسے ہی سنن نسائی، ابن ماجہ اور الادب المفرد میں موصولاً اور شرح السنہ بغوی میں تعلیقاً مروی ہے کہ میں مسجد میں پیٹ کے بَل سویا ہوا تھا کہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے میرا پاؤں پکڑ کر ہلاتے ہوئے فرمایا:

’’إِنَّهَا ضَجْعَةٌ يُبْغِضُهَا اللّٰهَ‘‘[1] ’’سونے کا یہ انداز اللہ کو ناراض کرنے والا ہے۔‘‘

جبکہ اس حدیث کی مؤید ایک دوسری حدیث ’’سنن الترمذي، كتاب الأدب، باب ما جاء في كراهية الاضطجاع على البطن‘‘ میں ہے، جس میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں:

’’رَأىٰ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ رَجُلًا مُضْطَجِعًا عَلٰى بَطْنِهِ فَقَالَ: إِنَّ هٰذِهِ ضَجْعَةٌ لَا يُحِبُّهَا اللّٰهُ‘‘[2]

’’نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک آدمی کو پیٹ کے بل لیٹے ہوئے دیکھا تو ارشاد فرمایا: لیٹنے کا یہ انداز ایسا ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے پسند نہیں کرتا۔‘‘

ایک تیسری حدیث سنن ابن ماجہ میں حضرت ابو ذر غفاری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، جس میں وہ فرماتے ہیں:

’’مَرَّ بِيَ النَّبِيُّ ﷺ وَأَنَا مُضْطَجِعٌ عَلٰى بَطْنِيْ فَرَكَضَنِيْ بِرِجْلِهِ وَقَالَ: يَا جُنَيْدِبُ: إِنَّمَا هٰذِهِ ضَجْعَةُ أَهْلِ النَّارِ‘‘[3]

’’نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم میرے پاس سے گزرنے لگے، جبکہ میں پیٹ کے بل لیٹا ہوا تھا،

---

[1] صحيح سنن ابن ماجه (٢/ ٣٠٥) الأدب المفرد (١١٨٧) شرح السنة (٢/ ٣٧٨) أورده الالبانى فى ضعيف أبي داود ولكن صحيح منه الاضطجاع على البطن، ضعيف السنن (ص: ٤٩٥- ٤٩٦) أبو داود مع العون (١٣/ ٣٨٠)

[2] سنن الترمذي مع التحفة (٨/ ٥١) وقال الأرناؤوط في تحقيق شرح السنة (٢/ ٣٧٨): و إسناده صحيح.

[3] صحيح سنن ابن ماجه (٢/ ٣٠٥)

آپ ﷺ نے اپنے پاؤں سے مجھے ہلاتے ہوئے فرمایا: اے جنیدب! لیٹنے کا یہ انداز اہلِ جہنم والا ہے۔‘‘

اسی مفہوم کی ایک اور حدیث الادب المفرد امام بخاری اور سنن ابن ماجہ ہی میں حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ سے بھی مروی ہے، جس میں مذکور ہے:

((فَإِنَّهَا نَوْمَةٌ جَهَنَّمِيَّةٌ)) ’’یہ انداز اہلِ جہنم والا ہے۔‘‘ لیکن اس حدیث کی سند ضعیف ہے۔

غرض کہ مذکورہ صحیح الاسناد تینوں حدیثوں کو سامنے رکھتے ہوئے وہ لوگ (مرد و زن) ذرا اپنے رویے پر نظر ثانی کر لیں، جنھیں پیٹ کے بَل سونے کی عادت ہو چکی ہے اور صحیح سنت طریقہ بتانے پر کسی کا یہ کہنا کہ جی کیا کریں، اب تو عادت ہو چکی ہے، کسی دوسرے طریقے سے نیند ہی نہیں آتی۔ ان کی یہ بات کوئی حیثیت نہیں رکھتی، کیونکہ دو چار دن میں وہ اس بُری عادت کو چھوڑ کر مسنون طریقے سے سونے کی عادت ڈال سکتے ہیں اور دو چار دن کی بے آرامی یقیناً مسلسل غضب الٰہی سے بدرجہا بہتر ہے۔ جہاں بڑے اسی ناجائز طریقے سے سوتے ہوں گے، وہاں یقیناً یہ عادت بچوں میں بھی آ جائے گی، لہٰذا ایسے لوگوں کو سنجیدگی سے اس پر غور کر کے اس قبیح عادت کو فوراً چھوڑ دینا چاہیے اور اگر کہیں بڑوں میں نہیں صرف بچوں میں یہ عادت قدم جما چکی ہے تو والدین کو چاہیے کہ سختی کے ساتھ انھیں اس طرح سونے سے باز کریں، تاکہ عمر بھر کے لیے نہ وہ اللہ کی ناراضی مول لیں، اور نہ عدمِ تربیت کی وجہ سے اس کا تھوڑا بہت حصہ والدین کے کھاتے میں چڑھتا رہے۔ نَسْأَلُ اللّٰهُ الْعَافِيَةَ.

دائیں پہلو پر لیٹنا:

جب سونے کے آداب کا ذکر ہی چل رہا ہے تو یہیں ایک تیسرا ادب بھی ذکر کر دیں، جس کا تعلق بھی پہلے آداب کی طرح ہی نہ صرف مسجد میں سونے سے ہے، بلکہ اپنے گھر یا کسی بھی جگہ سوئیں تو اس ادب کا خیال رکھنا چاہیے، کیونکہ یہ نبیِ اکرم ﷺ کا مسنون و پسندیدہ ادب ہے اور یہ ادب ہے دائیں پہلو پر لیٹنا، چنانچہ صحیح بخاری و مسلم، سنن ابو داود و ترمذی، الادب المفرد، عمل الیوم واللیلۃ نسائی، مسند ابی عوانہ اور مسند احمد میں حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ نبیِ اکرم ﷺ نے مجھ سے مخاطب ہو کر فرمایا:

((إِذَا أَتَيْتَ مَضْجِعَكَ فَتَوَضَّأْ وُضُوءَكَ لِلصَّلَاةِ ثُمَّ اضْطَجِعْ عَلٰى شِقِّكَ الْأَيْمَنِ))

''جب تم سونے کے لیے بستر پر آؤ تو پہلے نماز کے لیے کیے جانے والے وضو کی طرح وضو کرلو اور پھر اپنے دائیں پہلو یا کروٹ پر لیٹ جاؤ۔''

آگے فرمایا کہ یہ دعا کرو:

«اَللّٰهُمَّ أَسْلَمْتُ نَفْسِيْ إِلَيْكَ وَوَجَّهْتُ وَجْهِيْ إِلَيْكَ وَفَوَّضْتُ أَمْرِيْ إِلَيْكَ وَاَلْجَأْتُ ظَهْرِيْ إِلَيْكَ رَغْبَةً وَّرَهْبَةً إِلَيْكَ وَلَا مَلْجَأَ وَلَا مَنْجَأَ مِنْكَ إِلَّا إِلَيْكَ، آمَنْتُ بِكِتَابِكَ الَّذِيْ أَنْزَلْتَ، وَنَبِيِّكَ الَّذِيْ أَرْسَلْتَ»

''اے اللہ! میں نے اپنی جان تیرے سپرد کی اور تیری طرف متوجہ ہوا اور اپنا ہر کام تیرے سپرد کیا اور تیرے عفو و کرم کی رغبت اور تیرے غضب و قہر سے ڈرتے ہوئے، تیرے سہارے کا طلب گار ہوں اور تیرے سوا کوئی ملجا و ماویٰ اور سہارا و آسرا نہیں، میں تیری کتاب پر ایمان لایا جو تو نے نازل کی ہے اور تیرے نبی (حضرت محمد ﷺ) پر ایمان لایا جسے تو نے بھیجا ہے۔''

یہ دعا سکھانے کے بعد آپ ﷺ فرماتے ہیں کہ یہ کلمات تم سوتے وقت بالکل آخر میں کہو:

«فَإِنْ مُتَّ مِنْ لَيْلَتِكَ مُتَّ عَلَى الْفِطْرَةِ»[1]

''اگر تم اسی رات مر گئے تو فطرت پر مر گئے۔''

دائیں ہتھیلی پر اپنا دایاں رخسار رکھنا:

سونے کے آداب میں سے چوتھا ادب یہ ہے کہ جب سونے لگے تو اپنے دائیں پہلو پر لیٹنے کے علاوہ اپنا دایاں رخسار اپنے دائیں ہاتھ کی ہتھیلی پر رکھے، کیونکہ صحیح مسلم، سنن ابی داود و ترمذی، نسائی مصنف ابن ابی شیبہ، سنن ابن ماجہ، مسند ابی یعلی، مسند احمد و بزار، الادب المفرد اور عمل الیوم واللیلۃ ابن السنی میں حضرت براء بن عازب، حضرت حذیفہ بن یمان اور ام المومنین حضرت حفصہ بنت عمر الفاروق رضی اللہ عنہم

[1] مختصر صحيح مسلم للمنذري (١٨٩٦) صحيح البخاري مع الفتح، رقم الحديث (١٣١٥) صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٢١٩) صحيح سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٧٠٣) الأدب المفرد (ص: ٥٣٣، ٥٣٤) عمل اليوم والليلة للنسائي (ص: ٤٦٠، تحقيق الدكتور فاروق حماده طبع مراكش) الكلم الطيب، لابن تيمية بتحقيق الألباني (ص: ٤١) صحيح الأذكار لأبي عبيده عبدالعزيز (ص: ٧١) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٣٨٧٦)

سے مروی ہے:

«إِنَّ النَّبِيَّ ﷺ كَانَ إِذَا أَرَادَ أَنْ يَّرْقُدَ وَضَعَ يَدَهُ الْيُمْنٰى تَحْتَ خَدِّهٖ، ثُمَّ يَقُوْلُ: اَللّٰهُمَّ قِنِي عَذَابَكَ يَوْمَ تَبْعَثُ عِبَادَكَ»[1]

''نبیِ اکرم ﷺ جب سونے لگتے تو اپنا دایاں ہاتھ اپنے رخسار کے نیچے رکھتے اور پھر یہ دعا پڑھتے: اے اللہ! مجھے اس دن کے عذاب سے بچا لینا، جس دن تو اپنے بندوں کو (اُخروی زندگی کے لیے) اٹھائے گا۔''

دعا کرنا:

ان دونوں حدیثوں میں دو آداب کے علاوہ دو دعائیں بھی آ گئی ہیں، جو نبیِ اکرم ﷺ سوتے وقت کیا کرتے تھے، جبکہ اس وقت کے لیے کتنی ہی دیگر دعائیں بھی ہیں، جن میں سے بعض یہ ہیں:

1 صحیح بخاری، سنن ابو داود و ترمذی، عمل الیوم واللیلۃ نسائی اور سنن ابن ماجہ میں حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ نبیِ اکرم ﷺ جب سونے لگتے تو یہ دعا فرمایا کرتے تھے:

«بِاسْمِكَ اللّٰهُمَّ أَمُوْتُ وَأَحْيَا»

''اے اللہ! میں تیرے نام ہی سے مرتا اور جیتا (سوتا اور بیدار ہوتا) ہوں۔''

اور اسی حدیث میں ہے کہ جب آپ ﷺ نیند سے بیدار ہوتے تو یہ دعا فرمایا کرتے تھے:

«اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ أَحْيَانَا بَعْدَ مَا أَمَاتَنَا وَإِلَيْهِ النُّشُوْرُ»[2]

''ہر قسم کی تعریف اللہ کے لیے ہے، جس نے ہمیں موت (نیند) کے بعد زندہ (بیدار) کیا اور (بالآخر) اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔''

یہی الفاظِ دعا (حصہ اول) صحیح مسلم، مسند احمد، عمل الیوم واللیلۃ نسائی میں حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ

---

[1] صحيح سنن أبي داود (٤٢١٨) صحيح سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٧٠٥) عمل اليوم والليلة للنسائي (ص: ٤٤٩، ٤٥٣) صحيح الأذكار (ص: ٧٠) الأدب المفرد (ص: ٥٣٦) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٣٨٧٧) الكلم الطيب (ص: ٣٩) عمل اليوم لابن السني (ص: ٢٦٦، حديث: ٧٣٧) مسند أحمد (٥/ ٣٨٢، ٦/ ٢٨٨)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٣٢٤) صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٢٢٢) صحيح الترمذي، رقم الحديث (٢٧١٨) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٣٨٨٠) عمل اليوم والليلة (ص: ٤٤٧، ٤٤٨) الكلم الطيب (ص: ٣٦) صحيح الأذكار (ص: ٦٩)

سے اور صحیح بخاری، عمل الیوم واللیلۃ نسائی اور بعض دیگر کتب میں حضرت ابو ذر غفاری رضی اللہ عنہ سے بھی مروی ہیں۔[1]

2 صحیح بخاری و مسلم، سنن ابو داود، ترمذی، ابن ماجہ، مسند احمد اور عمل الیوم واللیلۃ نسائی میں ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہر رات جب بستر پر سونے لگتے تو دونوں ہتھیلیوں کو جمع کرتے اور ان میں پھونک مارتے، پھر ان میں (تین سورتیں) ﴿قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ﴾، ﴿قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ﴾ اور ﴿قُلْ أَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ﴾ پڑھتے اور پھر دونوں ہاتھوں کو حتی الامکان اپنے سارے جسم پر پھیرتے تھے، جس کی ابتدا سر اور چہرے سے کرتے، پھر جسم کا جو سامنے کا حصہ ہے، اس پر ہاتھ پھیرتے اور تین مرتبہ ایسا کرتے تھے۔[2]

3 صحیح بخاری شریف کتاب الوکالۃ میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ صدقے کی کھجوروں میں سے کوئی ہر رات کچھ نہ کچھ چُرا کر لے جاتا تھا۔ تیسری رات میں نے اسے پکڑ لیا اور کہا کہ تیرا یہ معاملہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور پیش کروں گا، اس نے کہا: آپ مجھے چھوڑ دیں، میں آپ کو کچھ مفید کلمات بتاتا ہوں۔ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم تو خیر و بھلائی کے بڑے خواہاں و حریص ہوتے تھے، اس نے بتایا کہ جب بستر پر سونے لگو تو آیت الکرسی ﴿اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّوْمُ﴾ آخر تک پڑھ لیا کرو، اللہ کی طرف سے تم پر محافظ مقرر کر دیا جائے گا اور صبح ہونے تک شیطان اور چور تمھارے قریب بھی نہیں پھٹکے گا، اس پر نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«صَدَقَكَ وَهُوَ كَذُوْبٌ، ذَاكَ شَيْطَانٌ»[3]

”اس نے یہ بات سچ کہی ہے، ورنہ وہ خود تو بڑا جھوٹا ہے، وہ شیطان تھا۔“

4 صحیح بخاری و مسلم میں حضرت ابومسعود انصاری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«مَنْ قَرَأَ الْآيَتَيْنِ مِنْ آخِرِ سُوْرَةِ الْبَقَرَةِ فِيْ لَيْلَةٍ كَفَتَاهُ»[4]

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٣٢٥) صحيح مسلم مع شرح النووي (٩/ ١/ ٣٠) عمل اليوم والليلة للنسائي (ص: ٤٤٧، ٤٤٨) صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٢٢٨)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٣١٩) صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٢٢٨) عمل اليوم والليلة (ص: ٤٦٢) الكلم الطيب (ص: ٣٦، ٣٧) صحيح الأذكار (ص: ٦٩)

[3] صحيح البخاري مع الفتح (٤/ ٤٨٧، حديث: ٥٠١٠)

[4] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٠٠٩) مختصر صحيح مسلم للمنذري (٢٠٩٧) الكلم الطيب (ص: ٣٧)

''جس نے رات کو سورۃ بقرہ کی آخری دو آیتیں (سوتے وقت) تلاوت کر لیں، وہ اس کے لیے کافی ہو جاتی ہیں۔''

5 صحیح بخاری و مسلم، سنن ابو داود و ترمذی، مصنف عبدالرزاق اور ابن السنی میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ جگر گوشۂ رسول حضرت فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور ایک خادم کا مطالبہ کیا (اس رات) نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے گھر تشریف لائے جبکہ ہم بستر پر لیٹ چکے تھے اور فرمایا:

«اَلَا أَدُلُّكُمَا عَلٰى مَا هُوَ خَيْرٌ لَكُمَا مِنْ خَادِمٍ؟»

''کیا میں ایک ایسا ذکر نہ بتاؤں جو تمھارے لیے خادم سے بھی بدرجہا بہتر ثابت ہو؟''

پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بتایا کہ سوتے وقت تینتیس مرتبہ سبحان اللہ، تینتیس مرتبہ الحمد للہ اور چونتیس مرتبہ اللہ اکبر کہہ لیا کرو، یہ تمھارے لیے خادم سے بہتر ہوگا۔[1]

گویا گھریلو کام کاج کر کے تھک جانے والی عورتوں بلکہ تمام مرد و زن کے لیے یہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا بتایا ہوا بہترین وظیفہ یا نسخہ ہے۔

6 ایک دفعہ بیدار ہو کر بستر سے اترنا اور پھر سونا:

سونے کے آداب میں سے چھٹا ادب صحیح بخاری و مسلم، سنن ترمذی اور عمل الیوم واللیلۃ ابن السنی میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ جب کوئی شخص نیند سے بیدار ہو کر بستر سے نیچے اترے اور پھر دوبارہ سونے لگے تو بستر کو ذرا جھاڑے۔ اس حدیث میں سونے کے وقت کی ایک دعا بھی ہے، چنانچہ وہ بیان کرتے ہیں کہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جب تم میں سے کوئی شخص اپنے بستر سے اٹھ کر کہیں جائے اور پھر واپس بستر پر آئے تو اسے چاہیے:

''فَلْيَنْفُضْهُ بِصَنِفَةِ إِزَارِهٖ فَإِنَّهٗ لَا يَدْرِيْ مَا خَلَفَهٗ عَلَيْهِ بَعْدَهٗ''

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٣٦٢) صحيح مسلم مع شرح النووي (٩/ ١٧/ ٤٥، ٤٦) صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٢٣٢) صحيح سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٧١٣) عمل اليوم و الليلة (ص: ٤٧٣، ٤٧٤) الكلم الطيب (ص: ٣٨، ٣٩) صحيح الأذكار (ص: ٧٠) حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اس دن سے لے کر میں نے کبھی یہ وظیفہ ترک نہیں کیا، ان سے پوچھا گیا کہ جنگِ صفین جیسی رات بھی نہیں تو انھوں نے فرمایا کہ صفین کی رات بھی نہیں۔

''وہ اپنے بستر کو اپنی چادر (یا کسی کپڑے کے) کونے سے جھاڑ لے، کیونکہ وہ نہیں جانتا کہ اس کے بعد اس کے بستر پر کیا چیز آ گئی ہو (یعنی کوئی زہریلا کیڑا نہ آ گیا ہو)۔''

آگے آپ ﷺ فرماتے ہیں کہ لیٹتے وقت یہ دعا کرنی چاہیے:

«بِإِسْمِكَ رَبِّيْ وَضَعْتُ جَنْبِيْ وَبِكَ أَرْفَعُهٗ فَإِنْ أَمْسَكْتَ نَفْسِيْ فَارْحَمْهَا، وَإِنْ أَرْسَلْتَهَا فَاحْفَظْهَا بِمَا تَحْفَظُ بِهٖ عِبَادَكَ الصَّالِحِيْنَ» [1]

''اے میرے پروردگار! میں نے تیرے نام سے اپنا پہلو بستر پر لگایا ہے اور تیرے فضل و کرم ہی سے اسے اٹھاؤں گا، اگر تو اس عرصے میں میری روح قبض کر لے تو اس پر رحم فرمانا اور اگر تو نے یہ مجھے عطا فرما دی تو پھر اس کی اسی طرح حفاظت فرمانا جیسے تو اپنے نیک بندوں کی حفاظت فرماتا ہے۔''

سابق میں ذکر کی گئی تیسری دعا پر مشتمل حدیث میں بھی بیدار ہونے کی ایک دعا گزری ہے۔ سنن ترمذی کی روایت کے مطابق اس حدیث میں بھی ایک دوسری دعا وارد ہوئی ہے اور ابن السنی میں صرف یہی دعا ہے، چنانچہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جب تم میں سے کوئی شخص بیدار ہو تو وہ یہ دعا کرے:

«اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ عَافَانِيْ فِيْ جَسَدِيْ وَرَدَّ عَلَيَّ رُوْحِيْ وَأَذِنَ لِيْ بِذِكْرِهٖ» [2]

''ہر قسم کی تعریف اللہ کے لیے ہے جس نے مجھے جسمانی طور پر عافیت بخشی ہے اور مجھے میری روح واپس لوٹا دی (بیدار کر دیا) اور مجھے اپنے ذکر کا موقع عطا فرمایا۔''

7 سونے کے آداب میں سے ساتواں ادب یہ ہے کہ آدمی سوتے وقت با وضو ہو اور ذکرِ الٰہی کرتے ہوئے سو جائے۔ ایسا شخص رات کو بیدار ہو کر کوئی بھی دعا مانگے تو اللہ تعالیٰ اس کی دعا کو قبول کرتا ہے، چنانچہ سنن ابو داود، نسائی، ابن ماجہ، مسند احمد اور مسند طیالسی میں حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبیِ اکرم ﷺ نے فرمایا:

«مَا مِنْ مُسْلِمٍ يَبِيْتُ عَلٰى ذِكْرٍ طَاهِرًا فَيَتَعَارَّ مِنَ اللَّيْلِ فَيَسْأَلُ اللّٰهَ تَعَالٰى

[1] صحيح البخاري مع الفتح، رقم الحديث (٧٣٩٣) مختصر صحيح مسلم، رقم الحديث (١٩٠٠) صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٢٢٣) صحيح سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٧٠٧)

[2] صحيح سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٧٠٧) الكلم الطيب (ص: ٣٧، ٣٨) صحيح الأذكار (ص: ٧٠)

خَيْراً مِنْ أَمْرِ الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ إِلَّا أَعْطَاهُ اللّٰهُ إِيَّاهُ ﴾[1]

’’کوئی بھی مسلمان جب وضو کی حالت میں ذکرِ الٰہی کرتا ہوا سو جائے اور رات کے کسی پہر اُٹھ کر دنیا و آخرت کی کسی بھی بھلائی کی کوئی بھی دعا مانگے تو اللہ تعالیٰ اسے وہ چیز عطا فرما دیتا ہے۔‘‘

امام ابوداود نے ایک اور حدیث بھی وارد کی ہے جو صحیحین اور سنن اربعہ سبھی میں ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان فرماتے ہیں:

﴿ إِنَّ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ قَامَ مِنَ اللَّيْلِ فَقَضیٰ حَاجَتَهُ، قَالَ: أَبُوْا دَاوٗدَ: يَعْنِي بَالَ ـ فَغَسَلَ وَجْهَهُ وَيَدَيْهِ ثُمَّ نَامَ ﴾[2]

’’نبیِ اکرم ﷺ رات کو اُٹھے، آپ ﷺ قضاے حاجت (اور بقول امام ابو داود: پیشاب) سے فارغ ہوئے تو آپ ﷺ نے اپنا چہرۂ اقدس اور دونوں ہاتھ دھوئے، اور پھر آپ ﷺ سو گئے۔‘‘

تیسری حدیث صحیح ابن حبان میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے، جس میں نبیِ اکرم ﷺ کا ارشادِ گرامی ہے:

﴿ مَنْ بَاتَ طَاهِراً بَاتَ فِيْ شِعَارِهِ مَلَكٌ، فَلَا يَسْتَيْقِظُ إِلَّا قَالَ الْمَلَكُ: اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِعَبْدِكَ فُلَانٍ فَإِنَّهُ بَاتَ طَاهِرًا ﴾[3]

’’جو شخص با وضو ہو کر سوتا ہے، اس کے شعار میں (یعنی اس کے ساتھ) ایک فرشتہ لگ جاتا ہے اور جب وہ آدمی جاگتا ہے تو وہ فرشتہ دعا کرتا ہے: اے اللہ! اپنے فلاں بندے کی مغفرت فرما، اس نے باوضو ہو کر رات گزاری ہے۔‘‘

اسی موضوع کی ایک چوتھی حدیث طبرانی اوسط میں اور معجم طبرانی کبیر میں بھی حضرت

---

[1] صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٢١٦) مسند أحمد (٥/ ٢٤١) عمل اليوم والليلة للنسائي، رقم الحديث (١١٣٧١) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٣٨٨١) صحيح الجامع (٣/ ٥/ ١٧٧) صحيح الترغيب (١/ ٣١٧، طبع مكتبة المعارف)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٣١٦) سنن أبي داود مع العون (١٣/ ٣٨٧) صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٢١٧)

[3] صحيح الترغيب (١/ ٣١٧، طبع الرياض)

ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے، جس میں وہ کہتے ہیں کہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

«طَهِّرُوْا هٰذِهِ الْأَجْسَادَ، طَهَّرَكُمُ اللّٰهُ فَإِنَّهٗ لَيْسَ مِنْ عَبْدٍ يَبِيْتُ طَاهِرًا إِلَّا بَاتَ مَعَهٗ فِيْ شِعَارِهٖ مَلَكٌ لَا يَنْقَلِبُ سَاعَةً مِنَ اللَّيْلِ إِلَّا قَالَ: اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِعَبْدِكَ فَإِنَّهٗ بَاتَ طَاهِرًا»[1]

''ان اجسام (اپنے بدنوں) کو پاک رکھا کرو، اللہ تمھیں پاک کرلے، جو شخص باوضو ہو کر رات گزارے تو اس کے ساتھ ایک فرشتہ (اس کے شعار میں) رات گزارتا ہے، جب وہ شخص رات کے کسی بھی وقت کروٹ لیتا ہے تو فرشتہ دعا کرتا ہے: اے اللہ! اپنے اس بندے کو بخش دے، کیوں کہ یہ باوضو ہو کر سویا ہے۔''

ان چاروں احادیث سے یہ بات واضح ہوگئی کہ سونے کے آداب میں سے ایک ادب یہ بھی ہے کہ سوتے وقت آدمی باوضو ہو کر اور ذکر و دعا کرتے کرتے سو جائے اور اس ادب پر عمل پیرا ہونے کی بہت ہی زیادہ فضیلت و برکت ہے۔

بیدار ہوتے وقت اور خصوصاً سوتے وقت کے اذکار و وظائف، دعائیں اور فضائل تو بکثرت اور صحیح اسناد پر مشتمل کتبِ حدیث میں مذکور ہیں، لیکن ہم انھی چند اذکار و اوراد پر اکتفا کرتے ہیں۔

آمدم برسرِ مطلب:

مسجد میں سونے کے جواز کا ذکر شروع ہوا تھا تو ساتھ ہی مسجد میں اور عام جگہ پر سونے کے آداب کا ضروری حد تک تذکرہ بھی ہوگیا ہے۔ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ عَلٰى ذٰلِكَ.

عورت کا مسجد میں سونا:

یہاں ہم اس بات کی وضاحت بھی کرتے جائیں کہ مسجد میں سونا چونکہ محض بوقتِ ضرورت ہے، لہٰذا اس معاملے میں حدود سے تجاوز نہ کیا جائے اور دوسری بات یہ کہ جس طرح یہ بوقتِ ضرورت مردوں کے لیے جائز ہے، ایسے ہی عورتوں کے لیے بھی جائز ہے، بشرطیکہ فتنے سے امن اور اس کا مناسب انتظام ہو، جیسا کہ سابق میں ذکر کی گئی مسجدِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی صفائی کرنے والی ایک نیک خاتون کے واقعہ والی حدیث گزری ہے کہ اس کے لیے مسجدِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں خیمہ لگایا گیا تھا، جس میں وہ رہتی تھی۔

[1] صحيح الجامع (٢/ ٤/ ١٥) صحيح الترغيب (١/ ٢٤٥) طبع المكتب الاسلامي.

ایسے ہی اس بات کی دوسری دلیل وہ حدیث ہے جو صحیح بخاری، صحیح ابن حبان اور صحیح ابن خزیمہ میں ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے، جس میں وہ ایک کنیز کا واقعہ اسی کی زبانی بیان کرتی ہیں کہ اسے اس کے آقاؤں نے آزاد کر دیا، لیکن ابھی وہ ان کے پاس ہی تھی کہ ان کی ایک بچی لال رنگ کا ہار پہنے ہوئے آئی اور اس نے وہ کہیں رکھا یا اس سے وہ ہار گر گیا، چیل آئی اور سمجھی کہ شاید گوشت ہے، لہٰذا لے اڑی، ان لوگوں نے اِدھر اُدھر تلاش کرنے کے بعد اس عورت پر الزام لگا دیا کہ اس نے چرایا ہے اور اس کے جسم کے ایک ایک عضو کی تلاشی لی، حتیٰ کہ ستر کی بھی تلاشی لی وہ کہتی ہے:

"فَدَعَوتُ اللّٰہَ أَنْ یُّبَرِّئَنِيْ"

"میں نے اللہ سے دعا کی کہ وہ میری براءت ثابت کرے۔"

چنانچہ وہ کہتی ہے کہ اللہ کی قسم! میں ابھی ان کے پاس ہی کھڑی تھی کہ چیل گزری اور وہ ہار پھینک گئی، جو ان کے عین درمیان آ گرا تو میں نے کہا کہ یہ ہے وہ چیز جس کی چوری کا الزام تم نے میرے سر دھرا تھا اور میں اس سے بَریٔ ہوں، پھر وہ عورت نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئی اور اسلام لے آئی۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں:

﴿ فَکَانَ لَھَا خَبَاءٌ فِي الْمَسْجِدِ أَوْ حَفْشٌ ﴾

"اسے مسجدِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں ایک خیمہ لگا کر دیا گیا تھا یا اس کے لیے ایک چھوٹا سا گھر بنایا گیا تھا۔"

آگے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بتاتی ہیں کہ وہ عورت میرے گھر آتی رہتی تھی اور جب بھی آتی تو یہ شعر ضرور پڑھ کر بیٹھتی:

وَیَوْمُ الْوِشَاحِ مِنْ تَعَاجِیْبِ رَبِّنَا
أَلَا إِنَّہٗ مِنْ بَلْدَۃِ الْکُفْرِ أَنْجَانِيْ

"وہ دن بھی عجائبِ قدرت میں تھا، جس دن ہار کے گم ہونے کا واقعہ رونما ہوا، جو بالآخر مجھے اس کافر ملک سے نجات دلانے (میرے مسلمان ہونے) کا سبب بن گیا۔"

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ جب وہ ہر دفعہ آتے ہی شعر پڑھتی تو ایک دن میں نے اس کی وجہ پوچھ ہی لی تو اس نے مجھے یہ سارا ماجرا کہہ سنایا۔[1]

---

[1] صحیح البخاري (١/ ٥٣٣، ٥٣٤) الإحسان (٤/ ٥٣٥، ٥٣٧) صحیح ابن خزیمة (٢/ ٢٨٦، ٢٨٧)

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جس کا کوئی گھر ٹھکانا نہ ہو، وہ چاہے عورت ہی کیوں نہ ہو، اس کے لیے جائز ہے کہ دوپہر اور رات کو مسجد میں سوئے، اگر مسجد میں اس طرح خیمہ لگا کر رہنے سے کسی بگاڑ کا اندیشہ نہ ہو۔[1]

مسجد میں بے وضو ہونا یا وضو کا ٹوٹنا:

یہاں بعض لوگوں کی ایک غلط فہمی کا ازالہ بھی کرتے جائیں کہ جو لوگ یہ سمجھتے اور کہتے ہیں کہ بلا وضو مسجد میں داخل ہونا یا بے وضو مسجد میں بیٹھنا اور رہنا منع ہے، انھوں نے بے وضو شخص کو جنبی ہی سے ملا دیا ہے، ان کی یہ بات تشدد پر مبنی ہے، کیونکہ مسجد میں کھانے پینے اور خصوصاً سونے کے جواز کا پتا دینے والی احادیث ان کی تردید کر رہی ہیں اور صحیح بخاری میں ان کے اس نظریے کی تردید کے لیے باقاعدہ ایک باب باندھا ہے:

''باب الحدث في المسجد'' یعنی مسجد میں حادث یا بے وضو ہونے کا بیان۔

اس باب کے تحت جو حدیث وارد کی ہے، وہ صحیح مسلم، صحیح ابن خزیمہ، سنن ابو داود و نسائی اور مسند احمد میں بھی ملتے جلتے الفاظ سے ہے، اس میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

«اَلْمَلَائِکَةُ تَصَلِّيْ عَلٰی أَحَدِکُمْ مَا دَامَ فِيْ مُصَلَّاهُ الَّذِيْ صَلّٰی فِیْهِ مَا لَمْ یَحْدُثْ»

''اللہ کے فرشتے تم میں سے جب کوئی جانماز (مسجد) ہی میں رہے، جہاں اس نے نماز پڑھی ہو، اس کے لیے دعاے رحمت کرتے رہتے ہیں اور یہ تب تک ہے جب تک کہ وہ بے وضو نہ ہو جائے۔''

آگے فرمایا کہ فرشتے اس کے لیے دعا کرتے ہیں:

''اَللّٰھُمَّ اغْفِرْ لَهٗ، اَللّٰھُمَّ ارْحَمْهُ''[2]

''اے اللہ! اسے بخش دے۔ اے اللہ! اس پر رحم فرما۔''

---

[1] فتح الباري (۱/ ۵۳۵)

[2] صحیح البخاري (۱/ ۵۳۸) صحیح الجامع (۳/ ٦/ ۲۱) صحیح سنن أبي داود، رقم الحدیث (٤٤٤) صحیح مسلم مع شرح النووي (۳/ ۵/ ۱٦٦) صحیح سنن النسائي، رقم الحدیث (۷۰۷) سنن ابن ماجه، رقم الحدیث (۷۹۹)

لفظِ حدث کی تشریح:

لفظِ حدث کی تشریح صحیح بخاری کے ایک دوسرے مقام یعنی "باب لا تقبل صلاۃ بغیر طهور" کے تحت وارد کی گئی حدیث میں ہے، جو سنن ابو داود، مسند احمد اور مصنف عبدالرزاق میں بھی ہے۔ اس میں خود حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

«لَا تُقْبَلُ صَلَاةُ مَنْ أَحْدَثَ حَتّٰى يَتَوَضَّأَ»

"حادث آدمی کی نماز قبول نہیں ہوتی، جب تک کہ وہ وضو نہ کرلے۔"

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے یہ حدیث بیان کی تو حضر موت کے کسی آدمی نے پوچھا:

"مَا الْحَدَثُ يَا أَبَا هُرَيْرَةَ" "اے ابو ہریرہ! حدث کیا ہے؟

تو انھوں نے جواباً فرمایا:

"فُسَاءٌ أَوْ ضُرَاطٌ"[1] "پھسکی یا گوز (بلا آواز یا آواز کے ساتھ) پیٹ سے ہوا کا اخراج ہونا۔"

تو معلوم ہوا کہ حادث سے مراد محض ہوا کے خروج سے بے وضو والا ہے نہ کہ جنبی شخص۔[2]

مصلّٰی سے مراد:

جس طرح اس حدیثِ اول میں وارد لفظِ حدث کی تشریح دوسری نے کر دی ہے، اسی طرح اس پہلی حدیث میں وارد لفظ "مصلاہ" یعنی جانماز کی تشریح کے لیے بھی ایک دوسری حدیث معاون ہوسکتی ہے، جس سے پتا چلتا ہے کہ یہاں "مصلاہ" سے مراد صرف یہی نہیں کہ نماز پڑھ کر وہ شخص اس جگہ پر ہی بیٹھا رہے، تبھی اس کے لیے یہ فضیلت ہے، بلکہ یہ فضیلت ہر اس شخص کے لیے ہے جو نماز سے فارغ ہو کر مسجد ہی میں رہے، چاہے اپنی نماز کی جگہ سے اُٹھ کر وہ کسی دوسری جگہ ہی کیوں نہ جا بیٹھے، گویا مصلّٰی یا جانماز سے یہاں مراد مسجد ہے اور یہ فضیلت ہر اس شخص کے لیے ہے جو نماز پڑھ کر دوسری نماز کے انتظار میں باوضو بیٹھا رہے، جیسا کہ صحیح بخاری "كتاب الصلاة، باب مَن جلس في المسجد ينتظر الصلاة" میں، ایسے ہی صحیح مسلم، سنن ابو داود اور دیگر کتبِ حدیث

---

[1] صحيح البخاري مع الفتح (١/ ٢٣٤) صحيح الجامع (٣/ ٦/ ١٦٥) صحيح مسلم (٣/ ٥/ ١٦٦) صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٤٦)

[2] دیکھیں: فتح الباري (١/ ٥٣٨، ٥٦٥)

میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ہی سے مروی ہے کہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز کے انتظار میں بیٹھنے والے شخص کی فضیلت بیان کرتے ہوئے فرمایا:

«وَلَا يَزَالُ فِي صَلَاةٍ مَا انْتَظَرَ الصَّلَاةَ»[1]

''وہ شخص جب تک نماز کے انتظار میں رہے گا، وہ ایسے ہی شمار ہوگا جیسے وہ نماز ہی پڑھتا جا رہا ہے۔''

اس حدیث میں ہر اس آدمی کے لیے فضیلت وارد ہوئی ہے، جو نماز کے انتظار میں مسجد میں رہے، وہ اپنی جانماز پر ٹکا رہے یا کچھ اِدھر اُدھر ہو جائے، ایسے ہی اس حدیث اول میں بھی مصلّٰی سے مراد مسجد ہے، جانماز نہیں۔ اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ وضو ختم ہو جانے کے بعد فرشتوں کی دعائیں منقطع ہو جاتی ہیں، اب چاہے وہ اسی جگہ ہی کیوں نہ بیٹھا رہے۔[2]

البتہ مسجد میں دل لگا کر بیٹھے رہنے کا مقام و مرتبہ اپنی جگہ ہے، وہ اسے بے وضو ہونے کی صورت میں بھی حاصل رہے گا۔ یاد رہے کہ مسجد میں ہوتے ہوئے اخراجِ ہوا سے ہر ممکن پرہیز ہی کرنا چاہیے، تاکہ لوگوں کو تکلیف نہ ہو اور تقدس و احترامِ مسجد بھی اسی کا تقاضا کرتے ہیں، لیکن یہ بھی نہیں کہ یہ قطعاً ناجائز و حرام ہے، جیسا کہ مسجد میں سونے کے جواز والی احادیث ہی سے اس کی اباحت و جواز واضح ہے۔ البتہ یہ فعل ناپسندیدہ سا ہے۔ لہٰذا علامہ شیخ ابن باز رحمہ اللہ کی تحقیق اور ابن مسیّب، حضرت حسن بصری اور امام غزالی رحمہم اللہ کے قول کے مطابق زیادہ سے زیادہ اسے مکروہ تنزیہی کہا جا سکتا ہے۔[3]

مسجد میں بے وضو داخل ہونا:

مصنف ابن ابی شیبہ میں حضرت سعید بن مسیّب اور حضرت حسن بصری رحمہما اللہ کے بارے میں مروی ہے کہ انھوں نے بے وضو آدمی کے بارے میں فرمایا:

''يَمُرُّ فِي الْمَسْجِدِ مَارًّا وَلَا يَجْلِسُ فِيهِ»[4]

---

[1] صحيح البخاري (٢/ ١٤٢) صحيح مسلم مع شرح النووي (٣/ ٥/ ١٦٦) صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٦٦) صحيح سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٧١)

[2] دیکھیں: فتح الباري (١/ ٥٣٨)

[3] حاشية فتح الباري (١/ ٥٣٩) إعلام الساجد (ص: ٣٠١۔ ٣٠٤)

[4] إعلام الساجد للزركشي (ص: ٣٠١)

’’وہ مسجد سے گزرتا ہوا نکل جائے، لیکن اس میں بیٹھے نہیں۔‘‘

یہ حکم جیسا کہ ہم ذکر کر چکے ہیں، جنبی والا ہے، جس میں قدرے شدت پائی جاتی ہے، یہاں مسئلہ جائز و ناجائز کا نہیں، بلکہ اولیٰ و غیر اولیٰ کا ہے، جیسا کہ شیخ ابن باز کی تحقیق سے پتا چلتا ہے۔ مسجد میں بے وضو داخل ہونے کے غیر اولیٰ یا ناپسندیدہ ہونے کی دلیل کے طور پر وہ حدیث پیش کی جاسکتی ہے، جو صحیحین، سنن اربعہ، صحیح ابی عوانہ، سنن دارمی، بیہقی، موطا امام مالک اور مسند احمد میں حضرت ابو قتادہ رضی اللہ عنہ سے اور سنن ابن ماجہ میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، جس میں ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے:

((إِذَا دَخَلَ أَحَدُكُمُ الْمَسْجِدَ فَلَا يَجْلِسُ حَتّٰى يُصَلِّيَ رَكْعَتَيْنِ)) [1]

’’تم میں سے جب کوئی شخص مسجد میں داخل ہو تو وہ دو رکعتیں پڑھے بغیر نہ بیٹھے۔‘‘

جب مسجد میں داخل ہونے والا نماز پڑھنے پر مامور ہے تو وہ نماز کی شرط یعنی وضو پر بھی مامور ہوگا، لہٰذا باہر سے مسجد میں داخل ہونے والے کے لیے وضو کی اہمیت اس شخص کی نسبت زیادہ ہے جو باوضو مسجد میں گیا اور تا دیر مسجد میں بیٹھا رہا اور کسی وقت اس کا وضو ٹوٹ گیا، کیونکہ ایسا شخص دو رکعتوں پر مامور نہیں ہے۔

غرض کہ تقدس و احترام مسجد کی خاطر باوضو ہو کر مسجد میں داخل ہونا اور با وضو ہی رہنے کی کوشش کرنا افضل ہے، ورنہ بے وضو کے لیے عدمِ جواز والی کوئی بات نہیں ہے، کیونکہ اصحابِ صفہ تو مسجد میں سویا کرتے تھے۔ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ.

جو شخص باہر سے مسجد میں جائے اور چلتے چلتے کسی کو دیکھ کر نکل آنا ہو تو اسے وضو کرنے نہ کرنے میں اختیار ہے، اگرچہ ابو داود کے الفاظ کی رُو سے تو یہ گنجایش بھی نہیں ملتی، کیونکہ اس میں ہے:

((ثُمَّ لِيَقْعُدْ بَعْدُ إِنْ شَآءَ أَوْ لِيَذْهَبْ لِحَاجَتِهٖ)) [2]

’’پھر وہ چاہے تو مسجد میں بیٹھ رہے یا اپنے کام سے چلا جائے۔‘‘

لیکن اگر بیٹھنے کا خیال نہیں تو رعایت ہوسکتی ہے، البتہ جو مسجد میں جا کر کسی وجہ سے کچھ بیٹھنا

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٤٤) صحيح مسلم مع شرح النووي (٣/ ٥/ ٢٢٥) صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٤٢) صحيح الترمذي، رقم الحديث (٢٦١) صحيح سنن النسائي، رقم الحديث (٧٠٨) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٠١٢) موطا الإمام مالك (١/ ١٦٢، رقم الحديث: ٥٧)

[2] إعلام الساجد للزركشي (ص: ٣٠١۔ ٣٠٤) حاشية فتح الباري بإشراف شيخ ابن باز (١/ ٥٣٩)

بھی چاہے تو افضل و احوط یہی ہے کہ وہ وضو کر کے مسجد میں داخل ہو، اس طرح مسجد میں بے وضو داخل ہونے اور مسجد میں داخل ہو کر بے وضو ہو جانے کے مابین کچھ فرق بھی ہو جاتا ہے۔[1]

مسجد میں غیر مسلم (مشرک) کا داخل ہونا:

یہاں ایک اور بات بھی ذکر کرتے جائیں کہ ہمارے بعض لوگ کسی غیر مسلم کو کہیں کسی مسجد میں دیکھ لیں تو وہ سخت سیخ پا ہو جاتے اور سمجھتے ہیں کہ یہ کوئی انہونی بات ہوگئی ہے اور ان کی یہ غیرت دراصل مسئلہ سے عدمِ واقفیت کا نتیجہ ہے، ورنہ حقیقت یہ ہے کہ کسی غیر مسلم و مشرک یعنی ہندو، سکھ اور عیسائی کے مسجد میں داخل ہو جانے سے کوئی فرق نہیں پڑتا، کیونکہ غیر مسلم کو خود نبیِ اکرم ﷺ کا مسجد میں داخل کرنا ثابت ہے۔ رہی یہ بات کہ یہ لوگ نجس ہوتے ہیں تو اس میں کوئی شک نہیں، لیکن ان کی نجاست حکمی ہوتی ہے، حسی نہیں، پھر ان کے اہلِ کتاب یا غیر اہلِ کتاب ہونے کا بھی کوئی فرق نہیں، کیونکہ ہر دو کا داخلہ ثابت ہے۔

غرض کہ اس سلسلے میں جمہور اہلِ علم کا مسلک تو یہی ہے جو ابھی ہم نے ذکر کیا ہے، البتہ ائمہ وفقہا کے اقوال میں تھوڑا تھوڑا فرق ہے، مثلاً احناف تو مشرکین یا کفار کے مسجد میں داخلے کے مطلقاً جواز کے قائل ہیں۔ امام مالک، فقہاے مالکیہ، بعض اہلِ ظاہر اور شوافع میں سے مزنی مطلقاً ممانعت کے قائل ہیں۔ عام شافعیہ مسجدِ حرام (مکہ مکرمہ) اور دیگر مساجد کے مابین فرق کرتے ہیں کہ اس میں تو کوئی غیر مسلم داخل نہیں ہوسکتا، دوسری مساجد میں داخل ہو جائے تو کوئی حرج نہیں ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ کتابی و غیر کتابی میں فرق ہونا چاہیے کہ جو اہلِ کتاب میں سے ہو، اس کے داخلے میں مضائقہ نہیں اور غیر اہلِ کتاب کا داخلہ جائز نہیں ہے۔[2]

جبکہ جواز و عدمِ جواز اور قائلینِ فرق و عدمِ فرق والے سبھی اہلِ علم کے پاس دلائل بھی ہیں۔ جن کا جائزہ لیا جائے تو جمہور اہلِ علم والا پہلا مسلک یعنی جواز ہی ثابت ہوتا ہے، چنانچہ اس سلسلے میں اختلافِ رائے کا بنیادی سبب غیر مسلم کی نجاستِ حکمی یا نجاستِ حسی میں اختلاف ہے۔ یہی وجہ ہے کہ غیر مسلم کے مسجد میں داخل ہونے کے جواز اور عدمِ جواز کے بارے میں ائمہ وفقہا کی مختلف آرا ہیں۔

---

[1] صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٤٣)

[2] فتح الباري (١/ ٥٦٠) نيل الأوطار (١/ ١/ ٣٦، ٣٧، طبع الرياض)

مانعین کے دلائل:

امام مالک، فقہاے مالکیہ، بعض اہلِ ظاہر اور شافعیہ میں سے امام مزنی رحمہ اللہ مشرک و غیر مسلم کے مسجد میں داخلے کو جائز نہیں سمجھتے۔ ان کا استدلال ایک تو اس آیت سے ہے، جو سورت توبہ میں ہے، جس میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے:

﴿ يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّمَا الْمُشْرِكُوْنَ نَجَسٌ فَلَا يَقْرَبُوا الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ بَعْدَ عَامِهِمْ هٰذَا﴾ [التوبة: ٢٨]

''اے ایمان والو! مشرکین نجس ہیں، اس سال کے بعد وہ دوبارہ کبھی بھی مسجدِ حرام کے قریب نہ آنے پائیں۔''

مشرکین چونکہ بیت اللہ شریف کے حج کے لیے آتے تھے تو اپنے ساتھ غلہ اور دیگر تجارتی سامان بھی لاتے تھے، جس سے اہلِ مکہ کو بہت فائدہ ہوتا تھا، لیکن جب ان کے مسجد حرام کے قریب آنے کی ممانعت کر دی گئی تو فطری بات تھی کہ مسلمانوں کو ان اشیا کی قلت کا خدشہ اور فقر و فاقہ کا اندیشہ ہوا تو ان کے اس وہم کو دور کرنے کے لیے اس آیت کا آخری حصہ بھی اللہ تعالیٰ نے نازل فرمایا، جس میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَ اِنْ خِفْتُمْ عَيْلَةً فَسَوْفَ يُغْنِيْكُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖٓ اِنْ شَآءَ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ﴾ [التوبة: ٢٨]

''اور اگر تمھیں فقر و تنگدستی کا خدشہ ہے تو (فکر مند مت ہوئیے) عنقریب تمھیں اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے غنی و مالدار کر دے گا، اللہ بڑا علم و حکمت والا ہے۔''

اس آیت کے الفاظ: ﴿ اِنَّمَا الْمُشْرِكُوْنَ نَجَسٌ﴾ ''مشرکین نجس ہیں۔'' انھیں بنیاد بنا کر کہا گیا ہے کہ کسی مشرک کو مسجد میں داخل کرنا جائز نہیں ہے۔ اسی آیت کے ان اور ان سے اگلے الفاظ: ﴿فَلَا يَقْرَبُوا الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ بَعْدَ عَامِهِمْ هٰذَا﴾ [التوبة: ٢٨] ''اس کے بعد وہ مسجد حرام کے قریب نہ آئیں۔'' سے یہ استدلال کیا گیا ہے کہ دیگر مساجد میں داخل ہوں تو ہوں، مسجدِ حرام (مکہ مکرمہ) میں ان کا داخلہ ہرگز جائز نہیں ہے۔

مانعین کی دوسری دلیل ایک حدیث کا مفہوم ہے، جو صحیح مسلم، سنن ابو داود، نسائی و ابن ماجہ اور

مسند احمد و بعض دیگر کتبِ حدیث میں حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ وہ راستے میں نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے روبرو ہوئے، لیکن ایک طرف کھسک گئے اور جا کر غسل کیا پھر حاضرِ خدمت ہوئے اور عرض کی کہ میں جنابت سے تھا (یعنی مجھ پر فرض غسل ابھی باقی تھا) تو نبیِ اکرم رضی اللہ عنہما صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«اَلْمُسْلِمُ لَا یَنْجُسُ» [1] ''مسلمان نجس و ناپاک نہیں ہوتا۔''

ایسی ہی ایک حدیث صحیحین، سنن اربعہ، مسند احمد اور بعض دیگر کتب میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے بھی مروی ہے، جس میں وہ اپنا واقعہ بیان کرتے ہیں کہ مدینہ طیبہ کے راستوں میں سے کسی جگہ میرا سامنا نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ہوگیا، لیکن میں چپکے سے ایک طرف نکل گیا، جا کر غسل کیا اور پھر حاضرِ خدمت ہوا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا:

«أَیْنَ کُنْتَ یَا أَبَا هُرَیْرَةَ ...؟» ''اے ابوہریرہ رضی اللہ عنہ تم کہاں تھے؟''

تو میں نے عرض کیا:

''کُنْتُ جُنُبًا، فَکَرِهْتُ أَنْ أُجَالِسَكَ وَأَنَا عَلٰی غَیْرِ طَهَارَةٍ''

''میں جنابت سے تھا تو مجھے اچھا نہیں لگا کہ میں پاک ہوئے بغیر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں بیٹھوں۔''

تو نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

«سُبْحَانَ اللّٰهِ! إِنَّ الْمُؤْمِنَ لَا یَنْجُسُ» [2]

''اللہ پاک ہے! بے شک مومن نجس و ناپاک نہیں ہوتا۔''

ان احادیث کا منطوق تو یہ ہے کہ مومن و مسلم ناپاک نہیں ہوتا، جبکہ ان کا مفہوم مخالف یہ بھی بنتا ہے کہ غیر مسلم نجس ہوتا ہے، اسی مفہوم مخالف کو دلیل بنا کر مالکیہ وغیرہ نے کافر و مشرک کے مسجد میں داخل ہونے کو منع قرار دیا ہے۔

---

[1] صحیح مسلم مع شرح النووي (٢/ ٤/ ٦٧) صحیح سنن أبي داود، رقم الحدیث (٢١١) صحیح سنن النسائي، رقم الحدیث (٢٥٨، ٢٥٩) المنتقی مع نیل الأوطار (١/ ١/ ٣٦، ١٠١، ١٠٢)

[2] صحیح البخاري (٢٨٥) صحیح مسلم مع شرح النووي (٢/ ٤/ ٦٧) صحیح سنن أبي داود، رقم الحدیث (٢١٢) صحیح الترمذي، رقم الحدیث (١٠٥) صحیح سنن النسائي، رقم الحدیث (٢٦٠) سنن ابن ماجه، رقم الحدیث (٥٣٤)

ایسے ہی ان کی چوتھی دلیل وہ حدیث ہے، جس میں بنی ثقیف کے وفد کی آمد کا ذکر ہے۔ انھیں جب نبیِ اکرم ﷺ نے مسجد میں بٹھایا تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو تعجب ہوا اور انھوں نے کہا:

''قَوْمٌ أَنْجَاسٌ ؟!''[1] ''یہ تو نجس لوگ ہیں!''

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ان الفاظ سے بھی وہ استدلال کرتے ہیں، حالانکہ ان کے اس استدلال کا جواب خود اسی حدیث ہی میں موجود ہے، جسے ہم آگے چل کر ذکر کرنے والے ہیں۔

وہ ایک اور حدیث سے بھی استدلال کرتے ہیں، جو صحیح بخاری و مسلم، سنن ابو داود و ترمذی اور مسند احمد میں حضرت ابو ثعلبہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، جس میں وہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے نبیِ اکرم ﷺ کی خدمت میں عرض کی کہ ہم اہلِ کتاب کے علاقے میں رہتے ہیں اور انھی کے برتنوں میں کھاتے پیتے ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا:

«إِنْ وَجَدْتُمْ غَيْرَهَا فَلَا تَأْكُلُوا فِيهَا، وَإِنْ لَّمْ تَجِدُوا، فَاغْسِلُوهَا وَكُلُوا فِيهَا»[2]

''اگر تمھیں دوسرے برتن مل سکتے ہوں تو ان کے برتنوں میں مت کھاؤ اور اگر دوسرے برتن نہ ملیں تو انھی کے برتنوں کو دھو لو اور ان میں کھا پی لو۔''

سنن ابو داود اور مسند احمد میں یہ بھی مروی ہے کہ حضرت ابو ثعلبہ رضی اللہ عنہ نے بتایا:

''إِنَّهُمْ يَأْكُلُونَ لَحْمَ الْخِنْزِيرِ وَيَشْرَبُونَ الْخَمْرَ''[3]

''وہ لوگ خنزیر کھاتے اور شراب پیتے ہیں۔''

اُن کے نزدیک برتنوں کو دھونے کا حکم دیا جانا ان کے نجس ہونے کی وجہ سے ہے، حالانکہ ایسا نہیں ہے۔

قائلینِ جواز کا مانعین کو جواب اور دلائلِ جواز:

جمہور اہلِ علم جو غیر مسلم کے مسجد میں داخلے میں کوئی حرج نہیں سمجھتے، وہ ان مانعین کا یہ جواب دیتے ہیں:

---

[1] نيل الأوطار (١/ ١/ ٢٠، طبع دار التراث)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٤٧٨، ٥٤٨٨، ٥٤٩٦) صحيح مسلم مع شرح النووي (٧/ ١٣/ ٧٩) صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٢٥٢) صحيح الترمذي، رقم الحديث (١٢٦٥) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٣٢٠٧) مسند أحمد (٤/ ١٩٣۔ ١٩٥) المنتقى (١/ ١/ ١٠١)

[3] صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٢٥٢) مسند أحمد (٤/ ١٩٣۔ ١٩٥) والمنتقى أيضاً.

1 پہلی بات تو یہ ہے کہ مشرک کی نجاست سے مراد یہ ہے کہ وہ عقیدے کے اعتبار سے اور حکماً نجس ہے، حسی طور پر یا جسماً نجس و ناپاک نہیں ہے۔ آیت کی اس تاویل کے صحیح ہونے کے لیے ان کی دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سورت مائدہ کے شروع میں اور خاص کر اس کی پانچویں آیت میں جن عورتوں سے نکاح جائز ہے، ان کا تذکرہ کیا ہے اور فرمایا ہے:

﴿ وَ الْمُحْصَنٰتُ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ ﴾ [المائدۃ: ٥]

''اور ان لوگوں کی پاکدامن عورتیں جنھیں تم سے پہلے کتاب دی گئی تھی (تمھارے لیے حلال ہیں)۔''

تو اہلِ کتاب کی عورتوں کا مسلمانوں کے لیے اپنے نکاح میں لینا مباح کیا گیا ہے اور ظاہر ہے کہ ان سے نکاح کر کے یہ تو ناممکن ہے کہ ایسی عورت کے شوہر کو اس کا پسینا کبھی نہ لگے گا، لیکن اس کے باوجود ایسا کوئی حکم نہیں کہ ایسی عورت کا شوہر محض اس کا پسینا لگنے ہی سے غسل کرتا پھرے، بلکہ اس کے شوہر کو بھی انھی اسباب پر غسل کا حکم ہے، جن پر ایک مسلمان عورت کے شوہر کو ہے، تو معلوم ہوا کہ غیر مسلم کا پسینا وغیرہ نجس نہیں ہے اور نہ وہ خود نجس العین ہیں، بلکہ ان کی نجاست حکمی ہے نہ کہ حسی۔ یہی بات مسلمانوں کے لیے اہلِ کتاب کے کھانے کے حلال ہونے سے متعلق بھی اخذ کی جا سکتی ہے، کیونکہ سورت مائدہ میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ وَ طَعَامُ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حِلٌّ لَّكُمْ ﴾ [المائدۃ: ٥]

''اور اہلِ کتاب کا کھانا تمھارے لیے حلال کیا گیا ہے۔''

لہٰذا جب ان کی عورتیں حلال ہیں اور کھانا حلال ہے تو پھر وہ خود نجس العین کیسے ہو سکتے ہیں؟ بلکہ ان کی نجاست حکمی ہے، حسی نہیں۔ یہی جواب کہ مشرکین نجس و ناپاک تو ہیں، لیکن ان کی نجاست حکمی ہے، حسی نہیں، ان کی دوسری اور تیسری دلیل والی دونوں احادیث کا بھی ہے۔

2 اب رہا معاملہ وفدِ ثقیف کو نبیِ اکرم ﷺ کے مسجد میں بٹھانے کا تو وہ واقعہ مانعین کے حق میں نہیں، بلکہ ان کے خلاف جاتا ہے، کیونکہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے جب دیکھا کہ نبیِ اکرم ﷺ نے انھیں اپنی مسجد میں بٹھایا ہے تو تعجب کیا اور کہا:

''قَوْمٌ أَنْجَاسٌ!'' ''یہ نجس لوگ ہیں!''

اگر یہ بات یہیں پر ختم ہوجاتی تو پھر واقعی مانعین کی کوئی بات بن جاتی، لیکن ایسا نہیں ہوا، بلکہ نبیِ اکرم ﷺ نے انھیں جواب دیتے ہوئے فرمایا تھا:

«إِنَّمَا أَنْجَاسُ الْقَوْمِ عَلٰی أَنْفُسِهِمْ»[1]

''ان کی نجاست کا وبال ان کی اپنی جانوں پر ہے۔''

آپ ﷺ کے ارشادِ گرامی کے یہ الفاظ اس کی صریح دلیل ہیں کہ آپ ﷺ نے ان سے حسی نجاست کی نفی فرما دی جو محلِ نزاع ہے اور واضح فرما دیا کہ ان کی نجاست حکمی و معنوی ہے، یعنی عقیدے کی نجاست وغیرہ ہے، حسی و جسمانی نجاست نہیں۔

3 رہا کفار و مشرکین کے برتنوں کو دھونے کے حکمِ نبوی ﷺ سے مانعین کا یہ استدلال کرنا کہ وہ نجس ہیں، لہٰذا ان کا مسجد میں داخل ہونا جائز نہیں تو قائلینِ جواز ان کی اس دلیل کا جواب یہ دیتے ہیں کہ نبیِ اکرم ﷺ نے اہلِ کتاب کے علاقے میں رہنے والے صحابہ کو ان کے برتن دھو کر استعمال کرنے کا حکم اس لیے نہیں فرمایا تھا کہ وہ برتن ان کی رطوبتوں سے نہیں بچ پاتے اور نہ یہ تھا کہ وہ نجس عین ہیں، لہٰذا ان کی رطوبت بھی نجس ہے اور ان کے برتن ناپاک ہیں، اس لیے انھیں حکم دیا گیا کہ ان کے استعمال شدہ یا جھوٹے برتنوں کو دھو لیا کرو، ایسا نہیں ہے، بلکہ ان کے برتنوں کو استعمال کرنے کے لیے انھیں دھونے کا حکم اس بنا پر فرمایا تھا کہ وہ لوگ اپنے برتنوں میں خنزیر کا گوشت پکاتے اور شراب پیتے ہیں، جیسا کہ سنن ابو داود و مسند احمد کی روایت میں اس صحابی رضی اللہ عنہ کے بیان سے واضح ہے:

«إِنَّ أَرْضَنَا أَرْضُ أَهْلِ الْكِتَابِ، وَإِنَّهُمْ لَيَأْكُلُوْنَ لَحْمَ الْخِنْزِيْرِ، وَيَشْرَبُوْنَ الْخَمْرَ فَكَيْفَ نَصْنَعُ بِآنِيَتِهِمْ وَقُدُوْرِهِمْ؟»

''ہم اہلِ کتاب کے علاقے میں رہتے ہیں اور وہ لوگ خنزیر کا گوشت کھاتے اور شراب پیتے ہیں، ہم ان کے برتنوں اور ہنڈیوں کو کس طرح استعمال میں لایا کریں؟''

گویا ان کے برتنوں کو دھونے کا حکم ان لوگوں کے نجس ہونے کی وجہ سے نہیں، بلکہ ان کے نجس و حرام اشیا کھانے پینے کی وجہ سے تھا، تاکہ ان کے برتنوں سے ان حرام اشیا کے اثرات دھو کر

---

[1] نیل الأوطار (۱/ ۱/ ۳۷)

زائل کر لیے جائیں، اس پر مستزاد یہ کہ سنن ابو داود، مسند احمد اور مصنف ابن ابی شیبہ میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ہم نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی معیت میں غزوات میں شریک ہوتے تھے اور مشرکین کے برتن و مشکیزے پاتے اور انھیں اپنے استعمال میں لاتے تھے۔

”وَلَا یَعِیبُ ذٰلِكَ عَلَیْھِمْ“

”نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم یہ بات ان کے لیے معیوب قرار نہیں دیتے تھے۔“

اس سے بھی پتا چلتا ہے کہ مشرکین نجس العین نہیں ہوتے کہ ان کا مسجد میں داخلہ ناجائز ہو، پھر اگر ان کے برتنوں کو دھونے کا حکم ان لوگوں کے نجس العین ہونے کی وجہ سے ہوتا تو پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے برتنوں کے علاوہ دوسرے برتنوں کے عدمِ وجود کی شرط عائد نہ فرماتے، یعنی ”اِنْ لَّمْ تَجِدُوْا غَیْرَھَا...“ نہ فرماتے کہ اگر تمھیں دوسرے کوئی برتن نہ ملیں، تب ان کے برتنوں کو دھو کر استعمال کر لو، کیونکہ نجاست نہ لگے برتن اور نجاست زائل کر کے پاک کیے گئے برتن میں باہم کوئی فرق ہی نہیں ہے۔ وہ پاک ہے اور یہ پاک کر لیا گیا ہے، پھر ان کے برتنوں کے سوا کسی دوسرے برتن کے عدمِ وجود کی کا کیا معنیٰ ہوا؟

یہ دراصل ان سے نفرت دلانے کے لیے تھا کہ وہ عقیدتاً اور معنوی طور پر ناپاک و نجس ہیں نہ یہ کہ وہ جسماً اور حسی طور پر ناپاک و نجس ہیں۔[1]

4 مانعین کی طرف سے جو سورت توبہ کے الفاظ ﴿اِنَّمَا الْمُشْرِكُوْنَ نَجَسٌ﴾ [التوبۃ: ۲۸] اور ایسے ہی ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم: «إِنَّ الْمُسْلِمَ لَا یَنْجُسُ» ”کہ مسلمان نجس نہیں ہوتا۔“

نیز فرمانِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم: «سُبْحَانَ اللّٰهِ إِنَّ الْمُؤْمِنَ لَا یَنْجُسُ» ”اللہ پاک ہے، مومن نجس نہیں ہوتا۔“

اس کے مفہومِ مخالف سے جو استدلال کیا جاتا ہے کہ کافر و مشرک نجس ہیں تو مسجد میں کافر و مشرک کے داخلے کو جائز قرار دینے والے اس کا چوتھا جواب یہ بھی دیتے ہیں کہ یہ لوگوں کے دلوں میں ان سے نفرت پیدا کرنے اور ان کی اہانت واضح کرنے کے لیے ہے نہ کہ ان کے نجس العین ہونے کی وجہ سے۔ اس کے ان سے نفرت و اہانت کے لیے ہونے کا قرینہ بھی موجود ہے، جو کئی ایک احادیث اور واقعات سے ظاہر ہے۔

---

[1] فتح الباري (۹/ ۵۲۱) نیل الأوطار (۱/ ۱/ ۱۰۲)

① صحیح بخاری و مسلم اور دیگر کتبِ حدیث میں نبیِ اکرم ﷺ کے بارے میں مذکور ہے:
((إِنَّهُ تَوَضَّأَ مِنْ مَّزَادَةِ مُشْرِكَةٍ)) [1]
''آپ ﷺ نے مشرک عورت کے مشکیزے سے وضو فرمایا۔''

② ایسے ہی امیر المومنین حضرت عمرِ فاروق رضی اللہ عنہ کے بارے میں بھی صحیح بخاری میں تعلیقاً اور مصنف عبدالرزاق، مسند شافعی اور سنن کبریٰ بیہقی میں موصولاً مروی ہے:
''إِنَّهُ تَوَضَّأَ مِنْ جَرَّةِ نَّصْرَانِيَّةٍ'' [2]
''انھوں نے ایک نصرانی عورت کے گھڑے سے وضو کیا۔''

③ سنن ابو داود اور مسند احمد میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبیِ اکرم ﷺ نے بلادِ نصاریٰ سے لایا گیا پنیر تناول فرمایا۔ [3]

④ مسند احمد میں حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں:
''إِنَّ يَهُودِيًّا دَعَا النَّبِيَّ ﷺ إِلٰى خُبُزِ شَعِيرٍ وَإِهَالَةٍ سَنِخَةٍ فَأَجَابَهُ'' [4]
''ایک یہودی عورت نے نبیِ اکرم ﷺ کو جو کی روٹی اور متغیر ہوا والے چکنے سالن (چربی) کی دعوت دی تو آپ ﷺ نے اس کی دعوت قبول فرمائی۔''

⑤ واقعہ مشہور ہے کہ نبیِ اکرم ﷺ نے خیبر کی ایک یہودی عورت کی بکری کا گوشت کھایا، جو اس نے آپ ﷺ کو ہدیتاً دی تھی۔ [5]

⑥ اہلِ کتاب عورت سے شادی و مباشرت کو قرآنِ کریم میں اللہ تعالیٰ کا حلال قرار دینا۔

⑦ اہلِ کتاب کے کھانے کو مسلمانوں کے لیے حلال قرار دینا، جیسا کہ ان دونوں کی حلت کا ذکر سورت مائدہ کی آیت (۵) کے حوالے سے گزرا ہے۔

⑧ صحیح بخاری و مسلم اور صحیح ابن خزیمہ سمیت دیگر کتبِ حدیث میں ملکِ یمامہ کے حاکم اور قبیلۂ بنی حنیفہ

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٤٤) صحيح مسلم مع شرح النووي (٣/ ٥/ ١٩٠، ١٩١) المنتقى مع نيل الأوطار (١/ ١/ ١٠٢)

[2] صحيح البخاري مع الفتح (١/ ٢٩٨، ٢٩٩)

[3] نيل الأوطار (١/ ١/ ٣٧)

[4] المنتقىٰ (١/ ١/ ١٠٢)

[5] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٢٤٩)

کے سردار ثمامہ بن اثال رضی اللہ عنہ کا واقعہ مذکور ہے کہ اسے مسجدِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے ستون کے ساتھ تین دن باندھے رکھا گیا۔[1]

یہ تمام احادیث و واقعات اس بات کا قرینہ ہیں کہ جس آیت اور جن احادیث میں کفار و مشرکین کو نجس کہا گیا ہے، اس سے معنوی یا عقیدے کی نجاست مراد ہے اور ان سے ترکِ موالات کروانا اور نفرت دلانا مقصود ہے، نہ یہ کہ وہ حسی و جسمانی طور پر نجس ہیں۔

اہلِ کتاب و غیر اہلِ کتاب میں عدمِ فرق:

ثمامہ بن اثال رضی اللہ عنہ کے واقعے سے یہ بات بھی واضح ہوگئی کہ اہلِ کتاب اور غیر اہلِ کتاب میں اس معاملے میں کوئی فرق نہیں، بلکہ وہ دونوں یکساں ہیں، کیونکہ ثمامہ بن اثال رضی اللہ عنہ اہلِ کتاب (یہود و نصاریٰ) میں سے نہیں تھے، بلکہ (اس وقت) ایک عام غیر مسلم مشرک تھے۔[2]

امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی صحیح میں باقاعدہ ایک باب باندھا ہے:

"باب دخول المشرك المسجد" "مسجد میں مشرک کے داخلے کا بیان۔"

اس باب کے تحت وہ ثمامہ بن اثال رضی اللہ عنہ والی حدیث ہی لائے ہیں، جس سے ان کے رجحان کا پتا چل رہا ہے کہ ان کے نزدیک بھی غیر مسلم یعنی کافر و مشرک اہلِ کتاب و غیر اہلِ کتاب مسجد میں داخل ہوسکتا ہے۔ امام نووی نے جمہور علماے سلف و خلف سے نقل کیا ہے کہ کافر نجس العین نہیں ہے۔ امام العز بن عبدالسلام کا بھی یہی قول ہے۔[3]

علامہ مقبلی نے "المنار" میں سورت توبہ کی آیت ﴿اِنَّمَا الْمُشْرِكُوْنَ نَجَسٌ﴾ [التوبة: ٢٨] سے کفار کی نجاست پر استدلال کو "وہم" سے تعبیر کیا ہے اور آگے اس کی وضاحت بھی کی اور بتایا ہے کہ یہ تو اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام کو ایک نو ایجاد اصطلاح پر محمول کرنے والی بات ہے، لیکن امام شوکانی رحمہ اللہ نے ان کی اس بات سے کچھ اختلاف کیا ہے، بالکلیہ موافقت نہیں کی۔

ان کا اختلاف یا عدمِ موافقت صرف علت یا سبب سے متعلق ہے، ورنہ اصل مسئلے میں وہ خود

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٦٨، ٤٦٩) صحيح مسلم (٦/ ١٢/ ٨٧- ٨٩) صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (٢٣٣١) صحيح سنن النسائي، رقم الحديث (٦٨٨)

[2] فتح الباري (١/ ٥٦٠)

[3] نيل الأوطار (١/ ١/ ١٠١ و ١/ ١/ ٣٨)

بھی جمہور علما کے ساتھ بلکہ ان کے زبردست حامی اور کفار کے نجس نہ ہونے کے قائل ہیں۔

امام خطابی رحمہ اللہ نے معالم السنن میں مشرک کے دخولِ مسجد کے جواز کو اختیار کرتے ہوئے لکھا ہے کہ وہ بوقتِ ضرورت مسجد میں داخل ہوسکتا ہے، مثلاً اس کا کوئی قرض دار مسجد میں ہو اور باہر نہ نکل رہا ہو تو وہ اندر جا سکتا ہے، ایسے ہی اگر اس نے کوئی کیس قاضی کی عدالت میں دائر کروانا ہو اور قاضی مسجد میں بیٹھا ہو تو اس کے لیے جائز ہے کہ اپنا حق ثابت کرنے کے لیے مسجد میں چلا جائے اور ایسے دیگر امور کے لیے بھی اس کا مسجد میں داخلہ جائز ہے۔[1]

امام خطابی رحمہ اللہ نے یہ بات سنن ابو داود کی اس حدیث کی شرح کے وقت لکھی ہے، جو صحیح بخاری و مسلم میں بھی ہے، جس میں حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ ایک آدمی (جو مشرک و غیر مسلم تھا) اپنے اونٹ پر سوار مسجدِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں آیا اور اپنا اونٹ بٹھا کر پوچھتا ہے کہ تم میں سے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کون ہے؟ جبکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کے مابین ٹیک لگائے بیٹھے تھے، ہم نے اس آدمی سے کہا:

''هٰذَا الْأَبْيَضُ الْمُتَّكِئُ''[2] ''یہی گورے رنگ والے جو ٹیک لگائے بیٹھے ہیں۔''

یہی یا ایسی ہی ایک اور حسن سند والی حدیث بھی سنن ابو داود میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے۔[3] جبکہ اسی باب میں ایک تیسری حدیث حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے بھی مروی ہے، جس میں یہودیوں کے مسجد میں آنے کا ذکر ہے، جبکہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مسجد میں تشریف فرما تھے، لیکن وہ ضعیف حدیث ہے۔[4] البتہ نفسِ مسئلہ چونکہ دیگر احادیث سے ثابت ہے، لہٰذا اس حدیث کی ضرورت ہی کیا ہے؟ محض اس کے ضعف کو واضح کرنا ہمارا مقصود ہے۔

اب رہا مسئلہ کفار و مشرکین اور یہود و ہنود یا نصاریٰ اور سکھوں کے زیرِ تعمیر مسجد میں کام کرنے کا تو معاملہ یہ بھی وہی ہے کہ جب تیار شدہ مسجد میں ان کا داخلہ جائز ہے تو پھر زیرِ تعمیر مسجد میں کیونکر ممنوع ہوگا؟ البتہ اتنا ضرور ہے کہ مسئولین یا انتظامیہ کو چاہیے کہ وہ اس معاملے میں کافی حزم و احتیاط سے کام لے اور اسی بات کو ترجیح دے کہ کسی ایسے کنٹریکٹر کو کام دے، جو خود بھی مسلم ہو، جس کی لیبر

[1] معالم السنن (١/ ١/ ١٢٥، طبع دار الكتب العلمية، بيروت)

[2] سنن أبي داود مع معالم السنن (١/ ١/ ١٢٥) صحيح سنن أبي داود (١/ ٩٦)

[3] صحيح أبي داود (١/ ٩٦، ٩٧) أبو داود مع العون (٢/ ١٥٣)

[4] ضعيف سنن أبي داود (ص: ٤٥، طبع المكتب الإسلامي بيروت)

بھی مسلمانوں پر مشتمل ہو یا کم از کم تعمیرِ مسجد کے لیے مسلمان ہوں، خصوصاً انجینئر وغیرہ نگرانی کرنے والے تو ضرور ہی مسلمان ہوں، کیونکہ بعض دفعہ ایسا بھی ہوا ہے اور اس کی زندہ مثال بھی متحدہ عرب امارات کے شہر ام القیوین میں بنائی گئی ایک بہت بڑی جامع مسجد کی شکل میں موجود ہے، جسے کسی متعصب غیر مسلم نے اپنی نگرانی میں تعمیر کروایا تو اس نے اس مسجد کے بڑے ہال اور دوسرے چھوٹے گنبدوں میں ایسے خبثِ باطن کا اظہار کیا ہے کہ سورج موجود ہو تو آپ مسجد کے چاروں طرف جدھر سے بھی گزریں، مسجد کے گنبدوں کی گولائی اور پینٹنگ ایسی کی ہے کہ سورج کی روشنی سے اس پر عیسائیوں کا مذہبی شعار صلیب یعنی سولی یا کراس بنا رہتا ہے، ایسے لوگوں کی ایسی شیطنت سے بچنے کے لیے ایسے لوگوں کو تعمیرِ مسجد سے دور ہی رکھنا چاہیے۔

مسجد میں رہایش:

اس سلسلے میں ہمارے استاذِ گرامی شیخ الحدیث مولانا حافظ ثناء اللہ مدنی (شیخ الحدیث جامعہ لاہور الاسلامیہ) کا فتویٰ ''الاعتصام'' میں شائع ہوا ہے، جسے یہاں افادۂ عام کے لیے مع الاستفتاء نقل کیا جا رہا ہے۔

سوال:

ایک صاحب نے اپنے مکان کے ساتھ والی جگہ مسجد کے لیے وقف کی اور دوسرے آدمی کو اس مسجد کی تعمیر کے لیے چندہ اکٹھا کرنے کو کہا۔ دوسرے آدمی نے مختلف علاقوں میں جا کر چندہ اکٹھا کیا اور وہاں دو منزلہ مسجد تعمیر کروائی۔ ان دو منزلوں کے درمیان ایک گیلری بھی بنوائی، نیچے والی جگہ اور گیلری مرد حضرات کے لیے اور دوسری منزل عورتوں کے لیے تھی۔ یہ آدمی پہلے کرائے کے مکان میں رہتا تھا، اس نے دوسری منزل جہاں عورتیں نماز ادا کرتی تھیں، انتظامیہ کے افراد کی منت سماجت کر کے دو کمرے بنوائے اور اپنے اہلِ خانہ کے ساتھ پانچ سال سے رہایش پذیر ہے۔ ان صاحب کا مسجد سے آدھ فرلانگ دور اپنا ذاتی مکان ہے (جو کچھ عرصہ ہوا تعمیر کروایا ہے) یہ چار مرلے کا مکان ہے، اس میں ہر قسم کی سہولت موجود ہے، لیکن وہ وہاں جانے کا نام نہیں لیتا۔ اکثر لوگ اس بات پر اعتراض کرتے ہیں تو وہ دلیل میں مسجد کی خدمت کرنے کا بہانہ تراشتا اور کہتا ہے میرے سوا کوئی خدمت نہیں کر سکتا۔

دلچسپی کی بات یہ ہے کہ جو صاحب نماز کی امامت کرواتے ہیں، ان کا بھی مسجد کے محراب کے

ساتھ (پہلی ہی منزل پر) کمرہ ہے، جہاں امام مسجد رہایش پذیر ہیں، اس کے علاوہ پانی، بجلی اور سوئی گیس کے کنکشن بھی اکٹھے ہیں اور وہ مسجد کے چندے سے ادا ہوتے ہیں، جس سے مسجد کا خرچہ زیادہ ہوگیا ہے، اس اکٹھے کنکشن پر اعتراض میں وہ پھر خدمت والی دلیل پیش کرتا ہے۔

قرآن وسنت کی روشنی کے مطابق آپ یہ بتائیں کہ کیا ایسا شخص مسجد کی دوسری منزل پر گھر بنا سکتا ہے یا مسجد میں کوئی اپنے اہلِ خانہ کے ساتھ بغیر کسی مجبوری کے یا ویسے رہایش رکھ سکتا ہے، جن میں لیٹرین بھی شامل ہوتی ہے؟ (ایک سائل)

الجواب بعون الوهاب:

اسلام میں مسجدوں کی طہارت اور صفائی کے بارے میں چونکہ سخت تاکید کی گئی ہے، اس لیے ان میں کوئی ایسا فعل نہیں ہونا چاہیے، جو ان کی عظمت اور آداب واحترام کے منافی ہو یا ان کی شان میں تحقیر وتذلیل کے پہلو کی نشان دہی کرتا ہو۔ صحیح مسلم میں حدیث ہے:

«إِنَّ هٰذِهِ الْمَسَاجِدَ لَا تَصْلُحُ لِشَيْئٍ مِنْ هٰذَا الْبَوْلِ وَلَا الْقَذَرِ وَإِنَّمَا هِيَ لِذِكْرِ اللّٰهِ وَقِرَاءَةِ الْقُرْآنِ»[1]

''مسجدوں میں بول و براز اور نجاست وغیرہ کا پھیلانا درست نہیں۔ یہ تو محض اللہ کی یاد اور قرآن کی تلاوت کے لیے بنائی گئی ہیں۔''

اس بنا پر امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''وَيُكْرَهُ أَنْ يُّجْعَلَ الْمَسَاجِدُ مَقْعَدِ الْحِرْفَةِ كَالْخِيَاطَةِ وَنَحْوِهَا''[2]

''مسجد کو باقاعدہ پیشہ سلائی وغیرہ کے لیے اڈہ بنا لینا غیر درست ہے۔''

البتہ اتفاقی امر کا کوئی حرج نہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے طائف کے دو آدمیوں کو مسجد الرسول صلی اللہ علیہ وسلم میں آوازے لگاتے ہوئے دیکھا تو فرمایا:

''لَوْ كُنْتُمَا مِنْ أَهْلِ الْمَدِيْنَةِ لَأَوْجَعْتُكُمَا''

''اگر تم اہلِ مدینہ سے ہوتے تو اس فعل کے ارتکاب پر میں تمھیں سزا دیتا۔''

نیز احترامِ مسجد کے پیشِ نظر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مسجد کی ایک جانب مجلس بنوائی تھی، اس کا نام

---

[1] مختصر صحيح مسلم للمنذري، رقم الحديث (١٨٦)

[2] المجموع (٣/ ١٩٢)

بٹھا رکھا ہوا تھا، جو گفتگو کرنا چاہتا یا قصیدہ گوئی کا عزم کرتا یا رفعِ صوت کا محتاج ہوتا، اسے وہاں بھیج دیا کرتے تھے۔[1]

صحیح مسلم میں ہے کہ جس نے کسی شخص کو سنا کہ وہ گمشدہ جانور مسجد میں تلاش کر رہا ہے تو جواباً کہنا چاہیے: ''اللہ کرے تجھے یہ جانور نہ مل سکے۔''

''لِأَنَّ الْمَسَاجِدَ لَمْ تُبْنَ لِهٰذَا''[2] ''مسجدیں اس غرض کے لیے تو نہیں بنی ہوئیں۔''

رسول اللہ ﷺ نے مزید فرمایا:

«لَا تُقَامُ الْحُدُوْدُ فِيْ الْمَسْجِدِ وَلَا يُسْتَقَادُ فِيْهَا»[3]

''مسجد میں حد قائم کی جائے اور نہ قصاص لیا جائے۔''

حدیثِ ہذا شواہد کی بنا پر ثابت اور قوی ہے۔[4]

آدابِ مسجد کے پیشِ نظر ہی آپ ﷺ نے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے تمام وہ دروازے جو مسجد کی طرف کھلتے تھے، بند کروا دیے ماسوائے استثنائی صورت کے۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ زیرِ حدیث فرماتے ہیں:

''وَأَنَّ الْمَسَاجِدَ تُصَانُ عَنِ التَّطَرُّقِ إِلَيْهَا لِغَيْرِ ضُرُوْرَةٍ مُّهِمَّةٍ''[5]

مذکورہ احادیث کی روشنی میں بلا تردد یہ کہا جا سکتا ہے کہ مسجد میں رہایش کی صورت میں کئی ایک مسائل کا سامنا کرنے کے علاوہ بے شمار پیش آمدہ ضروریاتِ زندگی سے محفوظ و مصئون نہیں رہا جاسکتا، جن سے مسجد کی صیانت و کرامت کا مجروح ہونا ایک یقینی امر ہے۔ لہٰذا مسجد کی خدمت کو بہانہ بنا کر شرفِ مسجد کو پامال کرنا درست فکر نہیں۔ مسجد کی خدمت باہر رہ کر بھی بطریقِ احسن سرانجام دی جاسکتی ہے، اس میں کون سی شے مانع ہے؟ لہٰذا سوال میں مذکور اشخاص کو مسجد سے علاحدہ مسکن اختیار کرنا چاہیے، یا مسجد سے ملحق ایسی جگہ جس سے احترامِ مسجد میں فرق نہ آئے۔

---

[1] رواه مالك، والبيهقي

[2] صحيح مسلم مع شرح النووي (٣/ ٥/ ٥٤)

[3] صحيح سنن الترمذي، رقم الحديث (١١٣٠) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٢٥٩٩) المستدرك للحاكم (٤/ ٣٦٩) سنن الدارقطني (١٨٤)

[4] تحقيق المشكوة للألباني (١/ ٢٢٩)

[5] فتح الباري (٧/ ١٥)

بالخصوص صاحبِ ملک کو اپنے مکان کی آبادکاری پر توجہ دینی چاہیے، تاکہ اللہ کی عطا کردہ نعمت سے کما حقہ مستفید ہو سکے۔ باقی رہا بلّوں کا معاملہ، سو وہ بجلی میں اشتراک کی صورت میں انتظامیہ کی رضا مندی سے طے پا سکتا ہے، جس پر طرفین کا اتفاق ہو، اس کے مطابق عمل ہوگا۔[1]

مسجد میں قضا اور لعان وغیرہ:

غیر مسلموں کے مسجد میں داخل ہونے کے جواز کا تذکرہ کرتے ہوئے امام خطابی رحمہ اللہ کی معالم السنن شرح سنن ابی داود سے ہم ایک اقتباس ذکر کر چکے ہیں، جس میں انھوں نے مشرک کے بوقتِ ضرورت مسجد میں داخل ہونے کی مختلف صورتیں بیان کی ہیں، جن میں سے ایک یہ بھی ہے کہ غیر مسلم اور مشرک نے کوئی کیس قاضی کی عدالت میں دائر کروانا ہو اور قاضی مسجد میں بیٹھا ہو تو اس مشرک کے لیے جائز ہے کہ وہ اپنے حق کو ثابت کرنے کے لیے مسجد میں داخل ہو۔

امام خطابی رحمہ اللہ کی اس بات پر بادی النظر میں کچھ تعجب ہوتا ہے کہ یہی کیا ضروری ہے کہ وہ مسجد میں جا کر ہی قاضی کے سامنے اپنا مسئلہ رکھ دے؟ وہ تھوڑا انتظار بھی کر سکتا ہے کہ قاضی صاحب مسجد سے نکل آئیں اور جہاں کچہری لگا کر بیٹھیں، وہاں وہ اپنا کیس پیش کرے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ تعجب والی کوئی بات نہیں، کیونکہ سلف صالحین کے عہد میں قاضی حضرات مسجد میں بیٹھ کر فیصلے کیا کرتے تھے اور یہ جائز بھی ہے، البتہ نفاذِ حدود کے لیے مجرم کو مسجد سے نکال لیا جاتا تھا، چنانچہ اس سلسلے میں ”صحیح البخاري، کتاب الأحکام: باب من حکم في المسجد“ میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں:

”أَتٰی رَجُلٌ رَسُوْلَ اللّٰہِ ﷺ وَھُوَ فِيْ الْمَسْجِدِ، فَنَادَاہُ فَقَالَ: یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ! إِنِّيْ زَنَیْتُ، فَلَمَّا شَھِدَ عَلٰی نَفْسِہٖ أَرْبَعًا، قَالَ: أَبِکَ جُنُوْنٌ؟ قَالَ: لَا، قَالَ: اِذْھَبُوْا بِہٖ فَارْجُمُوْہُ“[2]

”نبیِ اکرم ﷺ کی خدمت میں ایک آدمی حاضر ہوا اور آپ ﷺ اس وقت مسجد میں تشریف فرما تھے، اس نے آپ ﷺ کو پکار کر کہا: اے اللہ کے رسول (ﷺ!) مجھ سے زنا کا

[1] الاعتصام (جلد: ۴۴، شمارہ: ۲۰، بابت ماہ: ۱۲ ذوالقعدہ ۱۴۱۲ھ بمطابق ۵ مئی ۱۹۹۲ء)

[2] صحیح البخاري مع الفتح (۱۳/ ۱۵٦)

ارتکاب ہوگیا ہے۔ آپ ﷺ نے اس سے اعراض فرمایا اور جب یکے بعد دیگرے وہ چار مرتبہ اقبالِ جرم کر چکا تو آپ ﷺ نے فرمایا: تم پاگل تو نہیں ہو؟ اس نے کہا: نہیں، تب آپ ﷺ نے فرمایا کہ اسے باہر لے جا کر سنگسار کر دو۔''

''کتاب الحدود باب رجم المحصن'' میں اس حدیث کے آخری الفاظ ہیں:

﴿ وَكَانَ قَدْ أَحْصَنَ ﴾ [1] ''وہ شادی شدہ تھا۔''

کتاب الحدود ہی میں ''باب لا یرجم المجنون والمجنونة'' میں اس حدیث میں یہ بھی ہے کہ نبیِ اکرم ﷺ نے پہلے پوچھا کہ تم پاگل تو نہیں ہو؟ پھر دوسرا سوال یہ بھی فرمایا:

﴿ فَهَلْ أَحْصَنْتَ؟ ﴾ ''کیا تم نے شادی کی ہے؟'' تو اسی نے کہا: ''نعم'' (ہاں)

تب نبیِ اکرم ﷺ نے حکم فرمایا کہ اسے باہر لے جا کر سنگسار کر دو۔ [2]

یہ حضرت ماعز اسلمی رضی اللہ عنہ کا واقعہ ہے، جسے متعدد صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے بیان کیا ہے اور یہی وہ صحابی رضی اللہ عنہ ہیں، جنھوں نے خود حاضر ہو کر اقبالِ جرم کیا۔ عذابِ آخرت کے خوف اور نبیِ اکرم ﷺ کی تربیت کے نتیجے میں دنیا ہی میں سزا بھگت لینے کو ترجیح دیتے ہوئے عرض کی تھی:

''طَهِّرْنِي يَا رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ''

''اے اللہ کے رسول ﷺ! (مجھ پر حد نافذ کر کے) مجھے پاک کر دیجیے۔''

اس واقعے میں یہ بھی ہے کہ آپ ﷺ نے اس سے پوچھا کہ تم نے شراب تو نہیں پی رکھی؟ اس نے کہا: نہیں۔ ایک آدمی نے اُٹھ کر منہ کے قریب سے سونگھ کر بھی تصدیق کی اور یہ بھی پوچھا کہ ممکن ہے تم نے محض بوس و کنار کیا ہو؟ اس نے کہا: نہیں۔ ساتھ سونے اور مباشرت و جماع کی تمام تفصیلات کا اعتراف بھی اس کی زبانی کروا لیا، تا کہ کہیں کسی غلط فہمی میں اتنی بڑی سزا نہ دے دی جائے۔ [3]

مسجد میں قضا یعنی قاضی کا فیصلے صادر کرنا اور کیس کی تحقیق و تفتیش کرنا اس حدیث کے علاوہ بعض دیگر احادیث سے بھی ثابت ہے، چنانچہ ''صحیح البخاري: کتاب الطلاق: باب اللعان''

---

[1] صحیح البخاري مع الفتح (۱۲/ ۱۱۷)

[2] صحیح البخاری مع الفتح (۱۲/ ۱۲۰، ۱۲۱)

[3] اس واقعے کی تفصیلات کتبِ حدیث و شروحِ حدیث خصوصاً فتح الباری (۱۲/ ۱۲۰ تا ۱۲۷) اور دیگر مقامات پر دیکھی جا سکتی ہیں۔

اور ''كتاب الأحكام: باب من قضىٰ، و لاعن في المسجد'' میں حضرت سہل بن سعد رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں:

''إِنَّ رَجُلًا مِّنَ الْأَنْصَارِ جَاءَ إِلَى النَّبِيِّ ﷺ فَقَالَ: أَرَأَيْتَ رَجُلًا وَجَدَ مَعَ امْرَأَتِهِ رَجُلًا، أَيَقْتُلُهُ؟ فَتَقْتُلُوْنَهُ أَمْ كَيْفَ يَفْعَلُ؟''

''انصار میں سے ایک صحابی (حضرت عویمر عجلانی رضی اللہ عنہ) نبیِ اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور پوچھا کہ اگر کوئی شخص اپنی بیوی کے ساتھ کسی دوسرے آدمی کو دیکھے تو کیا وہ اسے قتل کر دے؟ تو پھر آپ ﷺ اسے قتل کر دیں گے یا پھر وہ کیا کرے؟''

نبیِ اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

«قَدْ أَنْزَلَ اللّٰهُ فِيْكَ وَفِيْ صَاحِبَتِكَ فَاذْهَبْ فَأْتِ بِهَا»

''اللہ نے تمھارے اور تمھاری عورت کے بارے میں حکم نازل فرما دیا ہے، جاؤ اسے لے آؤ۔''

حضرت سہل فرماتے ہیں کہ پھر ان دونوں نے نبیِ اکرم ﷺ کے سامنے (مسجد ہی میں) لعان کیا اور میں دیگر صحابہ رضی اللہ عنہم کے ساتھ وہیں موجود تھا۔[1]

لعان:

لعان کیا ہوتا ہے؟ اس کی تعریف یہ ہے کہ شوہر اگر اپنی بیوی پر بدچلنی کا الزام لگائے اور بدکاری پر گواہیاں نہ ہوں تو وہ دونوں اپنے اپنے سچے ہونے کی چار چار قسمیں کھاتے ہیں اور جھوٹے ہونے کی شکل میں اپنے پر لعنت کی پانچویں مرتبہ بد دعا کرتے ہیں، جسے لعان کہا جاتا ہے اور ساتھ ہی طلاق ہوجاتی ہے، اس کی تفصیل کا موقع نہیں، ہاں اس کے احکام کی تفصیلات کتبِ حدیث خصوصاً صحیح بخاری مع الفتح کتاب الطلاق، باب اللعان (۹/ ۴۳۸۔۴۶۴) میں دیکھی جا سکتی ہیں، اس حدیث مذکور سے بھی نبیِ اکرم ﷺ کا مسجد میں فیصلہ صادر فرمانا ثابت ہوتا ہے۔

نبیِ اکرم ﷺ کے علاوہ آپ ﷺ کے خلفاے راشدین رضی اللہ عنہم میں سے حضرت عمرِ فاروق رضی اللہ عنہ کا واقعہ صحیح بخاری میں تعلیقاً مروی ہے، چنانچہ مسجدِ نبوی ﷺ میں ان کے لعان کروانے کے بارے میں امام بخاری رحمہ اللہ ''باب من قضىٰ ولاعن في المسجد'' میں فرماتے ہیں:

---

[1] صحيح البخاري (٩/ ٤٤٦، ٤٥٢ و ١٣/ ١٥٤)

''وَلَاعَنَ عُمَرُ عِنْدَ مِنْبَرِ النَّبِيِّ ﷺ''[1]

''حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے منبرِ رسول اللہ ﷺ کے پاس کھڑے کر کے لعان کروایا۔''

تاریخِ اسلام کے معروف قاضی شریح کے بارے میں صحیح بخاری میں تعلیقاً اور مصنف ابن ابی شیبہ وطبقات ابن سعد میں موصولاً مروی ہے کہ ابو خالد بیان کرتے ہیں:

''رَأَيْتُ شُرَيْحًا يَقْضِيْ فِي الْمَسْجِدِ وَعَلَيْهِ بُرْنُسٌ مِنْ خَزٍّ''[2]

''میں نے قاضی شریح کو دیکھا کہ وہ مسجد میں فیصلے کیا کرتے تھے اور وہ اون اور ریشم سے بنی لمبی ٹوپی پہنے ہوتے تھے۔''

مصنف عبدالرزاق میں امام حکم بن عتیبہ بیان کرتے ہیں:

''رَأَيْتُ شُرَيْحًا يَقْضِيْ فِي الْمَسْجِدِ''[3]

''میں نے قاضی شریح کو مسجد میں فیصلے کرتے دیکھا ہے۔''

امام یحییٰ بن یعمر رحمہ اللہ کے بارے میں صحیح بخاری میں تعلیقاً اور مصنف ابن ابی شیبہ میں موصولاً مروی ہے کہ عبدالرحمٰن بن قیس کہتے ہیں:

''رَأَيْتُ يَحْيٰى بْنَ يَعْمَرَ يَقْضِيْ فِي الْمَسْجِدِ''[4]

''میں نے یحییٰ بن یعمر کو دیکھا ہے کہ وہ مسجد میں بیٹھ کر فیصلے کیا کرتے تھے۔''

امام شعبی رحمہ اللہ کے بارے میں امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی صحیح کے ایک ترجمۃ الباب میں تعلیقاً لکھا ہے:

''وَقَضَى الشَّعْبِيُّ فِي الْمَسْجِدِ''[5]

''امام شعبی رحمہ اللہ نے مسجد میں بیٹھ کر فیصلے کیے۔''

امام شعبی رحمہ اللہ کے اس اثر کو جامع سفیان میں سعید بن عبدالرحمٰن مخزومی نے عبداللہ بن شبرمہ

---

[1] صحيح البخاري (١٣/ ١٥٤)

[2] صحيح البخاري (١٣/ ١٥٤، ١٥٥)

[3] فتح الباري (١٣/ ١٥٥)

[4] فتح الباري (١٣/ ١٥٥)

[5] فتح الباري (١٣/ ١٥٥)

کے طریق سے موصولاً بھی بیان کیا ہے، جس میں ہے:

''رَأَيْتُ الشَّعْبِيَّ جَلَّدَ يَهُودِيًا فِيْ قَرْيَةٍ فِي الْمَسْجِدِ''[1]

''میں نے امام شعبی رحمہ اللہ کو ایک گاؤں کی مسجد میں ایک یہودی کو کوڑے مرواتے دیکھا ہے۔''

مصنف عبدالرزاق میں بھی یہ اثر سفیان کے حوالے سے موصولاً مروی ہے۔[2] کرابیسی نے ابوالزناد کے طریق سے ادب القضاء میں روایت کیا ہے کہ سعد بن ابراہیم، ابوبکر بن محمد بن عمرو بن حزم اور ان کے بیٹے اور محمد بن صفوان اور محمد بن مصعب بن شرحبیل مسجدِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں بیٹھ کر فیصلے کیا کرتے تھے۔ انھوں نے اور بھی بہت سے قضاۃ کے مسجد میں فیصلے کرنے کا تذکرہ کیا ہے۔[3]

صحیح بخاری میں تعلیقاً، لیکن موطا امام مالک میں موصولاً حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ اور عبداللہ بن مطیع کے معاملے میں مروان بن حکم کا فیصلہ بھی ہے، جس میں مروان نے فیصلہ کیا تھا کہ حضرت زید منبرِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس یا اس پر چڑھ کر قسم کھائیں، لیکن انھوں نے اس سے انکار کرتے ہوئے اپنی جگہ پر بیٹھے بیٹھے ہی قسم کھانے پر اصرار کیا تھا۔[4]

ان تمام احادیث و آثار سے امام بخاری رحمہ اللہ نے مسجد میں فیصلے کرنے کے جواز پر استدلال کیا ہے، جبکہ بعض دیگر آثار ایسے بھی ہیں، جن میں مسجد کے ہال سے باہر (مسجد کے صحن) میں بنائی گئی ایک مخصوص جگہ پر بیٹھ کر فیصلے کرنے کا ذکر بھی آیا ہے، جسے ''رَحَبہ'' کہا جاتا تھا، چنانچہ بخاری شریف میں تعلیقاً اور مصنف ابن ابی شیبہ میں موصولاً مثنی بن سعید سے مروی ہے:

''رَأَيْتُ الْحَسَنَ وَزُرَارَةَ بْنَ أَوْفٰى يَقْضِيَانِ فِي الْمَسْجِدِ''[5]

''میں نے حضرت حسن بصری اور زرارہ بن اوفی (رحمہما اللہ) کو دیکھا ہے کہ وہ مسجد میں بیٹھ کر فیصلے صادر کیا کرتے تھے۔''

---

[1] فتح الباري أيضاً.

[2] فتح الباري أيضاً.

[3] فتح الباري (١٣/ ١٥٥)

[4] صحيح البخاري (٥/ ٢٨٤، ٢٨٥ و ١٣/ ١٥٤، ١٥٥) مسجدِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس قسم کھانے کا مطالبہ تاکید کے لیے ہے۔ اس سلسلے میں بعض احادیث و آثار بھی ہیں کہ منبر کے اوپر یا منبر کے پاس جھوٹ بولنا عام مقامات کی نسبت زیادہ گناہ اور دخولِ جہنم کا موجب ہے۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: فتح الباري (٥/ ٢٨٥)

[5] صحيح البخاري مع الفتح (١٣/ ١٥٥)

کرابیسی کی ”أدب القضاء“ میں ایک تیسرے قاضی کا ذکر بھی ہے اور ایک الگ انداز سے، چنانچہ ”أدب القضاء“میں ہے:

”إِنَّ الْحَسَنَ وَزُرَارَةَ وَإِيَاسَ بْنَ مُعَاوِيَةَ كَانُوا إِذَا دَخَلُوا فِي الْمَسْجِدِ لِلْقَضَاءِ صَلُّوا رَكْعَتَيْنِ قَبْلَ أَنْ يَجْلِسُوا“[1]

”حضرت حسن اور زرارہ اور ایاس بن معاویہ رحمہم اللہ جب فیصلہ کرنے کے لیے مسجد میں داخل ہوتے تو وہ بیٹھنے سے پہلے دو رکعتیں پڑھا کرتے تھے۔“

ان سب آثار سے معلوم ہوا کہ مسجد کے اندر یا مسجد کے صحن میں بنے ہوئے چبوترے وغیرہ پر بیٹھ کر ثالثی اور فیصلے صادر کیے جا سکتے ہیں۔ صحن میں چبوتر سے یا ”رحبہ“ کے بارے میں اختلاف ہے کہ آیا اسے مسجد کا حصہ شمار کیا جائے یا نہیں؟ تو اس سلسلے میں حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ راجح بات یہی ہے کہ یہ مسجد کا حصہ شمار ہوتا ہے، اس کا حکم بھی مسجد والا ہی ہوگا، اس میں اعتکاف بیٹھنا اور ہر وہ عمل جائز ہے، جس کے لیے مسجد شرط ہے، ان آثار میں اسی چبوترے کا تذکرہ ہے، جو مسجد میں شامل ہوتا ہے، ہاں اگر مسجد کے احاطے سے الگ کوئی چبوترہ بنایا گیا ہو تو اس کا حکم الگ ہوگا، اسے مسجد شمار نہیں کیا جائے گا۔ یہ دو الگ الگ نوعیت کے چبوترے ہوئے اور ان دونوں کا حکم بھی الگ الگ ہی ہوگا، مسجد سے متصل کا مسجد والا اور مسجد سے الگ کا غیر مسجد والا حکم ہوگا۔

غرض کہ امام ابن بطال رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اہلِ علم کی ایک جماعت نے مسجد میں قضا منعقد کرنے کو مستحب قرار دیا ہے۔ امام مالک رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ تو قدیم امر ہے، امام احمد اور اسحاق بن راہویہ بھی اس کے استحباب ہی کے قائل ہیں، لیکن بعض علما نے اسے مکروہ قرار دیا ہے، جیسے حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ ہیں۔ امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ مجھے زیادہ محبوب یہ بات ہے کہ فیصلہ مسجد سے باہر کہیں کیا جائے، تاکہ کافر و مشرک اور حیض و نفاس والی عورتوں کے لیے آسانی رہے۔

کرابیسی نے کراہت والوں کے اقوال ذکر کر کے لکھا ہے کہ سلف صالحین میں یہ مروج تھا کہ وہ مسجدِ رسول ﷺ میں فیصلے کیا کرتے تھے اور اس پر دلالت کرنے والے کتنے ہی آثار ذکر کیے ہیں اور لکھا ہے کہ جب صورتِ حال یہ رہی ہے تو پھر عام مساجد میں یہ کیسے مکروہ ہوسکتا ہے؟ امام ابن بطال

---

[1] فتح الباري (١/ ١٥٥)

نے کہا ہے کہ حضرت سہل بن سعد کی حدیث میں مسجد میں لعان کے جواز کی دلیل ہے، اگرچہ ان کے نزدیک بھی مسجد کی طہارت و نظافت اور تقدس و احترام کے لیے احتیاط اسی میں ہے کہ فیصلہ کہیں باہر کیے جائیں۔[1]

اس ساری تفصیل سے معلوم ہوتا ہے کہ مساجد میں فیصلہ مستحب یا جائز تو ہے، لیکن مسجد کا احترام پیشِ نظر رکھ کر اگر ایسا نہ کیا جائے تو بھی ٹھیک ہے، گویا بات جائز و ناجائز یا مکروہ و مستحب کی نہیں، بلکہ اولیٰ و غیر اولیٰ کی ہے اور مسجد میں کیے گئے فیصلے یا دی گئی سزا پر عمل درآمد اور حدود کا نفاذ کرنا الگ الگ چیزیں ہیں۔

مسجد میں حدود و تعزیرات کا نفاذ:

مسجد میں فیصلہ کرنا جائز ہے اور اگر تعزیر و سزا معمولی ہو تو مسجد میں بھی ممکن ہے، ورنہ اس کے لیے مجرم کو مسجد سے باہر نکالنا ضروری ہے، چنانچہ اس سلسلے میں ایک تو اسی انصاری صحابی حضرت ماعز اسلمی رضی اللہ عنہ والی حدیث سے استدلال ممکن ہے، بلکہ امام بخاری نے استدلال کیا ہے، جس میں انھوں نے اقبالِ جرم کیا تو تحقیق و تفتیش سے فارغ ہو کر نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«إِذهَبُوا بِهٖ فَارۡجُمُوهُ»[2] ''اسے باہر لے جاؤ اور سنگسار کر دو۔''

اس واقعے سے تعلق رکھنے والی ایک حدیث کے راوی حضرت جابر رضی اللہ عنہ بھی ہیں، وہ بیان فرماتے ہیں:

''كُنۡتُ فِيمَنۡ رَجَمَهُ بِالۡمُصَلّٰى''[3]

''میں بھی ان لوگوں میں تھا، جنھوں نے انھیں عید گاہ کے پاس رجم کیا تھا۔''

بخاری شریف ''كتاب الحدود: باب الرجم بالمصلیٰ'' میں وارد اس حدیث کے آخر میں یہ الفاظ بھی ہیں:

«فَقَالَ لَهُ النَّبِيُّ صلی اللہ علیہ وسلم خَيۡرًا وَصَلّٰى عَلَيۡهِ»[4]

---

[1] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: فتح الباري (١٣/ ١٥٥، ١٥٦)

[2] صحيح البخاري مع الفتح (١٣/ ١٥٦)

[3] صحيح البخاري (١٢/ ١٢١، ١٢٩، ١٣٠ و ١٣/ ١٥٦) نیز دیکھیں: فتح الباري (١٢/ ١٢٩۔ ١٣١)

[4] صحيح البخاري (١٢/ ١٢٩) تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: فتح الباري (١٢/ ١٢٩۔ ١٣١)

''(رجم کے بعد) نبیِ اکرم ﷺ نے خیر و بھلائی کے ساتھ ان کا ذکر فرمایا اور ان کی نمازِ جنازہ پڑھی۔''

عیدگاہ کے پاس رجم کے حکم سے بلکہ اس کے نفاذ سے بھی مسجد سے باہر نفاذِ حدود ہی کا پتا چلتا ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے ''اِذْهَبُوْا بِهٖ فَارْجُمُوْهُ'' کے الفاظ سے اسی بات پر استدلال کیا ہے اور کتاب الاحکام میں یوں تبویب کی ہے:

''باب من حكم في المسجد حتى إذا أتى على حدٍ أمر أن يخرج من المسجد فيقام''[1]

''اس شخص کا بیان جس نے مسجد میں فیصلہ کیا اور جب حد یا سزا نافذ کرنے کا وقت آیا تو حکم فرمایا کہ مجرم کو مسجد سے باہر نکال کر اس پر حد قائم (یا سزا نافذ) کی جائے۔''

امام بخاری رحمہ اللہ کے اس استنباط و استدلال پر یہ اعتراض کیا جا سکتا ہے کہ یہ تو رجم کا معاملہ تھا، جو بہت بڑی سزا ہے اور اس آدمی کے خون وغیرہ سے مسجد کو کچھ لگنے کا واضح خدشہ ہوتا ہے، لہٰذا آپ ﷺ نے اسے مسجد سے باہر لے جانے کا حکم فرمایا تھا، ایسے ہی رجم کے لیے گڑھا کھودنے کی ضرورت بھی پیش آتی ہے، جس کے لیے مسجد مناسب نہیں تھی، لیکن اس کا یہ مطلب بھی تو نہیں کہ آپ ﷺ کے اس شخص کو مسجد سے باہر رجم کروانے سے یہ لازم آئے کہ دوسری حدود کا نفاذ بھی مسجد میں نہیں ہونا چاہیے، لیکن جیسا کہ معروف ہے، رئیس المحدثین امام بخاری رحمہ اللہ کی فقہ و ژرف نگاہی صحیح بخاری کے ابواب میں ہے اور وہ بات بھی بالکل صحیح ہے، اس مسئلے میں اس کا ثبوت انھوں نے یوں دیا ہے کہ ارشادِ نبوی ﷺ کے الفاظ: «اِذْهَبُوْا بِهٖ فَارْجُمُوْهُ» کو بنیاد بنا کر یہ باب قائم کیا ہے اور مذکورہ اعتراض و اشکال کو پیشگی طور پر حل کرنے کے لیے ترجمۃ الباب ہی میں نبیِ اکرم ﷺ کے دو خلفاے راشدین حضرت عمرِ فاروق اور حضرت علی رضی اللہ عنہما کے آثار بھی تعلیقاً بیان کر دیے ہیں، جن سے ان کے استدلال کو تقویت حاصل ہوتی ہے، چنانچہ صحیح بخاری میں تعلیقاً اور مصنف عبدالرزاق و ابن ابی شیبہ میں موصولاً طارق بن شہاب کے طریق سے بیان کرتے ہیں:

''أتي عمر بن الخطاب برجل في حد فقال: أخرجاه من المسجد ثم اضرباه''[2]

---

[1] صحيح البخاري مع الفتح (١٣/ ١٥٦)

[2] صحيح البخاري مع الفتح (١٣/ ١٥٦، ١٥٧)

''حضرت عمرِ فاروق رضی اللہ عنہ کے پاس ایک آدمی لایا گیا، جس پر حد کا حکم صادر ہوا تو انھوں نے فرمایا: اسے مسجد سے باہر نکال کر اس پر حد نافذ کرو۔''

اس اثر کی سند کو شارح بخاری نے امام بخاری و مسلم کی شروط کے مطابق صحیح قرار دیا ہے، جبکہ دوسرے اثر کو امام بخاری رحمہ اللہ نے تمریض وتضعیف کے صیغے سے تعلیقاً روایت کیا ہے اور مصنف ابن ابی شیبہ و مصنف عبدالرزاق میں موصولاً ابن معقل کے طریق سے بیان کرتے ہیں:

''إِنَّ رَجُلًا جَاءَ إِلٰی عَلِيٍّ فَسارَّهٗ، فَقَالَ: یَا قَنْبَرُ! أَخْرِجْهُ مِنَ الْمَسْجِدِ فَأَقِمْ عَلَیْهِ'' [1]

''ایک آدمی حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس آیا اور ان کے کان میں کچھ کہا تو انھوں نے فرمایا: اے قنبر! اسے مسجد سے باہر نکال کر اس پر حد قائم کرو۔''

لیکن اس کی سند میں ایک راوی ایسا ہے، جس پر کچھ کلام کیا گیا ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنے اندازِ بیان وتحریر ہی سے اس بات کی طرف اشارہ فرمایا ہے، لیکن اس کے ضُعف کو پہلے اثرِ فاروقی اور نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مرفوع حدیث سے تقویت ملتی ہے، اس حدیث اور ان آثار کی بنا پر فقہائے کوفہ (یعنی احناف) امام شافعی، احمد بن حنبل اور اسحاق بن راہویہ رحمہم اللہ نے کہا ہے کہ مسجد میں کسی کو شرعی سزا نہ دی جائے، البتہ امام شعبی رحمہ اللہ اور ابن ابی لیلیٰ رحمہ اللہ نے اس کی اجازت دی ہے۔ امام مالک رحمہ اللہ نے اس سلسلے میں کہا ہے:

''لَا بَأْسَ بِالضَّرْبِ بِالسِّیَاطِ الیَسِیْرَةِ فَإِذَا کَثُرَتِ الْحُدُوْدُ فَلْیَکُنْ ذٰلِكَ خَارِجَ الْمَسْجِدِ'' [2]

''اگر تھوڑے سے کوڑوں کی سزا ہو تو کوئی حرج نہیں اور اگر نفاذِ حدود کے لیے کوڑوں کی تعداد زیادہ ہو تو پھر مسجد سے باہر ہی ہونا چاہیے۔''

امام مالک رحمہ اللہ کی یہ رائے کافی حد تک معتدل ہے، البتہ ابن بطال رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جس نے بالکل ہی مسجد کے باہر کا کہا ہے، وہی قول اولیٰ ہے اور اس سلسلے میں بھی بات جائز و ناجائز کی نہ

[1] صحیح البخاري مع الفتح (۱۳/ ۱۵٦، ۱۵۷)

[2] فتح الباري (۱۳/ ۱۵۷)

سہی، البتہ اولیٰ اور غیر اولیٰ کی ضرور ہے، جبکہ مساجد میں اقامتِ حدود کی ممانعت کے بارے میں جو حدیثیں صریح ہیں، ان میں سے بھی بعض کی اسناد ضعیف بعض کی حسن اور بعض کی صحیح ہیں۔ مثلاً: سنن ابو داود و دارقطنی، مسند احمد، مصنف ابن ابی شیبہ، مستدرک حاکم، صحیح ابن السکن اور سنن بیہقی میں حضرت حکیم بن حزام رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً مروی ہے:

«لَا تُقَامُ الْحُدُوْدُ فِي الْمَسَاجِدِ وَلَا يُسْتَقَادُ فِيْهَا»[1]

''مساجد میں حدود (سزائیں) نافذ نہ کی جائیں اور نہ ان میں قصاص لیا جائے۔''

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے "التلخیص الحبیر" میں تو اس روایت کی سند کے بارے میں کہا ہے:

"لا بأس بإسناده"[2] ''اس کی سند پر کوئی خاص مواخذہ نہیں ہے۔''

لیکن بلوغ المرام (مع السبل: ۱/ ۱۵۵) میں اس کی سند کو ضعیف قرار دیا ہے اور شیخ البانی نے اسے حسن قرار دیا ہے۔[3]

ایسے ہی ایک دوسری حدیث سنن ترمذی، ابن ماجہ، دارمی، دارقطنی اور بیہقی میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی مرفوعاً مروی ہے:

«لَا تُقَامُ الْحُدُوْدُ فِي الْمَسَاجِدِ»[4]

''مساجد میں حدود (سزائیں) نافذ نہ کی جائیں۔''

اس کی سند میں ایک راوی اسماعیل بن مسلم مکی ہے، اس کا حافظہ کمزور تھا۔[5] لیکن اس کی کئی دوسرے رواۃ نے متابعت کی ہے، جن کی بنا پر اسے جید قرار دیا گیا ہے۔[6]

اسی موضوع کی ایک تیسری روایت مصنف ابن ابی شیبہ میں مرسلاً عن مکحول اور خلافیاتِ بیہقی میں مکحول کے طریق سے حضرت ابو درداء، واثلہ اور ابو امامہ رضی اللہ عنہم سے اور مصنف عبدالرزاق و طبرانی

---

[1] الإرواء (۷/ ۳٦۱ وحسنه) نيل الأوطار (۱/ ۲/ ۲۲۳، الرياض)

[2] التلخيص الحبير (۲/ ٤/ ۷۷، ۷۸) نيل الأوطار أيضاً.

[3] الإرواء (۷/ ۳٦۱) صحيح سنن ابن ماجه (۲/ ۸۹) صحيح سنن أبي داود (۳/ ۸۵۰) مشكاة المصابيح (۱/ ۲۲۹)

[4] الإرواء (۷/ ۲۷۱۔ ۳٦۲) صحيح سنن ابن ماجه (۲/ ۸۹) سنن البيهقي (۸/ ۳۹)

[5] التلخيص الحبير (۲/ ٤/ ۱٦) و نيل الأوطار أيضاً.

[6] إرواء الغليل (۷/ ۲۷۱، ۲۷۲) التلخيص الحبير (۲/ ٤/ ۱٦، ۱۷) مجمع الزوائد (۳/ ٦/ ۲۸۵)

کبیر میں حضرت واثلہ رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً مروی ہے، جس میں ہے:

((جَنِّبُوْا مَسَاجِدَكُمْ... إِقَامَةَ حُدُوْدِكُمْ))[1]

''اپنی مساجد میں... حدود کے نفاذ سے اجتناب کرو۔''

اس روایت میں اس مسئلے کے علاوہ بعض دیگر امور کا تذکرہ بھی ہے، جس کی اصل سنن ابن ماجہ میں صرف حضرت واثلہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے اور اس میں دیگر امور کا ذکر تو آیا ہے، لیکن بقول حافظ ابن حجر رحمہ اللہ حدود اور سزاؤں کا سرے سے اس میں ذکر ہی نہیں ہے، جو خلافیات والی روایت میں اس کے ورود کو مخدوش بنا دیتا ہے، لیکن ہمارے پیشِ نظر نسخے میں یہ الفاظ بھی موجود ہیں۔ سنن ابن ماجہ میں یہ الفاظ آ بھی جائیں تو بھی اس سے کوئی بات نہیں بن سکتی، کیونکہ سنن ابن ماجہ کی سند سخت ضعیف ہے۔[2]

ایسے ہی سنن ابن ماجہ میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ایک اور مرفوع حدیث میں بھی ہے، جس میں ہے:

((خِصَالٌ لَا تَنْبَغِيْ فِي الْمَسْجِدِ... وَلَا يُتَّخَذُ طَرِيْقًا))

''کچھ امور ایسے ہیں جو مسجد میں جائز نہیں ہیں، مثلاً مسجد کو راستہ بنانا۔''

آگے دیگر خصائل و امور کا تذکرہ ہے، جن میں سے ایک یہ بھی ہے:

((وَلَا يُضْرَبُ فِيْهِ حَدٌّ))[3]

''اور مسجد میں کسی کو سزا کے کوڑے بھی نہ مارے جائیں۔''

لیکن اس کی سند کو بھی محدّثین رحمہم اللہ نے ضعیف قرار دیا ہے۔

مسند بزار اور معجم طبرانی کبیر میں حضرت جبیر بن مطعم رضی اللہ عنہ سے بھی ایسی ایک مرفوع روایت مروی ہے، جس کی سند میں محمد بن عمر واقدی ہے جو معروف متکلم فیہ راوی ہے۔[4] ایک روایت عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ کی سند سے بھی مرفوعاً مروی ہے، لیکن اس کی سند میں معروف متکلم فیہ راوی ابن لہیعہ

---

[1] فتح الباري (١٣/ ١٥٧) الإرواء (٧/ ٣٦٢) سبل السلام (١/ ١/ ١٥٥)

[2] فتح الباري (١٣/ ١٥٧) نیز دیکھیں: ضعيف سنن ابن ماجه (ص: ٥٩) الإرواء (٧/ ٣٦٢)

[3] صحيح سنن ابن ماجه (١/ ١٢٥) ولكن الجزء الأول منه ضعيف سنن ابن ماجه (ص: ٥٩)

[4] التلخيص الحبير (٢/ ٤/ ٧٨) نيل الأوطار (١/ ٢/ ٢٢٣) مجمع الزوائد (١/ ٢/ ٢٨)

ہے۔[1] البتہ دیگر شواہد وغیرہ کی وجہ سے بعض کبار محدّثینِ کرام رحمہم اللہ نے اسے بھی حسن قرار دیا ہے۔[2]

غرض کہ حافظ ابن حجر عسقلانی اور خصوصاً امام شوکانی رحمہما اللہ کا رجحان اس طرف ہے کہ مساجد میں حدود و تعزیرات کا نفاذ نہیں ہونا چاہیے، بلکہ یہ سزائیں مسجد سے باہر ہی دی جائیں تو بہتر ہے۔

مسجد میں آواز بلند کرنا:

آدابِ مسجد میں سے ایک ادب یہ بھی ہے کہ مسجد میں آواز بلند نہ کی جائے، بلکہ اگر کوئی مباح بات کرنی پڑے تو مسجد کے تقدس و احترام کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے انتہائی دھیمے لہجے سے بات کی جائے۔ مسجد میں آوازیں بلند کرنے کی ممانعت کے بارے میں صحیح بخاری ''کتاب الصلاۃ: باب رفع الصوت في المسجد'' میں حضرت سائب بن یزید رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں:

''كُنْتُ قَائِمًا فِي الْمَسْجِدِ فَحَصَبَنِيْ رَجُلٌ فَنَظَرْتُ فَإِذَا هُوَ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ، فَقَالَ: إِذْهَبْ فَائْتِنِيْ بِهٰذَيْنِ، فَجِئْتُهُ بِهِمَا، قَالَ: مَنْ أَنْتُمَا؟ أَوْ مِنْ أَيْنَ أَنْتُمَا؟ قَالَا: مِنْ أَهْلِ الطَّائِفِ، قَالَ: لَوْ كُنْتُمَا مِنْ أَهْلِ الْبَلَدِ لَأَوْجَعْتُكُمَا، تَرْفَعَانِ أَصْوَاتَكُمَا فِيْ مَسْجِدِ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ!''[3]

''میں مسجد میں کھڑا تھا کہ مجھے کسی نے کنکری ماری، میں نے مڑ کر دیکھا تو وہ حضرت عمرِ فاروق رضی اللہ عنہ تھے، انھوں نے فرمایا: جاؤ اور ان دونوں آدمیوں کو میرے پاس لاؤ۔ میں انھیں جا کر لے آیا تو حضرتِ فاروق رضی اللہ عنہ نے فرمایا: تم کون ہو؟ یا پوچھا کہ تم کہاں سے ہو؟ انھوں نے بتایا کہ ہم طائف سے آئے ہیں۔ حضرت فاروق رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اگر تم یہاں ہمارے شہر سے ہوتے تو تمھیں تکلیف دہ سزا دیتا۔ تم نبیِ اکرم ﷺ کی مسجدِ مبارک میں اپنی آوازیں بلند کرتے ہو!''

شارح بخاری حافظ ابن حجر نے فتح الباری میں اس اثرِ فاروقی رضی اللہ عنہ کے بارے میں لکھا ہے کہ بظاہر تو یہ اثر یعنی حضرت عمرِ فاروق رضی اللہ عنہ کا فعل ہے، لیکن اس کا حکم مرفوع حدیث کا ہے کہ یہ

[1] الإرواء (٧/ ٣٦٢، ٣٦٣) نيل الأوطار (١/ ٢/ ٢٢٣) التلخيص الحبير أيضاً.

[2] صحيح ابن ماجه (٢/ ٨٩ وحسنه الألباني)

[3] صحيح البخاري (١/ ٥٦٠، حديث: ٤٧٠)

ممانعت نبیِ اکرم سے ثابت ہے، ورنہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ انھیں کوڑوں کی سزا کا ہرگز نہ کہتے۔[1]

یہی واقعہ مصنف عبدالرزاق میں ایک دوسرے طریق سے بھی مروی ہے جس میں حضرت نافع بیان فرماتے ہیں کہ حضرت عمرِ فاروق رضی اللہ عنہ کہا کرتے تھے:

''لَا تُكْثِرُوا اللَّغَطَ'' ''مسجد میں چیخ و چنگاڑ مت کیا کرو۔''

آگے اس روایت میں یہ بھی منقول ہے:

''إِنَّ مَسْجِدَنَا هٰذَا لَا يُرْفَعُ فِيهِ الصَّوْتُ''[2]

''ہماری اس مسجد میں آواز بلند نہیں کی جائے گی۔''

لیکن اس کی سند میں انقطاع پایا جاتا ہے، کیونکہ نافع نے اس واقعے کے رونما ہونے کا زمانہ نہیں پایا ہے۔

مسجد میں آواز بلند کرنے کی ممانعت کے سلسلے میں اس اثرِ فاروقی سے بھی استدلال کیا جا سکتا ہے، جو موطا امام مالک میں حضرت سالم بن عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے طریق سے مروی ہے:

''بَنٰى عُمَرُ إِلٰى جَانِبِ الْمَسْجِدِ رَحْبَةً فَسَمَّاهَا الْبُطْحَاء، فَكَانَ يَقُولُ مَنْ أَرَادَ أَنْ يَّلْغُطَ أَوْ يُنْشِدَ شِعْراً أَوْ يَرْفَعَ صَوْتًا فَلْيَخْرُجْ إِلٰى هٰذِهِ الرَّحْبَةِ''[3]

''حضرت عمرِ فاروق رضی اللہ عنہ نے مسجد کے ساتھ ہی ایک چبوترہ سا بنوا رکھا تھا، جس کا نام بطحا رکھا ہوا تھا۔ فرمایا کرتے تھے کہ جو چیخ و چنگاڑ یا شعر گوئی یا کسی معاملے میں آواز بلند کرنا چاہے تو اسے چاہیے کہ وہ اس چبوترے کی طرف چلا جائے۔''

ایسے ہی جہاں حضرت عمرِ فاروق رضی اللہ عنہ سے مروی یہ آثار مساجد میں آواز بلند کرنے کی ممانعت پر دلالت کرتے ہیں تو ان کی تائید بعض مرفوع احادیث سے بھی ہوتی ہے لیکن بذاتہ وہ ضعیف ہیں۔ مثلاً سنن ابن ماجہ، مصنف عبدالرزاق اور طبرانی کبیر میں حضرت واثلہ رحمہ اللہ والی جو حدیث مسجد میں نفاذِ حدود وتعزیرات کی ممانعت کے سلسلے میں گزری ہے،، اس میں یہ الفاظ بھی مروی ہیں:

---

[1] فتح الباري (١/ ٥٦٠) حديث (٤٧٠)

[2] فتح الباري (١/ ٥٦٠)

[3] فتح الباري (١/ ٥٦٠)

«جَنِّبُوا مَسَاجِدَكُمْ... رَفْعَ أَصْوَاتِكُمْ»[1]

''اپنی مساجد میں...آواز بلند کرنے سے اجتناب کرو۔''

ان احادیث و آثار کی بنا پر بعض اہلِ علم نے مطلقاً مسجد میں آواز بلند کرنے کو مکروہ وممنوع قرار دیا ہے، حتیٰ کہ علامہ ابن عبدالبر نے ''جامع بیان العلم و فضله'' میں اور حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے فتح الباري میں امام مالک رحمہ اللہ سے نقل کیا ہے کہ ان سے مسجد میں علم سکھانے کے لیے آواز بلند کرنے کے بارے میں پوچھا گیا تو انھوں نے فرمایا:

''ایسے علم میں کوئی خیر و بھلائی نہیں جو مسجد میں شور مچانے کا باعث بنے۔ میں نے لوگوں کو زمانۂ قدیم سے اس فعل کو معیوب سمجھتے پایا ہے لہٰذا میں اسے مکروہ سمجھتا ہوں۔''[2]

حضرت عمرِ فاروق رضی اللہ عنہ کے طرزِ عمل اور امام مالک رحمہ اللہ کے ارشاد کو سامنے رکھا جائے تو مساجد میں اگر حصولِ علم کے لیے بعض دوسری احادیث سے استدلال کرتے ہوئے آواز بلند کرنے کی گنجایش نکلتی ہے، تو وہاں ظاہر ہے کہ صرف خطیب و مدرس یا مقرر کے آواز بلند کرنے کی گنجایش نکلتی ہے۔ سامنے بیٹھے ہوئے سامعین کی نعرے بازی کی اس سے گنجایش قطعاً نہیں نکلتی۔ بلکہ آج ہمارے لوگوں میں نعرے بازی کا جو انداز آچکا ہے کہ وہ مسنون نعرۂ تکبیر پر اکتفا ہی نہیں کرتے تو ایسے خود ساختہ نعروں کا جواز کشید کرنا تو اور بھی مشکل امر ہے، کیونکہ ان میں سے بعض تو نہ صرف تقدس و احترامِ مسجد کے منافی بلکہ اہلِ سنت کے صحیح ومتفقہ عقائد کے بھی خلاف ہوتے ہیں، لہٰذا مساجد میں خطیب یا مقرر کو بغور صرف سننا ہی چاہیے۔ بلاوجہ کی نعرے بازی آدابِ مسجد کے منافی ہے۔ وہ تو عموماً مجلس کو گرمانے کے لیے ہوتی ہے، جب کہ وہ کسی عام یا کھلی جگہ پر منعقد ہو نہ کہ مسجد کی پر امن و پُرسکون فضا میں ارتعاش پیدا کرنے کے لیے۔ اگر مسجد میں نعرہ بازی خطبۂ جمعہ کے دوران میں ہو تو یہ اور بھی ناجائز بات ہے، کیونکہ جمعہ کے تو خود اپنے بھی بعض آداب اور پابندیاں ہیں، جو ایسے امور کی سامعین کو قطعاً اجازت نہیں دیتیں۔

البتہ امام وخطیب یا مدرس ومقرر کے مسجد میں آواز بلند کرنے کے جواز پر صحیح بخاری کی اس

[1] فتح الباري (١٣/ ١٥٦)

[2] إعلام الساجد (ص: ٣٢٦) فتح الباري (١/ ٥٦٠)

حدیث سے استدلال کیا جاتا ہے، جس میں مذکور ہے کہ حضرت کعب بن مالک اور حضرت ابن ابی حدرد رضی اللہ عنہما کے مابین کوئی قرض کا لین دین تھا۔ حضرت کعب رضی اللہ عنہ نے تقاضا کیا تو اس معاملے میں ان کی آوازیں بلند ہوگئیں، حتیٰ کہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے گھر میں ان کی آوازیں سنیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسجد کی طرف کھلنے والے دروازے سے پردہ اٹھایا اور حضرت کعب رضی اللہ عنہ سے مخاطب ہوکر فرمایا:

''تم اپنا کچھ یعنی آدھا قرض معاف کردو۔ انھوں نے فوراً تعمیل کی اور دوسرے صحابی رضی اللہ عنہ کو حکم فرمایا کہ اب تم بقیہ قرض ادا کر دو۔''[1]

اس حدیث سے آواز بلند کرنے کا جواز اخذ کیا جاتا ہے، جب کہ یہ آواز بلند بھی چیخ و چنگاڑ اور نعروں کی شکل میں نہ ہو۔ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ نے مسجد میں جو علم کے لیے آواز بلند کرنے کو جائز قرار دیا ہے تو اسے اسی پر محمول کیا جائے گا کہ اگر تعلیم کے لیے آواز بلند ہو تو جائز ورنہ ناجائز۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی صحیح کے ''باب رفع الصوت في المسجد'' میں ان دونوں حدیثوں کو وارد کر کے اس فرق کی طرف اشارہ فرما دیا ہے۔ لہٰذا ادب و احترام کو ملحوظ رکھتے ہوئے ایسے ہر فعل سے پرہیز کرنا چاہیے، جو مسجد کی بے ادبی و بے حرمتی کا باعث ہو۔[2]

مسجد میں اپنے لیے کوئی جگہ مخصوص کر لینا:

آداب و احکامِ مسجد کے سلسلہ میں ایک اور بات بھی ذکر کرتے جائیں کہ مسجد کے بعض لوگ مسجد میں اپنے لیے ایک جگہ یا گوشہ مخصوص کر لیتے ہیں۔ مثلاً امام کے پیچھے، منبر کے بازو میں، کسی اگلے یا پچھلے اور دائیں یا بائیں کونے میں اور اس جگہ کے سوا کسی دوسری جگہ میں انھیں عبادت یا قیام اچھا ہی نہیں لگتا، حتیٰ کہ اگر کوئی دوسرا آدمی لاعلمی کی وجہ سے اس مخصوص جگہ پر آ بیٹھے تو وہ اسے اُٹھنے پر مجبور کر دیتے ہیں اور اگر کہیں کوئی دوسرا پاؤں جما چکا ہو اور معمولی لے دے پر بھی نہ اُٹھے تو یہ صاحب لا حول ولا قوۃ الا باللّٰہ پڑھتے اور بڑ بڑاتے ہوئے وہاں سے کسی دوسری جگہ کی طرف اس طرح جلے کٹے ہوئے رخ کرتے ہیں کہ دوسروں کو یوں معلوم ہوتا ہے کہ ان کے ساتھ کوئی ''حادثہ'' رونما ہوگیا ہے۔

---

[1] صحیح البخاري (۱/ ۵۵۱، ۵۵۲، ۵٦۱)

[2] فتح الباري (۱/ ۵۵۲، ۵٦۰، ۵٦۱) سبل السلام (۱/ ۱/ ۱۵۵) اعلام الساجد (ص: ۳۲٦، ۳۲۷ اردو)

بعض جاہل تو اپنی جگہ چھیننے والے سے برملا کہہ دیتے ہیں کہ میں یہاں اتنے سال سے بیٹھ رہا ہوں تم یہاں کیوں بیٹھے ہو اور شور مچا کر اسے وہاں سے اُٹھنے پر مجبور کر دیا جاتا ہے۔ دلوں کی باتیں اللہ ہی جانتا ہے، البتہ ان کے اس فعل سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کی اس جگہ سے انسیت و محبت جہالت کے نتیجے میں اور ریا کاری کے لیے ہوتی ہے کہ لوگ سمجھنے لگیں کہ یہ فلاں شخص کی جگہ ہے اور فلاں تو صف اول کا نمازی ہے اور یہ کہ فلاں شخص تو مسجد کے فلاں کونے ہی میں پڑا رہتا ہے۔ ایسے ریا کار عابدوں اور زاہدوں کو امام غزالی رحمہ اللہ نے "إحياء علوم الدين" میں اور علامہ ابن قیم رحمہ اللہ نے "إغاثة اللهفان" میں خوب لیا ہے اور اس گوشہ نشینی کے ساتھ جو لوگ کاروبارِ جہاں کو ترک کر کے زہد و تقویٰ کا کچھ زیادہ ہی دم بھرنے لگتے ہیں، امام غزالی نے انھیں "باب المغرورين" میں فریبِ نفس اور فریبِ شیطان میں مبتلا قرار دیا ہے، جس کی تفصیل کتاب "إحياء علوم الدين" کے "باب المغرورين" میں دیکھی جا سکتی۔[1]

ان امور کی تفصیل ان دونوں کتابوں میں دیکھی جا سکتی ہے۔ یہ دونوں کتابیں اور امام ابن الجوزی رحمہ اللہ کی تلبیس ابلیس کے ایسے مباحث انتہائی عبرت انگیز ہیں، یہ کتابیں اردو میں بھی ترجمہ ہو چکی ہیں، لہٰذا اس موضوع کے سلسلہ میں ان کتابوں کا مطالعہ مفیدِ مطلب ہے۔ کوئی ترکِ دنیا کر کے مسجد میں گوشہ نشین ہو یا محض نماز کے وقت ہی آئے اور اپنی جگہ مخصوص کیے رکھے، ہر شکل میں یہ ناجائز ہے، کیونکہ نبیِ اکرم ﷺ نے مسجد میں ایک جگہ کو مخصوص کر لینے سے منع فرمایا اور اسے اونٹ کی عادت قرار دیا ہے، جیسا کہ سنن ابو داود، نسائی، ابن ماجہ، مسندِ احمد اور مستدرکِ حاکم کی معروف حدیث ہے۔ جس میں حضرت عبدالرحمٰن بن شبل رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں:

«نَهٰى النَّبِيُّ ﷺ عَنْ نُقْرَةِ الْغُرَابِ وَأَنْ يُّوَطِّنَ الرَّجُلُ فِي الْمَكَانِ فِي الْمَسْجِدِ كَمَا يُوَطِّنُ الْبَعِيْرُ»[2]

---

[1] نیز دیکھیں: اصلاح المساجد (ص: ۲۱۰، ۲۱۱) ایسے ہی علامہ ابن قیم نے بھی "إغاثة اللهفان" (۱/ ۱۲۱ طبع دارالمعرفة بيروت) میں ایسے لوگوں کی گوشہ نشینی کو شیطانی جال میں پھنسنا شمار کیا ہے۔ ایسے ہی "إصلاح المساجد" (ص: ۲۰۸، ۲۰۹) بھی ملاحظہ فرمائیں۔

[2] صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (۷٦۸) مسند أحمد (۳/ ٤٦۸) المستدرك للحاكم (۱/ ۲۲۹) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (۱۱٦۸) الفتح الرباني (٤/ ۹۱، ۹۲) فقه السنة (۱/ ۳۷۱)

''نبیِ اکرم ﷺ نے سجدوں کو کوے کے ٹھونگے مارنے کی طرح ادا کرنے سے منع فرمایا اور اس بات سے منع فرمایا کہ کوئی شخص مسجد میں کسی جگہ کو اپنے لیے مخصوص کرے، جس طرح کہ اونٹ باڑے میں اپنے لیے جگہ مخصوص کر لیتا ہے۔''

اس حدیث کے پیشِ نظر صحیح طرزِ عمل یہ ہے کہ جو شخص مسجد میں داخل ہو، جہاں جگہ ملے، دو رکعتیں پڑھے اور بیٹھ جائے۔ اپنی مخصوص جگہ کی تلاش میں لوگوں کو نہ پھلانگے جو ایک دوسرا ممنوع فعل ہے اور نہ نمازیوں کے آگے سے گزرے جو کہ تیسرا گناہ ہے، جیسا کہ احادیث سے پتا چلتا ہے، جو معروف ہیں، چناں چہ سنن ابو داود و نسائی، صحیح ابن حبان، مستدرک حاکم اور سنن بیہقی میں حضرت عبداللہ بن بسر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ جمعہ کے دن ایک آدمی دوسروں کی گردنیں پھلانگتا ہوا آگے گزر رہا تھا تو نبیِ اکرم ﷺ نے ناراض ہوکر اسے فرمایا تھا:

«إِجْلِسْ فَقَدْ آذَيْتَ وَ آنَيْتَ»[1]

''بیٹھ جاؤ، تم نے دوسروں کو تکلیف دی ہے اور خود دیر سے آئے ہو۔''

اسی طرح کی ایک حدیث سنن ابن ماجہ میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے بھی مروی ہے۔

یہاں اس بات کا بھی خیال رہے کہ پہلے آنے والے لوگ پہلی صف کو مکمل کریں اور آگے جگہ چھوڑ کر پیچھے نہ بیٹھیں، کیونکہ ایسا کرنے سے صفوں کا نظام خراب ہوتا ہے اور دوسروں کو لوگوں کے کندھے پھلانگ کر آگے آنے کا ناچار ارتکاب کرنا پڑتا ہے

یہ تو ہوئی گردنیں پھلانگنے کی بات جب کہ نمازی کے آگے سے گزرنے کی وعید اس حدیث میں ہے، جو صحیح بخاری و مسلم، سنن اربعہ اور موطا امام مالک میں حضرت ابو جہیم رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، جس میں ارشادِ نبوی ﷺ ہے:

«لَوْ يَعْلَمُ الْمَارُّ بَيْنَ يَدَيِ الْمُصَلِّيْ مَا ذَا عَلَيْهِ؟ لَكَانَ أَنْ يَّقِفَ أَرْبَعِيْنَ خَيْراً لَهُ مِنَ أَنْ يَمُرَّ بَيْنَ يَدَيْهِ»[2]

---

[1] صحيح سنن أبي داود (١/ ٢٠٧، ٢٠٨) صحيح الجامع (١/ ١/ ١٠٥) صحيح سنن النسائي، رقم الحديث (١٣٢٦) موارد الظمآن (٥٧٢)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥١٠) مختصر (٣٣٧) صحيح سنن أبي داود (٦٤٩) صحيح سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٧٦) صحيح سنن النسائي حديث (٧٢٩) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٩٤٥) موطأ الإمام مالك (٣٤) مجمع الزوائد (٢/ ٦١) وقال: رواه أيضاً البزار، و رجاله و رجال الصحيح.

''اگر نمازی کے آگے سے گزرنے والے کو اس کے گناہ کا پتا چل جائے تو وہ چالیس (برس) کھڑا رہے، لیکن اس کے آگے سے نہیں گزرے گا۔''

استثنائی صورتیں:

یہاں یہ بات بھی پیشِ نظر رہے کہ اگر کسی جگہ کو کوئی خاص فضیلت حاصل ہو تو وہاں پر نماز کا اہتمام کرنا اس سے مستثنیٰ ہے، مثلاً روضۃ الجنۃ یا روضۂ شریفہ میں نماز کا اہتمام صحیح و افضل ہے۔ کیونکہ اس مقام کی ایک فضیلت احادیث میں ثابت ہے، جس کی تفصیل ہماری کتاب ''سوئے حرم'' (ص: ۳۳۷) میں دیکھی جا سکتی ہے۔ البتہ اس جگہ کی فضیلت سنن ترمذی میں حضرت علی و ابو ہریرہ رضی اللہ عنہما سے، صحیح بخاری و مسلم، ترمذی و مسند احمد، موطا امام مالک اور السنۃ لابی عاصم میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے، اور صحیح بخاری و مسلم، سنن نسائی و مسند احمد میں حضرت عبداللہ بن زید المازنی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، جس میں ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے:

﴿مَا بَيْنَ بَيْتِي وَمِنْبَرِي رَوْضَةٌ مِّنْ رِيَاضِ الْجَنَّةِ﴾[1]

''میرے گھر اور میرے منبر کا درمیانی قطعہ ارضی جنت کے باغیچوں میں سے ایک باغیچہ ہے۔''

ایسے ہی صحیح مسلم اور دیگر کتبِ حدیث میں حضرت سلمہ بن اکوع رضی اللہ عنہ کے بارے میں مروی ہے کہ وہ مصحف کے قریب والے ستون کے پاس جگہ ڈھونڈ کر وہاں نماز پڑھا کرتے تھے اور جب ان سے اس کا سبب پوچھا گیا تو انھوں نے فرمایا:

''رَأَيْتُ النَّبِيَّ صلی اللہ علیہ وسلم يَتَحَرَّى الصَّلَاةَ عِنْدَهَا''[2]

''میں نے نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس جگہ کو تلاش کر کے یہاں نماز پڑھا کرتے تھے۔''

امام نووی رحمہ اللہ نے شرح مسلم میں لکھا ہے کہ اگر کسی جگہ کو کوئی خاص فضیلت حاصل ہو تو اس میں نماز پڑھنے پر ہیشگی کرنے میں کوئی حرج نہیں۔[3]

---

[1] ملاحظہ ہو: ''سوئے حرم (ص: ۳۳۷) تخریج نمبر (۳۷۰)

[2] صحيح مسلم مع شرح النووي (٢/ ٤/ ٢٢٦)

[3] صحيح مسلم مع شرح النووي (٢/ ٤/ ٢٢٦)

ظاہر ہے کہ جن عام مساجد کے سلسلے میں ہم بات کر رہے ہیں، انھیں ایسی کوئی مخصوص فضیلت حاصل نہیں ہوتی، ہاں اگر امامت، تدریس، وعظ، افتا اور حصولِ علم کی غرض سے مخصوص جگہ پر بیٹھنا ہو تو یہ بھی ناجائز نہیں، بلکہ مستحب ہے اور ایسی ضرورت پر جگہ مخصوص کرنے پر عدمِ کراہت کے بارے میں علمائے سلف کا اتفاق ہے، جیسا کہ امام نووی نے قاضی عیاض سے نقل کیا ہے۔[1]

یہ امور و افعال یعنی مساجد میں چیخ و چنگاڑ کرنا، نعرے مارنا، مسجد کی بعض جگہوں کو مخصوص کر لینا اور اپنی اجارہ داری ظاہر کرنا جو ممنوع ہیں، ان عرب ممالک کی مساجد میں تو دیکھنے میں نہیں آتے اور اگر کہیں کہیں شاذ و نادر مقامات ہوں بھی تو اولاً "النادر كالمعدوم" والی بات ہے کہ شاذ و نادر چیز کا حکم نہ ہونے کے برابر ہوتا ہے، دوسرے یہ کہ جن شاذ و نادر جگہوں پر ایسے بعض ناجائز قسم کے افعال دیکھنے یا سننے میں آتے ہیں تو وہ وہی جگہیں ہیں، جہاں صرف برصغیر کے لوگ ہی نمازی ہوتے ہیں۔ مقامی لوگوں میں سے اول تو وہاں ہوتا ہی کوئی نہیں اور اگر کوئی اِکا دُکا ہو تو بھی نہ ہونے کے برابر، لہٰذا پڑھے لکھے طبقے کے سمجھ دار لوگوں کو اس طرف توجہ دینی چاہیے کہ اگر یہ امور جائز ہوتے تو یہاں بھی ہر جگہ ہوتے اور جو ہر جگہ نہیں تو پھر ضرور دال میں کچھ کالا ہے، لہٰذا ان سے بچنا چاہیے۔

برصغیر کے ممالک کی مساجد میں پائے جانے والے ایسے امور کا ذکر آیا ہی ہے تو لگے ہاتھوں دو ایک اور چیزیں بھی ذکر کر دیں، جو پہلے امور کی طرح ہی یہاں کی مساجد میں تو ہرگز کہیں نہیں پائے جاتے، لیکن ہم انھیں محض اس لیے ذکر کر رہے ہیں کہ ہمارے قارئین کی غالب اکثریت بھی برصغیر ہی سے تعلق رکھنے والے لوگوں کی ہے۔

مسجد میں تعویذ گنڈے بیچنے، جادو ٹونے اور منتر جنتر کرنے والوں کا قیام:

برصغیر کے ملکوں اور بعض دیگر ممالک کی مساجد میں پائے جانے والے ایسے ممنوع امور میں سے ایک مسجدوں میں تعویذ گنڈے بیچنے اور منتر جنتر کرنے والوں کا کاروبار بھی ہے، چنانچہ "المدخل" میں امام ابن الحاج نے لکھا ہے:

"مسجد میں جانوروں کے بال یا لکھنے کا چمڑا فروخت کرنے والوں کو اس سے روکا جائے گا۔"

امام غزالی رحمہ اللہ نے "إحياء علوم الدين" میں مسجدوں سے متعلق منکرات یا ممنوع افعال

[1] شرح صحيح مسلم للنووي (٢/ ٤/ ٢٢٦)

کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

''ایک منکر امر یہ ہے کہ جمعہ کے دن (یا کسی بھی دن) حلقے بنا کر تعویذات وغیرہ فروخت کیے جائیں۔ تعویذ بیچنے والے لوگ مختلف قسم کی تلبیس و عیاری سے کام لیتے ہیں اور ہر وہ بیع جس میں جھوٹ، تلبیس یا عیب چھپانے کی بات ہو، وہ بیع حرام ہے۔ ایسے تلبیس و دجل پر مبنی امور نہ صرف مسجد میں بلکہ یہ تو مسجد اور باہر ہر جگہ ہی حرام ہیں۔''[1]

یہ امام غزالی رحمہ اللہ کے الفاظ کا ترجمہ ہے، جبکہ علامہ جمال الدین قاسمی اپنی کتاب ''إصلاح المساجد'' میں لکھتے ہیں:

''مسجدوں میں حجرے ہوتے ہیں، جن میں غیب اور مستقبل کے حالات سے واقفیت رکھنے کا دعویٰ کرنے والے لوگ مقیم ہوتے ہیں، ان کے پاس گمشدہ ضرورتوں اور اشیا والے اور مستقبل کے نفع و نقصان کو جاننے کے خواہشمند آتے رہتے ہیں اور اپنے مقصد کے لیے یہ لوگ منتر جنتر پڑھنے والے کو پیسے بھی دیتے ہیں، کچھ بیماریوں کے بجائے محض وہم و وسوسے کے سبب بھی ان عاملوں کے پاس آتے ہیں۔ عامل آنے والوں کو یہ باور کراتا ہے کہ ان امراض اور شیطانی اثرات کا علاج اس کے منتروں اور عجیب و غریب طریقوں کے سوا کوئی نہیں ہے، پھر ایسے عیّار لوگ کبھی خونِ حیض سے کچھ لکھتے ہیں، کبھی عورت کے پیٹ پر لکھتے ہیں۔

''غرض کہ وہ کئی انوکھی اور بھونڈی حرکات کرتے ہیں اور ہمارے سادہ دِل لوگ ایسے لوگوں کو عامل کامل اور نہ جانے کیا کیا سمجھے ان کے مکروفریب میں پھنسے رہتے ہیں اور وہ ان کی جیبوں، عزتوں اور ایمان پر ڈاکے ڈالتے رہتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو مسجدوں سے نکال دینا چاہیے۔''

آگے علامہ قاسمی لکھتے ہیں کہ قابلِ افسوس بات یہ ہے کہ یہ سب کچھ اب مسلمانوں میں رائج ہے۔ شاید انھیں یہ معلوم نہیں کہ یہ حدیث میں وارد ہے کہ جس نے نجومی سے عقیدت رکھی، اس کی نماز قبول نہیں ہوتی اور وہ کفر کی حد میں داخل ہو جاتا ہے۔[2]

[1] إصلاح المساجد (ص: ٢٢٧)

[2] إصلاح المساجد (ص: ٢٢٦)

اس سے ان کا اشارہ ان احادیث کی طرف ہے، جن میں سے ایک صحیح مسلم اور مسند احمد میں حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا کے طریق سے نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک زوجۂ محترمہ سے مروی ہے، جس میں ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے:

«مَنْ أَتٰى عَرَّافًا فَسَأَلَهٗ عَنْ شَيْءٍ لَمْ تُقْبَلْ لَهٗ صَلَاةٌ أَرْبَعِيْنَ لَيْلَةً»[1]

''جو شخص کسی نجومی و قیافہ شناس یا سیانے کے پاس گیا اور اس سے کچھ پوچھا تو اس کی چالیس دنوں کی نمازیں قبول نہیں ہوتیں۔''

دوسری حدیث سنن اربعہ، مسند احمد و بزار اور مستدرک حاکم میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، جس میں نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشادِ گرامی ہے:

«مَنْ أَتٰى كَاهِنًا أَوْ عَرَّافًا وَصَدَّقَهٗ، بِمَا يَقُوْلُ، فَقَدْ كَفَرَ بِمَا أُنْزِلَ عَلٰى مُحَمَّدٍ»[2]

''جو شخص کسی کاہن (ماضی و مستقبل کی خبریں جاننے کا دعویٰ کرنے والے) اور قیافہ شناس کے پاس گیا اور اس کی باتوں کو سچ مانا تو اس نے شریعتِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم سے انکار کیا۔''

ایسے ہی مسند بزار، معجم طبرانی اوسط اور حلیۃ الاولیاء ابونعیم میں حضرت ابن عباس، حضرت ابن ابی طالب اور عمران بن حصین رضی اللہ عنہم سے جید سند کے ساتھ مروی ہے کہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

«لَيْسَ مِنَّا مَنْ تَطَيَّرَ أَوْ تُطُيِّرَ لَهٗ أَوْ تَكَهَّنَ أَوْ تُكُهِّنَ لَهٗ أَوْ سَحَرَ أَوْ سُحِرَ لَهٗ وَمَنْ أَتٰى كَاهِنًا فَصَدَّقَهٗ بِمَا يَقُوْلُ فَقَدْ كَفَرَ بِمَا أُنْزِلَ عَلٰى مُحَمَّدٍ ﷺ»[3]

''جس نے جانور اُڑا کر شگون لیا یا کسی سے یہ کام کروایا، یا جس نے کہانت وغیب دانی کی یا کسی سے کہانت کروائی، یا جادو کیا یا کسی سے جادو کروایا، وہ ہم میں سے نہیں ہے اور جو شخص غیب کی خبریں دینے کا دعویٰ کرنے والے کاہن کے پاس گیا اور اس کی بات کو سچ مانا تو اس نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل شدہ شریعت سے انکار کیا۔''

جبکہ صحیح مسلم، سنن ابو داود، نسائی اور مسند احمد میں حضرت معاویہ بن حکم سلمی رضی اللہ عنہ بیان فرماتے

---

[1] صحيح مسلم مع شرح النووي (٧/ ١٤/ ٢٢٧)

[2] مسند أحمد (٢/ ٢٠٨) صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٣٠٤) صحيح سنن الترمذي، رقم الحديث (١١٦) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٦٣٩) سنن الدارمي (١/ ٢٥٩) صحيح الجامع، رقم الحديث (٥٩٣٩، ٥٩٤٢)

[3] مجمع الزوائد (٣/ ٥/ ١٢٠) التلخيص الحبير (٢/ ٤/ ٤٠) الترغيب (٥/ ٢٤٥) قبولیت عمل کی شرائط (ص: ١٠٨)

ہیں کہ میں نے نبیِ اکرم ﷺ کی خدمت میں عرض کی کہ عہدِ جاہلیت میں ہم بعض امور پر یہ عقیدہ رکھتے تھے، مثلاً ہم کاہنوں کے پاس جاتے تو نبیِ اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((فَلَا تَأْتُوا الْكُهَّانَ)) ''کاہنوں کے پاس مت جاؤ۔''

انھوں نے عرض کی کہ ہم پرندے کو اُڑا کر شگون لیتے تھے تو نبیِ اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((ذٰلِكَ شَيْئٌ يَجِدُهُ أَحَدُكُمْ فِيْ نَفْسِهٖ فَلَا يَصُدَّنَّكُمْ))[1]

''یہ ایک چیز ہے، جسے تم میں سے کوئی شخص اپنے دل میں پاتا ہے، لیکن تمھیں یہ کسی کام سے نہ روکے۔''

ضعیف الاعتقاد لوگوں کو لوٹنے اور ایسی خرافات پھیلانے والوں کو بقول علامہ محمد جمال الدین القاسمی مساجد کے حجروں میں نہیں رہنے دینا چاہیے اور ان لوگوں کو بھی سوچنا چاہیے کہ کمائی کی ہوس میں ہر جائز و ناجائز طریقہ اپنائیں، بلکہ رزق کے صرف حلال ذرائع سے روزی کمانے کا اہتمام کریں، کیونکہ وہ تو کچھ نہ کچھ پڑھے لکھے بھی ہوتے ہیں، کیا وہ عامل حضرات قرآنِ کریم نہیں پڑھتے؟ سورۃ البقرہ میں انہی جیسے تعویذ گنڈے کرنے والے فریب کاروں کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿ فَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا كَتَبَتْ اَيْدِيْهِمْ وَ وَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا يَكْسِبُوْنَ ﴾ [البقرة: ٧٩]

''تباہی ہے ان کی اس لکھائی پر اور ہلاکت ہے ان کی اس کمائی پر۔''

کیا انھیں معلوم نہیں کہ سحر اور یہ جادو، ٹونے کفریہ افعال ہیں اور یہ رمل و فال اور نجومت و کہانت سب ممنوع ہیں؟ قرآنِ کریم کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ جادو سیکھنے اور اسے بروئے کار لانے والا کافر ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے سورۃ البقرہ میں ہاروت و ماروت کا قول نقل کیا ہے کہ وہ اپنے پاس جادو سیکھنے کے لیے آنے والوں سے کہتے ہیں:

﴿ اِنَّمَا نَحْنُ فِتْنَةٌ فَلَا تَكْفُرْ ﴾ [البقرة: ١٠٢]

''یقیناً ہم آزمائش کے لیے ہیں، لہٰذا تم کفر میں نہ پڑو۔''

---

[1] صحيح مسلم مع شرح النووي (٧/ ١٤/ ٣٣٣) صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (٨٢٣) پھر عوام تو عوام ہوتے ہیں، خود ایسے فریب کار عاملوں کو یہ معلوم نہیں کہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے ان کے بارے میں کیا کیا وعیدیں فرمائی ہیں؟ یہ چند اگلے صفحات میں ملاحظہ فرمائیں۔

آ گے چل کر فرمایا:

﴿ وَ مَا كَفَرَ سُلَيْمٰنُ وَ لٰكِنَّ الشَّيٰطِيْنَ كَفَرُوْا يُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ السِّحْرَ ﴾

[البقرة: ١٠٢]

''سلیمان نے کفر کی کوئی بات نہیں کی، بلکہ ان شیطانوں ہی نے کفر کیا اور وہ لوگوں کو جادو سکھلایا کرتے تھے۔''

سورت طٰہٰ میں ارشادِ ربانی ہے:

﴿ وَ لَا يُفْلِحُ السّٰحِرُ حَيْثُ اَتٰى ﴾ [طٰهٰ: ٦٩]

''جادوگر جہاں بھی جائے فلاح نہیں پائے گا۔''

جادو گر تعویذ گنڈے کرنے والوں کی آخرت برباد ہونے کا ذکر سورۃ البقرہ میں بھی آیا ہے، چنانچہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَ لَقَدْ عَلِمُوْا لَمَنِ اشْتَرٰىهُ مَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ وَ لَبِئْسَ مَا شَرَوْا بِهٖۤ اَنْفُسَهُمْ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ﴾ [البقرة: ١٠٢]

''اور انھیں (یہود کو) خوب معلوم تھا کہ جو کوئی (ایمان دے کر) جادو کا خریدار بنا، اس کے لیے آخرت میں کوئی حصہ نہیں، اگر وہ سمجھتے ہوتے تو کتنا بُرا بدلہ ہے، جس کے عوض انھوں نے اپنی جانوں کو بیچ ڈالا۔''

غرض کہ امام ابوحنیفہ، مالک، احمد بن حنبل رحمہ اللہ اور سلف صالحین کی کثیر جماعت نے جادو کو کفر قرار دیا ہے۔ امام شافعی رحمہ اللہ کے یہاں کچھ تفصیل ہے اور پھر وہ بھی جادوگر کو کافر ہی قرار دیتے ہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اسے کفر ہی قرار دیا ہے۔[1]

قرآنی آیات کی طرح ہی ارشاداتِ نبویہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی ان لوگوں کے لیے تازیانۂ عبرت ہیں، چنانچہ صحیح بخاری و مسلم، سنن ابو داود اور نسائی میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

((اِجْتَنِبُوا السَّبْعَ الْمُوْبِقَاتِ))[2]

---

[1] هداية المستفيد ترجمه فتح المجيد (٢/ ٧٧٤۔ ٧٧٦) مترجم مولانا عطاء الله ثاقب، طبع طارق اکیڈمی لاهور

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٧٦٦) مختصر صحيح مسلم للمنذري (٤٧) صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (٢٤٩٨) صحيح سنن النسائي، رقم الحديث (٣٤٣٢) صحيح الجامع، رقم الحديث (١٤٤)

''سات ہلاکت خیز (کبیرہ) گناہوں سے بچو۔''

ساتوں کو یکے بعد دیگرے شمار کرتے ہوئے پہلے ''الشرك باللّٰه'' اور دوسرے نمبر پر ''السحر'' یعنی جادو کا نام لیا۔[1]

معجم طبرانی اوسط، مسند بزار اور حلیۃ الاولیاء میں حضرت ابن عباس، حضرت علی اور حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہم سے مروی حدیث ہے، جس میں نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے «لَیْسَ مِنَّا» فرما کر جن لوگوں کو اسلام سے خارج قرار دیا ہے، ان میں سے بھی دو یہی ہیں۔

سنن ترمذی میں مرفوعاً مروی ہے، جسے امام ترمذی نے موقوفاً مروی ہونا ہی صحیح قرار دیا ہے کہ انھوں نے فرمایا:

«حَدُّ السَّاحِرِ ضَرْبُهٗ بِالسَّیْفِ»[2]

''جادوگر کی سزا تلوار سے گردن کاٹنا ہے۔''

اس کی تائید اس اثر فاروقی سے ہوتی ہے، جس میں ہے:

''کَتَبَ عُمَرُ ابْنُ الْخَطَّابِ: أُقْتُلُوْا کُلَّ سَاحِرٍ وَسَاحِرَةٍ''[3]

''ہر جادوگر مرد و زن کو قتل کر دو۔''

موطا امام مالک میں ام المومنین حضرت حفصہ بنت عمر رضی اللہ عنہما کے بارے میں مروی ہے کہ ان کی ایک کنیز نے ان پر جادو کا وار کیا تو ان کے کہنے پر اس جادوگرنی کو قتل کر دیا گیا تھا۔

غرض کہ ان تینوں صحابہ رضی اللہ عنہم کے علاوہ حضرت عثمان، عبداللہ بن عمر، جندب بن کعب اور حضرت قیس بن سعد رضی اللہ عنہم سے ساحر کی سزا قتل مروی ہے اور پانچویں خلیفۂ راشد حضرت عمر بن عبدالعزیز، ایسے ہی امام ابوحنیفہ، امام مالک اور احمد بن حنبل رحمہم اللہ نے بھی جادو کی سزا قتل ہی قرار دی ہے۔[4]

---

[1] مسند بزار (ص: ١٦٩) الطبراني (١٨/ ١٦٢) مجمع الزوائد (٥/ ١١٧) صحيح الجامع، رقم الحديث (٥٤٣٥) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٢١٩٥)

[2] فتح المجيد (ص: ٢٤٢، طبع الرياض) ضعيف سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٤٤) **ملاحظہ ہو ہماری کتاب:** *قبولیتِ عمل کی شرائط* (ص: ١٠٩)

[3] مصنف عبدالرزاق (٨٧٥٢)

[4] فتح المجيد (ص: ٢٤٣، ٢٤٤) تفسير ابن كثير (١/ ١٧٩، مترجم اردو، طبع تعمير انسانيت لاهور)

یہی حال نجومیوں، جوتشیوں، قیافہ شناسوں، فال والوں، سیانوں اور کاہنوں کا بھی ہے، بلکہ ان سب کو بھی جادو کی اقسام ہی قرار دیا گیا ہے، چنانچہ سنن ابو داود، نسائی، ابن ماجہ، صحیح ابن حبان اور مسند احمد میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے:

«مَنِ اقْتَبَسَ شُعْبَةً مِنَ النُّجُومِ فَقَدِ اقْتَبَسَ شُعْبَةً مِّنَ السِّحْرِ زَادَ مَا زَادَ»[1]

''جس شخص نے علمِ نجوم کا کوئی حصہ بھی حاصل کیا، اس نے گویا جادو سیکھا اور جس قدر زیادہ سیکھتا جائے گا، اتنا ہی اس کے گناہ میں اضافہ ہوتا چلا جائے گا۔''

ایسے ہی سنن ابو داود و نسائی اور صحیح ابن حبان میں ہے:

«إِنَّ الْعِيَافَةَ وَالطَّرْقَ وَالطِّيَرَةَ مِنَ الْجِبْتِ»

''پرندوں کو اڑانے، زمین وغیرہ پر لکیریں کھینچنے سے فال لینا اور قیافہ شناسی کرنا یہ سب جادو ہے۔''

علامہ ہیتمی رحمہ اللہ نے ''الزواجر'' (۲/ ۱۰۹، ۱۱۰) میں ان تمام امور کو گناہ کبیرہ شمار کیا ہے۔

غرض ایسے افعال والے لوگوں کو مسجد کے حجروں سے نکال باہر کرنا چاہیے، تقدس اور احترام مسجد کا یہی تقاضا ہے۔ بعض لوگ جادو کو محض نظری بند اور نگاہوں کا فریب قرار دیتے ہوئے اس کی حقیقت ہی کا انکار کر دیتے ہیں، ان کی اس بات کا جامع و مانع جواب اور ان ذکر کیے گئے تمام امور و امراض کی تفصیلات ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں۔ نیز حال ہی میں شائع ہونے والی ہماری کتاب ''قبولیتِ عمل کی شرائط'' حصہ اول (ص: ۱۰۲۔ ۱۲۶) میں اس کی تفصیل دیکھی جا سکتی ہے۔ لہٰذا یہاں ان کے اعادے کی ضرورت نہیں۔

مجذوب لوگوں کو مساجد میں جگہ دینا:

ہمارے ممالک کی بعض مساجد میں کچھ مجذوب قسم کے لوگ بھی برآمدوں یا حجروں میں پڑے گندگی پھیلاتے رہتے ہیں، ان لوگوں میں سے کچھ تو ساتر لباس سے بے نیاز اور مادر پدر آزاد ہوتے ہیں اور لوگوں سے گداگری کرتے یا مانگتے پھرتے ہیں۔ ان میں سے کبھی کبھی ایسے مجذوب و دیوانے

[1] صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٣٠٥) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٣٧٢٦) مسند أحمد (١/ ٣١١) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٧٩٣) صحيح الجامع، رقم الحديث (٦٠٧٤) مسند أحمد (٣/ ٤٧٧) سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٩٠٧) صحيح ابن حبان، رقم الحديث (١٤٢٦)

بھی نظر آ جاتے ہیں، جو سڑکوں پر بھٹکتے پھرتے ہیں اور مختلف قسم کی حرکتوں سے لوگوں کو پریشان کرتے رہتے ہیں۔ مثلاً سر کھلا ہے اور بال بکھرے ہوئے ہیں اور گندے اس قدر کہ دیکھنے سے متلی ہو، پھر اوپر سے بال ایسے بے ڈھنگے کہ بچے اور عورتیں ڈر جائیں اور اپنی شکلیں یوں بگاڑنے کے ساتھ ساتھ ہی بعض نے اپنی بغل میں پتھر دبا کر رکھا ہوتا ہے۔ کئی تو بڑے بڑے کفریہ کلمات اور گالیاں بکتے رہتے ہیں، کسی کی شرمگاہ تک ننگی ہے اور انتہائی احمقانہ حرکتیں کرتا رہتا ہے، لیکن قربان جایئے ہمارے مسلمانوں پر جو خود باہوش وحواس ہوتے ہوئے بھی ان ننگے بدن اور بے دین لوگوں کو ولی مانتے ہیں، ان کے ہاتھ پاؤں دباتے ہیں، ان سے مرادیں مانگتے ہیں اور نہ معلوم انھیں کیا اور کیا مانتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمارے مسلمانوں کو جہالت و گمراہی سے محفوظ فرمائے۔ کہاں مقامِ ولایت اور کہاں یہ اسلامی تعلیمات کی نظافت و پاکیزگی کا منہ چڑانے والے دیوانے؟![1]

شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے اولیاے رحمٰن اور اولیاے شیطان کے مابین فرق کے موضوع پر لکھی گئی اپنی بے نظیر کتاب "الفرقان بين أولياء الرحمن و أولياء الشيطان" میں لکھا ہے:

> ''بندہ اللہ کا ولی اسی وقت ہوسکتا ہے، جبکہ وہ مومن و متقی ہو اور جو شخص نیکیاں کیے بغیر اور برائیاں چھوڑے بغیر اللہ کا تقرب ڈھونڈے، وہ اللہ کا ولی نہیں ہوسکتا۔ ایسے ہی کوئی دیوانہ و پاگل بھی ولی نہیں ہوسکتا، کیونکہ اس کا نہ ایمان صحیح ہے اور نہ اس کی عبادتیں صحیح ہیں اور درجہ ولایت کے حصول کے لیے یہ دونوں چیزیں ضروری ہیں، جس دیوانے کو کبھی افاقہ نہ ہو، وہ مرفوع القلم ہے اور تمام احکام سے معذور ہے۔''

اس سے شیخ الاسلام رحمہ اللہ کا اشارہ ان احادیث کی طرف ہے، جن میں دیوانے کو معذور قرار دیا گیا ہے، چنانچہ ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے سنن ابو داود، نسائی، ابن ماجہ، صحیح ابن حبان، سنن دارمی، مسند احمد، مستدرک حاکم اور منتقی ابن الجارود میں مروی ہے کہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«رُفِعَ الْقَلَمُ عَنْ ثَلَاثَةٍ: عَنِ النَّائِمِ حَتّٰى يَسْتَيْقِظَ، وَعَنِ الْمُبْتَلٰى حَتّٰى يَبْرَأَ [وَفِي رِوَايَةٍ: وَعنِ الْمَجْنُوْنِ وَفِي لَفْظٍ: اَلْمَعْتُوْهِ حَتّٰى يَعْقِلَ أَوْ يَفِيْقَ] وَعَنِ

---

[1] إصلاح المساجد (ص: ٢٢٥)

الصَّبِيِّ حَتّٰى يَكْبُرَ [وَفِي رِوَايَةٍ: حَتّٰى يَحْتَلِمَ] ›[1]

''تین آدمیوں سے قلم (گناہ، ثواب) اُٹھا لیا گیا ہے، سویا ہوا جب تک کہ وہ جاگ نہ جائے، پاگل جب تک اسے افاقہ نہ ہوجائے اور بچہ جب تک بالغ نہ ہوجائے۔''

ایسے ہی سنن ابو داود، ترمذی، ابن ماجہ، صحیح ابن خزیمہ و ابن حبان، سنن دارقطنی، مستدرک حاکم، مسند احمد اور سنن بیہقی میں چار مختلف طُرق سے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، جن میں سے اگرچہ تین طُرق پر کلام کیا گیا ہے، لیکن ایک طریق صحیح سند سے ثابت ہے اور دوسرے طُرق اس کے مؤید ہیں، لہٰذا کبار محدّثین نے ان کے مجموعے پر صحیح کا حکم لگایا ہے، چنانچہ ان میں سے صحیح طریق کے الفاظ ہیں:

‹ رُفِعَ الْقَلَمُ عَنْ ثَلَاثَةٍ: عَنِ الْمَجْنُوْنِ الْمَغْلُوْبِ عَلٰى عَقْلِهٖ حَتّٰى يَفِيْقَ، وَعَنِ النَّائِمِ حَتّٰى يَسْتَيْقِظَ، وَعَنِ الصَّبِيِّ حَتّٰى يَحْتَلِمَ ›[2]

''تین آدمیوں سے قلم اٹھا لیا گیا ہے، دیوانے سے جب تک اسے افاقہ نہ ہوجائے اور سوئے ہوئے سے جب تک وہ بیدار نہ ہوجائے اور بچے سے جب تک وہ بالغ نہ ہوجائے۔''

ان دونوں صحابہ رضی اللہ عنہم کے علاوہ اسی مفہوم و معنیٰ کی متعدد احادیث متعدد دیگر صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم مثلاً حضرت ابو قتادہ، حضرت ابو ہریرہ، حضرت ثوبان، حضرت ابن عباس اور حضرت شداد بن اوس رضی اللہ عنہم سے بھی مروی ہیں، جن کی اسانید متکلم فیہ ہیں، ان کی تخریج حافظ ہیثمی رحمہ اللہ نے ''مجمع الزوائد'' (٣/ ٦/ ٢٥٤) میں اور علامہ زیلعی نے ''نصب الرایۃ'' (٤/ ١٦٤، ١٦٥) میں کر دی ہے۔

غرض کہ ان احادیث سے معلوم ہوا کہ جس دیوانے کو کبھی افاقہ نہ ہوتا ہو وہ تو مرفوع القلم یا معذور ہے اور اگر کسی کو کبھی افاقہ ہوجاتا ہو تو افاقے کی حالت میں اگر اس سے کفر، نفاق یا گناہ سرزد ہوا ہو تو وہ بھی کافر، منافق یا فاسق ہوگا، البتہ اگر یہ دیوانگی کے عالم میں صادر ہوں تو پھر کوئی مؤاخذہ

---

[1] صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٦٩٨) صحيح سنن النسائي، رقم الحديث (٣٢١٠) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٢٠٤١) صحيح ابن حبان: الموارد (١٤٩٦) مسند أحمد (١/ ١٠١۔ ١٠٨) الإرواء (٢/ ٤) صحيح الجامع (٢/ ٣/ ١٧٩) نصب الراية (٤/ ١٦١، ١٦٢)

[2] صحيح سنن أبي داود (٣/ ٨٣٢) صحيح سنن الترمذي، رقم الحديث (١١٥٠) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٢٠٤٢) صحيح الجامع (١٢۔١٣۔ ٣٥١٤) صحيح ابن حبان، رقم الحديث (١٤٩٧) المستدرك للحاكم (١/ ٢٥٨)

نہ ہوگا اور ایسی حالت میں ایسا کوئی شخص ولی بھی نہیں ہوسکتا، کیونکہ درجۂ ولایت کو پانے کے لیے روحانی وجسمانی اور کپڑوں کی صفائی وستھرائی کے ساتھ ساتھ افعالِ خیر واعمالِ صالحہ اور ایمانِ کامل وعقیدۂ صحیحہ بنیادی عنصر ہیں، لہٰذا اگر کوئی ولایت کا دعویٰ کرے اور فرائض ادا نہ کرے اور محارم وممنوعات سے اجتناب نہ کرے، بلکہ اس کے برعکس افعال کا ارتکاب کرے اور ساتھ ہی یہ دعویٰ بھی کرے کہ اس پر نبیِ اکرم ﷺ کی پیروی ضروری نہیں، بلکہ وہ ایسی منازل سے آگے گزر چکا ہے تو ایسا شخص کافر اور دائرہ اسلام سے خارج ہے نہ کہ ولی اللہ۔ مزید تفصیل کے لیے شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کی کتاب ''الفرقان بین أولیاء الرحمن و أولیاء الشیطان'' دیکھی جا سکتی ہے۔

ایسے مجذوب لوگوں کو ولی ماننا صحیح نہیں ہے اور نہ ایسے لوگوں کو مساجد کے حجروں یا برآمدوں میں جگہ دینی چاہیے، تاکہ مساجد کا تقدس واحترام مجروح نہ ہو۔

مساجد میں بلیاں چھوڑنا:

یہ لوگ چاہے دیوانے ہی کیوں نہ ہوں، پھر بھی انسان تو ہوتے ہیں۔ حیرت تو ہمارے ان بھائیوں پر ہے، جو مساجد میں موذی قسم کی بلیاں چھوڑ آتے ہیں۔ یہ بعض علاقوں میں مشاہدے میں آنے والی بات بھی ہے اور بعض اہلِ علم نے بھی اپنی کتاب میں یہ حیرت ناک بات لکھی ہے، چنانچہ امام ابن الحاج نے اپنی کتاب ''المدخل'' میں لکھا ہے:

''پہلے لوگ اللہ کے گھروں (مساجد) کی توقیر واحترام کیا کرتے تھے اور انھیں نامناسب اشیا سے پاک و صاف رکھتے تھے، لیکن اب معاملہ مختلف ہے۔ موجودہ دور میں لوگ مسجدوں میں بلیوں کو جگہ دیتے ہیں، جن سے لوگوں کو تکلیف ہوتی ہے، مسجد میں گندگی پھیلتی ہے اور مسجد میں بلیوں کے گندگی پھیلانے کی طرف توجہ دیے بغیر کسی کے گھر میں موذی قسم کی بلی ہوتو وہ سیدھا اسے مسجد میں چھوڑ آتا ہے۔'' إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ.[1]

مجذوب ومجنون آدمی اور بلی یا کسی بھی جانور کو مسجد میں داخل کرنے کو امام نووی رحمہ اللہ کے حوالے سے علامہ زرکشی نے بھی مکروہ لکھا ہے۔[2]

---

[1] إصلاح المساجد (ص: ٢٢٥)

[2] إعلام الساجد (ص: ٣١٢، ٣١٣)

پاگل اور دیوانے چاہے کچھ لوگوں کے نزدیک ولی ہی کیوں نہ کہلاتے ہوں، وہ اور جانور مسجد کے تقدس و احترام کا پاس نہیں رکھ سکتے، لہٰذا متولیانِ مساجد کی ذمے داری ہے کہ وہ انھیں مساجد سے دور رکھیں اور کسی کو اگر احترامِ آدمیت و انسانیت کا پاس کرنے کی توفیق ہو تو بے آسرا و بے سہارا دیوانوں کے لیے گاؤں یا شہر کے اہلِ محلّہ کو ساتھ ملا کر انھیں یعنی دیوانوں کو کسی ہسپتال میں داخل کروایا جائے، جہاں ان کا علاج بھی ہو اور لوگ ان کے شر سے اور مساجد ان کے غلاظت پھیلانے سے بھی محفوظ رہیں۔ وہ لوگ قابلِ رحم ہیں، لیکن اس کا یہ مطلب بھی ہرگز نہیں کہ انھیں مساجد میں چھوڑ دیا جائے، یہ فعل تقدّس و احترامِ مسجد کے سراسر منافی ہے اور یہی معاملہ بلیوں کا بھی ہے۔

یہاں ہم ایک بات کی وضاحت کر دینا ضروری سمجھتے ہیں کہ مجذوبوں، دیوانوں اور بلیوں وغیرہ کو مساجد سے دور رکھنا محض اس لیے ہے کہ یہ گندگی کا باعث بنتے ہیں اور یہ بات احترامِ مسجد کے منافی ہے۔ اس سلسلے میں بعض احادیث بھی مروی ہیں، لیکن وہ ضعیف ہونے کی وجہ سے نا قابلِ استدلال ہیں، جیسا کہ بعض احادیث مساجد میں نفاذِ حدود کے سلسلے میں ذکر کی جا چکی ہیں، مثلاً حضرت ابو الدرداء، حضرت واثلہ بن اسقع اور حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہم سے مرفوعاً طبرانی کبیر، خلافیاتِ بیہقی اور مصنف عبدالرزاق میں اور سنن ابن ماجہ میں حضرت واثلہ رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً اور مصنف ابن ابی شیبہ میں مکحول سے مرسلاً مروی ہے:

«جَنِّبُوا مَسَاجِدَكُمْ صِبْيَانَكُمْ وَمَجَانِيْنَكُمْ وَشِرَارَكُمْ وَبَيْعَكُمْ وَخُصُومَاتِكُمْ وَأَصْوَاتِكُمْ وَسَلَّ سُيُوفِكُمْ وَإِقَامَةَ حُدُودِكُمْ»[1]

''اپنی مسجدوں کو بچوں، دیوانوں، برے لوگوں، خرید و فروخت، جھگڑوں، آوازوں کے شور، ننگی تلواروں اور نفاذِ حدود سے بچاؤ۔''

اس کے بارے میں ذکر کیا جا چکا ہے کہ یہ مرسل اور ایک طریق سے مرفوع مگر ضعیف ہے۔[2]

امام مکحول ہی کے طریق سے ایک روایت حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے بھی مرفوعاً معجم طبرانی کبیر میں مروی ہے، جس میں ہے:

«جَنِّبُوا مَسَاجِدَكُمْ صِبْيَانَكُمْ وَخُصُومَاتِكُمْ وَحُدُودَكُمْ وَشِرَاءَ كُمْ وَبَيْعَكُمْ»[3]

---

[1] ضعیف سنن ابن ماجه (ص: ٥٩، برقم: ١٩٤) ضعیف الجامع حدیث (٢٦٣٥) الإرواء (٧/ ٣٦١)

[2] مجمع الزوائد (١/ ٢/ ٢٨، ٢٩)

[3] مجمع الزوائد (١/ ٢/ ٢٩)

’’مساجد کو بچوں، جھگڑوں، نفاذِ حدود اور خرید و فروخت سے بچاؤ۔‘‘

اس حدیث میں دیوانوں کا تو ذکر ہی نہیں، ویسے بھی مکحول کا حضرت معاذ رضی اللہ عنہ سے حدیث سننا ہی ثابت نہیں ہے، لہٰذا یہ حدیث قابلِ استدلال نہ ہوئی۔

بچوں کو مسجد میں لے جانا:

انہی (مذکورہ) احادیث کی بنا پر بعض اہلِ علم نے بچوں کو اور خصوصاً جو پاک و ناپاک کی تمیز نہیں رکھتے، انھیں مسجد میں لے جانے کو مکروہ لکھا ہے، لیکن یہ احادیث ضعیف ہیں، لہٰذا ان کی بنا پر تو یہ صحیح نہیں ہے، البتہ اگر مسجد میں بچے کو لے جانا ہی ہو تو اسے پورا ساتر لباس پہنائیں اور پیشاب و پاخانے کے لیے حفاظتی تدابیر پیمپر وغیرہ باندھیں، جیسا کہ نماز کے لیے ضروری لباس کے موضوع میں بھی یہ بات ذکر کی جا چکی ہے۔ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنی نواسی امامہ بنت زینب رضی اللہ عنہا کو کندھے پر اُٹھا کر نماز پڑھانا، بچوں کے مسجد میں لے جانے کے جواز کی دلیل ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ واقعہ کتبِ حدیث میں سے صحیح بخاری و مسلم، سنن ابو داود و نسائی، مسند ابی عوانہ و احمد اور سنن بیہقی میں آیا ہے۔[1]

ایسے ہی صحیح بخاری، سنن ابو داود، نسائی، ابن ماجہ اور مسند احمد میں حضرت ابو قتادہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ’’میں نماز میں کھڑا ہوتا ہوں اور لمبی نماز پڑھنا چاہتا ہوں‘‘:

« فَأَسْمَعُ بُكَاءَ الصَّبِيِّ » ’’پھر میں بچے کے رونے کی آواز سنتا ہوں۔‘‘ لہٰذا میں نماز ہلکی پڑھا دیتا ہوں، تاکہ بچے کی ماں کے لیے باعثِ مشقت نہ بنوں۔[2]

یہ حدیث بھی دلیلِ جواز ہے، لیکن حفاظتی تدابیر واجب ہیں، تاکہ مسجد میں گندگی پیدا نہ ہونے پائے۔

مسجد کو بچوں کی تعلیم کے لیے مدرسہ بنانا:

بچوں کو مسجد میں داخل کرنے کی ممانعت کے سلسلے میں جو احادیث ذکر کی جا چکی ہیں، انہی کو

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥١٦، ٥٩٩٦) صحيح مسلم مع شرح النووي (٣/ ٥/ ٣١، ٣٢) صحيح سنن أبي داود (١١/ ٨١٢) صحيح سنن النسائي، رقم الحديث (٦٨٧) موطأ الإمام مالك (١/ ١٧٠، رقم الحديث: ٨١) الفتح الرباني (٤/ ١١٩، ١٢٠) شرح السنة (٣/ ٢٦٣) إرواء الغليل (٣/ ١٠٦)

[2] صحيح البخاري (٢/ ٢٣٦) رقم الحديث (٧٠٧) صحيح مسلم مع شرح النووي (٢/ ٤/ ١٨٧) صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (٧٠٨) صحيح سنن النسائي، رقم الحديث (٧٩٥) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٩٩١)

پیشِ نظر رکھ کر بعض اہلِ علم نے کہا ہے کہ بچوں کی تعلیم کے لیے بھی مسجد کا استعمال جائز نہیں ہے، لیکن وہ احادیث ضعیف ہیں، جیسا کہ ہم ذکر کر چکے ہیں، یہی وجہ ہے کہ اہلِ علم کا اس مسئلے میں اختلاف ہے، چنانچہ علامہ بدر الدین زرکشی نے "إعلام الساجد" میں لکھا ہے:

"کسی خاص ضرورت کے بغیر پاک و ناپاک میں تمیز نہ کر سکنے والے بچوں کو مسجد میں داخل کرنا مکروہ ہے، کیونکہ ان سے مسجد میں نجاست پھیلانے کا خدشہ رہتا ہے۔"

امام نووی رحمہ اللہ نے "روضة الطالبين" میں تو بچوں اور دیوانوں کے مسجد میں داخلے کو مطلقاً ممنوع لکھا ہے۔ البتہ صحیح مسلم کی شرح میں اسے جائز قرار دیا ہے۔[1]

یہ تو مطلق دخول کی بات ہوئی، جبکہ اس سلسلے میں احتیاطی تدابیر کے ساتھ جواز کا پہلو ہی راجح ہے، کیونکہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اپنی نواسی امامہ بنت زینب رضی اللہ عنہما کو اٹھا کر نماز پڑھنے اور لمبی نماز کے ارادے کے باوجود کسی بچے کی آواز سن کر نماز ہلکی پڑھ لینے کے عملِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہی تقاضا ہے۔

اب رہا معاملہ مسجد کو مکتب و مدرسہ بنا لینے کا تو اس سلسلے میں علامہ جمال الدین قاسمی نے "إصلاح المساجد" میں لکھا ہے کہ یہ صرف اسی صورت میں جائز ہے، جبکہ کوئی مسجد غیر آباد ہو اور نماز و عبادت کے لیے وہاں کوئی نہ آتا ہو، ان کے نزدیک نمازیوں اور عبادت گزاروں سے آباد مسجد میں قرآن پڑھانے، لکھائی اور پڑھائی کے ابتدائی امور سکھلانے کا مدرسہ کھول بیٹھنے سے مسجد کا اصل مقصد فوت ہو جاتا ہے۔[2]

علامہ زرکشی نے قفال سے ذکر کیا ہے کہ جب ان سے مسجد میں بچوں کو تعلیم دینے کے بارے میں پوچھا گیا تو انھوں نے کہا:

"چھوٹے بچے زیادہ تر مسجد کو نقصان ہی پہنچاتے ہیں، لہٰذا انھیں منع کرنا جائز ہے۔"

امام قرطبی رحمہ اللہ سے نقل کیا ہے کہ بعض علما نے مسجد میں بچوں کی تعلیم کو منع کہا ہے اور انھوں نے اسے خرید و فروخت کے ضمن میں شمار کیا ہے، لیکن یہ تو تب ہے کہ جب مسجد میں تعلیم دینے والا اس کی باقاعدہ تنخواہ لیتا ہو اور اگر کوئی اُجرت کے بغیر بھی پڑھائے تو اسے بھی انھوں نے جائز قرار

[1] إعلام الساجد (ص: ٣١٢، ٣١٣) صحيح مسلم مع شرح النووي (٢/ ٤/ ١٨٧، ٣/ ٥/ ٣٢)

[2] إصلاح المساجد (ص: ٢١٨، ٢١٩، اردو)

نہیں دیا، اس لیے کہ بچوں سے مسجد میں گندگی پھیلنے کا خدشہ موجود رہتا ہے، جو مسجد کی صفائی و ستھرائی کے منافی ہے، جبکہ مسجدوں کی نظافت اور صفائی و ستھرائی کا حکم دیا گیا ہے۔ آگے انھوں نے بھی اسی حدیث سے استدلال کیا ہے، جو ضعیف ہونے کی وجہ سے نا قابلِ استدلال ہے۔[1]

اور بعض دیگر اہلِ علم نے بھی بچوں کی تعلیم کی ممانعت والوں کا قول ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ بچوں کو تعلیم دینے کے لیے بھی آواز بلند کرنی پڑتی ہے، بلکہ بچوں کا شور بھی ہوتا ہے، لہٰذا اس وجہ سے بھی بعض علما نے ممنوع کہا ہے۔

غرض کہ اس تفصیل سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ بہت چھوٹے بچوں کو مسجد میں لے جانے سے پرہیز کیا جائے، یا پھر ساتر لباس اور ضروری احتیاط کر کے لے جائیں اور اگر کوئی اللہ کا بندہ لوجہ اللہ مسجد میں بچوں کو قرآن پڑھانا چاہے تو اس کے پاس پڑھنے کے لیے صرف ان بچوں کو بھیجا جائے جو کچھ سمجھدار ہوں اور پاک و ناپاک کی تمیز رکھتے ہوں، ویسے بھی مسجد میں یا مکتب میں تعلیم حاصل کرنے کے لیے ایسے ہی بچوں کو بھیجا جاتا ہے۔

اب رہیں وہ بعض خواتین جو مسجد قریب ہونے کا فائدہ اٹھانے کے لیے جب چھوٹے بچوں کے شور وشغب اور توڑ پھوڑ سے تنگ آ جاتی ہیں اور صبح نہیں تو عصر کے بعد والے حصے میں اپنے ان بچوں یا بچیوں کو بھی بڑی اولاد کے ساتھ ہی مسجد میں بھیج دیتی ہیں، جنھوں نے نہ کچھ پڑھنا ہوتا ہے نہ لکھنا، ان خواتین کا خیال یہ ہوتا ہے کہ چلیں کچھ وقت یہ باہر جا کر (مسجد میں) ہی گزار آئیں گے تو تھوڑی دیر کے لیے ذرا ہم ستا لیں گی اور قدرے سکون رہے گا۔ ایسی خواتین کو خاص طور پر اپنے اس رویے پر نظر ثانی کرنی چاہیے، کیونکہ مسجد اللہ کا گھر ہے، اس کا تقدس و احترام اور آداب ہیں، وہ کوئی گراونڈ تو ہے نہیں کہ چاہے کسی بھی عمر کے بچے کھیل کود آئیں۔ ہاں جو بچے سمجھ دار اور قرآن پاک پڑھنے یا سیکھنے کی عمر کے ہیں، انھیں بھیجنے میں کوئی حرج نہیں، خصوصاً جبکہ معلم یا حافظ و قاری مسجد میں تعلیم پر اُجرت نہ لیتا ہو، جیسا کہ امام قرطبی رحمہ اللہ کے حوالے سے بعض علما کا قول ذکر کیا گیا ہے۔

بچوں کا مسجد میں آنا یا لانا:

نماز کے لیے ضروری لباس کے ضمن میں بھی بچوں کو مسجد میں لانے کے لیے ضروری تدابیر

[1] إعلام الساجد (ص: ٣٢٧)

ذکر کی جا چکی ہیں۔ آدابِ مسجد کے ضمن میں یہ تو ذکر ہوگیا ہے کہ بعض اہلِ علم نے بچوں کو مسجد میں لانے اور مسجد میں ان کے لیے مکتب و مدرسہ کھولنے سے اختلاف کیا ہے اور بعض دیگر نے کہا ہے کہ اگر دوسرا کوئی انتظام نہ ہوسکتا ہوتو بوقتِ ضرورت و مجبوری بچوں کے مسجد میں پڑھنے کی رعایت ہونی چاہیے، ہاں اگر کوئی دوسرا انتظام ممکن ہوتو پھر مسجد کو بچوں کے شور وشغب وغیرہ سے بچایا جائے۔[1]

مطلق بچوں کے مسجد میں آنے یا لانے کے جواز کے دلائل پر مبنی بعض احادیث بھی ہم ذکر کر چکے ہیں، جبکہ اس سلسلے میں استاذ محترم شیخ الحدیث مولانا حافظ ثناء اللہ صاحب مدنی کا ایک فتویٰ بھی ہفت روزہ ''الاعتصام'' لاہور میں شائع ہو ہے، جو سوال و جواب سمیت ہم یہاں نقل کر رہے ہیں۔

کیا بچے مسجد میں آسکتے ہیں؟

سوال رمضان المبارک میں خصوصاً افطاری کے وقت چھوٹے چھوٹے بچے مسجد میں آجاتے ہیں اور کچھ حضرات ساتھ لے آتے ہیں۔ کچھ بچے، جن میں سے اکثر کا روزہ نہیں ہوتا، نماز سے پہلے ہی گھر لوٹ جاتے ہیں، دوسرے نماز کے دوران میں عموماً مسجد میں دوڑ بھاگ کرتے، باتیں اور شرارتیں بھی کرتے ہیں، یعنی ایک دوسرے کے ساتھ چھیڑ خانی وغیرہ۔ کچھ حضرات یہ کہتے ہیں کہ اگر بچوں کو منع کریں گے تو بڑے ہو کر مسجد میں نہیں آئیں گے۔ براہِ نوازش ارشاد فرمائیں کہ کتنی عمر کے بچوں کو نماز کے لیے مسجد میں لانا چاہیے؟

حدیثِ خیر الانام ﷺ کے مطابق جسے اکثر علما حضرات سے سنا ہے کہ سات سال کی عمر کے بچے کو نماز کی ترغیب دیں، دس سال کا ہوجائے تو نہ پڑھنے پر ماریں۔ مسجدیں ہی امن کی جگہ ہیں، اگر مسجد میں ہی خشوع والی نماز نصیب نہ ہوتو کہاں جائیں؟ کیونکہ بچوں کی وجہ سے جیسے اوپر ذکر کیا ہے، توجہ بٹ جاتی ہے۔ بعض یہ حوالہ بھی دیتے ہیں کہ ایک دفعہ حضورِ اکرم ﷺ جبکہ منبر پر تشریف فرما تھے، حضرت حسین رضی اللہ عنہ جن کی عمر اس وقت چار سال تھی، وہ مسجد میں آئے تو نبی اکرم ﷺ نے منبر سے اتر کر ان کو گود میں لیا۔ اس حوالے سے بچوں کو مسجد میں لانے یا آنے کا جواز نکلتا ہے؟

الجواب بعون الوهاب:

بلا قید عمر کے چھوٹے بچوں کو مسجد میں آنا یا لانا درست فعل ہے۔ صحیح حدیث میں وارد ہے کہ

[1] جدید فقہی مسائل (ص: ٦٥)

رسول اللہ ﷺ اپنی نواسی امامہ بنت زینب رضی اللہ عنہا کو اٹھا کر نماز پڑھتے تھے، بوقت سجدہ اسے بٹھا دیتے اور جب قیام کے لیے اُٹھنے لگتے تو اُٹھا لیتے۔

شارح بخاری حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"وَعَلَىٰ جَوَازِ إِدْخَالِ الصِّبْيَانِ فِي الْمَسَاجِدِ"[1]

یعنی اس حدیث میں بچوں کو مسجد میں لانے کا جواز ہے۔"

نیز صحیح مسلم میں راوی کا بیان ہے:

"رَأَيْتُ النَّبِيَّ ﷺ يَؤُمُّ النَّاسَ وَ أُمَامَةُ عَلٰى عَاتِقِهٖ"

"میں نے نبی ﷺ کو لوگوں کی امامت کراتے دیکھا، اور امامہ رضی اللہ عنہا آپ ﷺ کے کندھے پر سوار تھی۔"

سنن ابی داود میں راوی کے شک کے ساتھ نمازِ ظہر یا نمازِ عصر کا ذکر موجود ہے۔ ظاہر ہے کہ فرض نماز ادا کرنے کے لیے محل و مقام مسجد ہے، انہی طُرق کے پیشِ نظر حافظ موصوف نے مذکورہ نتیجہ اخذ کیا ہے، اسی طرح دوسری روایت میں ہے کہ ایک بچہ عَمرو بن سلمہ رضی اللہ عنہ قراءت میں امتیازی حیثیت کی بنا پر چھے یا سات سال کی عمر میں عہدِ نبوی ﷺ میں اپنی قوم کا امام تھا۔[2]

واقعہ ہٰذا سے ظاہر ہے کہ امامت کا شرف موصوف کو مسجد ہی میں حاصل ہوتا تھا، پھر حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما صغر سنی کے باوجود جماعت میں شرکت فرماتے تھے، چنانچہ ان کا بیان ہے کہ میں ایک دفعہ اپنی سواری کو منیٰ میں چرنے کے لیے چھوڑ کر خود جماعت میں شریک ہوگیا تھا۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے اس سے اور دیگر روایات سے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ بچوں کا وضو، جماعت میں شرکت، عیدین، جنائز اور صفوں میں موجودگی سب ثابت شدہ امور ہیں، جن میں کوئی کلام نہیں ہوسکتا۔[3]

مزید براں ایک دفعہ آپ ﷺ عشاء کی نماز سے لیٹ ہوگئے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

«نَامَ النِّسَاءُ وَالصِّبْيَانُ» "یعنی عورتیں اور بچے سو گئے۔"

اس کی تشریح میں حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

---

[1] فتح الباري (١/ ٥٩٢)

[2] صحيح البخاري (٢/ ٦١٥، ٦١٦)

[3] صحيح البخاري (١/ ١١٨)

"أَيِ الْحَاضِرُوْنَ فِي الْمَسْجِدِ"[1] ''یعنی وہ جو مسجد میں موجود تھے۔''

حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی مسجد میں آمد و رفت متعدد احادیث میں مصرَّح ہے۔ ملاحظہ ہو: مسند احمد وغیرہ۔ ایک اور صحیح روایت میں فرمانِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہے کہ ''میں بچے کا رونا سن کر نماز ہلکی کر دیتا ہوں کہ کہیں یہ امر بچے کی والدہ پر گراں نہ گزرے۔''

اسی طرح حدیث: «مُرُوْا أَوْلَادَكُمْ بِالصَّلَاةِ إِذَا بَلَغُوْا سَبْعًا» ''بچے جب سات سال کے ہو جائیں تو انھیں نماز کا حکم دیں۔'' بھی مسجد میں بچوں کی آمد مترشح ہے۔ دوسری طرف محدّثینِ کرام نے چار پانچ سال کے بچے کا سماعِ حدیث بھی قابلِ اعتبار سمجھا ہے۔ یہ اس صورت میں ممکن ہے، جبکہ اسے عام مجلس میں آنے کی اجازت ہو، جس میں مسجد بھی شامل ہے۔ حدیث میں وارد ہے:

«إِنَّمَا بُنِيَتِ الْمَسَاجِدُ لِمَا بُنِيَتْ لَهٗ»

''مسجدیں جس کام کے لیے بنائی گئی ہیں، وہی کام ان میں ہونا چاہیے۔''

زیرِ حدیث امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"مَعْنَاهُ لِذِكْرِ اللّٰهِ وَالصَّلَاةِ وَالْعِلْمِ وَالْمُذَاكَرَةِ فِي الْخَيْرِ وَنَحْوِهَا"

یعنی (اس حدیث کا مفہوم یہ ہے کہ) مساجد اللہ کی یاد، نماز، تعلیم و تعلّم اور امورِ خیر میں گفتگو کے لیے بنائی گئی ہیں۔''

لہٰذا عام حالات میں کسی کو حق نہیں کہ بچوں کو مسجد میں آنے سے روکے، البتہ بچے اگر شریر قسم کے ہوں، جس سے احترامِ مسجد اور آدابِ مسجد مجروح ہوتا ہو تو بطورِ تادیب ان کے خلاف مناسب کارروائی ہو سکتی ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مسجد میں بچوں کے کھیل کود پر دُرّے لگائے تھے۔

ایک روایت میں ہے:

«جَنِّبُوْا مَسَاجِدَكُمْ صِبْيَانَكُمْ»[2] ''اپنی مسجدوں کو بچوں سے بچاؤ۔''

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے اس کی وجہ یہ لکھی ہے:

"لِأَنَّهُمْ يَلْعَبُوْنَ فِيْهِ وَلَا يُنَاسِبُهُمْ"

''کیونکہ وہ کھیل کود کرتے ہیں اور وہ ان کے مناسب نہیں۔''

---

[1] فتح الباري (٢/ ٤٨)

[2] إسناده ضعيف، فتح الباري (١/ ٥٤٩)

تاہم مہذّب اور مؤدّب بچوں کو بلا روک ٹوک مسجد میں آنے کی اجازت ہے۔ لہو و لعب اور شورغل کرنے والوں کا محاسبہ ایک لازمی امر ہے، تاکہ مسجد کی طہارت میں فرق نہ آنے پائے۔[1]

مساجد سے جلوس نکالنا:

آدابِ مسجد کے خلاف امور و افعال میں سے ایک امر یہ بھی ہے کہ بعض لوگ سال کے مختلف مواقع پر اپنے مریدوں اور خلفا یا حاشیہ نشینوں کو ساتھ لے کر مسجد میں اکٹھے ہوتے ہیں اور پھر منظّم صورت میں جلوس نکالتے ہیں، جھنڈے لہراتے ہوئے اور بعض جگہوں پر ڈھول وغیرہ بجاتے ہوئے پہلے ایک جگہ اکٹھے ہوتے ہیں، پھر منظّم صورت میں وہاں سے چلتے ہیں اور ان جلوسوں میں بعض ایسے غیر شرعی امور بلکہ صریح بدعات کا ارتکاب کیا جاتا ہے جن کا دینِ اسلام اور اس کی تعلیمات سے دور کا بھی کوئی واسطہ نہیں ہوتا، بلکہ ان کی بعض حرکتیں تو ایسی ہوتی ہیں، جنھیں دیکھ کر کم عقلوں کو ہنسی اور عقلمندوں کو رونا آتا ہے۔

ان لوگوں نے اپنے لیے جو راستہ اختیار کر رکھا ہے، خود ان کی زبان کے مطابق تو اس میں اخلاص، تنہائی سے محبت، لوگوں سے دوری، بیہودہ کلام سے اجتناب، ہمیشہ ذکر و فکر میں مصروفیت، شب بیداری کرنا، تہجد پڑھنا، لوگوں سے بے نیاز رہنا اور سنتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع کرنا واجبات میں سے ہے، لیکن عملی طور پر ان اصولوں کی کوئی پروا نہیں کی جاتی۔

سنتوں کی جگہ بدعات نے لے لی ہے اور شریعت، خواہشاتِ نفس کی بھینٹ چڑھا دی گئی ہے، ان کے لکھے ہوئے یا زبانی اصولوں اور ان کے عملی کردار کا موازنہ کر کے تو دیکھیے، بات کھل کر سامنے آجائے گی۔ کہاں ان کی یہ حرکتیں اور کہاں باطن کی صفائی و اخلاص؟ کہاں لوگوں سے دوری و گمنامی کا دعویٰ اور کہاں ان کے یہ نمایشی ہتھکنڈے؟ کہاں ذکر و فکر اور تواضع اور کہاں گھوڑوں پر سوار ڈھول تاشے کے ساتھ چلنا؟ کہاں لوگوں سے دوری و بے نیازی کے دعوے اور کہاں دنیوی معاملات میں مزاحمت؟ کہاں ریاکاری و دکھلاوے سے دوری کے اعلانات اور کہاں ہزاروں، لاکھوں کے ساتھ لچکتے مٹکتے چلنا؟ ان امور و افعال کے ہوتے ہوئے ارشاد و سلوک اور پیر و شیخ کی بات کے کیا معنے؟

لگتا ہے کہ یہ سب کچھ دنیوی مفاد اور معاشی منفعت کے لیے کیا جاتا ہے۔ طبلے کی تھاپ پر

[1] ہفت روزہ الاعتصام لاہور (جلد: ۴۳، شمارہ: ۴۸، بابت جمادی الاولیٰ ۱۴۱۲ھ بمطابق: ۲۹ر نومبر ۱۹۹۱ء)

ان کا جھومنا، بھنگڑے اور دھمالیں ڈالنا، بلکہ رقص کرنا اور چیخ و پکار مچانا، غیر مسلم لوگوں کے دلوں پر کتنی غلط تصویر ثبت کرتا ہے۔ انھیں تو معلوم ہے کہ مسلمانوں کی عبادت خشوع و خضوع اور انتہائی اطمینان وسکون سے ہوتی ہے، لیکن بظاہر اہلِ صفا، لیکن در حقیقت اہلِ ہوس و ہوا کو ناچتے، جھومتے دیکھتے ہیں تو کیا سوچتے ہوں گے؟ ہمارے لوگوں کے ایسے افعال غیر مسلموں کو دینِ اسلام سے متنفر کرنے کا باعث بن رہے ہیں اور کچھ بھی نہ ہو تو علماے تاریخ و سیرت نے نبیِ اکرم ﷺ کی حیات طیبہ اور سیرتِ مبارکہ کا ایک ایک لمحہ محفوظ کر رکھا ہے۔ کیا ان میں کسی نے یہ افعال دیکھے ہیں؟ آپ ﷺ کے تمام افعال و ارشادات اور حرکات وسکنات مدوّن ہیں، کیا ان میں ایسی کسی بات کا سراغ ملتا ہے؟ خلفاے راشدین، عام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم، تابعین اور ائمہ عظام رحمہم اللہ حتیٰ کہ متقدمین صوفیا کا عمل ہمارے سامنے ہے، کیا ان میں سے کسی نے کبھی ایسا کیا تھا؟ پھر وہ بھی مسجد کے حوالے سے؟ ہرگز نہیں۔ یہ ان مسعود و میمون ادوار کے بعد کی ایجادات و اختراعات ہیں، لہٰذا ایسے جلوسوں میں شریک ہونے اور ان کی رونق بڑھانے سے بچنے ہی میں عافیت ہے۔[1]

مسجد میں ہاتھوں کی انگلیوں میں انگلیاں ڈالنا:

مسجد اور خصوصاً نماز کے آداب میں سے ایک ادب یہ بھی ہے کہ نماز کے دوران میں یا نماز کے انتظار کی خاطر مسجد میں بیٹھے ہوئے یا گھر سے وضو کر کے مسجد جاتے ہوئے کسی بھی مقام پر اپنے دونوں ہاتھوں کی انگلیوں کو ایک دوسرے میں نہ ڈالا جائے، کیونکہ یہ فعل ممنوع ومکروہ ہے اور احادیث میں اس کی ممانعت کے کئی دلائل موجود ہیں، مثلاً سنن دارمی، مستدرک حاکم اور صحیح ابن خزیمہ میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے دو طریق سے مروی ہے کہ نبیِ اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

«إِذَا تَوَضَّأَ أَحَدُكُمْ فِيْ بَيْتِهٖ ثُمَّ أَتَى الْمَسْجِدَ كَانَ فِي الصَّلَاةِ حَتّٰى يَرْجِعَ فَلَا يَفْعَلْ هٰكَذَا، شَبَّكَ بَيْنَ أَصَابِعِهٖ»[2]

”تم میں سے کوئی شخص جب اپنے گھر میں وضو کرے اور مسجد میں آئے تو واپس گھر

[1] إصلاح المساجد (ص: ٢٦٧۔ ٢٦٩)

[2] سنن الدارمي (١/ ٣٤٨، طبع دار القلم دمشق) صحيح ابن خزيمة (١/ ٢٢٧ تا ٢٢٩) الإرواء (٢/ ١٠١، ١٠٢ و صححه) صحيح الجامع (١/ ١/ ١٨١) صحيح الترغيب (١/ ١٩٠، ١٩١) السلسلة الصحيحة (٣/ ٢٨٤) تحقيق المشكاة المصابيح (١/ ٣١٤)

لوٹنے تک وہ گویا نماز ہی میں ہے، لہٰذا اس دوران میں یوں مت کرے اور پھر آپ ﷺ نے ایک ہاتھ کی انگلیوں کو دوسرے ہاتھ کی انگلیوں میں ڈالا۔''

ایسے ہی سنن دارمی اور طبرانی اوسط میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبیِ اکرم ﷺ نے فرمایا:

«إِذَا تَوَضَّأَ أَحَدُكُمْ لِلصَّلَاةِ فَلَا يُشَبِّكَ بَيْنَ أَصَابِعِهِ»[1]

''تم میں سے جب کوئی نماز کے لیے وضو کرے تو پھر دونوں ہاتھوں کی انگلیوں کو ایک دوسرے میں داخل نہ کرے۔''

اسی طرح سنن ابو داود، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ، مسند احمد و طیالسی اور سنن دارمی و بیہقی میں حضرت کعب بن عجرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبیِ اکرم ﷺ نے فرمایا:

«إِذَا تَوَضَّأَ أَحَدُكُمْ فَأَحْسَنَ وُضُوءَهُ، ثُمَّ خَرَجَ عَامِدًا إِلَى الْمَسْجِدِ فَلَا يُشَبِّكَنَّ بَيْنَ أَصَابِعِهِ فَإِنَّهُ فِي الصَّلَاةِ»[2]

''جب تم میں سے کوئی شخص وضو کرے اور خوب اچھی طرح وضو کرے اور مسجد میں نماز ادا کرنے کے ارادے سے نکلے تو وہ اپنی انگلیوں کو ایک دوسرے میں داخل نہ کرے، کیونکہ وہ نماز ہی میں ہے۔''

اسی سلسلے میں سنن ابی داود میں صحیح سند کے ساتھ حضرت سالم رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انگلیوں میں انگلیاں ڈال کر نماز پڑھنے والے شخص کے بارے میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا:

''تِلْكَ صَلَاةُ الْمَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ''[3]

''یہ تو ان لوگوں کی نماز کا طریقہ ہے، جن پر اللہ کا غضب نازل ہوا۔''

مسند احمد اور مصنف ابن ابی شیبہ کی ایک حدیث میں ہے:

---

[1] صحيح الجامع، رقم الحديث (٤٤٦) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (١٢٩٤)

[2] صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (٥٢٦) صحيح سنن الترمذي، رقم الحديث (٣١٦) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٩٦٧) الفتح الرباني (٤/ ٨٩) صحيح الترغيب (١/ ١٩١) إرواء الغليل (٢/ ٩٩۔ ١٠٢) نيل الأوطار (١/ ٢/ ٣٣٠) مسند أحمد (٤/ ٢٤١) سنن الدارمي (١/ ٣٢٧) صحيح الجامع، رقم الحديث (٤٤٦) السلسلة الصحيحة (١٢٩٤)

[3] إرواء الغليل (٢/ ١٠٢، ١٠٣)

«إِنَّ التَّشْبِيكَ مِنَ الشَّيْطَانِ وَإِنَّ أَحَدَكُمْ لَا يَزَالُ فِي صَلَاةٍ مَا دَامَ فِي الْمَسْجِدِ حَتَّى يَخْرُجَ مِنْهُ»[1]

''یہ انگلیوں کو انگلیوں میں ڈالنا شیطانی فعل ہے اور تم میں سے کوئی جب تک مسجد میں رہے، وہ نماز ہی میں شمار ہوتا ہے، جب تک کہ وہ وہاں سے نکل نہ جائے۔''

سنن ابو داود، ترمذی، ابن ماجہ، صحیح ابن حبان اور مسند احمد کی ایک حدیث میں ہے:

«أَنْتَ فِي صَلَاةٍ مَا انْتَظَرْتَ الصَّلَاةَ»[2]

''تم جب تک نماز کے انتظار میں رہو گے تم ایسے ہی ہو گے جیسے نماز ہی پڑھ رہے ہو۔''

ان ارشاداتِ نبویہ ﷺ سے پتا چلتا ہے کہ گھر سے نکلنے سے لے کر مسجد سے نکلنے تک کسی بھی موقع پر ہاتھوں کی انگلیوں کو ایک دوسرے میں داخل نہیں کرنا چاہیے، دوسرے یہ کہ جب تک کوئی شخص کسی نماز کے انتظار میں مسجد ہی میں بیٹھا رہے، اس کے لیے اتنا ثواب لکھا جاتا ہے، جتنا اس کے لیے لکھا جاتا ہے، جو اس عرصے میں نماز ہی میں مشغول رہے، اسی لیے اس عرصے میں اس فعل کو ممنوع و مکروہ قرار دیا گیا ہے۔

کراہت یا ممانعت کی حکمتیں:

اس فعل کے مکروہ قرار دیے جانے کی حکمت کے بارے میں پانچ مختلف اقوال ملتے ہیں:

1. یہ ایک کارِ عبث اور لایعنی فعل ہے۔
2. اختلاف سے مشابہت رکھنے والا فعل ہے۔
3. اس میں شیطان سے مشابہت پائی جاتی ہے، جیسا کہ حدیث گزری ہے۔
4. یہ انداز خشوع و خضوع کے منافی ہے۔
5. اس طرح نیند کا غلبہ ہو جاتا ہے اور وضو ٹوٹنے کا خدشہ ہوتا ہے۔

چنانچہ امام نووی رحمہ اللہ نے ''ریاض الصالحین'' میں لکھا ہے:

''اگر کوئی شخص اپنے گھٹنوں کے گرد باہیں ڈالے، انگلیوں میں انگلیاں پھنسائے، گوٹھ مار

---

[1] مسند أحمد (٢/ ٤٢، ٥٤) نيل الأوطار (١/ ٢/ ٣٣٤) تحقيق المشكاة المصابيح (١/ ٣١٤)

[2] الفتح الرباني (٤/ ٨٨) وقال: سنده جيد. صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٤٦) صحيح سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٧١) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٧٩٩)

کر بیٹھے گا تو نیند آ جائے گی، لہٰذا اس سے ایک تو یہ کہ وضو ٹوٹ جائے گا، دوسرا نقصان یہ بھی ہوگا کہ اگر جمعہ کے دن دورانِ خطبہ ایسے بیٹھے گا تو نیند سے وضو کا ٹوٹنا تو ایک طرف وہ خطبہ بھی نہ سن پائے گا، جو ایک خسارے کا سودا ہے۔"[1]

انگلیوں میں انگلیاں ڈالنے کی چار صورتیں:

علامہ بدر الدین الزرکشی نے متاخرین علما سے نقل کیا ہے کہ انھوں نے انگلیوں میں انگلیاں ڈالنے کو چار صورتوں میں تقسیم کیا ہے:

پہلی صورت:

انسان نماز کی حالت میں ہو اور دورانِ نماز ہی اپنے ہاتھوں کی انگلیوں کو ایک دوسرے میں ڈالے، اس صورت کی ممانعت و کراہت ذکر کی گئی احادیث میں بالصراحت موجود ہے، جس میں کسی قسم کے شک و شبہے کی کوئی گنجایش ہی نہیں ہے۔

دوسری صورت:

آدمی مسجد میں نماز کے انتظار میں بیٹھا ہو یا پھر گھر سے وضو کر کے مسجد کی طرف جانے اور نماز پڑھنے کا ارادہ ہو، تو یہ بھی ہر دو صورتوں میں نمازی کے حکم میں شمار ہوتا ہے، لہٰذا اس صورت کے ہر دو پہلوؤں میں بھی انگلیوں میں انگلیاں ڈالنا ممنوع فعل ہے، اس کی ممانعت بھی گذشتہ احادیث میں وارد ہوئی ہے۔

تیسری صورت:

انسان مسجد میں تو ہو، لیکن نہ تو وہ ابھی کوئی نماز پڑھنے کا ارادہ رکھے اور نہ کسی دوسری نماز کے انتظار میں ہو، بلکہ نماز سے فارغ ہو کر نکلنے سے پہلے ویسے ہی مسجد میں کسی وجہ سے رُکا ہوا ہو تو اس کے لیے گنجایش موجود ہے کہ وہ انگلیوں میں انگلیاں ڈال لے، یہ جائز تو ہے، اگرچہ پرہیز ہی بہتر ہے، اس کے جواز پر دلالت کرنے والی احادیث بھی آگے چل کر ہم ذکر کرنے والے ہیں۔

چوتھی صورت:

مسجد سے باہر کہیں ہو اور نماز کے لیے مسجد کی طرف بھی نہ آنے والا ہو تو اس مطلق صورت

[1] دیکھیے: رياض الصالحين (ص: ٦٣٨) إعلام الساجد (ص: ٣٣٤) فتح الباري (١/ ٥٦٧)

میں بھی اس کی اباحت اور عدمِ کراہت تو بالاولیٰ ہے۔[1]

چار مختلف صورتوں پر مشتمل اس تقسیم کا ایک بڑا فائدہ یہ بھی ہے کہ دو مختلف قسم کی احادیث میں جو بظاہر تضاد و تعارض بنتا نظر آتا ہے کہ بعض میں جواز اور بعض میں ممانعت وارد ہوئی ہے تو اس تقسیم سے وہ سارا تضاد و تعارض ختم ہو جاتا ہے۔

خواتین کے لیے حکم:

یہ معاملہ کوئی صرف مسجد میں جا کر نمازیں پڑھنے والے مردوں کے ساتھ ہی خاص نہیں ہے، بلکہ اس فعل کی کراہت و ممانعت جہاں مردوں کے لیے ہے، وہیں عورتوں کے لیے بھی ہے۔ وہ مسجد میں نہیں آتیں تو کم از کم گھر میں سہی جانماز پر تو کھڑی ہوتی اور بیٹھتی ہیں، کچھ نماز پڑھ کر اور کچھ امور کے لیے اور کبھی ایک نماز پڑھ کر دوسری کے لیے بھی جانماز پر بیٹھی رہتی ہیں، پھر وہ بھی تو وضو کر کے جانماز کا اہتمام کرتی ہیں، ان سب صورتوں کے دوران میں ان کے لیے بھی انگلیوں میں انگلیاں ڈالنا ممنوع ہے اور جن دو صورتوں میں مَردوں کے لیے اباحت اور عدمِ کراہت ذکر کی گئی ہے، ظاہر ہے کہ انھی دو صورتوں میں عورتوں کے لیے بھی اباحت اور عدمِ کراہت وارد ہے۔

جواز کی صورتیں اور رفعِ تعارض:

اب رہیں وہ دو صورتیں جن میں دونوں ہاتھوں کی انگلیو ں میں انگلیاں ڈالنا جائز ہے، ان میں سے پہلی یہ کہ کوئی شخص مسجد سے باہر تو نہ نکلا ہو، لیکن نہ وہ کچھ اور نماز پڑھتا ہو اور نہ وہ اگلی نماز کے انتظار میں ہو، ایسی صورت میں یہ جائز ہے اور اگر مسجد سے باہر ہو اور وضو کر کے نماز کے لیے مسجد بھی نہ جا رہا ہو تو اس مطلق حالت میں یہ بالاولیٰ جائز ہوگا، چنانچہ اس سلسلے میں جن احادیث سے استدلال کیا جاتا ہے، ان میں سے ایک تو وہ ہے جو صحیح بخاری و مسلم، سنن ترمذی و نسائی اور کتاب الایمان ابن ابی شیبہ میں حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، جس میں وہ بیان کرتے ہیں کہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«إِنَّ الْمُؤْمِنَ لِلْمُؤْمِنِ كَالْبُنْيَانِ يَشُدُّ بَعْضُهُ بَعْضًا»

''ایک مومن دوسرے مومن کے لیے (سیسہ پلائی) دیوار کی طرح ہے جس کے حصے ایک

[1] إعلام الساجد (ص: ٣٣٤، ٣٣٥)

دوسرے سے قوت پاتے ہیں۔"

آگے حضرت ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بات کو سمجھانے کے لیے:

((وَشَبَّكَ أَصَابِعَهُ)) [1] "اپنی انگلیوں کو ایک دوسرے میں داخل کیا۔"

ایسے ہی حضرت عبداللہ بن عَمر و یا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہم سے بھی مروی ہے کہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی موقع پر ایسا کیا تھا، چنانچہ صحیح بخاری و مسلم میں ان سے مروی ہے:

((شَبَّكَ النَّبِيُّ ﷺ أَصَابِعَهُ)) [2]

"نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی انگلیاں ایک دوسرے میں داخل کیں۔"

ان دونوں حدیثوں سے بظاہر مطلق جواز معلوم ہوتا ہے، لیکن اگر ممانعت کی حکمتوں پر ذرا غور کیا جائے تو یہاں بھی اطلاق نہیں رہتا، کیونکہ ممانعت کی پہلی حکمت یہ ذکر کی گئی ہے کہ انگلیوں میں انگلیاں ڈالنا ایک کارِ عبث اور لا یعنی فعل ہے۔ اس لیے ممنوع ہے، جبکہ ان احادیث میں نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا عملِ مبارک ایسے نہیں تھا، بلکہ شارح بخاری البدر ابن المنیر کے بقول وہ تو ایک مثال دے کر سمجھانے کی صورت تھی، کیونکہ کسی بات کو محسوس چیز کے ساتھ بنا کر دکھانا زیادہ قابلِ فہم ہوتا ہے، لہٰذا نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دوسرے کے ساتھ مل کر قوت اختیار کرنے کو انگلیوں میں انگلیاں ڈالنے سے پیدا ہونے والی قوت بنا کر سمجھایا کہ مومن بھی جب انگلیوں کی طرح کندھے سے کندھا ملا کر چلنے لگیں تو وہ بھی ان انگلیوں کے مل کر مضبوط ہونے کی طرح ہی سیسہ پلائی ہوئی دیوار جیسے بن جاتے ہیں۔

ایسے ہی باہم اختلاف کرنے اور گتھم گتھا ہونے کو بھی اسی سے بآسانی سمجھا اور سمجھایا جا سکتا ہے، لہٰذا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایسا کرنے کی یہ معقول وجوہات تھیں، وہ محض بلاوجہ نہیں تھا۔ دوسرے یہ بھی ہے کہ ممانعت اس کے لیے ہے، جو نماز میں ہو یا نماز کے انتظار میں ہو، جس کا حکم نمازی کا ہے، جبکہ یہ دونوں احادیث مطلق ہیں، جن میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے نماز میں ہونے کا تو درکنار نماز کے انتظار میں

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٨) مختصر صحيح مسلم للمنذري، رقم الحديث (١٧٧٣) صحيح سنن الترمذي، رقم الحديث (١٥٧٣) صحيح سنن النسائي، رقم الحديث (٢٤٠٠) كتاب الإيمان لابن أبي شيبة (ص: ٩٠: ق) صحيح سنن الترمذي (٢/ ١٨١) صحيح الجامع (٣/ ٦/ ٦)

[2] صحيح البخاري مع الفتح (١/ ٦٧٣) رقم الحديث (٤٧٨، ٤٧٩)

ہونے کا بھی ذکر نہیں ہے۔

ان احادیث کے علاوہ اور حدیث بھی ہے جو صحیحین اور دیگر کتب میں مشہور ومعروف ہے، اس میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک نماز میں بھول جانے کا ذکر کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے کچھ رکعتیں چھوٹ گئیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سلام پھیرا اور مسجد میں پڑی ایک لکڑی پر ٹیک لگا کر اس انداز سے کھڑے ہوگئے، جیسے کوئی آدمی غصے میں ہوتا ہے۔ آگے وہ فرماتے ہیں:

«وَ وَضَعَ يَدَهُ الْيُمْنٰى عَلَى الْيُسْرٰى وَشَبَّكَ بَيْنَ أَصَابِعِهٖ»

''آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا دایاں دستِ مبارک بائیں پر رکھا اور اپنی دونوں ہاتھوں کی انگلیوں کو ایک دوسرے میں ڈالا۔''

آگے مروی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا دایاں رخسار بائیں ہاتھ کی پشت پر رکھا، بعض لوگ جلدی سے نکلے اور کہنے لگے کہ آج نماز کم ہوگئی ہے، جبکہ ان میں ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما جیسے جلیل القدر صحابہ تھے، لیکن ان میں سے بھی کسی کو نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس معاملے میں بات کرنے کی ہمت نہ ہوئی تو ایک شخص جو لمبے ہاتھوں والا تھا، جسے ''ذوالیدین'' کہا جاتا تھا، اس نے کہا: اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم!

"أَنَسِيتَ أَمْ قُصِرَتِ الصَّلَاةُ" ''آپ صلی اللہ علیہ وسلم بھول گئے ہیں یا آج نماز ہی کم ہوگئی ہے۔''

تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«لَمْ أَنْسَ وَلَمْ تُقْصَرْ» ''نہ میں بھولا ہوں اور نہ نماز کم ہوئی ہے۔''

پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دیگر صحابہ رضی اللہ عنہم سے ذوالیدین رضی اللہ عنہ کی تصدیق چاہی تو سب نے تصدیق کی کہ نماز کم پڑھی گئی ہے، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم آگے بڑھے اور چھوٹی ہوئی نماز پڑھائی اور سجدۂ سہو کیا۔[1]

صحیح بخاری ومسلم میں اسی واقعہ کے بعض طرق میں حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے یہ بھی مروی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«إِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ أَنْسٰى كَمَا تَنْسَوْنَ فَإِذَا نَسِيتُ فَذَكِّرُوْنِي»[2]

---

[1] صحيح البخاري (١/ ٦٧٤) رقم الحديث (٤٨٢) صحيح مسلم مع شرح النووي (٣/ ٥/ ٦٨ تا ٧٠) صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (٨٨٦) صحيح سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٣٧) صحيح سنن النسائي، رقم الحديث (١١٦٦) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٢١٤) موطأ الإمام مالك (ص: ٥٨، ٥٩) التلخيص الحبير (١/ ٢/ ٣)

[2] صحيح البخاري مع الفتح (١/ ٥٠٣، طبع دارالافتاء) صحيح مسلم مع شرح النووي (٣/ ٥/ ٦٦)←

’’میں ایک بشر ہوں، میں بھی تمھاری طرح بھول جاتا ہوں، پس جب میں بھول جاؤں تو مجھے (لقمہ دے کر) یاد دلا دیا کرو۔‘‘

اس واقعے میں محلِ شاہد یا مقامِ استدلال حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے وہ الفاظ ہیں، جن میں نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس لکڑی کے ساتھ ٹیک لگا کر کھڑے ہونے کے انداز کو بیان کرتے ہوئے یہ بھی فرماتے ہیں:

’’وَشَبَّكَ بَيْنَ أَصَابِعِهِ‘‘

’’آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دونوں ہاتھوں کی انگلیوں کو ایک دوسرے میں ڈالا۔‘‘

اس واقعے میں ظاہر ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کسی کو کچھ سمجھانے کے لیے بھی ایسا نہیں کیے ہوئے تھے، لہٰذا اس سے عام جواز کا پتا چلتا ہے، لیکن یہ جواز بھی مطلق نہیں ہے، بلکہ ایک شارح بخاری اسماعیلی کہتے ہیں کہ اس حدیث سے بھی ممانعت والی احادیث کے ساتھ کوئی تعارض نہیں بنتا، کیونکہ ممانعت اس صورت میں ہے، جب کوئی نماز میں ہو یا نماز کے انتظار میں ہو، کیونکہ انتظار کرنے والے کا حکم بھی نمازی ہی کا ہے اور یہ تینوں احادیث اس سے خالی ہیں، یعنی ان میں یہ مذکور نہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کسی نماز کے انتظار میں تھے، بلکہ یہ مطلق حالت میں ہوا ہے، اس تیسری حدیثِ ذوالیدین رضی اللہ عنہ میں جو انگلیوں میں انگلیاں ڈالنے کا ذکر ہے تو یہ بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے بھول کے واقع ہوجانے کے بعد اس وقت رونما ہوا، جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے خیال کے مطابق آپ صلی اللہ علیہ وسلم نماز مکمل کر چکے تھے اور سلام پھیر کر اپنی جگہ سے بھی ہٹ چکے تھے، اس طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم نہ نماز میں تھے اور نہ نماز کے انتظار میں، لہٰذا جواز و عدمِ جواز والی احادیث میں کسی قسم کا کوئی تعارض باقی نہ رہا۔[1]

اس ساری تفصیل سے معلوم ہوا کہ انگلیوں میں انگلیاں ڈالنے کے سلسلے میں جو دو طرح کی احادیث آئی ہیں، ان میں باہم کوئی تضاد و تعارض نہیں ہے، بلکہ جن احادیث میں ممانعت وارد ہوئی ہے، ان کا تعلق ان صورتوں سے ہے، جب کوئی نماز میں ہو یا نماز کے انتظار میں ہو یا گھر سے نماز کے لیے آ رہا ہو اور جن احادیث میں جواز وارد ہوا ہے، ان کا تعلق نہ نماز سے ہے اور نہ نماز کے انتظار سے ہے، بلکہ وہ عام حالت سے تعلق رکھتی ہیں۔

← صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (٨٩٦) صحيح سنن النسائي، رقم الحديث (١١٨٤) التلخيص الحبير (١/ ٢/ ٣)

[1] دیکھیں: فتح الباري (١/ ٥٦٦، طبع دار الافتاء السعوديه)

علامہ عبیداللہ رحمانی رحمہ اللہ نے "المرعاۃ شرح المشکاۃ" میں اس موضوع کی کافی تفصیلات ذکر کی ہیں۔ امام شوکانی رحمہ اللہ نے بھی اس سلسلہ کی بحث کے آخر میں لکھا ہے:

''اس مسئلہ میں ظاہر ہونے والے اختلاف کے بارے میں یہ کہنا زیادہ صحیح ہے کہ جن احادیث میں ممانعت وارد ہوئی ہے، وہ افرادِ امت کے لیے خاص ہیں اور نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ذاتی فعل کسی ایسے ارشاد کا معارض ثابت نہیں ہوسکتا، جو امت کے ساتھ خاص ہو، جیسا کہ کتبِ اصول کا مسلّمہ قاعدہ ہے۔''[1]

انگلیاں چٹخانا:

دورانِ نماز، مسجد میں انتظارِ نماز کے دَوران میں یا نماز کے لیے آتے ہوئے انگلیوں میں انگلیاں ڈالنے کی ممانعت کے اس تذکرے کے ساتھ ہی یہ بھی ذکر کرتے جائیں کہ بعض لوگوں کو عادت ہوتی ہے کہ مسجد میں بلکہ دورانِ نماز میں بھی ٹک سے انگلیاں چٹخا لیتے ہیں، یعنی انگلیوں کو انگلیوں میں ڈالا اور دونوں ہاتھوں کو پیچھے کی جانب دبا دیا، تو ایسا کرنے سے ان سب میں یا اکثر میں سے ٹک ٹک کی آواز پیدا ہوگی اور اس مجموعی انداز کے علاوہ تمام انگلیوں کو ایک ایک کرکے بھی یہ آواز پیدا کی جاتی ہے، کیونکہ کسی انگلی کو اس کے بنیادی جوڑ کے قریب سے پکڑ کر پیچھے کو دبایا جائے تو اس سے چٹخنے کی آواز پیدا ہوتی ہے۔

یہ فعل بھی مسجد میں اور خصوصاً نماز کے دوران میں مکروہ شمار کیا گیا ہے، اس کی کراہت کے لیے بعض احادیث و آثار سے استدلال کیا جاتا ہے، جن میں ایک مسند احمد، سنن دارقطنی، سنن کبریٰ بیہقی اور معجم طبرانی میں ہے، جس میں ہے:

«إِنَّ الضَّاحِكَ فِي الصَّلَاةِ وَالْمُلْتَفِتَ وَالْمُفَقِّعَ أَصَابِعَهُ بِمَنْزِلَةٍ وَّاحِدَةٍ»[2]

''نماز میں ہنسنے، اِدھر اُدھر جھانکنے اور انگلیاں چٹخانے والے سب ایک جیسے ہی ہیں۔''

امام بیہقی رحمہ اللہ نے اس حدیث کی سند کے ایک راوی زبّان بن فائد کے بارے میں کہا ہے کہ وہ غیر قوی ہے۔ اسی موضوع کی ایک حدیث سنن ابن ماجہ میں بھی مروی ہے، جس میں ہے:

[1] نيل الأوطار (١/ ٢/ ٣٣٥) المرعاة (٣/ ١٤)

[2] الفتح الرباني (٤/ ٨٧) المرعاة (٣/ ١٤)

«لَا تُفَقِّعْ أَصَابِعَكَ فِي الصَّلَاةِ»[1] ''نماز کے دوران میں انگلیاں مت چٹخاؤ۔''

''إرواء الغليل في تخريج أحاديث منار السبيل'' میں دورِ حاضر کے معروف محدث علامہ شیخ ناصر الدین البانی رحمہ اللہ نے اس روایت کو سخت ضعیف قرار دیا ہے۔ اس طرح یہ مرفوع روایات تو دونوں ہی ضعیف السند ہوئیں، البتہ اس سلسلہ میں ایک اثر حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے اور اس کی سند بھی ضعیف نہیں، بلکہ حسن ہے، چنانچہ مصنف ابن ابی شیبہ میں شعبہ رحمہ اللہ بیان فرماتے ہیں:

''صَلَّيْتُ إِلٰى جَنْبِ ابْنِ عَبَّاسٍ فَفَقَّعْتُ أَصَابِعِيْ، فَلَمَّا قَضَيْتُ الصَّلَاةَ قَالَ: لَا أُمَّ لَكَ تُفَقِّعُ أَصَابِعَكَ وَأَنْتَ فِيْ الصَّلَاةِ''[2]

''میں نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے پاس نماز پڑھی اور دورانِ نماز میں اپنی انگلیاں چٹخائیں، جب میں نماز سے فارغ ہوا تو انھوں نے فرمایا: تیری ماں نہ ہو، تم نماز میں انگلیاں چٹخاتے ہو۔''

اس اثر میں وارد حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما جیسے جلیل القدر صحابی کے ارشاد سے پتا چلتا ہے کہ نماز کے دوران میں انگلیوں کو چٹخانا ایک مکروہ و ناپسندیدہ فعل ہے اور اگر یہ مسجد میں بھی ہو تو اس کی کراہت اور بھی بڑھ جائے گی۔ نماز میں انگلیاں چٹخانے کو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے علاوہ امام نخعی، مجاہد، سعید بن جبیر اور عطا رحمہم اللہ نے بھی مکروہ کہا ہے، جیسا کہ امام شوکانی رحمہ اللہ نے امام نووی رحمہ اللہ کے حوالے سے لکھا ہے۔[3]

مسجد میں نمازِ عیدین:

آداب و احکامِ مسجد کے ضمن میں کتنے ہی ایسے امور کا تذکرہ کیا جا چکا ہے جو مسجد میں ناجائز و ممنوع ہیں، لیکن ہمارے لوگ اس معاملے میں لاعلمی کی وجہ سے پرہیز نہیں کرتے۔ بعض امور ایسے ہیں کہ وہ بظاہر ممنوع سمجھے جاتے ہیں، لیکن وہ دراصل جائز ہیں اور بعض امور کی بعض صورتیں جائز اور بعض ناجائز ہیں۔[4]

---

[1] إرواء الغليل (٢/ ٩٩)

[2] سنن ابن ماجه، المرعاة والإرواء أيضاً.

[3] إرواء الغليل (٢/ ٩٩)

[4] نيل الأوطار (١/ ٢/ ٣٣٥)

وہ اُمور جو صرف بوقتِ ضرورت مسجد میں جائز ہیں، انہی میں سے ایک نمازِ عیدین بھی ہے، اگرچہ اس کے لیے افضل یہی ہے کہ نمازِ عیدین شہر یا گاؤں سے باہر بنائی گئی عید گاہ یا کھلی جگہ میں پڑھی جائے، کیونکہ امام شافعی رحمہ اللہ کی کتاب الام کے حوالے سے حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے فتح الباری میں لکھا ہے:

''ہمیں یہ بات پہنچی ہے کہ نبیِ اکرم ﷺ ہمیشہ مدینہ طیبہ کی عیدگاہ میں جا کر نماز عید پڑھا کرتے تھے، جو عمر بن شبہ کی کتاب ''أخبار المدینة'' کے مطابق مسجدِ نبوی ﷺ سے ایک ہزار ہاتھ یا گز کی دوری پر واقع تھی۔''[1]

آپ ﷺ کے خلفا رضی اللہ عنہم اور اہلِ مکہ کے سوا عام شہروں کے لوگوں کا بھی یہی طرزِ عمل رہا سوائے کسی عذر کے۔ مسجد میں عید کے جواز سے قطع نظر اس بات میں اہلِ علم کا اختلاف ہے کہ افضل کیا ہے؟ مسجد میں یا باہر عید گاہ میں؟ امام مالک رحمہ اللہ باہر عید گاہ کی افضلیت ہی کے قائل ہیں، ان کا استدلال نبیِ اکرم ﷺ کے مسجدِ نبوی ﷺ کی فضیلت کے باوجود بھی ہمیشہ باہر عیدگاہ میں جا کر نماز پڑھنے ہی سے ہے، جبکہ امام شافعی رحمہ اللہ مسجد میں نمازِ عید کے افضل ہونے کے قائل ہیں۔ امام شوکانی و زرکشی رحمہما اللہ کا رجحان عیدگاہ میں عیدین کی افضلیت کی طرف ہے۔[2]

عذر کی حالت میں ظاہر ہے کہ عام حالت کی نسبت گنجایش ہوتی ہے، یہی معاملہ یہاں بھی ہے کہ مثلاً اگر بارش ہو رہی ہو یا بارش آنے کا غالب خدشہ موجود ہو اور عیدگاہ میں جانا مشکل ہو تو ایسے میں کسی بڑی مسجد میں بھی عید کی نماز پڑھی جا سکتی ہے، بلکہ اس سلسلے میں ایک حدیث بھی پیش کی جاتی ہے، جو سنن ابو داود و ابن ماجہ اور مستدرک حاکم میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، جس میں وہ بیان فرماتے ہیں:

«إِنَّهُ أَصَابَهُمْ مَطَرٌ فِيْ يَوْمِ الْعِيْدِ فَصَلّٰى بِهِمُ النَّبِيُّ ﷺ صَلَاةَ الْعِيْدِ فِي الْمَسْجِدِ»[3]

---

[1] فتح الباري (٢/ ٤٤٩)

[2] نيل الأوطار (٢/ ٤/ ١٦٣، طبع رياض) إعلام الساجد (ص: ٣٨٥)

[3] ضعيف سنن أبي داود (ص: ١١١، ١١٢) ضعيف سنن ابن ماجه (ص: ٩٥، ٩٦) التلخيص (١/ ٢/ ٨٣) نيل الأوطار (٢/ ٤/ ١٦٢) مشكاة المصابيح (١/ ٥٤)

''ایک مرتبہ عید کے دن بارش تھی تو نبیِ اکرم ﷺ نے انھیں نمازِ عید مسجد میں پڑھائی۔''

اس حدیث کے بارے میں امام ابو داود اور منذری رحمہ اللہ نے تو سکوت اختیار فرمایا ہے، جس سے پتا چلتا ہے کہ ان کے نزدیک یہ ضعیف نہیں ہے، البتہ تلخیص الحبیر میں حافظ عسقلانی رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ اس کی سند ضعیف ہے۔[1] امام شوکانی رحمہ اللہ نے نیل الاوطار میں لکھا ہے کہ اس کی سند میں ایک راوی عیسیٰ بن عبدالاعلیٰ بن ابی فروہ الفروی المدنی مجہول ہے اور علامہ ذہبی رحمہ اللہ نے اس کے بارے میں میزان الاعتدال میں کہا ہے:

''لَا یَکَادُ یُعْرَفُ'' ''یعنی یہ تقریباً غیر معروف ہیں (جن کا کوئی اتا پتا نہیں ملتا)۔''

اس روایت کے بارے میں کہا ہے کہ یہ منکر ہے اور ابن القطان نے بھی اس راوی کے بارے میں کہا ہے کہ اس روایت کی سند کے سوا کسی دوسری روایت یا کتبِ رجال میں سے کہیں بھی اس کا ذکر نہیں ملتا۔[2]

یہی وجہ ہے کہ شیخ ناصر الدین البانی رحمہ اللہ نے بھی اسے تحقیقِ مشکاۃ میں ضعیف قرار دیا ہے اور اسے ضعیف سنن ابی داود اور ضعیف ابن ماجہ میں وارد کیا ہے، لہٰذا یہ حدیث تو قابلِ استدلال نہیں، البتہ عذر سے احکام میں جو تغیر واقع ہوتا ہے، اس کی بنا پر بارش وغیرہ میں مسجد میں نمازِ عید کی گنجایش ملتی ہے۔ اہلِ مکہ کے عمل کو بنیاد بناتے ہوئے شافعیہ کا مسجد میں نمازِ عید کے افضل ہونے کا قول محققین کے نزدیک مرجوح ہے، کیونکہ انھیں تو ممکن ہے کہ یہ عذر ہو کہ مکہ شہر کے باہر کھلی جگہ قریب نہیں، بلکہ وہ پہاڑوں سے گھرا ہوا شہر ہے اور مسجد حرام بڑی وسیع ہے، جو تمام اہلِ مکہ کے لیے کافی ہو جاتی ہے، لہٰذا اس کی وسعت اور باہر جگہ کی قلت والی مجبوری و عذر کی بنا پر وہ مسجد میں پڑھتے چلے آ رہے ہیں، اس سے افضلیت ثابت نہیں ہوتی، بلکہ افضلیت نبیِ اکرم ﷺ کے ہمیشہ والے عمل ہی سے ثابت ہو سکتی ہے، کیونکہ مسجدِ نبوی ﷺ بھی فضیلت والی مسجد ہے، اس کے باوجود کتاب الام میں خود امام شافعی رحمہ اللہ کے بقول نبیِ اکرم ﷺ نے ہمیشہ مسجد سے باہر عیدگاہ میں جا کر نمازِ عید پڑھی تو یہی افضل ہے، کیونکہ آپ ﷺ کسی ایسے فعل پر ہمیشگی نہیں کیا کرتے تھے، جو غیر افضل ہوتا، بلکہ اللہ تعالیٰ آپ ﷺ کو

[1] التلخیص الحبیر (۱/ ۲/ ۸۳)

[2] نیل الأوطار (۲/ ٤/ ١٦٢، ١٦٣)

ہمیشہ افضل عمل کی توفیق ارزاں فرماتا تھا، سوائے بیانِ جواز کی بعض استثنائی حالتوں کے، جن میں آپ ﷺ کبھی کبھار غیر افضل پر بھی عمل کر لیا کرتے تھے، تاکہ اس کا جواز واضح ہو جائے۔[1]

مسجد میں نمازِ جنازہ:

آداب و احکامِ مسجد کا ذکر ہوتا آرہا ہے اور کتنے ہی ایسے امور کا تذکرہ کیا جا چکا ہے، جو مسجد میں جائز یا ناجائز ہیں، ایسے امور میں سے ہی ایک مسجد میں نمازِ جنازہ پڑھنا بھی ہے۔ جنازے کے احکام و مسائل کی تفصیل کا یہ موقع نہیں، البتہ صرف اتنا کہے جاتے ہیں کہ نمازِ جنازہ فرض کفایہ ہے اور اس کے فرض کفایہ ہونے پر امام ابن الہمام نے فتح القدیر شرح ہدایہ میں اجماع نقل کیا ہے۔[2] جبکہ بعض مالکیہ نے اسے محض سنت قرار دیا ہے اور امام نووی رحمہ اللہ نے ان کی تردید کی ہے۔[3]

احکام و مسائلِ جنازہ میں سے اس وقت ہمارے پیشِ نظر صرف ایک ہی پہلو ہے اور وہ پہلو یہ کہ آیا کسی کی نمازِ جنازہ مسجد میں بھی پڑھی جا سکتی ہے یا نہیں؟ تو اس سلسلے میں عرض یہ ہے کہ عام طور پر تو نمازِ جنازہ شہروں اور دیہات میں بنائی گئی جنازہ گاہوں میں پڑھی جاتی ہے اور کبھی کبھی کسی اللہ والے کی نمازِ جنازہ پڑھنے والوں کی تعداد اتنی زیادہ ہوتی ہے کہ جنازہ گاہ کا دامن تنگ نظر آنے لگتا ہے تو ایسے مواقع پر نمازِ جنازہ کا انتظام شہروں میں موجود بڑے بڑے میدانوں یا گراؤنڈوں میں کر دیا جاتا ہے۔ کبھی کسی ایسے میدان یا جنازہ گاہ میں نماز پڑھی جا سکنے کی وجہ سے امکانات ہی نہ ہوں تو ایسے عذر کی حالت میں یا بوقتِ ضرورت مسجد میں بھی کسی کی نمازِ جنازہ پڑھی جا سکتی ہے، کیونکہ صحیح مسلم، سننِ اربعہ و بیہقی، مصنف ابن ابی شیبہ اور مسند احمد میں ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے بارے میں عباد بن عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ جب حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ فوت ہوئے تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے حکم فرمایا کہ جنازہ لے جانے والوں سے کہو کہ وہ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کا جنازہ لے کر مسجدِ نبوی سے ہوتے ہوئے جائیں، تاکہ میں ان کی نمازِ جنازہ پڑھ لوں، تو وہ لوگ جنازہ لائے اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے ان کی نمازِ جنازہ پڑھی۔ بعض لوگوں نے مسجد میں جنازہ پڑھنے

---

1. نيل الأوطار (٢/ ٤/ ١٦٣، ١٦٤)
2. فتح القدير لابن الهمام (١/ ٤٥٥)
3. الفتح الرباني (٧/ ٢٠١)

کو اچھا نہ سمجھا اور اس کی خبر ام المومنین رضی اللہ عنہا کو بھی ہوگئی تو انھوں نے فرمایا:

”مَا أَسْرَعَ النَّاسُ إِلٰى أَنْ يَّعِيبُوا مَا لَا عِلْمَ لَهُمْ بِهِ“[1]

”لوگ کتنی جلدی اس کام کو معیوب شمار کرنے لگے ہیں، جس کے بارے میں خود انھیں علم نہیں (کہ حقیقت کیا ہے؟)“

ان لوگوں نے مسجد سے نمازِ جنازہ گزارنے کو معیوب کہا ہے، حالانکہ سہل بن بیضاء کی نمازِ جنازہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مسجد میں پڑھی تھی۔ ایک روایت میں ہے:

«وَاللّٰهِ لَقَدْ صَلّٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ عَلَى ابْنَيْ بَيْضَاءَ فِي الْمَسْجِدِ سَهْلٍ وَأَخِيْهِ»[2]

”اللہ کی قسم! خود نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بیضاء رضی اللہ عنہا کے دونوں بیٹوں یعنی سہل اور ان کے بھائی کی نمازِ جنازہ مسجد میں پڑھی تھی۔“

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ حضرت سہل اور ان کے بھائی رضی اللہ عنہما دونوں کی نمازِ جنازہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مسجد میں پڑھائی تھی۔ تیسرے معروف صحابی حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کی نمازِ جنازہ ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے بھی مسجد ہی میں پڑھی تھی، جبکہ مصنف ابن ابی شیبہ اور سنن سعید بن منصور میں مروی ہے کہ خلیفۂ بلافصل حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی نمازِ جنازہ بھی مسجد میں پڑھی گئی تھی۔[3]

ایسے ہی موطا امام مالک، مصنف ابن ابی شیبہ اور سنن سعید بن منصور میں یہ بھی مروی ہے کہ خلیفۂ دوم امیر المومنین حضرت عمرِ فاروق رضی اللہ عنہ کی نمازِ جنازہ بھی مسجد میں پڑھی گئی تھی۔[4]

علامہ ابن قیم رحمہ اللہ نے زاد المعاد میں لکھا ہے کہ کبھی کبھار آپ صلی اللہ علیہ وسلم مسجد میں بھی نمازِ جنازہ پڑھا لیا کرتے تھے، جیسا کہ صحیح مسلم اور دیگر کتبِ حدیث میں سہل اور اس کے بھائی کی نمازِ جنازہ مسجد میں پڑھے جانے کا پتا چلتا ہے، ایسے ہی آگے چل کر انھوں نے حضرت صدیق و فاروق رضی اللہ عنہما کے

---

[1] صحيح مسلم تحقيق محمد فؤاد (٢/ ٦٦٨، ٦٦٩، برقم: ٩٧٣) صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٠، ٢٧٣١) صحيح سنن الترمذي، رقم الحديث (١/ ٣٠٢، رقم الحديث: ٨٢٥) صحيح سنن النسائي (٢/ ٤٢٤، رقم الحديث: ٥٨، ١٨٥٩) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٥١٨) الفتح الرباني (٧/ ٢٤٨)

[2] صحيح مسلم (٢/ ٦٦٨، ٦٦٩، رقم الحديث: ٩٧٣) الفتح الرباني (٧/ ٢٤٨)

[3] بلوغ الأماني (٧/ ٢٤٨) نيل الأوطار (٢/ ٤/ ٦٨) زاد المعاد (١/ ٥٠١) سبل السلام، تحقيق فواز أحمد و إبراهيم محمد (٢/ ٢٠٨)

[4] حواله جات بالا.

بارے میں بھی لکھا ہے کہ ان کی نمازِ جنازہ کے بھی مسجد میں پڑھے جانے کا ذکر ملتا ہے۔ اس سلسلے میں کافی تفصیل ذکر کرنے کے بعد آخر میں اپنی تحقیق کا نچوڑ پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”وَالصَّوَابُ مَا ذَكَرْنَاهُ أَوَّلًا وَإِنَّ سُنَّتَهُ وَهَدْيَهُ الصَّلَاةُ عَلَى الْجَنَازَةِ خَارِجَ الْمَسْجِدِ، وَاللّٰهُ أَعْلَمُ“[1]

”صحیح تر بات وہی ہو جو ہم شروع میں ذکر کر آئے ہیں کہ آپ ﷺ کی سنت و طریقہ تو یہ تھا کہ آپ ﷺ مسجد سے باہر نمازِ جنازہ پڑھا کرتے تھے، سوائے کسی عذر کے اور جائز دونوں طرح ہی ہے، البتہ افضل یہ ہے کہ نمازِ جنازہ مسجد سے باہر پڑھی جائے۔“

امام خطابی رحمہ اللہ نے ابو داود کی شرح معالم السنن میں لکھا ہے:

”وَقَدْ ثَبَتَ أَنَّ أَبَا بَكْرٍ وَعُمَرَ رضی اللہ عنہما صُلِّيَ عَلَيْهِمَا فِي الْمَسْجِدِ، وَمَعْلُومٌ أَنَّ عَامَّةَ الْمُهَاجِرِيْنَ وَالْأَنْصَارِ شَهِدُوا الصَّلَاةَ عَلَيْهِمَا وَفِي تَرْكِهِمُ الْإِنْكَارَ الدَّلِيْلُ عَلٰى جَوَازِهٖ“[2]

”یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کی نمازِ جنازہ مسجد میں پڑھی گئی تھی اور یہ بات بھی واضح ہے کہ مہاجرین اور انصار صحابہ رضی اللہ عنہم میں سے عام حضرات نے نمازِ جنازہ میں شرکت کی اور ان میں سے کسی کا اس چیز پر اعتراض نہ کرنا اس فعل کے جواز کی دلیل ہے۔“

غرض کہ امام شافعی، امام احمد بن حنبل، اسحاق بن راہویہ اور مدنی فقہا کی روایت کے مطابق امام مالک رحمہ اللہ سب کے نزدیک عذر و ضرورت پر مسجد میں نمازِ جنازہ جائز ہے، علامہ ابن رشد، علامہ عبدالرحمٰن مبارکپوری اور حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ اور عام محدّثینِ کرام کا رجحان بھی اسی طرف ہے۔[3]

ان کا استدلال سند و متن ہر اعتبار سے صحیح احادیث سے ہے۔ آج کل مکہ مکرمہ کی مسجدِ حرام اور مدینہ طیبہ کی مسجدِ نبوی ﷺ میں نمازِ پنج گانہ ہی کے بعد کبھی ایک ایک اور کبھی کئی کئی جنازوں پر نماز پڑھی جاتی ہے اور اس کا سبب بڑا واضح ہے کہ حجاجِ کرام اور عمرے کے لیے آئے ہوئے لوگوں کی اکثریت انھی مساجدِ حرمین ہی میں نمازیں پڑھتی ہے اور اتنے بڑے بڑے اجتماعات کسی دوسری جگہ ممکن نہیں

[1] زاد المعاد (١/ ٥٠٢)

[2] معالم السنن (١/ ١/ ٢٧٢)

[3] هداية (٢/ ٢٩، ٣٠) فتح الباري (٣/ ١٩٩) الفتح الرباني (٧/ ٤٩، ٢٥٠) كتاب الجنائز مباركپوری (ص: ٥٤)

ہیں، لہٰذا جواز کے پیشِ نظر مرنے والوں کے لیے ان اجتماعات کی دعائیں لے لی جاتی ہیں اور یقیناً خوش نصیب ہیں وہ لوگ جن کی نمازِ جنازہ حرمین شریفین میں سے کسی بھی ایک میں پڑھی جائے، لیکن ؎

این سعادت بزورِ بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

مسجد سے باہر نمازِ جنازہ کی افضلیت:

مسجد سے باہر جنازہ گاہ میں نمازِ جنازہ کے افضل ہونے کی وجہ یہ ہے کہ نبیِ اکرم ﷺ غالب و اکثر اوقات میں نمازِ جنازہ مسجد سے باہر اس غرض کے لیے بنائی گئی مخصوص جگہ ہی پر پڑھا کرتے تھے، جو فتح الباری (۳/ ۹۹) میں حافظ ابن حجر کے بقول مسجدِ نبوی ﷺ کی مشرقی یا بقیع الغرقد والی جانب سے بالکل متصل ہی تھی اور اس پر دلالت کرنے والی کئی احادیث ہیں، مثلاً صحیح بخاری میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے:

«إِنَّ الْيَهُوْدَ جَاءُ وْا إِلٰى النَّبِيِّ ﷺ بِرَجُلٍ مِنْهُمْ وَامْرَأَةٍ زَنَيَا فَأَمَرَا بِهِمَا فَرُجِمَا قَرِيْبًا مِنْ مَوْضِعِ الْجَنَائِزِ عِنْدَ الْمَسْجِدِ»[1]

''نبیِ اکرم ﷺ کے پاس یہودی اپنا ایک آدمی اور عورت لائے، جنھوں نے زنا کا ارتکاب کیا تھا، آپ ﷺ کے حکم سے ان دونوں کو مسجد کے قریب ہی جنازہ گاہ کے پاس سنگسار کر دیا گیا۔''

اس حدیث میں جنازہ پڑھنے کا ذکر تو نہیں، لیکن جنازہ گاہ کا تذکرہ آیا ہے۔ صحیح بخاری و مسلم، سنن ابو داود، نسائی، ابن ماجہ و بیہقی اور مسند احمد و طیالسی میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے، اور صحیح بخاری و مسلم، نسائی و بیہقی اور مسند احمد و طیالسی میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے، اور صحیح مسلم، سنن ترمذی، نسائی، ابن ماجہ، صحیح ابن حبان، سنن بیہقی اور مسند احمد و طیالسی میں حضرت حذیفہ بن اُسید رضی اللہ عنہ سے، اور سنن ابن ماجہ و مسند احمد میں حضرت مجمع بن حارثہ انصاری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

''أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ نَعٰى النَّجَاشِيَّ فِيْ الْيَوْمِ الَّذِيْ مَاتَ فِيْهِ خَرَجَ إِلَى الْمُصَلّٰى فَصَفَّ بِهِمْ وَكَبَّرَ أَرْبَعًا''

[1] صحيح البخاري (٣/ ١٩٩) رقم الحديث (١٣٢٩)

''نبیِ اکرم ﷺ نے لوگوں کو نجاشی کے فوت ہونے کی اسی دن خبر دی، جس دن وہ فوت ہوئے، پھر جنازہ گاہ کی طرف گئے اور صفیں بنائیں اور چار تکبیریں کہیں (یعنی نمازِ جنازہ پڑھی)۔''

ان صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی مرویات میں بھی جنازہ گاہ ہی میں نمازِ جنازہ پڑھنے کا ذکر آیا ہے، اگرچہ غائبانہ نمازِ جنازہ تھی۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے نجاشی اور یہودیوں کو سنگسار کرنے والی احادیث پر یوں تبویب کی ہے:

''باب الصلاۃ علیٰ الجنائز بالمصلّٰی والمسجد''[1]

''جنازہ گاہ اور مسجد میں میت پر نمازِ جنازہ پڑھنے کا بیان۔''

مصلّٰی یا جنازہ گاہ کا ذکر تو صریح ہے، جبکہ تبویب میں مسجد کا ذکر لا کر صحیح مسلم اور دیگر کتب والی اس حدیث کی طرف اشارہ فرما گئے ہیں، جن میں مسجد میں نمازِ جنازہ کا ذکر وارد ہوا ہے۔

ایسے ہی مسند احمد و طیالسی، سنن بیہقی اور مستدرک حاکم میں جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک آدمی فوت ہوگیا، تو ہم نے اسے غسل وکفن دیا، حنوط کیا (یعنی مشک کافور لگائی):

''وَوَضَعْنَاہُ لِرَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ حَیْثُ تُوْضَعُ الْجَنَائِزُ عِنْدَ مَقَامِ جِبْرِیْلَ ثُمَّ آذَنَّا رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ بِالصَّلَاۃِ عَلَیْهِ فَجَاءَ مَعَنَا''

''ہم نے اس کا جنازہ نبیِ اکرم ﷺ کے لیے مقامِ جبریل کے قریب اس جگہ رکھا، جہاں جنازے رکھے جاتے ہیں، پھر ہم نے اس کی نمازِ جنازہ کے لیے نبیِ اکرم ﷺ کو اطلاع دی تو آپ ﷺ ہمارے ساتھ آئے۔''

آگے اس میت کے دو دینار کے مقروض نکلنے، آپ ﷺ کے جنازہ پڑھانے سے انکار کرنے اور دوسروں کو پڑھنے کا کہنے اور حضرت ابو قتادہ رضی اللہ عنہ کے وہ قرض اپنے سر لینے اور پھر آپ ﷺ کے اس کا جنازہ پڑھانے کا ذکر ہے۔

مسند احمد و مستدرک حاکم میں حضرت محمد بن عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ سے حسن حدیث مروی ہے، جس میں وہ بیان فرماتے ہیں:

---

[1] صحیح سنن النسائي، رقم الحدیث (١٨٥٣) أحکام الجنائز (ص: ١٦، ١٠٦، ١٠٧)

((كُنَّا جُلُوساً بِفِنَاءِ الْمَسْجِدِ حَيْثُ تُوضَعُ الْجَنَائِزُ، وَرَسُولُ اللّٰهِ ﷺ بَيْنَ ظَهْرَانَيْنَا))

''ہم مسجد کے سامنے والے صحن میں اس جگہ بیٹھے تھے، جہاں جنازے رکھے جاتے ہیں اور نبیِ اکرم ﷺ بھی ہمارے مابین موجود تھے۔''

یہ حدیث آگے بھی ہے، لیکن محلِ شاہد انہی میں آ گیا ہے۔ غرض کہ ان سب احادیث کا مجموعی مفاد یہ ہے کہ نبیِ اکرم ﷺ غالب حالات میں نمازِ جنازہ مسجد سے باہر جنازہ گاہ میں پڑھا کرتے تھے اور یہی اصل سنت ہونے کی وجہ سے افضل بھی ہے، لیکن چونکہ کبھی کبھار آپ ﷺ نے مسجد میں بھی نمازِ جنازہ پڑھی ہے، جیسا کہ صحیح مسلم اور دیگر کتبِ حدیث میں ہے، لہٰذا وہ بھی جائز ہے، اس کی عدمِ صحت یا کراہت والی کوئی بات نہیں ہے۔[1]

مانعین کی دلیل اور اس کا جائزہ:

ہم ذکر کر چکے ہیں کہ نبیِ اکرم ﷺ کی سنتِ مبارکہ تو یہ تھی کہ نمازِ جنازہ مسجد سے باہر جنازہ گاہ میں پڑھا کرتے تھے، البتہ کبھی کبھار مسجد میں بھی پڑھ لیتے تھے اور یہ دونوں طرح ہی جائز ہے، البتہ افضل مسجد سے باہر ہی ہے۔ اکثر ائمہ وفقہا اور عام محدّثینِ کرام کا یہی مسلک ہے، جن کا استدلال صحیح مسلم اور دیگر کتب میں وارد صحیح احادیث و آثار سے ہے، جبکہ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ اور غیر مدنی فقہا سے مروی دوسرے قول کے مطابق امام مالک رحمہ اللہ کا بھی یہ مسلک ہے کہ مسجد میں نمازِ جنازہ صحیح نہیں ہے، ان کا استدلال سنن ابو داود و ابن ماجہ، مسند احمد، سنن بیہقی، مصنف ابن ابی شیبہ اور معانی الآثار طحاوی میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً مروی اس حدیث سے ہے، جس میں ہے:

((مَنْ صَلّٰى عَلٰى جَنَازَةٍ فِي الْمَسْجِدِ فَلَا شَيْئَ لَهُ))[2]

''جس نے مسجد میں کسی کی نماز جنازہ پڑھی، اس کے لیے کچھ بھی نہیں ہے۔''

علامہ ابن قیم رحمہ اللہ نے تہذیب السنن میں کہا ہے کہ یہ حدیث چار طُرق سے مروی ہے اور چاروں کے الفاظ ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ ایک میں ہے: ((فَلَا شَيْئَ)) ''تو کچھ نہیں۔''

---

[1] أحكام الجنائز (ص: ١٠٧) وحسنه بالشواهد.

[2] سنن أبي داود مع العون (٨/ ٤٧٩) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٥١٧) مسند أحمد (٢/ ٤٤٤، ٤٥٥) مصنف ابن أبي شيبة (٣/ ٣٦٤، ٣٦٥) السلسلة الصحيحة (٢٣٥١)

دوسرے میں ہے:((فَلَا شَيْئَ عَلَيْهِ)) ''اس پر کچھ (گناہ) نہیں۔''

تیسرے میں ہے:((فَلَا شَيْئَ لَهٗ)) ''اس کے لیے کچھ نہیں۔''

اور چوتھے میں ہے:((فَلَيْسَ لَهٗ أَجْرٌ)) ''اسے کوئی اجر نہیں ملے گا۔''[1]

زاد المعاد میں بھی علامہ ابن قیم نے اس اختلافِ الفاظ کو ذکر کیا ہے، لیکن وہاں انھوں نے خطیب کی روایت سنن کے حوالے سے لکھا ہے کہ اصل میں یہ ہے:

((فَلَا شَيْئَ عَلَيْهِ))[2] ''اسے کوئی گناہ نہیں ہے۔''

ان کے علاوہ دوسروں کی روایت میں ((فَلَا شَيْئَ لَهٗ)) ہے اور سنن ابن ماجہ میں ((فَلَيْسَ لَهٗ شَيْئَ)) اور یہی تفصیل علامہ زرکشی نے بھی ذکر کی ہے۔[3]

تعارض کا حل:

اس طرح ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مسجد میں جنازے کے جواز والی حدیث اور اس حدیث کے مابین بظاہر تضاد نظر آتا ہے، حالانکہ درحقیقت ایسا نہیں ہے، بلکہ اہلِ علم نے اس حدیث کے پانچ جوابات دیے ہیں، جن سے بظاہر نظر آنے والا تعارض رفع ہوجاتا ہے۔

پہلا جواب:

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی یہ عدمِ جواز کا پتا دینے والی حدیث ہی متنازع فیہ ہے، بلکہ امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ نے تو اسے ضعیف کہا ہے اور اس سے حجت لینے کو جائز قرار نہیں دیا، کیونکہ اسے روایت کرنے میں توامہ بنت امیہ کا آزاد کردہ غلام صالح منفرد ہے اور اس کے راویِ عدل ہونے میں اختلاف ہے، امام مالک رحمہ اللہ نے بھی اس پر جرح کی ہے اور امام بیہقی نے کہا ہے کہ یہ حدیث حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا والی حدیث کی معارض نہیں ہوسکتی، کیونکہ اگر اسے صحیح بھی مان لیا جائے، تب بھی وہ اس سے بدرجہا زیادہ صحیح ہے۔[4] بہر حال علامہ ابن قیم رحمہ اللہ نے اسے حسن اور شیخ البانی نے صحیح قرار دیا

[1] تهذيب السنن على العون (٨/ ٤٧٩) عمدة القاري (٦/ ١١٨) الفتح الرباني (٧/ ٢٤٨)

[2] زاد المعاد (١/ ٥٠٠)

[3] إعلام الساجد (ص: ٣٥٢)

[4] إعلام الساجد (ص: ٣٥٢)

ہے۔ شیخ الارناؤوط نے بھی اسے قوی کہا ہے۔[1]

لیکن پہلی حدیثِ عائشہ رضی اللہ عنہا چونکہ اس سے بدرجہا صحیح تر ہے، لہٰذا ان کے مابین کوئی تعارض یا تضاد نہ رہا، کیونکہ صحیح یا حسن، صحیح تر کی معارض نہیں ہوسکتی۔

دوسرا جواب:

اس کا دوسرا جواب وہی ہے جو علامہ ابن قیم رحمہ اللہ اور علامہ زرکشی رحمہ اللہ کے حوالے سے ہم ذکر کر آئے ہیں کہ اس حدیث کی روایت چار طرح کے الفاظ سے ملتی ہے اور ان میں سے صحیح تر الفاظ یہ ہیں:

« فَلَا شَيْئَ عَلَيْهِ » ''مسجد میں جنازہ پڑھنے والے پر کوئی مؤاخذہ نہیں ہے۔''

گویا اس حدیث میں مسجد میں نمازِ جنازہ کی ممانعت والی کوئی بات ہی نہ رہی۔

تیسرا جواب:

اگر یہ حدیث صحیح بھی ہو، تب بھی ضروری ہے کہ اس کی تاویل کی جائے اور « فَلَا شَيْئَ لَهٗ » کا معنیٰ ''فَلَا شَيْئَ عَلَيْهِ'' لیا جائے کہ اس پر کوئی مؤاخذہ نہیں ہے، اس طرح دونوں قسم کی احادیث کا معنیٰ ایک ہی ہوجائے گا اور تناقض یا تضاد و تعارض خود بخود رفع ہوجائے گا۔ اس تاویل کی گنجایش موجود ہے کہ ''له''، کو ''علیه'' کے معنیٰ میں لیا جائے، حتیٰ کہ خود اللہ تعالیٰ نے قرآنِ کریم میں ایک جگہ ایسا ہی کیا ہے، جو اس کی بہترین مثال ہے، چنانچہ سورت اسراء (بنی اسرائیل) میں ارشادِ الٰہی ہے:

﴿ وَ اِنْ اَسَاْتُمْ فَلَهَا ﴾ [الإسراء: ۷]

''اگر تم نے برائی کی تو اس کا وبال تمھاری جانوں پر آئے گا۔''

مفسرین نے اس کی تفسیر بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ یہاں مراد یہ ہے:

''وَ اِنْ اَسَاْتُمْ فَعَلَيْهَا''

''اگر تم نے برائی کی تو اس کا وبال تمھاری جانوں پر آئے گا۔''

یہاں ''لها'' اور ''عَلَيْهَا'' کی بحث کچھ علمی سی ہے، جو اہلِ علم سے پوشیدہ نہیں ہے، لہٰذا ہم اس سے صرفِ نظر کرتے ہیں۔

---

[1] زاد المعاد و تحقیقه (۱/ ۵۰۰، ۵۰۱) صحیح الجامع (۳/ ۵/ ۵۱۵)

چوتھا جواب:

بقول امام خطابی رحمہ اللہ اگر یہ حدیث ثابت بھی ہو تو اس میں اس بات کا احتمال موجود ہے کہ اس کا معنیٰ یہ ہو کہ جو شخص مسجد میں نمازِ جنازہ پڑھے گا، اسے ثواب کم ہوگا، کیونکہ جو مسجد میں نمازِ جنازہ پڑھے گا، وہ عموماً وہیں سے اپنے گھر لوٹ جائے گا اور تدفین میں شرکت نہیں کر پائے گا تو وہ اس اجر سے محروم ہو جائے گا، جو نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے تدفین تک رہنے والوں کے لیے بتایا ہے۔

تدفین تک موجود رہنے کا اجر و ثواب:

صحیح مسلم، سنن ابن ماجہ، مسند احمد اور طیالسی میں حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

﴿مَنْ صَلّٰی عَلٰی جَنَازَةٍ فَلَهٗ قِيْرَاطٌ فَإِنْ شَهِدَ دَفْنَهَا فَلَهٗ قِيْرَاطَانِ، اَلْقِيْرَاطُ مِثْلَ أُحُدٍ﴾[1]

”جس نے کسی کی نمازِ جنازہ پڑھی، اسے ایک قیراط کے برابر ثواب ملتا ہے اور جو کسی کی تدفین میں بھی شریک ہوا، اسے دو قیراط کے برابر اجر ملتا ہے اور ایک قیراط جبلِ اُحد کے برابر ہوتا ہے۔“

اسی موضوع کی کئی احادیث اور بھی ہیں، جن میں سے کئی طرق سے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

﴿مَنْ شَهِدَ الْجَنَازَةَ [مِنْ بَيْتِهَا] (وَفِيْ رِوَايَةٍ: مَنِ اتَّبَعَ جَنَازَةَ مُسْلِمٍ إِيْمَانًا وَاحْتِسَابًا) حَتّٰى يُصَلّٰى عَلَيْهَا فَلَهٗ قِيْرَاطٌ، وَمَنْ شَهِدَهَا حَتّٰى يُدْفَنَ (وَفِي الرِّوَايَةِ الْأُخْرٰى: يُفْرَغَ مِنْهَا) فَلَهٗ قِيْرَاطَانِ [مِنَ الْأَجْرِ]﴾[2]

---

[1] صحيح مسلم مع شرح النووي (٤/ ٧/ ١٧) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٥٤٠) الفتح الرباني (٧/ ١٩٦) أحكام الجنائز (ص: ١٦٨، طبع المكتب الإسلامي) صحيح الجامع (٣/ ٥/ ٣١٥) رقم الحديث (٦٣٥٢)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٧، ١٣٢٣، ١٣٢٥) صحيح مسلم مع شرح النووي (٤/ ٧/ ١٣ تا ١٦) صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (١٢، ٢٧١٣) صحيح سنن الترمذي، رقم الحديث (٨٣١) صحيح سنن النسائي، رقم الحديث (٨٤ تا ١٨٨٧) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٥٣٩) صحيح الجامع، رقم الحديث (٦١٣٤ تا ٦١٣٨) الفتح الرباني (٧/ ١٩٢، ١٩٣) أحكام الجنائز (ص: ٦٧، ٦٨)

’’جو کسی کے گھر سے اس کے جنازے میں شریک ہوا (اور ایک روایت میں ہے کہ جس نے اللہ پر ایمان رکھتے ہوئے رضائے الٰہی کی خاطر کسی جنازے میں شرکت کی) یہاں تک کہ اس کی نمازِ جنازہ پڑھی، اُسے ایک قیراط کے برابر اجر ملے گا اور جو میت کی تدفین تک ساتھ رہا (اور دوسری روایت میں ہے کہ تدفین سے فارغ ہونے تک ساتھ رہا) اسے دو قیراط کے برابر اجر ملے گا۔‘‘

یہ حدیث صحیحین وسنن اربعہ، سنن کبریٰ بیہقی، مسند احمد و طیالسی اور منتقی ابن الجارود میں مروی ہے اور اس کے آخر میں یہ الفاظ بھی ہیں کہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا کہ قیراطان کیا ہیں؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«مِثْلُ الْجَبَلَيْنِ الْعَظِيمَيْنِ [وَفِي الرِّوَايَةِ الْأُخْرىٰ: كُلُّ قِيرَاطٍ مِثْلَ أُحُدٍ]»

’’دو بڑے بڑے پہاڑوں کے برابر اور دوسری روایت میں ہے کہ ہر قیراط جبلِ اُحد کے برابر ہوتا ہے۔‘‘

ایسے ہی حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے بھی اسی مفہوم کا ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سنن نسائی اور مسند احمد میں مروی ہے۔[1] اور نسائی و مسند احمد میں اسی مفہوم و معنیٰ کا ایک ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم حضرت عبداللہ بن مغفل رضی اللہ عنہ سے بھی مروی ہے۔[2] مسند احمد و بزار اور مسند ابی یعلی میں حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے بھی ایسی ہی ایک حدیث مروی ہے۔[3]

ان احادیث کے متن و ترجمے سے ہم صرفِ نظر کر رہے ہیں، تاکہ اختصار بھی ہوجائے اور ویسے بھی ان میں وہی بات آئی ہے، جو صحیح بخاری و مسلم، سنن اربعہ اور دیگر کتب والی اس دوسری حدیثِ ابوہریرہ رضی اللہ عنہ اور صحیح مسلم و دیگر کتب والی پہلی حدیثِ ثوبان رضی اللہ عنہ میں آ گئی ہے، ان سب کا مجموعی و مرکزی معنیٰ ایک ہی ہے کہ اگر صرف نمازِ جنازہ پڑھی تو ثواب ایک قیراط کے برابر ہوجائے گا، اور ایک قیراط اُحد پہاڑ کے برابر ہوتا ہے۔ اسی مفہوم کی بعض دیگر احادیث کی تخریج حافظ ابن حجر رحمہ اللہ

[1] صحيح سنن النسائي (٢/ ٤١٨) رقم الحديث (١٨٣٣) صحيح الجامع، رقم الحديث (٦١٣٤) أحكام الجنائز (ص: ٦٨)

[2] حواله جات بالا، و الفتح الرباني (٧/ ١٩٦)

[3] أحكام الجنائز للألباني (ص: ٦٨٠) الفتح الرباني (٧/ ١٩٧)

نے کر دی ہے، جن کی تفصیل کے لیے فتح الباری (۳/۱۹۲ تا ۱۹۸) دیکھی جا سکتی ہے۔

معلوم ہوا کہ مسجد میں جنازہ پڑھنے والے سستی کر جاتے ہیں اور وہیں سے صرف ایک قیراط ثواب لے کر واپس ہو جاتے ہیں، جبکہ جنازہ گاہ میں جانے والا ساتھ ہی تدفین میں بھی شرکت کر لیتا ہے اور دو قیراط ثواب پاتا ہے، اس طرح مسجد میں نماز پڑھنے والے کے ثواب میں کمی واقع ہو گئی۔

آگے امام خطابی لکھتے ہیں کہ اس کے علاوہ کسی کے جنازے میں شرکت کے لیے جو قدم قدم پر ثواب ملتا ہے، مسجد میں جنازہ ہونے کی صورت میں وہ بھی کم ہو جائے گا اور جنازہ گاہ دور ہو گی تو زیادہ قدم چلے گا اور ثواب بھی زیادہ ہو گا، اس طرح یہ احتمال بھی واضح ہو جاتا ہے کہ حدیثِ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے ثابت ہو جانے کی شکل میں مسجد میں نماز پڑھنے پر ثواب کم ہونے کا پتا دیا گیا ہے اور کچھ نہیں۔

پانچواں جواب:

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ والی حدیث میں مسجد میں پڑھی گئی نمازِ جنازہ کے صحیح نہ ہونے کی تو کوئی دلیل ہی نہیں ہے، پھر یہ جواز پر دلالت کرنے والی احادیث کی معارض کیسے ہو سکتی ہے؟

امام طحاوی رحمہ اللہ کا دعوائے نسخ اور اس کا جائزہ:

یہاں تک تو بات تھی دو قسم کی احادیث میں جمع و تطبیق اور موافقت و مطابقت پیدا کرنے کی، تا کہ ان کے مابین بظاہر نظر آنے والا تعارض و تناقض یا تضاد رفع ہو اور سابقہ تفصیل سے وہ الحمد للہ رفع ہو گیا ہے۔

یہاں یہ بات بھی ذکر کرتے چلیں کہ امام طحاوی رحمہ اللہ نے ترجیح کی بجائے یہ موقف اختیار کیا ہے کہ اُم المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا والی حدیث جس سے مسجد میں نمازِ جنازہ کے واضح جواز کا پتا چلتا ہے، وہ منسوخ ہے اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی آخری سنت یا آخر الامرین مسجد میں نمازِ جنازہ کا ترک ہے۔ ان کے نزدیک اس کی دلیل یہ ہے کہ اگر مسجد میں نمازِ جنازہ کا جواز منسوخ نہ ہوا ہوتا تو پھر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے مسجد میں نمازِ جنازہ پڑھنے پر نکیر و اعتراض نہ کرتے اور ان کا نکیر کرنا اس بات کا پتا دیتا ہے کہ انھیں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا والی روایت کے برعکس (عدمِ جواز والی کسی) روایت کا علم ہو چکا تھا۔

امام طحاوی کے اس موقف کی کثیر ائمہ وفقہا اور محدثین نے سخت تردید کی ہے، انھی میں سے ایک امام بیہقی بھی ہیں، چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

''اگر حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کو کسی ایسی حدیث کا علم ہوتا، جس سے جواز منسوخ سمجھا جاتا تو وہ اس حدیث کو اس دن پیش فرماتے، جس دن عام انصار و مہاجرین صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی نمازِ جنازہ مسجدِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں پڑھی تھی، یا پھر اس دن وہ حدیث پیش فرماتے، جس دن حضرت عمرِ فاروق رضی اللہ عنہ کی نمازِ جنازہ بھی مسجد ہی میں پڑھی گئی تھی، یا پھر جن لوگوں نے ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے اس عمل پر نکیر کی تھی، انھوں ہی نے ناسخ حدیث پیش کی ہوتی اور تب نہیں تو جب حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے اپنے اس عمل کے جواز میں حضرت بیضاء رضی اللہ عنہا کے دو بیٹوں حضرت سہل اور ان کے بھائی (رضی اللہ عنہما) کی نمازِ جنازہ کے سلسلے میں بتایا کہ خود نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی نمازِ جنازہ مسجد میں پڑھی تھی تو کم از کم اسی وقت کوئی نسخ کا پتا دینے والی حدیث بیان کرتا، لیکن ایسا نہیں ہوا، بلکہ جن لوگوں کو جواز کا علم نہیں تھا، انھوں نے اعتراض کیا اور جب حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے جواز پر دلالت کرنے والے نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے عملِ مبارک کا حوالہ دیا تو وہ لوگ خاموش ہوگئے اور پھر کوئی اعتراض نہ کیا گیا ہو۔''[1]

اس سے معلوم ہوا کہ امام طحاوی رحمہ اللہ کا دعواے نسخ غیر صحیح ہے۔ فتاویٰ عالمگیری میں مسجد میں نمازِ جنازہ کے سلسلے میں لکھا ہے:

''بارش وغیرہ کا عذر ہو تو مطلق مکروہ نہیں اور بلا عذر ہو تو یہ مکروہ ہے، جبکہ حاشیہ میں ابن الہمام کے حوالے سے لکھا ہے کہ انھوں نے اس بات کو ترجیح دی ہے کہ یہ کراہت تنزیہی ہے، تحریمی نہیں، لہٰذا شافعیہ وغیرہ کے کچھ خلاف نہیں ہے۔''[2]

غرض کہ مسجد میں کراہت یا ممانعت اور اس کے صحیح نہ ہونے والا قول ضعیف ہے اور صحیح تر بات یہ ہے کہ باہر جنازہ گاہ میں اور مسجد میں دونوں جگہ ہی جائز ہے، البتہ افضل مسجد سے باہر ہی ہے۔[3]

---

[1] زاد المعاد (١/ ٥٠١) إعلام الساجد (ص: ٣٥٢، ٣٥٣)

[2] فتاویٰ عالمگیری اُردو ترجمہ مولانا سید امیر علی (١/ ٢٦٢) طبع ادارہ نشریات اسلام لاہور

[3] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: معالم السنن (١/ ١/ ٢٧١، دار الکتب العلمیة) زاد المعاد (١/ ٥٠١، ٥٠٢) إعلام ←

مساجد کے نام رکھنا:

احکام وآدابِ مساجد کے ضمن میں ہی ایک بات یہ بھی قابلِ توجہ ہے کہ سلف صالحین میں سے بعض حضرات اس بات کو پسند نہیں کرتے تھے کہ مساجد کو غیر اللہ کی طرف منسوب کیا جائے، مثلاً یہ کہا جائے، جامع مسجد غوثیہ، جامع مسجد قادریہ، جامع مسجد چشتیہ، جامع مسجد سہروردیہ، جامع مسجد حنفیہ؛ ایسے ہی مختلف ناموں کی طرف منسوب کرتے ہوئے جامع مسجد فلاں اور جامع مسجد فلاں اور مصنف ابن ابی شیبہ کی روایت کے مطابق یہ مسلک حضرت ابراہیم نخعی رحمہ اللہ اور بعض دیگر اہلِ علم سے منقول ہے کہ وہ مساجد کی غیر اللہ کی طرف نسبت کو مکروہ و ناپسندیدہ سمجھتے تھے۔[1] ان کا استدلال قرآنِ کریم سورت جن میں وارد اس ارشادِ الٰہی سے ہے:

﴿وَاَنَّ الْمَسٰجِدَ لِلّٰهِ فَلَا تَدْعُوْا مَعَ اللّٰهِ اَحَدًا﴾ [الجن: ١٨]

''(اے نبی کہہ دیجیے کہ) یہ مسجدیں اللہ کے لیے ہیں، لہٰذا ان میں اللہ کے ساتھ کسی اور کو مت پکارو۔''

اس آیت میں مساجد کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کی گئی ہے، ایسے ہی سورتِ بقرہ، آیت (١١٤) اور سورتِ توبہ، آیت (١٧، ١٨) میں بھی تینوں جگہوں پر ﴿مَسَاجِدَ اللّٰهِ﴾ کا لفظ آیا ہے اور مساجد کی اضافت اللہ تعالیٰ کی طرف کی گئی ہے۔ لہٰذا ان کے نزدیک غیر اللہ کی طرف کسی مسجد کی نسبت مکروہ وممنوع ہے، لہٰذا مساجد کو، جو اللہ تعالیٰ کے گھر ہیں، مختلف مسالک ومشارب یا شخصیات وقبائل کے ناموں کی طرف منسوب نہیں کرنا چاہیے۔ یہ امام نخعی رحمہ اللہ اور ان کے بعض موافقین کا مسلک ہے۔

مشہور مسلک:

لیکن اس سلسلے میں جمہور اہلِ علم کا مشہور مسلک یہ ہے کہ مسجد کو کسی کی طرف منسوب کرنا جائز ہے اور اس آیت سے استدلال کا جواب یہ ہے کہ یہ نسبت یا اضافت برائے ملکیت نہیں ہوتی، بلکہ یہ

← الساجد (ص: ٣٥١، ٣٥٣) فتح الباري (٣/ ١٩٦، دار الإفتاء) بداية المجتهد (١/ ٢٤٢، ٢٤٣، المعارف رياض) عون المعبود (٨/ ٤٧٧، ٤٨٠) طبع مدني، الفتح الرباني و شرحه (٧/ ٢٤٧، ٢٥٠، دارالشهاب قاهره) الموسوعة الفقهية (١٦/ ٣٥، ٣٦، طبع أوقاف الكويت)

[1] فتح الباري (١/ ٥١٥) إعلام الساجد (ص: ٣٨٤)

تو امتیاز وفرق اور تعارف و پہچان کے طور پر ہوتی ہے، تاکہ ذکر و تذکرے کے وقت ایسی اضافت ونسبت کی وجہ سے مسجدِ مقصود کو پہچاننے میں آسانی رہے اور ایسی اضافت جو ملکیت کے لیے نہیں، بلکہ محض فرق و تمییز کے لیے ہو، یہ ممنوع نہیں ہوتی، کیونکہ آیت میں اضافتِ ملکیت ہے، جیسا کہ علامہ زرکشی رحمہ اللہ نے ''إعلام الساجد'' (ص: ٣٨٤، ٣٨٥) میں اور حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے فتح الباری (١/ ٥٠٥) میں لکھا ہے اور اس بات کی دلیل کتبِ حدیث سے بھی ملتی ہے، چنانچہ صحیح بخاری و مسلم، سنن نسائی، دارمی اور موطا امام مالک میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان فرماتے ہیں:

« إِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ سَابَقَ بَيْنَ الْخَيْلِ الَّتِي أُضْمِرَتْ مِنَ الْحَيْفَاءِ، وَأَمَدُّهَا ثَنِيَّةَ الْوَدَاعِ، وَسَابَقَ بَيْنَ الْخَيْلِ الَّتِي لَمْ تُضْمَرْ مِنَ الثَّنِيَّةِ إِلٰى مَسْجِدِ بَنِي زُرَيْقٍ »[1]

''نبیِ اکرم ﷺ نے تضمیر و تربیت یافتہ گھوڑوں کی دوڑ کروائی، جن کے لیے حیفاء نامی جگہ سے لے کر ثنیۃ الوداع نامی مقام تک مسافت طے پائی اور غیر تضمیر و غیر تربیت یافتہ گھوڑوں کی دوڑ کروائی، جن کے لیے طے شدہ مسافت ثنیۃ الوداع نامی جگہ سے لے کر مسجد بنی زریق تک تھی۔''

اس حدیث میں گھوڑ دوڑ کا ذکر ہے، جو خالص جہادِ اسلامی کے لیے تیار کیے گئے گھوڑوں کو جانچنے پرکھنے اور مزید تربیت دینے کی گنجایش وغیرہ معلوم کرنے کے لیے تھی۔ تضمیر سے مراد یہ ہے کہ گھوڑوں کو بھوک و پیاس کا عادی بنا کر اور کم چارہ بھوسا دے کر ہلکے بدن اور چھوٹے پیٹ والا بنایا جاتا ہے، تاکہ تیز سے تیز دوڑ سکے۔ یہ اندازِ تربیت جائز ہے اور اگر کسی جانور کو بلاوجہ بھوکا پیاسا رکھا جائے اور اس سے کام برابر لیا جائے تو وہ منع ہے، جس پر دلالت کرنے والی احادیث قربانی پر کیے گئے بعض اندیشوں کے اعتراضاتِ بے رحمی وغیرہ کی تردید کے ضمن میں ہم ذکر کر چکے ہیں، جن کی تفصیل اور نبیِ اکرم ﷺ کی جانوروں کے ساتھ بھی رحمۃ للعالمینی کی متعدد مثالیں مسائل و احکام قربانی کے ضمن میں موجود ہیں۔[2]

---

[1] صحيح البخاري مع الفتح (١/ ٥١٥) مختصر صحيح مسلم للمنذري (١١٠٨) صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (٢٢٤٥) صحيح سنن الترمذي، رقم الحديث (١٣٨٩) صحيح سنن النسائي، رقم الحديث (٣٣٥١) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٢٨٧٧) موطا الإمام مالك (٢/ ٤٦٧، ٤٦٨)

[2] دیکھیں ہماری کتاب: ''عیدین و قربانی'' طبع پاک و ہند۔

ساتھ ہی یہ بات بھی پیشِ نظر رہے کہ اس حدیث میں نبیِ اکرم ﷺ کے گھوڑوں کی دوڑ کرانے سے کسی کے ذہن میں ریس کورس کا نقشہ ہرگز نہیں آنا چاہیے، کیونکہ موجود دور کی یہ ریس ان پاک و مقدس مقاصدِ جہاد سے قطعاً عاری ہوتی ہے، پھر سٹہ و قمار یا جُوا وغیرہ جیسی بیماریاں اس پر مستزاد ہیں، جن کی تفصیل کا یہ موقع نہیں۔

اس حدیث میں محلِ شاہد یا مقامِ استشہاد صرف وہ الفاظ ہیں، جن میں ایک نام مسجد بنی زریق آیا ہے۔ گویا عہدِ نبوت میں بھی پہچان کے لیے بعض مساجد کی اضافت بعض قبائل وغیرہ کی طرف ہوچکی تھیں۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے اس حدیث پر یوں تبویب کی ہے:

"باب هل يقال مسجد بني فلان؟"

"اس بات کا بیان کہ کیا کسی مسجد کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ قبیلہ فلاں کی مسجد؟"

اس باب کو استفہام و استفسار یا سوال کے انداز میں ذکر فرمایا ہے، حکم نہیں لگایا، جس کی وجہ دراصل یہ ہے کہ الفاظِ حدیث میں اس بات کا احتمال موجود ہے کہ اس مسجد کا یہ نام "مسجد بنی زریق" نبیِ اکرم ﷺ کے عہدِ مبارک میں ہی رکھا گیا ہو اور یہ بات آپ ﷺ کے علم میں بھی آ گئی ہو۔ اس بات کا امکان بھی ہے کہ اس مسجد کا یہ نام نبیِ اکرم ﷺ کے بعد رکھا گیا ہو اور راویِ حدیث نے اس کا موجودہ نام ذکر کر دیا ہو، اس احتمال کی وجہ سے امام بخاری رحمہ اللہ نے استفہامیہ انداز میں تبویب کی ہے اور اپنا رجحان بھی واضح کر دیا ہے، جبکہ صاحبِ فتح الباری نے لکھا ہے کہ ان دونوں طرح کے احتمالات میں سے زیادہ ظاہر پہلا ہی ہے کہ اس مسجد کا یہ نام نبیِ اکرم ﷺ کے عہدِ مبارک ہی میں رکھا گیا ہو اور جمہور علماے امت ایسی اضافت ونسبت کو جائز قرار دیتے ہیں۔[1]

البتہ بہتر ہو کہ مسجد کو اگر کسی کی طرف منسوب کرنا ہو تو یہ اضافت محض امتیاز کے لیے ہو، اس میں تعصّب اور انتشار و افتراق کا داعیہ کارفرما ہو نہ اس اضافت کو اپنے یا اپنے باپ دادا کے لیے بڑائی اور فخر و ریا کا ذریعہ نہ بنایا جائے، بلکہ جب مسجد خالص رضائے الٰہی کے لیے تعمیر کریں یا کروائیں تو اس کی اضافت میں بھی احتیاط کا دامن ہاتھ سے نہ جانے دیں اور کسی ایسی شخصیت کی طرف اضافت ونسبت کریں، جس میں ایسی کوئی بات نہ ہو، مثلاً مسجد ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ، مسجد عمرِ فاروق رضی اللہ عنہ،

[1] فتح الباری (١/ ٥١٥، ٥١٦) إعلام الساجد (ص: ٣٨٤، ٣٨٥) فتاویٰ ثنائیہ (١/ ٢٦٦) فتاویٰ علمائے حدیث (٢/ ٦٩)

مسجد عثمان غنی رضی اللہ عنہ، مسجد علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ، مسجد سلمان الفارسی رضی اللہ عنہ، مسجد صہیب الرومی رضی اللہ عنہ یا کسی بھی دوسرے صحابی کی طرف منسوب کریں جو ''رضي الله عنهم ورضوا عنه'' کا مقام پا گئے ہیں یا پھر انھی کے تربیت یافتہ تابعین اور ان کی روایات کے امین ائمہ حدیث اور ائمہ مجتہدین کی طرف منسوب کریں، جو نورِ علم و ہدایت کے مینار تھے، اس طرح ان کی دینی خدمات کا اعتراف اور ان کی رفعتوں کو خراجِ تحسین پیش ہوجائے گا اور مسجد کا نام بھی ہوجائے گا، البتہ کسی خاندان و قبیلہ اور عام شخص کی طرف یہ اضافت و انتساب بھی جائز ہے، لیکن بہتر طریقہ پہلا ہی ہے۔

اوقاتِ نماز کے علاوہ مساجد کے دروازے بند کرنا:

احکام و آدابِ مسجد میں سے ہی ایک یہ بھی ہے کہ آیا اوقاتِ نماز کے علاوہ دیگر اوقات میں مساجد کے دروازے بند کرنا جائز ہے یا نہیں؟

اس سلسلے میں یہ بات تو واضح طور پر کتبِ حدیث میں موجود ہے کہ بوقتِ تعمیر مسجد کے دروازوں کی جگہ رکھنے کے ساتھ ہی وہاں کے دروازے بھی لگائے جا سکتے ہیں، حتیٰ کہ ان دروازوں کی کنڈیوں وغیرہ کا تذکرہ بھی ملتا ہے، اگرچہ وہ اشارتاً ہے، صراحتاً نہیں، چنانچہ صحیح بخاری کے ایک ترجمۃ الباب میں حضرت ابن جریج رحمہ اللہ سے منقول ہے کہ حضرت ابن ابی ملیکہ رحمہ اللہ نے مجھ سے مخاطب ہوکر فرمایا: اے عبدالملک! ''لَوْ رَأَيْتَ مَسَاجِدَ ابْنِ عَبَّاسٍ وَأَبْوَابِهَا''[1]

''اگر تم حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی بنائی ہوئی مساجد دیکھ لیتے (تو تمھیں پتا چلتا کہ) ان کی اور اُن کے دروازوں کی نظافت و نفاست کس درجہ تک پہنچی ہوئی تھی۔''

عام مساجد تو کجا خاص بیت اللہ شریف یا خانہ کعبہ کے دروازے کا ذکر بھی ملتا ہے، جیسا کہ خانہ کعبہ کے اندر نماز کے جواز کے سلسلے میں بھی حدیث ذکر کی جا چکی ہے، جو صحیح بخاری و مسلم اور دیگر کتبِ حدیث میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے، جس میں وہ بیان فرماتے ہیں کہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم، حضرت اسامہ بن زید، حضرت بلال اور حضرت عثمان بن طلحہ رضی اللہ عنہم بیت اللہ شریف میں داخل ہوگئے۔

«فَأَغْلَقُوا عَلَيْهِمُ الْبَابَ فَلَمَّا فَتَحُوا كُنْتُ أَوَّلَ مَنْ وَلَجَ»[2]

---

[1] صحيح البخاري (۱/ ۵۵۹)

[2] صحيح البخاري (۱/ ۵۵۹ و ۳/ ۴۶۳)

''انھوں نے (اندر جا کر اندر سے) دروازہ بند کر لیا، جب انھوں نے دروازہ کھولا تو سب سے پہلے میں اندر گیا۔''

اس حدیث میں آگے بھی کچھ الفاظ ہیں، لیکن ہمارا مقصود انہی الفاظ میں موجود ہے کہ خانہ کعبہ کا دروازہ تھا، جسے اندر سے نبیِ اکرم ﷺ اور آپ ﷺ کے مرافقین صحابہ رضی اللہ عنہم نے بند کر لیا تھا۔ اس حدیث پر امام بخاری نے کتاب الصلاۃ میں یوں تبویب کی ہے:

''باب الأبواب والغلق للكعبة والمساجد''

یعنی خانہ کعبہ اور عام مساجد کے لیے دروازوں اور انھیں بند کرنے والے کواڑوں کنڈیوں کا بیان۔

پھر کتاب الحج میں جا کر اس حدیث پر یوں تبویب کی ہے:

''باب إغلاق البيت'' یعنی بیت اللہ کے دروازوں کو بند کر لینے کا بیان۔

اس طرح بیت اللہ شریف اور عام مساجد کے لیے دروازوں وغیرہ کا ثبوت تو مل جاتا ہے اور کعبۃ اللہ کے اندر داخل ہو کر اس کے دروازے کو اندر سے بند کر لینے کا پتا بھی چل جاتا ہے۔ بات صرف یہ رہ جاتی ہے کہ آیا اوقاتِ نماز کو چھوڑ کر دوسرے اوقات میں مساجد کو تالے وغیرہ لگا کر بند کرنا روا ہے یا نہیں؟ اس سلسلے میں کوئی واضح وصریح دلیل تو ہماری نظر سے نہیں گزری، جس سے جواز ثابت ہو، بلکہ اس کے برعکس فقہاے احناف میں سے بعض نے اسے مکروہ قرار دیا ہے، بلکہ صیمری نے شرح الکفایہ میں کہا ہے کہ خود امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کسی بھی وقت مسجد کے دروازے بند کرنے کو ممنوع قرار دیتے تھے۔ امام نووی نے روضۃ الطالبین میں الکفایہ سے ان کا یہ قول نقل کیا ہے اور اسے برقرار رکھا، بلکہ اس کی تائید کی ہے۔[1]

مساجد کو بند کرنے کے ناجائز ہونے پر احناف کا استدلال اس ارشادِ الٰہی سے ہے:

﴿وَ مَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ مَّنَعَ مَسٰجِدَ اللّٰهِ اَنْ يُّذْكَرَ فِيْهَا اسْمُهٗ وَ سَعٰى فِيْ خَرَابِهَا﴾ [البقرة: ١١٤]

''اور اس شخص سے بڑھ کر ظالم کون ہوگا جو اللہ کی مسجدوں میں اس کے نام کی یاد سے روکے اور ان کی ویرانی کے درپے ہو۔''

---

[1] دیکھیں: إعلام الساجد للزركشي (ص: ٣٤٠)

طوافِ بیت اللہ سے روکنے والے صرف مشرکین ہی مراد ہیں، بلکہ ان کے ساتھ ہی چونکہ یہ آیت عام ہے، لہٰذا ہر مسجد سے روکنے والے ہر شخص کو شامل ہے۔ تفصیل کے طالب سورت بقرۃ آیت (۱۱۴) اور سورۃ التوبہ آیت (۱۷، ۱۸) کی تفسیر دیکھ سکتے ہیں۔ تفسیر ابن کثیر و قرطبی اور تفہیم القرآن وغیرہ میں اس کی تفصیل موجود ہے۔ سورۃ البقرۃ کی اس آیت (۱۱۴) سے استدلال کرتے ہوئے نماز کے علاوہ اوقات میں مساجد کی تالا بندی کو ممنوع قرار دینے والی بات دل کو بھاتی ہے۔

لہٰذا متولیانِ مساجد کو چاہیے کہ وہ اس طرف توجہ مبذول فرمائیں اور مساجد کی تالا بندی کرنے اور لوگوں کو ان میں ذکر وفکر اور نماز و تلاوت جیسی عبادات سے روکنے کے بجائے ایک شخص کو نگران مقرر کر دیں، جو مسجد سے متعلقہ اشیا لاؤڈ سپیکر، قالین، کلاک، ویکیوم کلینز یا قالین صاف کرنے والی برقی مشین، پیتل کی ٹوٹیوں اور دوسری چیزوں پر نظر رکھے اور رات کے وقت بھی پہرے داری کرے، جسے پہرے دار یا مسجد کا خادم کہا جا سکتا ہے۔ وہ ہر وقت موجود رہے اور مسجد کے دروازے کھلے رکھے، تا کہ وقت بے وقت آنے والوں کو اللہ کا گھر کھلا ملے اور اس پر اللہ کے گھروں سے روکنے کی یہ وعید صادق نہ آئے۔

دوسری رائے:

لیکن اس کا کیا کیجیے کہ ہر مسجد میں خادم رکھنے یا پہرے دار مقرر کرنے کی ہر متولی میں ہمت نہیں ہوتی، لہٰذا وہ یا مساجد کا انتظام و انصرام کرنے والے اوقاف و اُمورِ اسلامیہ کے ادارے امام یا مؤذن پر پابندی عائد کر دیتے ہیں کہ وہ نماز کے وقت مسجد کو کھولیں اور نماز کے بعد اسے بند کر دیں اور یہ بھی چوری چکاری کی ایک مجبوری کے تحت ہوتا ہے، جو آج سے نہیں بلکہ صدیوں سے در آئی ہے، کیونکہ آٹھویں صدی ہجری میں پیدا اور اسی میں فوت ہونے والے علامہ زرکشی رحمہ اللہ نے لکھا ہے:

> ''مسجدوں کو بند نہ کرنے پر عمل سلف صالحین کے عہدِ مبارک میں تو ممکن تھا، لیکن اب ایسا نہیں، بلکہ اس سلسلے میں ایک دوسری رائے یہ ہے کہ آج کے دَور میں چونکہ جرائم بہت بڑھ چکے ہیں اور تو اور اللہ کے گھروں سے چوری ہونے کا خدشہ بھی رہتا ہے اور مسجدوں میں گھس کر مسجدوں کے ملحقہ مکانوں یا دکانوں میں نقب زنی یا دیوار پھاڑ کر چوری کا اندیشہ بھی ہے، لہٰذا ان قباحتوں سے بچنے کے لیے مساجد کو بند کرنا جائز ہے۔'' [1]

---

[1] إعلام الساجد أيضاً

یہ تو آٹھویں صدی ہجری کے ایک فاضل عالم کے خدشات ہیں اور اب تو یہ خدشات حقائق کا روپ بھی دھار چکے ہیں۔ واقعی چوری چکاری کے ایسے واقعات رونما ہوتے رہتے ہیں۔ کہیں ایمپلی فائر مشین، کہیں ہارن کا یونٹ اور کہیں کچھ چوری ہوتا ہے۔ لہٰذا ان حالات کے پیشِ نظر اس دوسری رائے پر عمل کرنا بھی روا ہوگا کہ نماز کے اوقات کو چھوڑ کر باقی اوقات مثلاً طلوعِ آفتاب سے لے کر دوپہر بارہ بجے تک اور پھر نمازِ عشاء سے لے کر فجر تک مساجد کو بند کر دیا جائے۔ آج ان عرب ممالک میں بھی دوسری رائے پر عمل ہو رہا ہے، بلکہ ہمارے ممالک میں ممانعت کی پہلی رائے رکھنے والے لوگ بھی ان اوقات میں مساجد کو بند کر دیتے ہیں۔

استاذ الاساتذہ شیخ الکل میاں سید نذیر حسین محدّث دہلوی رحمہ اللہ کا فتویٰ بھی یہی ہے:

''بلا وجہ تالا لگانا منع ہے اور چوری کے ڈر اور ذکر اللہ میں رکاوٹ نہ آنے کی صورت میں جائز ہے۔''[1]

البتہ بند کرنے اور کھولنے والے ائمہ و موذنین کو چاہیے کہ کسی نماز کی اذان سے معقول وقت پہلے اور کافی وقت بعد تک مساجد کھلی رکھنے کا اہتمام کریں۔ یہاں ان عرب ممالک میں تو اوقاف و امور اسلامیہ کی طرف سے باقاعدہ حکم ہے کہ ہر نماز سے کم از کم ۱۰۔ ۱۵ منٹ پہلے مسجد کھولیں اور کم از کم آدھا گھنٹا، ۲۰ منٹ تک نماز کے بعد بھی کھلی رہنے دیں اور پھر بند کریں، جیسا کہ بعض ائمہ و موذنین اور اوقاف سے متعلق لوگوں سے رابطہ کرنے پر ہمیں معلوم ہوا ہے۔

اب اگر کوئی صاحب اپنی ذاتی مصروفیات کی وجہ سے نمازیوں کو اتنا وقت نہیں دیتے تو یہ ان کی غلطی ہے اور اس کے وبال کے وہ خود ذمے دار ہیں۔ اس رائے پر عمل کی صورت میں جن مساجد میں خادم یا دربان رکھے گئے ہوں، جیسا کہ ہمارے ملک میں عموماً ہوتا ہے تو ان لوگوں کو علامہ تاج الدین سبکی رحمہ اللہ کی بات پر عمل کرنا چاہیے۔ چنانچہ وہ ''معید النعم'' میں لکھتے ہیں:

''دربان یا خادم کو مسجد کے دروازے کے قریب ہی کہیں رات بسر کرنی چاہیے، تاکہ اگر کوئی نمازی تہجد وغیرہ کے لیے رات کے وقت مسجد میں آنا چاہے تو آ سکے۔ بعض لوگ عشاء کے بعد یا کسی دوسرے وقت جب ایک مرتبہ دروازہ بند کر دیں تو پھر کسی کے آنے پر نہیں کھولتے، ان کے لیے یہ

[1] فتاویٰ نذیریہ (۱/۲۵۶) بحوالہ فتاویٰ علمائے حدیث (۲/۹۵)

رو یہ درست نہیں ہے۔''[1]

علامہ سبکی رحمہ اللہ کے اس بیان کی روشنی میں ان خادموں اور دربانوں کو اپنے رویے پر نظر ثانی کرنی چاہیے جو باوجود ضرورت کے مساجد ومدارس کے دروازے بند رکھتے ہیں اور صرف نماز باجماعت کے وقت ہی کھولتے ہیں۔ اگر کوئی کسی دوسرے وقت ضرورت سے آئے تو یہ خود بخود موجود ہونے کے باوجود اندر داخل نہیں ہونے دیتے۔

علامہ جمال الدین قاسمی نے ''إصلاح المساجد'' میں لکھا ہے۔

''مساجد ومدارس کے دروازے بلا ضرورت بند رکھنا تو بالا اتفاق ناجائز ہے۔ البتہ رات کے وقت چوری وغیرہ کے ڈر سے دروازے بند کر سکتے ہیں۔ ایسی کسی ضرورت کے واقعی...... یا غیر واقعی ہونے کا لحاظ بھی کرنا ہوگا۔''

مسجد کے خادم یا دربان کے بارے میں فرماتے ہیں:

''کسی ایسی واقعی ضرورت کی وجہ سے مسجد کے دورازے بند کرنے کی صورت میں اس کا فرض ہے کہ وہ دروازے کے قریب سوئے، تاکہ کسی کے اٹھانے سے اٹھ سکے۔ اسے جو تنخواہ ملتی ہے، وہ اسی لیے ملتی ہے کہ مسجد میں آنے والوں کو اس کی وجہ سے سہولت رہے۔ اگر وہ اس کا لحاظ نہیں رکھے گا تو اس کی تنخواہ جائز نہیں ہوگی۔''

یہ علامۂ شام شیخ محمد جمال الدین قاسمی کا فتویٰ ہے۔

متروک مسجد کا سامان اور زمین:

آداب و احکامِ مسجد کے سلسلے میں ضروری باتیں ہم نے ذکر دی ہیں۔ اس موضوع کی ایک آخری بات جو ہم ذکر کرنا چاہتے ہیں، یہ ہے کہ اگر کسی گاؤں یا کسی آبادی میں کوئی مسجد ہو اور وہ گاؤں یا آبادی مرورِ زمانہ کے بعد کسی بھی سبب سے اجڑ جائے، وہاں کوئی انسان آباد نہ رہے اور نہ کوئی نماز پڑھنے والا قریب قریب موجود ہو تو اس مسجد کا کیا کرنا ہے؟ نیز اگر کوئی مسجد کسی وجہ سے متروک ومعطل ہوجائے یعنی قریب ہی نئی مسجد تعمیر ہوجانے کی وجہ سے اس مسجد کو نماز سے بند کردیا گیا ہو تو اس مسجد کو کیا کرنا ہے؟ ان دونوں صورتوں میں مسجد کا کیا حکم ہے؟

[1] إصلاح المساجد (ص: ٢٧٧)

اس سلسلے میں پہلی بات یہ ہے کہ چونکہ اللہ کے نام وقف زمین ہوتی ہے، لہٰذا وہ گاؤں یا آبادی رہے نہ رہے، وہ زمین وقف ہی رہے گی۔ وہ وقف کرنے والے کی ملکیت میں نہیں آئے گی۔ اس پر تمام ائمہ وفقہاء کا اتفاق ہے سوائے امام محمد بن حسن شیبانی کے! وہ جگہ وقف کی صورت میں ہی پڑی رہے گی اور ساتھ والی دوسری نئی مسجد کی تعمیر وترقی میں اس جگہ کی آمدنی کو صرف کیا جائے گا اور جس طرح عام وقف اشیا کا حکم ہوتا ہے، اسی طرح یہ زمین بھی ہوگی۔[1]

اب رہی دوسری صورت کہ مسجد تو باقی ہے، لیکن آبادی نہیں رہی۔ لوگ کسی وجہ سے نقل مکانی کر گئے ہیں اور وہاں نماز کوئی نہیں پڑھتا تو ظاہر ہے کہ وہ مسجد متروک ہوجائے گی اور اگر اسے اسی حالت میں رہنے دیا جائے تو وہ چور خانہ بن جائے گی یا پھر لوگ اس کا سامان نکال کرلے جائیں گے۔ ان خدشات کے پیش نظر اس مسجد کو قرآن وحدیث کی تعلیم کا مدرسہ بنایا جائے یا پھر اسے توڑ کر اس کا جملہ سامان لکڑی، لوہا، قالین، دریاں اور پنکھے وغیرہ محفوظ کرلیے جائیں۔ یا پھر ان اشیاء کو بیچ کر ان کی قیمت محفوظ کرلیں اور وہ کسی دوسری مسجد پر صرف کردیں۔[2]

اگر اسی سامان کو کسی دوسری مسجد کے بنانے میں لگایا جائے تو بھی فقہائے شافعیہ میں سے متولی، ابن الصباغ اور قاضی کے بقول یہ جائز ہے اور متولی کے بقول اولیٰ یہ ہے کہ وہ اشیا کسی قریب تر جگہ کی مسجد میں لگائی جائیں، لیکن اگر کسی دور کی مسجد میں بھی صرف کردیں تو بھی جائز ہے۔ البتہ یہ ہرگز جائز نہیں کہ کسی ایسی مسجد کی اشیا لکڑی لوہا وغیرہ کو سراؤں، پلوں یا کنوؤں پر لگایا جائے، بلکہ ایک مسجد کا سامان کسی مسجد ہی میں لگایا جائے گا۔ ایسے ہی مسجد کے قالین، دریاں اور قندیلیں (یا بلب اور ٹیوبیں نیز پنکھے اور ائیر کنڈیشنرز) وغیرہ بھی کسی دوسری مسجد میں لگا دیے جائیں۔

کتاب الکافی میں خوارزمی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ہمارے فقہا متروک مسجد کی اشیا کو کہیں منتقل کرنا روا قرار نہیں دیتے، لیکن پھر انھوں نے خود اپنی رائے ذکر کرتے ہوئے کہا ہے کہ میرے نزدیک زیادہ مفید تر بات یہ ہے کہ ان اشیاء کو کسی دوسری مسجد میں منتقل کر دینا چاہیے اور امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کا بھی یہی مسلک نقل کیا گیا ہے۔

---

[1] إصلاح المساجد (ص: ٢٧٨)

[2] فتاویٰ ثنائية (١/ ٣٢٨) فتاویٰ علمائے حدیث(٥٠/٢)

اس تفصیل سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ اگر کسی کمپنی کی رہایشی کالونی میں عارضی طور پر کوئی مسجد بنائی گئی ہو اور وہ ایک عرصہ تک رہے اور اس کی ضروریات کے لیے کچھ لوگ مل کر ایک فنڈ بنائیں، جس سے اس مسجد کی ضرورتیں پوری کی جاتی ہیں۔ پھر کسی وقت وہاں سے کمپنی کا کیمپ ختم ہوجائے تو ظاہر ہے کہ وہ مسجد وہاں نہیں رہے گی، بلکہ کمپنی کے منتقل ہوتے ہی وہ متروک ہوجائے گی اور اس کا سامان بھی کسی دوسری مسجد کو منتقل ہوجائے گا۔ زمین پہلے ہی وقف نہیں بلکہ وہاں مسجد مؤقت تھی۔ اور اس کے لیے جو فنڈ بنایا گیا تھا، اس میں جتنا پیسا باقی ہو، اسے کسی دوسری مسجد پر صَرف کر دیا جائے گا، جو قریب ہو۔

کرائے کی جگہ کو مسجد بنانا:

کمپنیوں کی نقل مکانی کا یہ سلسلہ چونکہ عام ہے اور فنڈ یا بجٹ اور ایسی مؤقت مساجد کے فاضل سامان کا مسئلہ پیدا ہوتا ہی رہتا ہے، لہٰذا فقہا کی بیان کردہ ان تفصیلات سے استفادہ کیا جاسکتا ہے۔ یہ تو کسی کی جگہ پر زمین کے مالک کی رضا و مرضی سے مؤقت مسجد کی بات ہے۔

امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے سوا تمام ائمہ رحمہم اللہ کے نزدیک تو یہ بھی جائز ہے کہ کوئی مکان کرائے پر لیا جائے اور اسے نماز پڑھنے کے لیے مسجد کے طور پر استعمال کیا جائے۔ علامہ زرکشی رحمہ اللہ نے اس کے جواز کی تائید کرتے ہوئے لکھا ہے:

> ''کرائے پر لی گئی اس جگہ سے یہ منفعت حاصل کرنا اور فائدہ اٹھانا ایک مقصود ومطلوب امر ہے۔ جب اپنے سونے اور سامان وغیرہ رکھنے کے لیے کرائے پر گھر لیا جاسکتا ہے تو (کسی ایسی جگہ جہاں مسجد نہ ہو اور بنانے کی اجازت نہ ہو یا بنانے کی طاقت نہ ہو تو) وہاں نماز کے لیے کوئی گھر کرائے پر کیوں نہیں لیا جاسکتا؟''[1]

قارئینِ کرام! محدّثین و فقہا اور مصلحین علما نے آداب واحکام مساجد کے سلسلے میں بہت تفصیلات بیان کی ہیں۔ بعض اہلِ علم نے تو اس پر مستقل کتابیں بھی لکھی ہیں، جیسے ''إعلام الساجد'' علامہ بدر الدین زرکشی رحمہ اللہ اور ''إصلاح المساجد'' علامہ محمد جمال الدین قاسمی ہیں۔

ان میں مسجدِ حرام مکہ مکرمہ، مسجدِ نبوی مدینہ منورہ اور مسجدِ اقصیٰ بیت المقدس کے آداب واحکام

[1] إعلام الساجد (ص: ٤٠٠)

اور مسائل و آداب مذکور ہیں۔ لیکن ہم نے اپنے موضوع کی حدود کے اندر رہتے ہوئے ضروری ضروری احکام ومسائل اللہ تعالیٰ کی توفیق اوراس کی عنایت سے آپ کے سامنے رکھ دیے ہیں۔

اللہ تعالیٰ اخلاص کی نعمت سے سرفراز کرے۔ ہماری محنت کوشرفِ قبولیت سے نوازے۔ توفیقِ مزید ارزاں فرمائے اور ہم سب کے لیے انھیں اصلاحِ عمل اورنجات کا ذریعہ بنائے۔ آمین ثم آمین۔

مصادر و مراجع

نمبر شمار	اسم الکتاب	طبع
۱	إرواء الغليل. علامه الباني	طبع المكتب الاسلامی بيروت
۲	أحكام الجنائز. علامه الباني	طبع المكتب الاسلامی بيروت
۳	الأدب المفرد. إمام بخاري	طبع اوقاف و امورِ اسلاميه متحده عرب امارات
۴	الاختيارات الفقيه. امام ابن تيميه	طبع بيروت
۵	أحكام القرآن. امام جصاص	طبع بيروت
۶	الاقناع مع كشاف القناع	طبع مصر
۷	الإعلام بنقد الحلال و الحرام. القرضاوي. الفوزان	طبع جامعة الإمام محمد الرياض
۸	الأحكام الفقيه حول الحجاب والدماء الطبيعه. شيخ محمد صالح العثيمين	بيروت
۹	إصلاح المساجد. علامه قاسمی. ترجمه ڈاکٹر مقتدیٰ حسن ازہری	الدار السلفيه، بمبئی
۱۰	إغاثة اللهفان. علامه ابن قيم	طبع بيروت
۱۱	إعلام الموقعين. علامه ابن قيم	طبع بيروت
۱۲	إعلام الساجد. علامه زركشی	طبع اوقاف متحده عرب امارات
۱۳	الأربعين النووية. امام نووی	طبع حكومتِ قطر
۱۴	اقتضاء الصراط المستقيم. امام ابن تيميه	طبع السعودية

۱۵ الإجماع. امام ابن المنذر بتحقیق ڈاکٹر صغیر احمد القاهره (مصر)

۱۶ أشرف الحواشي (فوائد سلفیه) مولانا محمد عبده الفلاح طبع لاهور

۱۷ آزادیِ عورت. رانا صابر نظامی طبع لاهور

۱۸ بلوغ الأماني شرح مسند أحمد. علامه احمد عبدالرحمن البناء طبع مصر

۱۹ بداية المجتهد. علامه ابن رشد طبیع بیروت

۲۰ بدائع الفوائد. علامه ابن قیم طبع الریاض

۲۱ البداية والنهاية. امام ابن کثیر طبع بیروت

۲۲ پرده. مولانا مودودی طبع لاهور

۲۳ تفسیر قرطبي. امام قرطبی طبع بیروت

۲۴ تفسیر طبري. امام ابن جریر طبری طبع بیروت

۲۵ تفسیر ابن کثیر. امام ابن کثیر طبع بیروت

۲۶ تفسیر الدر المنثور. امام سیوطی طبع بیروت

۲۷ تفسیر المجاهد. مولانا عبدالرحمن سورتی طبع حکومتِ قطر

۲۸ تفسیر الکشاف. علامه زمخشری طبع بیروت

۲۹ تفسیر جلالین. علامه جلال الدین سیوطی و محلی طبع بیروت

۳۰ تفسیر ثنائی. مولانا ثنائی اللّٰہ امرتسری طبع بیروت

۳۱ تفهیم القرآن. مولانا مودودی طبع لاهور

۳۲ ترجمه قرآنِ مجید. مولانا مودودی طبع لاهور

۳۳ ترجمه قرآن مجید. شاه صاحب دهلوی طبع لاهور

۳۴ ترجمه قرآن مجید. مولانا محمود الحسن طبع جرمنی

۳۵ تفسیر عثمانی. علامه شبیر أحمد عثمانی طبع جرمنی

۳۶ تنوی الحوالك شرح موطأ إمام مالك. امام سیوطی طبع بیروت

۳۷ تهذيب السنن. علامه ابن قيم — طبع بيروت

۳۸ تقريب التهذيب. حافظ ابن حجر عسقلانی — نشر السنة. لاهور

۳۹ تلخيص الحبير. حافظ ابن حجر عسقلانی — جامعه سلفيه فيصل آباد

۴۰ تمام المنة في التعليق على فقه السنة. علامه البانی — المكتب الإسلامي بيروت

۴۱ تحذير الساجد من اتخاذ القبور مساجد. علامه البانی — جمعية إحياء التراث. كويت

۴۲ جزء القراء ة إمام بخاری. ترجمہ: مولانا خالد گھرجاکھی — دار احياء السنة، گوجرانواله

۴۳ الجواب الباهر. امام ابن تيميه — طبع جامعة الإمام محمد الرياض

۴۴ الجواب الباهر. اُردو ترجمہ: مولانا عطاء اللّٰہ ثاقب — طبع لاهور

۴۵ جديد فقهی مسائل. مولانا خالد سيف اللّٰہ رحمانی — طبع حيدر آباد. انڈيا

۴۶ حجات المرأة المسلمة. إمام ابن تيميه — المكتب الإسلامی، بيروت

۴۷ حجاب المرأة المسلمة. علامه البانی — المكتب الإسلامی، بيروت

۴۸ الحجاب. مولانا مودودی — طبع لاهور

۴۹ الحلال والحرام في الإسلام. ڈاکٹر يوسف القرضاوي — المكتب الإسلامی، بيروت

۵۰ در مختار مع رد المحتار — طبع كراچی

۵۱ رد المحتار المعروف حاشيه ابن عابدين — طبع كراچی

۵۲ روضة المحبين. علامه ابن قيم — طبع الرياض

۵۳ روائع البيان في تفسير آيات الأحكام. شيخ محمد على صابونی — طبع بيروت

۵۴ الروضة الندية شرح الدرر البهية. امام شوكانی و صديق حسن خان — طبع بيروت

۵۵ رياض الصالحين. امام نووی — طبع بيروت

۵۶ زاد المعاد. علامه ابن قيم، بتحقيق الأرناؤوط — طبع حكومتِ قطر

۵۷	الزواجد من اقتراف الكبائر. علامه هيثمى	طبع بيروت
۵۸	الزرقاني شرح موطأ إمام مالك. علامه زرقانى	طبع بيروت
۵۹	سنن أبي داود مع عون المعبود. عظيم آبادى	طبع مدنى
۶۰	سنن ترمذى مع تحفة الأحوذي. مباركپورى	طبع مدنى
۶۱	سنن نسائي مع التعليقات السلفية	المكتبة السلفية لاهور
۶۲	سنن ابن ماجه	طبع بيروت
۶۳	سنن دارقطنى مع التعليق المغني	طبع بيروت
۶۴	سنن كبرىٰ بيهقي مع حاشية التركماني	طبع بيروت
۶۵	سبل السلام شرح بلوغ المرام	طبع بيروت
۶۶	السفور والحجاب. ابن باز	طبع دار الافتاء۔ الرياض
۶۷	سوئے حرم از مؤلف	مكتب كتاب و سنت ريحان چيمه ڈسكه
۶۸	سيرة إمام الأنبياء	مكتب كتاب و سنت ريحان چيمه ڈسكه
۶۹	شرح السنة. امام بغوى	المكتب الإسلامي، بيروت
۷۰	شرح مسلم. امام نووى	طبع بيروت
۷۱	شرح الصدور بتحريم رفع القبور	طبع بيروت
۷۲	شراب اور ديگر منشيات. از مولف	مكتب كتاب و سنت ريحان چيمه (سيالكوٹ)
۷۳	صحيح بخارى شريف مع فتح الباري	دار الافتاء الرياض
۷۴	صحيح مسلم شريف مع شرح النووي	طبع بيروت
۷۵	صحيح أبي داود للألباني	مكتب التربية والتعليم، الرياض
۷۶	صحيح ترمذي للألباني	مكتب التربية والتعليم، الرياض

۷۷	صحیح نسائي للألباني	مكتب التربية والتعليم، الرياض
۷۸	صحيح ابن ماجه للألباني	مكتب التربية والتعليم، الرياض
۷۹	صحيح الترغيب والترهيب للألباني	مكتبة المعارف۔ الرياض
۸۰	صحيح الكلم الطيب للألباني	المكتب الإسلامي۔ بيروت
۸۱	صفة صلاة النبي للألباني	المكتب الإسلامي۔ بيروت
۸۲	الصحيحة سلسلة الأحاديث الصحيحة للألباني	المكتب الإسلامي۔ بيروت
۸۳	صحيح الجامع الصغير للألباني	المكتب الإسلامي۔ بيروت
۸۴	صحيح ابن خزيمة بتحقيق ڈاکٹر مصطفیٰ اعظمی	طبع الرياض
۸۵	صحيح ابن حبان "المسمٰی بالاحسان" الفاسي۔ الأرناؤوط	طبع الرسالة۔ بيروت
۸۶	الصارم المنكي في الرد على السبكي. ابن عبد الهادي	دار الافتاء۔ الرياض
۸۷	الصارم المشهور على أهل التبرج والسفور للتويجري	طبع الرياض
۸۸	صفة التفاسير للصابوني	طبع بيروت
۸۹	ضعيف أبو داود للألباني	المكتب الإسلامي۔ بيروت
۹۰	ضعيف ترمذی للألباني	المكتب الإسلامي۔ بيروت
۹۱	ضعيف نسائي للألباني	المكتب الإسلامي۔ بيروت
۹۲	ضعيف ابن ماجه للألباني	المكتب الإسلامي۔ بيروت
۹۳	السلسة الأحاديث الضعيفة للألباني	المكتب الإسلامي۔ بيروت
۹۴	ضعيف الجامع الصغير سيوطی. الباني	المكتب الإسلامي۔ بيروت
۹۵	عمل اليوم والليلة. امام نسائی	طبع بيروت
۹۶	عمل اليوم والليلة	طبع مراكش
۹۷	عمدة القاري شرح صحيح بخاری. علامه عینی	دار الفكر۔ بيروت
۹۸	عون المعبود شرح أبو داود. علامه شمس الحق	طبع مدنی

۹۹	غاية المرام بتخريج الحلال والحرام. القرضاوي والألباني	المكتب الإسلامي۔ بيروت
۱۰۰	فتح الباري شرح صحيح بخارى. ابن حجر عسقلاني	دار الإفتاء۔ الرياض
۱۰۱	الفتح الرباني ترتيب مسند أحمد. علامه البنا	طبع مصر
۱۰۲	فقه السنة. سيد سابق	طبع بيروت
۱۰۳	فتح القدير شرح هداية. علامه ابن الهمام	طبع بيروت
۱۰۴	فتح المجيد. شيخ عبدالرحمن آلِ شيخ	طبع الرياض
۱۰۵	فتاویٰ إسلامية. شيخ ابن باز بن عثيمين بن جبرين	طبع بيروت
۱۰۶	فتاویٰ و مقالات متنوعه. شيخ ابن باز	الجمعية الخيرية الوش۔ السعودية
۱۰۷	فتاویٰ شيخ ابن باز	مؤسسة الدعوة۔ الرياض
۱۰۸	فتاویٰ قيادة المرأة للسيارة لابن باز	طبع السعودية
۱۰۹	فتاویٰ قيادة المرأة للسيارة للعثيمين	طبع السعودية
۱۱۰	فصل الخطاب في المرأة والحجاب. شيخ أبوبكر جابر جزائرى	طبع السعودية
۱۱۱	فتوائ علماءِ حديث. جمع و ترتيب مولانا على محمد سعيدى	طبع خانيوال
۱۱۲	قرة عيون الموحدين. آل الشيخ	طبع الرياض
۱۱۳	القاعدة الجليلة. امام ابن تيمية	طبع الرياض
۱۱۴	قبوليتِ عمل کی شرائط از مولف	مكتبه كتاب و سنت ريحان چيمه (سيالكوٹ)
۱۱۵	كتاب التوحيد. شيخ محمد بن عبدالوهاب	طبع السعودية
۱۱۶	الكلم الطيب. امام ابن تيميه	طبع بيروت

۱۱۷	كشاف القناع عن متن الاقناع	طبع الرياض
۱۱۸	كفاية الأخيار في حل غاية الاختصار	طبع حكومتِ قطر
۱۱۹	لغات الحديث. علامه وحيد الزمان	طبع كراچی
۱۲۰	اللباب في فرضية النقات للهنداوي	طبع بيروت
۱۲۱	مختصر تفسير طبري	طبع حكومتِ قطر
۱۲۲	مصنف ابن أبي شيبة	طبع بيروت
۱۲۳	منتقى الأخبار مع نيل الأوطار	طبع بيروت
۱۲۴	مختصر صحيح بخاري للألباني	طبع بيروت واردن
۱۲۵	موطأ إمام مالك مع التنوير للسيوطي	طبع بيروت
۱۲۶	موارد الظمآن. زوائد ابن حبان للهيثمي	طبع بيروت
۱۲۷	مراسيل أبي داود بتحقيق مولانا محمد عبده	طبع معهد الشريعة والصناعة كوٹ ادّو
۱۲۸	المنار المنيف. علامه ابن قيم	طبع بيروت
۱۲۹	المعجم المفهرس لألفاظ القرآن الكريم. محمد فؤاد عبدالباقي	طبع بيروت
۱۳۰	المعجم المفهرس لألفاظ الحديث الشريف متشرقين	طبع ليڈن
۱۳۱	المغني لابن قدامة بتحقيق ڈاکٹر الترکی	طبع مصر۔ هجر
۱۳۲	الموسوعة الفقيه. مجموعه علماء	أوقاف كويت
۱۳۳	المجموع شرح المهذب. إمام نووي	طبع مصر
۱۳۴	المهذب مع المجموع . إمام نووي	طبع مصر
۱۳۵	منار السبيل (أساس إرواء الغليل)	
۱۳۶	المرة المسلمة	طبع دار الإفتاء
۱۳۷	مختصر الشمائل المحمدية. ترمذی و البانی	طبع بيروت

١٣٨	مجمع الزوائد للهيثمي	طبع بيروت
١٣٩	المرعاة شرح مشكاة. علامه عبيد الله رحمانى	طبع سانگله هل شيخوپوره
١٤٠	مختصر صحيح مسلم. منذري و الباني	طبع بيروت
١٤١	مجموعة الرسائل المنيريه	جامعه إسلاميه مدينه منورة
١٤٢	المشاهدات المعصومية	دار الإفتاء۔ الرياض
١٤٣	معالم السنن للخطابي	طبع بيروت
١٤٤	المحلى لابن حزم	طبع بيروت
١٤٥	مصباح اللغات	طبع دهلى
١٤٦	مشكاة بتحقيق الباني	طبع بيروت
١٤٧	المعجم الوسيط	طبع بيروت
١٤٨	نيل الأوطار للشوكاني	طبع الرياض و بيروت
١٤٩	هداية المستفيد ترجمه كتاب التوحيد. مولانا ثاقب	طبع لاهور

جرائد ومجلّات

نمبرشمار	جرائد مجلّات	مقام اشاعت
۱	ہفت روزہ ''الاعتصام''	لاہور
۲	ہفت روزہ ''اہلحدیث''	لاہور
۳	ماہنامہ ''محدّث'' بنارس	انڈیا
۴	ماہنامہ ''صراطِ مستقیم'' برمنگھم	برطانیہ
۵	مجلّہ جامعہ ابراہیمیہ	سیالکوٹ